DATA ENTERED

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ) ...... تا ...... (سُوْرَةُ الْقَصَصِ)

(جلد: ۸)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الْقَصَصِ)

(جلد: ۸)

مؤلف
ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

297.14
109519

نام کتاب : تفسیر روح القرآن
مؤلف : ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر : ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ
کمپوزنگ : زاہد حسین
پرنٹرز : محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم : جنوری 2012ء
تعداد : 1000
قیمت : 700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343- مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون 042-35426800
۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔
۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔
۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔
۵۔ ۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ فون: 042-37248676-37320961
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074
۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔
موبائل: 0300-8485030۔ فون: 042-37225030

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

ـ
ـ١
٢
٣
٤
ـ٥
ـ٦

Marfat.com

فہرست

(اَلْمُؤْمِنُوْنَ، اَلنُّوْرِ، اَلْفُرْقَانِ، اَلشُّعَرَآءِ، اَلنَّمْلِ، اَلْقَصَصِ)

اَلْمُؤْمِنُوْنَ

تعارف 1
نام 1
مقامِ نزول 1
زمانۂ نزول 1
مضامین اور مباحث 2
اَلْمُؤْمِنُوْنَ 5
فلاح کی حقیقت 7
اہلِ ایمان کی پہلی صفت 9
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت 10
زکوٰۃ دوسرا استون ہے 11
زکوٰۃ سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے 12
زکوٰۃ کا ایک اور مفہوم 12
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت 13
ایک غلط فہمی کا ازالہ 14
متعہ کا رد 14
اہلِ تشیع کی جسارت 15
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت 16
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت 16
ایک اور صفت کا بیان 17
فردوس کی وراثت کے اصل حقدار 18
آیت کا پس منظر 19

Marfat.com

کفار کے انکار کا بنیادی سبب 19
دلیل نفسی 21
اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْن کا مفہوم 23
بحث کا نتیجہ 23
طَرَآئِق کا مفہوم 24
آیت کے دوسرے جملے کا مفہوم 25
اہتمامِ ربوبیت کی ایک مثال 26
اہتمامِ ربوبیت کی مزید مثالیں 27
عبرت کا مفہوم 28
جانوروں میں منافع 29
خلاصۂ کلام 30
تاریخ سے استدلال 32
قوم نوح کی مخالفت کے خدوخال 33
موجودہ دور کے مخالفین کی ذہنی عصبیت 37
حضرت نوحؑ کی نزولِ عذاب کیلئے دعا 38
بعض اجمالات کی وضاحت 39
کشتی پر سوار ہونے والے اور ان کی دعا 40
سرگزشت میں مضمر نشانیاں 41
عاد و ثمود کی طرف اشارہ 42
قوم نوح کے بعد دیگر قوموں کی طرف رسولوں کی بعثت 42
دعوت میں وحدت 43
دعوت الی اللہ کی مخالفت کرنے والے 46
متکبرین کی چند صفات 46
متکبرین کا عوام کو بہکاوا 47
زندگی کے بگاڑ کا اصل سبب 47
پیغمبر کی دعا 48
دعا کی قبولیت 49

Marfat.com

غلط فہمی کے ازالے کیلئے سنت اللہ کا بیان 50
تکذیب رسل فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے 51
دو رسولوں اور ان کی امتوں کی تاریخ سے استدلال 52
فرعونیوں کا قومی مزاج 52
تکذیب اور تکبر کا انجام 53
حضرت موسیٰ ؑ اور ان کی قوم پر انعام 53
اس آیت کا مفہوم 54
یٰاَیُّھَاالرُّسُلُ کا مفاد 58
چند غلط فہمیوں کا ازالہ 58
گزشتہ حقیقت کا اظہار 60
پس منظر 61
ہر دور کے آسودہ حال لوگوں کی گمراہی 61
کامیابی کے راستے پر چلنے والوں کی پہلی صفت 62
دوسری صفت 63
تیسری صفت 63
چوتھی صفت 64
احساسات کی تسکین 65
مترفین کی گمراہی اور تباہی کا سبب 66
مترفین کا انجام 67
آیت کی تالیف 68
مشرکین مکہ کی مخالفت کے نام نہاد اسباب 68
مزید عذر لنگ 69
ایک بیہودہ الزام 70
مخالفت کا حقیقی سبب 71
گزشتہ بات کی وضاحت 71
آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل 73
مشرکین کا اصل مرض 74

Marfat.com

حق کے مسلسل انکار کے نتائج 74
مشرکین کی حالت سے تائید 75
مشرکین کی بے بسی 76
انسان اور حیوان میں فرق، اور حقیقت شکر 78
اللہ تعالیٰ کے احسانات سے قیامت پر استدلال 79
اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت سے استدلال 80
قریش کا فسادِ عقیدہ اپنے جاہل آباء کا تسلسل ہے 81
مشرکین کا فطری تضاد 81
قریش کے تضادِ فکر کی مزید وضاحت 82
زمامِ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے 83
ایک لطیف تعریض 84
الکمۃ الجامعۃ 85
اللہ تعالیٰ کی سنت اور اسلام کے غلبۂ عمومی کی بشارت 89
اللہ تعالیٰ کا ارادہ حتمی ہے 90
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور حسنِ سلوک کی ہدایت 90
توفیق ایزدی کیلئے دعا کی تلقین 91
معاندین کیلئے آئینہ 92
ارْجِعُوْنِ کا مفہوم 93
واپسی سے انکار کا سبب 93
مضمون کا تسلسل 94
قیامت کے دن کی نفسانفسی 95
قیامت کے دن کامیابی کا ذریعہ 96
کفار کی آہ وزاری اور اس کا جواب 97
اخسئوا کا مفہوم اور کلام نہ کرنے سے مراد؟ 97
غریب مسلمانوں کی دلآزاری اور ان کی توہین کا انتقام 98
طولِ حیات کا مغالطہ 99
انسان کی کوتاہی فکر اور اس کا نتیجہ 100

Marfat.com

انسان کی فکری گمراہیوں کی تردید 101
آغاز واختتام میں یکسانی 102
آنحضرت ﷺ معصوم ہیں تو پھر استغفار کا مفہوم کیا ہے؟ 102
دعا میں معنوی لطافت 103

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ النُّوْرِ

تعارف 104
نام 104
زمانہ نزول 104
تاریخی پس منظر 105
غزوہ بنی المصطلق کی تفصیل 106
واقعۂ اِفک 107
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 108
سُوْرَۃُ النُّوْرِ 111
آغاز میں تین اہم نکات 113
زنا کی سزا 113
جرمِ زنا کی سنگینی 114
حدود سے اسلام کا منشا 115
اسلام اور دیگر مذاہب میں اس جرم کی حقیقت میں فرق 115
عام معمول سے ہٹ کر عورتوں سے خطاب کی وجہ 116
زنا کی سزا کے حکم میں تدریج 116
سزا کے تیسرے مرحلے کا ثبوت سنت ثابتہ سے 117
ثبوت زنا کے دو طریقوں میں پہلا طریقہ شہادت 120
دوسرا طریقہ مجرم کا اقرار اور اس کی مثالیں 121
تازیانہ اور ضرب تازیانہ کی کیفیت 123
دین اللہ کی تعبیر 124

Marfat.com

حدود کے نفاذ میں انسانی احساسات مانع نہیں ہونے چاہئیں 124
سزا لوگوں کے سامنے دی جائے 125
آیت کے الفاظ میں دو احتمالات 125
ذٰلِکَ کا مرجع اور اس کا مفہوم 127
بے حیائی کے فروغ کا ایک ذریعہ قذف بھی ہے، اس کی سزا 128
الزام سے مراد زنا کا الزام ہے 129
مرد پر الزام بھی عورت پر الزام کی طرح موجب سزا ہے 129
قاذف، مقذوف اور فعلِ قذف کی شرائط 129
آیات کا شانِ نزول 131
الزام سے انکار پر دونوں میں ملاعنت 131
اِفک کا مفہوم 134
واقعۂ اِفک کا مختصر ذکر 135
بہتان لگانے والے کون تھے؟ 136
شر میں خیر کے پہلو 136
نامناسب بات پر مسلمانوں کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے 139
شہادت ہی اصل ثبوت ہے 140
ایک تنبیہ 141
ایک اور پہلو سے تنبیہ 141
منافقین کی طرف اشارہ 143
برائی کا سرچشمہ 146
ایک لطیف تنبیہ 146
اسلامی رشتے کی اہمیت 147
حضرت صدیق اکبرؓ کا اعلیٰ کردار 147
ایک اہم مسئلہ 147
پاکدامن اور بھولی بھالی مومن عورتوں پر الزام کی سنگینی 148
ایک فطری اور اقعاتی دلیل 150
تمہید 153

Marfat.com

گھروں میں داخل ہونے کیلئے استیذان کی ہدایت 154
آیت میں عموم کا مفہوم 155
استیذان کا طریقہ 155
پرائیویسی کا لحاظ 157
اجازت نہ ملنے پر واپسی کی ہدایت 157
غَیْرَ مَسْکُوْنَۃٍ کا مفہوم 158
اسلام اور دیگر نظام ہائے زندگی میں فرق 158
پردے کے احکام میں ترتیب 159
گھروں میں داخل ہونے کے بعد کی احتیاطیں 160
غضِ بصر میں استثناء 161
حفظِ فروج کا مفہوم 161
گھر کے اندر عورتوں کو ہدایات 163
وہ لوگ جن کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں 164
مخفی زینت کے اظہار کی ممانعت 166
زینت کے مفہوم میں وسعت 167
اَیَامٰی سے مراد 168
تجرد کی حوصلہ شکنی کیونکہ یہ بھی گناہ کے عوامل میں سے ہے 168
ذی صلاحیت غلاموں کے نکاح کی ہدایت 169
نکاح رزق میں اضافے کا سبب 169
نکاح کی عدم مقدرت میں ہدایت 170
مکاتبت کا مفہوم اور اس کا حکم 171
فَکَاتِبُوْھُمْ کا مفہوم اور اختلاف کا حل 171
مکاتبت میں تعاون کا حکم 172
مکاتبت کا حق لونڈیوں کو بھی ہے 173
معاشرتی مقام کی بلندی اصلاح کا ذریعہ 176
اہلِ عرب میں قحبہ گری 177
حرف اِن کا مفہوم 177

Marfat.com

زنا کی کمائی کی حرمت 178
ایک تنبیہ 178
گزشتہ آیات سے ربط اور منافقین کو تنبیہ 181
نور کا مفہوم 182
تمثیل کی وضاحت 183
روغنِ زیتون سے مراد 184
فِيْ بُيُوْتٍ کا محل اور مفہوم 185
اَذِنَ کا مفہوم 186
رَفَعَ کا مفہوم 186
تعمیر مساجد میں اعتدال کا رویہ 187
رِجَالٌ سے مراد 188
مردانِ خدا کا ایک وصف 189
اہلِ کفر کی تمثیل 189
اہلِ کفر کی ذہنی تاریکی کی مثال 190
اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کی دعوت 193
تسبیح سے کیا مراد ہے 193
عبادت کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے 194
اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق ہے 195
اللہ تعالیٰ کے اختیار کی ہمہ گیری کی ایک مثال 196
عبرت کا مفہوم 197
اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک مثال 197
ہدایت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت 198
منافقین کے رویے پر تنقید 199
نفاق کا ایک پہلو 200
خود غرضی کی اطاعت نفاق ہے 201
منافقین کے طرزِ عمل کا تجزیہ 202
سچے مومنوں کی شان 204

Marfat.com

مسلمانوں کی کامیابی کی تین شرائط اطاعت، خشیت، تقویٰ 206
منافقین کی روش جہاد کے معاملے میں 208
منافقین کو تنبیہ 209
اللہ تعالیٰ کے وعدے چند صفات کے ساتھ مشروط ہیں 210
خلافت کا غلط مفہوم 210
خلافت کا صحیح مفہوم 211
ایک ضروری بات 212
کفر کا مفہوم 215
مسلمانوں کو تین ہدایات 216
کافروں کو تنبیہ 216
توضیحی آیات، غلاموں اور بچوں کیلئے تین اوقات میں اجازت لینے کی ہدایت 219
ایک سوال کا جواب 220
مملوکوں سے غلام اور لونڈیاں دونوں مراد ہیں 220
بوڑھی عورتوں کیلئے ایک رخصت 222
گزشتہ احکام سے متعلق بعض توضیحی ہدایات 223
آیت کی تفسیر میں مختلف آراء اور ان میں تطبیق 223
منافقین کو تنبیہ 226
امر جامع سے مراد 227
دعاء الرسول سے مراد اور اس کی اہمیت 228

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

تعارف 231
نام 231
زمانۂ نزول 231
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 231
سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ 233

Marfat.com

تبارک کا معنی ومفہوم 234
فرقان کا معنی ومفہوم 235
عبدہ کا محل 235
انذار کا معنی ومفہوم 236
قرآن کی حقیقت واہمیت 237
سابق مضمون کی مزید تشریح 238
قریش کے لیڈروں کے الزامات اوران کا رد 238
معترضین پر ایک لطیف طنز 242
قریش کے بعض مزید اعتراضات 242
ضربِ مثل کا مفہوم 243
اعتراضات کا جواب 245
ایک مغالطہ 247
دوزخ اوراہلِ دوزخ کی تصویر 248
اہلِ دوزخ کی آخری خواہش 248
جنت اوراہلِ جنت کی تصویر 249
آخرت میں انبیاء وصالحین کا اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت 251
کفار کی گمراہی کا اصل سبب 252
ایک بلیغ اسلوب 253
قریش کے اعتراضات کی لغویت 253
فتنہ کا مفہوم 254
متکبرین کے استکبار پر ایک ضرب 257
حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا مفہوم 258
متکبرین کے اعمال کی حقیقت 259
اہلِ جنت کا مقام ومرتبہ 259
قیامت کے دن فرشتوں کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ 260
قیامت کے دن مکذبین رسول کی حسرت 261
ذکر سے مراد 262

Marfat.com

مَهْجُوْرًا کا مفہوم اور اس سے مراد	263
آنحضرت ﷺ کو تسلی	264
قرآنِ کریم کے یک وقت نہ اترنے کی وجہ	265
قرآنِ کریم کے تدریجاً نزول کی ایک اور حکمت	267
قریش کو تنبیہ کیلئے تاریخ انبیاء سے استدلال	269
سب سے پہلے حضرت موسیٰ ؑ کا ذکر ان کی جلالتِ قدر اور شہرت کے باعث	670
حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت اہتمام دعوت کے حوالے سے	670
حضرت نوح ؑ کا ذکر اولین رسول اور دیگر بعض خصوصیات کے باعث	272
ایک رسول کا انکار، سب کا انکار	272
اصحاب الرس سے کیا مراد ہے؟	273
ضربِ مثل کا مفہوم	274
قوم لوط کی بستی سے استشہاد	275
قریش کی بدنصیبی	276
قریش کی گمراہی کا ایک بہت بڑا سبب اتباعِ ہوائے نفس ہے	276
رات اور دن کا آنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے	280
رات اور دن کے فوائد و منافع	282
ایک اور نشانِ قدرت	283
تصریفِ آیات کا اعجاز	285
آنحضرت ﷺ کو تسلی	285
اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک اور نشانی	287
اضداد میں توافق کی ایک انفسی دلیل	288
کافر کی عصبیت	289
آنحضرت ﷺ کو تسلی	289
پروردگار کی چند مزید صفات کا ذکر	291
اسمِ رحمٰن پر قریش کا اعتراض اور اس کا جواب	292
تَبٰرَکَ کا مفہوم اور سورۃ کی پہلی آیت سے ربط	295
نشانیوں کی کمی نہیں اصل ضرورت تذکر اور شکر گزاری کی ہے	296

Marfat.com

عبادالشیطان کے مقابلہ میں عبادالرحمٰن کا بیان 296
عباد کا مفہوم 297
سیرت واخلاق کے دو نمونے 297
عبادالرحمٰن کی پہلی صفت عاجزانہ رفتار 298
دوسری صفت مومنانہ گفتار 299
جاہل کا مفہوم اور سلام سے مراد 300
تیسری صفت عبادالرحمٰن کا کردار اور خلوت کی زندگی 301
عبادت ان میں نیکی کا پندار پیدا نہیں کرتی 302
مستقر اور مقام کا مفہوم 303
عبادالرحمٰن کی ایک اور صفت 303
عبادالرحمٰن کا کبائر سے اجتناب 304
کبائر کی ہولناک سزا 307
توبہ، مژدۂ جانفزا 308
توبہ کے تین ارکان 309
جہالت کا مفہوم 310
عبادالرحمٰن کا لغویات سے احتراز 313
عبادالرحمٰن کا نصیحت سے شغف 314
عبادالرحمٰن کی جامعیت 315
عبادالرحمٰن کے ہدف کی بلندی 315
عبادالرحمٰن کا اخروی مقام ومرتبہ 316
مخالفین کو وارننگ 317

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ

تعارف 318
نام 318
مقامِ نزول 318

Marfat.com

زمانہ نزول	318
موضوع اور مباحث	318
سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ	320
یہ کتاب خود اپنی حقانیت کی دلیل ہے	321
ان آیات سے تین حقائق کا استحضار	322
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کیلئے تہدید	323
مخالفین کے اصل مرض کی نشاندہی	324
مخالفین کا علاج غلبۂ دین	324
زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ	325
ہر طرف نشانیاں ہیں مگر اندھے پن کا کیا علاج؟	325
غلط فہمی کا ازالہ	326
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت	328
سرگزشت سے پہلے چند باتوں کی طرف توجہ	329
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چند اندیشے	331
اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دہانی	332
فرعون کی برہمی	333
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب	333
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مسکت جواب پر فرعون کا خلط مبحث	334
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمۂ حق	335
فرعون کی بوکھلاہٹ	335
کلمۂ حق کی وضاحت	336
فرعون کی جھنجلاہٹ	336
فرعون کی خدائی پر آخری ضرب	336
فرعون کی دھمکی	337
سندِ ماموریت کا اظہار	337
معجزات کا ظہور	338
معجزات کی قاہری اور فرعون کی ہشیاری	340

Marfat.com

درباریوں کا مشورہ 341
مقابلے کی تیاری 341
ساحروں کی طلب اور فرعون کی حوصلہ افزائی 342
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحر میدانِ مقابلہ میں 343
معجزے کی قاہری 343
ساحروں کا اعتراف حق 344
فرعون کی سیاست کاری 344
ایمان کی حیرت انگیز قوت 345
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا دوسرا باب، آپؑ کی ہجرت 347
تعاقب کیلئے فرعون کی تدبیریں 348
مفسرین کا اختلاف اور آیت کا مفہوم 349
قوم کی کمزوری اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتماد علی اللہ 350
قدرتِ خداوندی کا کرشمہ 351
ترجیع کی آیت اور اس کا مفہوم 352
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت سے متعلق چند اہم امور اور دعوت کا آغاز 355
دعوت ایک قدم آگے اور مخالفین کا جواب 356
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ براءت 357
ربِ حقیقی کی چند صفات 358
ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا 360
والد کیلئے مغفرت کی دعا کا مفہوم و مراد 361
دعا کی تکمیل پروردگار کی طرف سے ہے 362
متقین کا اعزاز 362
کافروں کا حشر 363
لیڈروں اور پیروکاروں میں جھگڑا 364
حسرت کا اظہار 365
حضرت نوح علیہ السلام و آپؑ کی دعوت کی سرگزشت سے پہلے چند حقائق 366
رسولوں کی تکذیب کا مفہوم 367

Marfat.com

حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کا بھائی کہنے کا مفہوم 368
رسولِ امین کا مطلب 369
پیغمبر کی حقانیت پر دلیل 369
اس آیت کے تکرار کا سبب 370
خوئے بدرا بہانہ بسیار 371
طبقۂ امراء کے معارضے کا جواب 371
بحث کے میدان میں پسپا ہونے کے بعد رجم کی دھمکی 372
فتح و نصرت کیلئے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا 372
دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کا فیصلہ 373
حضرت ہود علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کی سرگزشت 375
اطاعت کی دلیل 376
ترجیحات کے بگاڑ پر تنبیہ 377
فساد فی الارض پر تنبیہ 377
کفرانِ نعمت سے بچو 378
قلبی قساوت کی آخری حد 379
تکذیب کا نتیجہ 380
حضرت صالح علیہ السلام اور آپؑ کی دعوت کی سرگزشت 382
خوشحالی سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ 382
آخرت فراموشی سے پیدا ہونے والے تمدن کا فساد 383
گمراہ لیڈر شپ تباہی کا باعث ہے 385
قوم کا جواب 385
قوم کے مطالبے پر نشانی کا ظہور 386
سرکشی اور نافرمانی نئی نئی گمراہیوں کو جنم دیتی ہے 389
فطرت کا بگاڑ 389
قوم کی فیصلہ کن دھمکی 390
حضرت لوط علیہ السلام کی استقامت 390
حضرت لوط علیہ السلام کی دعا 391

Marfat.com

قبولیتِ دعا اور قوم کا انجام 391
اَصۡحٰبُ الۡئَیۡکَۃِ کی تحقیق 394
قومِ شعیب کی سب سے نمایاں برائی پر تنقید 396
ناپ تول میں کمی اور ملاوٹ فساد کا پیش خیمہ ہے 396
تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت 397
قومِ شعیب کا مطالبۂ عذاب 397
اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے 398
یَوۡمِ الظُّلَّۃِ کا عذاب آ گیا 398
خاتمۂ سورۃ کی آیات، قرآنِ کریم کا مرتبہ و مقام 401
اہلِ عرب پر احسان اور تنبیہ 403
قرآنِ کریم کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت 403
علماء بنی اسرائیل کی گواہی 404
قریش کے مطالبے کا جواب 404
قرآنِ کریم کی دعوت قبول نہ کرنے کا سبب 405
عذاب کیلئے جلدی مچانے والوں کو جواب 406
قریش کو تنبیہ 406
مخالفین کے الزام کی تردید 407
تردید پر پہلی دلیل 407
دوسری دلیل 408
تیسری دلیل 409
خطاب آنحضرت ﷺ سے، عتاب مخالفین پر 409
قریبی خاندان کو انذار کا حکم کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب برابر ہیں 410
آیت کے مفہوم کی وضاحت 411
آنحضرت ﷺ کو تسلی 412
حِیۡنَ تَقُوۡمُ کی تاویل 413
شیاطین کن پر اترتے ہیں 413
آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید 414

Marfat.com

فیصلہ کن تین کسوٹیاں 415
ایک ضروری بات 417
شانِ نزول 418
چار خصوصیات کے حامل شعراء کا استثناء 418

☆☆☆☆☆

سُوْرَةُ النَّمْلِ

تعارف 421
نام 421
زمانۂ نزول 421
مضامین 421
سُوْرَةُ النَّمْلِ 423
ایک اشکال کا جواب 425
کتابِ مبین کا مفہوم 425
کتاب کی دو خصوصیات ہدایت، بشارت 425
ہدایت کی شرائط 426
ایمان سے انکار کا سبب 427
سُوْٓءُ الْعَذَاب سے مراد؟ 428
آنحضرت ﷺ کو تسلی 428
انبیائے کرام کے واقعات بیان کرنے کا سبب 429
مدین اور طور کا محل وقوع 430
وادیٔ طور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر عنایتِ ربانی 430
ایک شبہ کا ازالہ 431
احتمالات کی وضاحت 431
پہلا معجزہ اور اس کی وضاحت 432
نبی کی حقانیت کی دلیل 432
ایک حقیقت کا اظہار 433

Marfat.com

عام اصول اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بشارت	433
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا جانے والا دوسرا معجزہ	434
ایک سوال اور اس کا جواب	435
پیغمبروں کے معجزات آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں	435
منکرین کے انکار کا اصل سبب	436
انسانی زندگی میں شکر کے اثرات	439
آیت میں وراثت کا مفہوم	440
مَنطِقَ الطَّیرِ کا علم	441
حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوج	441
وادیٔ نمل کی وضاحت	443
تَبَسَّمَ کا مفہوم	444
واقعہ کی اصل روح اور مرکزی مضمون	444
جانوروں سے پیغام رسانی کی خدمت	445
ایک غلط فہمی کا ازالہ	446
ہدہد کی رپورٹ	447
یہ تضمین ہے	448
ہدہد کی عذر خواہی کا جواب	449
مکتوبِ گرامی سے متعلق چند اہم امور	450
ملکہ کی اہلِ دربار سے مشاورت	453
اہلِ دربار کا جواب	454
ملکہ کی رائے	454
حقیقت کا تجسس	455
حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے وفد کو جواب	455
حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوتی تدبیر	456
اَلَّذِیْ عِندَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ کا مفہوم	457
حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکر گزاری	458
تخت ذریعۂ ہدایت	459

Marfat.com

ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں	460
ایک سوال کا جواب	460
محل میں ملکہ کی حیرانی	461
حضرت سلیمان علیہ السلام کا طرزِ زندگی ذریعۂ ہدایت بنا	461
ملکۂ سبا کا ذکر تورات میں اور اس پر تبصرہ	462
انسان کے بناؤ اور بگاڑ کے دو سبب	465
حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت اور اس کا ردِ عمل	466
مخالفین کا عام حربہ	467
اِطَّیَّرْنَا کی تحقیق	467
قوم کا بیہودہ ردِ عمل	468
رَھْطٍ کا مفہوم	469
زمین میں فساد کا سبب	469
حضرت صالح علیہ السلام کیخلاف مخالفین کا منصوبہ	470
مخالفین کی چال کے مقابل میں اللہ تعالیٰ کی چال	470
قریش کو تنبیہ	471
حضرت لوط علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کا بیان	472
خلافِ فطرت کام پر اظہارِ تعجب و حیرت	472
دلائل سے پسپائی	473
فیصلہ کن چیز ایمان اور کفر ہے	473
قومِ لوط کا انجام	474
خطبے کا آغاز اور آغازِ گفتگو کی تعلیم	476
دو کردار اور ان کا انجام	476
استفہام کا مفہوم	477
الوہیت پر دلائل کے ضمن میں صفتِ تخلیق کی وضاحت	477
زمین کے جائے قرار ہونے کی وضاحت اور اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمتیں	478
اللہ تعالیٰ کی صفت اجابتِ مضطر، کشف السوء اور زمین میں جانشینی کی وضاحت	481
ہدایت کا وسیع مفہوم اور اس کے مدارج	482

Marfat.com

ہدایت کا دوسرا مرتبہ 483
ہدایت کا تیسرا مرتبہ 484
حاصلِ بحث 488
آیت میں دوسرے سوال کا جواب 490
اللہ تعالیٰ کی صفت ابتداءِ خلق اور اعادۂ خلق کی وضاحت 491
اللہ تعالیٰ کی صفتِ رزاقی کی وضاحت 493
علمِ غیب کی حقیقت 494
اِدّٰرَکَ کی تحقیق 496
مشرکین کی اصل بیماری 496
آخرت سے متعلق کفار کا رویہ 499
قیامت کا چرچا نیا نہیں 499
عذاب کا ثبوت تاریخ کی روشنی میں 500
معذب قوموں کے عذاب سے استدلال 500
فسق و فجور کا سبب آخرت سے انکار ہے 500
آنحضرت ﷺ کو تسلی 501
مکذبین کے مطالبے کا جواب 502
عَسٰی کے معنی کی وضاحت 502
مخالفین کی بدنصیبی 503
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو انذار 503
ترہیب کے بعد ترغیب 504
دفع دخلِ مقدر 505
اللہ تعالیٰ پر توکل آپ کی طاقت ہے 506
آنحضرت ﷺ کو تسلی 506
اتمامِ حجت کے بعد کا مرحلہ 507
خروجِ دابہ کا وقت 508
ایک اشتباہ کا جواب 508
قیامت کی یاددہانی اور محشر میں مکذبین کی حالت 510

Marfat.com

مکذبین سے ایک سوال 511
مکذبین کی بے بسی 511
نشانیاں مانگنے والوں کو ملامت 512
ہولِ قیامت سے تذکیر 513
قیامت کا ایک اور منظر 513
عدل وجزاء کا دن 514
آنحضرت ﷺ کے مشن کی وضاحت 515

☆☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْقَصَصِ

تعارف 517
نام 517
زمانۂ نزول 517
موضوع اور مباحث 517
سُوْرَةُ الْقَصَصِ 520
کتابِ مبین کا مفہوم 522
سرگزشت کے سنانے کا اصل مقصد 522
سرگزشت کے مقصد کے اہم اجزاء 523
فرعون کے مظالم کے برعکس خدائی فیصلہ 525
ہامان کے بارے میں وضاحت 526
اصل سرگزشت کا آغاز 526
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پانی میں ڈالے دیئے جانے کے بعد کی صورتحال 528
ماں کی بے قراری اور اللہ تعالیٰ کی دستگیری 529
تسلی کی ایک تدبیر 529
اللہ تعالیٰ کی کارسازی 530
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی آغوش میں واپسی اور اس کی حکمتیں 531
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوانی 533

Marfat.com

علم اور حکم کا مفہوم 534
عمر کا تعین 534
مدینہ سے مراد 535
شہر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد اور احتیاط کا سبب 535
آئندہ کیلئے احتیاط کا عہد 537
عہد کے پاس کیلئے مزید احتیاط 538
ایک صالح آدمی کی خیرخواہی 539
خطرے سے نکلتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا 540
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدین کو قصد 542
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منزل 542
مدین میں پہلا پڑاؤ اور سبق آموز واقعات 543
ایک واقعہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اثر 544
ان صاحبزادیوں کے والد کون تھے؟ 544
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی قبولیت اور آپؑ کیلئے خیر کی راہ 545
بیٹی کی تجویز 546
بیٹی کی انگیخت اور باپ کا فیصلہ اور اس کی شرعی حیثیت 547
مصر کو واپسی اور جلوۂ طور کا مشاہدہ 551
جلوۂ طور کا تعارف 552
پہلا معجزہ اور اس کا اثر 552
معجزے سے پیغمبر کی کیفیت صداقت کی دلیل ہے 552
دوسرا معجزہ 553
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک اندیشہ 554
اپنی تائید و نصرت کیلئے حضرت ہارون علیہ السلام کے تعاون کی درخواست 554
دونوں درخواستوں کی قبولیت 555
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور ان کی دعوت کی مخالفت 555
فرعون کی یاوہ گوئی کا جواب 556
فرعون کا استہزاء اور اس کے دعویٰ کا مفہوم 556

109519

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کی تین صفات 563
آنحضرت ﷺ کی رسالت کی دلیل 564
آنحضرت ﷺ کی رسالت کے اثبات میں مزید دلیل 565
آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد 566
تین باتوں کی طرف اشارہ 567
ایک اعتراض اور اس کا جواب 567
قریش سے ایک مطالبہ 569
ہدایت کی پیروی سے گریز کرنے والا خواہشات کا پیرو ہے 570
ہدایت کی تعلیم وتذکیر کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا 572
اہلِ کتاب کے صالحین کے ایمان لانے پر اظہارِ تحسین 573
اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات 574
اہلِ کتاب میں ایمان لانے والوں کی صفات 575
گزشتہ مضمون کا تسلسل 576
آنحضرت ﷺ کو تسلی 576
قریش کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب 578
قریش کے خدشے کا علاج 579
سنت اللہ کا بیان 581
قریش کو براہِ راست تنبیہ 582
کافر اور مومن کی ذہنیت کا مقابلہ 585
شرک اور اہلِ شرک کا انجام 586
گمراہ لیڈروں اور ان کے پیرووں میں تکرار 587
مشرکین کی بے بسی 588
رسولوں کے حوالے سے لوگوں سے سوال اور ان کی بدحواسی 588
اہلِ ایمان کیلئے فلاح کی بشارت 589
شرک کیخلاف صفتِ خلق واختیار سے استدلال 590
صفتِ علم سے استدلال 590
خلاصۂ بحث 591

Marfat.com

مخاطب کے مسلمات سے استدلال 592
دونوں دلائل کا نتیجہ 593
ایک اور پہلو سے سوال 593
قارون دنیا پرستی کا نمونہ اور اس کے اطوار 596
قوم کے اہلِ دانش کی قارون کو نصیحت 598
قارون کا جواب 599
اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ 600
قارون کا اظہارِ طاقت اور کمزور لوگوں کا تأثر 600
قوم کے تربیت یافتہ لوگوں کا ردِعمل 601
قارون کا عبرتناک انجام 602
عوام کی کوتاہ فکری اور زود پشیمانی 603
قارون کی سرگزشت کا مقصد 604
دارِ آخرت کیسے لوگوں کیلئے ہے 606
آخرت میں جزاء وسزا کا طریقہ 606
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور بشارت 607
مَعَادِ کا مفہوم 608
آنحضرت ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل 609
آنحضرت ﷺ کو تسلی 611
اللہ تعالیٰ کے دین کا مزاج 611
ردِ شرک میں آخری درجہ تک زور اور تاکید 612
آنحضرت ﷺ کی دعوتِ توحید کا نچوڑ 613

Marfat.com

درسِ قرآن

سُورَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ

(۲۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

اَلْمُؤْمِنُوْنَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام ''اَلْمُؤْمِنُوْنَ'' ہے۔ یہ اس سورۃ کی پہلی آیت ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ'' سے ماخوذ ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس میں 6 رکوع، 128 آیتیں، 1840 کلمات اور 4802 حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ حتمی طور پر کوئی بات کہنا تو مشکل ہے۔ البتہ! اندازِ بیان اور مضامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کا زمانہ نزول مکی زندگی کا دورِ متوسط ہے۔ آیت 75 اور 76 سے واضح طور پر شہادت ملتی ہے کہ یہ سورۃ مکہ کے قحط کے زمانے میں نازل ہوئی ہے اور معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط مکی زندگی کے دورِ متوسط میں برپا ہوا تھا۔ حضرت عروہ بن زبیر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لا چکے تھے کیونکہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ سورۃ میرے سامنے نازل ہوئی ہے اور میں نے نبی کریم ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہوتے دیکھی جو نزولِ وحی کے وقت آپ پر طاری ہوا کرتی تھی۔ یعنی سخت سردیوں میں آپ کی مبارک پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے اور سخت گرمی میں آپ کے دانت بجنے لگتے تھے اور آپ کے چہرے کی رنگت یوں ہو جاتی تھی جیسے کھجور کا خشک اور زرد پتا ہوتا ہے۔ آپ نزولِ وحی کی اس کیفیت سے جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ مجھ پر اس وقت دس ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ اگر کوئی ان کے معیار پر پورا اتر جائے تو یقیناً جنت میں جائے گا۔ پھر آپ نے اس سورۃ کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں۔ (ترمذی، نسائی، حاکم)

اس سورۃ کا سورۂ حج سے گہرا ربط معلوم ہوتا ہے۔ سورۂ حج کے اختتام پر مسلمانوں کو ان کا فریضۂ منصبی یاد دلایا گیا ہے۔ یعنی اللہ کے رسول نے دینِ حق کی گواہی جس طرح تم پر دی ہے اسی طرح اب تمہارا فرض ہے کہ یہ گواہی تم خلق پر دو اور ساتھ ہی ساتھ اس منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جن باتوں کو اپنے اندر پیدا کرنا ضروری ہے مثلاً اہتمامِ نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور توکل علی اللہ، ان کی ہدایت فرمائی ہے۔ اب اس سورۃ میں بعینہٖ مومنوں کی کامیابی کے حوالے سے ان صفات کو بیان کیا گیا ہے جو مومنوں کو فلاح و کامرانی سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ اس میں بھی اول و آخر نماز میں خشوع، اہتمامِ صلوٰۃ، زکوٰۃ اور دوسری صفات کو نمایاں کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''سورۃ الحج'' جس مضمون پر اختتام پذیر ہوئی تھی ''المؤمنون'' اسی مضمون کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ مضمون کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوبِ بیان اور نہجِ استدلال کا فرق ہے۔

Marfat.com

مضامین اور مباحث:۔

المومنون کو پڑھتے ہوئے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ از اول تا آخر اپنے اندر زبردست استدلالی قوت رکھتی ہے۔اس سورۃ کی پہلی دس آیات بظاہر صاحب ایمان لوگوں کی صفات معلوم ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ نہایت اہم دلائل کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی بھی دعوت کو مؤثر اور مؤکد بنانے کیلئے جس طرح عقلی اور نقلی، آفاقی اور انفسی دلائل کسی دعویٰ اور بات کو ثابت کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔اسی طرح اگر کوئی دعوت ایسی ہے جس کا موضوع انسان ہے اور اس کے پیشِ نظر انسانوں میں کوئی صالح تبدیلی لانا ہے جو انسانوں کو دنیا میں اللہ کی رحمت اور آخرت میں جنت کا مستحق بنادے، تو ایسی دعوت کو سچا ثابت کرنے کیلئے سب سے مضبوط طرزِ استدلال یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو جو اس دعوت کو قبول کریں ہر اعتبار سے مکمل اور قابلِ تعریف انسان کی حیثیت سے پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ جن لوگوں کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے ہیں وہ فکری، اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی، اور تمدنی ہر لحاظ سے بگڑے ہوئے نہیں بلکہ بگاڑ کی بدترین مثالیں ہیں۔ کسی قوم میں بھی شاید ایسا ہمہ جہت اور ہمہ رنگ بگاڑ نہ پایا جاتا ہو جیسا ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کا وارث کہتے ہیں۔لیکن انہیں میں سے جن لوگوں نے اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرلیا اور اس پر ایمان لے آئے انہوں نے ایمان ویقین کی ہر وادی کو قطع کرتے ہوئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔مخالفین نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ ان کے ایمان کو شکست دے سکیں ۔لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے ۔وہ لوگ جو ہوائے نفس کے پرستار، مفادات کے حریص، اور ہر خیر کی بات سے کوسوں دور تھے۔انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سر جھکایا کہ وہ عاجزی اور فروتنی کی تصویر بن گئے۔ وہ ہر لغو سے پرہیز کرنے اور زندگی کی مشعل کو فروزاں کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔کل تک جو لوگ خواہشِ نفس پر جان دیتے تھے ایمان لانے کے بعد ایسی ہر آلودگی سے اپنے آپ کو پاک کرنے میں لگ گئے۔جنہیں شرم وحیا سے دور کا رشتہ بھی نہ تھا وہ شرم اور اخلاق کے ایسے معلم بن کر اٹھے کہ دنیا نے ان سے اخلاق کا درس لیا اور حیا کے اصول سیکھے اور زندگی کے معاملات میں دیانت وامانت کو اپنا رہنما اور، عہد وپیمان کو اس طرح اپنی طبیعتِ ثانیہ بنایا کہ لوگ اپنی زندگیاں بھی ان کی حفاظت میں دینے کیلئے تیار ہوگئے۔ان میں سے ایک ایک فرد جہاں بھی گیا اپنی ذات اور اپنے اعمال میں اللہ کے رسول کی تعلیم اور دعوت کی سب سے بڑی دلیل بن گیا۔لوگ اسے دیکھ کر یقین کرنے پر مجبور ہوگئے کہ جس دعوت نے ایسے بے عیب نمونے اور انسانیت کے ایسے نمائندے تیار کیے ہیں اس کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس دعوت کا پیش کرنے والا اللہ کا رسول نہیں اور اس کی کتاب اللہ کی کتاب نہیں۔

اسی طرزِ استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت نے انسانی اصلاح کیلئے فکری بنیاد فراہم کرتے ہوئے توحید، رسالت اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔لیکن اہلِ عرب کو توحید اور قیامت کو قبول کرنے میں سخت تامل تھا۔ یہ دونوں باتیں ان کے نزدیک عقل، تجربہ اور مشاہدہ کے سراسر خلاف تھیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے ان باتوں کو قریب الفہم بنانے کیلئے دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق سے کام لیا۔ دلائلِ انفس کے سلسلے میں مٹی کے خلاصہ سے انسان کی تخلیق، پھر پانی کی بوند سے ماں کے پیٹ میں حیران کن تبدیلیاں اور ہر تبدیلی ایک طرف اللہ کی قدرت کی شاہکار اور دوسری طرف حکمت ودانش کا حیران کن عجوبہ، پھر انسان کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ کی ربوبیت کا فیضان اور اس کی نگرانی کی نگاہ جس طرح انسان کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں

Marfat.com

اپنے حصار میں لئے رہتی ہے، وہ بجائے خود اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے اور پھر یہ بچہ جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ بول سکتا ہے، نہ پہچانتا ہے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ نہ صرف اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے بلکہ علم ودانش اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی قوتِ ایجاد کے حوالے سے ایک حیران کن شخصیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان دلائل کے آئینہ میں سوچنے والی نگاہ پلٹ کر پیچھے دیکھے کہ کہاں پانی کی بوند میں ایک گمنام جرثومہ، اور کہاں یہ حضرتِ انسان اور اس کی حیرت انگیز شخصیت، یہ کس کی قدرت کا کرشمہ ہے؟

یہ اعجاز آفرینی اور جلوہ گری انسان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی پیدائش، نباتات وحیوانات کی تخلیق اور دوسرے آثارِ کائنات، ان میں ایک ایک چیز، اپنی ذات میں بے پناہ دلیل کی قوت رکھتی ہے۔ پانی جو ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ ہے اس کی بہم رسانی کا انتظام، پھر اس کے چند چھینٹوں سے زمین پر بچھ جانے والا مخملی فرش، پھر اس روئے زمین پر لہلہانے والی کھیتیاں، گھاس اور پھوس سے وجود میں آنے والی حیرت انگیز انسانی ضروریات، پہاڑوں کی بلند وبالا چوٹیاں، ان میں ایک ایک چیز اپنے اندر زبردست دانش وحکمت رکھتی ہے۔ جسے سمجھنے کیلئے زندگیاں تمام ہو جاتی ہیں لیکن ان میں بہت سی چیزیں پھر بھی انسان کیلئے چیلنج بنی رہتی ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ جس ذات نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے اور جو حیران کن صفاتِ کمال سے متصف ہے اس کے ساتھ ان قوتوں کو شریک کیا جائے جو ان صفات سے قطعاً عاری ہیں۔ اسے انسانی عقل ودانش پر الزام کے سوا اور کیا کہا جائے۔

اس کے بعد چند انبیائے کرام کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ جن سے غرض محض چند قصے سنانا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ آج تم نبی کریم ﷺ پر جو اعتراضات کر رہے ہو ان میں کوئی اعتراض نیا نہیں۔ جب بھی کوئی رسول دنیا میں آیا ہے۔ جن میں ایسے رسول بھی ہیں جنہیں تم خود بھی فرستادۂ الٰہی مانتے ہو۔ ان پر بھی ان کی قوموں نے ایسے ہی اعتراضات کئے۔ لیکن تاریخ کے آئینہ میں جھانک کر دیکھو کہ آخر نتیجہ کیا ہوا؟

تمہیں خوب معلوم ہے (کیونکہ تم سابقہ معذب قوموں کے کھنڈرات سے گزرتے ہو) کہ جب ان رسولوں کی قوموں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی بہیمانہ مخالفت نے ان کی ایک نہ چلنے دی، تو آخر اس کشمکش کا نتیجہ کیا ہوا؟ اللہ نے رسولوں کی دعوت کو فروغ دیا اور شریروں کی جڑ کاٹ دی۔ یہی اب بھی ہوگا لیکن یہ دنیا دارالامتحان ہے اس میں اہلِ حق کی آزمائش ضروری ہے۔ اس آزمائش کے تقاضے سے اہلِ باطل کو بھی ایک حدِ خاص تک مہلت دی جاتی ہے کہ وہ بھی جتنا زور لگانا ہے لگالیں۔ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

نبی کریم ﷺ کی دعوت کی تکذیب کرنے والوں کے شبہات کا ذکر فرما کر ان کا بے بنیاد ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ نیز ان کے مطالبۂ عذاب کے حوالے سے نہایت دھیمے انداز میں انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر انہیں عذاب کا کوئی نمونہ دکھا بھی دیا گیا تو اس کا انہیں کیا فائدہ ہوگا؟ جس طرح یہ دوسروں پر گزرے ہوئے حوادث سے کوئی سبق نہیں لیتے اسی طرح اگر خود ان پر بھی کوئی مصیبت آگئی تو اس سے نکلتے ہی پھر اپنی بدمستیوں میں کھو جائیں گے۔

جس طرح تم آج اپنی دنیوی خوشحالی اور سیادت وامارت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے ہو، یہی غلط فہمی پہلی امتوں کو بھی تھی جس طرح آج تم رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے خستہ حال لوگوں کی خستگی کو ان کے برسرِ باطل ہونے کی دلیل سمجھتے ہو، یہی حال سابقہ امتوں کا بھی تھا۔ لیکن جب عذاب آیا تو اس نے یہ بات ثابت کردی کہ اللہ کے عذاب سے بچانے والی چیز ایمان اور حسنِ عمل ہے، دولت وحشمت، خدم وحشم اور منصب واقتدار اللہ کے عذاب سے کبھی نہیں بچا سکے۔ وہ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آئے اور آج اگر اللہ کا عذاب تم پر آیا تو جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے وہ بھی تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔

Marfat.com

مشرکین بعض دفعہ آنحضرت ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر آپ ہماری فلاں فلاں بات مان لیں اور ہماری رائے کے مطابق فلاں فلاں آیت میں ردوبدل کردیں اور ہمیں اپنے صحابہ سے بڑھ کر مقام ومرتبہ دینے کا کوئی انتظام کریں تو ہم آپ کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کے ان بے جا مطالبات اوران کی خوش فہمی کو یہ کہہ کر ہمیشہ کیلئے ختم کردیا کہ حق باطل کے مشورے قبول نہیں کرسکتا۔اوراگر ایسا ہوجائے تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوکررہ جائے۔

خاتمۂ کلام پر قریش کو آخرت کی باز پرس سے ڈرایا گیا ہے اور تنبیہ کی گئی ہے کہ انہیں اندازہ نہیں کہ وہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کررہے ہیں ان سے اس کا سخت حساب لیا جائے گا۔انہیں یہ دنیا کی زندگی آج بڑی طویل معلوم ہورہی ہے لیکن جب یہ لوگ قیامت میں اٹھائے جائیں گے تب انہیں اندازہ ہوگا کہ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا چند لمحوں سے زیادہ نہ تھی۔اور دنیا میں انہوں نے جس سرکشی اور لاپرواہی سے زندگی گزاری ہوگی اخروی عدالت کو دیکھ کر سر پیٹیں گے کہ کاش ہم نے دنیا میں اللہ کے نبی کی دعوت کو سنجیدگی سے لیا ہوتا لیکن اس وقت انہیں کوئی پچھتاوا فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان کے شرکاء و شفعاء ان کے کسی کام آئیں گے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۱۸	سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ (۲۳)	رُكُوْعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤى
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ
ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ
نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۪﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ
مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ
اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ
بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ؕ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ

Marfat.com

خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا
عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً
تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾
وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ
فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾ ع

رکوع ۱:۔ بے شک فلاح پائی ہے ایمان والوں نے۔ ۱) (ایمان لانے والے) وہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ ۲) اور وہ لغویات سے احتراز کرتے ہیں۔ ۳) اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے ہیں۔ ۴) وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ۵) بجز اپنی بیویوں اور اپنی کنیزوں کے، سوا اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۶) البتہ! جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۷) اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھنے والے ہیں۔ ۸) اور وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ ۹) یہی وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے۔ ۱۰) اور اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ ۱۱) بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ ۱۲) پھر ہم نے اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مستقر میں رکھا۔ ۱۳) پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیا، پھر اس بوٹی سے ہڈیاں پیدا کر دیں، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو گوشت پہنا دیا، پھر ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔ ۱۴) پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو۔ ۱۵) پھر بلا شبہ تمہیں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ ۱۶) اور ہم نے تمہارے اوپر سات تہہ بہ تہہ آسمان بنائے اور ہم اپنی مخلوق کی مصلحتوں سے بے خبر نہ تھے۔ ۱۷) اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازہ کے مطابق اور پھر ہم نے اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔ اور یقیناً ہم اسے لے جانے پر بھی پوری طرح قادر ہیں۔ ۱۸) پس ہم نے اس پانی سے تمہارے

Marfat.com

لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں (جن سے تم لطف اندوز ہوتے ہو) اور انہیں باغوں سے تم روزی بھی حاصل کرتے ہو۔ ۱۹) اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا ہے جو طورِ سینا سے نکلتا ہے اور تیل لئے ہوئے اگتا ہے اور کھانے والوں کیلئے سالن بھی۔ ۲۰) اور بے شک تمہارے لئے جانوروں میں بھی درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم ان چیزوں کے اندر سے جو ان کے پیٹوں میں ہے تمہیں (خوشذائقہ دودھ) پلاتے ہیں۔ اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ ۲۱) اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے (تم سواری کرتے ہو)۔ ۲۲)

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱

(بے شک فلاح پائی ہے ایمان والوں نے۔ ۱)

اس سورۃ کا آغاز اگرچہ ایک سپاٹ انداز میں کیا گیا ہے۔ لیکن جن کی نگاہوں میں وہ زمانہ اور وہ حالات ہیں جب یہ سورۃ نازل ہوئی ہے تو ان کیلئے سمجھنا مشکل نہیں کہ اس بے تکلف انداز میں درحقیقت کن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حقیقت کا ادراک تو اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو باتیں انسانی فکر بہ ادنیٰ تجسس جان سکتی ہے ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

فلاح کی حقیقت

ا:۔ یہاں فلاح سے مراد درحقیقت وہ فلاح نہیں جس کا تصور اشرافِ قریش کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فلاح دراصل دنیوی عیش و عشرت، تجارت کی وسعت، دولت کی فراوانی، عہدہ و منصب اور شہرت و ناموری کا میسر آنا ہے۔ خدم و حشم کی فراوانی عام انسانوں پر رعب و ہیبت، عرب و بیرونِ عرب قابلِ ذکر قوتوں سے تعلقات، یہ وہ سرمایہ ہے جس کے حاصل ہو جانے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں فلاح میسر آ گئی ہے۔ اس لئے قریش کے چھوٹے بڑے لوگ درجہ بدرجہ چونکہ اس فلاح کے وسائل پر قابض اور ان سے متمتع ہو رہے تھے تو وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں کسی اور فلاح کی ضرورت نہیں۔ فلاح وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں حاصل ہے۔ لیکن اس کے برعکس مسلمان جس زبوں حالی سے گزر رہے تھے اور رفتہ رفتہ جس طرح ان کے مالی حالات قابلِ رحم ہوتے جا رہے تھے اور ان میں بیشتر لوگ نانِ شبینہ کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے اور روز بروز حوائجِ دنیا ان کے لئے ایک مسئلہ بنتی جا رہی تھیں۔ قریش کی نگاہوں میں یہ لوگ ہر طرح کی فلاح سے محروم اور نہایت بدنصیب لوگ تھے۔ اس آیت کے حوالے سے اس غلط تصور پر چوٹ لگائی جا رہی ہے کہ تم جن چیزوں کو فلاح و کامرانی کی علامت سمجھتے ہو ان کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

دولت و حشمت، عہدہ و منصب، اسباب و وسائل، انسان کی ضروریات تو ہیں، نہ یہ حقیقتِ انسان ہیں اور نہ مقاصدِ انسان۔ ان کی کمی بیشی سے صبر و شکر کی صفات تو ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن انسان کی حقیقتِ نفس الامری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قومیں جب بھی سرافراز

Marfat.com

ہوتی ہیں وہ ہمیشہ مقاصد سے وابستگی، کردار کی پختگی، اخلاق کی توانائی اور قلب ونگاہ کی روشنی سے ہوتی ہیں، وسائل واسباب سے نہیں۔ انقلاب کا سیل غریب کے جھونپڑے سے نکلتا ہے، جس میں امیروں کے محلات بہہ جاتے ہیں۔ دنیا کا بناؤ ہمیشہ انسان کے بناؤ کا مرہونِ منت رہا ہے اور دنیا کا بگاڑ انسان کے بگاڑ کا نتیجہ۔ اقبال نے خوب کہا۔

تیری روح میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

۲:۔ دوسری بات جس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول دنیا میں جس دین کی دعوت لے کر آتے ہیں اس کا مرکزی موضوع یا ہدف انسان کی اصلاح ہوتا ہے۔ اگر کوئی دعوت بہتر سے بہتر انسان تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دعوت صحیح، برحق اور منجانب اللہ ہے۔ لیکن اگر وہ انسان کی تعمیر کردار کی بجائے کچھ اور قسم کے احساسات اور اذواق ومیلانات، انسان کے اندر پیدا کردیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعوت ناکام بھی ہے اور کاذب وفاسد بھی۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ کی سرزمین پر جن لوگوں کو سب سے پہلے اپنی دعوت اور تبلیغ کا ہدف بنایا ان میں عقیدہ وعمل کی کوئی ایسی خرابی نہیں، جو نہ پائی جاتی ہو۔ اور سیرت واخلاق کا کوئی ایسا فساد نہیں جس کی وہ علامت نہ ہوں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی دعوت کے نتیجے میں جو لوگ ایمان لائے، پیشِ نظر رکوع میں ان کی صفات کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے اور یہ مرقع ایسا ہے جس کی صحت وصداقت میں دشمن کو بھی کوئی شبہ نہیں ان میں سے ایک ایک شخص ان تمام صفات سے موصوف ہے۔ ان کا وجود اور ان کی صفات اس بات کی دلیل ہیں کہ جس دعوت نے ایسے حیران کن لوگ تیار کیے ہیں جو انسانی پتھروں کے ڈھیر میں چمکنے والے ہیروں سے کم نہیں، وہ دعوت یقیناً حق کی دعوت ہے اور جس عظیم شخصیت نے اپنی تربیت کے زور سے ان لوگوں کو تیار کیا ہے، اس کے رسولِ برحق ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے زندگی کے بہت سے معیارات بنا رکھے ہیں۔ اور انہیں معیارات کو برحق اور قابلِ عمل سمجھتے ہوئے اہلِ دنیا انہیں بروئے کار لانے میں مصروف ہیں۔ اسی کا ایک نمونہ قریش کی فکر اور ان کی زندگی ہے۔ وہ اس سے مختلف کسی پیمانہ فکر اور کسی زاویۂ نگاہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن یہ تمام وہ معیارات ہیں جس نے دنیا کو دکھوں سے بھر دیا ہے اور زمین میں جابجا فساد پھیل گیا ہے۔ انسان ان کے برے نتائج کے زخم سہہ رہا ہے۔ لیکن صحیح اور مفید زاویۂ نگاہ اس کے سامنے نہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا نمونہ جو لوگوں کو اپیل کرسکے دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی تاریکی اور ایسی بے بسی میں اچانک یہ نغمۂ سرمدی آسمان سے اترتا ہے اور لوگوں کے سامنے زندگی کی ایسی تصویر رکھ دیتا ہے، جس کا عنوان فلاح وکامرانی ہے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جس فلاح کا ذکر کیا گیا ہے اس کے حوالے سے دو باتیں جاننا بہت ضروری ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اس فلاح سے مراد صرف فلاحِ اخروی نہیں۔ اگرچہ ایک مومن کیلئے حقیقی مقصود یہی فلاح ہے اور وہ اسی فلاح کے حصول کیلئے اپنا مال ودولت، اپنا عیش وآرام، حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی قربان کردیتا ہے اور اس قربانی کو بھی کامیابی کا زینہ سمجھتا ہے۔ لیکن اللہ کی طرف سے اصحابِ ایمان کو جس فلاح وکامرانی کا مژدہ سنایا گیا ہے، وہ اخروی کامیابی کے ساتھ ساتھ دنیوی کامیابی بھی ہے۔ جس کا ذکر گزشتہ سورہ میں کیا گیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے تین وعدے فرمائے ہیں اور تینوں کا تعلق دنیا سے ہے اور اس آیتِ کریمہ میں چوتھا وعدہ کیا گیا ہے جس کا تعلق جنت الفردوس سے ہے۔ دنیا میں جو تین وعدے کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

Marfat.com

ا:۔ استخلاف فی الارض ۲:۔ مسلمانوں کیلئے ان کے دین کا تمکن ۳:۔ خوف کی بجائے امن

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ میں تینوں وعدے پورے فرمائے۔ اسی طرح جنت الفردوس کے وعدے کے ایفا میں بھی کوئی شبہ نہیں۔

دوسری بات فلاح کے حوالے سے جس کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اخروی فلاح کا وعدہ ظاہر ہے مستقبل میں یعنی قیامت میں فرمایا ہے۔ لیکن اس کو تعبیر ماضی کے صیغے سے کیا گیا ہے، جس سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں کو جنت اگرچہ قیامت کو ملے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چونکہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے اس جنت کا ملنا اس طرح قطعی اور یقینی ہے جیسے یہ وعدہ پورا ہو چکا ہو۔ جو بات ہو چکتی ہے وہ ماضی بن جاتی ہے اور جو ہونے والی ہوتی ہے وہ مستقبل ہوتی ہے۔ یہاں ماضی کا صیغہ لانے سے اس کی قطعیت کا اظہار ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝۲

((ایمان لانے والے) وہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ ۲)

اہلِ ایمان کی پہلی صفت

خشوع کا معنی ہے ''عاجزی، تذلل، نیاز مندی، کسی کے سامنے جھک جانا، دب جانا''۔ آدمی جب کسی عظیم ذات یا پر ہیبت شخصیت کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اس کی عظمت اور اس کی ہیبت سے مرعوب ہو جاتا ہے اور اگر وہ عظمت اور ہیبت حقیقی اور واقعی ہے تو پھر یہ مرعوبیت انکساری، عاجزی اور تذلل صرف اس حد تک محدود نہیں رہتا کہ اس کے سامنے گردن جھک جائے، جسم خم ہو جائے، کندھے سکڑ جائیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی سرافگندہ ہو جاتا ہے۔ نماز میں خشوع اسی کیفیت کا نام ہے۔ حضرتِ حسن رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ جب آپ نماز کیلئے وضو کرتے ہیں تو رنگت اڑ جاتی اور چہرے پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ لوگوں نے پوچھا: وضو کرتے ہوئے آپ کی یہ کیفیت کیوں ہوتی ہے؟ فرمانے لگے کہ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ وضو دراصل اللہ کی بارگاہ میں حاضری کی تیاری ہے جیسے جیسے وہ حاضری کا وقت قریب آتا جاتا ہے تو مجھ پر ایک ہیبت طاری ہوتی جاتی ہے۔ یوں تو آدمی ہر وقت اللہ کے سامنے ہے لیکن نماز میں چونکہ بطورِ خاص آدمی خود اللہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے اس لئے خشوع کا تقاضا یہی ہے کہ اس پر یہ کیفیت طاری ہو اور اگر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی نماز خشوع سے خالی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: لو خشع قلبه خشعت جوارحه " اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جسم پر بھی خشوع طاری ہوتا''۔ اس کی عملی صورت وہی ہے جس کا ذکر صاحبِ تفسیر مظہری نے کیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

الخشوع فی الصلوة ھو جمع الھمة لھا والاعراض عما سواہ والتدبر فی ما یجری علی لسانه من القراءة والذکر (مظہری)

''نماز میں خشوع کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ساری توجہ نماز میں مرکوز کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے منہ پھیر لے اور وہ اپنی زبان سے جو تلاوت اور ذکر کرتا ہے ان کے معنی پر غور و تدبر کرے''۔

Marfat.com

اگر ایسی کیفیت نماز پڑھنے والے پر طاری ہو جاتی ہے تو خود بخود اس کے اندر وہ تمام احتیاطیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہمیں شریعت نے سکھائی ہیں۔ لیکن انسان چونکہ کمزور واقع ہوا ہے اس لئے شریعت نے نماز کے کچھ ایسے آداب مقرر کر دیئے ہیں جو خشوع پیدا کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتے ہیں اور انہیں سے اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے کہ خشوع کی کیفیت کیا ہے۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ آدمی دائیں بائیں نہ مڑے اور نہ سر اٹھا کر اوپر کو دیکھے۔ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک نگاہ سجدہ گاہ سے متجاوز نہیں ہونی چاہئے۔ نماز میں کھیلنا اور مختلف سمتوں میں جھکنا بھی ممنوع ہے۔ کپڑوں کو بار بار سمیٹنا یا ان کو جھاڑنا یا ان سے شغل کرنا بھی ممنوع ہے۔ اس بات سے بھی باخبر کیا گیا ہے کہ آدمی اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت نہ دے۔ اپنی انگلیاں نہ چٹخائے۔ اپنے کپڑوں کو نہ سمیٹتا رہے۔ سجدہ میں جائے تو اپنے سجدہ کی جگہ کو ہاتھوں سے صاف نہ کرتا رہے۔ تعدیلِ ارکان کی پابندی کرے۔ نماز میں اگر کوئی چیز اذیت دے رہی ہو تو اسے ایک ہاتھ سے دفع کیا جاسکتا ہے مگر بار بار ہاتھوں کو حرکت دینا یا دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾

(اور وہ لغویات سے احتراز کرتے ہیں۔ ۳)

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

لغو سے مراد ہر وہ قول اور فعل ہے جو زندگی کے اصل مقصود یعنی رضائے الٰہی سے غافل کرنے والا ہو۔ اسلامی تربیت اور نماز کی پابندی انسان کی سیرت و کردار میں ایسی یک جہتی اور یکسوئی پیدا کرتی ہے کہ اس کا راستہ صراطِ مستقیم بن جاتا ہے۔ وہ اس صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا دائیں بائیں دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کی تمام توجہات رضائے الٰہی کے حصول پر مرکوز رہتی ہیں۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کو زندگی کے مقصد کے مطابق گزارنا فرض سمجھتا ہے۔ اسے ہمیشہ یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ اگر میں کسی ایسی دلچسپی میں کھو گیا جس سے میری منزل کھوٹی ہو گئی یا کسی ایسے کام میں اپنی صلاحیتیں صرف کر ڈالیں جو صلاحیتوں کا صحیح مصرف نہیں تھا تو میں اپنے اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: من حسنِ اسلام المرء ترکه مالا یعنیه ''ایک آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس میں نہ دنیا کا بھلا ہے نہ دین کا''۔ اس لئے ایک مومن اگر کبھی کسی ایسی جگہ سے گزرتا ہے جہاں کوئی ایسا لغو کام ہو رہا ہو تو وہ اس کی طرف توجہ کئے بغیر گزر جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود کسی جگہ جا رہے تھے۔ راستے میں کوئی تقریب منعقد ہو رہی تھی جس میں لغویات بھی جاری تھیں۔ آپ کو معلوم نہ تھا کہ مجھے ایسی جگہ سے گزرنا پڑے گا۔ اب چونکہ گزرنا ناگزیر تھا تو آپ نے چادر سے اپنا منہ سر لپیٹ لیا اور چکر کاٹتے ہوئے ایک طرف سے گزر گئے۔ کسی مسلمان نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسے بیان کیا۔ تو آپ نے خوش ہو کر فرمایا: واذا مروا باللغو مروا کراماً ''اور جب وہ کسی لغویات سے گزرتے ہیں تو وقار سے گزر جاتے ہیں''۔ یعنی ادھر متوجہ ہوئے بغیر نہایت بے نیازی سے گزر جاتے ہیں۔

صاحبِ ایمان لوگوں کو ایمان جو یکسوئی عطا کرتا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب وہ اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں مخالفین کے پاس جاتے تو وہ اسلام کے بارے میں قسم قسم کے سوالات اٹھاتے اور طرح طرح کی بیہودگی سے کام لیتے۔ کبھی ان کی غربت کو ہدفِ طعن بنایا جاتا اور کبھی انہیں آنے والے دنوں میں مختلف خطرات اور مصائب کے پیش آنے سے ڈرایا جاتا۔ ان کی زبانیں بچھوؤں کی طرح

Marfat.com

زہر اگلتیں۔لیکن یہ ایمان کی دولت سے مالا مال لوگ ان کی کسی قسم کی ژاژ خائی کی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنے مقصدی کام سے اور زیادہ لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اور کر رہے ہو تمہیں بہر حال اللہ کے ہاں اس کا جوابدینا ہے۔اور ہم اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہیں اس لئے آپ کی بیہودہ باتوں کا کوئی جواب دینا پسند نہیں کریں گے۔قرآنِ کریم نے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا: واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم ''اور جب وہ کوئی فضول بکواس سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارے اعمال''۔

لیکن اس صدمۂ جانکاہ کا شکوہ کس سے کریں؟ کہ جس امت کا ایک ایک لمحہ اللہ کی رضا کا امین تھا اور وہ اپنے وقت کا کوئی حصہ مقصد سے بیگانہ ہو کر گزارنے کا تصور بھی گناہ سمجھتی تھی اب اس کے معمولات ایسے ہو گئے ہیں جس میں وقت کی قدر و قیمت کا دور دور تک پتہ نہیں۔تفریح سے اسلام نے نہیں روکا لیکن ایسی تفریح جو پانچ پانچ دن جاری رہے اور جو تفریح زندگی کے مقاصد پر غالب آجائے اور زندگی کی ہر سنجیدگی جس کے سامنے دم توڑ جائے،نوجوان علم کے حصول پر اسے ترجیح دینے لگیں،اور یا ایسی تفریح جس میں گردنیں کٹیں، سڑکوں پر قتلِ عام ہو،چھتوں پر شیطان چڑھ کر ناچے،شرم وحیا کا جنازہ نکل جائے،ان لغویات میں اس امت کی دلچسپی صدمۂ جانکاہ نہیں اور کیا ہے؟ان لغویات کی گہرائی اور گیرائی کو دیکھ کر اقبال یاد آتا ہے۔اس نے کہا تھا۔

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دَیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ ۴

(اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے ہیں۔ ۴)

زکوٰۃ دوسرا ستون ہے

اصحابِ ایمان کی تیسری صفت زکوٰۃ کی صورت میں بیان کی جارہی ہے۔قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ پروردگار نے مسلمانوں کی تعمیرِ کردار،شیرازہ بندی،اللہ تعالیٰ اور دین سے گہری وابستگی اور انتہا درجے کا نظم وضبط،پیدا کرنے کیلئے نماز کا جابجا حکم دیا ہے۔اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں بیشتر مواقع پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین کا دوسرا ستون ہے۔انبیائے کرام کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے بالعموم یہ بات ضرور کہی ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے یعنی نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانی کمزوریوں میں ہوائے نفس نے جو مظاہر پیدا کئے ہیں اس کی اکثر صورتوں کا علاج تو نماز سے ہو جاتا ہے۔لیکن جہاں تک حبِّ مال اور اس کے نتیجے میں انسانی حقوق سے لاپرواہی بلکہ بے رحمی اور شقاوت کا تعلق ہے اسے دور کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کیونکہ جو شخص زکوٰۃ کی حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے وہ مال کی محبت میں غیر متوازن نہیں ہوتا۔اسی طرح مالی طور پر محتاج لوگوں کی جو ضرورتیں امراء کی دولت سے متعلق ہیں ان سے صرفِ نظر نہیں کرتا۔وہ جانتا ہے کہ جس طرح اپنے دل و دماغ اور اعضاء و جوارح کی ترجیحات کا جواب اللہ کے سامنے دینا ہے اسی طرح بندوں کے حقوق اور ان کے تعلق کے حوالے سے بھی سخت باز پرس کا اندیشہ ہے اور اسلام کا اصل حسن ہی یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنے ماننے والوں کو اللہ کے آستانے پر جھکا کر اللہ

Marfat.com

کے دامن سے وابستہ کر دیتا ہے۔اسی طرح زکوٰۃ کے ذریعے مالداروں کو غریبوں کے ساتھ مربوط بھی کرتا ہے۔اس طرح ایک مسلمان خلق اور خالق دونوں سے صحیح بنیادوں پر اپنے تعلق کو استوار کر لیتا ہے۔

زکوٰۃ سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے

یہ سورۃ چونکہ مکی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ زکوٰۃ قانونی اور اصطلاحی حیثیت سے مدینہ منورہ میں فرض ہوئی۔اس لئے اس سورۃ میں زکوٰۃ کا لفظ اصطلاحی معنوں میں مراد نہیں لیا جا سکتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم نے مکی سورتوں میں بھی بیشتر مواقع پر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اور اس کی ترغیب بھی دی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی زکوٰۃ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ جس طرح نماز باجماعت اجتماعیت کی روح اور اللہ سے مضبوط تعلق کو پیدا کرتی ہے اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ غریبوں اور امیروں کو اجتماعیت کا درس دیتا اور باہمی روابط کو مضبوط کرتا ہے۔اگر چند آدمی اکٹھے بیٹھ کر اللہ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ان میں سے صاحبِ استطاعت غریب اور محتاج کو اپنے کھانے میں شریک نہیں کرتے تو ان کے اندر حقیقی وحدت پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ ہم ایک امت کے افراد ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے اعضاء کی مانند ٹھہرایا ہے۔اس لئے یہاں انفاق فی سبیل اللہ اصحابِ ایمان کی صفت کے طور پر بیان فرما کر ان کی حقیقی قوت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کا ایک اور مفہوم

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اصحابِ ایمان کیلئے صفت کے طور پر یہ نہیں کہا گیا کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآنِ کریم کے مختلف مواقع پر مستعمل الفاظ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ کی صورت میں اس صفت کو ذکر فرمایا جاتا۔نئی تعبیر اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ دونوں تعبیروں کے معنی میں بہت اختلاف ہے۔پیشِ نظر تعبیر میں معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کو بطور مصدر کے استعمال کیا گیا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اصحابِ ایمان وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کیلئے کوشش کرنے والے لوگ ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ زکوٰۃ کے طریقے پر عمل کرنے والے لوگ ہیں۔زکوٰۃ کا لفظی معنی ''پاک اور صاف کرنا'' ہے۔عربی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ایک ہے ''پاکیزگی'' اور دوسرا ہے ''نشوونما''۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ صاحبِ ایمان اپنے ایمان کے جوہر کو جب ترقی دینا چاہتا ہے تو کچھ قوتیں ہیں جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ہوائے نفس اپنا زور لگاتی ہے، مفادات کی ماری ہوئی عقل اپنے لئے راستہ نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ہر شخص کے دل میں بیٹھی ہوئی مفادات کی ہوس پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔جو شخص ایمان کے مطابق اپنی زندگی کو اس راستے پر چلانا چاہتا ہے جس کی طرف اس کا ایمان راہنمائی کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان رکاوٹوں سے اپنے ایمان کو پاکیزہ کرتا ہے۔اس لحاظ سے زکوٰۃ کا تعلق صرف مال و دولت سے نہیں بلکہ نفس، اخلاق، زندگی اور ایسی ہی دوسری ہی چیزوں سے بھی ہے۔ان تمام کو اس جوہرِ ایمان سے آراستہ کرنا اور مخالف قوتوں سے ان کو بچانا بلکہ انہیں ان کے سامنے زیر کر دینا یہ پہلا مرحلہ ہے جس سے ایمان کا راستہ آسان ہو جاتا ہے اور دوسرا معنی ہے جوہرِ ایمان کو نشوونما دینا۔یعنی قرآن وسنت سے ایمان کے جو تقاضے ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک ایک کو جلا دینا اور پروان چڑھانا ہے۔اس میں فرض نمازوں کے ساتھ ساتھ قیامِ لیل اور دن کی مختلف نمازیں بھی شامل ہیں۔فرض زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانا ہے۔اپنے باطن کی صفائی کیلئے صیامِ رمضان کے ساتھ ساتھ نفلی روزوں کی عادت ڈالنا بھی ہے۔لوگوں کی مالی

Marfat.com

معاونت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ ہر طرح کی مروت، ہمدردی اور غمگساری بھی شامل ہے۔ جس میں عیادتِ مریض بھی ہے، حقِ ہمسائیگی بھی ہے، حقِ قرابت بھی ہے، گرے ہوئے لوگوں کی ہر طرح مدد کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ اصلاح کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس میں اپنی ذات، اپنے احباب، اپنے اقربا اور گردوپیش کی ساری زندگی شامل ہے۔ ان تمام کو لادینیت اور بدعملی کی آلائشوں سے پاک کرنا اور اسلامی اقدار اور ایمانی انوار کو فروغ دینا اصحابِ ایمان کی وہ صفت ہے جسے زکوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝٥

(وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ۵)

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

اصحابِ ایمان کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یعنی جسم کے وہ حصے جنہیں چھپانا ضروری ہے۔ انہیں کھولنے اور عریاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ نہ وہ دوسروں کے ستر پر نگاہ ڈالتے ہیں اور نہ اسے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کے ستر پر نگاہ ڈالے۔ آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"کوئی شخص مجھے عریاں حالت میں دیکھے یعنی اس کی نظر میرے ستر پر پڑے اس سے بہتر ہے کہ مجھے آسمانوں سے گرا دیا جائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں"۔

اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر ہاتھ پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارا جسم ہے۔ اب اس کی شکایت کس سے کی جائے کہ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ کی بیٹیاں مختلف کھیلوں میں شریک ہو کر ٹی وی پر اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہیں اور ڈراموں اور کمرشل میں کام کرنے والی بہو بیٹیاں اپنے ناز و انداز، اپنے جسم کے مختلف زاویوں اور اپنی اداؤں سے دنیا کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ ہم کرسٹن کیلر کی امت سے تعلق رکھتی ہیں، ہمارا فاطمہ اور عائشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر تو بعض دفعہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

بانجھ ہو جائیں زمینیں لڑکیاں پیدا نہ ہوں
اے خدا شہناز گل سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں
پھول پیدا ہوں مگر شاخوں کی آرائش رہیں
لڑکیاں پیدا ہوں لیکن تتلیاں پیدا نہ ہوں

اور جہاں تک مردوں کا تعلق ہے انہوں نے فری سٹائل کشتیوں، کبڈی اور بعض دوسری کھیلوں سے امتیاز ہی ختم کر ڈالا ہے کہ مرد کا بھی کوئی ستر ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ یعنی صنفی معاملات میں آزادی نہیں برتتے۔ شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اس کے استعمال میں بے لگام نہیں ہوتے۔ وہ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔

Marfat.com

اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ﴿۶﴾
فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ۚ﴿۷﴾

(بجز اپنی بیویوں اور اپنی کنیزوں کے، سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ۶)
البتہ! جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ ۷)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

سابقہ آیتِ کریمہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جو اصحابِ ایمان اور اللہ والے ہوتے ہیں وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ وہ جنسی تعلق کو اپنے لئے ایک عیب سمجھتے ہیں۔ وہ بالکل راہبوں اور جوگیوں کی طرح زندگی بھر نہ شادی کرتے ہیں اور نہ کسی اور طرح اس تعلق کے قریب جاتے ہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ بیویوں اور کنیزوں کے سوا صنفی تعلق کسی اور سے قائم نہیں کرتے۔ وہ چونکہ اپنے اللہ پر ایمان لائے ہیں اس کی شریعت کو انہوں نے اپنا دستور العمل بنایا ہے اور اس کے رسول کو اپنا آئیڈیل اور اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اس لئے جہاں اس کی شریعت کسی چیز کی اجازت دیتی ہے تو وہ اجازت کو اپنے لئے ذریعۂ فلاح سمجھتے ہیں اور جہاں کسی چیز سے روکتی ہے تو اس سے رک جانے کو اللہ کی رضا کا راستہ جانتے ہیں۔ وہ اپنے صنفی تعلقات میں نہ تو بالکل سانڈھ بن جاتے ہیں کہ آبروئیں برباد کرتے پھریں اور انسانی معاشرے کو لاعلاج امراض کا شکار کر دیں اور نہ وہ اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں لگا کر رہبانیت کا راستہ اختیار کر کے فطرت سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ نے انہیں نکاح کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ وہ اپنی بیویوں سے صنفی تعلق قائم کریں۔ اسی طرح لونڈیوں اور کنیزوں سے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ایک وقت میں یہ بھی اسلامی معاشرے کی بہتری اور اصلاح کیلئے بہت ضروری تھا۔ بیوی سے یہ تعلق اس لئے جائز ہے کہ نکاح کو جائز طریقہ قرار دیا گیا ہے اور لونڈی سے اس تعلق کے جواز کا سبب یہ ہے کہ باقاعدہ قانونی حیثیت سے لونڈی اپنے آقا کی ملک میں آتی ہے اور وہ ملک اس کے آقا کو اس سے تمتع کا حق دیتی ہے۔ لیکن اب چونکہ غلامی کا دور گزر گیا ہے اسلام نے اپنی ہمہ گیر کوششوں سے غلامی کو ختم کر ڈالا ہے اس لئے ازسرِ نو ان بحثوں کو زندہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تو بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں صنفی ضرورت ان کا فطری تقاضا ہے۔ اللہ نے اس تقاضے کو قانونی شکل دے کر نکاح اور ملک کی صورت میں اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن جو شخص ان دونوں جائز طریقوں سے تجاوز کرتا ہوا کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں شمار ہوگا اور اسلامی شریعت میں حد سے تجاوز کو زنا کہا گیا ہے جس پر حدِ زنا جاری کی جاتی ہے۔

متعہ کا رد

بعض علما نے انہیں آیات سے متعہ کی حرمت کو ثابت کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک مومن کیلئے صنفی خواہشات کی تکمیل کے دو ہی طریقے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے جائز ٹھہرایا ہے۔ ایک ہے ''منکوحہ بیوی'' اور دوسری ہے ''مملوکہ لونڈی''۔ اس کے علاوہ تیسری ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں صنفی تعلق پیدا کیا جا سکے۔ جو شخص کسی عورت سے متعہ کرتا ہے تو یہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور جہاں تک بیوی ہونے کا تعلق ہے اسے بیوی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ

Marfat.com

زوجیت کے لئے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے، نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اس کے لئے عدت ہے، نہ طلاق۔ نہ نفقہ، نہ ایلاء اور ظہار اور لعان وغیرہ۔ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔ پر جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ کچھ اور میں شمار ہوگی۔ جس کے طالب کو قرآن حد سے گزرنے والا قرار دیتا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''المامون'' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ خلیفہ مامون اہلِ تشیع کے دلائل سے متاثر ہو کر متعہ کے جواز کا قائل ہو گیا اور اس نے شہر میں متعہ کے جواز کا اعلان کرنے کا حکم دیا۔ جب شیخ الاسلام کو علم ہوا تو وہ خلیفہ کے پاس آئے اور اس سے آکر بات کی اور انہیں آیات سے استدلال کیا اور مامون سے پوچھا کہ ممتوعہ عورت لونڈی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو کیا بیوی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو شیخ الاسلام نے کہا کہ اس کے علاوہ تو ہر تعلق قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کو حد سے تجاوز کرنے والا قرار دیا ہے۔ مامون کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دوبارہ شہر میں متعہ کے حرام ہونے کا اعلان کرایا گیا۔

اہلِ تشیع کی جسارت

اہلِ تشیع متعہ کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے فضائل بیان کرنے میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ پیشِ نظر آیات کی موجودگی میں میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن دلائل سے قطع نظر ایک بات نہایت حیران کن ہے کہ جس کام کو وہ فضیلت اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے ہیں اسی کام کو وہ اپنی بچیوں اور اپنی بہنوں کیلئے کبھی سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بازاری عورتوں کا ایک بازار لگا رہے؟ یا طبقۂ امراء کے لوگ غریب بچیوں سے متعہ کے نام پر عیاشی کرتے رہیں؟ اگر ایک فعل ایک خاندان کیلئے باعثِ ننگ وعار ہے تو دوسرے کسی خاندان کیلئے باعثِ عزو وقار کیسے ہو سکتا ہے؟

اہلِ تشیع کی جسارت کا عالم تو یہ ہے کہ وہ تو نبی کریم ﷺ کے خاندان کو بھی اس سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ضیاء القرآن کے محترم مصنف نے ایک حوالہ دیا ہے ہم نہایت شرم کے احساس کے ساتھ اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

> اس مسئلہ کی تحقیق کرتے ہوئے جب میری نظر شیعہ کی مشہور کتاب تہذیب الاحکام جلد ۷ صفحہ ۲۷۱ مطبوعہ نجف اشرف باب تفصیل احکام النکاح جس کے مصنف شیخ الطائفہ ابی جعفر الطوسی ہیں کی اس عبارت پر پڑی ولا بأس بالتمتع بالهاشمية کہ خاندانِ نبوت کی خواتین کے ساتھ بھی متعہ کرنے میں حرج نہیں تو نہ پوچھئے مجھ پر کیا گزری۔ میرا سر چکرانے لگا اور آنکھوں میں خون اتر آیا اور میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ مذہب ان لوگوں کا ہے جو اہلِ بیت پاک کی محبت اور تعظیم وتکریم کو اپنا دین وایمان بتاتے ہیں؟ کیا اس دعویٰ محبت کی یہ حقیقت ہے؟ کیا تعظیم وتکریم کے مدعی اتنی گستاخی کے جواز کا فتویٰ دے سکتے ہیں؟ العياذ بالله العياذ بالله تعالىٰ

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ ۝٨

(اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھنے والے ہیں۔ ۸)

Marfat.com

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

اہلِ ایمان کی پانچویں اور چھٹی صفت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ اپنی امانتوں کا پاس رکھنے والے ہیں۔ امانت کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرمائی ہیں یہ اس کی انسانوں کے پاس امانتیں ہیں۔ زندگی سب سے بڑی امانت ہے۔ جوانی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اپنی اہمیت کے پیشِ نظر الگ سے اسے امانت کا درجہ دیا گیا ہے۔ مال و دولت بھی اللہ کی امانت ہے اور مال و دولت کے حصول کی صلاحیت بھی اللہ کی امانت ہے۔ ذہنی صلاحیتیں حصولِ علم کے ذرائع اور پھر اسے عام کرنے کی کوششیں بھی اللہ کی امانت ہیں۔ ان سب کے بارے میں الگ الگ پوچھا جائے گا کہ تم نے ان امانتوں کا حق کیسے ادا کیا؟ کیا یہ امانتیں امانتیں رکھنے والے کی ہدایت کے مطابق صحیح مصرف میں صرف کی گئیں یا ان میں خیانت کی گئی؟ اسی طرح اولاد بھی اللہ کی امانت ہے۔ عہدہ و منصب بھی اللہ کی دین ہے۔ وجاہت اور شخصیت بھی اللہ کا عطیہ ہے۔ ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسی طرح انسان جو ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھواتے ہیں یا دوسروں کے جو حقوق کسی شخص کے ذمہ عائد ہوتے ہیں یہ بھی امانت کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان ان تمام امانتوں کو اللہ کا حق جان کر ادا کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

اصحابِ ایمان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ عہد کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں۔ عہد میں وہ تمام عہد و میثاق شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لئے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطے سے اپنی شریعت کی شکل میں اس دنیا میں لئے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں شامل ہیں جو ہم نے ایمان کی صورت میں اپنے اللہ سے کئے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام معاہدات اور تمام قول و قرار جو ہم نے مختلف قوموں اور مختلف افراد سے کئے ہیں، خواہ وہ تحریری شکل میں ہوں یا زبانی حد تک یا معاشرے کے معروف کی صورت میں ہم اسے قبول کر چکے ہیں یہ تمام بھی عہد و میثاق میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایسی تمام امانتوں اور تمام عہد و میثاق کی پاس داری کا حکم دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا شاید ہی کوئی خطبہ ایسا ہو گا جس میں آپ نے یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: لا ایمان لمن لا امانة له ''اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت کی پابندی نہیں''۔ اور لا دین لمن لا عهد له ''اور اس آدمی کا کوئی دین نہیں جس میں عہد کی پاسداری نہیں''۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے منافق کی علامتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ چار خصلتیں ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے۔ جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ۱:۔ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ۲:۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔ ۳:۔ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ ۴:۔ اور جب کسی سے جھگڑے تو اخلاق و دیانت کی ساری حدیں پھلانگ جائے۔ وہ اصحابِ ایمان جنہیں اللہ نے کامیابی سے نوازا ہے وہ امانتوں کی بھی پاسداری کرتے ہیں اور عہد و میثاق کا بھی پاس کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹

(اور وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ ۹)

Marfat.com

ایک اور صفت کا بیان

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ایمان کی ایک اور صفت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ ان صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع ہوا تھا اور نماز ہی پر ختم کیا جا رہا ہے۔ البتہ! فرق یہ ہے کہ پہلے نماز کی روح یعنی نماز کے اندر خشوع کا ذکر کیا گیا تھا اور اب نماز کی محافظت یعنی اس کی دیکھ بھال اور اس کے اہتمام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلے صلوٰۃ کے لفظ کو واحد لایا گیا تھا اور اس آیت میں جمع لایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں جنسِ نماز مراد تھی اور یہاں ایک ایک وقت کی نماز فرداً فرداً مراد ہے۔ نماز جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو اگر اس میں خشوع نہیں تو وہ روح سے خالی نماز ہے۔ جس سے نماز کی صورت تو وجود میں آ سکتی ہے نماز کی حقیقت نہیں اور صرف کسی چیز کی صورت حقیقت کے بغیر دیر تک باقی نہیں رہا کرتی۔ اور یہ صورت سے حقیقت کا سفر تب ممکن ہوتا ہے جب صورت اور سیرت دونوں کی محافظت کی جائے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے جیسے صورت بہتر ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے اور جیسے جیسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے صورت کے اہتمام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اصل توجہ سب سے پہلے صورت پر ہوتی ہے جس کے اندر سے حقیقت وجود میں آتی ہے۔ اس لئے اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں یعنی اس کے ایک ایک پہلو کی نگہداشت کرتے ہیں۔ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، اور ارکان و اجزاءِ نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری طرح نگہداشت کرتے ہیں۔ نماز کی تیاری کیلئے صاف کپڑوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جسم کی پاکیزگی کا خیال کرتے ہیں۔ وضو، سنن، مستحبات اور آداب کے اہتمام کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ نماز کبھی وقت ٹال کر نہیں پڑھتے۔ جب تک ایک رکن کی ادائیگی نہیں ہو جاتی دوسرے رکن کی طرف انتقال نہیں کرتے۔ یعنی تعدیلِ ارکان کا اہتمام رکھتے ہیں۔ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔ اس کے معنی اور مفہوم پر توجہ دیتے اور اپنے دل میں اسے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتی الامکان نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وقت سے پہلے مسجد میں پہنچتے ہیں اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکلتے ہیں۔ دل ان کا مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔ جب تک نماز میں رہتے ہیں یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے سامنے ہیں۔ ان کے دل پگھلتے اور آنکھوں سے آنسو برستے ہیں۔ اس طرح سے خشوع کی طرف ان کا سفر جاری رہتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نماز باغِ جنت کا پودا ہے اس کی طرف سے ذرا سی غفلت اور ناقدری اس کے بے ثمر ہونے کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر اسے پورے اہتمام سے قائم رکھا گیا تو دین کا ایک ایک ستون باقی رہے گا اور اگر اس کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی تو دین کی عمارت کو کسی وقت بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ مَنْ اَقَامَهَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَ مَ الدِّيْنَ

"نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کو ڈھا دیا"۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١﴾

(یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے۔ ۱۰) اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۱)

Marfat.com

فردوس کی وراثت کے اصل حقدار

وہ اہلِ ایمان جو متذکرہ بالا صفات سے موصوف ہوں گے اور زندگی بھر انہوں نے اپنے اندران صفات کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے میں محنت کی ہوگی تو وہ اپنے اس ایمان وعمل کے باعث اللہ کے فضل کے مستحق ٹھہریں گے۔ جس کا نتیجہ اور ثمرہ یہ ہوگا کہ اللہ انہیں وہ جنت عطا فرمائے گا جس سے ان کے جدِ امجد کو نکالا گیا تھا۔ چنانچہ اب وہ اپنے جدِ امجد سمیت اس میراث کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے کیونکہ وہ دنیا میں اپنے باپ کے اور اپنے ازلی دشمن شیطان کو دنیا میں شکست دے کر جنت میں داخل ہوں گے۔ اس لئے اب انہیں نکالے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ وہاں شیطان کی دسترس کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ وہ اپنے اللہ کی عظیم نعمتوں سے سرافراز کیے جائیں گے۔

فردوس جنت کا اعلیٰ ترین مقام ہے اور اس سے وہ لوگ نوازے جاتے ہیں جو اپنی مسلسل قربانیوں، ایمان پر استقامت اور اعمال واخلاق کی بہترین خوبیوں کے باعث اللہ کا اعلیٰ ترین قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

فردوس کے اعلیٰ ترین مقام ہونے کے باعث تمام سابقہ امتوں میں بھی اس لفظ کا استعمال ملتا ہے اور تمام انسانی زبانوں میں تلفظ کے اختلاف کے باوجود مشترک طور پر اس کا مادہ پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں ''پروِیشا'' قدیم کلدانی زبان میں ''پرویسا'' قدیم ایرانی زبان (ژند) میں ''پیری دائزا'' عبرانی میں ''پردیس'' ارمنی میں ''پرویز'' سریانی میں ''پردیسو'' یونانی میں ''پاراداِنسوس'' لاطینی میں ''پاراڈائسس'' اور عربی میں ''فردوس''۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کیلئے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو۔ وسیع ہو آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو اور اس میں ہر قسم کے پھل خصوصاً انگور پائے جاتے ہوں بلکہ مختلف زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلامِ جاہلیت میں لفظ فردوس مستعمل تھا اور قرآن میں اس کا اطلاق متعدد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے: کانت لھم جنت الفردوس نزلاً ''ان کی میزبانی کیلئے فردوس کے باغ ہیں''۔ اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾
ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا
الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾

(بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ ۱۲) پھر ہم نے اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مستقر میں رکھا۔ ۱۳) پھر ہم نے اس پانی کی بوند کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنادیا، پھر اس بوٹی سے ہڈیاں پیدا کردیں، پھر ہم نے ان ہڈیوں کو گوشت پہنادیا، پھر ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔ ۱۴)

Marfat.com

آیت کا پس منظر

قرآنِ کریم کے اصل موضوع کی طرح اس سورۃ کا موضوع بھی انسانی افکار و کردار کی اصلاح ہے۔اس اصلاح کے حوالے سے اساسی صداقتوں کی تعلیم بھی دی گئی ہے اور ان کے مطابق تعمیرِ کردار کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس کے قبول نہ کرنے کے نتیجے میں ترہیب سے کام لیا گیا اور برے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ترغیب ہی کے سلسلے میں اسلام کی پیش کردہ اساسی صداقتوں سے وجود میں آنے والے کردار کے نمونوں کو بھی دکھایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ قرآنِ کریم جس طرح کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیشِ نظر صفات سے متصف لوگ ہوتے ہیں اور اسی میں ایک انذار بھی مضمر رکھا گیا ہے۔جو بہ ادنیٰ تأمل سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیم کا نتیجہ ایسے انسان ہیں جو یہاں بھی اور قیامت کے دن بھی اللہ کے افضال وعنایات کے مستحق ٹھہریں گے تو جو لوگ ان باتوں کو قبول نہیں کریں گے بلکہ انکار کی روش اپنا لیں گے وہ یقیناً ایسے برے اوصاف کے حامل ہوں گے جو اللہ کے یہاں دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی ناراضگی کا سبب بنیں گے۔

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں مطلوب انسانوں کی تصویر کشی کی گئی اور ان کے سراپا کو مختلف صفات کے آئینہ میں نمایاں کیا گیا ہے اور پھر اس کے آخر میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہی لوگ اللہ کے یہاں جنت الفردوس کے وارث ہوں گے اور گزشتہ سورۃ میں اس سے پہلے یہ بات ذکر کردی گئی ہے کہ یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ خلافتِ ارضی سے نوازے گا۔جب غور وفکر کرنے والا اس کے دوسرے پہلو پر نظر کرتا ہے تو فوراً اس کے ذہن میں یہ بات سٹرائیک (Strike) کرتی ہے کہ اگر ایسی صفات کے حامل لوگ دنیوی اور خروی کامیابیوں کے مستحق ٹھہریں گے تو جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں گے وہ یقیناً اللہ کی ناراضگی اور اس کے نتیجے میں ناکامیوں سے دوچار ہوں گے۔اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ ان آیتوں میں اگر مسلمانوں کے لئے بشارتیں ہیں تو کافروں کیلئے انذار کا پہلو بھی موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ آیات دلائل کی حیثیت بھی رکھتی ہیں کہ دیکھ لو قرآنِ کریم کی پیش کردہ تعلیم اور تہذیب نے کیسے قابلِ فخر انسان پیدا کئے ہیں۔انہیں دیکھ کر کوئی عقلمند آدمی اس تعلیم کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور مزید یہ بات کہ اسی تعلیم کے نتیجے میں دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا راستہ کھلتا ہے تو جو شخص کامیابی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بہت مشکل ہے کہ ان بنیادی صداقتوں سے صرفِ نظر کرسکے۔

متذکرہ بالا پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ قرآن کی پیش کردہ ان بنیادی صداقتوں کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔جس کے نتیجے میں مکے کے نہایت بگڑے ہوئے ماحول میں ایسے صالح اور صاحبِ کردار انسان وجود میں آئے ہیں جو انسانیت کا سرمایہ ہیں تو دیکھنا چاہئے کہ ان کے انکار کا بنیادی سبب کیا ہے۔چنانچہ پیشِ نظر آیات میں اس بنیادی سبب کو متعین کرتے ہوئے اس کے رد اور انکار کیلئے مختلف دلائل دیئے گئے ہیں۔جن میں سب سے پہلے دلائل انفس کا ذکر کیا گیا ہے۔

کفار کے انکار کا بنیادی سبب

ان کے انکار کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے آنے سے انکار کرتے ہیں۔ان کی عقل میں یہ بات کسی طرح سمانہیں رہی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب سے اس زمین پر انسان آباد ہوا ہے اس وقت سے انسان پیدا بھی ہورہے ہیں اور اپنا وقت آنے پر مر بھی رہے ہیں اور جب تک اس زمین پر انسان آباد ہے اس وقت تک یہ موت وحیات کا سلسلہ چلتا رہے گا۔اگر قیامت کے آنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کا وقوع دو مرحلوں میں ہوگا۔پہلا مرحلہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی صور کے پھونکے جانے سے ہلاک ہوجائیں گے۔اندازہ کیجئے! زمین کا کونسا گوشہ انسانوں سے خالی ہے تو کیا یہ بات قابلِ فہم ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی آواز گونجنے سے زمین پر رہنے والی تمام مخلوقات ہلاکت کی نذر

Marfat.com

ہوجائیں؟ بلکہ زمین بھی ٹوٹ پھوٹ جائے، اس پر جمے ہوئے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں۔ چلئے اگر اس بات کو قبول بھی کر لیا جائے کہ ایک دن زندگی کی بساط لپیٹ دی جائے گی تو قیامت کا دوسرا مرحلہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے ہر شخص اپنی قبر سے اٹھے گا اور میدانِ حشر کی طرف چلنا شروع کردے گا۔ یہ بات تو کسی طرح بھی عقل میں آنے والی نہیں کہ اربوں کھربوں سال میں مرنے والے انسان نجانے کہاں کہاں مرے اور کہاں کہاں دفن ہوئے اور پھر کتنے ایسے انسان ہیں جن کو قبر بھی میسر نہ آسکی اور جنہیں قبر ملی بھی وہ وقت کے ساتھ ساتھ مٹ گئی۔ قبرستان آبادیوں میں گم ہوگئے، آبادیاں بعض دفعہ زمین بوس ہوگئیں اور بعض دفعہ سیلاب انہیں بہالے گیا۔ کتنے نئے جزیرے سمندر سے نکلے اور کتنے جزیرے سمندر میں ڈوب گئے۔ دریاؤں نے کتنی دفعہ رخ بدلے اور کتنی دفعہ اپنے کنارے توڑتے ہوئے آبادیوں کو نگل گئے اور کتنی دفعہ پہاڑوں نے آتش فشانی کی اور ایسا لاوا اگلا جو انسانی بستیوں کو تباہ کر گیا۔ تو آخر یہ تمام تباہ ہونے والے جو اپنا نشان تک باقی چھوڑ کر نہیں گئے انہیں کیسے ازسرِ نو زندہ کیا جائے گا؟ اور کس طرح سے ازسرِ نو انسانی آبادی وجود میں آئے گی اور میدانِ حشر اتنا عظیم کہاں ہوگا جو اربوں کھربوں سالوں کی مخلوق کو اپنے دامن میں جگہ دے سکے؟ یہ وہ عقلی استبعادات ہیں جو ان لوگوں کو قیامت کے بارے میں یکسو ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ قیامت کی ایک ایک بات انہیں ناقابلِ وقوع اور ناممکن العمل دکھائی دیتی تھیں۔ قرآنِ کریم نے ایک ایک بات کا جواب دینے کی بجائے ایک ایسی جگہ انگلی رکھی ہے جہاں پانی مر رہا ہے اور ایک ایسی بات پر گرفت کی ہے جو ان کی تمام گمراہیوں کا سبب ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمہیں ان میں سے ہر بات ناممکن دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے بارے میں نہایت محدود تصور رکھتے ہو اگر تمہیں اس کی قدرت کی وسعت کا اندازہ ہوتا اور اس کے بے پایاں ہونے کا کسی حد تک بھی یقین ہوتا تو تمہیں دنیا کی کوئی چیز جس کے بارے میں پروردگار خود ارشاد فرماتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا ناممکن دکھائی نہ دیتی۔

قرآنِ کریم نے اور بھی کئی مواقع پر کفار کی اسی بنیادی بیماری پر گرفت کی ہے اور اس کیلئے ایسی خوبصورت مثالیں چھوڑی ہیں کہ اگر کوئی شخص چشمِ بینا سے انہیں دیکھتا اور پڑھتا اور اس کی بصیرت موت کی نذر نہ ہوچکی ہوتی تو وہ کبھی بھی قیامت سے انکار نہ کرسکتا تھا۔ اصحابِ کہف کا تین سو سال تک سوئے رہنا اور پھر زندہ ہونا اور لوگوں سے ملاقات کرنا یہ بجائے خود کتنی بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کسی کو جب تک چاہے سلائے رکھ سکتا ہے اور جب چاہے اسے اٹھا سکتا ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے یروشلم کی حیران کن تباہی کو دیکھ کر بے ساختہ یہ بات کہی تھی کہ یا اللہ اس مکمل تباہی کے بعد اس بستی کو تو کیسے زندہ کرے گا؟ تو پروردگار نے انہیں سو سال تک کیلئے موت دے دی۔ سو سال کے بعد اٹھایا پوچھا کتنا عرصہ تم نے یہاں گزارا۔ کہا: شاید ایک دن یا دن کا ایک حصہ۔ فرمایا: نہیں، تم تو ایک صدی گزار چکے ہو۔ اب ذرا اپنی خوراک اور چھاگل میں اپنے پانی کو دیکھو جو تم ساتھ لے کر چلے تھے تاکہ راستے میں میں ان سے کام لوں گا۔ دیکھا کہ ان میں سڑاند تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بالکل ویسے ہی تروتازہ تھے جیسے آپ گھر سے لے کر چلے تھے۔ پھر فرمایا: اب ذرا اپنے گدھے کو دیکھو۔ دیکھا تو اس کی ہڈی ہڈی جدا ہوچکی تھی۔ کھال کا نشان تک نہ تھا۔ فرمایا: دیکھو ہم کس طرح ہڈیوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر کس طرح اس پر گوشت اور کھال چڑھاتے ہیں چنانچہ ان کی آنکھوں کے سامنے گوشت چڑھنے کے بعد اچانک وہ گدھا کھڑا ہو کر بولنے لگا۔ حضرت عزیر زندگی اور موت کا راز تو کیا جانتے البتہ! جس سبب سے ان کی زبان پر تعجب کا جملہ آ گیا تھا اس کے حوالے سے فرمایا کہ اب میں خوب جان گیا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس آدمی کو یہ یقین حاصل ہے اسے اللہ تعالیٰ کے کسی کام پر کبھی شک وشبہ لاحق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں بھی انسان کے اپنے وجود اور اپنے وجود کی تخلیق کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ تم اپنی پیدائش کے ایک ایک مرحلے پر غور کرو ان میں سے کون سا مرحلہ ایسا ہے جسے عقل باور کرسکتی ہے۔ لیکن آج چونکہ یہ سارے مراحل ہماری نظروں کے سامنے ہیں تو ہمیں ان کے وجود سے انکار نہیں۔

Marfat.com

دلیل نفسی

سب سے پہلے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ذرا غور کرو تمہارے جدِ امجد حضرتِ آدم علیہ السلام جنہیں اللہ نے خلافتِ ارضی سے نوازا اور جو زمین پر پہلے نبی اور رسول تھے انہیں ہم نے مٹی کے جوہر اور اس کے خلاصہ سے پیدا کیا تھا۔ یہ اللہ کی قدرت کا پہلا ظہور ہے کہ ایک شخص جسے مٹی کے خلاصے سے بنایا گیا اور قرآنِ کریم نے جس طرح سڑے ہوئے اور کھنکھناتے ہوئے گارے کا ذکر کیا ہے اس کو ذہن میں رکھیں تو تعجب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یعنی مٹی کے خلاصے، سڑے ہوئے اور کھنکھناتے ہوئے گارے سے بننے والا وجود مسجودِ ملائک ٹھہرتا ہے، جنت میں مقام حاصل کرتا ہے پھر جنت ہی اس کی آخری قیام گاہ کے طور پر اس کا مطلوب بنا دی جاتی ہے اور پھر دنیا کی نعمتیں اور عناصرِ قدرت کو اس کیلئے مسخر کر دیا جاتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کیلئے ایک حیرت انگیز نظام وجود میں لایا جاتا ہے کہ اب نوعِ انسانی کا جو فرد شرفِ انسانی سے نوازا جائے گا اس کی ابتدا گندے پانی کی ایک بوند سے ہوگی۔ جو کپڑے کو لگ جائے تو کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے اور پھر یہ پانی کی بوند اپنے اندر کوئی تخلیقی جوہر نہیں رکھتی بلکہ اس کے بننے اور وجود میں آنے کیلئے جن غذاؤں نے کام کیا ہے وہ ساری مٹی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں بھی مٹی کا جوہر کہا جا سکتا ہے اب اگر ایک سوچنے والا گہری نگاہ سے پانی کی اس بوند کے ایک ایک مرحلے کو دیکھے کہ وہ کس طرح ایک شخص کے جسم سے نکلتا ہے اور رحمِ مادر کے محفوظ مستقر میں اسے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ رحمِ مادر میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس میں کسی تبدیلی کا باعث بن سکے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ یہی پانی کی بوند خون کی ایک پھٹکی میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر یہی گاڑھا خون گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ مزید کچھ مدت گزرتی ہے تو وہ رحمِ مادر جس میں باہر کا کوئی عامل اپنا اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ دنیا کی ہر محفوظ چیز سے بڑھ کر محفوظ چیز ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اب تک کا عمل تو بالکل ویسا ہی تھا جیسا تمام حیوانوں میں جنین کی صورت میں وجود میں آتا ہے۔ لیکن اب اچانک یہ گوشت کا لوتھڑا ہڈیوں میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اب اسے حیوانی نسل سے ممتاز کر کے نسلِ انسانی کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ لیکن اب تک بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جسمِ انسانی کی ابتدا تو ہو گئی ہے لیکن حیاتِ حیوانی کا وہی عمل جاری ہے جو اس سے پہلے رواں دواں تھا۔ لیکن اب نفسِ ناطقہ کے غلبے سے جنین جواب ایک جسم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جس کے اندر اب ایک حیات پیدا کر دی گئی ہے اس نے اب ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی سے متعلق فرمایا گیا: ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ '' پھر ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا''۔

البتہ! یہ ضرور ہے کہ وضعِ حمل کے آغاز تک زندگی کی ابتدائی خصوصیات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی نہ عقل و خرد۔ لیکن جیسے ہی بچہ رحمِ مادر سے باہر آتا ہے تو جس طرح رحمِ مادر میں اس نے پانی کی بوند سے لے کر جسمِ انسانی اور حیاتِ انسانی کا سفر مختلف مراحل میں طے کیا تھا اور ہر مرحلہ اپنے اندر غور و فکر کے بے پناہ مدارج رکھتا ہے۔ اسی طرح اب بھی اس کی زندگی کے مختلف مراحل کا سفر ایک نئی صورت میں شروع ہو جاتا ہے۔ اب بچہ ماں کی آغوش میں آتا ہے تو اسے کچھ پتہ نہیں کہ یہ میری ماں ہے۔ اسے یہ تک معلوم نہیں کہ میری غذا کہاں ہے۔ جب کہ حیوانات کے بچے پیدا ہوتے ہی بنیادی ضرورتیں حاصل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مرغی کا بچہ چند لمحوں کے بعد ماں کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ بلی کے بچے جیسے ہی آنکھیں کھولتے ہیں تو ماں کے پستان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ گائے اور بھینس کے بچے ایک مختصر وقفے کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے ماں کے پستان چوسنے لگتے ہیں۔ لیکن،

Marfat.com

انسان کا حال یہ ہے کہ ابتدائی مرحلے میں وہ نہ ماں کو پہچانتا ہے اور نہ باپ کو۔ قرآنِ کریم کہتا ہے: ھُوَالَّذِیْ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے''۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ حواس اپنا کام کرنے لگتے ہیں، آنکھیں دیکھنے لگتی ہیں، ہاتھ پکڑنے لگتے ہیں، کان سننے لگتے ہیں، ناک سونگھنے لگتی ہے، زبان چکھنے لگتی ہے۔ لیکن حواس کا یہ سفر بھی ایک تدریج کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ لڑکپن میں پہنچ کر بچہ حواس کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی کام لینے لگتا ہے۔ عقل کا سفر بھی آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص پانی کی بوند کا تصور کر کے اس من موہنے بچے کو دیکھے جس کی مسکراہٹ ہر دل میں پیار کو جنم دیتی ہے تو اسے کبھی یقین نہیں آئے گا (اگر وہ اس عمل سے واقف نہیں) کہ پانی کی ایک بوند سے اس طرح کا بچہ وجود میں آسکتا ہے اور پھر پنگھوڑے میں ہنستے اور روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر کوئی آدمی اس لڑکے کا تصور نہیں کرسکتا جو اب سکول جاتا ہے علم کی ابتدائی باتیں سیکھتا ہے، دوڑتا، بھاگتا، کھیلتا اور شرارتیں کرتا ہے۔ پھر جیسے جیسے زندگی کا سفر آگے بڑھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر ایک خودی ابھرنا شروع ہوتی ہے جو ہر چیز پر اپنا تحکم جتاتی اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر یہ سفر اور آگے بڑھتا ہے تو کہیں ایجادات حیران کرنے لگتی ہیں، کہیں طلاقتِ لسانی اپنا رنگ دکھاتی ہے، کہیں انشا پردازی اپنا جوہر دکھاتی ہے اور کہیں ایک شخص قوموں کی تاریخ بنانے یا سنوارنے لگتا ہے۔ یہ حیران کن تبدیلیاں اور حیرت انگیز کمالات اس شخص میں دکھائی دیتے ہیں جس کی ابتدا پانی کی ایک بوند سے ہوئی تھی تو آدمی بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ : ''پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا''۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ پانی کی ایک بوند میں اللہ تعالیٰ نے کیسی حیرت انگیز تبدیلیاں کی ہیں اور پھر آخر میں ایک بالکل نئی مخلوق کی شکل میں پیدا فرمایا جس کا پہلے مراحل کو دیکھ کر اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اولاً تو انسان کا وجود بجائے خود اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے لیکن پھر اس کے اندر حواس کا پیدا ہونا پھر جوہرِ عقل کے فانوس کا جلنا اور پھر رفتہ رفتہ ایسے کمالات کا جنم لینا جن میں غوروفکر کی صلاحیتیں بھی ہیں اور تسخیرِ کائنات کے حوصلے بھی اور حکمرانی کی امنگیں بھی ہیں اور سب کچھ ہوتے ہوئے فقر و درویشی کا سوز و گداز بھی اور پھر آخر میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ جب ان کمالات کا حامل، دنیا کو اپنی شخصیت کے طلسموں سے حیرت میں ڈال دینے والا، جب زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو شخصیت کی رعنائیاں ڈھلنے لگتی ہیں، زبان و بیان کے جوہر دکھانے والا قوتِ گویائی سے محروم ہونے لگتا ہے۔ حسنِ تدبر سے ہر مشکل مرحلے میں عقدہ کشائی کرنے والا بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں بہت کچھ جاننے والا علم کی ہر خوبی سے محروم ہوجاتا ہے تو بے ساختہ آدمی کی زبان سے نکلتا ہے کہ پاک ہے اللہ اور بابرکت ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

تَبٰرَکَ اللّٰہُ کے الفاظ کا اردو زبان میں ٹھیک ترجمہ کرنا ممکن نہیں۔ اس کے استعمالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نہایت مقدس اور منزہ ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس قدر بھلائی اور خوبی کا مالک ہے کہ تم اس کی انتہا کو نہیں پاسکتے۔ اس کے مقدس اور منزہ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس کے حسن و خوبی میں بے مثال ہونے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کے بارے میں کسی عجز و نقص کو فسادِ عقل سمجھا جائے اور کبھی اس وہم کو قریب نہ آنے دیا جائے کہ وہ دوبارہ مخلوقات کو پیدا نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اس کے عجز کی دلیل ہے۔

Marfat.com

اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ کا مفہوم

اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ کا ترجمہ عموماً کیا جاتا ہے ''سب سے بہتر پیدا کرنے والا'' کیونکہ ''احسن'' خالقین کی طرف مضاف ہے ۔پھراس پرایک اعتراض ہوتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق اور بھی ہیں ۔البتہ! اللہ تعالیٰ ان سب میں بہتر ہے جبکہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھا جائے کہ صرف اللہ ہی کی ذات خالق ہے اس کی صفتِ تخلیق میں کوئی دوسرا شریک نہیں ۔علماء کرام نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا کہ خلق کا لفظ دراصل دومعنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ا:۔ کسی چیز کوکسی موجود مادے اور سابقہ مثال کے بغیر پیدا کرنا۔اس معنی کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی یہ صفت ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاسکتی۔

۲:۔ دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ کسی سابقہ مادہ سے کسی چیز کوکسی موجود مثال کے مطابق بنالینا۔یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں میں بھی پائی جاسکتی ہے اور اسی حوالے سے دوسروں کیلئے اس لفظ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ ''افعل'' کا لفظ جو اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے۔جب مضاف ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا مضاف الیہ جمع ہوتو عموماً ترجیح اور تفضیل کے معنی سے مجرد ہوکر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ تفضیل سے مجرد ہوکر استعمال ہوا ہے اس لحاظ سے ہم اس کا ترجمہ یہ نہیں کریں گے کہ وہ سب پیدا کرنے والوں میں بہتر ہے بلکہ ہم اس کا ترجمہ کریں گے کہ ''وہ بہترین پیدا کرنے ولا ہے''۔ایسی صورت میں کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

(پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو۔ 15) پھر بلاشبہ تمہیں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔۱۶)

بحث کا نتیجہ

زندگی کے تمام مراحل جن جن سے انسان اپنی تخلیق سے گزرا ہے ان تمام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس زندگی کا آخر ایک دن خاتمہ ہوجاتا ہے اور تم فرداً فرداً اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو اور تمہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ تم جانتے ہو کہ دنیا کی ہر چیز ایک دن ختم ہونی ہے اور ہماری زندگی کا بھی یہ آخری مرحلہ ہے۔لیکن اگر تم پانی کی ایک بوند سے لے کر اپنی زندگی کے تمام مراحل پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی مرحلہ بھی پہلے مرحلے کا منطقی جواب نہیں بلکہ سراسر اللہ کی قدرت کا ظہور ہے۔یہاں موت حیات کا نتیجہ نہیں اور نہ حیات موت کا پیش خیمہ ہے۔ایک وقت تھا کہ انسان پر باقی مخلوقات کی طرح عدمِ محض طاری تھا، اللہ نے محض اپنی قدرت سے اسے زندگی بخشی اور پھر وہ زندگی کے مختلف مراحل سے اسی کی رحمت اور قدرت سے کامیابی سے گزرا، اگر وہ ان میں سے ایک ایک مرحلے پر غور وفکر کرتا تو اس کا اللہ کی قدرت پر یقین بڑھتا رہتا۔لیکن اس نے اپنی نادانی سے ان تبدیلیوں کو حالات کا نتیجہ سمجھا۔لیکن اب قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کو دعوت دے رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کے تغیرات اور تطورات پر فکر اور تدبر کی نگاہ ڈالو اور پھر فیصلہ کرو کہ کیا ان میں سے ہر تبدیلی اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے یا نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر تمہاری فکر کو موت پر رک نہیں جانا چاہیئے بلکہ اس کا اقرار کرنا چاہیئے کہ جس قدرت نے تمہیں پانی کی بوند سے حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک مخلوق بنایا وہی پروردگار موت کے بعد تمہیں برزخ میں رکھے گا اور جب قیامت کا صور پھونکا جائے گا تو تمہیں از سرِ نو زندہ کرکے جواب دہی کیلئے میدانِ حشر میں لے جائے گا اور ان میں سے کوئی مرحلہ بھی اس کی قدرت سے بعید نہیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ⑰

(اور ہم نے تمہارے اوپر سات تہہ بہ تہہ آسمان بنائے اور ہم اپنی مخلوق کی مصلحتوں سے بے خبر نہ تھے۔ ۱۷)

انسان کے آغاز اور اس کے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب یہاں سے اللہ تعالیٰ اپنے اس نظامِ ربوبیت کا ذکر فرما رہا ہے جس سے انسان کی بقا وابستہ ہے۔ اس میں انسانوں پر کئے جانے والے احسانات کا ذکر بھی ہے اور اس کی قدرت کا اظہار بھی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھتے ہوئے یہ بات محض حماقت معلوم ہوتی ہے کہ جو پروردگار مٹی کے ست اور پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی مخلوق پیدا کرسکتا ہے جس کے کمالات نے زمین کی وسعتوں کو نہ صرف جکڑ رکھا ہے بلکہ ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو فنا کردینے کے بعد ازسرِ نو زندہ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ربوبیت کی صورت میں اپنے بے شمار احسانات میں سے چند احسانات کا ذکر فرما کر انسانوں کیلئے لمحۂ فکریہ پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جس پروردگار نے انسان کی جسمانی زندگی کی بقا کیلئے اس قدر احسانات کیے ہیں کیا وہ اس کی معنوی اور روحانی زندگی کو اجر وثواب اور مکافاتِ عمل کے بغیر چھوڑ دے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو یہ انسانی زندگی پر بہت بڑا ظلم ہوگا جبکہ اللہ جیسی محسن ذات اپنی مخلوق پر کبھی ظلم نہیں کرسکتی۔

طَرَآئِق کا مفہوم

اس نے اپنی قدرت کے ظہور اور اپنے احسانات کے سلسلے میں سب سے پہلے سَبْعَ طَرَآئِق کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ طرائق، طریقۃ کی جمع ہے۔ ''اَسِرَّۃٌ'' یعنی دھاریوں کے معنی میں آتا ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ ظاہر ہے صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی صفت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ یعنی دھاریوں والے سات آسمان۔ مراد اس سے آسمان کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ طَرَآئِق، طَرق سے ہے۔ عرب جب کسی چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھتے ہیں تو کہتے ہیں طارقتُ الشئی ای جعلت بعضہ علی بعض اور اگر ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے کے اوپر پہنیں تو کہتے ہیں طارق بین ثوبین ای لبس احد ھما علی الاخر خلیل اور فراء نے اس کا یہی معنی کیا ہے۔ اس صورت میں اس کا یہ معنی ہوگا تہہ بہ تہہ سات آسمان۔ اس طرح سے یہ دونوں معنی یکساں ہیں۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ طرائق، طریق کی جمع ہے جس کا معنی ہیں ''راستے''۔ تو اس صورت میں اس کا مطلب ہوگا ''سات سیاروں کی گردش کے راستے''۔ جن کے اوپر وہ مصروفِ حرکت رہتے ہیں۔

چوتھا معنی یہ ہے کہ اس سے مراد طبقات ہیں۔ سبع سموات طباقاً۔ تو یہ وہی معنی ہے جو پہلے گزر چکا ہے یعنی سات تہہ بہ تہہ آسمان۔ ان آسمانوں کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ سائنس دانوں کی تحقیق ابھی تک آسمانوں تک نہیں پہنچ سکی۔ لیکن ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو اس کی خبر دی ہے اور قرآنِ کریم نے ہمیں اس کے وجود اور اس کی وسعتوں کا یقین دلایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ زمین پر بسنے والی مخلوقات کیلئے آسمانوں کا وجود بہت سے فوائد کا ذریعہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ ہمارے لئے بہت بڑا اللہ کا احسان ہے اور مزید یہ بات بھی کہ وہ اللہ کی قدرت کا ایسا ظہور ہے جس کو سمجھنے سے بھی عقلیں عاجز ہیں۔ وہ بغیر ستونوں کے کھڑا ہے۔ جس میں کہیں کوئی دراڑ نہیں۔ جس کی وسعتوں کو ناپا نہیں جاسکتا۔ انسانوں کو قیامت کے بپا ہونے میں تامل ہے جبکہ آسمانوں کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے کہیں بڑھ کر اللہ کی قدرت کا ظہور ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے فرمایا: لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس ''آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے بڑا کام ہے''۔

Marfat.com

آیت کے دوسرے جملے کا مفہوم

آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ ہم اس تخلیق سے غافل نہیں تھے۔اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ہم نے سات آسمان پیدا فرمائے اور ان کی تخلیق کسی اناڑی کے ہاتھوں سے نہیں ہوئی بلکہ ہم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نہایت علم وحکمت سے انہیں پیدا فرمایا۔اس میں بے شمار سیارے محوِ پرواز ہیں۔ان میں نظم وترتیب اس انداز کی ہے کہ آج تک اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکی۔اس کے نظام میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہرغوروفکر کرنے والے کو اس کارِ عظیم میں ایک مقصدیت نظر آتی ہے جو بنانے والے کی حکمت پر دلالت کرتی ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ہماری ہر مخلوق ہماری قدرت کا ظہور ہے اسی طرح ہم اپنی مخلوقات کیلئے بے پایاں ربوبیت کا فیضان بھی رکھتے ہیں۔ہم نے جہاں جہاں جس مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے ہم اس کی ضروریات سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ہم نے اپنی ہر مخلوق کو اس کی زندگی کے موافق ماحول مہیا کیا ہے اور اس ماحول کے مطابق اسے مخصوص صلاحیتوں سے نوازا ہے۔منطقۂ باردہ کا ریچھ منطقۂ حارہ میں نہیں پایا جاتا اور منطقۂ حارہ کا کوئی جانور منطقۂ باردہ میں نہیں پایا جاتا۔مچھلیاں پانی میں پیدا کی گئی ہیں تو انہیں تیرنا سکھایا اور پرندے فضا میں پیدا کئے گئے ہیں تو انہیں اڑنے کیلئے پر دیئے گئے ہیں اور ہر ایک کی روزی کا اس کے دائرۂ کار میں انتظام کیا گیا ہے۔اسرائیلی روایات میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت سے نوازا گیا اور پھر فرعون کو ہدایت دینے کیلئے اس کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ مجھے حکم کی تعمیل میں بالکل کوئی تامل نہیں، البتہ! اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ میں پیچھے دو پہاڑوں کے درمیان اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ آیا ہوں، میں انہیں سردی سے بچانے کیلئے آگ ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا تھا کہ یہاں مجھ پر احسانات کی بارش کردی گئی۔اب یہ مزید احسان کیا جائے کہ میں انہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر پھر فرعون کے پاس جانے کی کوشش کروں۔تو پروردگار نے فرمایا کہ موسیٰ! تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمیں تمہارے بیوی بچوں کی فکر نہیں؟ ہم تو اپنی ہر مخلوق کے بارے میں آگاہی بھی رکھتے ہیں اور فکر بھی رکھتے ہیں۔پھر حکم دیا جس چٹان پر کھڑے ہو اس پر اپنا عصا مارو۔چٹان پھٹی اس کے نیچے ایک اور چٹان نظر آئی کہا: اس پر بھی عصا مارو۔تو نیچے ایک بڑا پتھر نظر آیا۔حکم ہوا اس پر بھی عصا مارو۔وہ پتھر پھٹا تو اس میں ایک جانور نظر آیا جو گھاس کی سبز پتی منہ میں لئے کھا رہا تھا۔پروردگار نے فرمایا: اس جانور کو تین چٹانوں کے نیچے ہمارے سوا کون جان سکتا ہے؟ تو اسے روزی کون پہنچا سکتا ہے؟ ہم اگر اس جانور کو روزی دیتے ہیں تو کیا تمہارے بیوی بچوں کو روزی نہ دیں گے؟ اور ان کے بچاؤ کا سامان نہیں کریں گے؟ اس آیتِ کریمہ میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم اپنی مخلوق کی ضروریات سے اور وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان کی جگہ سے غافل نہیں۔ہم ہر ایک کو جانتے ہیں اور ہر ایک کی ضروریات بہم پہنچاتے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝١٨

(اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا ایک اندازہ کے مطابق اور پھر ہم نے اس کو زمین میں ٹھہرا دیا۔اور یقیناً ہم اسے لے جانے پر بھی پوری طرح قادر ہیں۔ ۱۸)

Marfat.com

اہتمامِ ربوبیت کی ایک مثال

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد بھی لئے جا سکتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے آغازِ آفرینش میں آسمان سے پانی برسایا اور اس اندازے سے برسایا کہ زمین پر بسنے والی مخلوقات کیلئے قیامت تک کمی نہ آنے پائے۔ اللہ کا بے پایاں علم ہی جان سکتا تھا کہ قیامت تک زمین پر بسنے والی مخلوقات کی ضروریات کیا ہوں گی۔ چنانچہ کوئی نہیں جانتا کہ زمین پر آبادی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن زمین کا کوئی گوشہ آج تک پانی کی کمیابی کا شکار نہیں ہوا۔

آسمانوں سے جب پانی برسا تو نشیبی علاقوں میں پانی کو روک دیا گیا جس سے سمندر اور دریا وجود میں آئے، جھیلیں پھیلا دی گئیں، زیرِ زمین پانی کے ذخیرے ٹھہرا دیئے گئے اور پھر حیرت انگیز انتظام یہ کیا گیا کہ پانی کے ذخیروں سے پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے اور ابر کی چادروں کی صورت میں فضا پر چھا جاتا ہے۔ زمین پر جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں ہوائیں کھینچتے ہوئے اسے لے جاتی ہیں اور پانی برسا دیتی ہیں۔ موسم بدلتے ہیں، سردیوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جما دی جاتی ہے اور گرمیوں میں وہی برف پگھل کر کہیں چشموں کی صورت میں پانی ابلتا ہے، کہیں آبشاریں گرتی ہیں۔ پھر یہی پانی ندی نالوں میں پہنچ کر آبیاری کا سامان کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن دو گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے۔ اولاً تو یہ بات حیران کن ہے کہ ان دو گیسوں کو ایک خاص تناسب سے کون ملنے کا حکم دیتا ہے جس سے پانی وجود میں آتا ہے؟ کیونکہ اگر وہ تناسب بگڑ جائے تو پیدا ہونے والے مرکبات زہر ہوتے ہیں۔ اور دوسری بات اس سے بھی حیران کن ہے کہ پانی جب بھاپ بن کر ہوا میں اڑ جاتا ہے تو اس وقت کون ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ ہو جانے سے روکے رکھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ نظامِ ربوبیت ہے جو صرف اسی کے حکم کے تابع ہے۔ اگر یہاں کوئی اور خدا ہوتا تو نہ دونوں گیسیں ایک تناسب سے آپس میں ملنے پاتیں اور اگر وہ مل جاتیں تو ان کو کوئی الگ الگ نہ کر سکتا۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ آج بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر پانی برستا ہے۔ اگر زمین اسے اپنی مرضی سے چوس لیتی اور ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑتی تو زمین دلدل بن جاتی۔ کسی چیز کے پیدا ہونے کا تو کیا امکان، انسانوں کے رہنے کے قابل بھی نہ رہتی اور اگر وہ سارا پانی اگل دیتی اور اپنے سینے کو سخت کر لیتی تو آبیاری نہ ہونے کے باعث کوئی چیز پیدا نہ ہو پاتی۔ تو زمین پر بسنے والی مخلوقات ضروریاتِ زندگی نہ ملنے کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ایک اندازے سے پانی برساتے ہیں پھر آبیاری کے لئے جتنی ضرورت ہوتی ہے اسے روک لیتے ہیں حالانکہ اگر ہم چاہیں تو سارا پانی دوبارہ ندی نالوں میں لے جانے پر قادر ہیں اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پانی کو ختم یا خشک کر دینے پر بھی قادر ہیں اور یہ بھی ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم پانی کو زمین کے اتنا نیچے اتار دیں کہ کوئی کنواں، کوئی ٹیوب ویل اس کا سراغ نہ لگا سکے۔ یہ سراسر اللہ کی ربوبیت ہے کہ جس طرح ماں اپنے بچے کی نگرانی کرتی اور کھلانے پلانے کا بندوبست کرتی ہے اللہ بھی اپنی مخلوقات کی اسی طرح دیکھ بھال کرتا ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾

(پس ہم نے اس پانی سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے ان باغوں میں بہت سے لذیذ پھل ہیں (جن سے تم لطف اندوز ہوتے ہو) اور انہیں باغوں سے تم روزی بھی حاصل کرتے ہو۔ ۱۹)

Marfat.com

اہتمامِ ربوبیت کی مزید مثالیں

اللہ کے بے شمار احسانات میں سے چند احسانات یہ ہیں کہ اس نے تمہارے لئے زمین پر ایسے باغات پیدا فرمائے، جن میں پیٹ کی آگ بجھانے اور کام ودہن کی لذتوں کو پورا کرنے کیلئے قسم قسم کے پھل اور غلے پیدا کئے۔ عرب میں پھلوں کی اصل حیثیت تو کھجور اور انگور کو حاصل تھی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اور مختلف قسم کے پھل پائے جاتے تھے۔ جس سے عرب لطف ولذت حاصل کرتے تھے۔ اہلِ عرب کے ہاں ایک اچھے باغ کا جو تصور پایا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ انگوروں کا باغ ہو اور اس کے کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو۔ کھجور چونکہ ایک سخت جان قسم کا درخت ہے جو ہر طرح کے موسم کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ تیز ہواؤں کے سامنے تن کر کھڑا ہوتا ہے اور چونکہ اس پر شاخیں زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔ بلند ہونے کی وجہ سے بلندی کی نمی بھی چوستا ہے اور بادِ صرصر کا مقابلہ بھی کرتا ہے اور عرب میں متنوع قسم کی کھجور پیدا ہوتی ہے جس میں ادنیٰ قسم کی کھجور بھی شامل ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین کھجور بھی پائی جاتی ہے۔ رطب کا اپنا مزہ ہے۔ جس کی موجوگی میں کسی اور پھل کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی اور کھجور کے پک جانے اور یابس ہو جانے کے بعد سفر وحضر میں اس سے غذا حاصل کی جاسکتی ہے۔ کھجور کے درختوں کی حفاظت میں انگور کی بیلیں لہلہاتی اور اعلیٰ قسم کا انگور کام ودہن کی لذت اور غذائیت سے بھرپور تیار ہوتا اور غذا اور تفکہ کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا اور بیچ بیچ میں مختلف اجناس اور دوسرے موسمی پھلوں کے قطعات بھی ہوتے جو مختلف ضروریات کو پورا کرنے میں کام آتے تھے۔ اصل غذا اور پھل کی حیثیت تو کھجور اور انگور کو ہی حاصل تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو اور کہیں کہیں گندم بھی پیدا کی جاتی تھی۔ اس سے غذائی اجناس بھی وجود میں آتیں اور مختلف پھل بھی کام ودہن کی لذت کیلئے باغوں میں موجود ہوتے۔ تاکلون سے ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ طائف کے باغوں میں انجیر بکثرت پایا جاتا ہے۔ اب تو بادام کے درخت بھی طائف سے نجران تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وہ بادام ایسا ہوتا ہے جس کا تصور بھی ہمارے یہاں مشکل ہے اور بعض علاقوں میں خاصی بڑی تعداد میں گندم اور دیگر غذائی اجناس بھی پیدا ہونے لگی ہیں۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾

(اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا ہے جو طورِ سینا سے نکلتا ہے اور تیل لئے ہوئے اگتا ہے اور کھانے والوں کیلئے سالن بھی۔ ۲۰)

درخت کا اگرچہ نام نہیں لیا گیا لیکن اس کی صفات کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ''زیتون'' کا درخت ہے۔ یہ اگرچہ مختلف ملکوں میں پیدا ہوتا ہے لیکن طورِ سینا کا ذکر یا تو اس کے وطنِ اصلی کے طور پر کیا گیا ہے کیونکہ شام میں یہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور یا تقدس کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں کوئی استبعاد نہیں ہوگا کہ قدرت نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی علاقے میں اس کو پیدا کیا ہو جو طورِ سینا کا علاقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں تین خصوصیات رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ غذا ہونے کے ساتھ ساتھ پھل بھی ہے اور آج بھی عرب اسے پھل کے طور پر اپنے ناشتے میں استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کسی حد تک کڑواہٹ ہوتی ہے لیکن کثرتِ استعمال سے اس کا ایک ایسا (Taste Develope) ہو جاتا ہے کہ اس کی کڑواہٹ اچھی لگنے لگتی ہے اور عرب اسے حلاوہ (شیرینی) کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور اس کی شکل بیر جیسی ہوتی ہے اور دوسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ جب یہ درخت سے اترتا ہے تو ایک مکھن کی طرح ہوتا ہے جسے سالن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ''صبغ'' عربی زبان میں ''رنگ'' کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور سالن کیلئے بھی۔ اور تیسری خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس سے بہتر شاید کوئی تیل نہیں۔ باقی پھل دھوپ کی کثرت سے سوکھنے اور ماند پڑنے لگتے ہیں لیکن اس پر جتنی دھوپ پڑے یہ اسی قدر شفاف تیل دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس

Marfat.com

کے شفاف ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ آگ کے چھونے سے پہلے ہی اس کا تیل بھڑک اٹھنے کیلئے تیار ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنی ذات میں بہت شفاف ہوتا ہے اور کوئی تیل بھی روشنی دینے میں اس کی ہمسری نہیں کرسکتا اور جہاں تک اس کی غذائیت کا تعلق ہے باقی تمام تیل کرسٹول پیدا کرتے ہیں اور اس میں کرسٹول پیدا کرنے کی صلاحیت صرف گیارہ یا بارہ پرسنٹ (11%,12%) ہے۔ اس لحاظ سے یہ غذائیت سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کم نقصان دیتا ہے۔ پاکستان میں چونکہ یہ باہر سے آتا ہے، یہاں اس کی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے مہنگا ہے لیکن اس کی افادیت میں کوئی دوسرا تیل اس جیسا نہیں۔ البتہ! یہ ضروری ہے کہ اس میں ملاوٹ نہ ہونے دی جائے اور اگر ملک کے اندر اس کی پیداوار ممکن ہوسکے تو یہ غذائی نقطہ نگاہ سے ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت پاکیزہ ٹھہرایا ہے تو اس کی افادیت میں اللہ کا خصوصی کرم شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پھل دینے میں سب درختوں سے زیادہ وقت لیتا ہے۔ اگر یہاں اس کا تجربہ کرکے دیکھا جائے تو ہوسکتا ہے کہ کسی علاقے میں یہ تجربہ کامیاب ہوسکے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢١﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾

(اور بے شک تمہارے لئے جانوروں میں بھی درس آموزی کا سامان ہے۔ ہم اُن چیزوں کے اندر سے جو ان کے پیٹوں میں ہے تمہیں (خوشذائقہ دودھ) پلاتے ہیں۔ اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان سے تم اپنی غذا کا سامان بھی حاصل کرتے ہو۔ ۲۱) اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے (تم سواری کرتے ہو)۔۲۲)

عبرت کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں ''عبرت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

العبرة مختصة بالحالة التی یتوصل بها من معرفة المشاهد الی ما لیس بمشاهد (مفردات) یعنی مشاہد کی معرفت سے غیر مشاہد تک پہنچنا۔ اسی طرح ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کرجانا اور اس سے سبق حاصل کرنا بھی ''عبرت'' کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ متذکرہ بالا آیات میں اللہ کے وجود اس کی وحدانیت اور بالخصوص وقوعِ قیامت پر جو دلائل دیئے گئے ہیں اور جس طرح ان سے عبرت وموعظت کے پہلو پیدا کئے گئے ہیں وہ تو اپنی جگہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی درس آموزی اور وقوعِ قیامت کو عقل، اخلاق اور حکمت کا تقاضا سمجھنے میں بہت اپیل رکھتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں نُسْقِيْكُمْ کا دوسرا مفعول ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اسی طرح مِمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا کو مجمل لایا گیا ہے۔ لیکن سورۃ النحل کی آیت نمبر ۶۶ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے نسقیکم مما فی بطونه من بین فرث و دم لبناً خالصاً سائغاً للشاربین ''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نسقیکم کا دوسرا مفہوم'' لبنا خالصا سائغا '' کے الفاظ سے ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اور مما فی بطونها کے اجمال کی تفصیل ''من بین فرث ودم'' سے کی گئی ہے۔ اور اس تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ کی قدرت وصنعت کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اہلِ عرب جیسے لوگ جو موسم کے شدائد کے پیشِ نظر اکثر خانہ بدوشی پر مجبور ہوجاتے تھے ان کے لئے غذا کا سب سے بڑا ذریعہ دودھ دینے والے جانور تھے اور یہ دودھ ان جانوروں سے اللہ تعالیٰ اس طرح انسانوں کو مہیا فرماتے تھے اور آج بھی اس کا یہی طریقہ ہے کہ

Marfat.com

جانور کے پیٹ سے جو دودھ نکلتا ہے ایسا نہیں کہ پیٹ میں کسی ایسی جگہ پیدا ہوتا ہو جس میں گندگی کا کوئی امکان نہ ہو بلکہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کے ایک طرف اگر گوبر ہوتا ہے تو دوسری طرف خون کی غلاظت ہوتی ہے۔ دونوں کی اپنی بدبو اور اپنا رنگ۔ لیکن ان کے درمیان سے دودھ کا چشمہ جاری ہوتا ہے اور نہایت محفوظ شکل میں پستانوں کی نالیوں سے اس طرح انسانی برتنوں میں منتقل ہوتا ہے کہ کہیں بھی کوئی آمیزش ہونے نہیں پاتی۔ پروردگار نے اس کیلئے دو صفات ذکر فرمائی ہیں کہ جانوروں کے پیٹ سے نکلنے والا دودھ خالص ہوتا ہے جس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ پینے والوں کیلئے خوشگوار ہوتا ہے کہ نہ بالکل پھیکا کہ پینے والے کیلئے مشکل ہو جائے اور نہ بالکل میٹھا کہ ذیابیطس کے مریض نہ پی سکیں۔ اس کی مہک دماغ کو معطر کرنے والی اور اس کی تاثیر ایسی کہ ہر جانور کی اپنی اپنی خصوصیات اس میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر قدرت نے اسے زود ہضم بنایا ہے۔ پیٹ کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ٹھنڈا کر کے پییں تو پیاس بجھاتا ہے اور نارمل حالت میں پییں تو غذا کا کام دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ جب بھی آپ اللہ کی کسی نعمت سے متمتع ہوتے تو آپ اللہ کا شکر بجالاتے اور اس سے بہتر نعمت کی دعا فرماتے۔ لیکن جب آپ دودھ پیتے تو دودھ کی کثرت کی دعا فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ دودھ سے بہتر کوئی اور نعمت نہیں۔

جانوروں میں منافع

وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ : اور تمہارے لئے ان میں بہت سے فائدے ہیں۔ یعنی ان جانوروں میں اللہ نے صرف دودھ جیسی نعمت ہی نہیں رکھی بلکہ ان میں اور بھی انسانوں کیلئے بہت سے فوائد اور منافع رکھے ہیں۔ اونٹ ہی کو دیکھ لیجئے وہ اہلِ عرب کا سفینۂ صحرا تھا۔ یعنی صحرائی سفر میں ان کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ عربوں کی تجارت دوسرے ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔ سینکڑوں میلوں کا سفر اور خوراک اور پانی کی کمیابی اور جا بجا ریت کے علاقے اور ٹیلے، ایسے سفر میں صرف اونٹ ہی تھا جو کامیاب ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔ کئی دنوں تک پیاس اور بھوک کو برداشت کر لینا اس حیرت انگیز جانور کیلئے کوئی مشکل نہیں اور پھر منوں بوجھ اٹھا لینا اس کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی اور اونٹ کی مادہ کا دودھ راستے میں تجارتی سامان لے جانے والوں کیلئے غذا کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ سفر کے علاوہ عام حالت میں کاشتکاری میں کام آتا تھا۔ گوشت، چمڑا اور اس کے بال بہت سی ضرورتوں میں کارآمد تھے۔ اسی طرح دوسرے جانور بھی سواری اور باربرداری میں کام دیتے تھے اور اون والے جانوروں کی اون کپڑا بنانے کے کام آتی تھی۔

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ : اور انہیں جانوروں سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ یعنی اونٹ سمیت دوسرے تمام جانور ان کیلئے خاص طور پر غذا کا سامان تھے۔ بکرا بکری، مینڈھا دنبہ، بھیڑ، غرضیکہ ان میں سے کونسا جانور تھا جو ان کے سفر و حضر میں ان کیلئے غذا کا ذریعہ نہ تھا۔

وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ : اور ان جانوروں پر اور کشتی پر تم سواری کرتے ہو۔ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عرب کا بیشتر حصہ چونکہ ریگستان پر مشتمل تھا اور مزید یہ بات کہ بارشوں کی کمیابی کے باعث انہیں مسلسل خانہ بدوشی کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔ تجارتی سفر بھی ان کیلئے ناگزیر تھے اور خانہ بدوشی بھی انہیں سفر میں رکھتی تھی۔ ایسی حالت میں ممکن ہے بعض علاقوں میں وہ بحری سفر کے ذریعے تجارت کرتے ہوں۔ تو بحری سفر میں کشتیاں ان کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ لیکن ان کے بیشتر سفروں کا انحصار ان کے جانوروں پر تھا۔ جو باربرداری کے بھی کام آتے تھے اور سواری کے بھی اور شاید اسی خصوصیت کی وجہ سے اونٹ کو سفینۂ صحرا کہا جاتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے شاید اسی نسبت سے یہاں دونوں کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

Marfat.com

خلاصہ کلام

مقصود ان تمام نعمتوں کے ذکر سے صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی ہے کہ جس پروردگار نے نہایت جزرسی کے ساتھ تمہاری ایک ایک ضرورت کو پورا فرمایا ہے اس کے بارے میں تم نے یہ کیسے تصور کرلیا ہے کہ وہ تمہیں ایک سے ایک بیش قیمت نعمت سے نوازتا ہے لیکن کبھی اس کے بارے میں یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے میری نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ تمہارے آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات ہیں، افادہ و استفادہ، اخذ ورد اور استعانت اور معاونت انسانی زندگی کا ناگزیر پہلو ہے۔ تم میں طاقتور کمزوروں کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں اور اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں کیلئے جینا مشکل کردیں اور وہ نعمتیں جو اس نے سب کیلئے پیدا کی ہیں ان پر زبردستی قبضہ کر کے اپنے لئے مخصوص کرلیں اور دوسرے ہمیشہ ظلم کی چکی میں پستے رہیں۔ تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ تمہیں پیدا کر کے تم سے اتنا بے تعلق ہوگیا ہے کہ تم یہ اندھیر نگری مچائے رکھو اور وہ تم سے کبھی باز پرس نہ کرے؟ عقل بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے اور اخلاق بھی اسے قبول کرنے سے ابا کرتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس دنیا کو بازیچۂ اطفال نہ سمجھا جائے بلکہ اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب اللہ کی نعمتوں سے متمتع ہونے والوں سے حساب لیا جائے گا۔ زیادتی کرنے والوں کو زیادتی کی سزا دی جائے گی اور نیکی کرنے والے اجر وثواب سے نوازے جائیں گے۔ یہی وہ سبق ہے جو ان تمام نعمتوں کے ذکر کرنے سے دل و دماغ میں پیدا کرنا مقصود ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ
عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى
حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ
اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ

Marfat.com

عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُمْ
مُّغْرَقُونَ ﴿٢٧﴾ فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ
الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٢٨﴾ وَقُل رَّبِّ
أَنزِلْنِي مُنزَلًا مُّبَارَكًا وَأَنتَ خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٢٩﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ
وَإِن كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ أَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٣١﴾
فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ
غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ

رکوع: ۲۔ (اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ۲۳) تو اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بزرگی جتلائے اور اگر اللہ تعالیٰ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو وہ فرشتوں کو (رسول بنا کر) نازل کرتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے پہلے آباؤ اجداد میں تو نہیں سنی۔ ۲۴) یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جسے جنون کا مرض ہو گیا ہے تو کچھ دن اس کا انتظار کرو۔ ۲۵) حضرت نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو اس چیز سے میری مدد فرما جس میں انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ ۲۶) تو ہم نے حضرت نوح کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق ایک کشتی تیار کیجئے۔ تو جب ہمارا عذاب آ جائے اور تنور ابل پڑے تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو بجز ان کے جن کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہیے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ وہ لازماً غرق کیے جائیں گے۔ ۲۷) پس جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی میں اچھی طرح بیٹھ جائیں تو آپ کہیے کہ شکر ہے اس اللہ کیلئے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔ ۲۸) اور یہ بھی عرض کیجئے کہ اے رب! تو مجھے اتار مبارک اتارنا اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ ۲۹) بے شک اس سرگزشت میں بڑی نشانیاں ہیں اور بے شک ہم امتحان کرنے والے ہیں۔ ۳۰) پھر ان کے بعد ہم نے دوسرے لوگ اٹھائے۔ ۳۱) پھر ہم نے ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا اس دعوت کے ساتھ کہ اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم اس سے ڈرتے نہیں ہو۔ ۳۲)

Marfat.com

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ۲۳)

تاریخ سے استدلال

سابقہ آیات میں دلائل انفس اور دلائل آفاق سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان اپنی ایمانی زندگی کے باعث فوز وفلاح سے نوازے جاتے ہیں اور حق کی تکذیب کرنے والوں کا مقدر ہمیشہ خسران ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی کہ اگرچہ اہلِ حق کو فوز وفلاح سے نوازا جاتا ہے لیکن انہیں اپنا اہلِ حق ہونا ثابت کرنے کے لئے آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان آزمائشوں کے فطری نتیجے کے طور پر اہلِ باطل کو کچھ عرصہ ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو اگر بدلنا چاہیں تو بدل لیں۔ لیکن اہلِ باطل عموماً اس ڈھیل سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے اسے اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اور اس طرح سے خسران کی طرف ان کا سفر مزید تیز ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے جس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں اب انہیں حقائق کو تاریخی دلائل سے ثابت کیا جا رہا ہے اور تاریخی دلائل کے سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کیونکہ تورات اور قرآن دونوں کی صراحت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں جو لوگوں کے گمراہ ہونے کے بعد ان کی ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ ان کی سرگزشت سے چند حقائق بالکل پیش پا افتادہ حقائق کی طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ سب سے پہلی جو حقیقت واشگاف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آج قریش کے سامنے نبی کریم ﷺ اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ بعینہٖ وہی دعوت ہے جو رسولوں کی تاریخ کے سب سے پہلے اولوالعزم رسول نے پیش کی تھی۔ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو! عبادت یعنی پرستش اور اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ اس کا عطا کردہ سر اس کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ مافوق الاسباب طریقے سے اس کے سوا کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تنہائیاں صرف اسی سے آباد کی جاسکتی ہیں۔ ظاہری سہارے ٹوٹ جانے کے بعد صرف وہی ایک سہارا ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے مناجات کی جاتی اور اسی سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اسی طرح زندگی کی ایسی رہنمائی جس پر آخرت میں سرخروئی کا دارومدار ہے عطا کرنا صرف اسی کے شایانِ شان ہے۔ تحلیل وتحریم کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ غیر مشروط اطاعت کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ زندگی کی نہج مقرر کرنے کیلئے صرف وہی آئین، دستور اور قوانین عطا کرتا ہے۔ عبادت کا یہ وہ تصور ہے جو ہمیں اللہ کی کتابوں سے ملتا ہے اور اللہ کے ہر رسول نے اسی تصور کے تحت اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی اور نبی کریم ﷺ نے درمیان میں ہزاروں سال کا فاصلہ ہونے کے باوجود اسی دعوت کا اعادہ فرمایا۔ یہ بات بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ جس سرچشمۂ ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام کو رہنمائی ملتی تھی اسی سرچشمۂ ہدایت کا فیضان آنحضرت ﷺ کے واسطے سے اب نوعِ انسانی تک پہنچ رہا ہے

Marfat.com

مزید فرمایا کہ عبادت تو صرف اللہ کا حق ہے کیونکہ وہی خالق ہے اور خالق ہی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر اپنی مخلوق کو حکم دے اور ساتھ ہی ساتھ وہ رب بھی ہے وہ اپنی تمام مخلوقات کو جن مین انسانون کو خصوصی حیثیت حاصل ہے ربوبیت سے نوازتا ہے۔ یعنی ان کی تمام ضرورتوں کو حالات کے مطابق درجہ بدرجہ عطا فرماتا اور عہد بعہد ترقی دیتا ہے۔ تو تم جب اس کے ساتھ دوسری قوتوں کو شریک کرتے اور ان کی بندگی کرتے، ان سے مرادیں مانگتے اور ان کی پوجا کرتے ہو، تو کیا تمہیں اللہ کے غضب سے ڈر نہیں لگتا؟ جب وہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے میری خدائی، میری الوہیت اور میرے حقوق میں دوسروں کو شریک کیوں کیا؟ تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ج صلے مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

تو اس کی قوم کے سرداروں نے، جنہوں نے کفر کیا، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بزرگی جتلائے اور اگر اللہ تعالیٰ رسول ہی بھیجنا چاہتا تو وہ فرشتوں کو (رسول بنا کر) نازل کرتا۔ اس طرح کی بات ہم نے اپنے پہلے آباؤ اجداد میں تو نہیں سنی۔ (۲۴)

قومِ نوح کی مخالفت کے خدوخال

اس آیتِ کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جو رویہ اختیار کیا اور آپ کی دعوت کے جواب میں جو اعتراضات اٹھائے اور مخالفت میں جو لوگ پیش پیش رہے اس کا ایک منظر سامنے لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جس میں بڑی آسانی سے قریش کی مخالفت کے تمام خدوخال اس طرح نمایاں ہو جاتے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کفر اور شرک کے علم برداروں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب اور مخالفت میں ہمیشہ ایک جیسے اعتراضات کیے۔ ان کا رویہ بھی ایک جیسا رہا اور ایک ہی طبقہ ہے جو ہمیشہ اس مخالفت میں پیش پیش رہا ہے۔ کسی بات میں بھی تو قریش نے ان سے مخالفت نہیں کی۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریش کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں یہ کن لوگوں کا طریقہ رہا ہے؟ اور ایسا کرنے والے کس طرح کے انجام سے دوچار ہوئے ہیں۔

سب سے پہلی جو بات نمایاں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت میں جو لوگ پیش پیش تھے وہ ہمیشہ کی طرح اس قوم کے اہلِ ثروت اور اصحابِ اقتدار تھے۔ انہوں نے ہر دور کے گمراہ لوگوں کی طرح رسول کی دعوت کو اپنے اقتدار اور اپنے نام نہاد مقام و مرتبہ کے خلاف ایک سازش سمجھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر عوام نے پیغمبر کی دعوت کو قبول کر لیا تو ان کے اندر ایک ایسا شعور پیدا ہوگا جو ہماری خود ساختہ عظمتوں کیلئے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ہم نے ایک جیسے انسانوں میں جو اونچ نیچ اور ظالمانہ تفاوت پیدا کر رکھا ہے اس کے پرزے اڑ جائیں گے۔ یہ کل کو ہمارے برابر بیٹھیں گے بلکہ ہماری عظمتوں کو چیلنج کریں گے۔ ہر بات کو دلیل اور انسانیت کے ترازو میں تولیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صدیوں سے جو کچھ ہم اپنے لئے حاصل کر سکے ہیں وہ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس نے ہر دور میں مراعات یافتہ طبقے کو نہ صرف حق سے دور رکھا ہے بلکہ انہوں نے آخری دم تک اہلِ حق کو پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ ایسے ہی لوگوں کی مخالفت اور مظالم کا شکار تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کی مخالفت میں بھی یہی لوگ پیش پیش تھے۔

Marfat.com

دوسری بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کی گمراہیاں بھی مشترک رہی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے جتنے رسولانِ گرامی کا ذکر کیا ہے انہوں نے اپنی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کی مخالفت میں جو باتیں کہیں اور جو اعتراضات اٹھائے ان میں یہ ایک اعتراض ہر قوم کی طرف سے سنا گیا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم بھی آپ کی مخالفت میں سب سے زیادہ اسی اعتراض کو اچھال رہی تھی اور نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں بھی یہی بات بار بار کہی گئی کہ نبوت اور رسالت ایک بہت عظیم منصب ہے جس میں ایک شخص براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہدایت حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ براہِ راست اس سے باتیں کرتا ہے۔ اس پر اپنی وحی اتارتا ہے۔ ایسے عظیم منصب کا حامل ظاہر ہے کوئی بشر تو نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ وہ جب یہ دیکھتے تھے کہ ان کے بڑے بڑے سردار سیرت و کردار کے کیسے بڑے بڑے عیوب اپنے اندر رکھتے ہیں اور کون سی خرابی ایسی ہے جو انسان میں نہیں پائی جاتی؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور کے ابوجہل اور ابولہب درحقیقت انسانیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں، تو کیا ایسے لوگ کبھی نبوت کے منصب پر فائز ہوسکتے ہیں؟ جبکہ وہ منصب سراسر اعلیٰ کردار اور انسانیت کے مرتبۂ علیا کی تعلیم دیتا ہے، لیکن یہ تصور اور خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی ابوجہل یا ابولہب کو نبوت عطا نہیں کی۔ ہر قوم کی طرف جو بھی رسول آیا قوم اس کی معترف رہی کہ یہ شخص اپنے سیرت و کردار کے اعتبار سے پوری قوم میں بے عیب شخصیت کا مالک ہے۔ کبھی کسی قوم نے کسی بھی رسول پر اخلاقی کمزوری کا الزام نہیں لگایا۔ انہیں ہمیشہ نبوت کے دعویدار پر اس کی غربت اور ناداری کے حوالے سے اعتراض رہا اور وہ اس بات کو ہمیشہ اچھالتے رہے کہ جب قوم میں بڑے بڑے سردار موجود ہیں تو تم جو اپنے تئیں نہ کسی بڑے قبیلے کا انتساب رکھتے ہو، نہ تمہارے پاس طاقتور لوگوں کا کوئی جتھا ہے۔ نہ تم دولت و ثروت کا کوئی تفوق رکھتے ہو۔ تو آخر تمہیں نبوت کیوں دی گئی؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں میں اگر کسی انسان کو نبی کے طور پر قبول کرسکتے تھے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ دولت و ثروت، عہدہ و منصب اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے غیر معمولی حیثیت کا حامل ہوتا۔ البتہ! بعض آیاتِ کریمہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنسِ بشر کو جنسِ ملائکہ سے فروتر سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ جنات کو بھی بہت سے حوالوں سے اہمیت دیتے تھے لیکن انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ کسی جن کو نبوت عطا کی جانی چاہئے تھی۔ البتہ! فرشتوں کے تقدس ان کی معصومیت اور نورانی مخلوق ہونے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی ایک عظمت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ ہر لحاظ سے انسانوں سے افضل مخلوق ہیں اس لئے نبوت اگر دی جاسکتی تھی تو فرشتوں کو دی جانی چاہئے تھی۔ یہ لوگ دراصل ایک غلط فہمی کا شکار تھے۔ ان کے اندر اس بات کا یقین پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ اللہ نے جنسِ بشر کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ یہ وہ مخلوق ہے جسے مسجودِ ملائکہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ نے اس کے اندر نفخِ روح کو اپنی طرف منسوب کر کے اسے خاص اہمیت عطا کی ہے۔ وہ علّم آدم الاسماء کے تمغۂ امتیاز کی حقیقت سے ناآشنا تھے اور دوسری یہ بات کہ نہ جانے یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہو جاتی تھی کہ اللہ کا نبی انسانوں کی ہدایت اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا جاتا ہے؟ نبی کی زندگی لوگوں کیلئے ایک نمونہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگیوں کے چراغوں کو اس کی زندگی کے چراغ سے روشن کرتے ہیں۔ وہ انہیں جس بات کی تعلیم دیتا ہے خود اس پر نہ صرف عمل کر کے دکھاتا ہے بلکہ ان کے سامنے عمل کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ اقدارِ انسانیت، مکارمِ اخلاق، بے نفسی و بے غرضی اور اللہ کی عبادت اور اس کی محبت کی وہ اعلیٰ مثالیں قائم کرتا اور چھوڑ کر جاتا ہے جو ہمیشہ انسانوں کیلئے منارۂ نور ثابت ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے جو شخص بھی غور کرے گا اس کیلئے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ یہ مثالیں اسی صورت میں قابلِ اتباع اور قابلِ تقلید ثابت ہوسکتی ہیں جبکہ اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کی جنس ایک ہو۔ احساسات

Marfat.com

میں اشتراک پایا جاتا ہو۔ انفعالات یکساں ہوں۔ جسمانی عوارض دونوں کو لاحق ہوتے ہوں۔ جسمانی ضرورتیں دونوں کو پریشان کرتی ہوں۔

لیکن انسان کی نارسائیِ فکر اور بے بصیرتی اور عقیدت ومحبت میں غلو ایسے عوارض ہیں جس سے انسان بہت کم چھٹکارا حاصل کر پاتا ہے۔ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ جن بزرگوں سے لوگوں کو عقیدت ہو جاتی ہے ان کی زندگی کے بعد ان کے بارے میں عجیب وغریب تصورات پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسی چیزوں کو بہت خوبی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اس طرح کی باتیں کہ فلاں بزرگ تو اس حد تک خدا رسیدہ تھے کہ بارہ سال تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا اور کسی کے بارے میں یہ شہرت کہ وہ کسی کنویں میں کئی سال تک الٹے لٹکے رہے اور کسی کے بارے میں اس طرح کی بے سروپا باتیں کہ انہوں نے کئی سال صرف مٹی کھانے پر اکتفا کیا۔ یہ تصورات ان لوگوں کے ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کا چراغ موجود ہے۔ اس کے باوجود حال یہ ہے ۔

اللہ کے کچھ بندے معبود ہی بن بیٹھے
لوگوں میں نظر آئی جو خوئے جبیں سائی

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ کے رسول کی مخالفت میں قوموں نے جو حربے استعمال کئے ہیں ان میں یہ بھی ایک حربہ ہمیشہ استعمال ہوتا رہا کہ ان کی نیتوں پر ہمیشہ شبہ کیا جاتا رہا کہ یہ لوگ بظاہر تو درویش اور مسکین دکھائی دیتے ہیں اور ہر وقت آخرت کی باتیں کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اقتدار کے بھوکے ہیں۔ اس پر صاحبِ تفہیم القرآن نے ایک نوٹ لکھا ہے اسے مفید سمجھتے ہوئے ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں۔

یہ بھی مخالفین حق کا قدیم ترین حربہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کیلئے کوشش کرنے اٹھے اس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں۔ بس اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضر موسیٰ اور ہارون پر لگایا تھا کہ تم اس لئے اٹھے ہو کہ تمہیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے۔ تکون لکما الکبریاء علی الارض (یونس آیت ۷۸) یہی الزام حضرت عیسیٰ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے اور اسی کا شبہ نبی ﷺ کے متعلق سردارانِ قریش کو تھا۔ چنانچہ کئی مرتبہ انہوں نے آپ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو ''اپوزیشن'' چھوڑ کر ''حزبِ اقتدار'' میں شامل ہو جاؤ، تمہیں ہم بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادی فائدوں اور اس کی شان وشوکت ہی کیلئے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں ان کے لئے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اسی دنیا میں کوئی انسان نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاح انسانیت کی خاطر اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر واقتدار جمانے کیلئے دلفریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے دعوے شب وروز استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ مکاری وفریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر وفریب کے سوا کسی صداقت اور خلوص کے ساتھ کبھی لیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ ان کا اپنا ہم جنس ہی ہوگا اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف ''اقتدار کی بھوک'' کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انہیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں۔ البتہ! نہایت قابل ملامت ہے وہ جس کے لئے یہ ''غذا'' پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی ''بھوک'' محسوس کر رہے ہیں۔

Marfat.com

اسی طرح یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کیلئے اٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ ونظام پیش کرے گا۔ اس کیلئے بہرحال یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِ راہ ہوں انہیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ ونظام کو عملاً نافذ کرسکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہوگی اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی یا اس کے حامیوں اور پیروں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیاء اور مصلحین عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا۔ اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنادیا؟ پھر کیا یہ امرِ واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کردینے کیلئے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کرلی؟ ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصد خیر کے لئے مطلوب ہونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کردے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجہ میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ صرف اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت دونوں کے طریق کار اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کرسکتا۔

چوتھی بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بشریت اور نبوت میں تضاد واضح کرنے اور دعویٰ نبوت کرنے والے کی ذات کو مشتبہ قرار دینے کے بعد یہ عقلی دلیل دی کہ ہمیں زندگی میں راہنمائی کیلئے کسی نبی کی حاجت نہیں۔ ہم اپنے معاملات میں رہنمائی کے حوالے سے خود کفیل ہیں۔ ہمارا کوئی معاملہ بھی الجھا ہوا نہیں۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی کیلئے ضرور کسی نبی کو بھیجنے والا ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ کسی بشر کو بھیجنے کی بجائے فرشتوں میں سے کسی کو اس عظیم کام کیلئے بھیجتا کیونکہ بشر تو سرے سے اس کا اہل ہی نہیں تو جب اس نے کسی فرشتے کو نہیں بھیجا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اس دعویٰ نبوت میں جھوٹا ہے۔

پانچویں بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے یہ کہا کہ اس شخص کے دعویٰ نبوت کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم نے اپنے باپ دادا سے اور انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے کبھی یہ نہیں سنا کہ کوئی بشر بھی نبی ہوسکتا ہے۔ ہمیں دین اپنے اسلاف سے ملا ہے، ہمارے آباؤ اجداد اس دین کے وارث تھے، اس لئے جس بات کو وہ غلط قرار دیتے ہیں یا جو بات انہوں نے کبھی اپنے بڑوں سے نہیں سنی وہ ایک ایسی نئی بات ہے جس کی حیثیت بدعت سے زیادہ نہیں۔ سورہ قصص میں اسی حقیقت کو دہراتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًى وَّمَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِىۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۳۶﴾

''یہ محض ایک جادو ہے جس کو جھوٹ موٹ اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور اس طرح کی باتیں ہم نے اگلوں میں تو کبھی سنی نہیں''۔

Marfat.com

یہ پانچ باتیں جو حضرت نوح علیہ السلام کی مخالفت میں آپ کی نبوت کو رد کرتے ہوئے ان کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کہیں۔ یہی باتیں آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں قریش بھی کہہ رہے تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم جو نوح علیہ السلام کی مخالفت کی پاداش میں عذاب کا شکار ہوئی اور دنیا میں آج تک سامانِ عبرت بنی ہوئی ہے اس کے یہ نمایاں اوصاف ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے ایک ترتیب سے بیان کردیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ قریش انہیں باتوں کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں جبکہ یہی باتیں ان کی تباہی کا باعث بننے والی ہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

یہ تو بس ایک ایسا شخص ہے جسے جنون کا مرض ہوگیا ہے تو کچھ دن اس کا انتظار کرو۔ ۲۵)

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جب دیکھا کہ نوح علیہ السلام کی باتوں اور آپ کی تعلیمات سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں اور آپ صرف اس دنیا کے بارے میں نہیں بلکہ آنے والی دنیا کے بارے میں اور بعض ان دیکھے حقائق کے حوالے سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو دوسروں کی گرفت میں نہیں آسکتیں اور نہ انسانی علم اس تک رسائی رکھتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کا اللہ کے ساتھ کوئی خاص رشتہ ہے اور آپ کے قول کے مطابق واقعی آپ پر فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے اور اسی ذریعے سے آپ کو ان حیران کن باتوں کی خبر ہوتی ہے۔تو قوم کے سرداروں نے آپ کے اثر کو روکنے اور آپ کی دعوت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کیلئے یہ بات کہنا شروع کی کہ تم اس پیغمبر کی باتوں سے متاثر نہ ہونا اس کے دعووں کو حقیقت نہ جاننا، اس پر نہ تو کوئی وحی اترتی ہے نہ فرشتہ نازل ہوتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی خلل واقع ہوگیا ہے اور اس خلل کے نتیجے میں الٹی سیدھی باتیں اس کے دماغ میں آتی ہیں اور انہیں کو وہ وحی سمجھ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کردیتا ہے۔تو بجائے اس کی باتوں کو قبول کرنے کے تم انتظار کرو ہوسکتا ہے کہ اسے جنون سے افاقہ ہوجائے اور یہ خود بخود تسلیم کرے کہ میں نے جو کچھ کہا وہ سراسر خللِ دماغ کا نتیجہ تھا۔

قرآنِ کریم نے قریش کے بارے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو شاعر ٹھہراتے تھے اور آپ کی تعلیمات اور تبلیغ و دعوت کے اثرات کو روکنے کیلئے یہ بات کہا کرتے تھے کہ ہر شاعر وقتی طور پر اپنے زورِ بیان کے نتیجے میں بعض لوگوں پر اپنا اثر قائم کرلیتا ہے لیکن کلام کا یہ سحر عارضی ہوتا ہے۔شاعرانہ خیال آرائی چندروز کی گرماگرمی تو پیدا کرسکتی ہے کسی مستقل تبدیلی کا ذریعہ نہیں ہوتی۔تو اس لئے تم انتظار کرو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی باتیں بھی ہوا میں تحلیل ہوجائیں گی۔ ہوسکتا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اس طرح کی باتیں بھی آپ کے بارے میں کہی ہوں۔ بہرحال ہر دور میں وقت کے لیڈر جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلاح مصلح یا نجات دہندہ لوگوں کا مرجع بنتا جارہا ہے تو اس کے اثرات کو ناکام کرنے کیلئے ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں اور ہر پیغمبر کی قوم نے پیغمبر کے بارے میں ایسی ہی باتیں کہیں۔

موجودہ دور کے مخالفین کی ذہنی عصبیت

آج کے دور کو علم و ہنر کا دور اور روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔اہلِ مغرب نے خاص طور پر یہ تأثر دے رکھا ہے کہ ہم ہر اس بات کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں جسے دلیل کی زبان میں کہا جائے اور جس کے صحیح ہونے پر واضح قرائن موجود ہوں۔لیکن یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ آج کے دور کا مستشرق اور علمی حیثیت سے مذاہب پر محاکمہ کرنے والے دانشور اور جدید تحقیق کے نام سے تقابلِ ادیان پر کام کرنے والے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں اس طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں جسے اندھی مذہبی

Marfat.com

عصبیت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً وہ قرآنِ کریم کے بارے میں تسلیم کرتے ہیں کہ جس شکل وصورت میں آنحضرت ﷺ نے اسے اپنے صحابہ کے سپرد کیا تھا آج تک اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں ہوئی اور ساتھ ہی وہ اس بات کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ دنیا کی کوئی کتاب بلکہ کوئی دستاویز اتنے طویل عرصے تک اپنی اصلی حالت پر کبھی قائم نہیں رہی۔ تو بجائے اس کے کہ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب تسلیم کرلیں وہ عجیب وغریب تاویلوں کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں تسلیم کرتے ہیں کہ آپ سیرت وکردار کے اعتبار سے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ آپ کے بارے میں جھوٹ کا گمان نہیں کیا جاسکتا اور یہ بات بھی انہیں تسلیم ہے کہ آپ ذہانت وفطانت اور حکمت وتدبیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بااین ہمہ! انہیں اللہ کا رسول ماننے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم تسلیم کرتے ہو کہ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور انہوں نے تیئس (۲۳) سالہ دورِ نبوت میں بڑے اصرار کے ساتھ اپنے آپ کو بطور نبی اور رسول کے پیش کیا۔ اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے تھے تو پھر تم ان کے نبی ہونے سے کیسے انکار کرتے ہو؟ لیکن آدمی ان کے انکار اور اس کے حق میں تاویلوں کو پڑھ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ منٹگمری واٹ جیسا عالمی شہرت کا محقق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے سالوں تک اہلِ عرب کی گمراہیوں پر حرا کی تنہائیوں میں غور وفکر کیا تھا اور برسوں گہرے دکھ اور فکر میں گزارے تھے کہ کس طرح لوگوں کو ان گمراہیوں سے نکالا جائے۔ اچانک ایک دن ان کے اندر کی وہ آواز جو ان گمراہیوں کے بارے میں ردِعمل کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ ان کے لئے باہر کی آواز بن گئی اور وہ اس آواز کو وحی کی اور فرشتے کی آواز سمجھنے لگے اور یہ گمان کرنے لگے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی اترتی ہے۔ اندازہ کیجئے! جس شخص کی ذہانت وفطانت اور حکمت ودانش کے بلند بانگ دعوے کیئے جاتے ہیں وہ اس طرح کی سادگی کا ثبوت دے سکتا ہے کہ اسے تیئس (۲۳) سال تک یہ معلوم نہ ہوسکے کہ میں جسے اللہ کی وحی سمجھتا ہوں وہ تو سراسر میرے اندر کی آواز ہے جبکہ نزولِ وحی کی کیفیات کو بیسیوں راویوں نے چشم دید واقعات کے طور پر بیان کیا ہے اور وہ وحی جس زبان میں نازل ہوتی رہی ہے اور آج بھی وہ دنیا کے سامنے موجود ہے اس کی فصاحت وبلاغت اور اس کی معجز بیانی کا جواب دینے سے اس وقت بھی دنیا عاجز تھی اور آج بھی عاجز ہے۔ اس وحی نے جو ایک مکمل نظامِ فکر اور نہایت مرتب ضابطۂ حیات دیا ہے کسی مذہب کے پاس اس کا جواب نہیں اور اس نے صدیوں تک دنیا کی سب سے بڑی ریاست کا نظام چلایا ہے۔ اور اس کی تعلیم نے ان لوگوں کو دنیا کا امام بنایا ہے۔ جو دنیا کی سب سے جاہل اور اجڈ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان باتوں کا آج کی عیسائی اور یہودی دنیا کے پاس کوئی جواب نہیں لیکن انہیں اپنے کفر اور اپنے متعصبانہ رویے پر شرمندگی کی بجائے اصرار ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے پیچھے ایک علمی اندازِ فکر اور نہایت غیر متعصب رویہ کارفرما ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

حضرت نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب! تو اس چیز سے میری مدد فرما جس میں انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ ۲۶)

حضرت نوح ؑ کی نزولِ عذاب کیلئے دعا

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آپ کی نبوت ورسالت کو تسلیم کرنے کی بجائے جب آپ کے قتل کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور یہ فیصلہ کرلیا کہ اس نبی اور اس کی دعوت کو ہر ممکن طریقے سے مٹا دیا جائے۔ تو تب حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ الٰہی! میرے پاس نہ افرادی قوت ہے اور نہ اقتدار کی ہیبت۔ تیری تائید ونصرت کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں نے شب وروز اپنی قوم کو سمجھایا اور

Marfat.com

تبلیغ ودعوت کے ذریعے سے ان پر اتمامِ حجت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ لیکن انہوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر مجھے اور مجھ پر ایمان لانے والوں کو اس حد تک اذیتیں پہنچائی ہیں کہ ہمارا جینا مشکل کر دیا ہے۔ رَبِّ اِنِّی مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ”اے میرے رب! میں دبا لیا گیا ہوں، پس تو ان سے میرا بدلہ لے اور میری مدد فرما“۔ (القمر:١٠) اور سورہ نوح میں فرمایا: وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۝ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ۝ (نوح: ٢٦، ٢٧) ”اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا اے میرے پروردگار! اس زمین پر کافروں میں سے ایک بسنے والا بھی نہ چھوڑ۔ اگر تو نے انہیں رہنے دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان کی نسل سے بدکار منکرینِ حق ہی پیدا ہوں گے“۔ ان دعاؤں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس عذاب کو نازل کرنے کی درخواست کی ہے جس سے ہر رسول نے اپنی قوم کو ڈرایا ہے اور جو اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد قوموں پر نازل ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد کسی کو زندہ رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا بلکہ ایسی مکمل تباہی ہوتی ہے کہ صدیوں تک وہ قوم آنے والے لوگوں کیلئے سامانِ عبرت بن جاتی ہے۔ قریش کو ان مثالوں سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تم اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر ایمان نہیں لاؤ گے تو تمہارا انجام بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب ایسا موقع آتا ہے یعنی اتمامِ حجت ہو جاتا ہے تو پیغمبر کو ہجرت کرنے کا حکم ملتا ہے۔ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے ہجرت کے ذریعے بچا لیے جاتے ہیں اور جن لوگوں کی طرف براہِ راست اللہ کے نبی کی بعثت ہوتی ہے انہیں تباہ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب ایسے موقع پر اللہ سے دعا کی تو اللہ کا حکم آیا۔

فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُکْ فِیْهَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝٢٧

تو ہم نے حضرت نوح کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق ایک کشتی تیار کیجئے۔ تو جب ہمارا عذاب آ جائے اور تنور ابل پڑے تو اس میں ہر چیز کے جوڑے رکھ لو اور اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو بجز ان کے جن کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہئے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ وہ لازماً غرق کئے جائیں گے۔ (٢٧)

بعض اجمالات کی وضاحت

حضرت نوح علیہ السلام کی پوری سرگزشت سورہ ہود میں گزر چکی ہے۔ تفصیل کیلئے اس کی طرف مراجعت کی جانی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما چکے تھے کہ اس قوم پر پانی کا عذاب بھیجا جائے گا۔ اس لئے حضرت نوح اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بچانے کیلئے یہ حکم دیا گیا کہ آپ ایک بڑی کشتی تیار کیجئے اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ کشتی کے بارے میں جزئیات کی حد تک پوری تفصیل وحی کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام کو بتا دی گئی تھی اور یہ بھی اطمینان دلایا گیا تھا کہ اس قوم کے اشرار جب آپ کو کشتی بناتا ہوا دیکھیں گے تو یقیناً مذاق اڑائیں گے۔ ممکن ہے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اس لئے کسی بھی حادثے سے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔ دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کا عذاب پانی کے سیلاب کی شکل میں آئے گا اس کا آغاز تنور

Marfat.com

کے ابلنے سے ہوگا۔ جیسے ہی تنور سے پانی بہنے لگے آپ فوراً اپنی تیاری شروع کر دیجئے۔ بعض لوگوں نے تنور سے مراد زمین لی ہے اور بعض کے نزدیک زمین کا بلند ترین حصہ مراد ہے اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ تنور ابلنے کا مطلب طلوعِ فجر ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ "حمی الوطیس" کی طرح کا ایک استعارہ ہے۔ جس کا معنی ہوتا ہے ہنگامہ گرم ہو جانا۔ یعنی جب سیلاب کا آغاز زمین، فضا اور آسمانوں سے ہو جائے تو آپ کو کشتی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔ لیکن یہ تمام اس لفظ کے مجازی معنی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ مجازی معنی اس وقت لئے جاتے ہیں جبکہ ظاہری معنی لینا متعذر ہوں۔ یا ظاہری مفہوم لینے میں کوئی قباحت ہو۔ لیکن یہاں تنور کو اگر تنور ہی کے معنی میں لیا جائے تو نہ اس میں کوئی قباحت ہے اور نہ اس میں کوئی مشکل پیش آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جہاں کہیں بھی طوفانِ نوح کا ذکر کیا ہے وہاں تنور ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگر یہ کوئی استعارہ ہوتا تو کہیں کسی جگہ دوسرا لفظ بھی استعمال کیا جاتا۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں اس کا ظاہری معنی ہی مراد ہے۔ تاثر دینا شاید یہ مقصود ہے کہ جو تنور ہمیشہ آگ اگلتا ہے اللہ کی قدرت دیکھو جب اس کا عذاب آئے گا تو وہی تنور طوفانِ نوح کے آغاز کا اعلان کرے گا اور تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جب طوفان کا آغاز ہو جائے تو پھر تم ہر چیز کا ایک ایک جوڑا اپنے اہلِ خانہ اور صاحبِ ایمان لوگوں کو ساتھ لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ "کُلٍّ" یہاں معہودِ ذہنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ تمام جانور جو براہِ راست انسان کی معاشی ضرورت سے تعلق رکھتے ہیں "اثنین، زوجین کی وضاحت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی ہر چیز میں سے نر اور مادہ دو دو رکھ لئے جائیں۔ البتہ! اہلِ خانہ میں سے صرف وہ لوگ کشتی پر سوار کئے جائیں جو ایمان لا چکے ہیں اور جو ایمان نہ لانے کے باعث اللہ کے عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں انہیں کشتی پر سوار نہ کیا جائے اور ساتھ ہی مزید ایک ہدایت بھی فرمائی کیونکہ اللہ سے بڑھ کر اور کون جان سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام دعا میں اگرچہ سخت الفاظ استعمال کر چکے ہیں لیکن جب وہ اپنی قوم کے لوگوں کو طوفان میں ڈوبتا ہوا دیکھیں گے تو ان کے پیغمبرانہ خصائل شاید انہیں خاموش نہ رہنے دیں۔ انسانی ہمدردی اور شفقت کا جذبہ انہیں مجبور کرے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیں اس لئے فرمایا کہ ان لوگوں نے مسلسل شرک اور تمرد کے باعث بندگی اور انسانیت کا ہر رشتہ توڑ ڈالا ہے۔ اس لئے اب یہ کسی رحم و مروت کے مستحق نہیں ہیں۔ انہیں ڈوبتا ہوا دیکھ کر مجھ سے کسی قسم کی درخواست نہ کرنا۔ ان کے غرق ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اس لئے یہ غرق ہو کر رہیں گے۔

فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَکَ عَلَی الْفُلْکِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾

پس جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی میں اچھی طرح بیٹھ جائیں تو آپ کہیے کہ شکر ہے اس اللہ کیلئے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔ ۲۸) اور یہ بھی عرض کیجئے کہ اے رب! تو مجھے اتار مبارک اتارنا اور تو بہترین اتارنے والا ہے۔ ۲۹)

کشتی پر سوار ہونے والے اور ان کی دعا

یہ کشتی پر سوار ہونے والے کون لوگ ہیں؟ ان میں حضرتِ نوح اللہ کے وہ عظیم رسول ہیں جنہوں نے نو صدیوں تک اس قوم کو اللہ کی طرف بلایا اور اس کے عذاب سے ڈرایا اور ان کے ساتھ آپ کے اہلِ خانہ اور ان لوگوں کی مختصر سی تعداد ہے جنہوں نے قوم کی سنگدلانہ اذیتوں کے باوجود اللہ پر ایمان لانے کی جرأت کی اور پھر نہ جانے کب سے وہ ان مصائب کی چکی میں پستے چلے آ رہے ہیں۔ اب جبکہ وہ ایک عافیت

Marfat.com

کدہ میں اپنی جانیں بچا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو اس سے چند لمحے پہلے تک ان کی قوم کی طرف سے ان کی زندگیاں اور ان کے مال، ان کے بچے اور ان کے گھر، انتہائی خطرے میں تھے۔ کسی وقت بھی ان پر ہلاکت و تباہی کی قیامت ٹوٹ سکتی تھی۔ اب وہ لوگ جو صدیوں تک سرکشی اور تمرد کا صور پھونکتے رہے اور جنہوں نے کبھی کوئی نصیحت اور حق کی بات سن کے دینا بھی گوارا نہ کیا۔ اور جن کا گمان یہ تھا کہ ہم اس دھرتی کی فیصلہ کن قوت ہیں کوئی ہمیں چیلنج نہیں کر سکتا اب وہ ان بے بس اور بے کس مسلمانوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں۔ کشتی لحہ بہ لحہ پانی کی لہروں پر بلند ہوتی جا رہی ہے اور سیلاب کی طغیانی اس حد تک زوروں پر ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی پانی میں ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ مظلوم لوگ نہایت اطمینان اور راحت کے ساتھ کشتی میں سوار ہیں اور پانی کا کوئی جھونکا اندر آ کر ان کی پریشانی کا باعث بننے کی جرأت نہیں کر رہا۔ ایسی حالت میں انہیں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ آپ اللہ کا شکر ادا کیجئے اور یہ دعا کیجئے کہ الٰہی تیرا شکر ہے کہ ہم بے وسیلہ اور بے کس لوگوں کو ان ظالم درندوں سے تو نے بچایا۔ ظاہر ہے کہ اس موقع سے بڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنے کا اور کونسا موقع ہو سکتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ کشتی جن منزلوں کی طرف بڑھ رہی ہے وہ آپ کے لئے ان دیکھی اور ان جانی منزلیں ہیں۔ زندگی کے وسائل کے اعتبار سے ہر چیز تباہی کی نذر ہو گئی ہے۔ زمین پر نہ کوئی جائے پناہ باقی ہے اور نہ اشیائے ضرورت کی کوئی چیز۔ لیکن ایک آستانہ ایسا ہے جس کی پناہ ایسی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ زمین پر ہمارا کوئی اپنا نہیں جس کے پاس جا سکیں۔ صرف تیرا ایک آستانہ ہے اس لئے ہم صرف تیرے مہمان ہیں تو ہمارا میزبان ہے۔ جس طرح تو نے ہمیں ان ناہنجاروں سے بچایا ہے اسی طرح کسی مبارک منزل پر ہمیں اتار، تجھ سے بڑھ کر بہتر اتارنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ دعا چونکہ اللہ کی طرف سے سکھائی گئی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ صرف دعا نہیں بلکہ فوز و فلاح کی بشارت بھی ہے۔ اس میں دوسرے لفظوں میں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ تم ایک بہترین میزبان کے مہمان ہو۔ وہ تمہیں جہاں بھی اتارے گا اس سرزمین کو تمہارے لئے بہتر بنائے گا۔ وہیں تم پھولو پھلو گے۔ تمہاری افرادی تعداد کتنی بھی کم صحیح لیکن اللہ کی قدرت تو کم نہیں وہ تم ہی چند افراد اور تھوڑے سے وسائلِ معاش سے دنیا کو پھر آباد کرے گا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ ﴿۳۰﴾

بے شک اس سرگزشت میں بڑی نشانیاں ہیں اور بے شک ہم امتحان کرنے والے ہیں۔ (۳۰)

سرگزشت میں مضمر نشانیاں

قرآنِ کریم قصہ گوئی کی کتاب نہیں وہ محض قصہ گوئی کیلئے کسی سرگزشت کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے پیشِ نظر چند حقائق کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ اس سرگزشت میں غور کرنے والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ سب سے پہلی نشانی تو یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس دنیا کو پیدا کرنے کے بعد اس طرح لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھا کہ وہ اپنی مخلوق کو رزق پہنچانے کا انتظام نہ کرے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے جہاں جہاں اس کی مخلوق ہے وہیں وہیں اس کی ربوبیت کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ اسی طرح انسانوں کو چونکہ اس نے مکلف بنایا ہے اس لئے تکلیفِ شرعی کی ذمہ داری عائد کر دینے کے بعد وہ لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ اس کی رہنمائی کیلئے اس نے اپنے رسول بھیجے۔

Marfat.com

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے رسولوں کی تبلیغ ودعوت کی تکذیب کرتے ہیں۔ انہیں ایک خاص حد تک تو مہلت دی جاتی ہے لیکن جب اللہ کے رسولوں کی طرف سے ان پر اتمام حجت ہو جاتی ہے تو پھر اس قوم کی مہلتِ عمل بھی ختم کردی جاتی ہے۔ پھر اللہ کا عذاب آتا ہے جس سے انہیں کوئی چھڑا نہیں سکتا۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کسی جگہ کا اقتدار عطا فرماتا ہے اور اپنی زمین کے وسائل ان کے حوالے کرتا ہے تو انہیں ساتھ ہی آزمائش میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ ان کا اقتدار اس بات کا اجازت نامہ نہیں ہوتا کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں بلکہ وہ انہیں دیکھتا رہتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں اور جب وہ اپنے اقتدار سے بدمست ہو کر اپنے خالق ومالک سے بغاوت کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو پھر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔

اس سرگزشت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رسولوں کی دعوت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اسی طرح ان کے مخالفین کی مخالفت کا انداز بھی ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ یہ حقیقت اگر پیشِ نظر رہے تو ہر دور کے اہلِ حق جب مصائب سے گزرتے ہیں تو ہر دور کے رسولوں کو بالآخر جو فوز وفلاح نصیب ہوتی ہے وہ ان کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے اور ہر دور کے اہلِ باطل اگر معذب قوموں کی تاریخ سامنے رکھیں اور قومِ نوح کا انجام ان کے سامنے ہو تو انہیں یہ بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آسکتی کہ ہم کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾

پھر ان کے بعد ہم نے دوسرے لوگ اٹھائے۔ (۳۱)

عاد وثمود کی طرف اشارہ

قرن، جس طرح صدی کے معنی میں آتا ہے اسی طرح ایک قوم کے افراد کے بارہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو غرق کردیئے جانے کے بعد دوسری قوم اٹھائی۔ اس سے مراد قومِ عاد اور قومِ ثمود ہے کیونکہ سورہ اعراف سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح کے بعد قومِ عاد آئی ہے اور اس کے بعد قومِ ثمود، اور ان قوموں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح آزمائش میں ڈالا جس طرح قومِ نوح کو ڈالا گیا تھا۔ طوفانِ نوح سے اس وقت کی معلوم دنیا، کہا جاتا ہے کہ مکمل طور پر تباہ کردی گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد اور آپ پر ایمان لانے والوں کی اولاد سے دوبارہ اس دنیا کو آباد کیا۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣٢﴾

پھر ہم نے ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا اس دعوت کے ساتھ کہ اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم اس سے ڈرتے نہیں ہو۔ (۳۲)

قومِ نوح کے بعد دیگر قوموں کی طرف رسولوں کی بعثت

قومِ نوح کی تباہی کے بعد اللہ بہتر جانتا ہے زمین کی آبادی میں کتنا عرصہ لگا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام آپ کی اولاد اور آپ پر ایمان لانے والوں کی اولاد سے نئی دنیا آباد ہوئی۔ ان میں سے ہر مرنے والا شخص اپنے پسماندگان کو یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم جس نے انسانوں کو از سرِ نو زندگی بخشی اور وہ طوفان جو اللہ کے نبی کی تکذیب اور اس کی لائی ہوئی شریعت

Marfat.com

پر ایمان نہ لانے کے نتیجے میں تباہی کا سبب بنا، کے بارے میں سب کچھ بتا کر جاتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمین کی اس نئی آبادی میں کئی نسلوں تک شیطان کو گمراہی پھیلانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے حقیقت سے دور ہٹنا اور شیطان کے پھیلائے ہوئے گمراہی کے جال میں پھنسنا شروع کیا۔ آخر ایک وقت آیا جب حق مغلوب ہونے لگا اور باطل کا چلن دھرتی میں عام ہوگیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں ان کی ہدایت کیلئے اپنے رسول بھیجے۔ کہا جاتا ہے کہ قومِ نوح کے بعد جس قوم میں اللہ کے رسول آئے وہ قومِ عاد تھی اور ان کی تباہی کے بعد پھر قومِ ثمود کی طرف رسول مبعوث ہوئے۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف جو رسول آئے وہ یقیناً انہیں قوموں سے اپنا جنسی اور نسبی تعلق رکھتے تھے، یعنی نہ وہ جن تھے اور نہ فرشتے بلکہ ان انسانوں میں سے ایسے انسان تھے جنہیں اللہ نے اس دور کی گمراہیوں سے محفوظ رکھا تھا اور وقت آنے پر اللہ نے انہیں پیامبری کے لئے اٹھایا اور لوگوں کی ہدایت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی۔

دعوت میں وحدت

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوموں کے سامنے وہی دعوت پیش کی جو نوح علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے پیش کر چکے تھے، یعنی ایک اللہ کی عبادت۔ جس میں کسی اور کے شرکت کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ اندازہ کیجئے کہ جو دعوت حضرت نوح علیہ السلام لے کر مبعوث ہوئے وہی دعوت بعد کی قوموں میں مبعوث ہونے والے انبیاء کرام پر نازل کی گئی جبکہ ان رسولوں کی آپس میں ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے زمانوں میں طویل فاصلہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کی دعوت سے زمینی وسائل کی حد تک بالکل بے خبر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی دعوت میں جو انتہا درجے کی وحدت اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ وہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سب کا سرچشمۂ ہدایت ایک ہے اور اسی سرچشمۂ ہدایت کا وہ فیضان ہے جو آج نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے قریش تک پہنچ رہا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ
كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَا اِلَّا
بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾
وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ
اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ
لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا

Marfat.com

نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٣٧﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَّ
مَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا
قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ
غُثَاءً فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿٤١﴾ ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا
اٰخَرِينَ ﴿٤٢﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿٤٣﴾ ثُمَّ
أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ فَأَتْبَعْنَا
بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيثَ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٤٤﴾
ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسٰى وَأَخَاهُ هٰرُونَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٤٥﴾
إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴿٤٦﴾ فَقَالُوا
أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُونَ ﴿٤٧﴾ فَكَذَّبُوهُمَا
فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴿٤٨﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ
يَهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَا إِلٰى
رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِينٍ ﴿٥٠﴾

رکوع: ۳۔ توان کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ہم نے دنیا کی زندگی میں انہیں خوشحالی دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہے یہ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ ۳۳) اور اگر تم پیروی کرنے لگے اپنے جیسے بشر کی تو تم بہت نقصان اٹھانے

Marfat.com

والے ہو جاؤ گے۔ ۳۴) کیا وہ تمہیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں قبروں سے نکالا جائے گا۔ ۳۵) عقل سے بعید ہے بالکل بعید، یہ ڈراوا، جو تمہیں سنایا جا رہا ہے۔ ۳۶) زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے یہیں ہم مرتے ہیں اور یہیں ہم جیتے ہیں، اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔ ۳۷) وہ تو ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ پر ایک جھوٹ گھڑا ہے۔ اور ہم تو قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ۳۸) پیغمبر نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز کے ساتھ جس میں انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ ۳۹) اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب یہ لوگ اپنے کئے پر نادم ہو کر رہیں گے۔ ۴۰) آخر کار ٹھیک حق کے مطابق ایک سخت ڈانٹ نے ان کو آ پکڑا۔ تو ہم نے ان کو خس و خاشاک کر دیا۔ تو برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے۔ ۴۱) (پھر ہم نے ان کے بعد کئی قومیں پیدا فرمائیں۔ ۴۲) کوئی قوم اپنی اجلِ معین سے نہ بڑھ سکتی ہے اور نہ وہ اس سے پیچھے ہی ہٹ سکتی ہے۔ ۴۳) پھر ہم نے اپنے رسول یکے بعد دیگرے بھیجے۔ جب آیا کسی قوم کے پاس اس کا رسول تو انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور ان کو افسانہ بنا دیا۔ پس اللہ کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لاتی۔ ۴۴) پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو بھیجا اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر۔ ۴۵) فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی تکبر کیا اور وہ نہایت مغرور لوگ تھے۔ ۴۶) تو انہوں نے کہا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں در آں حالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے۔ ۴۷) پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں سے ہو گئے۔ ۴۸) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی تا کہ وہ ہدایت پائیں۔ ۴۹) اور ہم نے مریم کے فرزند اور ان کی والدہ کو ایک عظیم نشانی بنایا۔ اور انہیں ایک پر سکون اور چشمے والی بلند جگہ پر ٹھکانہ دیا۔ ۵۰)

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۙ مَاهٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

تو ان کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ہم نے دنیا کی زندگی میں انہیں خوشحالی دے رکھی تھی، کہا کہ یہ تو بس تمہارے ہی مانند ایک بشر ہے یہ وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ ۳۳) اور اگر تم پیروی کرنے لگے اپنے جیسے بشر کی تو تم بہت نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ ۳۴)

Marfat.com

دعوت الی اللہ کی مخالفت کرنے والے

اس آیتِ کریمہ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے ہمیشہ وہ لوگ رہے ہیں جن کے ہاتھوں میں قومی قیادت ہوتی ہے اور جو اپنے دور کے سربرآوردہ لوگ ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ کے نبیوں کی دعوت کو وہ اپنے لئے خطرے کی علامت سمجھتے ہیں اور وہ اس حقیقت کو پالیتے ہیں کہ اس دعوت کے نتیجے میں جب مصنوعی طبقات ختم ہوں گے اور انسانی ذہنوں سے اونچ نیچ کا تصور مٹے گا۔ تو ہماری سرداریاں باقی نہیں رہیں گی۔

متکبرین کی چند صفات

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان مخالفین اور متکبرین کی کچھ مشترکہ صفات ہیں۔ جن سے ان کے طغیان اور رعونت کو اصل غذا ملتی ہے۔ ان میں پہلی چیز یہ ہے کہ وہ آخرت کے منکر ہوتے ہیں اور اللہ کے سامنے پیشی کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ جس طرح کی زندگی گزارتے ہیں اس پر مطمئن ہوتے ہیں وہ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ اس رویے کے باب میں کسی کے سامنے کبھی جوابدہ بھی ہونا پڑے گا۔

تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے بگاڑ کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ انتہائی مالدار اور خوشحال لوگ ہوتے ہیں اور اپنی خوشحالی کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ اس فتنے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہماری یہ دنیوی کامیابیاں ہمارے عقیدہ اور عمل کی صحت کی دلیل ہیں۔ اگر ہمارے طرزِ عمل میں کوئی خرابی ہوتی تو ہمیں اللہ تعالیٰ اپنی قوم کی سرداری اور امارت و ثروت کبھی عطا نہ کرتا اور اسی سوچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اولاً تو آخرت کے آنے کا کوئی سوال نہیں اور اگر وہ بفرضِ محال آخرت برپا ہو ہی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ جو دولت و رفاہیت ہمیں یہاں حاصل ہے اس سے ہمیں وہاں محروم کر دیا جائے گا۔

اپنے ان بیہودہ تصورات کی بنیاد پر چونکہ وہ اپنے فکر کی بنیاد اٹھاتے ہیں اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ شخص جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ ہماری ہی طرح کا ایک بشر ہے اور اس کی زندگی بھی کھانے پینے سے قائم ہے۔ تو یقیناً جن باتوں کو ہم زندگی کی کامیابی کی علامت سمجھتے ہیں وہ بھی انہیں کو سمجھتا ہوگا جبکہ ان میں سے کوئی چیز اس کے اندر نہیں پائی جاتی۔ وہ بشر ہونے میں یقیناً ہم جیسا ہے لیکن نہ اس کے پاس دولت ہے نہ رفاہیت۔ نہ اسے کوئی سرداری حاصل ہے اور نہ کوئی طاقت، ایسا شخص تو بجائے خود محرومیوں کی داستان ہے وہ دوسروں کیلئے کیا رہنمائی دے سکتا ہے؟ چنانچہ ان تصورات کو نمایاں کرتے ہوئے وہ لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر تم نے اپنے جیسے بشر کو جو زندگی کے ہر شرف سے محروم ہے اللہ کا رسول مان کر اس کا قلادۂ اطاعت اپنی گردن میں ڈال لیا۔ تو تم اپنی دنیا بھی ڈبو دو گے اور اپنے عیش کے تصورات کو بھی موت کے گھاٹ اتار دو گے۔ نہ تمہاری کوئی روایت باقی رہے گی اور نہ کوئی تمہاری تاریخ۔ اس کے نتیجے میں تم قومی شیرازے سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔

اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

Marfat.com

کیاوہ تمہیں اس بات سے ڈراتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے تو پھر تمہیں قبروں سے نکالا جائے گا۔
(۳۵) عقل سے بعید ہے بالکل بعید، یہ ڈراوا، جو تمہیں سنایا جارہا ہے۔ (۳۶) زندگی تو بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے
یہیں ہم مرتے ہیں اور یہیں ہم جیتے ہیں، اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔ (۳۷)

"وَعَدَ" "یَعِدُ" کا ایک معنی ہوتا ہے "وعدہ کرنا" اور دوسرا معنی ہے "ڈرانا"۔ قرآنِ کریم نے دو معنوں کیلئے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اَلشَّیطَانُ یَعِدُکُمُ الفَقرَ "شیطان تمہیں غربت سے ڈراتا ہے"۔ اس آیت میں "یَعِدُ" ڈرانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

متکبرین کا عوام کو بہکاوا

انسان کی فطرت ہے کہ کبھی وہ ترغیب سے متاثر ہوتا ہے اور کبھی ترہیب سے۔ قرآنِ کریم نے آخرت کی تلقین کیلئے ان دونوں اسالیب کو استعمال کیا ہے۔ قوم کے سردار اپنے لوگوں کو بہکاتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ یہ دعویٰ نبوت کرنے والا شخص تمہیں ڈراتا ہے کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اس کے نتیجے میں تمہیں دنیا میں بھی کامیابیاں ملیں گی اور آخرت میں بھی سرخرو ٹھہرو گے اور اگر تم ایمان نہیں لاتے ہو تو پھر یاد رکھو موت تو تم سے ٹل نہیں سکتی۔ تم اپنی آنکھوں سے ہر روز لوگوں کے جنازے اٹھتے ہوئے دیکھتے ہو، تمہارا بھی ایک دن جنازہ اٹھے گا۔ یاد رکھو! مرنے کے بعد تم فنا نہیں ہوجاؤ گے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مدت کے بعد تمہارے جسم مٹی ہوجائیں گے اور تمہاری ہڈیاں الگ الگ ہوجائیں گی۔ لیکن یہ تمہارا تصور صحیح نہیں کہ تمہاری یہ موت مکمل فنا ثابت ہوگی۔ ایک دن ایسا آئے گا جب تمہیں از سرِ نو زندہ کیا جائے گا۔ تم اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے اور اپنے رب کے سامنے جوابدہی کیلئے کھڑے کئے جاؤ گے۔ سوچ لو! آج کی پرتعیش من مرضی کی زندگی کے بارے میں تم اللہ کو کیا جواب دو گے؟ یہ شخص تمہیں اس طرح کے ڈراوے دے کر اور تمہیں مرعوب کر کے اپنی نبوت کا قائل کرنا چاہتا ہے۔ خبردار یاد رکھو! مرنے کے بعد جب ہڈیاں تک خاک ہوجائیں گی تو یہ بات عقل سے نہایت بعید ہے کہ تمہیں کبھی دوبارہ زندہ بھی کیا جائے گا۔ زندگی یہیں کی زندگی ہے۔ دنیا ہی ہماری زندگی کا مقام ہے اس کے بعد کہیں زندگی نہیں۔ ہمیں یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ دوبارہ اٹھائے جانے کا تصور خوش فہمی اور توہم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

زندگی کے بگاڑ کا اصل سبب

یہی وہ تصور تھا جس نے ان کی زندگی کے رویے کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی ساری جد جہد اس زندگی کو آرام دہ اور باوقار بنانے اور زیادہ سے زیادہ مال وجاہ حاصل کرنے کیلئے صرف ہوتی تھی۔ وہ اسی دنیا کی خوشیوں اور غموں کو حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ وہ اس دنیا کی کامیابیوں کو حقیقی کامیابیاں سمجھتے تھے اور اس کی ناکامیوں کو حقیقی محرومیاں گردانتے تھے۔ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ لطف ولذت اور ہر خواہش کا حصول ان کی زندگی کا عنوان بن گیا تھا۔ وہ ایثار و ہمدردی کے نام سے واقف تھے اور بعض دفعہ لوگوں میں شہرت کے حصول کیلئے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن اسے زندگی کا لازمہ نہیں سمجھتے تھے۔ نہ جانے ان کے ذہنوں میں یہ بات کیوں نہیں آتی تھی کہ یہ دنیا دار العمل ہے دار الجزا نہیں۔ یہاں ایک آدمی بدکار ہوتے ہوئے عزت وآرام کی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرا آدمی نیک، مخلص اور نوعِ انسانی کا حقیقی بہی خواہ ہونے کے باوجود عمر بھر طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر موت ہی انسانی زندگی کے قافلہ کی آخری منزل ہے تو پھر اس سے بڑی بے انصافی اور کیا ہوسکتی ہے؟ یہاں مزدور اور بے نوا لوگ ہمیشہ دکھوں سے بھری زندگی گزارتے ہیں اور ظالم اور ہوشیار لوگ انہیں کے کھنڈرات اور انہیں کی ہڈیوں پر اپنے محلات اٹھاتے ہیں۔ اگر یہی زندگی حقیقی زندگی ہے تو پھر اس کا کون جواب دے گا؟

Marfat.com

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

حقیقت یہ ہے کہ قیامت اور آخرت کا یقین انسانیت کی بقا کیلئے ضروری ہے۔ انسانیت اقدارِ انسانیت، مکارمِ اخلاق، حقوق و فرائض، آدابِ زندگی، نیکی کا فروغ، برائی کی بیخ کنی اور ایثار و محبت کے راستوں کو جلا بخشنے کا نام ہے۔ اگر کوئی انسان کہلانے والا شخص ان تمام حقائق و فضائل کو بیکار سمجھتا ہے تو اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ قیامت کا انکار کرے۔ لیکن جو شخص ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا اس کے لئے قیامت کا انکار کرنا فتورِ عقل سے پہلے ممکن نہیں۔ ملکی سرحدیں قربانی سے قائم رہتی ہیں۔ انسانی رشتے ایثار و محبت سے زندہ رہتے ہیں۔ انبیائے کرام اور ان کے راستوں پر چلنے والے زندگی کے ہر سکھ کی قربانی دے کر زندگی کا چراغ جلاتے ہیں۔ اور شہید کا خون انہیں راہوں میں روشنی کا سامان کرتا ہے۔ لیکن ان کی قربانیوں کا صلہ دنیا میں نہیں دیا جاسکا اور یقیناً نہیں دیا جاسکتا تو پھر اگر قیامت کو تسلیم نہ کیا جائے تو سوچ لیجئے کہ کون ان راہوں پر چلنے کی ہمت کریگا اور اس طرح ہم اپنی کتنی بڑی متاع سے محروم ہوجائیں گے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۸﴾

وہ تو ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ پر ایک جھوٹ گھڑا ہے۔ اور ہم تو قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ۳۸)

عوام کو اکسانے اور بہکانے کے بعد ان کے لیڈروں اور سرداروں نے یہ کہا کہ ہم نے تمہیں سمجھانے کا حق ادا کردیا ہے اور تم پر یہ بات واضح کردی ہے کہ اگر تم نے اس شخص کی اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈال لیا تو تم اپنے آپ کو تباہ کرلو گے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام، جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس شخص نے رسالت کا دعویٰ کرکے درحقیقت اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ اس نے کبھی کسی بشر کو اپنا رسول بنا کر نہیں بھیجا کیونکہ بشر تو کسی بات میں ہم سے مختلف نہیں۔ تو وہ اللہ کا برگزیدہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور ہماری رہنمائی کا فریضہ کیونکر انجام دے سکتا ہے؟ اس لئے ہم نے تو فیصلہ کیا ہے کہ ہم اس شخص پر کبھی ایمان لانے والے نہیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۳۹﴾

پیغمبر نے دعا کی اے میرے رب! تو میری مدد فرما اس چیز کے ساتھ جس میں انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ ۳۹)

پیغمبر کی دعا

یہ آیت گزشتہ رکوع میں گزر چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس پیغمبر کا یہاں ذکر ہورہا ہے وہ بھی جب حضرت نوح علیہ السلام کی طرح تبلیغ و دعوت کے حوالے سے ان پر اتمامِ حجت کرچکے اور قوم نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے آپ کا کام تمام کرنے اور آپ کی دعوت کو ختم کرنے کا ارادہ کرلیا۔ تو تب پیغمبر نے اللہ سے مدد کرنے کی درخواست کی۔ اور آیت کے الفاظ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ پیغمبر نے چونکہ انہیں بار بار عذاب سے ڈرایا تھا لیکن انہوں نے عذاب سے ڈرنے کی بجائے اسے ایک مذاق بنالیا اب وہ بار بار مطالبہ کرنے لگے کہ عذاب کہاں ہے، وہ آتا کیوں نہیں؟ تو پیغمبر نے اسی عذاب کے حوالے سے اللہ کی نصرت کو پکارا۔

Marfat.com

قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب یہ لوگ اپنے کیے پر نادم ہو کر رہیں گے۔ ۴۰) آخر کار ٹھیک حق کے مطابق ایک سخت ڈانٹ نے ان کو آ پکڑا۔ تو ہم نے ان کو خس وخاشاک کر دیا۔ تو برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے۔ ۴۱)

دعا کی قبولیت

اللہ کے رسول کی دعا قبول ہوئی۔ تو اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اب اس قوم کی تباہی میں کوئی دیر نہیں عنقریب تم دیکھو گے کہ اللہ کی طرف سے ایسی گرفت ہو گی کہ انہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے اللہ کے رسول کی رسالت سے انکار کر کے بہت بڑی حماقت کی۔ اب وہ ندامت کا اظہار کریں گے لیکن یہ ندامت کام نہیں آئے گی۔ چنانچہ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برسا اور ایک سخت ڈانٹ نے انہیں آ پکڑا۔

صیحۃ: کے معنی ''چنگھاڑ'' کے بھی ہیں اور ''سخت ڈانٹ'' کے بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عذاب کا نشانہ بننے والوں میں عذاب کے بعد جو ایک ہنگامہ اور چیخ پکار برپا ہوتی ہے وہ یہاں مراد ہو۔ اس لئے اس کے ایک ہی معنی پر اصرار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

غثاء: اس خس وخاشاک کو کہتے ہیں جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہوا آتا ہے۔ اور پھر کناروں پر لگ کر پڑا سڑتا رہتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے ذریعے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ ان کی لاشیں اور ان کی بستیوں کا ملبہ کوڑا کرکٹ کی طرح ہوا میں اڑتا اور پانی میں بہتا پھرتا تھا حتی کہ یہ سب کچھ زمین کی خاک بن گیا۔ اس پر اللہ کی طرف سے لعنت اور پھٹکار برسی اور ہمیشہ کیلئے انہیں رحمت سے دور کر دیا گیا۔ یہاں بھی کوڑا کرکٹ کی طرح پامال کیے گئے اور قیامت کے دن بھی بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾

(پھر ہم نے ان کے بعد کئی قومیں پیدا فرمائیں۔ ۴۲)

آیت نمبر ۳۱ میں لفظ ''قرن'' آیا ہے اور یہاں ''قرون'' آیا ہے۔ جو قرن کی جمع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے مختلف قومیں اٹھائی گئیں۔ عین ممکن ہے کہ ان کے افراد زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئے ہوں اور وہیں آبادی بڑھتے بڑھتے قوموں کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ اللہ نے ان کی اصلاح کیلئے مختلف وقتوں میں متعدد رسول بھیجے لیکن ان کے ناموں کا ذکر نہ قرآنِ کریم میں ہے اور نہ تورات میں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم میں نہایت اہتمام کے ساتھ یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ نے ہر قوم میں ہدایت دینے والا ضرور بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ کے رسول لوگوں کی اصلاح کیلئے نہ آئے ہوں۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

کوئی قوم اپنی اجلِ معین سے نہ بڑھ سکتی ہے اور نہ وہ اس سے پیچھے ہی ہٹ سکتی ہے۔ ۴۳)

Marfat.com

غلط فہمی کے ازالے کیلئے سنت اللہ کا بیان

مختلف انبیائے کرام اور رسولانِ گرامی کی دعوت کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب کا شکار ہونے والی امتوں کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے تا کہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دنیا میں قوموں کی حیات وبقاء اور عزت وسرافرازی دنیوی وسائل کی فراہمی کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامِ ہدایت کی قبولیت کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح دنیا کی تباہی دنیا کے وسائل کی کمی سے فیصلہ کن سطح کو نہیں پہنچتی بلکہ اس کا حقیقی فیصلہ اللہ کے رسولوں اور ان پر نازل ہونے والی ہدایت کے انکار پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ قومیں اس استدلال سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کریں یہ قوموں کی بدنصیبی ہے کہ ہر بگڑی ہوئی قوم ممکن ہے دوسروں کے بارے میں اس استدلال کو حتمی سمجھتی ہو۔ لیکن اپنے بارے میں اس کا رویہ دوسرے اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس کے خود ساختہ ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک یہ غلط فہمی بھی ہے کہ جب کوئی اللہ کا رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور وہ اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو وہ اسے اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہے اور جب اس انذار پر چند سال گزر جاتے ہیں اور عذاب کا نزول نہیں ہوتا تو قوم اس بارے میں یکسو ہو جاتی ہے کہ یہ دعوائے رسالت کرنے والا اللہ کا حقیقی رسول نہیں ورنہ آج تک ہم پر عذاب نازل ہو چکا ہوتا اور ہماری زندگی کا رویہ وہ نہیں جو معذب قوموں کا ہوتا ہے ورنہ ہمیں اتنی مہلت نہ دی جاتی۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں عذاب کے بارے میں سنت اللہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے رسول جب کسی قوم کو عذاب سے ڈراتے ہیں تو ان کا یہ انذار یقیناً حقیقت پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ پیغمبروں اور ان کی دعوت کی تکذیب ہی درحقیقت کسی قوم کی زندگی کو مباح کر دیتی ہے۔ لیکن رہی یہ بات کہ وہ وقت کب آئے گا جب ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسے گا؟ تو اس وقت کو اجلِ معین کہتے ہیں۔ اس اجلِ معین کا وقت اللہ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہوتا۔ اس اجلِ معین کا تعین اللہ کی جانب سے کسی بھی قوم کی اخلاقی حالت کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ قوم اپنی اجل کو کب پہنچے گی اس بات کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دوسری بات جو اسی اجل ہی سے متعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ کوئی امت اپنی اجل معین سے پہلے عذاب کا شکار نہیں ہوتی۔ اسی طرح جس قوم کی اجل آجاتی ہے وہ اپنی تباہی اور بربادی کو ایک لمحہ کیلئے بھی مؤخر نہیں کر سکتی۔ جس طرح پانی ابلنے کی ایک اجل ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مطلوب حرارت پانی کو پہنچ جائے اور اسی طرح اس کے جم جانے کی بھی ایک اجل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں وہ ٹھنڈک پیدا ہو جائے جو اس کے جما دینے کیلئے مطلوب ہے۔ اسی طرح کسی قوم کا بگاڑ جب اس سطح کو پہنچ جاتا ہے جو اس کیلئے اجل مقرر کر دی گئی ہے۔ تو پھر وہ قوم اپنے انجام کو پہنچ کر رہتی ہے۔ اس حقیقت سے بالواسطہ قریش کو توجہ دلانا مقصود ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر اللہ کا عذاب ہمارے لئے مقدر ہو چکا ہوتا تو وہ اب تک آچکا ہوتا۔ لیکن ابھی تک عذاب کا نہ آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم پر عذاب آنے کی ایک اجل معین ہے اس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تم ابھی تک بچے ہوئے ہو۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ
بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

پھر ہم نے اپنے رسول یکے بعد دیگرے بھیجے۔ جب آیا کسی قوم کے پاس اس کا رسول تو انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ تو ہم نے بھی ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور ان کو افسانہ بنا دیا۔ پس اللہ کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لاتی۔ (۴۴)

Marfat.com

چند الفاظ کی تشریح: ''تَتْـرًا'' اصل ''وَتـریٰ'' ہے۔عربی کے معروف قاعدے کے مطابق ''وٗ'' ''ت'' سے بدل گئی ہے۔اس کا معنی ہے، ''یَتْبَعُ بَعْضُھُمْ بَعْضًا'' ''یکے بعد دیگرے''۔

''احادیث'' جمع ہے۔اس کا واحد 'احدوثۃ' ہے اس کا معنی ہے ''قصے کہانیاں''۔مایتحدث بہ۔

تکذیب رسل فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے

قوموں کے تباہ ہونے کے بعد نئی قومیں اٹھائی جاتی رہیں جو ان کی جگہ لیتی رہیں۔اللہ تعالیٰ کی ربوبیت نے جس طرح ہر قوم کو اپنے فیضان سے نوازا یعنی ان کی کوئی ضرورت رکنے نہیں پائی۔زمین، برابر روئیدگی کے جوہر دکھاتی رہی۔سورج، بدستور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر ابر کی چادریں بچھاتا رہا۔ہوا، اپنے ہچکولوں سے بادلوں کو وہاں پہنچاتی رہی جہاں زمین کو آبیاری کی ضرورت تھی۔چاند کی چاندنی اپنے خزانے لٹاتی رہی۔غرضیکہ عناصرِ قدرت اللہ کے حکم سے اپنا فرض انجام دیتے رہے۔اسی طرح اس کی معنوی اور روحانی ربوبیت نے بھی کبھی انسانوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑا۔جب بھی کسی قوم میں عقیدہ وعمل کی خرابیاں پیدا ہوئیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے۔انہوں نے اپنی زندگیاں مصائب میں ڈال کر قوموں کی اصلاح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔لیکن جب کوئی قوم اپنی گمراہیوں اور ظلم وتعدی میں حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور پھر ان کی جگہ دوسری قوم کو لا بسایا اور اللہ کی ربوبیت کا فیضان اس کو بھی برابر اسی طرح پہنچتا رہا۔اس طرح قوموں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور رسول بھی بدستور آتے رہے اور دنیا کی تاریخ نے یہ بات ثابت کردی کہ وہ قومیں جو کبھی اپنے کروفر اپنی قوت وشوکت اور اپنے عروج واقبال کی مثال نہیں رکھتی تھیں۔وہ ماضی کی داستانِ پارینہ بن کر رہ گئیں۔آج تاریخ میں وہ عبرت کی ایک علامت بن کر رہ گئی ہیں۔

آیت کے آخری جملے میں ارشاد فرمایا کہ پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لاتی۔یہ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔بُعد کو اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔وہ ایمان جس کو قریش اور دوسرے گمراہ لوگ نہایت ناقابلِ ذکر سمجھتے ہیں اندازہ کیجئے! اللہ کے یہاں وہ اس قدر گراں مایہ ہے کہ وہ قومیں جو صدیوں پہلے عذاب کا شکار ہو چکی تھیں ان کے عدمِ ایمان پر اللہ کا غضب بدستور بھڑک رہا ہے اور آج بھی ان کے ذکر کے ساتھ اللہ کی لعنت برستی ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٥﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿٤٦﴾

پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو بھیجا اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر۔ ۴۵) فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی تکبر کیا اور وہ نہایت مغرور لوگ تھے۔ ۴۶)

Marfat.com

دو رسولوں اور ان کی امتوں کی تاریخ سے استدلال

ہزاروں سال تک روئے زمین پر مختلف قوموں کی آبادی اور ان کے بگاڑ کے نتیجے میں ہزاروں انبیائے کرام کی بعثت کے اجمالی ذکر کے بعد اب متعین طور پر دو رسولانِ گرامی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جن کے نام لیواؤں اور نسبت کا دعویٰ رکھنے والوں کی ایک قوم جو بنی اسرائیل کے نام سے معروف تھی اور اس وقت آنحضرت ﷺ کی دعوت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ انہیں ان کی تاریخ یاد دلا کر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ ہارون علیہ السلام کو ان کی دعوت کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات بھی یاد دلائی جا رہی ہیں اور اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ فرعون اور اس کے عمائدین نے جو رویہ ان اولوالعزم رسولوں کے ساتھ اختیار کیا تو دیکھ لو پھر اس کا انجام کیا ہوا؟ اور اگر تم بھی وہی رویہ اختیار کرو گے باوجود اس کے کہ تمہارے پاس کسی نہ کسی حد تک آسمانی ہدایت اور تمہاری اپنی تاریخ بھی ہے۔ لیکن کسی بھی پیغمبر کی دعوت کے انکار کے نتیجے میں یہ تمام باتیں دھری رہ جاتی ہیں۔

حضرتِ موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا ذکر تاریخِ نبوت کی ایک کڑی کے طور پر فرماتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کی طرف ان دونوں بزرگوں کو بھیجا گیا تھا وہ اپنا ایک خاص قومی مزاج رکھتے تھے۔ جس کا ذکر اگلی آیتِ کریمہ میں آ رہا ہے۔ اس مزاج کی رعائت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے معجزات سے نوازا اور ان میں سے بطورِ خاص ایک معجزہ عصائے موسیٰ تھا جسے یہاں سلطانِ مبین کہا گیا ہے کیونکہ اس معجزے کو دیکھتے ہوئے دو باتیں بالکل واضح تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ معجزہ ایسی سندِ ماموریت کی حیثیت رکھتا تھا جس سے بڑھ کر کوئی سند نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اسے دیکھتے ہی یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا تھا کہ جس کے ہاتھ کی لٹھیا ایسی حیرت انگیز شکل اختیار کر جاتی اور ایسے محیر العقول کمالات رکھتی ہے وہ یقیناً اللہ کا نمائندہ ہے اور دوسری یہ بات یہ کہ وہ لٹھیا اپنے اندر وہ قوت رکھتی ہے جس کی موجودگی میں اس لٹھیا بردار پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے معجزے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ فرعون اور اس کے عمائدین انتہائی مغرور لوگ تھے۔ انہوں نے تکبر ہی کی وجہ سے ایمان لانے سے انکار کیا اور تکبر ہی انہیں اس بات پر اکساتا تھا کہ تم ہر ممکن طریق سے اس دعوت سے گریز کرو۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۚ ﴿۴۷﴾

تو انہوں نے کہا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں درآں حالیکہ ان کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے۔ (۴۷)

فرعونیوں کا قومی مزاج

یہ اسی تکبر کا اظہار ہے جو ان کا قومی مزاج بن چکا تھا۔ ایک تو وہ اسی گمراہی کا شکار تھے جو سب گمراہ قوموں میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود رہی ہے۔ یعنی وہ بشریت اور نبوت میں تضاد سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں نبوت و رسالت ایک بلند منصب ہے اور بشر نہایت معمولی مخلوق ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے منصب کا تاج ایسی معمولی مخلوق کے ایک فرد کے سر پر رکھ دیا جائے۔ اور ان کے اس عذرِ لنگ کو ایک ایسے تصور نے تقویت فراہم کی تھی جو ان کا قومی مزاج تھا۔ یعنی ہم حکمرانوں اور آقاؤں کی قوم ہیں اور یہ دو فرد جو نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں یہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو ہماری غلام ہے۔ تو کیا ہم اپنے غلاموں کو اپنا رہنما مان لیں؟ اور ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیں۔

Marfat.com

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں سے ہو گئے۔ ۴۸)

تکذیب اور تکبر کا انجام

بڑائی کے گھمنڈ نے ایک بہت بڑی سعادت سے انہیں محروم رکھا۔انہوں نے اللہ کے دونوں سچے نبیوں کی تکذیب کر ڈالی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ کا وہ قانون حرکت میں آیا جو سابقہ امتوں میں اس سے پہلے بار بار بروئے کار آ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو ایک خاص حد تک مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ کسی طرح بھی ہدایت کے راستے پر نہیں آتی اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان پر اتمامِ حجت ہو جاتا ہے تو پھر انہیں زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔چنانچہ اسی قانون کے تحت فرعون، اس کی فوج اور اس کے بڑے بڑے درباری بحرِ قلزم میں غرقاب ہو گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی تا کہ وہ ہدایت پائیں۔ ۴۹)

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم پر انعام

فرعون اور آلِ فرعون تو اپنے تکبر اور غرور اور نسلی تمرد کے باعث ہدایت سے محروم رہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تباہی کے بعد حضرتِ موسیٰ اور ان کی قوم کو صحرائے سینا میں ایک ایسے انعام سے نوازا جو کسی بھی قوم کیلئے سب سے بڑا انعام ہے اور وہ انعام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کتابِ ہدایت عطا فرمائی تا کہ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔کتاب سے مراد یہاں تورات ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی اور يَهْتَدُوْنَ کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔فرعون اور اس کے عمائدین جس قوم کو اپنا غلام سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان غلاموں کو آقائی کے منصب پر بٹھانے کیلئے ایک ایسی کتاب عطا فرمائی جس میں بندگی کے آداب بھی ہیں اور حکمرانی کے طریقے بھی سکھائے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہر دور میں پسے ہوئے اور بے بس انسانوں کو ہمیشہ سریرِ سلطنت پر بٹھاتی رہی ہے بشرطیکہ وہ اللہ کے ساتھ بندگی اور غلامی کا حق ادا کر دیں۔چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی اسی اصول کے تحت مختلف ادوار میں نوازا جاتا رہا۔

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
غلاموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایہ

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

اور ہم نے مریم کے فرزند اور ان کی والدہ کو ایک عظیم نشانی بنایا۔اور انہیں ایک پرسکون اور چشمے والی بلند جگہ پر ٹھکانہ دیا۔۵۰)

Marfat.com

اس آیت کا مفہوم

تاریخِ نبوت کی آخری عظیم شخصیت حضرت مسیح ابنِ مریم ہیں۔ انسانی فکر کے الجھاؤ بھی عجیب ہیں۔ گزشتہ آیات میں تو ہم نے پڑھا کہ انسان اسلئے اللہ کے نبیوں پر ایمان لانے سے انکار کرتا رہا کہ وہ بشر ہیں اور بشر نبی نہیں ہوسکتا۔ لیکن حضرت مسیح ابنِ مریم کے بارے میں معاملہ بالکل برعکس رہا کہ ان پر جو لوگ ایمان لائے وہ ان کی بشریت پر معترض ہونے کی بجائے ان کے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کے قائل ہوگئے اور آج تک اس غلط فہمی سے انہیں نجات نہیں مل سکی۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً :امام رازی فرماتے ہیں کہ چاہیے یہ تھا کہ عبارت یوں ہوتی۔ ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَتَيْنِ'' لیکن تثنیہ کی بجائے واحد استعمال کرتے ہوئے آپ کی بن باپ ولادت کی طرف اشارہ کردیا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابنِ مریم تھے اور ایک نشانی خود مریم اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابنِ مریم اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابنِ مریم کا پیدا ہونا اور مرد کی صحبت کے بغیر مریم کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔

اس سے پہلے سورہ مریم اور بعض دوسری سورتوں میں تفصیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوچکا۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف باتیں ارشاد فرمائی ہیں لیکن ہم فوائد القرآن سے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔

> شاید یہ وہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں۔ چنانچہ سورہ مریم کی آیات 'فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾'' دلالت کرتی ہیں کہ وہ جگہ بلند تھی۔ نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی اور کھجور کا درخت نزدیک تھا (کذا فسرہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ) لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک ظالم بادشاہ ہیرودس نامی نجومیوں سے سن کر کہ حضرت عیسیٰ کو سرداری ملے گی لڑکپن ہی میں ان کا دشمن ہوگیا تھا اور قتل کے درپے تھا۔
>
> حضرت مریم الہامِ ربانی سے ان کو لے کر مصر چلی گئیں اور اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس چلی آئیں۔ چنانچہ ''انجیل متی'' میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے اور مصر کا اونچا ہونا باعتبار رودنیل کے ہے ورنہ غرق ہوجاتا اور ''ماء معین'' رودنیل ہے۔
>
> بعض نے ''ربوۃ'' (اونچی جگہ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔ بہرحال اہلِ اسلام میں کسی نے ''ربوۃ'' سے مراد کشمیر نہیں لیا۔
>
> نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر کشمیر میں بتلائی۔ البتہ! ہمارے زمانہ کے بعض زائغین نے ''ربوۃ'' سے کشمیر مراد لیا ہے اور وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتلائی ہے جس کا کوئی ثبوت تاریخی حیثیت سے نہیں۔ محض کذب و دروغ بافی ہے۔ محلہ ''خان یار'' شہر سری نگر میں جو قبر ''یوز آسف'' کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بابت تاریخ اعظمی کے مصنف نے محض عام افواہ نقل کی ہے کہ ''لوگ اس کو کسی نبی کی قبر بتاتے ہیں اور وہ کوئی شہزادہ تھا اور دوسرے ملک سے یہاں آیا'' اس کو حضرت

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتانا پرلے درجہ کی بے حیائی او سفاہت ہے۔ ایسی اٹکل پچو قیاس آرائیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات کو باطل ٹھہرانا بجز خبط اور جنون کے کچھ نہیں۔ اگر اس قبر کی تحقیق مطلوب ہو اور یہ کہ "یوز آسف" کون تھا تو جناب منشی حبیب اللہ صاحب امرتسری کا رسالہ دیکھو جو خاص اسی موضوع پر نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے اور جس میں اس مہمل خیال کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا و عن سائر المسلمین احسن الجزاء۔

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٥١﴾ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ
اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿٥٢﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ
زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى
حِيْنٍ ﴿٥٤﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ
لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ
خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٨﴾
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ
قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا
وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ
فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا

Marfat.com

عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾
لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ قف اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى
عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا
تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَمْ
يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ
كٰرِهُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧١﴾
اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَ
اِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ
مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ
بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾ حَتّٰٓى اِذَا
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾

رکوع: ۴۔ اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو تم جو کچھ بھی کرو گے میں اس کو خوب جانتا ہوں۔ ۵۱)
اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ ۵۲) پس انہوں نے اپنے
دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اب ہر گروہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔ ۵۳) تو انہیں ایک وقت

Marfat.com

خاص تک ان کی سرمستی (اورغفلت) میں چھوڑ دو۔ ۵۴) کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد میں مدد دیئے جارہے ہیں۔ ۵۵) تو ان کے لئے بھلائی میں اضافہ کر رہے ہیں؟ بلکہ ان کو اصل معاملے کا شعور نہیں ہے۔ ۵۶) بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے لرزاں وترساں رہنے والے ہیں۔ ۵۷) اور وہ لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۵۸) اور وہ لوگ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ ۵۹) اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں اس خیال سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۶۰) یہی لوگ بھلائیاں کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ ۶۱) ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتادے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۶۲) بلکہ ان لوگوں کے دل اس چیز سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے اعمال ان کے ماسوا ہیں وہ انہیں کاموں کو کرتے رہیں گے۔ ۶۳) یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چلائیں گے۔ ۶۴) آج نہ چلاؤ اب ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۶۵) (وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جایا کرتے تھے۔ ۶۶) غرور وتکبر کرتے ہوئے۔ گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو۔ ۶۷) کیا ان لوگوں نے اس کلام پر کبھی غور نہیں کیا یا ان کے پاس پیغمبر (ﷺ) کوئی ایسی چیز لے کر آئے ہیں جو ان کے اگلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی۔ ۶۸) یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اُن کے منکر بنے ہوئے ہیں۔ ۶۹) یا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کوئی جنون کا اثر ہے۔ نہیں، بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے۔ ۷۰) اور اگر کہیں حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کا اپنا ذکر لے کر آئے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ ۷۱) کیا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہیں؟ آپ کے رب کا دیا ہوا معاوضہ آپ کیلئے بہتر ہے۔ اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے۔ ۷۲) (بے شک آپ انہیں ایک سیدھی راہ کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ۷۳) اور جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ ۷۴) (اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف دور کر دیں جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں تو یہ اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے بڑھتے جائیں گے۔ ۷۵) (ان کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں تکلیف میں مبتلا کیا تو پھر بھی اپنے رب کی بارگاہ میں نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ ۷۶) (یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو یکایک تم دیکھو گے کہ وہ اس میں بالکل مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔ ۷۷)

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۱ۭ

اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو تم جو کچھ بھی کرو گے میں اس کو خوب جانتا ہوں۔ ۵۱)

Marfat.com

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کا مفاد

گزشتہ دورکوعوں میں متعدد انبیائے کرام کا ذکر کرنے کے بعد تمام انبیائے کرام کو یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کے مشترک لفظ سے خطاب فرما کر ایک خاص حقیقت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ دورکوعوں میں ہم نے سب سے پہلے حضرتِ نوح علیہ السلام کا ذکر کیا جو انسانوں میں بگاڑ پیدا ہو جانے کے بعد اللہ کی جانب سے پہلے رسول ہیں۔ پھر ان رسولوں کی طرف اشارے کئے جو ان قوموں کی طرف آئے جو قومِ نوح کی تباہی کے بعد مختلف وقتوں میں روئے زمین پر اٹھائی گئیں۔ پھر ان دو رسولوں کا ذکر فرمایا گیا جنہوں نے تاریخِ اقوام اور تاریخِ مذاہب میں اپنی پیدا کردہ امت کے باعث بہت گہرا اثر پیدا کیا اور صدیوں تک دینی نقطہ نگاہ سے قوموں کی امامت کی اور اب وہ اپنے زوال اور بگاڑ کی انتہا کو پہنچ رہی تھیں۔ اس کے بعد خاتم النبیین ﷺ سے پہلے سلسلۂ نبوت کے آخری نبی کا ذکر فرما کر بنی اسرائیل کی اس شاخ کی طرف اشارہ کیا جو آنحضرت ﷺ کی معاصر قوموں میں سے ایک مضبوط مملکت کی مالک تھی اور یہ دونوں قومیں اس وقت اسلام کی سب سے بڑی حریف تھیں۔ ان مختلف اقوام اور امتوں کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کی طرف مبعوث کئے جانے والے انبیائے کرام نے انہیں مختلف دین دیئے تھے۔ مختلف شریعتیں عطا کی تھیں اور اللہ کی بندگی کا وہ تصور دیا تھا جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا تھا۔ لیکن یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کہہ کر ان تمام واہموں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو نبی اور رسول بھی آیا اس نے اللہ کی طرف سے خدا پرستی اور اللہ کی کامل بندگی اور اطاعت کی دعوت دی۔ سب نے ایک ہی دین پیش کیا اور بندگی اور خدا پرستی کی دعوت میں یہ تمام انبیاء مکمل طور پر ایک دوسرے کے حلیف اور مماثل تھے۔ سب نے اصل دین کو قائم کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا۔ البتہ! اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوئی تو انہوں نے اسی دین کے مزید مقتضیات نمایاں کئے۔ قرآن اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس نے اصل دین کو بالکل نکھار کر اس کی اصل صورت میں پیش کر دیا اور اس کے جو پہلو ابھی تشنۂ تکمیل تھے اور جن کی تکمیل کا کام سابق انبیائے کرام کی پیش گوئیوں کے مطابق آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا ان کی اس نے تکمیل کر دی۔ ان تمام رسولوں اور ان کی دعوت میں اس حد تک یکسانی، مماثلت اور قربت پائی جاتی ہے کہ جب تمام رسولوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی رسول کی شخصیت اور اس کی دعوت کے ابواب الٹے جا رہے ہیں اور جب کسی ایک رسول کی شخصیت اور اس کی دعوت کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت کو ایک کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہئے کہ جب ہم سو کا لفظ بولتے ہیں تو اس میں ننانوے کے ہندسے شامل اور مراد ہوتے ہیں۔ اور جب ایک، دو، تین، چار سے سو تک کے عدد شمار کرتے ہیں تو مراد اس سے سو ہی ہوتا ہے۔ مولانا روم نے اس بارے میں جو اشارات کئے ہیں وہ از بس لطیف واقع ہوئے ہیں۔

نامِ احمد نامِ جملہ انبیا است
چونکہ صد آمد نود ہم پیشِ ما است

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ میں انبیائے کرام کی دعوت کے سلسلہ میں کچھ غلط فہمیوں کا بھی ازالہ فرمایا گیا ہے۔ جن میں پہلی غلط فہمی وہ ہے جسے عیسائیت اور ہندومت نے ضلالت کی انتہا تک پہنچایا۔ انہوں نے دنیا کو یہ تصور دیا کہ اللہ کی ذات ایسی پاکیزہ ہے کہ پاکیزہ ہوئے بغیر اس کا قرب حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا اور اس کے علائق ایک گندگی ہیں جس میں آلودہ ہو کر کوئی شخص قربِ خداوندی اور اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ میں اللہ کا قرب حاصل کروں تو اسے ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ جسے عیسائیت نے ''

Marfat.com

رہبانیت'' قرار دیا ہے اور ہندومت نے اسے ''جوگی ازم'' کا نام دیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں پاکیزہ نعمتوں کا رزق کھانے کا حکم دے کر اس تصور کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی بندگی ترکِ دنیا نہیں بلکہ دنیا کا حصول اور استعمال ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دنیا کی ان نعمتوں کو حاصل کیا جائے جسے اللہ کی شریعت نے پاکیزہ قرار دیا ہے اور اس طریقے سے حاصل کیا جائے جسے اس کی شریعت نے جائز اور حلال قرار دیا ہے۔ حرام طریقے سے حاصل ہونے والی پاکیزہ چیز بھی ناپاک اور حرام ہو جاتی ہے۔ آبِ زم زم انتہائی پاک اور مدینہ طیبہ کا خرما انتہائی پاکیزہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص چوری یا غصب کے ذریعے حاصل کرتا ہے تو یہ پاکیزہ نعمتیں بھی اس کیلئے ناپاک ہو جاتی ہیں۔

مزید فرمایا کہ طیبات کھانے کے ساتھ ساتھ صالح عمل بھی کرو۔ اس لئے کہ جس دین میں بنیادی صداقتوں کو قبول کرنے کے بعد ان پر عمل کرنے سے پہلوتہی کی جائے، اسلام نے اسے فسق وفجور قرار دیا ہے۔ وہ خدا پرستی کا نہیں خدا سے بغاوت کا راستہ ہے۔ مزید یہ اشارہ فرمایا کہ جب تک تم طیبات تک خود کو محدود نہ رکھو اور جائز طریقوں سے طیبات کو حاصل نہ کرو اس وقت تک تمہارا کوئی عمل عملِ صالح کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الرجل يطيل السفر اشعث اغبر ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام و غذى بالحرام يمد يديه فى السماء يارب يارب فانّٰى يستجاب لذلك

''ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار آلود پراگندہ موآتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتا ہے یارب یارب مگر حال یہ ہوتا ہے کہ روٹی اس کی حرام، کپڑے اس کے حرام اور جسم اس کا حرام کی روٹیوں سے پلا ہوا ہے۔ اب کس طرح ایسے شخص کی دعا قبول ہو''۔ (مسلم، ترمذی، احمد، من حدیثِ ابی ہریرہ)

مزید فرمایا کہ زندگی گزارتے ہوئے اس بنیادی تصور کو کبھی دل ودماغ سے الگ نہ ہونے دینا کہ تم جو کچھ کرتے ہو میں اسے جانتا ہوں یعنی تمہاری ہر حرکت میرے علم اور میری نگاہوں میں ہے۔ تم کسی وقت میرے حصار سے باہر نہیں ہو۔ تمہارا ہر عمل محفوظ کیا جارہا ہے اور اسی کی بنیاد پر قیامت کے دن تم سے باز پرس کی جائے گی اور اعلائے کلمۃ الحق کے سلسلہ میں اگر کبھی تمہیں تنہائی کا احساس ہو تو یہ مت بھولو کہ میں تمہارا پشت پناہ ہوں اور میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں اور یہ بھی یاد رکھو کہ میری طرف سے تم پر جو شریعت نازل کی گئی ہے اس کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ اور برپا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے اور اسے تم کہاں تک ادا کرتے ہو میں ہمیشہ اسے دیکھتا رہوں گا اور اسی حوالے سے تمہاری دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا فیصلہ ہوگا۔ یہ بات یاد رہے کہ خطاب اگرچہ رسولوں سے ہے لیکن ان کے واسطے سے یہ ہدایات امتوں کی دی جارہی ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم مجھ ہی سے ڈرو۔ ۵۲) پس انہوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اب ہر گروہ اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔ ۵۳)

Marfat.com

گزشتہ حقیقت کا اظہار

یٰاَیُّھَا الرُّسُلُ کے خطاب سے جس حقیقتِ ثابتہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کو کھول دیا گیا ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک ہی رہی ہے اور یہ سب ایک ہی امت تھے کیونکہ یہ ایک ہی دین لے کر آئے۔ امت کا لفظ اس مجموعۂ افراد پر بولا جاتا ہے جو کسی اصلِ مشترک پر جمع ہوں۔ انبیائے کرام چونکہ اختلافِ زمانہ و مقام کے باوجود ایک عقیدے، ایک دین اور ایک دعوت پر جمع تھے اس لئے فرمایا گیا کہ ان سب کی ایک ہی امت ہے اور ان کی دعوت نے دیکھنے کو مختلف امتیں تیار کیں لیکن حقیقت میں وہ سب ایک امت تھیں کیونکہ ان کی بنیاد ایک تھی۔ آیتِ کریمہ کے دوسرے جملے نے اس بنیاد کو واضح فرمادیا۔

وَاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ ''اور میں تمہارا رب ہوں پس تم مجھ ہی سے ڈرو''۔ رب وہ ذات ہے جو تمام مخلوقات کی تربیت کا سامان کرتی ہے۔ جسمانی تربیت کیلئے غذا مہیا کرتی، موسم کے شدائد سے بچاتی اور زندگی کے امکانات کو بروئے کار لانے کیلئے مطاو بہ رہنمائی سے نوازتی ہے۔ لیکن معنوی اور روحانی تربیت کیلئے جن وانس کی حد تک حواس اور عقل عطا کرتی اور زندگی کے وہ دوائر جو عقل کی رسائی سے باہر ہیں ان کے لئے وحیِ الٰہی کا فانوس روشن کرتی ہے اور مزید یہ بات کہ رب جس طرح تربیت کرنے والے کو کہتے ہیں اسی طرح اس ذات کو بھی کہتے ہیں جو غیر مشروط طور پر اور غیر محدود حد تک قانون سازی کا حق رکھتی ہے۔ تحلیل وتحریم کا حق صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اہلِ کتاب پر جب یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اپنا رب بنالیا ہے تو حضرتِ عدی ابنِ حاتم طائی نے آنحضرت ﷺ سے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ جس کو تحلیل وتحریم یعنی قانون سازی کا غیر مشروط اختیار دے دیا جائے اسی کو رب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے اپنی امتوں کو جو تعلیم دی تھی اس کی بنیاد یہ تھی کہ اللہ ہی تمہارا رب ہے اس لئے اس کی غیر مشروط اطاعت تم پر واجب ہے اس اطاعت میں کمی بیشی کے حوالے سے صرف اسی سے ڈرنا ہے۔ زندگی کی رہنمائی میں کسی اور کو شریک کرنا یہ شرک ہے اسے اللہ گوارا نہیں فرماتا۔ لیکن ان کی امتوں نے اسی بنیادی تعلیم کو جس نے ان کے درمیان وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل پیدا کی تھی پارہ پارہ کر ڈالا۔ اصل دین کو اپنی تنگ نظری اور تعصب کے باعث مختلف شکلوں میں تبدیل کردیا۔ اب ہر گروہ اور ہر فرقہ جو کچھ اس کے پاس ہے جو محرف بھی ہے اور نا تمام بھی۔ اس پر اڑا ہوا ہے اور اسی پر خوش ہے کہ میں بالکل صحیح راستے پر ہوں۔ قریش بھی اسی گمراہی کا شکار تھے۔ وہ وحیِ الٰہی کی رہنمائی سے بالکل محروم ہوچکے تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف اپنا نسبی انتساب تو رکھتے تھے لیکن ان کی مذہبی رہنمائی کو یکسر فراموش کرچکے تھے۔ اب ان کے پاس ان کی خانہ ساز شریعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن وہ اس پر اس حد تک مطمئن اور خوش تھے کہ اللہ کے آخری رسول کی دعوت کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔

فَذَرْھُمْ فِیْ غَمْرَتِھِمْ حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۵۴﴾

تو انہیں ایک وقتِ خاص تک ان کی سرمستی (اور غفلت) میں چھوڑ دو۔ ۵۴)

Marfat.com

پس منظر

آیتِ کریمہ کے یہ چند الفاظ اپنے اندر بڑی معنوی گہرائی رکھتے ہیں۔ بظاہر اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو تسلی دیتے ہوئے یہ کہا جارہا ہے کہ آپ انہیں ان کی غفلت میں ڈوبا رہنے دیں اور اس مدت تک ان سے کوئی سروکار نہ رکھیں جب تک یہ خود اپنی غفلت کے نتائج کو محسوس نہیں کرتے۔ لیکن غور و فکر کے بعد بات اس سے زیادہ وسیع معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ گزشتہ چند سال سے آنحضرت ﷺ نے قریش کو سمجھانے کیلئے کس طرح جان ماری ہے اور اس راستے میں کیسی کیسی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ آپ نے اپنی شخصیت کا سارا سرمایہ اس جدوجہد میں جھونک دیا ہے۔ ہر طرح کے قرابت کے اثرات اور عقل و فکر کی دعوت کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ استدلال کی حد تک دلیل کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا۔ دعوت کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی چند نفوسِ قدسیہ کے سوا قریش کی اکثریت نے اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اس کا راستہ بند کرنے کا ہر ممکن تہیہ کرلیا۔ اس پس منظر کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ زیادہ دل گرفتہ نہ ہوں ہر قوم کی طرح جن کی طرف اللہ کا نبی مبعوث ہوتا ہے انہیں بھی ایک مہلتِ عمل دی گئی ہے آپ اس وقت تک تبلیغ و دعوت کا کام ان کے اندر جاری رکھیں لیکن اگر ان کی غفلت کا پردہ ہٹنے نہیں پاتا تو آپ آزردہ نہ ہوں۔ جب مہلتِ عمل گزر جائے گی تو پھر یہ گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ انہیں بالآخر اپنی سرمستی کا انجام نظر آجائے گا اور ممکن ہے کہ اب ان کا انجام زیادہ دور نہ ہو۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد میں مدد دیئے جارہے ہیں۔ ۵۵) تو ان کے لئے بھلائی میں اضافہ کررہے ہیں؟ بلکہ ان کو اصل معاملے کا شعور نہیں ہے۔ ۵۶)

ہر دور کے آسودہ حال لوگوں کی گمراہی

پیشِ نظر دونوں آیتوں میں قریش کی ایک ایسی کمزوری کا ذکر کیا جارہا ہے جو ہر دور کے آسودہ حال لوگوں کی گمراہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مال و دولت اور اولاد میں جیسے جیسے اضافے سے نوازتا ہے ان کی گمراہی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو مال و دولت اور اولاد کی کثرت عطا کرتا ہے وہ یقیناً اپنے رویے میں بہتر شخص ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بہتر رویے کی وجہ سے اس سے خوش اور راضی ہے اور جب وہ اپنے مقابلے میں پیغمبر اور اس کے پیروکاروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مالی دشواریوں کا شکار اور بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہیں تو ان کا یقین اور پختہ ہوجاتا ہے کہ اگر یہ لوگ جو اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں واقعی ہدایت پر ہوتے اور ہم گمراہ ہوتے تو صورتحال بالکل اس کے برعکس ہوتی ہم بھوکوں مر رہے ہوتے اور مسلمان ہر طرح کی آسودگی سے ہمکنار ہوتے۔ یہ بات یاد رہے کہ مال کے ساتھ اولاد کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ قبائلی زندگی میں اولاد کی کثرت قوت و طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ جس کے پاس لڑنے والے بازو زیادہ ہیں وہ ایک طاقتور آدمی سمجھا جاتا ہے اور پھر کھیتی باڑی اور باغوں کی دیکھ بھال اور قافلۂ تجارت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی یقیناً افراد کی محتاج ہوتی ہے اور جس کے بیٹوں کی تعداد قابلِ ذکر ہے وہ وسائلِ رزق میں بھی یقیناً دوسروں سے بہتر ہوگا۔

Marfat.com

ان آیات میں اس غلط فہمی کو رد کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ مال و دولت اور اولاد کی کثرت اللہ کے ہاں قرب کا ذریعہ اور بھلائیوں میں اضافے کا باعث نہیں یہ تو اللہ کی طرف ایک آزمائش ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں پورا اترنے کی بجائے اسی کو اپنی کامیابی تصور کر لیتے ہیں ان کیلئے یہ قدرت کے استدراج کا ایسا پھندا ہے جس میں پھنس جانے کے بعد کبھی کوئی اس سے بچ کر نہیں نکلا۔ لیکن ان کی حماقت اور بلادت کا کیا کہنا کہ جو چیز ان کی تباہی کا باعث بن رہی ہے اسی کو اپنے لئے کامیابی اور قرب کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۵۷﴾

بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں۔ ۵۷)

کامیابی کے راستے پر چلنے والوں کی پہلی صفت

اس سے پہلے کفار کی خوش فہمیوں اور ان کے غلط تصورات کا تذکرہ ہوا۔ جن کی وجہ سے ان کی فکری اور عملی زندگی میں ایسی دراڑیں واقع ہوئیں جنہوں نے ان کی دنیا و عقبیٰ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے ان لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو نہ صرف کامیابیوں کے راستے کے مسافر ہیں بلکہ ان کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ انہوں نے کامیابیوں کے وضعی تصورات کو رد کر کے ان افکار و اعمال کو اپنی زندگی کی زینت بنایا ہے جو اس راستے کی کامیابی کی حقیقی ضمانت ہیں۔ دولت و رفاہیت اور عہدہ و منصب زندگی میں بظاہر بڑائی اور عظمت کی علامت ہیں۔ لیکن ان سے اقدارِ انسانیت کی جلا و بقا میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ انسان کا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ان میں سے چند لوگ امیر سے امیر تر ہو جائیں اور باقی لوگ نانِ شبینہ کے محتاج رہیں بلکہ انسان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسانوں کے اندر ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس پیدا ہو۔ لوگ اپنی منڈیر اونچی کرنے کو عزت کی علامت نہ سمجھیں بلکہ جھونپڑوں میں رہنے والوں کو ایسی چھت مہیا کرنے کو اپنا فرض جانیں جس میں وہ حوادثِ روزگار سے محفوظ رہ سکیں۔ انسان کی عظمت یہ نہیں کہ اس کے ساتھ طاقت کی فراوانی ہو بلکہ انسان کی عظمت یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کا حقوق آشنا ہو اور اپنی دولت و ثروت اور قوت و ہیبت کو انسانی معاشرے کی استواری کا ذریعہ سمجھتا ہو اور یہ تصورات اس وقت تک دلوں میں پیدا نہیں ہوتے جب تک دلوں میں ان صفات کا دیپ نہیں جلتا جس کا پیشِ نظر آیات میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے رب کی خشیت اور خوف سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ جب ان کے اندر کسی برائی کا تصور سر اٹھاتا ہے یا ان کی طاقت انہیں کسی کمزور پر ہاتھ اٹھانے پر اکساتی ہے تو ان کے رب کی خشیت اور اس کے سامنے جواب دہی کا احساس انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ آج تم اپنی طاقت اور قوت کی وجہ سے کسی کمزور پر ہاتھ اٹھانا اگر جائز سمجھتے ہو تو کل جب تم اس ذات کے سامنے کھڑے کئے جاؤ گے جو تمام طاقتوروں سے بڑھ کر طاقتور ہے اور سب حکمرانوں سے بڑا حکمران ہے تو اسے کیا جواب دو گے؟ ان کی زندگی میں یہ تصور کہ اللہ بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے اور میں ہر وقت اس کے حصار میں ہوں۔ کسی غلط کام کی طرف بڑھنے سے پہلے ان کے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں جب انسانوں میں ایسے بنیادی تصورات جگہ بنا لیتے ہیں تو ان کی زندگی دوسروں کیلئے رحمت بن جاتی ہے اور یہیں سے انسانی کامیابی کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کی خشیت کو دل میں بٹھا لیتا ہے اس کے اندر سے عرفانِ ذات کا جو شرارہ پھوٹتا ہے اقبال نے اسے زبان دیتے ہوئے کہا۔

Marfat.com

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں، میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور وہ لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۵۸)

دوسری صفت

اللہ کا رسول جب قرآنِ کریم کی آیات لوگوں کو پڑھ کر سناتا ہے تو ان آیات کے ساتھ ان کا رویہ متکبرین کی طرح کا نہیں ہوتا بلکہ یہ آگے بڑھ کر اسے حرزِ جان بناتے، دل و دماغ کی زینت ٹھہراتے، اس کے ہر حکم کی تعمیل کو زندگی کا اثاثہ گردانتے اور مشکل سے مشکل حالات میں آمنا وصدقنا کو اپنا وطیرہ بناتے ہیں۔

آیات کا ایک معنی نشانیاں بھی ہے اس معنی کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی اپنی ذات ان کے گرد و پیش اور زمین و آسمان کی ہر چیز میں جو انہیں اللہ کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں ان کے واسطے سے وہ اللہ پر ایمان اور یقین کو روز بروز مستحکم سے مستحکم تر کرتے ہیں اور کائنات کی ہر نشانی ان کے راستے کا سنگِ میل بن جاتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور وہ لوگ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ ۵۹)

تیسری صفت

زندگی کے سفر میں وہ اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے کسی سے امیدیں نہیں باندھتے اور کسی سے خوف نہیں کھاتے۔ وہ اللہ کی ذات، صفات اور حقوق میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتے۔ ان کے دلوں میں اللہ کے سوا کسی اور کو جگہ نہیں ملتی۔ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور حوالے کو قبول نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾

(اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں اس خیال سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۶۰)

Marfat.com

چوتھی صفت

وہ جو کچھ بھی اللہ کے راستے میں دیتے ہیں نمائش اور فخر کیلئے نہیں دیتے۔ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل اور اسی کی رضا کے حصول میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ اپنے مال و دولت کا بیشتر حصہ بھی اللہ کی راہ میں لٹا دیں تب بھی ان کے دل اس تصور سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اللہ کے حضور حاضری ہونے والی ہے وہاں ہمارے اس انفاق میں اگر کہیں اظہارِ فخر یا نمائش و ریا کا ادنیٰ ساجذبہ بھی نکل آیا تو ہم اللہ کو کیا جواب دے سکیں گے۔ وہ صرف دولت خرچ کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے محرک کی پاکیزگی اور قلب و دماغ کے اخلاص پر سب سے زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ بڑے سے بڑا ایثار اور انفاق ضروری نہیں کہ نمائش اور فخر کی ہر آلودگی سے مبرا رہا ہو کیونکہ

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

اُولٰٓئِکَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

یہی لوگ بھلائیاں کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ ۶۱)

ان آیات سے پہلے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کی مال و اولاد میں اضافہ فرماتے ہیں اور روز بروز ان کی دولت بڑھتی چلی جاتی ہے تو وہ بجائے اسے آزمائش سمجھنے کے اللہ کا انعام سمجھنے لگتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ ان کے لئے خیر میں اضافہ فرما رہے ہیں۔ ان کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ خیر اور بھلائی میں اضافہ مال و اولاد میں اضافے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے تو دل و دماغ میں تبدیلی کا برپا ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے حریص اسبابِ دنیا کے معمولی خسارے سے پریشان ہو جاتے ہیں اس خسارے کو دور کرنے کیلئے انہیں اگر دوسروں کے کھنڈرات پر اپنی عظمت کی عمارت اٹھانی پڑے، اپنی تجوری بھرنے کیلئے دوسروں کی قوتِ لایموت چھیننی پڑے، اپنے سامانِ عیش و نشاط کی فراوانی کیلئے دوسروں کی ہڈیوں کا تیل نکالنا پڑے تو انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ وہ کامیابی صرف اپنی ذات کی کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں جو لوگ دنیا کی بہتری اور خیر کا سامان کرتے ہیں وہ اپنے لئے کم دوسروں کیلئے زیادہ جیتے ہیں۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنے رب کے سامنے جواب دہی سے ڈرتے ہیں۔ دنیا میں نام نہاد عظمتوں کو تختِ کبریائی پر فائز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ جو کچھ اللہ کے راستے میں دیتے ہیں اسے اپنی ذات کا ذریعہ بنانے کی بجائے اللہ کی رضا کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس فکری تبدیلی سے جو عام رویہ جنم لیتا ہے اس کے نتیجے میں بھلائیاں آگے بڑھتی ہیں اور یہی درحقیقت اس فوز و فلاح کا راستہ ہے جس کی طرف اشارہ اس سورۃ کے آغاز میں بھی فرمایا گیا۔

وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا وَلَدَیْنَا کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۶۲)

Marfat.com

احساسات کی تسکین

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے بعض احساسات کی تسکین کا سامان ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ کمزور طبیعتوں کی ڈھارس کا سامان بھی۔ مسلمان مخالفت وعناد کی جس صورتحال سے دوچار تھے اور جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا اس میں کبھی کبھی بعض طبیعتوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگتا تھا کہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایمان اپنی قیمت مانگتا ہے اور مخالفین کا ردِ عمل بھی غیر فطری نہیں۔ کوئی شخص بھی اپنے آبائی خیالات اور دل ودماغ میں بیٹھے ہوئے تصورات کو آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور جب تبلیغ ودعوت کے زور سے ان خیالات میں اصلاح یا تبدیلی کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ صرف سادہ ردِ عمل پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اکثر اوقات طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن جب یہ طاقت کا استعمال ظلم کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو پھر ایمان کے راستے پر چلنے والوں کے دماغوں میں بعض دفعہ اندیشے تیرنے لگتے ہیں کہ ہم کب تک صبر واستقامت سے اس صورتحال کا مقابلہ کرسکیں گے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مخالفین کی طرف سے حالات کی یہ ابتری کیا رنگ لائے گی۔ چنانچہ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ایسے ہی احساسات کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے۔ مخلص فداکاروں سے کہا گیا ہے کہ تم نے آج تک قربانی اور استقامت کی جو تاریخ رقم کی ہے وہ تمہاری دنیوی واخروی کامیابیوں کی ضمانت ہے۔ اللہ نے مومنوں سے فوز وفلاح کے جو وعدے کر رکھے ہیں تم انشاءاللہ ان سب سے نوازے جاؤ گے۔ رہا تمہارا یہ احساس کہ ممکن ہے آئندہ چل کر مخالفتیں اور اذیتیں اس طرح ناقابلِ برداشت ہو جائیں کہ تمہاری ہمت جواب دینے لگے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی ہمتوں سے بڑھ کر کبھی ان پر بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ اپنے بندوں کی ہمتوں کو جانتا ہے۔ وہ انسانی فطرت اور انسانی جذبوں اور صلاحیتوں کا خالق ہے اس لئے اس سے بڑھ کر ان کی حدود کا جاننے والا اور کون ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے پہلے جملے میں ان کی ہمتوں کا اعتراف بھی ہے اور حالات میں تبدیلی کا اشارہ بھی۔

اصحابِ ایمان میں سے وہ لوگ جو سابقون جیسی ہمت وعزیمت کے مالک نہیں ہوتے۔ وہ حالات کو دیکھ کر بعض دفعہ دل گرفتہ ہونے لگتے ہیں کہ ہم کب تک ان مخالفتوں کا سامنا کرسکیں گے۔ انہیں یہ کہا جارہا ہے کہ تمہیں جن مصائب کا سامنا ہے وہ تمہاری ہمتوں سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا مکلف نہ بناتا اور دوسری بات یہ ہے کہ انفرادی کمزوریوں سے تو پروردگار بھی درگزر فرماتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی مشترک اور عمومی ہمتوں کے حوالے سے کوئی شخص جب کمزوری کا اظہار کرتا ہے تو اس سے یقیناً یہ پوچھا جائے گا کہ آخر دوسرے مسلمان جن کے ایمان واستقامت کی تاریخ تم سے بھی دراز ہے وہ ان مصائب کو کیسے برداشت کرتے رہے ہیں؟ اگر یہ صورتحال تکلیفِ مالایطاق ہوتی تو وہ بھی ہمت ہار دیتے۔ لیکن انہوں نے آج تک ہمت نہیں ہاری۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں عزیمت واستقامت کی تاریخ رقم کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا ایک ایک عمل اور ایک ایک قربانی ایک کتاب یعنی نامۂ عمل میں محفوظ کی جارہی ہے۔ اور اگر کہیں کسی نے کوئی کمزوری دکھائی ہے تو وہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہے۔ قیامت کے دن اس نامۂ عمل کی ایک ایک پرت کھلے گی اور ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ بولے گا اور شہادت دے گا اور اسی کے مطابق اجر وثواب سے ہر شخص کو نوازا جائے گا۔ اس دن اجر وثواب کی وسعت اور قدر وقیمت کو دیکھ کر قربانیوں کے راستے پر چلنے والے تمنا کریں گے کاش! ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں تو آج ہم ان کا بھی بیش از بیش صلہ پاتے۔

اس نامۂ عمل کی اگر صحیح کیفیت کو معلوم کرنا ہو تو سورۂ کہف کی اس آیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

Marfat.com

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

''اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا پھر تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اس کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے۔ اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری بدبختی یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ایسی نہیں رہ گئی جو اس میں درج نہ ہو وہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔ (الکہف: ۴۹)

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾

بلکہ ان لوگوں کے دل اس چیز سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کے اعمال ان کے ماسوا ہیں وہ انہیں کاموں کو کرتے رہیں گے۔ ۶۳)

مترفین کی گمراہی اور تباہی کا سبب

آیت نمبر ۵۴ اور ۵۵ میں متکبرین اور متمردین کے ایک مغالطہ کا ذکر کیا گیا تھا۔ جس نے ان کی فکری اور عملی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور وہ اپنے مغالطہ میں اس حد تک جکڑے ہوئے تھے کہ اس سے مختلف کسی بہتر سے بہتر بات کو بھی سننے کے روادار نہ تھے۔ اس مغالطہ کے تحت ان میں جو سب سے بڑی خرابی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی دولت و رفاہیت کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل بنا لیا اور اسی کو اللہ کی رضا کی علامت سمجھا۔ پروردگار نے ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے ان لوگوں کی زندگی کے نمونے ان کے سامنے رکھے جو دولت و رفاہیت اور مادی زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ کے اعتبار سے بالکل نادار اور تہی دامن ہیں۔ لیکن انسانیت کا حسن، نیکی کا وقار اور مکارمِ اخلاق کی عظمت انہیں کے دم سے قائم ہے اور یہی لوگ ہیں جس سے انسانی قافلے کی بقا وابستہ ہے۔

پیشِ نظر آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ مال دار اور مادہ پرست لوگوں کا وہ رویہ جس نے انسانیت کا مستقبل خطرے میں ڈال دیا ہے اس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ وہ نہ قیامت کے آنے پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اللہ کے سامنے جوابدہی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کے تمام اعمال وہ ہیں جو مادہ پرستی کے نتیجے میں پیدا ہوتے اور ان کی ترجیح بن جاتے ہیں۔ چونکہ انہیں کسی جواب دہی کا احساس نہیں اس لئے وہ لطف و لذت اور عزت و طاقت کے فلسفے کے سوا کسی اور فلسفے کے قائل نہیں۔ وہ عمل جو قربانی اور ایثار پر مبنی ہو وہ ان کے نزدیک حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ! جس عمل سے خواہشات کا پیٹ بھرا جا سکتا ہو۔ وہ ان کے دل کی آواز ہے۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ ۖ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چلائیں گے۔ ۶۴)

آج نہ چلاؤ اب ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۶۵)

Marfat.com

مترفین کا انجام

اللہ کے سامنے جوابدہی سے بے نیاز ہو کر چونکہ ان کی ترجیحات بدل گئی ہیں اور ان کے اعمال بالکل دوسری روش اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی ذہنی اور عملی حالت اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے رویے سے مختلف بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور یہ لوگ اپنے معاشرے کی جو صورت آرائی کر چکے ہیں اس میں امرا و غربا کے دو مختلف طبقے اس طرح اپنی جڑیں بنا چکے ہیں گویا وہ انسانی زندگی کے لازمے ہیں۔ اس معاشرے کو لیڈ (Lead) کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا وہ بالا دست طبقہ ہے جس کو اس آیت میں مترفین کہا گیا ہے۔ حقیقت میں ان تمام خرابیوں کی اگر ذمہ داری کسی پر ڈالی جاسکتی ہے تو وہ یہی مترفین کا گروہ ہے۔ اسی لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ چونکہ نصیحت و فہمائش کے مرحلے سے گزر چکے ہیں اس لئے اب ایک ہی صورت ہے کہ ان کے خوشحال طبقے پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ وہ اس وقت یقیناً تکبر اور تمرد کی تصویر بنے ہوئے ہیں لیکن جب ان پر اللہ کی گرفت آئے گی اور پھر وہ اس طرح آہ و بکا کریں گے بلکہ اس طرح چلائیں گے جس طرح بیل ذبح ہوتا ہوا ڈکراتا ہے کیونکہ "جوار" بیل کی آواز کو کہتے ہیں۔ تو ان کی اس آہ و زاری اور بے تحاشہ چیخنے پر کوئی رحم نہیں کھایا جائے گا بلکہ اللہ کی طرف سے آواز آئے گی کہ آج چیخنے اور چلانے کی کوشش نہ کرو۔ ہمارے رسول نے تمہیں سمجھانے بجھانے کیلئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا۔ خونِ جگر پی پی کر تمہارے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا۔ تمہاری گالیوں پر تمہارے لئے دعائیں کی۔ لیکن تم نے ہمارے رسول کی بات سن کر نہ دی۔ تم اپنے تکبر اور تمرد میں اس حد کو پہنچ گئے ہو کہ کسی طرح کا رحم اور ہمدردی کے تم مستحق نہیں رہے کیونکہ جب اللہ کا عذاب آجاتا ہے تو پھر دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں جس طرح فرعون نے ڈوبتے ہوئے اللہ پر ایمان لانے کا دعویٰ کیا تاکہ اللہ سے رحم کی بھیک مانگے لیکن صاف فرمایا گیا کہ اب تمہیں اللہ پر ایمان یاد آیا اس سے پہلے تم انتہا درجے کے نافرمان اور مفسد رہے ہو، اب تم پر رحم نہیں کیا جاسکتا۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾
مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

(وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جایا کرتے تھے۔ (٦٦) غرور و تکبر کرتے ہوئے۔ گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو۔ (٦٧)

جب ان کے مترفین پر عذاب آئے گا تو وہ چیختے چلاتے ہوئے اللہ کو مدد کیلئے پکاریں گے۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ مدد مانگنے کا تو وہ وقت تھا جب تم پر اللہ کا رسول اللہ کی کتاب کی آیات پڑھ کر سناتا تھا اور تمہارے عقائد و اعمال پر نہایت مخلصانہ تنقید کے ساتھ تم پر تمہاری کوتاہیاں واضح کرتا تھا۔ لیکن تمہارا حال یہ تھا کہ وہ تمہاری عاقبت سنوارنے کیلئے تمہارے پیچھے پیچھے ہوتا لیکن تم نہایت تکبر اور غرور کے ساتھ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے اور آنحضرت ﷺ کو کوئی مناسب مقام دینا تو دور کی بات ہے تم اس طرح چھوڑ کر بھاگتے تھے گویا آپ کوئی قصہ گو ہیں جو اللہ کی کتاب پڑھ کر نہیں سنا رہے بلکہ قصے کہانیاں سنا رہے ہیں۔

Marfat.com

آیت کی تالیف

آیت کے آخری حصے کا یہ مفہوم جو ہم نے بیان کیا ہے اس صورت میں ہے کہ بہٖ کی ضمیر مجرور کا مرجع رسول ہو۔ رسول کا ذکر اگرچہ الفاظ میں نہیں لیکن فحوائے کلام سے متبادر ہوتا ہے اور ''سامر'' کو یا تو ''تھجرون'' کا مفعول بنایا جائے اور یا ضمیر مجرور سے حال ٹھہرایا جائے۔

ترکیب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ''سامراً'' ''مستکبرین'' سے حال ہے۔ یہ مفرد ہے جو جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس طرح ثم نخرجکم طفلاً میں طفل مفرد ہے لیکن اس کا معنی اطفال ہے۔ اس صورت میں آیت نمبر ۶۷ کا مفہوم یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ جب ان کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے تو وہ پیٹھ پیچھے بھاگ کھڑے ہوتے۔ غرور وتکبر کا رویہ اختیار کرتے اور صحنِ حرم میں چاندنی راتوں میں جب محفلیں جمتیں تو وہاں دنیا بھر کے قصے اور افسانے بیان ہوتے تو قرآن کریم کو بھی ایک افسانے کی طرح زیرِ بحث لایا جاتا اور آنحضرت ﷺ کی شان میں طرح طرح کی گستاخیاں کی جاتیں۔

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

کیا ان لوگوں نے اس کلام پر کبھی غور نہیں کیا یا ان کے پاس پیغمبر (ﷺ) کوئی ایسی چیز لے کر آئے ہیں جو ان کے اگلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی۔ ۶۸)

مشرکین مکہ کی مخالفت کے نام نہاد اسباب

مشرکینِ مکہ کا رویہ جو گزشتہ آیات میں متعدد دفعہ زیرِ بحث آچکا ہے اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کے ساتھ ان کا سلوک جس کو ہر آنکھ دیکھ رہی ہے کیا اس وجہ سے ہے کہ نبیِ کریم ﷺ اللہ کی طرف سے جو کتاب ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں یعنی قرآنِ کریم انہوں نے کبھی اس پر غور وفکر نہیں کیا کہ وہ کتاب کیسی ہے؟ کیسی زبان میں ہے؟ اس کی فصاحت وبلاغت کا عالم کیا ہے؟ وہ انہیں کس بات کی دعوت دیتی ہے؟ اور یا ایسا ہے کہ انہوں نے غور تو کیا ہے لیکن وہ کتاب انہیں سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ دونوں باتیں درحقیقت ناقابلِ قبول ہیں۔ نبیِ کریم ﷺ کی جو دعوت ان کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اور کتاب کی تلاوت دلوں کی تسخیر کر رہی ہے اور جس کی معجز بیانی نے قریش کے بڑے بڑے لوگوں کو حیرانی میں مبتلا کر رکھا ہے اور جس کی بیان کردہ تعلیم اور نظامِ زندگی کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے کبھی اس پر غور وفکر نہ کیا ہو؟ رہی یہ بات کہ ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ کتاب سمجھ نہ آئی ہو۔ یہ بات قبول کرنا بھی محال ہے اس لئے کہ وہ کتاب کوئی چیستان نہیں جو سمجھ نہ آتی ہو۔ اس کی زبان الجھی ہوئی زبان نہیں وہ اسی زبان میں نازل ہو رہی ہے جسے قریش کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہ دونوں باتیں ان کے رویے کا باعث نہیں ہوسکتیں۔

تیسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ شاید ان کے موجودہ رویے کا سبب یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ ہمارے پاس ایک ایسی دعوت لے کر آئے ہیں اور اللہ کی طرف سے اپنے اوپر ایسی وحی اترنے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ایسی باتوں کی تعلیم دے رہے ہیں جو باتیں اور جو وحی ہمارے اگلے آباؤ اجداد میں کبھی نہیں آئی۔ ان میں کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور کبھی یہ بات نہیں کہی کہ تم چونکہ اللہ کے بندے ہو اور اللہ تمہارا معبود ہے اس لئے تمہیں زندگی گزارنے کا طریقہ اور ڈھب اللہ کی طرف سے ملنا

Marfat.com

چاہئے۔تم اپنی طرف سے جو اصولِ حیات اور ضوابطِ حیات طے کرو گے وہ صحیح نہیں ہوں گے۔اس طرح کی باتیں ہمارے آباؤ اجداد نے کبھی نہیں سنیں۔یہ بات بھی پہلی دونوں باتوں کی طرح بالکل غلط ہیں۔اس لئے کہ جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اور اللہ کی طرف سے رہنمائی نازل کئے جانے کا سوال ہے یہ کوئی نئی بات نہیں۔قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے تجارتی اسفار میں عراق،شام اور مصر سے گزرتے رہتے ہیں۔اس لئے وہاں جو نبی مبعوث ہوئے اُن کی تاریخ اِن کیلئے اجنبی نہیں اور یہ بھی اب امرِ واقعہ ہے کہ ان کی اپنی سرزمین میں ان کے اپنے آباؤ اجداد میں حضرت ابراہیم اور حضرتِ اسماعیل علیہما السلام اللہ کے رسول گزرے ہیں۔اور خود جزیرۂ عرب کے اندر حضرتِ ہود، حضرتِ صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام اپنے اپنے وقتوں میں رسول بن کر آئے۔اور ان کی قومیں ان کی تکذیب کے باعث اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔یہ سب لوگ ان کے جانے پہچانے ہیں اور یہ انہیں اپنے تئیں اللہ کے سچے نبی سمجھتے ہیں۔تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو یہ کہہ کر رد کر دیں کہ یہ ایک ایسی اجنبی چیز ہے جس سے نہ ہم واقف ہیں اور نہ ہمارے آباؤ اجداد واقف تھے۔

اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

یا انہوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں اس وجہ سے اُن کے منکر بنے ہوئے ہیں۔ ۶۹)

مزید عذرِ لنگ

قریش اور دوسرے اہلِ مکہ کے انکار کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ایک اجنبی آدمی اٹھا اور اس نے رسالت کا دعویٰ کر دیا کہ میں اللہ کی طرف سے اللہ کا پیغام لے کر مبعوث ہوا ہوں۔اس لئے تم مجھ پر ایمان لاؤ۔اب لوگ پریشان ہیں کہ ہم لوگ شخصی طور پر اسے جانتے نہیں اس کے نسب سے واقف نہیں اس کے قبیلے کی کچھ خبر نہیں۔اس کا سیرت و کردار بے خبری کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔اس سے کبھی کسی معاملہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تو ہم ایسے شخص کو اللہ کا رسول مان کر کس طرح کھائی میں چھلانگ لگا دیں۔ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں قریش اور دیگر اہلِ مکہ اس طرح کی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔وہ آنحضرت ﷺ کے خاندان سے واقف ہیں۔آپ کی نسلی شرافت ان کے یہاں مسلّم ہے۔شہر مکہ ان کے عزیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ان کا بچپن، ان کا لڑکپن ان کی جوانی ان کے سامنے گزری ہے۔انہوں نے بکریاں ان کے سامنے چرائیں۔تجارت ان کے سامنے شروع کی اور اپنی کاروباری صلاحیت ان سے منوائی۔چالیس سالہ زندگی ان میں گزاری اور اپنے بے عیب سیرت و کردار کا ان سے لوہا منوایا۔کل تک مکہ کے لوگ ان کی صداقت و امانت کا اعتراف کرتے رہے۔ان کو امین اور صادق کہہ کر پکارا جاتا۔قریش ہی کے خاندان کی ایک معزز خاتون سے انہوں نے شادی کی۔شب و روز انہیں کے ساتھ گزارے۔قریش کا ہر آدمی اپنے پیچھے اچھی بری داستانیں رکھتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ ایک ایسی شخصیت کے طور پر جانے پہچانے ہیں جن کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔نبوت کے دعوے تک لوگوں نے ان میں ایسی بو تک نہیں سونگھی جس سے گمان کیا جاسکتا ہو کہ وہ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں۔کبھی کسی شخص نے ان سے کلمۂ نصیحت تک نہیں سنا۔اب جبکہ وہ اپنی معصوم شخصیت اور معلوم سیرت و کردار کے ہر پہلو سے لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں تو اچانک اللہ کا پیغام ان پر نازل ہوتا ہے اور وہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم چونکہ اس شخص کو جانتے نہیں کہ یہ کس سیرت و کردار کا آدمی ہے آیا نبوت جیسے عظیم منصب کا مستحق بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے کوئی ذمہ دار آدمی قبول نہیں کرسکتا۔تو ایسے جھوٹ کی بنیاد پر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر ایمان نہ لانے کا سبب ہوسکتا ہے؟ یقیناً ان کے انکار کا سبب کچھ اور ہے۔

Marfat.com

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ بَلۡ جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَکۡثَرُہُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ ۝۷۰

یا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کوئی جنون کا اثر ہے۔نہیں، بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے اور حق ہی ان کی اکثریت کو ناگوار ہے۔ ۷۰)

ایک بیہودہ الزام

قریش کا آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرنے کا سبب شاید یہ ہو کہ قریش کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو جنون کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔چنانچہ وہ اپنے اس مرض کے زیرِ اثر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان پر اللہ کی وحی اترتی ہے حالانکہ جب انہیں اس بیماری کا دورہ پڑتا ہے تو ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اسے اللہ کی وحی سمجھنے لگتے ہیں۔جو شخص بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا سرسری مطالعہ بھی رکھتا ہو، وہ اس بات کو سن کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا قریش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے سمجھدار لوگ تھے لیکن ان کی یہ بات تو نہایت احمقانہ ہے۔لیکن جس شخص کی نگاہ حسد اور بغض کے محرکات اور آثار و نتائج پر ہو اور وہ کسی حد تک انسانی نفسیات کو سمجھتا ہو تو اسے اس میں کوئی حیرانی محسوس نہیں ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کے مستشرقین جنہیں علومِ مشرقیہ اور علومِ اسلامیہ پر دسترس کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ وہ رات دن تحقیق کے کام میں مصروف ہیں اور انہوں نے پراپیگنڈہ کے زور سے بہت حد تک اپنی غیر جانبداری کو لوگوں کے دلوں میں اتار رکھا ہے، وہ بھی یہ بات کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کو مرگی کا دورہ پڑتا تھا اور وہ اور ان کے دیکھنے والے اسے نزولِ وحی کی کیفیت سمجھتے تھے۔اور مرگی چونکہ جنون ہی کی ایک قسم ہے ایسا مریض بعض دفعہ اول فول بھی بکنے لگتا ہے اور بعض چیزیں اس کے تصور میں لہرانے بھی لگتی ہیں۔تو وہ اسی کیفیت کے نتیجے کو آنحضرت ﷺ کی نبوت کا باعث سمجھتے ہیں۔اندازہ فرمایئے! نبی کریم ﷺ کی زندگی نبوت سے چالیس سال پہلے اور نبوت سے تیئس سال بعد لوگوں کے سامنے گزری ہے۔دوست اور دشمن اس کے گواہ ہیں۔نبوت سے پہلے کی زندگی میں آپ نے کاروبار بھی کیا، لوگوں کے معاملات میں شریک بھی رہے، قریش کا کوئی اجتماعی مفاد ایسا نہیں جس میں آپ نے اپنا فرض ادا نہ کیا ہو، غریبوں بے کسوں اور بیواؤں کے گھر آپ کی مدد اور تعاون سے روشن رہے اور کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے حقوق کی واپسی میں آپ نے اپنا فرض انجام دیا۔لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایسی مصروف معاشرتی زندگی میں قریش نے ہمیشہ آپ کو نمونے کا بے عیب آدمی سمجھا اور ہمیشہ آپ کی ہوش مندی اور دانائی کی مثالیں دی جاتیں اور الجھے ہوئے معاملات میں آپ کی معاملہ فہمی پر بھروسہ کیا جاتا اور کبھی کسی کو ایک لمحے کیلئے بھی یہ تصور پیدا نہ ہوا کہ آپ کو کوئی جنوں لاحق ہے۔اسی طرح نبوت کے بعد کی تیئس سالہ زندگی دشمنوں اور دوستوں میں اس طرح گزری کہ ہر ایک نے آپ کی اصابتِ فکر اور غیر معمولی حالات میں آپ کی استقامت انتہائی مایوس کن حالات میں آپ کا حیران کن یقین واذعان نہایت محدود افرادی قوت کے ساتھ چند ہی سالوں میں جزیرۂ عرب کی قسمت کو بدل ڈالنے والا انقلاب اور آپ کی زبان مبارک سے نکلنے والے جواہر پارے اپنی حکمت ودانش میں آج تک انسانی سطح سے بالا اور آپ کی ہمہ جہت شخصیت کے بے پناہ اثرات آج تک انسانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ، کیا ایسا ہوتا ہے جنون؟ اور کیا ایسے ہوتے ہیں وہ اثرات جو جنون سے پیدا ہوتے ہیں؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریش کے انکار کا سبب یہ جنون کا الزام نہ تھا بلکہ سبب کچھ اور تھا۔

سبب کچھ اور ہے تو خود جسے سمجھتا ہے

Marfat.com

مخالفت کا حقیقی سبب

وہ سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کے پاس وہ حق اور سچائی لے کر آئے ہیں جو ان کی اکثریت کو ناگوار گزرتی ہے۔ یہ خواہشاتِ نفس کے اسیر، مال و دولت اور عہدہ و منصب کی ہوس کے شکار اور اپنی ہی ذات کے گنبد میں بند رہنے والے جب یہ دیکھتے ہیں کہ انہیں ایثار و قربانی اور اللہ کی بندگی کی طرف بلایا جا رہا ہے جبکہ ان کی زندگی اس کے بالکل برعکس دوسری طرح سے گزر رہی ہے۔ وہ اپنی بے بسی اور نارسائی کو چھپانے کیلئے داعی الی الحق کو مختلف الزامات کا نشانہ بنانے لگتے ہیں، جس طرح ایک مریض جب طبیب کی تشخیص کردہ دواؤں کو کڑوی اور کسیلی دیکھتا ہے اور وہ انہیں حلق سے نیچے اتارنا نہیں چاہتا تو وہ خود کو مریض تسلیم کرنے کی بجائے الٹا طبیب ہی کے مشورے کو ہذیان قرار دینے لگتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ﴿۷۱﴾

اور اگر کہیں حق ان کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب تباہ ہو جاتے بلکہ ہم تو ان کے پاس ان کا اپنا ذکر لے کر آئے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑ رہے ہیں۔ ۷۱)

گزشتہ بات کی وضاحت

قریش اور دیگر مخالفین کی جانب سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کے جتنے امکانات یا جتنے دعوے ہو سکتے تھے، گزشتہ آیات میں ان میں سے ایک ایک کا ذکر فرما کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی آنحضرت ﷺ کی مخالفت کا اصل سبب نہیں بلکہ اصل سبب دو باتیں ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ قریش اور دیگر مشرکین نے اپنے طور پر دین کے بارے میں کچھ تصورات بنا لیے ہیں اور زندگی گزارنے کا ایک خاص خانہ ساز طریقہ اپنا لیا ہے۔ اب ان کی خواہش یہ ہے کہ جو شخص بھی انسانی اصلاح کا مقصد لے کر اٹھے تو اسے وہی باتیں پیش کرنی چاہئیں جو انہوں نے پہلے سے اختیار کر رکھی ہیں اور جس سے مختلف کسی بات کو نہ یہ سننے کیلئے تیار ہیں اور نہ قبول کرنے کیلئے جبکہ ان کی اختیار کردہ باتوں کے پیچھے نہ کوئی فلسفہ کام کر رہا ہے اور نہ کوئی زندگی کا مخلصانہ گہرا تجربہ۔ بس ان کی چند خواہشات ہیں جن سے انہوں نے اپنی فکر کا ایک سانچہ تیار کیا ہے، اسی کے مطابق انہوں نے چند عقائد اختیار کر لئے ہیں اور جائز و ناجائز، حلال و حرام اور حسن و قبح کے معیارات میں بھی ان کی خواہشات اور مفادات نے بنیادی کردار ادا کیا ہے لیکن اللہ کا رسول جب اللہ کی طرف سے زندگی کی حقیقی صداقتوں اور واقعی حقائق کو ان کے سامنے واشگاف کرتا ہے اور ان کی اصل حیثیت کو ان کے دل و دماغ میں اتارتا ہے اور زندگی کو مہلتِ عمل قرار دے کر آخرت کے شعور کو ان کے سامنے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو وہ اپنے مزعومہ تصورات کو اٹل اور حتمی سمجھتے ہوئے اللہ کے رسول کی ہر بات کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری بات یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی بلند مقصد نہیں۔ یہ درحقیقت خواہشاتِ نفس کو اپنی اپنی ہمت کے مطابق بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جو شخص یہاں اپنی ہمت، صلاحیت اور قابلیت سے اپنی خواہشات کی مملکت بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ دنیا میں ایک کامیاب انسان ہے اور جو ایسا نہیں کر سکتا وہ ایک ناکام شخص ہے۔ اللہ کا رسول جب انہیں زندگی کے مقاصد کی طرف بلاتا ہے جو قدم قدم پر خواہشاتِ نفس کی قربانی مانگتے ہیں تو یہیں سے تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہاں بالادستی اور حکمرانی کا حق خواہشِ نفس کو ہونا چاہئے۔ یہاں اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں۔ کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری؟ اور کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہئے؟ سراسر جذباتی اور کتابی باتیں ہیں۔ جن کا کتاب زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اگر ان کے تصورات کے مطابق حق کو خواہشِ نفس کے تابع کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اخلاق تباہ ہو جائیں گے۔ انسانی قدریں پامال ہو جائیں گی۔ نیکی کا تصور مٹ جائے گا۔ خیر کی جگہ شر، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ بدی، امانت کی جگہ خیانت اور اس سے بڑھ کر توحید کی جگہ شرک اور قیامت کی بجائے انکارِ قیامت جیسے تصورات کا چلن عام ہو جائے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ شر کی سرافرازی، ظلم کی بالادستی، خیانت کی کارفرمائی اور بدی کی حکمرانی سے یہ دنیا درندوں کا بھٹ بن کر رہ جائے گی۔

آیتِ کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے کیونکہ ایسا کرنے سے زمین و آسمان کی ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔ البتہ! انسانی فلاح و بقا کا راستہ یہ ہے کہ ہوائے نفس کو حق کے تابع بنا دیا جائے۔ عدل کو ظلم کے تابع کرنے سے تو ظلم بڑھتا ہے اور انسانی خوشیاں غموں میں ڈوب جاتی ہیں اور حقوق محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ظلم کو عدل کے تابع کر دیا جائے تو محرومیاں شادمانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور غم واندوہ کے بادل مسرتوں کے سایوں میں بدل جاتے ہیں اور یہ تبدیلی اس وقت آتی ہے، جب انسانی معاشرہ اس بات کو قبول کرلے کہ دنیوی زندگی مہلتِ عمل ہے۔ ہر عمل کی صورت گری انبیائے کرام کی تعلیم اور اللہ کی کتابوں کی رہنمائی سے ہوتی ہے۔ اس لئے پروردگار نے ہر دور میں اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور انسانوں کے دل و دماغ میں یہ بات اتاری کہ یہ تمہاری چند سالہ زندگی آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کیلئے کامیابی یا ناکامی کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے ہر رسول ہر دور کے لوگوں کیلئے یاددہانی لے کر آتا ہے کہ اس زندگی کی نعمتوں کو حاصلِ زندگی سمجھ کر عیش و عشرت کا ذریعہ نہ بناؤ بلکہ جو تمہیں زندگی کے بلند مقاصد بخشے گئے ہیں ان کے حصول کیلئے اس زندگی کو استعمال کرو۔ لیکن قریش اور دیگر باطل پرستوں کا حادثہ یہ ہے کہ وہ اپنے حصے کی یاددہانی کی طرف توجہ دینے کی بجائے اس سے منہ پھیر رہے اور مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔

ذکر کا ایک اور معنی تاریخ اور کہانی بھی ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے سامنے گزشتہ انبیائے کرام کی دعوت اور معذب قوموں کی تکذیب کی تاریخ بیان کی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ کا رسول آتا ہے تو وہ ان کے سامنے دین کی صورت میں ایک ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر وہ قوم اسے قبول کر کے اپنی زندگی کا دستور بنا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی حکمرانی اور آخرت کی فلاح و کامرانی سے نوازتا ہے۔ لیکن اگر وہ اللہ کے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد اس قوم پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے اور وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے۔ یہ انسانوں کی تاریخ اور انسانیت کی کہانی ہے۔ جو ہر دور میں پیش آتی رہی ہے۔ اب نبی کریم ﷺ پھر اسی ذکر اور کہانی کو لوگوں کے سامنے دہرا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی دنیا و عاقبت کو سنوار لیں۔ بصورتِ دیگر ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلی معذب قوموں کا ہو چکا ہے۔ اسی بات کو قرآنِ کریم نے ایک اور جگہ دہراتے ہوئے ارشاد فرمایا:
لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ اقبال مرحوم نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا ۔

Marfat.com

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿٧٢﴾

کیا آپ ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہیں؟ آپ کے رب کا دیا ہوا معاوضہ آپ کیلئے بہتر ہے۔اور وہ بہترین روزی بخشنے والا ہے۔ ۷۲)

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کیلئے تسلی اور آپ کے مخالفین کیلئے سرزنش ہے۔اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل بھی ہے۔قریش کو شرم دلاتے ہوئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم جو آنحضرت ﷺ پر نفسانیت کا الزام لگاتے ہو اور تمہارا گمان یہ ہے کہ شاید آپ نے اپنی کسی نفسانی غرض کیلئے نعوذ باللہ من ذالک نبوت کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔خدا لگتی کہو! کہ وہ جو شب و روز تمہاری اصلاح اور تم تک اللہ کا دین پہنچانے کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور اس راستے میں تم سے ہر اذیت کو برداشت کرتے ہیں۔تمہارے الزامات سہتے اور تمہاری خرافات کو برداشت کرتے ہیں تو آخر اس میں ان کا ذاتی مفاد کیا ہے؟ دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی خاطر محنت کرتا، وقت صرف کرتا اور دکھ اٹھاتا ہے تو کیا آنحضرت ﷺ نے تمہاری بھلائی اور خیر خواہی کیلئے جو کچھ کیا ہے اس پر کچھ معاوضہ طلب کیا ہے۔آپ کا بدترین دشمن بھی آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کیونکہ تمام قریش جانتے ہیں کہ آپ ایک کامیاب تاجر تھے مختلف ممالک میں آپ کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔لیکن نبوت کی مصروفیات نے نہ صرف آپ کا کاروبار تباہ کیا بلکہ آپ کو نادار کر دیا۔آپ اپنی قوم اور شہر میں سب سے زیادہ ہردلعزیز اور عزت و شہرت کے مالک تھے۔لیکن اب انہیں گالیاں دی جا رہی اور پتھر مارے جا رہے ہیں۔ملک کا بچہ بچہ آپ کا دشمن ہو گیا ہے۔آپ کے اپنے ہی بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔اور مزید یہ بات بھی کہ آپ جو دعوت لے کر اٹھے ہیں اور آپ نے جس طرح انسانوں میں تفاوت ختم کرنے اور طبقات کو مٹانے کی کوشش کی ہے وہ تو سراسر قومی تعصبات کیلئے چیلنج ہے۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے تو قریش کے سمجھدار طبقے کو آپ کی بے نفسی اور للّٰہیت پر یقین پیدا ہونا چاہئے تھا۔لیکن وہ نہ جانے آنحضرت ﷺ کے بارے میں کس طرح کے تحفظات کا شکار ہو چکے ہیں۔وہ اپنی طرح آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ وہ اپنی تجارت اور کاروبار اثر و رسوخ اور ہردلعزیزی کو داؤ پر لگا کر لوگوں کی فلاح و کامرانی کیلئے کوشاں ہوں گے۔وہ آپ کو بھی اپنی طرح دنیا کے مفادات کا اسیر سمجھتے ہیں۔اور انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک داعیِ حق صرف اللہ کی رضا اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے جسم و جان، مال و دولت اور زندگی کی ہر آسائش کو قربان کر سکتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿٧٤﴾

(بے شک آپ انہیں ایک سیدھی راہ کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ۷۳) اور جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ ۷۴)

Marfat.com

مشرکین کا اصل مرض

اس آیت کریمہ میں بھی نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ آپ کی دعوت میں کوئی کجی ہے اور نہ دعوتی جدوجہد میں کوئی کوتاہی ہے بلکہ آپ کی دعوت تو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چلنے کی دعوت ہے اور اسی شاہراہ پر چل کر ہی انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ قریش کی مخالفت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اس شاہراہ کے مسافر نہیں جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں اور جس منزل کی طرف آپ انہیں لے جانا چاہتے ہیں وہ سرے سے اس منزل کو تسلیم ہی نہیں کرتے یعنی انہیں آخرت کے وجود ہی سے انکار ہے۔ اور یہ بالکل ایک سیدھی سی بات ہے کہ جو شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مآل اور نتیجہ نہیں اور اسے کسی کے سامنے اپنی زندگی کے اعمال کی جوابدہی نہیں کرنی۔ تو اسے آخر اس بات کی کیا فکر ہوسکتی ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اس کے سامنے تو صرف جسمانی ضروریات اور خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ اگر پیٹ کا جہنم بھرتا رہے اور نفسانی خواہشات کو غذا مہیا ہوتی رہے تو اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ صراطِ مستقیم کتنا دور نکل گیا ہے۔ اس کیلئے حقوق اللہ بھی بے معنی ہیں اور حقوق العباد بھی لایعنی باتیں ہیں۔ اچھائی برائی کا تصور اور اخلاقی پابندیاں محض توہمات کا ایک پھندا ہیں جسے لوگوں نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ جب تک اس بنیادی تصور میں تبدیلی نہیں آتی اس وقت تک آنحضرت ﷺ کی دعوت اور توحید اور آخرت کی باتیں قریش اور دیگر مخالفین کیلئے بے وقت کی راگنی ہیں جسے ان کی سماعتیں برداشت نہیں کرسکتیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

(اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف دور کردیں جس میں آج کل یہ مبتلا ہیں تو یہ اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے بڑھتے جائیں گے۔ ۷۵)

مشکل الفاظ:۔ لَجُّوْا، اللجاج التمادی فی العناد وتعاطی الفعل المزجور عنه.

یعنی عناد و مخالفت میں بڑھے چلے جانا اور جس فعل سے روکا جائے اس کا ارتکاب کرنا۔

يَعْمَهُوْنَ: العمه، التردد فی الامر من حیرةٍ۔ حیرت سے کسی کام میں متردد ہونا۔

حق کے مسلسل انکار کے نتائج

آخرت سے مسلسل انکار اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے بے نیازی نے ان کی سیرت و کردار میں ایسا بگاڑ پیدا کیا ہے کہ نہ ان کیلئے راحت ہدایت کا باعث بنتی ہے اور نہ کوئی تکلیف انہیں بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے اس بگاڑ پر تأسف کا اظہار کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ آج کل مشرکینِ مکہ قحط کا شکار ہیں اور یہ قحط وہ ہے جو نبوت سے چند سالوں کے بعد آنحضرت ﷺ کی دعا سے اس وقت ان پر مسلط کیا گیا تھا جب ان کی طرف سے سخت مزاحمت شروع ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی اللھم اعنی علیھم بسبع کسبع یوسف (اے اللہ! ان کے مقابلے میں میری مدد یوسف کے ہفت سالہ قحط جیسے سات برسوں سے فرما۔) چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں عرب میں ایسا سخت قحط پڑا کہ مردار تک کھانے کی نوبت آگئی۔ پھر آنحضرت ﷺ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اس قحط کو دور فرمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس قحط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم اس قحط کو دور بھی کردیں اور اہلِ مکہ جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس

Marfat.com

سے انہیں نکال لیں تو تب بھی یہ اللہ کریم کا احسان جانتے ہوئے راہِ ہدایت کبھی اختیار نہیں کریں گے بلکہ یہ اپنی سرکشی میں اور بڑھتے چلے جائیں گے۔ان کے نام نہاد دانشور انہیں یہ بات سمجھانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں گے کہ قوموں کو زندگی میں نرم اور گرم ہر طرح کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔کبھی خشک سالی ہوتی ہے اور کبھی سیلاب آ جاتا ہے،کبھی اشیاء کی فراوانی ہوتی ہے اور کبھی قلت کا احساس ہونے لگتا ہے۔زندہ قومیں اس طرح کے حالات کو زندگی کے لوازم میں شمار کرتی ہیں اور اپنی ہمت اور کارگزاری سے اسے بدلنے کی کوشش کرتی ہیں۔وہ ایسا کبھی نہیں سوچتیں کہ قحط آیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور فراوانی آئی ہے تو اس کی آزمائش بن کے آئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں اللہ تعالیٰ سے غافل قوموں کو افیون کی طرح ایسا نشہ مہیا کرتی ہیں کہ بجائے اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت پر کان دھرنے کے وہ اور زیادہ بگڑتے چلے جاتے ہیں اور جس طرح اندھے کو راستہ سجھائی نہیں دیتا اور وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھتا جاتا ہے،اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ آگے کتنی بڑی کھائی ہے،یہ بھی اسی طرح زندگی کے سفر میں خیر و شر کی تمیز کئے بغیر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٧٦﴾

(ان کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں تکلیف میں مبتلا کیا تو پھر بھی اپنے رب کی بارگاہ میں نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ ۷۶)

مشرکین کی حالت سے تائید

سابقہ آیتِ کریمہ میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے حالات سے اس کی تائید کی گئی ہے کہ موجودہ حالات میں کس بری طرح سے یہ لوگ قحط کی سختیوں میں مبتلا کیے گئے۔پانی کے جوہڑ تک ختم ہوگئے،کہیں ہریاول کا نام تک نہ رہا،اشیائے خوردنی اس حد تک کمیاب ہوگئیں کہ لوگ مردار کھانے پر مجبور ہوگئے۔بایں ہمہ ان لوگوں کی سرکشی اور آخرت سے بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔نہ ان کے دلوں میں شکستگی اور خستگی کے آثار پیدا ہوئے اور نہ ان کی آنکھوں سے خشیت یا ندامت کے آنسو بہہ سکے۔ایسا لگتا ہے کہ مسلسل کفر اور شرک نے انہیں ہر طرح کے لطیف احساسات سے عاری کر دیا ہے انسان کے دل کو بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب صفات کا مرقع بنایا ہے کہ اگر اس میں سوز و گداز پیدا ہو جائے اور خشیتِ الٰہی کی تخم ریزی ہو جائے تو اس سے وہ برگ و بار پیدا ہوتے ہیں جس کے سائے میں نہ صرف انسانیت پلتی ہے بلکہ فرشتے بھی اس پر رشک کرتے ہیں لیکن اگر یہی دل اللہ تعالیٰ کے تصور سے خالی اور شیطانی خیالات کا مخزن بن جائے تو اس کی سختی پتھروں سے بھی بڑھ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تبلیغ و دعوت بھی ایسے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

استکانۃ: دل کی شکستگی اور خستگی کو کہتے ہیں اور تضرع: گریہ وزاری کو کہتے ہیں جو استکانۃ کا نتیجہ ہوتی ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٧﴾

(یہاں تک کہ جب ہم ان پر ایک سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو یکا یک تم دیکھو گے کہ وہ اس میں بالکل مایوس ہو کر رہ جائیں گے۔ ۷۷)

Marfat.com

مشرکین کی بے بسی

گزشتہ دو آیتوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ نہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان میں شکر کے جذبات پیدا کرتی ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی مصیبتیں ان کے دلوں میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ وہ بظاہر انسان ہیں لیکن حقیقت میں لکڑی کے کندے ہیں جو ہر طرح کے جذباتِ خیر سے تہی دامن ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کا انذار جس میں بار بار انہیں عذاب کی دھمکی دی گئی ہے بالکل اثر انداز نہیں ہو رہا بلکہ وہ ایسی ہر بات کو قہقہوں میں اڑا دیتے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ دیکھنے والا ان لوگوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی گرفت بھی انہیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی کیونکہ ان کے مضبوط اعصاب میں کسی طرح کی لچک دکھائی نہیں دیتی، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو ایک خاص حد تک مہلتِ عمل دیتا ہے۔ وہ بگاڑ میں آگے بڑھتی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی تدبیر ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ جب وہ لمحہ آ جاتا ہے، جب مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں عذابِ شدید سے وہی عذاب مراد ہے جو مہلتِ عمل ختم ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں پر نازل ہوتا ہے۔ اگر ان پر وہ عذاب نازل ہو گیا جیسا کہ ان کے کرتوتوں سے اس کے خدشات پیدا ہوتے جا رہے ہیں تو پھر تم دیکھو گے کہ آج جو لوگ بڑی ہیکڑی دکھا رہے ہیں اس عذاب کا سامنا کرتے ہی مایوسی کی تصویر بن جائیں گے۔ ان کے تمام سہارے اور تمام امیدیں یک قلم ختم ہو جائیں گی۔

ابلاس :- حیرت اور مایوسی کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ بعض دفعہ یہی مایوسی برافروختگی تک پہنچ جاتی ہے، اس وقت انسان ایسا حواس باختہ ہوتا ہے کہ اسے اپنی نجات کے سارے راستے مسدود نظر آنے لگتے ہیں۔ امام قرطبی مبلسون کا مفہوم واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ای یائسون متحیرون لایدرون مایصنعون

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا
مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾
وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا
مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ
وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ

Marfat.com

لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُوْلُوْنَ
لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾
قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿٨٩﴾
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٩٠﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ
وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَ
لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٩١﴾ لا
عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾ ع

رکوع: ۵۔ (اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۷۸) (اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور انجام کار اسی کی جناب میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۷۹) (اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے، اور اسی کے اختیار میں ہے گردشِ لیل ونہار، تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۸۰) (بلکہ انہوں نے وہی بات کہی جو پہلے کفار کہا کرتے تھے۔ ۸۱) کہتے ہیں کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا۔ ۸۲) بلاشبہ ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ بھی آج سے پہلے یہی وعدہ کیا گیا، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔ ۸۳) (اے پیغمبر (ﷺ) ان سے پوچھئے! کہ یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے، کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔ ۸۴) وہ کہیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، آپ (ﷺ) کہئے! تو کیا تم اس پر غور نہیں کرتے۔ ۸۵) (ان سے پوچھئے ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ ۸۶) وہ کہیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، تو آپ کہئے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔ ۸۷) (ان سے پوچھئے! وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ (جسے چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابل میں پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانتے ہو۔ ۸۸) وہ کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے، کہہ دیجئے، پھر تمہاری مت کیوں ماری جاتی ہے۔ ۸۹) (بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ۹۰) خدا نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہوجاتا اور ایک دوسرے پر

Marfat.com

چڑھائی کر دیتا، پاک ہے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۹۱) وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۹۲)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸

(اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ ۷۸)

انسان اور حیوان میں فرق، اور حقیقت شکر

اس سے پہلے خطاب آنحضرت ﷺ سے تھا اس میں قریش کو جو تہدید و وعید کی گئی ہے وہ غائب کے صیغے سے اور نبی کریم ﷺ کے واسطے سے ہے، لیکن اب قریش سے براہِ راست خطاب فرمایا جا رہا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے سننے کیلئے کان اور دیکھنے کیلئے آنکھیں اور سوچنے سمجھنے کیلئے دل عطا نہ فرمایا ہو۔ اَفْئِدَة فؤاد کی جمع ہے اس کا معنی دل کیا جاتا ہے لیکن انسان کے دل اور حیوان کے دل میں بنیادی فرق ہے۔ حیوان کو بھی دل عطا ہوتا ہے لیکن صرف خون کو پمپ کرنے کیلئے، لیکن انسان کا دل صرف اسی مقصد کیلئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے فہم، تفہیم، تأثر اور تاثیر جیسی مختلف قوتیں بھی رکھی ہیں۔ اگرچہ سائنسدان غور و فکر کی صلاحیتوں کا مرکز دماغ کو قرار دیتے ہیں لیکن تمام آسمانی کتابوں نے دل ہی کو انفعالی قوتوں کے مرکز کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب میڈیکل سائنس بھی کسی حد تک اسے تسلیم کرنے لگی ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ یوں تو ان میں بہت سی قوتیں اللہ تعالیٰ نے حیوانوں کو بھی عطا کی ہیں لیکن انسانوں اور حیوانوں میں فرق یہ ہے کہ حیوان صرف ان صلاحیتوں سے جسم اور نفس کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے سامنے جسمانی ضرورتوں اور حاجتوں کے سوا اور کسی چیز کا تصور نہیں ہوتا، لیکن انسان ان ہی قوتوں کے ذریعے اگر چاہے تو اور بھی بہت ساری چیزوں کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں اسی حوالے سے سب سے بنیادی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ حیوان میں اس بات کا شعور نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بھی ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو ہر نعمت پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ انسان کے اچھا اور برا ہونے کی ایک ہی شناخت ہے کہ وہ شاکر ہے یا کفور۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والا انسان ہے لیکن اگر وہ شکر کی بجائے کفرانِ نعمت کرتا ہے تو یہ کفر کا راستہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ انسان کو جو شکر کا پابند ٹھہرایا گیا ہے تو شکر کیا چیز ہے۔ شکر کیلئے دو باتیں بہت ضروری ہیں۔ پہلی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ جن نعمتوں سے وہ متمتع ہو رہا ہے چاہے ان کا تعلق جسم و جان سے ہو، مال و دولت سے ہو، دوسرے انسانوں سے ہو، زمین و آسمان سے ہو یا فضاء اور موسم سے ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ انہیں پیدا کرنے میں نہ اسے کوئی دخل حاصل ہے نہ کسی اور کو۔ اور ان نعمتوں پر اس کا کوئی ذاتی استحقاق بھی نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت کا ایک مقصد رکھا ہے۔ نعمت کا شکر یہ ہے کہ انسان اس نعمت کو اس مقصد کے حصول کیلئے استعمال کرے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہوئے زبان سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور اعضاء و جوارح سے وہ کام لے جس سے وہ مقصد حاصل ہو سکے جس کیلئے نعمت عطا کی گئی ہے اور دل میں ہمیشہ احسان مندی کے جذبات موجزن رہیں۔ ان تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے اس آیتِ کریمہ کے الفاظ پر غور کیجئے کہ تمہیں کان اس مقصد کیلئے عطا کئے گئے ہیں کہ تم ان سے وہ نصیحت سنو جو

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ السلام تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور تم اپنی آنکھوں سے آفاق وانفس میں پھیلی ہوئی وہ نشانیاں دیکھو جو تمہیں حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والی ہیں اور دل تمہیں اس لئے عطا کئے گئے ہیں تاکہ ان سے ان انشانیوں کو دیکھ کر وہ نتائج اخذ کرو جن سے تمہیں اس کائنات کی حقیقت کو جاننے اور اپنی زندگی کی غائت کو سمجھنے میں مدد مل سکے، لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان نعمتوں سے جسم اور نفس کے مطالبات پورا کرنے کے ذرائع ہی تلاش کرتے رہو یعنی ان کانوں سے وہی بات سنو اور آنکھوں سے وہی چیز دیکھو جس سے اس فانی زندگی میں عزت وآرام حاصل ہو سکے اور اپنی فکری قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کو جاننے میں استعمال کرنے کی بجائے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے نئے سے نئے مصارف اختیار کرنے میں صرف کرو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اپنے آپ کو انسان کی بجائے ایک حیوان سمجھا اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے تم نے انہیں جسم ونفس کے مطالبات پورا کرنے کے ذرائع سے زیادہ اہمیت نہیں دی، تو سوچ لو کہ تم میں اور ایک حیوان میں کیا فرق ہے؟

وَهُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾

(اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور انجام کار اسی کی جناب میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۷۹)

اللہ تعالیٰ کے احسانات سے قیامت پر استدلال

شکر اور ادائے شکر کے ذرائع کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اب اپنے کچھ احسانات کو اس طرح ذکر فرمایا جارہا ہے کہ وہ بجائے خود اپنے اندر دلیل کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ قریش کو براہِ راست اور باقی نوعِ انسانی کو بالواسطہ فرمایا جارہا ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے۔ میاں بیوی سے اولاد پھیلتی ہے جس سے ایک گھر وجود میں آتا ہے جو پھیلتے پھیلتے ایک قبیلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پھر یہ قبائل قوم میں ڈھل جاتے ہیں اور قومیں زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ انسان اپنی پھیلی ہوئی آبادی کو دیکھ کر کبھی اس طرف دھیان نہیں دیتا کہ ہمارا یہ پھیلاؤ کس کی عطاو بخشش ہے اور نہ کبھی اس بات پر غور کرتا ہے کہ جس نے ہمیں زمین پر پیدا کیا اور پھیلایا کیا وہ ہمیں کبھی جمع نہیں کرے گا۔ کسان اپنے کھیت میں غلہ بوتا ہے تو محض اس لئے تو نہیں بوتا کہ وہ اُگے، برگ وبار پیدا کرے اور پھر زمین کا رزق ہو جائے بلکہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب وہ اپنے بوئے ہوئے غلے کو اکٹھا بھی کرتا ہے اور پھر اسے ایک کھلیان کی صورت میں ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیتا ہے، اسی طرح پروردگار اس پھیلی ہوئی آبادی کو ایک دن جمع کرے گا اور چونکہ پروردگار کی یہ پھیلی ہوئی فصل اپنے اندر ذمہ داری کی وہ تمام خصوصیات رکھتی ہے جو جوابدہی کیلئے ضروری ہیں، تو انہیں اللہ تعالیٰ اس طرح جمع کرے گا کہ ان کے اعمال بھی جمع ہوں گے اور ہر ایک سے زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔ اس سے واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زمین پر پھیلی ہوئی آبادی کا ایک دن جمع ہونا اور پھر جس نے پیدا کیا ہے بلاشرکتِ غیرے اس کے سامنے جوابدہی کرنا، یہ ایک ایسا لابدی نتیجہ ہے جس سے عقل انکار نہیں کر سکتی تو پھر امکانِ قیامت اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

(اور وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے، اور اسی کے اختیار میں گردشِ لیل ونہار، تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ ۸۰)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت سے استدلال

اپنے چند مزید احسانات وانعامات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنی قدرت وحکمت کی طرف بھی متوجہ کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کس قدر عظیم اور کس قدر قوت والی ہے کہ زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے۔ حیات وممات ایک ایسا راز ہے جس کا عقدہ آج تک انسان پر نہیں کھل سکا۔ انسان نے ہر چند کوشش کی کہ وہ ان دونوں کی حقیقت کو جان سکے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کوئی شخص جتنا اس پر غور کرتا ہے اتنا ہی اس یقین میں بڑھتا جاتا ہے کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہے۔ جو خانہ ساز قسم کے شرکاء مشرکین نے بنا رکھے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ اگر وہ واقعی شخصیتیں ہیں تو خود ان کی زندگی اور موت بھی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسعت کو مزید بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ لیل ونہار کی گردش بھی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ سورج اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے اور رات اپنے وقت پر اپنا پردہ تان دیتی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اس طرح لپٹے ہوئے آتے ہیں کہ دونوں میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ دونوں کے آنے اور جانے میں آج تک کبھی تخلف نہیں ہوا۔ کبھی دن رات سے آگے نہیں بڑھ سکا اور رات کبھی دن سے سبقت نہیں کرسکی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی جو گردشیں مقرر کر رکھی ہیں ان میں کبھی ایک منٹ کا فرق واقع نہیں ہوا، ورنہ ہماری جنتریوں کے تمام حساب غلط ہوجاتے۔ موسموں میں تبدیلی کا نظام غارت ہوکر رہ جاتا، زمین کی قوتِ روئیدگی اپنا کام چھوڑ دیتی۔ ان دونوں کا وقت کی پابندی کے ساتھ آنا اور جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس مصرفِ حقیقی کے قبضہ میں ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے یہ اپنی مرضی سے نہ آنے کے مجاز ہیں اور نہ جانے کے۔ اس نظام میں کسی کا دخل انداز نہ ہوسکنا اس بات کی دلیل ہے کہ مصرفِ حقیقی صرف اللہ وحدہ لاشریک ہے۔

ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ لیل ونہار اپنی صورت اور مزاج میں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ لیکن کائنات کے نظام کو چلانے میں ان دونوں میں جو سازگاری پائی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی حکیم وقدیر کا ارادہ کارفرما ہے۔ دن کو چمکتا ہوا سورج جس طرح اپنے طلوع وغروب میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے اسی طرح وہ اپنے اثرات ونتائج میں بھی اسی کے حکم کے تابع ہے۔ اس کی گرمی سمندر سے بھاپ اٹھنے کے عمل کو روک نہیں سکتی۔ فضاء میں ابر کی چادروں کے بچھنے کا عمل تشنۂ تکمیل نہیں رہ سکتا۔ بارش وہیں جاکر برستی ہے جہاں اسے حکم ملتا ہے۔ دن کی گرمی اپنے معمول میں تبدیلی نہیں کرسکتی، اور رات کی ٹھنڈک اور اس کی تاریکی کی تنی ہوئی چادر اپنی بساط کو لپیٹ نہیں سکتی۔ ان میں سے ہر بات ایک ہی دستِ تصرف کی شہادت دیتی ہے، وہی حقیقی معبود ہے جس کی غلامی میں سب جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ جب چاہے گا لیل ونہار کی گردش رک جائے گی، سورج بے نور ہوجائے گا اور زمین ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ انہی باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر معمولی عقل کا آدمی بھی جاننے میں دشواری محسوس نہیں کرتا۔ تمہاری عقلوں کو کیا ہوگیا ہے، تم ان باتوں کو کیوں نہیں سمجھتے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٨١﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٨٢﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٨٣﴾

(بلکہ انہوں نے وہی بات کہی جو پہلے کفار کہا کرتے تھے۔ ۸۱) کہتے ہیں کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا۔ ۸۲) بلاشبہ ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ بھی آج سے پہلے یہی وعدہ کیا گیا، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔ ۸۳)

Marfat.com

قریش کا فسادِ عقیدہ اپنے جاہل آباء کا تسلسل ہے

اللہ تعالیٰ کی ان بے پناہ قدرتوں اور کائنات کے اس دقیق اور حکیمانہ نظم ونسق کو دیکھ کر چاہئے تو یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ یہ کائنات جس ذاتِ عظیم کی شاہکار ہے وہ یقیناً تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے مردوں کو زندہ کرنا اور ایک نئی دنیا بسانا اور تمام اگلوں اور پچھلوں کو حساب کتاب کیلئے ایک جگہ جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ لیکن ان عقل کے دشمنوں کا حال یہ ہے کہ بجائے اس سامنے کی بات کو تسلیم کرنے کے انہوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے جو ان کے آباؤ اجداد نے لگا رکھی تھی کہ ہم جب مرنے کے بعد متفرق ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے، آخر ہماری ہڈیاں بھی بوسیدگی کی نذر ہو جائیں گی اور مٹی کے ڈھیر کے سوا کوئی چیز باقی نہیں بچے گی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں ازسرِ نو زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے۔ یہ ایک ایسی انہونی بات ہے جس سے ہمارے اگلوں کو بھی ڈرایا گیا اور ہمیں بھی اس کی دھمکی دی جارہی ہے لیکن نہ اس سے پہلے قیامت آئی اور نہ آج آرہی ہے۔ یہ سب پرانے افسانے ہیں، قصے کہانیاں ہیں جنہیں بار بار دہرایا جارہا ہے، ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں۔ صدیاں گزر گئیں اگر قیامت کو آنا ہوتا تو وہ کبھی کی آچکی ہوتی۔ ایسی بے سروپا باتوں پر ہم یقین لانے سے قاصر ہیں اور ایسی انہونی بات کو قبول کر کے ہم اپنی زندگیوں کے عیش و آرام کو داؤ پر لگانے کیلئے تیار نہیں۔

اَسَاطِیْرُ :۔ نحو و ادب کے امام مبرد نے اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اَسَاطِیْرُ اسطورہ کی جمع ہے، جس طرح احادیث احدوثہ کی جمع ہے۔ اور اعاجیب، اعجوبہ کی جمع ہے۔ یہ ایسی تحریر پر بولا جاتا ہے جو محض دل بہلانے کیلئے لکھی گئی ہو، جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ تفسیر مظہری کے مصنف کا ارشاد ہے کہ جھوٹی اور بے سروپا باتوں کو اساطیر کہتے ہیں۔ مشرکین مکہ بھی قرآنِ کریم کو اسی معنی میں پہلے لوگوں کے اساطیر قرار دیتے تھے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ
قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾

(اے پیغمبر (ﷺ) ان سے پوچھئے! کہ یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے، کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔ ۸۴)
وہ کہیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، آپ (ﷺ) کہئے! تو کیا تم اس پر غور نہیں کرتے۔ ۸۵)

مشرکین کا فطری تضاد

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپؐ ان سے پوچھئے کہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے یہ کس کی ملکیت اور کس کے تصرف میں ہے اور اس زمین کو اور اس کے اندر جو کچھ ہے اسے کس نے پیدا کیا ہے؟ اور اس کے اندر جو کچھ تصرفات ہو رہے ہیں وہ کس کے اختیار میں ہیں؟ زمین کی قوتِ روئیدگی جو کچھ پیدا کر رہی ہے وہ کس کی اجازت سے کر رہی ہے؟ لیل ونہار کی گردش جس پر مخلوقات کی زندگی کا مدار ہے وہ کس کے قبضے میں ہے؟ وہ اس سب کے جواب میں یہ کہیں گے، کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے فکری تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے ارشاد فرمارہا ہے کہ اگر یہ زمین اور اس میں ہونے والی ہر تبدیلی اور اس میں نظر آنے والے تصرفات اور اس کی

Marfat.com

بقاءاوراس کے اندر پلنے والی مخلوقات کو ملنے والی ضروریات، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو پھر تم وقوعِ قیامت سے کس طرح انکار کرتے ہو۔ کیونکہ جو ذات زمین کو پیدا کرسکتی اور اس میں ہونے والے تصرفات پر حکمرانی کرسکتی ہے اور جہاں کا ہر لمحہ اس کے اختیار اور تصرف کا محتاج ہے اور جس کی تمام مخلوقات اسی کے احسانات سے گراں بار ہیں اور جہاں زندگی اور موت کا عمل اسی کی قدرت سے ہو رہا ہے تو عجیب بات ہے کہ اس کیلئے زمین کو تباہ کر دینا اور پھر از سرِ نو وجود دے دینا اور اس زمین پر بسنے والے انسانوں کو ہلاک کر دینا اور پھر انہیں از سرِ نو زندہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی کیلئے مجبور کرنا آخر اس کے اختیارات سے کیوں مستبعد ہے۔ جو عظیم ذات پہلی دفعہ زمین اور اہلِ زمین کو پیدا کرسکتی ہے وہ دوبارہ کیوں نہیں کرسکتی۔ تمہارے اس فکری تضاد کا تمہارے پاس کیا جواب ہے کہ تم زمین اور اس پر بسنے والی ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت جانتے ہو اور اس پر قیامت کے نام سے اللہ تعالیٰ کے تصرف سے انکار بھی کرتے ہو۔ تم انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق بھی سمجھتے ہو اور اس کی مخلوق کو اس کے سامنے جوابدہی سے بے نیاز بھی گردانتے ہو۔ آخر یہ کیسی منطق ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی مشیت میں یقیناً کوئی تضاد نہیں، البتہ تمہاری فکر میں تضاد ہے کہ ایک بات کو تسلیم کرتے ہو، لیکن اس کے تقاضوں اور اس کے نتائج سے انحراف کرتے ہو۔ اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم اپنی اس روش پر غور نہیں کرو گے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ
قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾

(ان سے پوچھئے ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ ٨٦) وہ کہیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، تو آپ کہئے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔ ٨٧)

قریش کے تضادِ فکر کی مزید وضاحت

سابقہ آیتِ کریمہ میں سوال زمین اور اہلِ زمین کے بارے میں تھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں سوال کا تعلق ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم سے ہے۔ زمین اگرچہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ متعدد کُرّوں میں سے سب سے چھوٹا کرہ بیان کی جاتی ہے، لیکن اس پر بسنے والی مخلوق چونکہ اشرف المخلوقات ہے اور اسی زمین میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تشریف لائے ہیں اس لئے اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ زمینیں بھی سات ہیں، اس لئے سابقہ آیتِ کریمہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ الارض سے اسمِ جنس مراد ہے۔ اس لئے اس سے مراد صرف ایک زمین نہیں بلکہ ساتوں زمینیں ہیں۔ پھر زمین پر بسنے والی ان مخلوقات کا ذکر نہیں کیا جنہیں انسان جانتا پہچانتا ہے بلکہ مَنْ فِيْهَا کے بارے میں سوال کیا، کیونکہ ساتوں زمینوں میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوقات کا وجود بھی ممکن ہے جس سے انسان واقف نہ ہو۔ لیکن وہ فی الجملہ یہ بات سمجھتا ہے کہ کسی زمین پر مخلوق کوئی بھی ہو اس کی باگیں اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کی مخلوق ہے اسی کی ملکیت بھی ہے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم سے متعلق سوال کر کے پوری کائنات کا حصار کھینچ لیا گیا ہے کیونکہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں سے باہر نہیں اور پھر ان سب کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے جس کے ہمہ گیر اقتدارِ مطلق کی محسوس علامت عرشِ عظیم ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، لیکن یہ اپنے قد و قامت اور حجم میں تمام کائنات سے عظیم ہے۔ ایک حدیث سے

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس کے سامنے ایسے ہے جیسے ایک صحرا میں پڑی ہوئی انگشتری۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات اپنی وسعتوں کے اعتبار سے ہمارے اندازوں اور علم سے ماورا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو ذات اس بے کراں کائنات اور عرشِ عظیم کی خدا ہے اس نے انہیں بھی بغیر کسی تردد کے اسی طرح پیدا کیا ہے جیسے زمین میں گھاس کی پتی اگتی یا حشرات الارض وجود میں آتے ہیں۔ ایسی ہمہ مقتدر ذات کے مقابلے میں کسی اور کو خدا بنانا یا اس کی خدائی یا اس کی صفات میں شریک کرنا اور یا اس کے حقوق میں شریک کرنا قطع نظر اس سے کہ شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے، عام انسانی عقل اپنے وضعی پیمانوں سے کام لے کر بھی فیصلہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ جن قوتوں کو آج تک انسانوں نے کسی نہ کسی درجے میں اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور کمالات کے مقابلے میں کیا حیثیت حاصل ہے۔ وہ تو اپنے مخلوق ہونے کے اعتبار سے بھی بے شمار مخلوقات سے ادنیٰ ہیں۔ ان کا اپنا وجود جس طرح تخلیق کا رہینِ منت ہے اسی طرح اپنی بقاء میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا محتاج ہے۔ وہ ذات جس کی عظمتیں انسانی عقل کی حدود سے ماورا ہیں جو واجب الوجود ہے جو ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی مخلوقات میں سے ہر مخلوق اپنے وجود اور بقاء میں اسی کی محتاج ہے اس کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ کوئی اس کا شریک ہو سکتا ہے یا یہ خیال کرنا کہ وہ ایک دفعہ زمین کو بنا چکا اور انسانوں کو پیدا کر چکا لیکن اب دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا، یہ ایسی بات ہے جس سے زیادہ بے ہودہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ زمینوں کی طرح ساتوں آسمان اور عرشِ عظیم بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ لیکن اس تضادِ فکر کا کیا کیا جائے کہ وہ اتنا واضح عقیدہ رکھنے کے ساتھ ساتھ شرک کا بھی ارتکاب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تمام تر قوتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دوبارہ انسانوں کو پیدا نہیں کر سکتا اور کائنات کی تباہی کے بعد از سر نو آخرت برپا نہیں کر سکتا۔ آخر میں فرمایا کہ جس ہستی کے بارے میں تمہارے بنیادی احساسات یہ ہیں تو کیا تم اس کے شریک بناتے ہوئے اور اس کی نافرمانی کرتے ہوئے اس سے ڈرتے نہیں ہو۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

(ان سے پوچھیے! وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ (جسے چاہتا ہے) پناہ دیتا ہے لیکن اس کے مقابل میں پناہ نہیں دی جا سکتی، اگر تم جانتے ہو۔ ۸۸) وہ کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے، کہہ دیجیے، پھر تمہاری مت کیوں ماری جاتی ہے۔ ۸۹)

زمامِ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے

گزشتہ آیات میں مختلف سوالوں کے جواب میں مشرکین نے بار بار اعتراف کیا کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز اور کوئی ایسا وجود نہیں جو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں نہ ہو۔ بڑی سے بڑی قوت، اس کی مخلوق اور اس کی غلام ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اب یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ ہر چیز کی زمامِ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہے؟ اور وہ کون ہے جس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اپنی پناہ میں لے لے اور جسے چاہے اپنی پناہ سے نکال دے اور اس کے مقابلے میں کسی اور کی یہ مجال نہیں کہ جس کو وہ پناہ نہ دینا چاہے اسے وہ پناہ دے دے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محرومی کا فیصلہ کرے اور کوئی ذات اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدل ڈالے۔ ایسا اختیار کسی کے پاس نہیں۔ مشرکینِ عرب اپنے تمام تر مشرکانہ دعوؤں کے باوجود

Marfat.com

اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ زمامِ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، جس طرح وہ ہر چیز کا مالک ہے اسی طرح وہ ہر چیز کا خدا اور حکمران ہے۔ مزید فرمایا کہ اگر تم یہ جانتے ہو کہ اقتدار میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے تو پھر اس کا نام لو یا اس کا حوالہ دو۔ لیکن مشرکین کے عقائد اور قومی روایات کے حوالے سے یہ فرمایا گیا کہ جب آپ ان سے یہ سوال کریں گے تو وہ سابقہ جوابوں کی طرح اس کا بھی یہی جواب دیں گے کہ زمامِ اقتدار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ تم نے اس کے اقتدار میں نہ جانے کس کس کو شریک بنا رکھا ہے۔ آخر تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ تم نے اپنے بعض نام نہاد شرکاء کو تحلیل و تحریم کا حق دے رکھا ہے اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو تم اسے ڈراتے ہو کہ اگر تم نے اس سے توبہ نہ کی تو تم پر ہمارے ان شرکاء کی مار پڑے گی اور تم کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے یعنی ایک طرف تم کھلے دل سے اللہ تعالیٰ کی خدائی اور اس کے مالک ہونے کا اعتراف کرتے ہو اور دوسری طرف قدم قدم پر اس سے انحراف کرتے ہو یعنی جس حقیقت کو تم بظاہر دل و جان سے تسلیم کرتے ہو وہی جب عمل کی صورت اختیار کرتی ہے یا دوسرے شرکاء تک نوبت پہنچتی ہے تو پھر تمہاری آنکھوں پر کس کا جادو چل جاتا ہے کہ تم کبھی کسی کو پکارنے لگتے ہو، کبھی کسی کو۔ اور کبھی کسی کو مؤثر سمجھ کر اس کے نام کی قربانیاں دیتے ہو، اس کے چڑھاوے چڑھاتے ہو اور اس کی ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہو، آخر یہ کس کا جادو ہے جس نے تمہیں مسحور کر رکھا ہے۔

ایک لطیف تعریض

فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ ...... یعنی تمہاری کیوں مت ماری گئی ہے، تم کس کے جادو کے زیر اثر آ گئے ہو۔ اس میں لطیف تعریض بھی ہے۔ اشرارِ قریش نبی کریم ﷺ کو جادوگر بھی قرار دیتے تھے اور جادو کے زیر اثر بھی سمجھتے تھے۔ جب وہ قرآنِ کریم کی غیر معمولی تاثیر کو دیکھتے تو اسے جادو سمجھتے اور کبھی آپ ﷺ کے بارے میں یہ کہتے کہ آپؐ جس طرح کی باتیں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر کسی آسیب کا اثر ہے یا کسی نے آپؐ پر جادو کر دیا ہے اور اسی جادو کے اثر سے کچھ ایسی چیزیں آپؐ کو دکھائی دیتی ہیں جنہیں آپؐ کبھی فرشتہ سمجھتے ہیں اور کبھی کچھ اور نام دیتے ہیں۔ ان سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنی فکر اور عمل کے تضاد کو دیکھو اور پھر فیصلہ کرو کہ تم کسی سحر کے اثر میں ہو یا ہمارے رسول پاک ﷺ۔ وہ تو پہلے دن سے چند بنیادی حقائق کو پیش کر رہے ہیں اور آج تک ان کے فکر و عمل میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوا۔ لیکن تم مانتے کچھ اور ہو اور کرتے کچھ اور ہو۔ جب تم اپنے تعصّبات سے الگ ہو کر جواب دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی غیر معمولی قدرتوں کا اعتراف کرتے ہو۔ لیکن جب تم پر اپنی جاہلی عصبیت کا حملہ ہوتا ہے تو پھر تم ایسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہو جیسے ایک مسحور آدمی ہوتا ہے۔

بَلْ اَتَیْنٰـهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

(بلکہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ۹۰) خدا نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود شریک ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود جو کچھ اس نے پیدا کیا ہوتا اس کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا، پاک ہے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۹۱) وہ غائب و حاضر کا جاننے والا ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۹۲)

Marfat.com

الكلمة الجامعة

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے حوالے سے مشرکین سے چند سوالات کئے۔ انہوں نے جواب میں تسلیم کیا کہ ہاں! اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف ہے۔ زمین بھی اسی کی ہے، زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اسی کی ملکیت ہے، آسمانوں پر بھی اسی کی حکمرانی ہے، عرشِ عظیم کا بھی وہی مالک ہے، تمام کائنات اسی کے اقتدار کی گرفت میں ہے، اس کے سوا کوئی اور ذات نہیں جس کے قبضے میں کائنات کا اختیار ہو، وہ جس کو چاہے پناہ دے سکتا ہے اور جس کو چاہے پناہ دینے سے انکار کرسکتا ہے۔ لیکن کوئی دوسری قوت ایسی نہیں جو اس کے ارادے اور مرضی کے بغیر کسی کو پناہ دے سکے۔ ان تمام باتوں کو تسلیم کرنے کے باوجود حیرانی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بہت سارے اختیارات غیر اللہ کے سپرد کر رکھے ہیں۔ بہت سی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے۔ بہت ساری شخصیتوں کو اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں دخیل سمجھتے ہیں۔ ان کی اس دوعملی اور ان کے فکر وعمل کے اس تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی بے عقلی پر انہیں شرم دلائی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم جن بنیادوں کو درست تسلیم کرتے ہو اس سے ماخوذ نتائج کو ماننے سے انکار کر دیتے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہاری عقلوں پر شیطانی قوتوں نے سحر کر رکھا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے بنیادی عقائد میں جن باتوں کو تسلیم کرتے ہو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ اس کی ذات بھی یکتا ہے اور اس کی صفات اور حقوق میں بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ رہے تمہارے مشرکانہ توہمات اور تصرفات، وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ عقیدے اور عمل یا دل اور زبان میں تضاد کو جھوٹ کہا جاتا ہے اور تم اپنی اعتقادی اور عملی زندگی میں اس جھوٹ کا پیکر بن کر رہ گئے ہو۔ چنانچہ ہمارا پیغمبر تمہارے پاس حق لے کے آ گیا ہے۔ تم اگر اپنے جھوٹ سے نکل سکتے ہو تو تمہیں اس حق کو قبول کر لینا چاہئے اور اس بات پر عقیدہ پختہ کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا۔ (ولد ایک ایسا لفظ ہے جو واحد اور جمع، مذکر اور مونث سب پر بولا جاتا ہے)۔ اس میں صرف نصاریٰ پر تنقید نہیں بلکہ جس گروہ نے بھی اللہ تعالیٰ کی اولاد ثابت کی ہے وہ اس تنقید کا ہدف ہے اور ان میں مشرکین بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی مختلف مشرک گروہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کی ہے۔ البتہ مختلف قوموں میں اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔ اسی طرح کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں۔ یہ کائنات اس خدائے وحدہ لاشریک کی تخلیق ہے۔ ان کی بقاء کا دارومدار بھی صرف اسی کی ربوبیت پر ہے۔ اگر اس کائنات کی تخلیق اور بقا میں کوئی اور اِلٰہ بھی شریک ہوتا یعنی کسی اِلٰہ نے کسی مخلوق کو پیدا کیا ہوتا اور کسی نے کسی کو۔ کوئی زمینوں کا خالق ہوتا، کوئی آسمانوں کا، کوئی انسانوں کا پیدا کرنے والا ہوتا اور کوئی جنوں کا۔ یا ہر مخلوق میں کچھ تعداد ایک خالق کی ہوتی اور کچھ دوسرے خالق کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر خالق اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا۔ جس طرح ہر باپ اپنے بچوں کو لے کر الگ ہو جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اختلاف ہو جائے اور اختلاف تصادم کی صورت اختیار کر لے تو پھر رشتے بھول جاتے ہیں۔ ہر باپ اپنی اولاد کے ساتھ مل کر دوسروں پر چڑھائی کر دیتا ہے۔ ایسے ہی ہر خالق اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہونے پر اکتفا نہ کرتا بلکہ کبھی نہ کبھی ان میں اختلاف اور تصادم کی نوبت آتی۔ کیونکہ جس طرح دو بادشاہوں کا اختیار ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا، تو ایک اِلٰہ کا اختیار دوسرے اِلٰہوں کو برداشت کرنے کا کیسے موقع دے سکتا ہے۔ چنانچہ تصادم کی صورت میں کائنات کا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا۔ اگر زمین کا اِلٰہ زمین کی قوتِ روئیدگی کو بروئے کار لاتا اور آسمان کا اِلٰہ آسمان کو بارش برسانے، غلہ پکانے اور پھلوں میں گداز پیدا کرنے سے منع کر دیتا تو زمین میں کوئی چیز نہ اُگ سکتی، اور اگر اُگتی تو فصل کی صورت اختیار نہ کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ زمین پر بسنے والے تمام تباہ و برباد ہو جاتے۔

Marfat.com

رہی یہ بات کہ اتنی وسیع کائنات کا نظام ایک اِلٰہ کیسے چلاسکتا ہے، وہ کس طرح ایک ایک مخلوق کی ضرورت کو جان سکتا اور اس کے اندرونی حالات سے آگاہ ہوسکتا ہے، وہ اپنے عرشِ عظیم پر فائز کائنات کے دور دراز گوشے کو کیسے کنٹرول کرسکتا ہے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو غیب کی بھی جاننے والی ہے اور حاضر کی بھی۔ اس کی عظمت، اس کی حاکمیت، اس کی ہیبت، اس کی وسعت اور اس کی وجاہت کسی دوسرے کی شرکت کو قبول نہیں کرسکتی۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ بہت گری ہوئی حرکت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شان سے بہت فروتر ہے۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال گزرے کہ کسی اِلٰہ کا دوسرے اِلٰہ پر چڑھائی کرنا اور اس کی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا یہ انسانوں کا کام تو ہوسکتا ہے، اِلٰہ تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسے مفروضے پر بات کی ہے جس کا فرض کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہ یونانیوں اور ہندوؤں کی میتھالوجی پر ہے وہ اس کو تسلیم کریں گے کہ وہ اپنے دیوتاؤں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے درمیان خونریز جنگیں ہوچکی ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مرد کو سورج نے پیدا کیا ہے اور عورت کو زمین نے۔ تصور کیجئے اگر سورج اپنے پیدا کئے ہوئے مردوں کو لے کر الگ ہوجائے تو زمین کی عورتوں کا کیا انجام ہوگا۔ چنانچہ یہی وہ مشرک قوموں کی خرافات ہیں جن کی طرف قرآنِ کریم نے اشارے کئے ہیں۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا

تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾
وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ
اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ
مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٩٧﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿٩٨﴾
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿٩٩﴾ لَعَلِّيْٓ
اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ
وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٠٠﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ
اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ

Marfat.com

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ
بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا
وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ
سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ
جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ
فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ
الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾
اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾
وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ
عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ
وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

Marfat.com

رکوع: ۶۔ (دعا کیجئے، اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ۹۳) تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کرنا۔ ۹۴) بیشک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس عذاب سے ہم ان کو ڈرا رہے ہیں وہ تم کو دکھا دیں۔ ۹۵) برائی کو اس طریقے سے دور کیجئے جو بہترین ہو، ہم خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ ۹۶) اور دعا کرتے رہئے کہ اے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ۹۷) اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں، اے میرے رب! اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ۹۸) یہاں تک کہ جب آ جائے گی ان میں سے کسی کی موت تو وہ کہے گا، اے رب! مجھے پھر واپس بھیج۔ ۹۹) شاید میں اس دنیا میں اچھے کام کروں جسے میں چھوڑ کر آیا ہوں، ہرگز نہیں یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک پردہ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ ۱۰۰) تو جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان کے درمیان نسب کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ ۱۰۱) پس جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱۰۲) اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۳) جھلس ڈالے گی ان کے چہروں کو آگ، اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ ۱۰۴) کیا تمہیں میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے۔ ۱۰۵) تو وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی اور ہم گمراہ ہو گئے۔ ۱۰۶) اے ہمارے رب! ہمیں جہنم سے (ایک مرتبہ) نکال، اگر ہم پھر ایسا کریں تو بیشک ہم ہی ظالم ہوں گے۔ ۱۰۷) اللہ تعالیٰ جواب دے گا، دفع ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ ۱۰۸) بیشک میرے بندوں کی ایک جماعت تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو، تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۹) تو تم نے ان کو مذاق بنا لیا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تمہارے اس شغل نے تم کو میری یاد سے غافل کر دیا اور تم ان پر ہنستے رہے۔ ۱۱۰) آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔ ۱۱۱) اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا سالوں کے حساب سے تم زمین میں کتنا عرصہ رہے ہو۔ ۱۱۲) وہ کہیں گے ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔ ۱۱۳) ارشاد ہوگا تم تو بس تھوڑی ہی مدت رہے ہو، کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا۔ ۱۱۴) تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔ ۱۱۵) پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہِ حقیقی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرشِ کریم کا مالک۔ ۱۱۶) اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو پکارے گا جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے اور کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ ۱۱۷) اور دعا کیجئے کہ اے رب! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۸)

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

(دعا کیجئے، اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے وہ عذاب دکھائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ۹۳) تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کرنا۔ ۹۴)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی سنت اور اسلام کے غلبۂ عمومی کی بشارت

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو متعدد بار بیان کیا جاچکا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول آتا ہے اور وہ اس قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پیش کرتا ہے تو اب اس قوم کی زندگی کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی دعوت کی قبولیت پر آ ٹھہرتا ہے۔ اگر وہ قوم اس دعوت کو قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے انعامات کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ اور اگر وہ تکذیب کر دیتی ہے تو پھر اسے ایک خاص مدت تک کیلئے مہلتِ عمل دی جاتی ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام برابر جاری رہتا ہے تاکہ اس قوم کو تکذیب کے نتیجے سے بچانے کی کوشش کی جائے لیکن جب وہ قوم کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات کو مان کے نہیں دیتی تو پھر اسے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اسے بھی مذاق بنا لیتی ہے تو پھر عذاب کا کوڑا اس طرح برستا ہے کہ وہ قوم بے نام و نشان ہو جاتی ہے۔ تاریخ میں عبرت کے طور پر اس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ مکے کے لوگ بھی آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ آنحضرت ﷺ کی تبلیغی مساعی اپنی تمام تر اثر آفرینی کے باوجود ان کے دل و دماغ میں نفوذ پیدا نہیں کر رہی تھیں۔ تب انہیں سنت اللہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا، لیکن جب عذاب آنے میں تاخیر ہوئی تو معذب قوموں کی روایت کے مطابق مشرکینِ مکہ نے بھی اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور وہ بار بار مطالبہ کرنے لگے کہ اگر یہ عذاب کی دھمکی واقعی اپنے اندر کوئی حقیقت رکھتی ہے تو پھر اس کے آنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر اس کا جواب دیا ہے۔ سورۂ یونس آیت ۴۶، سورۂ رعد آیت ۴۰ اور سورۂ غافر آیت ۷۷ اس پر شاہد ہیں جن سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا آنا تو بالکل قطعی اور حتمی ہے۔ البتہ اس بات کو کسی حد تک مبہم رکھا گیا ہے کہ اس کے ظہور کا وقت کون سا ہوگا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس ابہام کو اس طرح دور فرمایا گیا ہے کہ ایک طرف آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے غلبہ و نصرت کی طرف اشارہ فرمایا گیا اور دوسرا اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کے غلبہ کا زمانہ جیسے جیسے قریب آتا جاتا ہے ویسے ویسے کافروں کی ہلاکت بھی قریب آتی جاتی اور یقینی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبر اور اصحابِ ایمان کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور کافروں پر عذاب نازل کر دیتا ہے۔ اس عذاب کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ ایسی کوئی آفت نازل کی جاتی ہے جس سے وہ کفار اور ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان کے ساتھیوں کو زمینی غلبہ عطا فرماتا ہے اور کافروں کو شکست سے دوچار کر کے نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ صورت کوئی سی بھی ہو یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کیلئے بھی یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ دعا پھیلا دیتے ہیں اور اپنی حفاظت اور دشمنوں سے دور رکھے جانے کی دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی آنحضرت ﷺ کو اور بالواسطہ مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ الٰہی جب ان ظالموں پر تیری گرفت آئے تو ہمیں اپنی آغوشِ رحمت میں لے لینا اور اشارۃً یہ بتایا جا رہا ہے کہ اب اسلام کے غلبۂ عمومی کے دن دور نہیں۔ اللہ تعالیٰ جزیرۂ عرب کی سرزمین کو اس آبِ حیات سے سیراب کرنے والا ہے جسے اسلام کہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ سرسبزی اور شادابی وجود میں آنے والی ہے جس سے قیامت تک دنیا فائدہ اٹھائے گی۔

Marfat.com

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو میں ان میں نہیں ہوں گا۔ اس کے باوجود آپؐ کو دعا کی تلقین فرمائی جارہی ہے تاکہ عذاب کی شدت کا احساس پیدا ہو اور آنحضرت ﷺ کیلئے زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کا سامان ہو۔ علامہ فرماتے ہیں کان علیہ السلام یعلم ان اللہ تعالیٰ لایجعله فی القوم الظالمین اذا انزل بهم العذاب و مع هذا امره الرب بهذا الدعاء والسوال لیعظم اجره ولیکون فی کل الاوقات ذاکراً لربه تعالیٰ۔

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

(بیشک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس عذاب سے ہم ان کو ڈرارہے ہیں وہ تم کو دکھادیں۔ ۹۵)

اللہ تعالیٰ کا ارادہ حتمی ہے

گزشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کیلئے جس غلبہ و نصرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دشمنانِ دین کی تباہی اور پامالی کی جو خبر دی گئی ہے اس وقت کے حالات (جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں) کو دیکھ کر نہایت مستبعد از عقل معلوم ہوتی تھی کیونکہ مخالفین اور معاندین کی چیرہ دستیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ مسلمان اس صورتحال سے اس قدر پریشان تھے کہ آئے دن ہجرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسے حالات میں یہ باور کرنا آسان نہ تھا کہ مسلمانوں کے غلبے کے دن قریب آ پہنچے ہیں اور اس تاریکی سے وہ سحر طلوع ہونے والی ہے جو نوعِ انسانی کیلئے سرافرازیوں کی نوید بن کر آئے گی۔ اس لئے پروردگار نے اپنی قدرت کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کو اطمینان دلایا ہے کہ حالات میں یہ صالح تبدیلی بہت دنوں کی بات نہیں حالات کچھ بھی ہوں ہم ہر طرح کے حالات کو تبدیل کرنے پر قادر ہیں۔ ممکن ہے اس دعا میں ہجرت کی طرف بھی اشارہ ہو کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں تو ایسی ہی دعائیں انہیں تلقین کی جاتی ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾

(برائی کو اس طریقے سے دور کیجئے جو بہترین ہو، ہم خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔ ۹۶)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور حسنِ سلوک کی ہدایت

عذاب میں تاخیر کے باعث مخالفین کی مخالفت اور ہرزہ سرائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور ہمیں جس انجام سے ڈرایا جارہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کہتے اور آپؐ کی ذاتِ والا تبار کی شان میں بڑھ چڑھ کر گستاخیاں کرتے۔ آنحضرت ﷺ ان کی شرارتوں پر دل مسوس کر رہ جاتے۔ آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آپؐ ہرگز دل گرفتہ نہ ہوں، ہم ان کی ایک ایک شرارت سے واقف ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم ان سے اس کا حساب لیں گے۔ تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کی ہرزہ سرائی قیامت کے دن کیا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ البتہ تبلیغ و دعوت کے آداب میں لب و لہجہ اور رویئے کا پاکیزہ ہونا آپؐ کی سنت رہی ہے۔ اس لئے اس میں کمی نہیں آنی چاہئے۔ قریش یقیناً اپنی زیادتیوں میں حدود سے

Marfat.com

بہت حد تک تجاوز کر چکے ہیں لیکن آپؐ کو حسبِ معمول مکارمِ اخلاق کا پیکر بن کر اپنا فریضہ ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ جس طرح احقاقِ حق آپؐ کی طرف سے ضروری ہے اسی طرح قیامت تک آنے والے ہر داعی الی الحق کیلئے آپؐ کا رویہ بھی رہنما ہونا چاہیے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ آپؐ ان کی ہر زیادتی کا جواب حسنِ اخلاق نہیں بلکہ احسان سے دینے کی کوشش کریں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے سالہا سال تک آپؐ کو اذیتیں پہنچائیں جب وہ وقت آیا جب وہ بے بس ہو کر آپؐ کے سامنے کھڑے تھے تو آپؐ نے ان سے کوئی نامناسب لفظ کہنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ کا واقعہ اس کی روشن مثال ہے۔ حضرت ابوسفیان جو اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کر چکے تھے جب آپؐ کے سامنے لائے گئے تو آپؐ نے ان کے ساتھ وہ سلوک فرمایا جس کی شاید وہ بھی توقع نہ کرتے تھے۔ آپؐ کے اپنے خاندان کی شاخ کے لوگ جنہیں بنو حارث کہا جاتا ہے ان کا رویہ آپؐ کیلئے اس حد تک جارحانہ تھا کہ فتح مکہ کے راستے میں جب وہ لوگ جا کے آپؐ سے ملے تو آپؐ نے انہیں منہ لگانے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب وہ دو تین دفعہ آپؐ کے سامنے معافی کیلئے حاضر ہوئے تو آخر آپؐ نہ صرف معاف کرنے پر تیار ہو گئے بلکہ انہیں بیش از بیش عنایات سے بھی نوازا۔ مکارمِ اخلاق کی آپؐ کے حوالے سے اس قدر درخشندہ مثالیں تاریخ میں موجود ہیں کہ دنیا بھر کے عظیم لوگ شاید اس کا عشر عشیر بھی پیش نہ کر سکیں۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٩٧﴾ وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿٩٨﴾

(اور دعا کرتے رہیے کہ اے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ۹۷) اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں، اے میرے رب! اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔ ۹۸)

توفیق ایزدی کیلئے دعا کی تلقین

جب ایک داعی الی الحق میدانِ عمل میں اترتا ہے تو اس کی کامیابی چونکہ شیطنت کی ناکامی اور کفر و شرک کی بدنصیبی اور محرومی ہے اس لئے تمام شیطانی قوتیں ہر ممکن طریقے سے اس کی دعوت کو بے اثر کرنے میں لگ جاتی ہیں اور انسانوں میں شیطان کے کارندے پیغمبر کو پریشان کرنے اور اس کے دعوتی عمل کو مسدود کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شیطانی قوتیں وسوسہ اندازی اور اندیشہ ہائے دور دراز سے دلوں کو مسموم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور شیاطینِ انس انسانی حربوں اور انسانی اثر و رسوخ سے داعی الی الحق اور اس پر ایمان لانے والوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں عفو و درگزر کا حکم دے کر پیشِ نظر آیت میں اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل کرنے کیلئے دستِ دعا پھیلانے کی تلقین کی ہے تاکہ شیاطینِ جن اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے دلوں کو اپنا نشانہ نہ بنا سکیں اور شیاطینِ انس اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جانے کے بعد اپنی کاوشوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ کیونکہ دونوں طرف کی مخالفتوں سے بچنے کیلئے اگر ایمان و عمل کی قوت اور مصائب کے مقابلے میں استقامت ضروری ہے تو اس سے کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس راستے کا سب سے بڑا سہارا اور سرمایہ ہے کیونکہ وہ دل جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے معمور رہتے ہیں شیطانی قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ ہماری وسوسہ اندازی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تو وہ پھر اپنے انسانی چیلے چانٹوں کو مشتعل کر کے گری ہوئی حرکتیں کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اللہ تعالیٰ کا سہارا نہ ہو تو ان اشرار سے بچنا آسان کام نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے جس طرح قریش کی مخالفت کے مقابلے کیلئے ایمان و استقامت کا درس دیا اسی طرح شیطانی وساوس سے بچاؤ کیلئے بعض دعائیں بھی سکھائیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ حضورؐ نے فرمایا

Marfat.com

جب سونے کا ارادہ کرو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَ عِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنَ (تفسیر کبیر) ''میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اللہ کے کامل کلمات کے ذریعے سے، اس کے غضب سے اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس بات سے کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اپنے سارے بالغ لڑکوں کو یہ کلمات سکھایا کرتے اور سوتے وقت پڑھنے کا حکم دیتے اور جو نابالغ بچے ہوتے ان کے گلے میں لکھ کر ڈال دیتے۔ (مسند امام احمد)

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

(یہاں تک کہ جب آ جائے گی ان میں سے کسی کی موت تو وہ کہے گا، اے رب! مجھے پھر واپس بھیج۔ ۹۹) شاید میں اس دنیا میں اچھے کام کروں جسے میں چھوڑ کر آیا ہوں، ہرگز نہیں یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک پردہ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ ۱۰۰)

معاندین کیلئے آئینہ

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی کے ساتھ ساتھ مخالفین اور معاندین کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ اب یہ لوگ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں اور کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات سننا بھی انہیں گوارا نہیں۔ ان کی مخالفت اور اذیت رسانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت اور آپؐ کی ہمدردی اور خیر خواہی سے بھرپور تبلیغ و دعوت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو رہی۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب موت کا عفریت ان پر حملہ آور ہوگا اور جیسے ہی ان کے جسم پر اس کے پنجے گڑیں گے اور نزع کی حالت میں انہیں دوسرا جہان نظر آنے لگے گا، فرشتے خشمگیں نگاہوں سے اس دنیا کی سرحد پر ان کے استقبال کیلئے موجود ہوں گے تو یہ انہیں دیکھ کر اور عذاب کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے چیخ اٹھیں گے کہ الٰہی ہم پر رحم فرما اور ہمیں واپس اس دنیا میں بھیج دے جہاں سے ہم آئے ہیں۔

قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار اور مشرکین موت کی سرحد میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر آخرت میں واصل بجہنم ہونے تک بلکہ اس کے بعد بھی بار بار یہی درخواستیں کریں گے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جس واپسی کی درخواست کی گئی ہے یہ اس وقت بھی ہو سکتی ہے جب مرنے والا موت کی سرحد میں داخل ہو رہا ہو۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ آخرت کے مختلف مراحل میں کسی وقت بھی یہ درخواست کی گئی ہو۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت تو یہ لوگ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے لیکن وہ وقت دور نہیں جب اپنے انجام کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے واپسی کی درخواست کریں گے کیونکہ موت کے پہلے ہی مرحلے میں انہیں اپنے انجام کی خبر ہو جائے گی، لیکن پروردگار کی جانب سے سختی سے انکار کیا جائے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

اِرْجِعُوْنِ کا مفہوم

قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ...... اِرْجِعُوْنِ جمع کا صیغہ ہے،اس کا ایک مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ مرنے والا ہر کافر بڑے احترام اور آداب کے ساتھ پروردگار سے عرض کرے گا کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تا کہ میں اپنے گناہوں کی تلافی کرسکوں۔اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے، جیسا کہ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ وہ نہایت لجاجت کے ساتھ بار بار پروردگار سے درخواست کرے گا کہ مجھے دوبارہ دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے۔جمع کا صیغہ بار بار کی اجازت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے لایا گیا، لیکن ان کا بار بار کا اصرار اور ہر طرح کی لجاجت اور گریہ زاری اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدل نہیں سکے گی۔اللہ تعالیٰ صاف انکار فرما دیں گے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، تمہارے اصرار اور لجاجت کی حیثیت ایک کلمۂ ناروا کے سوا کچھ بھی نہیں۔کل تمہارے منہ سے نکلنے والے کلمات، کفر اور شرک کی نمائندگی کرتے تھے، اور آج تمہارے منہ سے نکلنے والا کلمہ تمہاری ندامت اور شرمندگی کا اظہار ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

واپسی سے انکار کا سبب

کفار کی واپسی سے انکار اس وجہ سے ہوگا کہ دنیا دارالامتحان ہے۔انسان کو دنیا میں عقل اور شعور دے کر امتحان کیلئے بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر حقیقت کا مشاہدہ کئے بغیر حق کو پہچاننے کی کوشش کرے۔اس پر دلالت کرنے والے بیشمار دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق کو ذریعہ بنایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں تا کہ انہیں حقیقت کی شناخت میں دشواری پیش نہ آئے اور مزید یہ کہ انہیں اطاعت اور معصیت دونوں کی آزادی دی گئی کہ تم چاہو تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اور چاہو تو نافرمانی کرو۔لیکن دونوں راہوں کو اس طرح واضح کردیا گیا کہ انسان اگر عقل سے کام لے تو اس کیلئے اطاعت کا راستہ اختیار کرنا کوئی مشکل نہیں۔لیکن موت کی سرحد سے گزر کر جب ایک شخص عالمِ غیب میں حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے اور ہر چیز جس پر ایمان لانا ضروری تھا وہ اس کیلئے مشاہدہ بن جاتی ہے تو اب اگر اسی صورت میں اسے واپس لایا جائے تو اس صورت میں یہ دنیا دارالامتحان نہیں رہے گی کیونکہ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے کسی کے سامنے امتحان کا پرچہ ہر سوال کے جواب کے ساتھ رکھ دیا جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ تم ان سوالوں کا جواب لکھو۔ظاہر ہے یہ امتحان کے نام پر ایک مذاق تو ہوسکتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے مرحلے سے گزرتے ہی عالمِ غیب کی ہر حقیقت مرنے والے پر واشگاف ہوجاتی ہے۔مومن ایمان کے مقامات کو دیکھتا ہے اور کافر اپنے بدترین انجام کو۔ان دونوں حوالوں سے ان پر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔عبادہ ابن الصامت سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملاقات کرنے کو پسند فرماتے ہیں، اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں)۔حضرت عائشہ ؓ نے عرض کی یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا معنی تو موت کو قبول کرنا ہے اور ہم تو موت کو پسند نہیں کرتے۔حضور ؐ نے فرمایا، یہ مطلب نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب مومن کو موت آتی ہے تو اسے بشارت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر راضی ہے اور تیری عزت افزائی ہونے والی ہے۔وہ یہ نوید جانفزا سن کر آگے جانے کی آرزو کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی آرزو کو قبول فرماتے ہیں۔اور کافر کو اس وقت عذاب کی خبر دی جاتی ہے، وہ عذاب کا سن کر آگے جانے سے سو دفعہ پناہ مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں فرماتا۔حاصل یہ ہے کہ موت کا ایک جھونکا ہر کافر کا کس بل نکال دیتا ہے تو وہ فرشتوں کو دیکھتے ہی چلانے لگتا ہے کہ خدا کیلئے مجھے واپس جانے کی اجازت دی جائے، میں یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں اس سے پہلے کوتاہیاں کر چکا ہوں، وہ اب نہیں کروں گا۔

Marfat.com

کفار کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا یہ وہ مضمون ہے جو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر کفار کو آئینہ دکھاتے ہوئے بیان فرمایا ہے۔

لیکن بعض جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کے عذاب کو دیکھ کر صرف کافر ہی دنیا میں واپسی کی درخواست نہیں کریں گے بلکہ وہ نام نہاد مسلمان بھی کریں گے جنہوں نے زندگی بھر اسلامی احکام کی کبھی پرواہ نہ کی۔ نام کے مسلمان بنے رہے لیکن فسق و فجور ان کی زندگیوں میں غالب رہا۔ انہیں بھول کر بھی کبھی آخرت کا خیال نہ آیا۔ وہ بھی نزع کی حالت میں مبادیِ عذاب کو دیکھ کر گزشتہ زندگی پر پچھتانا شروع کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ انہیں زندگی کی مزید مہلت دی جائے تاکہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کی تلافی کر سکیں۔ سورۃ منافقون میں ارشاد ہے وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۔ (اور جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو وہ کہے کہ کیوں نہ میری موت کو مؤخر کیا قریبی مدت تک تاکہ میں صدقہ کرتا اور نیکو کاروں میں سے ہو جاتا)۔

وَمِنۡ وَّرَآئِهِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ...... کفار سے کہا جا رہا ہے کہ تم موت کے ایک حملے سے پریشان ہو کر دنیا کی طرف واپسی کی درخواستیں کر رہے ہو شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اب تمہارے سامنے ایک برزخ ہے۔ یہ اس وقت تک حائل رہے گا جب تک قیامت کا صور نہیں پھونکا جاتا اور انسانوں کو زندہ کر کے اٹھایا نہیں جاتا۔ برزخ، اوٹ، رکاوٹ یا پردے پر بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد موت سے لے کر وقوعِ آخرت تک کا وقفہ ہے۔ مرنے والے کافر تمنا کرتے ہیں کہ انہیں دوبارہ دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ اب دنیا میں جانے کا تو کوئی موقع نہیں، اب تو انہیں آخرت کے قائم ہونے تک انتظار کرنا ہے اور انتظار کا وہ وقفہ جو حائل ہے دنیا کے سفر سے آخرت کی منزل تک، اسے برزخ کہا گیا ہے۔ اس میں کافروں کو آخرت کا عذاب تو نہیں ہوگا، البتہ وہ آخرت کے کچھ شواہد سے ضرور گزارے جائیں گے اور ایک مختصر عذاب برزخ میں بھی انہیں دیا جائے گا جس میں آخرت کے عذاب کی شدت تو نہیں ہوگی لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوگا کہ آئندہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾

(تو جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان کے درمیان نسب کام آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ ۱۰۱)

مضمون کا تسلسل

اشرارِ قریش جو تکبر اور تمرد کی چلتی پھرتی تصویر تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی کوئی بات بھی پسند نہ آتی تھی انہیں گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان کے انجام سے آگاہ کرتے ہوئے وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں وہ موت سے سابقہ پڑتے ہی گزریں گے۔ جیسے ہی ان پر نزع طاری ہوتی ہے تو یہ وہ وقت ہے جب اصحابِ ایمان کو ان کا انجام دکھا دیا جاتا ہے اور نہایت خوبصورت فرشتے تہنیتی کلمات سے انہیں خوش آمدید کہنے کیلئے تیار کھڑے ہوتے ہیں اور کافروں کو بھی آنے والے دنوں میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ فرشتے نہایت ڈراؤنی صورتوں میں تہدید آمیز کلمات کے ساتھ ان کے استقبال کیلئے کھڑے ہوتے ہیں۔ سکرات الموت سے گزرنے والا کافر جان لیتا ہے کہ میرے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ مجھے واپس اسی دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے تاکہ میں نیک عمل کر سکوں۔ یہ پہلا منظر ہے جس سے کافر کو سابقہ پیش آتا ہے۔ چنانچہ ابھی وہ اسی چیخ و پکار میں ہوتا ہے کہ دوسرا منظر اس کے سامنے ابھرنے لگتا

Marfat.com

ہے۔وہ یہ دیکھتا ہے کہ موت کی سرحد سے گزر کر میں ایک دوسری دنیا میں داخل ہو گیا ہوں اب اس دنیا اور آخرت کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں آخرت کا اسے انتظار کرنا ہوگا، وہ اپنے وقت پر آئے گی اور دنیا کی طرف اس پردے کو عبور کر کے وہ جانے پر قادر نہیں۔ اسے بتا دیا جائے گا کہ تمہیں اب اسی برزخ میں رہنا ہے اور یہاں تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو اس شخص کے ساتھ ہوتا ہے جسے ایک مدت کے بعد بدترین سزا دی جانے والی ہوتی ہے۔ پھانسی کی سزا پانے والا دوسرے سزا یافتہ قیدیوں سے الگ کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے جو نسبتاً چھوٹی اور تکلیف دہ ہوتی ہے اور اس کا لباس دوسرے قیدیوں سے الگ وہ پہنایا جاتا ہے جسے پھانسی پانے والوں کا لباس کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کافروں اور مشرکوں کے ساتھ بھی برزخ میں رہنے والے باقی لوگوں سے مختلف سلوک ہوگا۔

قیامت کے دن کی نفسا نفسی

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایک تیسرے منظر سے پردہ اٹھایا جارہا ہے کہ برزخی زندگی کے اختتام پر اور آخرت کے اعلان کے طور پر جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو ہر شخص اپنے مسکن اور مدفن سے اٹھایا جائے گا اور اسے اس جگہ کی طرف ہانکا جائے گا جہاں سب کو حساب کتاب کیلئے پیش ہونا ہے جسے محشر یا میدانِ حشر کہا جاتا ہے۔ یہ قیامت کا دن اور قیامت کا میدان ہوگا اور جس کی ہر کیفیت اپنے اندر نہ جانے کتنی قیامتیں لئے ہوئے ہوگی۔ سب لوگ نفسی نفسی پکاریں گے۔ یہاں چونکہ ذکر صرف کفار کا ہے ان کے بارے میں خاص طور پر ان دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کے بل بوتے پر وہ آنحضرت ﷺ کو دھمکیاں دیتے اور ہر میدان میں اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے۔ سرزمینِ مکہ اور جزیرۂ عرب میں پھیلے ہوئے قبائل فکری وحدت کی وجہ سے ایک متحدہ قوت تھے۔ ہر قبیلے کو جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے ہم نسب لوگوں کو اکٹھا کرتا تھا اور اگر یہ کام مختلف قبائل کے مل کر کرنے کا ہوتا تو ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کو جن کے درمیان فکری اشتراک ہوتا، مدد کیلئے پکارتا تھا۔ جس طرح جنگِ خندق میں عرب بھر کے قابلِ ذکر قبائل اپنے تئیں مسلمانوں کا استحصال کرنے کیلئے ایک فکر اور ایک حوالے سے جمع ہو گئے تھے، حالانکہ ان کی آپس میں دشمنیاں بھی تھیں لیکن اسلام اور مسلمان دشمنی ان کے نزدیک وہ جذبۂ مشترکہ تھا جس نے ان کو یک مشت بنا دیا تھا۔ یہ دو چیزیں چونکہ ان کی قوت کا سامان تھیں اور ان پر انہیں بڑا ناز تھا تو ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے تو ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ باہمی نسبی اشتراک رکھتے ہوئے بھی نسلی نسبتوں کو بھول چکے ہوں گے۔ کوئی کسی کو مدد کیلئے پکارنے کی ہمت نہیں کرے گا بلکہ ان کا حال یہ ہوگا یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍۭ بِبَنِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِیْهِ وَ فَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُؤْوِیْهِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْهِ ”ہر مجرم اس دن یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد اور بیوی اور بھائی اور اپنی حمایت کرنے والے قریب ترین کنبے اور دنیا بھر کے سب لوگوں کو فدیے میں دے دے اور اپنے آپ کو عذاب سے بچالے“۔ (المعارج، آیات ۱۱ تا ۱۴) اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِیْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ”جس روز آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور اولاد سے بھاگے گا اس روز ہر شخص اپنے حال میں ایسا مبتلا ہوگا کہ اسے کسی کا ہوش نہ رہے گا۔“

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۲ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۳ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَ هُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ ۝۱۰۴

Marfat.com

(پس جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱۰۲) اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۱۰۳) جھلس ڈالے گی ان کے چہروں کو آگ، اور اس میں ان کے منہ بگڑے ہوئے ہوں گے۔ ۱۰۴)

قیامت کے دن کامیابی کا ذریعہ

یہ تیسرا منظر ہے جس سے قیامت کے دن کفار کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ دنیا میں یہ لوگ اپنے قبائل کی افرادی قوت اور باہمی تعاون وتناصر پر ہمیشہ نازاں رہے اور یہی ان کی اجتماعی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ تھا، لیکن قیامت کے دن اس طرح بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے کھڑے ہوں گے کہ قبیلوں کا انتساب رکھتے ہوئے بھی اور باہمی تعاون کے جذبے کے باوجود ایک دوسرے کی بات تک نہیں پوچھ سکیں گے۔ قریبی اور حقیقی رشتے بھی اس دن کی ہولناکی کے سامنے اپنا وجود کھودیں گے۔ اس دن صرف ایک سکہ کام آئے گا جسے ایمان وعمل کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ہر شخص کے اعمال تولے جائیں گے تو ایمان وعمل ہی وہ اثاثہ ہوگا جو پلڑے کو جھکا دے گا اور اس سے محرومی ہر طرح کے اثاثوں کو بے قدر اور بے وزن کردے گی۔ اس دن جو ایمان وعمل کا سرمایہ لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے گا وہ دنیا میں چاہے کیسا ہی نادار اور بے یارومددگار شخص رہا ہو اس کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا جائے گا۔ اور یہی وہ حقیقی کامیابی ہے جس کا ذکر اس سورت کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ اور اشرافِ قریش کو بار بار سمجھایا گیا کہ تم جن چیزوں کو عزت وافتخار کی علامت اور کامیابی کا سرمایہ سمجھتے ہو ان کی حیثیت ڈھلتی چھاؤں سے زیادہ نہیں۔ حقیقی کامیابی یہ ہے جو آج دیکھنے میں آئے گی اور جس کے بارے میں دنیا کو پہلے بتادیا گیا تھا فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ''جو شخص آگ سے ہٹادیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہ ٹھہرا کامیاب، اور دنیا کی زندگی متاعِ غرور کے سوا کچھ نہیں۔'' لیکن جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ ہوئے آج وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھیں گے۔ ان کے طرزِ عمل کی پاداش میں انہیں ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے گا۔ اور جہنم کے عذاب کی شدت کا عالم یہ ہوگا کہ جیسے ہی ان کے چہروں پر جہنم کی آگ کے تھپیڑے پڑیں گے تو ان کی کھال جل کر لٹک جائے گی اور ان کے دانت اس طرح باہر نکل آئیں گے جیسے بکرے کی بھنی ہوئی سری ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے کسی نے پوچھا کہ آیتِ کریمہ میں جو کٰلِحُوْنَ کا لفظ آیا ہے جس کا واحد کَالِحٌ ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا اَلَمْ تَرَا اِلَى الرَّاسِ الْمُشِيْطِ ''کیا تم نے بھنی ہوئی سری نہیں دیکھی۔'' یعنی جس طرح بکرے کی سری اگر بھونی جائے تو اس میں چہرے کے دائیں بائیں کا چمڑا غائب ہوجاتا ہے اور صرف دانت نظر آتے ہیں، یہ حال اس کافر کا ہوگا جسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

(کیا تمہیں میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں تو تم ان کو جھٹلاتے تھے۔ ۱۰۵) تو وہ کہیں گے، اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی اور ہم گمراہ ہوگئے۔ ۱۰۶) اے ہمارے رب! ہمیں جہنم سے (ایک مرتبہ) نکال، اگر ہم پھر ایسا کریں تو بیشک ہم ہی ظالم ہوں گے۔ ۱۰۷)

Marfat.com

کفار کی آہ وزاری اور اس کا جواب

جب کفار جہنم میں بہت زیادہ چیخیں چلائیں گے اور بار بار رحم کی درخواست کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اب چیخنے چلانے کا کیا فائدہ، کیا میرے رسول (ﷺ) نے اسی دن کی یاددہانی کیلئے تمہارے سامنے بار بار ہماری آیات پڑھ کر نہیں سنائی تھیں۔ تم گالیاں دیتے اور ہذیان بکتے تھے، لیکن ہمارا رسول (ﷺ) رحمت و موعظت کا پیکر بن کر تمہیں آنے والے انجام سے برابر باخبر کرتا رہا لیکن تم نے اس کی کسی بات کا جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ تو کفار جواب میں کہیں گے کہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری بدبختی اور شقاوت نے ہم پر ایسا غلبہ کیا کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اللہ تعالیٰ کے رسول کی باتوں کو اور قرآنِ کریم کی آیات کو سننے کی زحمت نہ کی۔ بلکہ جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کے رسول کی ہمدردی بڑھتی گئی ویسے ویسے ہماری طرف سے تکذیب میں تیزی آتی گئی۔ آج ہمارے پاس اپنی بدبختی کے اعتراف اور ندامت کے سوا کچھ نہیں۔ الٰہی تو بڑا رحیم ہے، ایک دفعہ ہم پر رحم فرما اور جہنم سے نکال کر ایک دفعہ ہمیں دنیا میں بھیج، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اب اگر ہمیں دنیا میں جانے کا موقع ملا تو ہم ایک نیکوکاری کی زندگی گزاریں گے اور اللہ تعالیٰ کے نبی کی ایک ایک نصیحت پر کان دھریں گے۔ لیکن اگر ہم نے اس موقع سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور ہمارا وہی رویہ رہا جو پہلے تھا تو پھر ہم رحم کی اپیل بھی نہیں کریں گے بلکہ ہم تسلیم کریں گے ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں اور ہر طرح کے سلوک کے سزاوار ہیں۔

قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾

(اللہ تعالیٰ جواب دے گا، دفع ہو، اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ ۱۰۸)

خسا کا مفہوم اور کلام نہ کرنے سے مراد؟

خَسَا ...... کتے کو دھتکارنے کیلئے آتا ہے۔ کفار سے بھی اسی لہجے میں بات کی جائے گی جس طرح کتے سے کی جاتی ہے۔ ان کی بار بار یہ درخواست کہ ہمیں ایک دفعہ دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے، اس کا جواب نہایت حقارت سے دیا جائے گا اور تحقیر میں مزید شدت پیدا کرنے کیلئے کہا جائے گا کہ اب اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات مت کرو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے عذاب میں مبتلا لوگوں کی یہ آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد ان کی زبانیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جائیں گی۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ وہ کسی طرح کی بات کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ لیکن سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے کلام پر پابندی نہیں بلکہ پابندی اس بات پر لگائی گئی ہے کہ آئندہ دنیا میں دوبارہ جانے کی درخواست مت کرنا۔ دنیا دار العمل ہے جہاں ہر آدمی کو ایک ہی دفعہ بھیجا جاتا ہے۔ تم اس سہولت سے ایک دفعہ فائدہ اٹھا چکے ہو، اب دوسری دفعہ جانے کا کوئی امکان نہیں، اب تمہیں ہمیشہ اسی جہنم میں رہنا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ
﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿١١٠﴾ اِنِّيْ
جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿١١١﴾

Marfat.com

(بیشک میرے بندوں کی ایک جماعت تھی جو دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو، تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۹) تو تم نے ان کو مذاق بنالیا، یہاں تک کہ ان کے ساتھ تمہارے اس شغل نے تم کو میری یاد سے غافل کردیا اور تم ان پر ہنستے رہے۔ ۱۱۰) آج ان کے اس صبر کا میں نے یہ پھل دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔ ۱۱۱)

غریب مسلمانوں کی دل آزاری اور ان کی توہین کا انتقام

سابقہ آیتِ کریمہ میں کفار کو جس طرح دھتکارا گیا ہے اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دھتکارنے کی وجہ دراصل ان کا وہ رویہ ہے جو انہوں نے ان مخلص مسلمانوں کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے ایمان کا حوالہ دیتے، پھر اس سے مغفرت طلب کرتے اور اسی سے رحمت کے خواستگار ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ کفار کی طرف سے ہر طرح کی اذیت رسانی کا عمل بے روک ٹوک جاری تھا اور اس کا نشانہ یہی مخلص مسلمان تھے۔ لیکن وہ اس کی شکایت کرنے کی بجائے ہمیشہ اپنے ایمان اور استغفار کی بات کرتے اور اللہ تعالیٰ سے رحم کی بھیک مانگتے، لیکن ان ظالموں نے ان کے اس طرزِ عمل کو ایک مذاق بنا رکھا تھا اور اپنے نہایت مکروہ طرزِ عمل کو اس طرح اپنا وطیرہ بنالیا تھا کہ وہی ان کی تفریح تھا اور اسی کو انہوں نے ان کی تضحیک کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور اس میں یہ اس حد تک منہمک رہتے تھے کہ انہیں اس بات کا احساس ہی مر گیا تھا کہ ہم مسلمانوں کے جس رویئے کا مذاق اڑا رہے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اسی سے بخشش کی طلب اور اسی سے رحم کی درخواست کے سوا اور کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مذاق مسلمانوں کا نہیں اڑا رہے بلکہ ہم نے ذکر اللہ کو نشانہ بنا رکھا ہے۔ اولاً تو اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کا مذاق اڑانا بھی بجائے خود ایک بہت بڑا جرم ہے لیکن اگر اس میں ذکر اللہ کا بھی استخفاف ہوتا ہو تو اس حرکت کی شناعت میں انتہائی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سے وہ غیرت پھوٹتی ہے جس کی وجہ سے پروردگار نے انہیں اس طرح دھتکارا ہے کہ انہیں ہر طرح کی درخواست پیش کرنے کے حق سے بھی محروم کردیا۔

آیتِ کریمہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے متمردین جن مخلص مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے وہ مسلمانوں کے ان غرباء کا گروہ تھا جو اپنی غریبی اور بے کسی کے باعث اشرارِ قریش کے ظلم و ستم اور مذاق و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کی رعونت کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ان غریب مسلمانوں کو جو انسانیت کا وقار تھے سِخْرِیًّا بنایا ہوا تھا۔ یہ سخری اس چیز یا اس شخص کو کہتے ہیں جس کو ایک مذاق بنالیا جائے اور پھر یہ مذاق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا احترام بھی اٹھ گیا تھا۔

کفار کے طرزِ عمل کو کراہت سے ذکر کرنے کے بعد ان غریب مسلمانوں پر اپنے افضال و انعامات کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے جس سے ان کے مرتبہ و مقام میں غیر معمولی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کفار کی نگاہوں میں نہایت چھوٹے لوگ تھے لیکن انہوں نے جس طرح ان کے تمسخر اور استہزاء کو برداشت کیا بلکہ اسے اپنے ایمان کی جلا کا ذریعہ بنایا اور ان کی بڑی سے بڑی بات پر بھی صبر و استقامت کی نئی تاریخ مرتب کی۔ پروردگار نہایت تحسین کے ساتھ اس کا ذکر فرماتے ہوئے صرف ایک لفظ میں انہیں وہ اعزاز عطا فرما رہے ہیں کہ ایک مومن کی زندگی بھر کی مساعی کا انعام اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ ارشاد فرمایا، کہ ہم اعلان کرتے ہیں کہ یہ لوگ جنہیں دنیا میں یہ متمردین اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی بے کسی اور بے بسی کا نہایت حقارت سے مذاق اڑاتے تھے، ہم انہیں فوز و فلاح سے نوازنے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ دنیا میں بھی اس طرح کامیاب ہوں گے کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں ان کے نقوشِ قدم کو اپنے لئے بصیرت کا سامان سمجھیں گی اور آخرت میں جنت کا بڑے سے بڑا مقام ان کیلئے ہوگا۔

Marfat.com

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

(اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا سالوں کے حساب سے تم زمین میں کتنا عرصہ رہے ہو۔ ۱۱۲) وہ کہیں گے ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔ ۱۱۳) ارشاد ہوگا تم تو بس تھوڑی ہی مدت رہے ہو، کاش تم نے یہ اس وقت جانا ہوتا۔ ۱۱۴)

طولِ حیات کا مغالطہ

قریش کے عقیدے کی سب سے بڑی خرابی کا سبب شرک ہے جس نے ان کے انفرادی اور اجتماعی تشخص کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور ان کی بدکرداری اور غیر سنجیدگی کا سب سے بڑا سبب قیامت کا انکار ہے اور قیامت کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ اولاً تو اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں اور اگر اس کی آمد فرض کر بھی لی جائے تو جب بھی اس کا وقوع ابھی دور ہے، تو ابھی سے اپنا عیش مکدر کیوں کیا جائے۔ قیامت کے دن ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی لیکن تب اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ لیکن وہاں جس طرح ان کے ساتھ مکالمہ ہونے والا ہے جو انہیں اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دے گا، وہ مکالمہ انہیں سنایا جا رہا ہے تا کہ اگر ان کے اندر نصیحت قبول کرنے کا کسی حد تک بھی مادہ موجود ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ اس مکالمے کی ابتداء اس طرح ہوگی کہ اے قیامت کا انکار کرنے والو! یہ بتاؤ کہ تم دنیا میں کتنا عرصہ رہے ہو تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ ہمیں اپنی غفلت کے باعث ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں، آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو زندگی کے دنوں کی گنتی کرتے رہے ہیں۔ پروردگار ارشاد فرمائے گا کہ تم آخرت کے مقابلے میں دنیا میں بہت قلیل عرصہ رہے ہو، لیکن تم اسی قلیل کو کثیر سمجھ کر اس کے عیش و عشرت کو ہاتھ سے دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ آج اگر تمہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جو تا ابد ہے۔ دنیا کی زندگی اس کے مقابلے میں فانی بھی ہے اور بہت مختصر بھی۔ لیکن کاش تم نے اس بات کو دنیا میں سمجھا ہوتا تو تمہاری ہدایت کا سبب بن سکتی تھی، لیکن آج اس کا کیا فائدہ۔

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ یہ مکالمہ کافروں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نہیں ہوگا بلکہ کافر خود آپس میں یہ باتیں کریں گے۔ پہلی آیت میں ''قال'' کا فاعل اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ قائل یعنی کوئی کہنے والا ہے جو ظاہر ہے کہ ان ہی میں سے ہوگا۔ اس کے پوچھنے پر دوسرے لوگ جواب دیں گے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا قیام دنیا میں ایک دن کا تھا یا ایک دن کا بھی کچھ حصہ۔ لیکن ساتھ ہی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو، ان لوگوں سے پوچھو جو اس کا شمار کرتے رہے ہیں، لیکن ایسے لوگ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے۔ ہم تو اس وقت اپنے خطرناک مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں اور ہولناک عذاب ہمارے انتظار میں ہے اور تم ہم سے دنیا میں ہمارے قیام کی تفصیلات جاننا چاہتے ہو۔ پھر ان ہی میں سے کوئی صاحب کہیں گے، معلوم ہوتا ہے یہ وہ صاحب ہوں گے جو دنیا میں ان کے نزدیک بہت عقیل و فہیم سمجھے جاتے تھے کہ صحیح بات تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں تمہاری مدتِ قیام بہت مختصر تھی۔ لیکن اس کے جاننے اور احساس کرنے کا وقت دنیا تھی، آج تو یہ باتیں بیکارِ محض ہیں۔

Marfat.com

مکالمے کی اس تشریح پر یہ اہلِ علم سورۂ طٰـہٰ کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ سے استدلال کرتے ہیں جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کافر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ تمہارا قیام دنیا میں دس دن سے زیادہ نہ تھا اور پھر ان میں سب سے زیادہ دانا و بینا آدمی یہ کہے گا کہ میرے نزدیک تو یہ قیام ایک دن سے زیادہ نہیں تھا۔ سورہ طٰـہٰ کی ان آیات کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ جہنم کی یہ گفتگو ان کے اپنے درمیان ہوگی، اللہ تعالیٰ یا کسی فرشتے کے ساتھ نہیں۔ لیکن جب ہم آنے والی آیتِ کریمہ کو دیکھتے ہیں جس میں کفار کو ملامت کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ ساری کوتاہیاں اور گمراہیاں اس سبب سے ہوئی ہیں کہ تم نے یہ سمجھا کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے۔ اس میں چونکہ پروردگار کا ارشاد نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ گفتگو بھی کفار اور پروردگار کے درمیان ہوئی ہو، اور اس کا بھی امکان ہے کہ کفار اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری سے پہلے جب میدانِ حشر میں انتظار میں کھڑے تھے، یہی گفتگو ان کے درمیان بھی ہوئی ہو اور بعد میں پروردگار سے بھی اس سوال و جواب کی نوبت آئی ہو۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ جس تصور نے ان کی آخرت برباد کر ڈالی اس کی اصلاح آخرت میں جا کے ہوگی لیکن اس وقت اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال گزرے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل اور بے حقیقت ہے، لیکن دنیا میں رہتے ہوئے بعض دفعہ ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ قلت و کثرت اور اہم اور غیر اہم کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب غفلت کا غبار چھٹتا ہے۔ غفلت میں گزرنے والی زندگی گزرتے ہوئے بہت طویل ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے انجام سے دوچار ہوتی ہے یا کسی مقصد سے ہمکنار ہوتی ہے تو تب اندازہ ہوتا ہے کہ اسے تو زندگی کہنا، زندگی کی توہین ہے اور اس کی طوالت دراصل غفلت کی طوالت ہے اور جیسے جیسے آدمی اس فکر کو مجلّا اور مصفا کرتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے اس کا یہ احساس توانا ہوتا جاتا ہے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

(تو کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے۔ ۱۱۵)

عَبَثًا ...... عبث کا معنی ہوتا ہے، فضول یعنی بے مقصد۔ (2) کھیل۔

انسان کی کوتاہیِ فکر اور اس کا نتیجہ

چونکہ عَبَثًا استعمال ہوا ہے۔ ترکیب کے اعتبار سے ہم اس کا ترجمہ کھیل کے طور پر بھی کر سکتے ہیں اور کھیل کیلئے بھی۔ پہلے ترجمہ کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے تمہیں یونہی بطور تفریح پیدا کر دیا تھا، تمہاری تخلیق کا کوئی مقصد اور کوئی غرض و غایت نہیں تھی اور دوسرے ترجمے کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ تم محض اس لئے پیدا کئے گئے ہو کہ کھیلو، کودو، عیش و عشرت میں وقت گزارو، لاحاصل مصروفیات میں لگے رہو، تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں جس کے بارے میں کل کو تم سے سوال کیا جائے۔ چنانچہ ان ہی تصورات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان عاقبت اور آخرت سے لاپرواہ ہو گیا۔ اس نے یہ گمان کر لیا کہ مجھے چونکہ محض ایک کھیل کے طور پر یا کھیل کود کیلئے پیدا کیا گیا ہے جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں، میں ایک ایسا شترِ بے مہار ہوں جسے ہر جگہ گھومنے پھرنے کی آزادی حاصل ہے اور اس کے سپرد کوئی ذمہ داری نہیں۔ میں جو چاہوں کروں، میرے اعمال کی کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا سوچنے والا شخص کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کے جانا ہے اور وہاں اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

Marfat.com

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿١١٦﴾

(پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہِ حقیقی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرشِ کریم کا مالک۔ ۱۱۶)

انسان کی فکری گمراہیوں کی تردید

جن تصورات نے انسان کی عاقبت برباد کی اور زندگی کے حقیقی مقاصد سے غافل کر دیا اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عبث اور بے مقصد پیدا کیا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہایت گستاخی اور گمراہی کی بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت ہی بلند و برتر ہے۔ اس بلند و برتر ہستی کی شان سے یہ بات نہایت بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے اور محض ایک کھیل تماشا اور تفریح کی خاطر ایک جہان پیدا کر ڈالے اور ایسا انسان تخلیق کرے جس کے دل و دماغ کی رعنائیاں خود بولتی ہوں کہ ایسی مخلوق نہ تو تفریح کا سامان ہو سکتی ہے اور نہ اسے بے مقصد کہا جا سکتا ہے۔

دوسری بات فرمائی کہ وہ پادشاہِ حقیقی ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی رعایا میں اچھے اور برے انسانوں میں یکساں سلوک کرے۔ اپنے وفاداروں کو انعام سے محروم رکھے اور غداروں کو غداری کیلئے کھلی چھٹی دے دے اور پھر ایسے پادشاہِ حقیقی سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی رعایا میں عدل و انصاف نہ کرے، ظالم کو ظلم کی سزا نہ دے اور مظلوم کی اشک شوئی نہ کرے۔ ظالم کو اس بات کا کھٹکا نہ ہو کہ ایک ایسی عدالت کا دن بھی آنے والا ہے جب مجھے اپنی زیادتیوں کی اس طرح سزا ملے گی کہ اس کا کوئی حوالہ بھی مخفی نہیں رہے گا اور جس میں مظلوم کو کوئی امید نہ ہو کہ کبھی میری مظلومیت بھی رنگ لائے گی اور میرا پیدا کرنے والا اور میرا پادشاہِ حقیقی کبھی ظالم سے میرا انتقام لے گا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ...... اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ وہی اس کائنات کا معبود بھی ہے اور حکمران بھی۔ اس کی پرستش اور اس کی اطاعت سے انحراف کرنے والے کی جب گرفت ہو گی تو کوئی اس خیال میں نہ رہے کہ وہ کسی دوسرے کی سعی اور سفارش سے اس کی گرفت سے بچ نکلے گا۔ اس کی زمین پر اس کی مرضی کو نافذ کرنے والے اور اس کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو زندگی کا چلن اور قانون بنانے والے قیامت کے دن سرخرو ہوں گے اور اس کی نافرمانی اور اس کی الوہیت میں شریک کرنے والے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ٹھہریں گے۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ...... عرشِ کریم کا مالک۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اقتدارِ مطلق کی تعبیر ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عرش کا کوئی وجود نہیں۔ اس کا ایک وجود بھی ہے جو تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ کیسا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ جو اس عرشِ کریم کا مالک ہے اس کی حکومت و اقتدار کی وسعتوں کی بے پناہی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ جس طرح وہ صاحبِ جبروت اور پر ہیبت حکمران ہے، اسی طرح اس کا کرم اور اس کی رحمت ہر چیز پر غالب ہے۔ یہ اسی کے کرم کا نتیجہ ہے کہ اس نے اہلِ زمین کو مہلتِ عمل دے رکھی ہے۔ سنبھلنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے اور نافرمانوں کو کھل کھیلنے کا، تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ جس عظیم ذات کی زمین پر ہم نے نافرمانی اور بغاوت کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں وہ پکڑنے میں کبھی جلدی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب رہتی ہے اور اس کی قدرت کی بے پناہی کبھی اس خیال سے گراں بار نہیں ہوتی کہ مجرم طاقت حاصل کر کے ہمارے ہاتھ سے بچ نکلیں گے۔ کوئی اس کی پکڑ سے دور نہیں اور کوئی اس کی قوت کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

(اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو پکارے گا جس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے اور کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ ۱۱۷)

آغاز و اختتام میں یکسانی

گزشتہ آیتِ کریمہ میں توحید کے مضمون کو اس قدر مکمل اور مبرہن کر دیا گیا ہے کہ کسی دماغ میں شرک کے غبار کی بھی امید نہیں کی جا سکتی، لیکن اس کے باوجود بھی کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو پکارتا ہے جبکہ کسی اور کی الوہیت کی دلیل کا وجود ہی کوئی نہیں تو ایسے شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ یعنی اب اسے اپنے رب سے واسطہ پڑنے والا ہے، وہ اس سے باز پرس کرے گا کہ تم نے ایسی عظمتوں اور شانوں والے خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو بطورِ الٰہ شریک کر کے اتنی بڑی جسارت کا جوار تکاب کیا ہے تو تمہارے پاس اس کا جواب کیا ہے۔ دنیا میں سخن سازی کی جا سکتی ہے، دلیلیں بھی گھڑی جا سکتی ہیں اور ہٹ دھرمی بھی دکھائی جا سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ باتیں چلنے والی نہیں۔ اس وقت ایسے مشرک سے کوئی جواب بن نہیں پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ قریش کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ جیسے پادشاہِ حقیقی کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو وہ ایک ایسی بے سروپا بات کہتا ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کافر ہے اور کافر نہ دنیا میں فلاح پاتا ہے نہ آخرت میں فلاح پائے گا۔

اس سورت کا آغاز اس بات سے ہوا تھا کہ مومن ہی فلاح پانے والے ہیں۔ پھر ان کی صفات بیان کی گئی تھیں اور فلاح کے حقیقی تصور کو واضح کیا گیا تھا۔ اب اس سورت کو ختم کرتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی گئی ہے کہ فلاح مومن کیلئے مقدر ہے، کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جو انتہا درجہ مربوط ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے ربط میں اس حد تک غموض اور گہرائی ہے جس کو جاننے کیلئے جہاں قرآن کا گہرا علم درکار ہے وہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق سب سے بڑا سہارا ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

(اور دعا کیجئے کہ اے رب! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور تو بہترین رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۱۸)

آنحضرت ﷺ معصوم ہیں تو پھر استغفار کا مفہوم کیا ہے؟

سورت کے آخر میں آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ پر ایمان لانے والوں کو طلبِ مغفرت و رحمت کی دعا تلقین کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک رحم کا تعلق ہے یہ تو ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ ایک عام آدمی بھی اللہ تعالیٰ سے رحم کا طلبگار ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے انتہائی مقرب ہیں وہ بھی اس سے ہمیشہ رحم کے خواستگار رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر جگہ اس لفظ کی معنویت میں گہرائی اور گیرائی پید

Marfat.com

ہو جاتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مانگنے والے کو وہ کچھ ملتا ہے جو اس کے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن جہاں تک استغفار اور طلبِ مغفرت کا تعلق ہے یہ دعا تو اس شخص کیلئے سزاوار ہے جس سے کبھی نہ کبھی گناہ کا صدور ہوتا ہو۔اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول معصوم ہوتے ہیں یعنی ان سے کبھی گناہ صادر نہیں ہوتا۔اور اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تو چمنِ نبوت کے گلِ سرسبد ہیں، ان سے گناہ کے صدور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تو پھر آپ کو یہ تلقین کرنا کہ آپ طلبِ مغفرت کی دعا کریں اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا استغفار در حقیقت امت، کے گناہوں کی بخشش کیلئے ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کی امت، آپ کی اولاد اور آپ کی سپاہ کی طرح ہے۔جرنیل کو ہمیشہ اپنی سپاہ اور باپ کو ہمیشہ اپنی اولاد کی فکر رہتی ہے۔وہ اپنے آپ کو تو بھول سکتا ہے لیکن انہیں اپنی دعاؤں میں کبھی نہیں بھولتا۔اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کی خوبیاں اور کمزوریاں ہمیشہ جرنیل اور باپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ یقیناً اپنی امت کیلئے استغفار فرماتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اپنے آپ کو بھول جاتے تھے یا آپ اپنے لئے اس لئے استغفار نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ معصوم تھے۔حقیقت یہ ہے کہ استغفار صرف گناہوں سے بخشش کیلئے نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ مباح کاموں میں تدبیر کی غلطی پر بھی ہوتا ہے اور حسنات الابرار سیئات المقربین کے اصول کے مطابق بعض ایسی باتیں جو نیک لوگوں کی نیکیاں سمجھی جاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول کے مقامِ بلند کے حوالے سے انہیں فروگزاشت کہا جا سکتا ہے۔ایسی فروگزاشتوں کیلئے استغفار ہمیشہ پیغمبر بھی کرتے رہے ہیں اور اسی کا یہاں آنحضرت ﷺ کو بھی حکم دیا جا رہا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ استغفار گناہوں سے بخشش کیلئے نہیں ہوتا بلکہ ترقی درجات کیلئے بھی ہوتا ہے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے درجات اور مقامات میں آج بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے اور قیامت کے دن مزید اضافہ ہوگا۔

دعا میں معنوی لطافت

اس دعا میں ایک لطیف معنویت بھی پائی جاتی ہے کہ آیت ۱۰۸ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کو دھتکارتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دور ہو جاؤ اب جہنم میں پڑے رہو اور مجھ سے کبھی بات کرنے کی جرأت نہ کرنا۔اور اگلی آیتِ کریمہ میں اس کی وجہ یہ بتائی کہ تمہارے سامنے میرے بندے اور میرے پیغمبر پر ایمان لانے والے مجھ سے طلبِ مغفرت کرتے اور رحمت کی دعائیں مانگتے تھے تو تم ان کا ہمیشہ مذاق اڑاتے تھے۔ان کی توہین کا بدلہ یہ ہے کہ آج میں تم سے بات تک کرنا نہیں چاہتا۔اب سورت کے آخر میں اپنے انہیں بندوں کو جنہیں قیامت کے دن بیش از بیش نوازشات سے گراں بار کر دیا جائے گا، حکم دیا جا رہا ہے کہ جن دعاؤں پر کافر تمہارا مذاق اڑاتے تھے، تم وہ دعائیں برابر اپنے اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔یہی دعائیں تمہارے لئے مغفرت و رحمت کے دروازے کی کلید ہیں۔اس میں خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن یہ بات تمام صحابہ کرامؓ سے کہی جا رہی ہے۔اب اگر یہ لوگ اپنے معمول کے مطابق تمہارا مذاق اڑانا جاری رکھتے ہیں جبکہ انہیں صاف تنبیہ کی جا چکی ہے تو وہ خود ہی اپنے خلاف ایک مضبوط مقدمہ تیار کریں گے جس سے کل انہیں واسطہ پڑنے والا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ النُّوْرِ

(۲۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النُّوْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام پانچویں رکوع کی پہلی آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے ماخوذ ہے۔ اس کی آیات کی تعداد 64 ہے۔

زمانۂ نزول:۔ (اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سانحۂ اِفک غزوۂ بنی المصطلق کے بعد پیش آیا۔ اور واقعہ اِفک سے متعلق احکام اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی براءت کا ذکر چونکہ اس سورت میں کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سورت غزوہ بنی المصطلق کے بعد نازل ہوئی۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ غزوہ بنی المصطلق کس سن میں ہوا۔ نیز اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ غزوہ بنی المصطلق غزوہ خندق سے پہلے ہوا یا بعد میں۔ مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں، لیکن دونوں سورتوں کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ سورۃ الاحزاب پہلے نازل ہوئی ہے جس کا نزول غزوۂ خندق کے بعد ہوا اور سورۃ النور اس کے بعد نازل ہوئی ہے جس کا نزول غزوہ بنی المصطلق کے بعد ہوا) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے جس طرح اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی روایت سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ واقعہ ان کی ذات سے متعلق ہے۔ اسے دیکھ کر اور دیگر روایات کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے پیش آنے سے پہلے حضرت زینبؓ سے آنحضرت ﷺ نکاح فرما چکے تھے اور حجاب کے احکام سورۃ النور کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہو چکے تھے کیونکہ حضرت عائشہؓ نے صاف طور پر ذکر فرمایا ہے کہ چونکہ حضرت صفوانؓ احکام حجاب کے نزول سے پہلے مجھے دیکھ چکے تھے، اب جیسے ہی ان کی مجھ پر نظر پڑی تو انہوں نے مجھے پہچان لیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کے وقوع سے پہلے احکام حجاب نازل ہو چکے تھے اور احکامِ حجاب سورۃ الاحزاب میں نازل ہوئے تھے۔ ان دونوں قرائن کے پیشِ نظر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ سورۃ الاحزاب کا نزول سورۃ النور سے پہلے ہو چکا تھا۔ البتہ اس معاملے میں جس روایت کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب برسرِ منبر اس آدمی کے بارے میں شکوہ کیا جس نے اس واقعہ کو اچھال کر آنحضرت ﷺ کو اذیت پہنچانے میں انتہا کر دی تھی، تو حضرت سعد بن معاذؓ نے کھڑے ہو کر کہا کہ اگر وہ شخص ہمارے قبیلے سے ہے تو ہم ابھی اس کا سر حاضر کر دیتے ہیں اور اگر وہ قبیلۂ خزرج کا آدمی ہے تو پھر آپؐ ہمیں جو حکم دیں، ہم اس کی تعمیل کیلئے حاضر ہیں۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہؓ پر قبائلی عصبیت غالب آئی اور وہ سعد بن معاذؓ سے الجھ پڑے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد بن معاذؓ اس واقعہ کے وقت موجود تھے جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ غزوۂ خندق سے چند دن بعد ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگر سورۂ نور غزوۂ خندق اور سورۃ الاحزاب کے بعد نازل ہوئی ہوتی تو سعد بن معاذؓ کا پایا جانا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اپنے نزول میں سورۃ

Marfat.com

الاحزاب سے پہلے ہے، بعد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی راوی کے وہم کی وجہ سے پیدا ہوئی، کیونکہ یہی حدیث حضرت عائشہؓ سے ابن اسحاق نے بہ سند زہری عن عبداللہ بن عتبہ، عن عائشہ روایت کی ہے، تو اس میں سعد بن معاذؓ کے بجائے اسید بن حضیرؓ کا ذکر ہے۔ چنانچہ امام ابومحمد بن حزم فرماتے ہیں کہ بلاشبہ یہی صحیح ہے، اور سعد بن معاذ کا ذکر وہم ہے۔ (زادالمعاد۲/۱۱۵)

رہی یہ بات کہ دونوں سورتوں کے نزول کی تاریخ کیا ہے، تو محمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اور اس کی تائید بیشتر معتبر روایات کرتی ہیں کہ غزوۃ الاحزاب شوال ۵ ہجری کا واقعہ ہے اور غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۶ ہجری کا۔

تاریخی پس منظر

۵ ہجری میں غزوۂ خندق کا واقعہ پیش آیا جسے غزوۃ الاحزاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں قریش اور یہود نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر جزیرۂ عرب کے تمام قابلِ ذکر قبائل کو اسلام کے خلاف اکسا کر میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا جن کی تعداد 10 ہزار سے 24 ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ عرب میں کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوئی جس میں عربوں نے اتنی بڑی تعداد میں حصہ لیا ہو، لیکن اتنی بڑی تعداد بیشمار اسلحۂ جنگ اور اسلام کے خلاف ابلتے ہوئے غیض و غضب کے جذبات سے مسلح کئی روز تک سر پٹخنے کے باوجود عرب کی متحدہ قوت پر مشتمل یہ عظیم لشکر ناکامی کے زخم چاٹتا ہوا ایک رات مدینے کی فضاؤں سے غائب ہوگیا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو دشمن کے ایک سپاہی تک کا بھی وجود نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے ارشاد فرمایا **لن تغزوکم قریش بعد عامکم ھذا، ولکنکم تغزونھم** (ابن ہشام جلد۳، ص ۲۶۶) ''اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔'' یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اسلام کے دشمن بالخصوص قریش اپنی اقدامی قوت کھو چکے ہیں، اب وہ دفاعی لڑائی لڑیں گے، اب ان شاءاللہ تعالیٰ مسلمان کفر پر حملہ آور ہوں گے اور کفر کی طاقتیں جلد ہی سرنگوں ہو جائیں گی۔

دشمن اس بات کو اچھی طرح جان چکے تھے اور حدیبیہ کے معاہدے کے بعد انہیں مزید اس کا تجربہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز نہ افرادی قوت میں ہے، نہ اسلحۂ جنگ کی فراوانی میں اور نہ انہیں معاشی آسودگی میسر ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اندر قوت محسوس کرتے ہوں، ان کی قوت کا راز صرف ان کے بلند کردار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان، رسول اللہ ﷺ جیسی جامع شخصیت کی رہنمائی اور شہادت کا شوق، یہ وہ چیزیں ہیں جس نے ان کے اندر اولوالعزمی، بے داغ کردار اور تقویٰ اور للّٰہیت جیسی صفات پیدا کر دی ہیں جو ان کی کامیابیوں کی اصل ضمانت ہیں۔ اس لئے اگر ان سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو ان ہی صفات کی برابری میں کیا جاسکتا ہے اور یہ صفات چونکہ کفار اپنے اندر پیدا کرنے پر قادر نہیں تو اب مسلمانوں کو ناکام کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ان کے کردار کی عظمت کو عیب دار کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کی بلند کرداری اور خداخوفی نے جس طرح تمام عرب قبائل کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے اس کا تدارک اسی صورت میں ممکن ہے کہ بدنامیاں ان کے پیچھے لگا دی جائیں اور اس کا ہدف نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی، آپؐ کے بے عیب کردار اور آپؐ کے اہل خانہ کو بنایا جائے تاکہ باہر آپؐ کی عظمت گہنا کر رہ جائے اور گھر میں اپنی پاکیزہ صفت ازواج کے حوالے سے جو آسودگی آپ کو میسر ہے جس کے نتیجہ میں فقر و فاقہ میں بھی کبھی آپؐ کو پریشانی نہیں ہوتی اسے بدگمانی اور شک وارتیاب کی نذر کر دیا جائے۔ چنانچہ قریش اور یہود نے اس سوچی سمجھی سازش کو بروئے کار لاتے ہوئے حضرت زینبؓ کے مسئلے کو اٹھایا اور مرچ مسالہ لگا کر اس رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اتہامات اور الزامات کی اس شدت سے دھول اڑائی کہ آج تک تاریخ کے اوراق اس کے غبار سے خالی نہیں ہو سکے۔ اچھے اچھے مؤرخین بھی پراپیگنڈے کے زہر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ

Marfat.com

سکے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات کو نشانہ بنانے کے بعد اب آپؐ کے گھر کو نشانہ بنایا گیا اور ہوشیاری یہ کی گئی کہ اس خبیث مقصد کیلئے اس عظیم ذات کو چنا گیا جنہیں ایک طرف آنحضرت ﷺ کی محبوب بیوی ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور دوسری طرف وہ اس شخصیت کی صاحبزادی تھیں جسے مسلمانوں میں آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بعد سب سے زیادہ مرجعیت کا مقام حاصل تھا۔

قریش اور یہود نے اس سازش کو پروان چڑھانے کیلئے ان لوگوں کو چنا جو مدینے میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے ہر وقت مسلمانوں کے معاشرے میں بدگمانیوں اور اتہامات کا زہر پھیلا سکتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ کریم کی زبان میں منافقین کہا جاتا ہے۔ عبداللہ بن اُبَی ان کا سرغنہ تھا۔ اس کے اندر کا بغض اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اوس وخزرج کے لوگ اس کے بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کیلئے مونگوں کا تاج تیار کیا جارہا تھا کہ آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو اس کا سارا کھیل بکھیڑا ہوگیا۔ انصار کو آنحضرت ﷺ کی صورت میں دین ودنیا کی نعمتیں ہاتھ آئیں تو وہ اس کی طرف کیونکر متوجہ ہوتے۔ اس نے اپنی اس محرومی کا ذمہ دار آنحضرت ﷺ کو گردانا۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام لانے کے بعد بھی اس نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کیخلاف کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اب جیسے ہی اسے ایک موقع ہاتھ آیا تو اس نے اپنے اعوان وانصار کی مدد سے اس حد تک اسے شہرت دی کہ خود نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کیلئے بہت بڑا فتنہ بنادیا گیا۔ اگر آنحضرت ﷺ کی تربیت مسلمانوں کو نئی زندگی سے آشنا کر چکی ہوتی تو یہ فتنہ مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیرنے کیلئے کافی تھا۔ اس فتنے کو واقعۂ اِفک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ چونکہ غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر پیش آیا، اس لئے پہلے ہم غزوہ بنی المصطلق کی کچھ تفصیل عرض کرتے ہیں۔

غزوہ بنی المصطلق کی تفصیل

بنی المصطلق قبیلہ بنی خزاعہ کی ایک شاخ تھی جو ساحلِ بحر احمر پر جدے اور رابغ کے درمیان قدید کے علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے چشمے کا نام مریسیع تھا جس کے آس پاس اس قبیلے کے لوگ آباد تھے۔

شعبان ۶ ہجری میں نبی اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کیخلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپؐ ایک لشکرِ گراں لے کر ان کی طرف روانہ ہوگئے تا کہ فتنے کے سر اٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔ اس مہم میں عبداللہ بن ابی بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپؐ کے ساتھ ہوگیا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے۔ مریسیع کے مقام پر آنحضرت ﷺ نے اچانک دشمن کو جالیا اور تھوڑی سی زدوخورد کے بعد پورے قبیلے کو مال واسباب سمیت گرفتار کرلیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابھی لشکرِ اسلام اسی چشمے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم اور قبیلہ خزرج کے ایک حریف کے درمیان پانی پر جھگڑا ہوگیا۔ جھگڑے نے اگرچہ نامناسب صورت اختیار کرلی لیکن صحابہؓ نے پہنچ کر اس کو رفع دفع کرادیا، لیکن عبداللہ بن اُبی نے اس بات کو بتنگڑ بنا دیا اور مہاجرین کیخلاف ایسے نازیبا کلمات کہے جو کسی مسلمان کے منہ سے نہیں نکل سکتے تھے اور پھر آنحضرت ﷺ کے پاس جاکر ان سے مکر گیا، لیکن سورۂ منافقون نے اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فوراً لشکر کی روانگی کا حکم دے کر اس واقعہ کے اثر کو بہت حد تک ختم کردیا اور سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

Marfat.com

واقعۂ اِفک

عبداللہ بن ابی کا یہ شوشہ ابھی تازہ ہی تھا کہ ظالم نے اسی سفر میں ایک اور خطرناک فتنہ اٹھا دیا جسے واقعۂ اِفک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے جانثار صحابہؓ کمال درجہ ضبط و تحمل اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینے کی نوخیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ اب ہم اس واقعہ کی کچھ تفصیلات عرض کرتے ہیں۔ اس واقعہ کا ماحصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ سفر میں جاتے ہوئے ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے، جس کا قرعہ نکل آتا اسے ہمراہ لے جاتے۔ اس غزوہ میں قرعہ حضرت عائشہؓ کے نام نکلا۔ آپؐ انہیں ساتھ لے گئے۔ غزوے سے واپسی میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ حضرت عائشہؓ رفعِ حاجت کیلئے باہر گئیں اور اپنی بہن کا ہار جسے عاریۃً لے گئی تھیں کھو بیٹھیں۔ احساس ہوتے ہی فوراً اس جگہ واپس گئیں جہاں ہار غائب ہوا تھا۔ اسی دوران وہ لوگ آئے جو آپؐ کا ہودج اونٹ پر لادا کرتے تھے انہوں نے سمجھا آپ ہودج کے اندر تشریف فرما ہیں۔ اس لئے اسے اونٹ پر لاد دیا۔ حضرت عائشہؓ ابھی نوعمر تھیں، بدن موٹا اور بوجھل نہ تھا۔ نیز چونکہ کئی آدمیوں نے مل کر ہودج اٹھایا تھا اس لئے بھی ہلکے پن پر تعجب نہ ہوا۔ اگر صرف ایک یا دو آدمی اٹھاتے تو انہیں ضرور محسوس ہو جاتا۔

بہر حال حضرت عائشہؓ ہار ڈھونڈ کر قیام گاہ پہنچیں تو پورا لشکر جا چکا تھا اور میدان بالکل خالی پڑا تھا۔ نہ کوئی پکارنے والا تھا نہ جواب دینے والا۔ وہ اس خیال سے وہیں بیٹھ گئیں کہ لوگ انہیں نہ پائیں گے تو پلٹ کر وہیں تلاش کرنے آئیں گے لیکن اللہ اپنے امر پر غالب ہے وہ جو تدبیر چاہتا ہے کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئیں۔ پھر صفوان بن معطلؓ کی یہ آواز سن کر بیدار ہوئیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن رسول اللہ ﷺ کی بیوی......؟ وہ پچھلی رات کو چلا آ رہا تھا۔ صبح کو اس جگہ پہنچا جہاں آپؓ موجود تھیں۔ انہوں نے جب حضرت عائشہؓ کو دیکھا تو پہچان لیا، کیونکہ وہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے انہیں دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھی اور اپنی سواری بٹھا کر حضرت عائشہؓ کے قریب کر دی۔ حضرت عائشہؓ اس پر سوار ہو گئیں۔ حضرت صفوان نے اِنَّا لِلّٰہِ کے سوا زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ سواری کی نکیل تھامی اور پیدل چلتے ہوئے لشکر میں آ گئے۔ یہ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور لشکر پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ انہیں اس کیفیت کے ساتھ آتا دیکھ کر مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز پر تبصرہ کیا اور اللہ کے دشمن خبیث عبداللہ بن اُبی کو بھڑاس نکالنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ چنانچہ اس کے پہلو میں نفاق اور حسد کی جو چنگاری سلگ رہی تھی اس نے اس کے کربِ پنہاں کو عیاں اور نمایاں کر دیا یعنی بدکاری کی تہمت تراش کر واقعات کے تانے بانے بنتا تہمت کے خاکے میں رنگ بھرنا اور اسے پھیلانا بڑھانا اور ادھیڑنا اور بننا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھی بھی اسی بات کو بنیاد بنا کر اس کا تقرب حاصل کرنے لگے اور جب مدینہ آئے تو ان تہمت تراشوں نے خوب جم کر پروپیگنڈا کیا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ خاموش تھے، کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن جب لمبے عرصے تک وحی نہ آئی تو آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے علیحدگی کے متعلق اپنے خاص صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے صراحت کئے بغیر اشاروں اشاروں میں مشورہ دیا کہ آپؐ ان سے علیحدگی اختیار کر کے کسی اور سے شادی کر لیں لیکن حضرت اسامہؓ وغیرہ نے مشورہ دیا کہ آپؐ انہیں اپنی زوجیت میں برقرار رکھیں اور دشمنوں کی بات پر کان نہ دھریں۔ اس کے بعد آپؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر عبداللہ بن اُبی کی ایذا رسانیوں سے نجات دلانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر حضرت اسید بن حضیرؓ نے اس کے قتل کی اجازت چاہی لیکن حضرت سعدؓ بن عبادہ پر جو عبداللہ بن اُبی کے قبیلہ خزرج کے سردار تھے، قبائلی حمیت غالب آ گئی اور دونوں حضرات میں ترش کلامی ہو گئی جس کے نتیجے میں دونوں قبیلے بھڑک اٹھے۔ رسول اللہ ﷺ نے خاصی مشکل سے انہیں خاموش کیا، پھر خود بھی خاموش ہو گئے۔

Marfat.com

ادھر حضرت عائشہؓ کا حال یہ تھا کہ وہ غزوے سے واپس آتے ہی بیمار پڑ گئیں اور ایک مہینے تک مسلسل بیمار رہیں۔ انہیں اس تہمت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ انہیں یہ بات کھٹکتی رہتی تھی کہ بیماری کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جو لطف وعنایت ہوا کرتی تھی اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ بیماری ختم ہوئی تو وہ ایک رات امِّ مسطح کے ہمراہ قضائے حاجت کیلئے میدان میں گئیں۔ اتفاق سے امِ مسطح اپنی چادر میں پھنس کر پھسل گئیں اور اس پر انہوں نے اپنے بیٹے کو بد دعا دی۔ حضرت عائشہؓ نے اس حرکت پر انہیں ٹوکا تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کو یہ بتلانے کیلئے کہ میرا بیٹا بھی پروپیگنڈے کے جرم میں شریک ہے تہمت کا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عائشہؓ نے واپس آ کر اس خبر کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ سے والدین کے پاس جانے کی اجازت چاہی، اجازت پا کر والدین کے پاس تشریف لے گئیں اور صورتحال کا یقینی طور پر علم ہو گیا تو بے اختیار رونے لگیں اور پھر دو راتیں اور ایک دن روتے روتے گزر گیا۔ اس دوران نہ نیند کا سرمہ لگایا نہ آنسو کی جھڑی رکی۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ روتے روتے کلیجہ شق ہو جائے گا۔ اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ کلمۂ شہادت پر مشتمل خطبہ پڑھا اور امابعد کہہ کر فرمایا "اے عائشہؓ مجھے تمہارے متعلق ایسی اور ایسی بات کا پتا لگا ہے۔ اگر تم اس سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ عنقریب تمہاری براءت ظاہر فرما دے گا اور اگر خدانخواستہ تم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو تم اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو اور توبہ کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔"

اس وقت حضرت عائشہؓ کے آنسو ایک دم تھم گئے اور اب انہیں آنسو کا ایک قطرہ بھی محسوس نہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ آپؐ کو جواب دیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے خود ہی کہا "واللہ میں جانتی ہوں کہ یہ بات سنتے سنتے آپ لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گئی ہے اور آپ لوگوں نے اسے بالکل سچ سمجھ لیا ہے۔ اس لئے اب اگر میں یہ کہوں کہ میں بری ہوں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں بری ہوں تو آپ لوگ میری بات سچ نہ سمجھیں گے اور اگر میں کسی بات کا اعتراف کر لوں ...... حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں ...... تو آپ لوگ صحیح مان لیں گے۔ ایسی صورت میں واللہ میرے لئے اور آپ لوگوں کیلئے وہی مثل ہے جسے حضرت یوسف علیہ السلام کے والد نے کہا تھا کہ:

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝ ۱۸:۱۲

اس کے بعد حضرت عائشہؓ دوسری طرف جا کر لیٹ گئیں اور اسی وقت رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ پھر جب آپؐ سے نزولِ وحی کی شدت و کیفیت ختم ہوئی تو آپؐ مسکرا رہے تھے اور آپؐ نے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ اے عائشہؓ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بری کر دیا۔ اس پر (خوشی سے) ان کی ماں بولیں (عائشہ!) حضورؐ کی جانب اٹھو (شکریہ ادا کرو)۔ انہوں نے اپنے دامن کی براءت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پر اعتماد و وثوق کے سبب قدرے ناز کے انداز میں کہا "واللہ میں تو ان کی طرف نہ اٹھوں گی اور صرف اللہ کی حمد کروں گی۔"

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

جب واقعۂ اِفک سے مدینے کے معاشرے میں ایک ہلچل برپا ہوئی تو یہ سورۃ اخلاق، معاشرت اور قانون کے ایسے احکام و ہدایات کے ساتھ نازل فرمائی گئی جن کا مقصد یہ تھا کہ اول تو مسلمان معاشرے میں اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کے فیضِ صحبت کے نتیجہ میں ایسا ماحول پیدا ہونا چاہئے جس میں اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کا پیدا ہونے کا امکان کم سے کم ہو۔ لیکن اگر ایسی کوئی خرابی اور بد اخلاقی پیدا ہو ہی جائے تو پھر اس کا پورا پورا تدارک کیا جائے اور ہر صاحبِ نظر جانتا ہے کہ اخلاق کی تعمیر اور بد اخلاقیوں کا

Marfat.com

تدارک صرف حُسنِ اخلاق کی ترغیب، تزکیۂ نفوس اور ماحول کو پاکیزہ کرنے والی کاوشوں سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے ایسے قوانین بھی نافذ کئے جاتے ہیں جوان طبیعتوں کو راہِ راست پر رکھنے میں ممدومعاون ثابت ہوں جو ترغیب سے زیادہ ترہیب سے اثر قبول کرتے ہیں۔

چنانچہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے زنا انتہائی بداخلاقی اور اسلامی معاشرت اور تہذیب کو تباہ کردینے والی چیز ہے۔ اس لئے سب سے پہلے زنا کے جرم کی سزا بیان فرمائی اور اسے فوجداری جرم قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا۔ کسی مسلمان کیلئے کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی مومنہ کیلئے کسی زانی یا مشرک سے نکاح کی ممانعت کردی گئی۔

اس کے بعد قذف کی سزا اور اس کیلئے شہادت کا قانون بیان کیا گیا یعنی جو شخص دوسرے پر زنا کا الزام لگائے، اسے قذف کہا جاتا ہے اور پھر ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کرسکے اس کیلئے 80 کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

معاشرے میں جب خدا خوفی کم ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے تو جس طرح دوسروں کی عزتوں سے کھیلنا ایک معمول بن جاتا ہے اسی طرح اپنی گھریلو تلخیوں میں بھی اخلاقی تہمتیں باندھنا بہت ہلکی بات سمجھ لی جاتی ہے۔ چنانچہ اس انتہائی غیر سنجیدہ رویئے کو جو انتہائی بداخلاقی کا نتیجہ ہوتا ہے، روکنے کیلئے چھٹی سے دسویں آیت تک لعان کا قانون بیان کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور اپنے الزام کو ثابت کرنے کیلئے شریعت کی مطلوبہ شہادت پیش نہ کرسکے تو اس کا فیصلہ فریقین کی قسم سے ہوگا۔ اس قسم کے طریقہ کی وضاحت کی گئی۔

آیت 11 سے 26 تک حضرت عائشہؓ پر لگائی گئی تہمت کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ آنکھیں بند کرکے ہر شریف شخص کیخلاف ہر قسم کی تہمتیں قبول کرلینا بیمار اخلاق کی علامت ہے۔ اس رویئے سے ان لوگوں کو اپنا کام کرنے میں سہولت پیدا ہوجاتی ہے جو مسلمان معاشرے میں بدگمانیاں پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو افواہیں پیدا کرنے اور پھیلانے کی ہر کوشش کا سدِ باب کرنا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ ان منافقین کا بھی پردہ اٹھایا گیا ہے جنہوں نے اس فتنے کو اٹھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور ان مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے جنہوں نے اس معاملے میں بے پرواہی اور سہل انگاری سے نادانستہ منافقین کے مقصد کو تقویت پہنچائی اور آئندہ ان منافقین سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی گئی۔ اسی سلسلے میں ایک اصولی بات بھی سمجھائی گئی کہ طیب آدمی کا جوڑ طیب عورت سے ہی لگ سکتا ہے۔ خبیث عورت سے اس کا مزاج چند روز بھی موافقت نہیں کرسکتا۔ اور ایسا ہی حال طیب عورت کا ہوتا ہے۔ اس کی روح طیب مرد سے ہی سے موافقت کرسکتی ہے نہ کہ خبیث سے۔ اس اصول کو سامنے رکھئے اور پھر تصور کیجئے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کس عظیم شخصیت کی رفیقۂ حیات ہیں۔ وہ نہ صرف طیب ہیں بلکہ اطیب ہیں۔ ان کا احساس دنیا کے ہر پاکیزہ آدمی کے احساس سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ آپ ایک ایسی خاتون کو رفاقتِ حیات کیلئے منتخب ہی نہیں کرسکتے، اگر کرلیں تو شاید چند روز سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتے جس کے اندر اخلاقی خباثت کی بدبو پائی جاتی ہو اور ادھر حال یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نہ صرف آپؐ کے دنیا میں قیام کے آخری لمحے تک آپؐ کی رفیقۂ حیات رہیں بلکہ آپؐ کی محبوب ترین رفیقۂ حیات رہیں۔ اور پھر یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ الزام لگانے والا کون ہے اور الزام کس پر لگا رہا ہے۔

یہ بھی ایک ضابطہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلم معاشرے میں اجتماعی تعلقات کی بنیاد باہمی حُسنِ ظن پر ہونی چاہئے۔ ہر شخص بے گناہ سمجھا جائے جب تک اس کے گنہگار ہونے کا ثبوت نہ ملے۔ نہ یہ کہ ہر شخص گنہگار سمجھا جائے جب تک اس کا بے گناہ ہونا ثابت نہ ہوجائے۔

Marfat.com

(آیت 27 تا 31) میں گھروں میں آنے جانے کی تہذیب سکھائی گئی۔ اگر کسی مسلمان بھائی کو کسی مسلمان بھائی کے گھر میں جانے کی ضرورت پیش آئے تو وہ بے تکلف گھر میں گھسنے کی کوشش نہ کرے بلکہ چند معین ضابطوں کی پابندی کرے تاکہ گھروں کے اندر بدنگاہی اور شیطان کو دراندازی کی راہ نہ ملے، پھر ان ضوابط کی تفصیل بیان کی گئی۔ مثلاً عورتوں اور مردوں کو غضِ بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھورنے یا جھانک تاک کرنے سے منع کر دیا گیا۔ عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں سر اور سینہ ڈھانپ کر رکھیں، عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے محرم رشتہ داروں اور گھر کے خادموں کے سوا کسی کے سامنے زیب وزینت کے ساتھ نہ آئیں۔ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چھپا کر نکلیں بلکہ ایسے زیور پہن کر نہ نکلیں جو چلنے سے بج اٹھتے ہوں۔

(آیت 32 تا 34) عقدِ بیوگان اور لونڈیوں وغلاموں کے نکاح کی تاکید کی گئی، معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا تاکہ معاشرہ شیطان کی رخنہ اندازیوں سے محفوظ رہے، کیونکہ تجرد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مجرد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے میں ہی دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ غلاموں کو آزادوں کی سطح پر لانے اور غلامی کو ختم کرنے کیلئے مکاتبت کی ہدایت کی گئی اور مکاتبت کے طلبگار غلاموں کی مالی امداد کی تاکید کی گئی۔ اسی طرح لونڈیوں سے کسب کرانے کی شدت سے ممانعت کی گئی۔ عرب میں یہ پیشہ لونڈیوں سے کرانے کا رواج تھا۔ اس لئے اس کی ممانعت دراصل قحبہ گری کی قانونی بندش تھی۔

گھریلو معاشرت میں مزید پاکیزگی پیدا کرنے کیلئے خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کیلئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں (یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت) کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں، اولاد تک کو اجازت لے کر اندر آنے کا حکم دیا گیا۔ البتہ بوڑھی عورتوں کو رعایت دی گئی کہ وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اتار کر رکھ دیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن بہتر اسی کو قرار دیا گیا کہ وہ بڑھاپے میں بھی سروں پر اوڑھنیاں رکھیں اور بن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے سے پرہیز کریں۔

اسی طرح اسلامی معاشرت کے سلسلے میں اور بھی چند ہدایات دی گئیں۔ اس طرح سے معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ ان کے اندر پہلے سے موجود طبقات کی حوصلہ شکنی کی گئی اور ان طبقات کے نتیجے میں جو بیگانگی پیدا ہوتی ہے اس کے پردے ہٹا دیئے گئے تاکہ آپس کی محبت بڑھے اور باہمی اخلاص کے رابطے ان رخنوں کو بند کر دیں جن سے کوئی فتنہ پرداز پھوٹ ڈال سکتا ہو۔

تمثیل کے ذریعے ایمان اور کفر کی وضاحت کی گئی۔ دلائلِ آفاق کی روشنی میں ایمان کی دعوت دی گئی اور ہدایت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ سے ہی اپنی عبادت واطاعت کو خالص رکھا جائے، کسی اور کو اس میں شامل کر کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق نہ بنایا جائے۔ منافقین کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے عقیدے اور عمل میں جس دو عملی کا شکار ہیں اس سے توبہ کریں۔ جب تک اندر یکسوئی پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک وہ فوز وفلاح کے راستے کے مسافر نہیں بن سکتے۔ اصل چیز ایمان اور اطاعت میں اخلاص ہے، جھوٹی قسموں کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔

مخلص مسلمانوں کو نہایت واضح الفاظ میں زمین کی خلافت کی بشارت دی گئی اور بتایا گیا کہ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ خوف کی حالت کو امن واطمینان سے بدل دے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٦٤	سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ (٢٤)	رُكُوْعَاتُهَا ٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ (١) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ
جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ (٢) اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ
لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (٣)
وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٤) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ
اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥) وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ
شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (٦) وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ

Marfat.com

اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٧ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ
اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٨ ۙ
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٩
وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝١٠ ع

رکوع: ۱۔ (یہ ایک اہم سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکامات ہم نے فرض ٹھہرائے ہیں اور ہم نے اس میں نہایت واضح آیات اتاری ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ ۱) (زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور چاہئے کہ ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔ ۲) (زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر زانیہ یا مشرکہ سے، اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک اور حرام کر دیا گیا ہے یہ اہلِ ایمان پر۔ ۳) (اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔ ۴) مگر ان میں سے وہ لوگ جو توبہ کرلیں اس بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔ ۵) (اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے۔ ۶) اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہو۔ ۷) اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص اپنے الزام میں جھوٹا ہے۔ ۸) اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہو اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ ۹) اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا دانا ہے۔ ۱۰)

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝١

(یہ ایک اہم سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکامات ہم نے فرض ٹھہرائے ہیں اور ہم نے اس میں نہایت واضح آیات اتاری ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ ۱)

Marfat.com

آغاز میں تین اہم نکات

اس سورۃ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے غیر معمولی طریقے سے کیا جارہا ہے۔اس کا اندازِ بیان وہ ہے جو کسی آئین اور دستور کا ہوتا ہے۔ اَنْزَلْنٰهَا کا لفظ اپنے اندر ایک خاص تمکنت اور جلال رکھتا ہے۔قرآنِ کریم کا ایک ایک حرف اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے لیکن کسی سورۃ کے آغاز میں یہ اسلوب اختیار نہیں فرمایا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انسانوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ اس سورۃ کو محض ایک نصیحت نہ سمجھنا جس میں کسی حوالے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ دستور کی ایک دفعہ ہے جسے ہم نے بطورِ خاص انسانی اصلاح کیلئے نازل کیا ہے۔اس میں اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور کبریائی نظر آتی ہے جس سے دل و دماغ پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے تو دوسری طرف انسانی اصلاح کیلئے اس کا ناگزیر ہونا بھی واضح ہوجاتا ہے۔

مزید فرمایا کہ ہم نے اسے فرض کیا یعنی اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی حیثیت سفارشات کی نہیں بلکہ قطعی احکام کی ہے اور یہ احکام بھی رب العالمین کے ہیں جو احکم الحاکمین بھی ہے اس لئے کوئی مسلمان انفرادی طور پر یا مسلمانوں کا کوئی ملک اجتماعی طور پر اس کی اہمیت، افادیت اور قطعیت سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

تیسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ جو ہدایات اس سورۃ میں دی جارہی ہیں ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔صاف صاف اور کھلی کھلی ہدایات ہیں جن کے متعلق تم یہ عذر نہیں کرسکتے کہ فلاں بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی تو ہم عمل کیسے کرتے۔ان آیات کی حیثیت تنبیہات کی بھی ہے کیونکہ اس میں خاندان، معاشرہ، تعزیرات اور حدود کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں وہ پچھلی امتوں کیلئے آزمائش کا سبب ثابت ہوئے جن کی وجہ سے وہ امتیں خدا کے عتاب کا شکار ہوئیں۔یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے احکام کے ساتھ ساتھ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بھی بار بار آگاہ فرمایا تاکہ لوگ اس کی طرف سے غفلت کا شکار نہ ہوں۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور چاہئے کہ ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔ ۲)

زنا کی سزا

اسلامی معاشرے کو ہر طرح کے شیطانی اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے جس طرح تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس کا اہتمام کیا گیا ہے اسی طرح انسانوں کی جان مال اور عزت و عصمت کی حفاظت کیلئے ایسے قوانین نافذ کئے ہیں جس سے امکانی حد تک انسانی جان و مال اور ناموس کی حفاظت ہوجاتی ہے۔اسلامی قانون کی رو سے اگر کوئی شخص کسی کی جان کو تلف کرتا ہے تو اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور اگر کسی کے مال پر دست اندازی کرتا ہے تو اسے قطعِ ید کی سزا دی جاتی ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت و ناموس کو داغدار کرتا ہے تو اسے دُروں یا رجم کی سزا دی

Marfat.com

جاتی ہے۔ اسلام نے اپنی سزاؤں میں دو باتوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ پہلی یہ بات کہ مجرم نے جو جرم کیا ہے اس جرم کی نوعیت، شناعت اور اثراندازی کے مطابق اسے سزا دی جائے۔ اور دوسری یہ بات کہ جن لوگوں میں جرائم کے ارتکاب کا میلان پایا جاتا ہے وہ اس خوفناک سزا سے ڈر کر جرم کے ارتکاب کی جرأت نہ کریں اور یہ سزا ایسی عبرت کا سامان بن جائے کہ لوگ ہمیشہ اسے یاد رکھیں۔ ان جرائم میں زنا ایک ایسا ہی جرم ہے، اس آیتِ کریمہ میں ایسی ہی سزا تجویز کی گئی ہے۔

جرمِ زنا کی سنگینی

زنا کی تعریف میں فقہی بحثوں سے قطع نظر جو عام بات کہی جاسکتی ہے اور جسے سب تسلیم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زنا یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت بغیر اس کے کہ ان کے درمیان جائز رشتۂ زن وشو ہو، باہم مباشرت کا ارتکاب کریں۔ اور یہ ایسا جرم ہے جس کی شناعت اور برائی تمام مذاہب اور تمام معاشروں میں مسلم رہی ہے۔ بجز تاریخ کے ان ادوار کے جس میں محدود طور پر بعض غلط قسم کے نام نہاد مصلحین نے انسانی معاشرت کے اصولوں کو بگاڑا جن میں مانی اور مزدک کے نام معروف ہیں اور قریبی تاریخ میں ڈاکٹر فرائڈ بین ان کا وکیل گزرا ہے، ورنہ انسانوں میں بڑی بڑی قباحتیں پیدا ہوئیں اور اقدارِ انسانیت میں عجیب وغریب تبدیلیاں عمل میں آئیں، لیکن جہاں کہیں بھی مذہب اور اخلاق کی روح زندہ رہی ہے زنا کو انتہائی مکروہ فعل سمجھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوعِ انسانی کی بقا اور انسانی تمدن کا قیام دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کیلئے ملنے اور پھر الگ ہوجانے میں آزاد نہ ہوں بلکہ یہ انتہائی نازک اور پرائیویٹ تعلق مرد اور عورت میں اس وقت پیدا ہونا چاہئے جب وہ اس عہدِ وفا کو ان بنیادوں پر استوار کریں جو ایک مہذب اور محتاط معاشرے میں معلوم ومعروف ہوں۔ اگر اس نازک تعلق کو کسی عہدِ وفا کی استواری اور کسی ذمہ داری کے احساس کے بغیر کھلا چھوڑ دیا جائے تو پھر انسان اور حیوان میں بنیادی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ حیوان مذکر ومونث کے فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان میں بھی توالد اور تناسل کا سلسلہ چلتا ہے لیکن ان میں کوئی بھی اولاد کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور تمدن کے بناؤ سنوار کے احساس سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ ایک جنسی ضرورت ہے جو انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور پھر انہیں الگ کردیتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک جنگل کا ماحول اور جنگل کی زندگی پیدا ہوتی ہے لیکن تہذیب وتمدن کا نام تک نہیں ہوتا۔ انسان کا اپنی فطرت اور مقصد کے حوالے سے تہذیب اور تمدن سے گہرا رشتہ ہے بلکہ یہی اس کی بنیاد ہے۔ یہ اگر جنسی میلانات کے اعتبار سے حیوانی سطح پر اتر جاتا ہے تو تمدن اور تہذیب کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو الگ ہے خود نسلِ انسانی بنیادی خصوصیات سے محروم ہوجاتی ہے۔ انسان کا بچہ ایک خاص عمر تک ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کا شدت سے محتاج ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کی جسمانی دیکھ بھال اور اس کی ضروریات کی فراہمی سٹیٹ سرانجام دے سکے لیکن اس کی ذہنی نشوونما موسم کے شدائد سے بچاؤ ناموافق ماحول اور غلط صحبت کے اثرات سے تحفظ اور اس کے ذہنی میلان کے مطابق درجہ بدرجہ اور عہد بعہد رہنمائی سٹیٹ انجام نہیں دے سکتی، اس کیلئے گہری دلسوزی، ہمدردی، شفقت، محبت بلکہ جان سوزی کی ضرورت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ نے والدین میں رکھی ہے۔ زنا کا جواز اور ان بندھنوں کا ٹوٹ جانا جو اس فعل بد کے راستے میں حائل ہیں انسانیت کیلئے ایک ایسی کاری ضرب ہے جس کے زخموں سے انسانیت کو کبھی اندمال نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام نے اسے فوجداری جرم بنانے سے پہلے ان تمام سوتوں کو بند کرنے کی کوشش کی ہے جہاں سے جنس کو آوارگی کی غذا ملتی ہے۔

Marfat.com

حدود سے اسلام کا منشا

درحقیقت اسلام کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روز ان پر کوڑے برسانے کیلئے ٹکٹکیاں لگی رہیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان کو اتنا مہذب اور اتنا متقی بنا دیا جائے کہ حتی الامکان اس جرم کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ اس لئے وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بٹھاتا ہے۔ اسے آخرت کی بازپرس کا احساس دلاتا ہے۔ جس سے مرکر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ اس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ پھر اسے متنبہ کرتا ہے کہ بے حیائی اور بدکاری ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت بازپرس فرمائے گا، لیکن پروردگار سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ اس نے انسان کے نظم وضبط میں کمزوریاں بھی رکھی ہیں اور یہی اس کے امتحان کا باعث بھی ہیں۔ ان کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ہر مومن کو نکاح کا حکم دیتا ہے اور پھر اس کیلئے ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ مغرب نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اس لئے وہ اعتراض کرتا ہے ورنہ حقیقت میں تطہیر کے اس عمل کا یہ حصہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک بیوی سے تسکین نہ ہو تو اسلام چار چار تک سے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے۔ میاں بیوی میں سازگاری پیدا نہ ہو تو رنجھ رنجھ کر مرنے کی بجائے مرد کیلئے طلاق اور عورت کیلئے خلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے اور ناموافقت کی صورت میں خاندانی پنچایت سے لے کر سرکاری عدالت تک سے رجوع کا راستہ کھول دیتا ہے تاکہ یا تو مصالحت ہو جائے اور یا پھر زوجین ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جہاں مناسب سمجھیں نکاح کر لیں۔ اسی طرح اس نے مردوں اور عورتوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا ہے اور ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں کے نکاح کر دیئے جائیں۔ وہ معاشرے سے ان اسباب کا خاتمہ کر دیتا ہے جو زنا کے محرکات سمجھے جاتے ہیں اور جن کی متعدد شکلیں ہیں اور ہر مہذب اور صالح معاشرہ انہیں پہچانتا ہے۔ البتہ وہ معاشرہ جو جنسی آلودگیوں میں بری طرح لت پت ہو گیا ہو اس کیلئے بڑے سے بڑا محرک بھی فنون لطیفہ کا ایک ورق ہوتا ہے۔ مزید ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے نبی کریم ﷺ کے گھر کو نمونے کا گھر قرار دیتے ہوئے بناؤ سنگھار کی پابندی لگائی، گھر میں وقار اور سکینت سے رہنے کا حکم دیا، نقاب اور حجاب کو لازم ٹھہرایا، عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت پر پابندی لگا دی گئی، عورت کے بن سنور کر باہر نکلنے کو روک دیا گیا۔ ان تفصیلات کو دیکھتے ہوئے آسانی سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلام اپنی اصلاحی کوششوں سے پہلے اپنے معاشرے کو سفلی جذبات اور بے ہودہ محرکات سے صاف کرتا ہے اور تربیت کے زور سے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ پیدا کرتا ہے، لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی جوڑا حرام فعل کا ارتکاب کرتا ہے اور وہ بھی اس قدر جسارت کے ساتھ کہ موقع پر چار گواہ اسے دیکھ لیتے ہیں تو پھر اس کیلئے وہ سزا مقرر کی گئی ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اسلام اور دیگر مذاہب میں اس جرم کی حقیقت میں فرق

ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام نے عورت اور مرد کے ہر ناجائز تعلق کو جو مباشرت پر منتج ہوتا ہے زنا قرار دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ دونوں کنوارے ہوں یا شادی شدہ ہوں یا ان میں سے ایک کنوارہ ہو اور ایک متزوج ہو اور یہ حرکت باہمی رضامندی سے ہو یا بالجبر ہو، ہر صورت میں یہ فعلِ بد اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حد سے تجاوز اور انسانی نسب اور تمدن کو تباہ و برباد کر دینے کی ایک کوشش ہے جسے اسلام کسی طور برداشت نہیں کرتا۔ اس لئے وہ ہر صورت میں فعل کو قانوناً مستلزم سزا قرار دیتا اور اسے فوجداری جرم ٹھہراتا ہے۔ لیکن باقی مذاہب اور معاشروں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس جرم کی شناعت اور اس کے مستلزم سزا ہونے سے اختلاف کیا ہے۔ اگر ایک مرد اور عورت باہمی

Marfat.com

رضامندی سے منہ کالا کرتے ہیں تو مغرب تو اسے جدید تہذیب کی علامت قرار دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اسے جوانی کی خوش فعلیوں میں شمار کرتا ہے۔ البتہ دوسرے مذاہب اور معاشرے اسے کسی حد تک ایک غلط کام تو سمجھتے ہیں لیکن اس کیلئے کسی سزا کو تجویز کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ ان کے یہاں اگر کوئی فعل مستلزم سزا ہوسکتا ہے تو وہ یا تو یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی بیوی سے یہ حرکت کرے تو اس کیلئے مختلف قوانین میں مختلف سزائیں رکھی گئی ہیں، تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ زنا کیوں کیا گیا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ جس کی بیوی سے حرکت کی گئی ہے اس کا استحقاق مجروح ہوا اور اسے نقصان پہنچایا گیا ہے اور نقصان کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں اور یا پھر زنا کی وہ صورت مستلزم سزا ہے جس میں کسی مرد نے عورت کے ساتھ جبراً یہ حرکت کی ہو تو اس میں بھی قابلِ گرفت چیز زنا نہیں بلکہ جبر ہے لیکن اسلامی قانون جیسا کہ میں واضح کرچکا ہوں ان سب تصورات کے برعکس زنا کو بجائے خود ایک جرم مستلزم سزا قرار دیتا ہے، اور شادی شدہ ہوکر زنا کرنا اس کے نزدیک جرم کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ مجرم نے کسی سے عہد شکنی کی یا کسی دوسرے کے بستر پر دست درازی کی ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے خواہشات کو پورا کرنے کا جائز ذریعہ مہیا کیا تھا، اس کے باوجود اس نے ناجائز راستہ اختیار کیا۔ اسلامی قانون زنا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کی اگر آزادی ہو جائے تو ایک طرف نوعِ انسانی کی اور دوسری طرف تمدنِ انسانی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

اس جرم کی شدت اور زہرناکی کی وجہ سے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قانونی انداز میں اس کی سزا کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ عورتوں کے مخصوص احکام کے علاوہ وہ احکام جو مرد و عورت دونوں کیلئے مشترک ہیں ان کیلئے براہ راست مردوں سے خطاب کرتا ہے، عورتوں کا ذکر اس کے تابع سمجھا جاتا ہے اور یا کہیں کہیں کسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن اس صورت میں بھی مردوں کا ذکر مقدم ہوتا ہے اور عورتوں کا مؤخر۔ ایسی کوئی مثال قرآنِ کریم میں نہیں ملتی جہاں عورتوں کا ذکر مردوں سے پہلے ہو حتیٰ کہ حدِ سرقہ میں بھی مرد چوری کرنے والے کا ذکر پہلے ہے اور عورت کا بعد میں۔

عام معمول سے ہٹ کر عورتوں سے خطاب کی وجہ

لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں زانیہ کا ذکر پہلے آیا ہے اور زانی کا بعد میں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح مرد کو اللہ تعالیٰ نے کسب اور اکتساب اور حصولِ معاش کے کثیر مواقع عطا کئے ہیں ان کے باوجود بھی اگر وہ چوری کرتا ہے تو یہ بہت سنگین معاملہ ہے اس لئے اس کی چوری کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عورت میں حیاء اور شرم و حیاء کا مادہ مرد کی نسبت بہت زیادہ رکھا ہے۔ پھر حجاب اور نقاب کی پابندیوں اور گھروں میں پردہ نشیں رہنے کے باعث بگاڑ کے اسباب مرد کی نسبت کم ہوتے ہیں۔ با ایں ہمہ عورت اگر ایسے مکروہ فعل کا ارتکاب کرتی ہے تو یہ اس کی فطرت، اس کے ماحول اور اس کے مخصوص حالات کی وجہ سے ایک بڑا سنگین مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس بناء پر پروردگار نے اس کی سزا کا ذکر پہلے فرمایا ہے۔

زنا کی سزا کے حکم میں تدریج

سورۃ النور کے نازل ہونے سے پہلے سورۃ النساء میں زنا کی برائی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کا ذکر پہلے ہے اور مرد کا بعد میں۔ اور دوسری یہ بات کہ وہاں اس جرم کو فوجداری جرم قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کی حیثیت ایک معاشرتی یا خاندانی جرم کی تھی جس پر اہلِ خاندان ہی کو بطورِ خود سزا دینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ جس طرح حرمتِ خمر کا حکم تین مراحل میں بتدریج نازل ہوا، اسی طرح زنا کے احکام بھی تین مراحل میں مکمل ہوئے۔ سورۃ النساء کا حکم نسبتاً ہلکا تھا اور اسے قانونی جرم قرار نہیں دیا گیا تھا کہ

Marfat.com

قانون اسے اپنی گرفت میں لیتا اور عدالت اسے سزا دیتی۔ لیکن سورۃ النور کے نازل ہونے کے بعد اسے قانونی جرم بنا دیا گیا اور فوجداری جرم قرار دیتے ہوئے قابلِ دست اندازیِ سرکار قرار دے دیا گیا، لیکن سورۃ النساء ہی کی وہ آیت جس میں سب سے پہلے زنا پر سزا تجویز کی گئی ہے اگر اسی سلسلہ آیات کو مسلسل پڑھا جائے تو فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ یعنی جب لونڈیاں قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر وہ زنا کریں تو ان کی سزا آزاد عورت کی سزا سے نصف ہوگی۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکاب زنا کی سزا بیان کی گئی ہے اور یہ وہی سزا ہے جس کا وعدہ سورۃ النساء کی محولہ بالا آیتِ کریمہ میں کیا گیا تھا۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے واضح طور پر اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ النور کے نزول کے بعد یوں کہنا چاہیئے کہ زنا کے تصور اور اس کی سزا کے دو مراحل مکمل ہوگئے، جن میں پہلا مرحلہ منسوخ ہوگیا، کیونکہ اب زنا کو قانونی جرم بنا دیا گیا اور خاندان اور معاشرے پر جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی وہ ریاست اور حکومت کے سپرد کر دی گئی۔

سزا کے تیسرے مرحلے کا ثبوت سنت ثابتہ سے

البتہ تیسرا مرحلہ ابھی باقی تھا وہ یہ کہ اگر کوئی غیر شادی شدہ مرد اور عورت اس مکروہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں تو انہیں تو سو سو کوڑے لگائے جائیں گے لیکن اگر شادی شدہ جوڑا یہ حرکت کرتا ہے تو اس کی سزا کیا ہوگی؟ اس کا جواب قرآنِ کریم کے ذریعے نہیں بلکہ اس ذاتِ عزیز کی زبان سے پروردگار نے دیا ہے جس پر قرآنِ کریم نازل ہوا ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں وہی قانونی وزن اس تشریح کا بھی ہے جو نبی کریم ﷺ کے قول و عمل سے منصۂ شہود پر آتی ہے۔ بشرطیکہ آپؐ کی تشریح معتبر ذرائع سے امت تک پہنچی ہو۔ جس نے بھی قرآنِ کریم کو گہری نظر سے پڑھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے فہمِ دین سے کچھ بھی حصہ عطا فرمایا ہے وہ اس بنیادی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر اس کا انکار کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ قرآنِ کریم پر اضافہ ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب پر کسی طرح کا بھی اضافہ حدیث اور سنت سے نہیں کیا جا سکتا تو یہ محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اپنی کتاب کا مبین اور شارح قرار دیا ہے اور کسی ٹیکسٹ کی شرح اور وضاحت وہی حیثیت رکھتی ہے جو ٹیکسٹ کے اصل متن کی ہوتی ہے اور قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم نے چوری کی سزا قطع ید کے مطلق الفاظ میں ذکر فرمائی۔ آنحضرت ﷺ کی تشریحات نے اسے قابلِ عمل صورت دی اور اگر ان تشریحات کو قبول نہ کیا جائے تو پھر ان الفاظ کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک سوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی کسی آدمی کو سارق قرار دے کر شانے کے پاس سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری کرنے والا ابھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ (پس جس شخص نے توبہ کر لی چوری کا ظلم کرنے کے بعد اور اپنی اصلاح کر لی تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے گا) اسی طرح قرآنِ کریم صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے اور رضاعی بیٹی کی حرمت آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ اور آج تمام امت اسے حتمی سمجھتی ہے۔ اسی طرح قرآن صرف دو بہنوں کو جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو آنحضرت ﷺ نے حرام قرار دیا۔ لیکن آج کوئی شخص بھی اسے قرآنِ کریم کے خلاف قرار نہیں دیتا۔ قرآن صرف اس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جب اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو، لیکن آنحضرت ﷺ کی تشریح نے یہ بات واضح کی کہ پرورش پانے کی قید اتفاقی ہے، احترازی نہیں۔ قرآنِ کریم صرف اس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے جبکہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ

Marfat.com

آ ئے جبکہ آج شریعت میں حضر میں اور کاتب کے قابلِ حصول ہونے کی صورت میں رہن کو جائز رکھا جاتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی تشریح نے اس کو واضح کیا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تشریح کی کیا حیثیت ہے اور نظامِ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے رسول کا یہ منصب مسلمہ ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد اس کے حکم کا منشاء واضح کرتا ہے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتاتا ہے اور یہ بات بھی واضح کرتا ہے کہ کن معاملات میں اس کا اطلاق ہوگا اور کن معاملات کیلئے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار دراصل اپنے اندر اتنی عملی قباحتیں رکھتا ہے جس کا کوئی شمار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے شادی شدہ مرد و عورت کیلئے رجم کی سزا مقرر فرمائی۔ اس کا حکم بھی دیا اور اپنے عمل سے اسے کر کے بھی دکھایا۔ اور آپ کے بعد چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دور میں یہی سزا نافذ کی، اور اس کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ مسلمانوں کے گمراہ فرقے خوارج اور بعض معتزلہ کے سوا کبھی کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور تمام زمانوں اور ملکوں کے فقہائے اسلام اس بات پر متفق رہے ہیں کہ یہ ایک سنت ثابتہ ہے اور خود آنحضرت ﷺ کے قول و عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ نے اپنے اس فیصلے کہ (شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے) کتاب اللہ کا فیصلہ قرار دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور زید بن خالد جہنیؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکے نے جو ایک شادی شدہ عورت کا ملازم تھا اس کے ساتھ زنا کیا۔ زانی لڑکے کا باپ اس کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نوجوان لڑکے نے واقعہ کا اقرار کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَاَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ "یعنی میں تم دونوں کے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔" پھر یہ حکم صادر فرمایا کہ زانی لڑکا چونکہ غیر شادی شدہ ہے اس کو سو کوڑے لگائے جائیں اور عورت جو شادی شدہ تھی اس کو رجم اور سنگسار کرنے کیلئے حضرت انیس کو حکم دیا۔ انہوں نے خود عورت سے بیان لیا، اس نے اعتراف کر لیا تو اس پر نبی کریم ﷺ کے حکم سے رجم کی سزا جاری کی گئی۔ (ابنِ کثیر)

اس کی مزید وضاحت کیلئے میں چاہتا ہوں کہ صحیح بخاری و مسلم سے حضرت فاروق اعظمؓ کا جو خطبہ بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے، ذکر کر دوں۔ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

قال عمر بن خطابؓ وهو جالس علىٰ منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله بعث محمدا صلى الله عليه وسلم بالحق وانزل عليه الكتاب فكان مما انزل الله عليه اية الرجم قرأناها و وعيناها و عقلناها فرجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل مانجد الرجم فى كتاب الله تعالىٰ فيضلوا بتركه فريضة انزلها الله وان الرجم فى كتاب الله حق على من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البينة او كان الحبل والاعتراف (مسلم ص ٦٥ ج ٢)

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا جبکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر تشریف رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپؐ پر کتاب نازل فرمائی تو جو کچھ کتاب اللہ میں آپؐ پر نازل ہوا اس میں آیتِ رجم بھی ہے جس کو ہم نے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا، پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی رجم کیا اور ہم نے آپؐ کے بعد رجم کیا، اب مجھے یہ خطرہ ہے کہ زمانہ گزرنے پر کوئی یوں نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو وہ ایک دینی فریضہ چھوڑ دینے سے گمراہ ہو جاویں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور سمجھ لو کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں حق ہے۔ اس شخص پر جو مردوں اور عورتوں میں سے محصن ہو یعنی شادی شدہ جبکہ اس کے زنا پر شرعی شہادت قائم ہو جائے یا حمل اور اعتراف پایا جائے۔

Marfat.com

یہ روایت صحیح بخاری میں بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ (بخاری ص۱۰۰۹ جلد۲) اور نسائی میں اس روایت کے بعض الفاظ یہ ہیں:

انا لانجد من الرجم بدا فانه حدمن حدود الله الاوان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد رجم ورجمنا بعده ولولا ان یقول قائلون ان عمرزاد فی کتاب الله مالیس فیه لکتبت فی ناحیة المصحف وشهد عمر بن الخطاب وعبدالرحمن بن عوف و فلان و فلان ان رسول الله صلی الله علیه وسلم رجم ورجمنا بعده الحدیث (ابن کثیر)

زنا کی سزا میں ہم شرعی حیثیت سے رجم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد ہے خوب سمجھ لو کہ رسول اللہ ﷺ نے خود رجم کیا اور ہم نے آپؐ کے بعد بھی رجم کیا۔ اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ کہنے والے کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا ہے تو میں قرآن کے کسی گوشہ میں بھی اس کو لکھ دیتا اور عمر بن خطاب گواہ ہے عبدالرحمٰن بن عوف گواہ ہیں اور فلاں فلاں صحابہ گواہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور آپؐ کے بعد ہم نے رجم کیا۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس خطبہ سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکم رجم کی کوئی مستقل آیت ہے جو سورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کے علاوہ ہے مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے اس آیت کے الفاظ نہیں بتلائے کہ کیا تھے اور نہ یہ فرمایا کہ اگر وہ اس آیتِ نور کے علاوہ کوئی مستقل آیت ہے تو قرآن میں کیوں نہیں اور کیوں اس کی تلاوت نہیں کی جاتی، صرف اتنا فرمایا کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مجھ پر کتاب اللہ میں زیادتی کا الزام لگائیں گے تو میں اس آیت کو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ کمارواہ النسائی۔

اس روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر وہ واقعی قرآن کی کوئی آیت ہے اور دوسری آیت کی طرح اس کی تلاوت واجب ہے تو فاروق اعظمؓ نے لوگوں کی بدگوئی کے خوف سے اس کو کیسے چھوڑ دیا جبکہ ان کی شدت فی امر اللہ معروف و مشہور ہے اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ خود حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں داخل کر دیتا بلکہ ارشاد یہ فرمایا کہ میں اس کو قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔

یہ سب امور اس کے قرائن ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے سورۂ نور کی آیتِ مذکورہ کی جو تفسیر رسول اللہ ﷺ سے سنی جس میں آپؐ نے سو کوڑے لگانے کے حکم کو غیر شادی شدہ مرد و عورت کے ساتھ مخصوص فرمایا اور شادی شدہ کیلئے رجم کا حکم دیا۔ اس مجموعی تفسیر کو اور پھر اس پر رسول اللہ ﷺ کے تعامل کو کتاب اللہ اور آیتِ کتاب اللہ...... کے الفاظ سے تعبیر فرمایا اس معنی میں کہ آپ کی یہ تفسیر و تفصیل بحکم کتاب اللہ ہے وہ کوئی مستقل آیت نہیں ورنہ حضرت فاروق اعظمؓ کو کوئی طاقت اس سے نہ روک سکتی کہ قرآن کی جو آیت رہ گئی ہے اس کو اس کی جگہ لکھ دیں۔ حاشیہ پر لکھنے کا جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ بھی اسی کی دلیل ہے کہ درحقیقت وہ کوئی مستقل آیت نہیں بلکہ آیت سورۂ نور ہی کی تشریح میں کچھ تفصیلات ہیں اور بعض روایات میں جو اس جگہ ایک مستقل آیت کے الفاظ مذکور ہیں وہ اسناد ثبوت کے اعتبار سے اس درجہ میں نہیں کہ اس کی بنا پر قرآن میں اس کا اضافہ کیا جا سکے۔ حضرات فقہاء نے جو اس کو منسوخ التلاوۃ غیر منسوخ الحکم کی مثال میں پیش کیا ہے وہ مثال ہی کی حیثیت میں ہے۔ اس سے درحقیقت اس کا آیت قرآن ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

Marfat.com

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۃ نور کی آیت مذکورہ میں جو زانیہ اور زانی کی سزا سو کوڑے لگانا مذکور ہے یہ رسول اللہ ﷺ کی مکمل تشریح و تصریح کی بنا پر غیر شادی شدہ لوگوں کیلئے مخصوص ہے اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے۔ یہ تفصیل اگرچہ الفاظ آیت میں مذکور نہیں مگر جب ذاتِ اقدس پر یہ آیت نازل ہوئی خود ان کی طرف سے ناقابل التباس وضاحت کے ساتھ یہ تفصیل مذکور ہے اور صرف زبانی تعلیم و ارشاد ہی نہیں بلکہ متعدد بار اس تفصیل پر عمل بھی صحابۂ کرام کے مجمع کے سامنے ثابت ہے اور یہ ثبوت ہم تک تواتر کے ذریعہ پہنچا ہوا ہے۔ اس شادی شدہ مرد و عورت پر سزائے رجم کا حکم درحقیقت کتاب اللہ ہی کا حکم اور اسی...... کی طرح قطعی اور یقینی ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم کتاب اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سزائے رجم سنت متواترہ سے قطعی الثبوت ہے جیسا کہ حضرت علیؓ سے یہی الفاظ منقول ہیں کہ رجم کا حکم سنت سے ثابت ہے اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ (معارف القرآن)

اس فعلِ شنیع کی سزا جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا نہایت سخت رکھی گئی ہے کیونکہ اس کے اثرات پورے اسلامی معاشرے کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ البتہ اس کے ثبوت میں بہت احتیاط برتی گئی ہے۔ اسلامی حکومت کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کا حتمی ثبوت نہ مل جائے۔ ثبوتِ جرم کے بغیر کوئی شخص کیسی بھی بری شہرت رکھتا ہو اور اس کی بدنامیاں حکومت کے علم میں ہوں لیکن حکومت اس پر حد جاری نہیں کرسکتی۔ مدینہ میں ایک عورت تھی جس کے متعلق روایات ہیں کہ وہ اپنے کردار کے اعتبار سے بہت بدنام عورت تھی، لیکن چونکہ اس کے خلاف بدکاری کا کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالانکہ نبی کریم ﷺ اس کے بارے میں نہایت منفی احساس رکھتے تھے۔ اسی کے تحت آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے لَوْ كُنْتُ رَاجِمًا اَحَدًا بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ لَرَجَمْتُهَا "اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو ضرور رجم کرا دیتا۔"

البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کی بری شہرت اگر معاشرے پر اثر انداز ہو رہی ہے لیکن وہ اپنی چابکدستی اور ہوشیاری سے ابھی تک قانون کی گرفت سے بچا ہوا ہے تو عدالت کو حق ہے کہ وہ اس کے معاملے کی تحقیق کرے اور اگر ضروری سمجھے تو تعزیر کے طور پر اسے سزا دے۔

ثبوتِ زنا کے دو طریقوں میں پہلا طریقہ شہادت

ثبوت کے دو طریقے ہیں۔ (۱) قرآن کی تصریح کے مطابق کم از کم چار عینی شاہد ہونے چاہئیں۔ آگے سورۃ النور میں بھی چار گواہوں کا ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ النساء میں بھی اس کا ذکر ہو چکا۔ چار گواہ بالاتفاق اس بات کی گواہی دیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مرد اور عورت کو ملوث حالت میں دیکھا ہے۔

گواہوں کی چند صفات ہیں۔ جو گواہ ان صفات سے متصف نہ ہو وہ گواہی نہیں دے سکتا۔ مثلاً کہ اسلامی قانونِ شہادت کی رو سے وہ قابلِ اعتماد ہوں، یعنی کسی مقدمے میں جھوٹے ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں، ملزم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو۔

گواہوں کو اپنی گواہیوں کی ان تفصیلات میں بھی متفق ہونا چاہئے جن کی حیثیت بنیادی امور کی ہوتی ہے۔

شہادت کی ان شرائط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی قانون کا منشاء یہ نہیں ہے کہ ٹکٹکیاں لگی ہوں اور روز لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے برستے رہیں بلکہ وہ ایسی حالت ہی میں یہ سخت سزا دیتا ہے جبکہ تمام اصلاحی اور انسدادی تدابیر کے باوجود اسلامی معاشرے میں کوئی جوڑا ایسا بے حیاء ہے کہ چار چار آدمی اس کو جرم کرتے دیکھ لیتے ہیں۔

Marfat.com

دوسرا طریقہ مجرم کا اقرار اور اس کی مثالیں

شہادت کے علاوہ دوسری چیز جس سے جرمِ زنا ثابت ہوسکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں ہونا چاہئے جس میں اخفاء کی کوئی شکل باقی نہ رہے۔ عدالت کو بھی پوری طرح اطمینان کر لینا چاہئے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطورِ خود بحالت ہوش و حواس یہ اقرار کر رہا ہے۔ البتہ فقہاء میں اس بات میں اختلاف ہے کہ ایک ہی دفعہ کا اقرار کافی ہے یا مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہئے۔ احادیث سے دونوں باتوں کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی مجرم کی سزا کا فیصلہ صرف اس کے اقرار پر کیا گیا تو اگر عین سزا کے دوران میں بھی مجرم اپنے اقرار سے پھر جائے تو سزا کو روک دینا چاہئے، چاہے اس بات کا قرینہ موجود ہو کہ مجرم مار کی تکلیف سے بچنے کیلئے اقرار سے رجوع کر رہا ہے۔ اس پورے قانون کا ماخذ وہ نظائر ہیں جو زنا کے مقدمات کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مقدمہ ماعز بن مالک اسلمی کا ہے جسے متعدد صحابہؓ سے بکثرت راویوں نے نقل کیا ہے۔ یہ روایت چونکہ اس قانون کا بہت بڑا ماخذ ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سمیت تفہیم القرآن سے نقل کرتے ہیں۔ یہ شخص قبیلہ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا جس نے حضرت ہزالؓ بن نعیم کے ہاں پرورش پائی تھی۔ یہاں وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زنا کر بیٹھا۔ حضرت ہزالؓ نے کہا کہ جا کر نبی کریم ﷺ کو اپنے اس گناہ کی خبر دو، شاید آپ کیلئے مغفرت کی دعا کریں۔

ماعز نے جا کر مسجد نبوی میں حضورؐ سے کہا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے پاک کر دیجئے، میں نے زنا کی ہے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا ویحک ارجع فاستغفر اللہ وتب الیہ ”ارے، چلا جا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کر۔“ مگر اس نے پھر سامنے آ کر وہی بات کہی اور آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری بار وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو متنبہ کیا کہ دیکھ، اب چوتھی بار اگر تو نے اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ تجھے رجم کرا دیں گے، مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔ اب حضورؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا لعلک قبلت اوغمزت اونظرت ”شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی یا نظر بد ڈالی ہوگی۔“ (اور تو سمجھ بیٹھا ہوگا کہ یہ زنا کا ارتکاب ہے)۔ اس نے کہا نہیں، آپؐ نے پوچھا ”کیا تو اس سے ہم بستر ہوا؟“ اس نے کہا ہاں، پھر آپؐ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں صریحاً فعل مباشرت کیلئے بولا جاتا ہے۔ اور فحش سمجھا جاتا ہے ایسا لفظ حضورؐ کی زبان سے نہ پہلے کبھی سنا گیا نہ اس کے بعد کسی نے سنا۔ اگر ایک شخص کی جان کا معاملہ نہ ہوتا تو زبان مبارک سے کبھی ایسا لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیا۔ آپؐ نے پوچھا حتٰی غاب ذٰلک منک فی ذٰلک منھا (کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اس کی اس چیز میں غائب ہوگئی؟) اس نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا ”کما یغیب المیل فی المکحلۃ والرشاء فی البئر (کیا اس طرح غائب ہوگئی جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنویں میں رسی؟) اس نے کہا ہاں۔ پوچھا ”کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا ”جی ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔“ آپؐ نے پوچھا ”کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ اس نے کہا ”جی ہاں۔“ آپؐ نے پوچھا ”تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟“ اس نے کہا نہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپؐ نے اس کے محلہ والوں سے دریافت کیا کہ یہ دیوانہ تو نہیں ہے؟ انہوں نے کہا ہم نے اس کی عقل

Marfat.com

میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ آپؐ نے ہزال سے فرمایا لو سترته بثوبک کان خیرا لک ''کاش تم نے اس کا پردہ ڈھانک دیا ہوتا تو تمہارے لئے اچھا تھا۔'' پھر آپؐ نے اس ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرمادیا اور اسے شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا گیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگا اور اس نے کہا ''لوگو! مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروادیا۔ انہوں نے مجھے دھوکہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔'' مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں جب حضور کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا ''تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، میرے پاس لے آئے ہوتے، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔''

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے جو قبیلہ غامد (قبیلۂ جہینہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی اس نے بھی آ کر چار مرتبہ اقرار کیا کہ وہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اسے ناجائز حمل ہے۔ آپؐ نے اس سے بھی پہلے اقرار پر فرمایا ویحک ارجعی فاستغفری الی اللہ وتوبی الیہ ''اری، چلی جا، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ اور توبہ کر۔'' مگر اس نے کہا ''یارسول اللہ ﷺ کیا آپؐ مجھے ماعز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں زنا سے حاملہ ہوں۔'' یہاں چونکہ اقرار کے ساتھ حمل بھی موجود تھا، اس لئے آپؐ نے اس قدر مفصل جرح نہ فرمائی جو ماعز کے ساتھ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا ''اچھا نہیں مانتی تو جا وضع حمل کے بعد آئیو۔'' وضع حمل کے بعد وہ بچے کو لے کر آئی اور کہا اب مجھے پاک کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا ''جا اور اس کو دودھ پلا۔ دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو۔'' پھر وہ دودھ چھڑانے کے بعد آئی اور ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لیتی آئی۔ بچے کو روٹی کا ٹکڑا کھلا کر حضورؐ کو دکھایا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے اور دیکھئے یہ روٹی کھانے لگا ہے، تب آپؐ نے بچے کو پرورش کیلئے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

ان دونوں واقعات میں بصراحت چار اقراروں کا ذکر ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام کا عام خیال یہی تھا کہ اگر ماعز اور غامدیہ چار مرتبہ اقرار نہ کرتے تو انہیں رجم نہ کیا جاتا۔ البتہ تیسرا واقعہ (جس کا ذکر ہم اوپر نمبر ۱۵ میں کر چکے ہیں) اس میں صرف یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''جا کر اس کی بیوی سے پوچھ اور اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔'' اس میں چار اعترافوں کا ذکر نہیں ہے، اور اسی سے فقہاء کے ایک گروہ نے استدلال کیا ہے کہ ایک ہی اعتراف کافی ہے۔

اوپر ہم نے جن تین مقدمات کی نظیریں پیش کی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقراری مجرم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ اس طرح ایک کی بجائے دو کو سزا دینی پڑے گی اور شریعت لوگوں کو سزائیں دینے کیلئے بے چین نہیں ہے۔ البتہ اگر مجرم خود یہ بتائے کہ اس فعل کا فریق ثانی فلاں ہے تو اس سے پوچھا جائے گا اگر وہ بھی اعتراف کرے تو اسے سزا دی جائے گی لیکن اگر وہ انکار کر دے تو صرف اقراری مجرم ہی حد کا مستحق ہوگا۔ اس امر میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس دوسری صورت میں (یعنی جبکہ فریق ثانی اس کے ساتھ مرتکب زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے) اس پر حدِ زنا جاری کی جائے گی یا حدِ قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حدِ زنا کا مستوجب ہے کیونکہ اسی جرم کا اس نے اقرار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی رائے میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی کیونکہ فریق ثانی کے انکار نے اس کے جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے۔ البتہ اس کا جرم قذف بہر حال ثابت ہے اور امام محمد

Marfat.com

کا فتویٰ یہ ہے (امام شافعی کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے) کہ اسے زنا کی سزا بھی دی جائے گی اور قذف کی بھی کیونکہ اپنے جرم زنا کا وہ خود معترف ہے اور فریق ثانی پر اپنا الزام وہ ثابت نہیں کر سکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی عدالت میں اس قسم کا ایک مقدمہ آیا تھا۔ اس کی ایک روایت جو مسند احمد اور ابوداؤد میں سہل بن سعد سے منقول ہے اس میں یہ الفاظ ہیں "ایک شخص نے آ کر نبی کریم ﷺ کے سامنے اقرار کیا کہ وہ فلاں عورت سے زنا کا مرتکب ہوا ہے۔ آپ نے عورت کو بلا کر پوچھا، اس نے انکار کیا۔ آپ نے اس پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔" اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کون سی حد جاری کی۔ دوسری روایت ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباسؓ سے نقل کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ پہلے اس کے اقرار پر آپ نے حدِ زنا جاری کی پھر عورت سے پوچھا اور اس کے انکار پر اس شخص کو حدِ قذف کے کوڑے لگوائے لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کے ایک راوی قاسم بن فیاض کو متعدد محدثین نے ساقط الاعتبار ٹھہرایا ہے اور قیاس کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپ نے اسے کوڑے لگوانے کے بعد عورت سے پوچھا ہوگا۔ صریح عقل اور انصاف کا تقاضا جسے حضور نظر انداز نہیں فرما سکتے تھے، یہ تھا کہ جب اس نے عورت کا نام لے دیا تھا تو عورت سے پوچھے بغیر اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ اسی کی تائید سہیل بن سعد والی روایت بھی کر رہی ہے۔ لہٰذا دوسری روایت لائق اعتماد نہیں ہے۔

تازیانہ اور ضربِ تازیانہ کی کیفیت

گواہوں کی گواہی اور عدالت کے اطمینان سے جب ملزم کو مجرم ٹھہرا دیا جائے تو اب اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ کوڑا یعنی تازیانہ کیسا ہونا چاہئے اور ضربِ تازیانہ کی کیفیت کیا ہو۔ آنحضرت ﷺ کی سنت سے ہمیں جو اس کی وضاحت ملتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا ہر حکم اپنے اندر کتنی تہذیب اور شائستگی رکھتا ہے۔ کوڑے کے بارے میں بہتر یہ ہے کہ وہ چمڑے کا ہو، لیکن آنحضرت ﷺ کی سنت سے بید کا استعمال بھی ثابت ہے۔ دونوں صورتوں میں کوڑا اوسط درجے کا ہونا چاہئے۔ نہ بہت موٹا اور سخت اور نہ بہت پتلا اور نرم۔ آپ کو بہت کمزور کوڑا دیا گیا تو آپ نے اس سے بہتر منگوایا اور بالکل نیا دیا گیا تو آپ نے فرمایا ایسا کوڑا لاؤ جو استعمال سے نرم ہو چکا ہو۔ خلفائے راشدین بھی اوسط درجے کا کوڑا استعمال کرتے تھے۔

کوڑے کی مار اور ضرب کے بارے میں خود قرآنِ کریم کے لفظ فَاجْلِدُوْا میں اشارہ موجود ہے۔ "جلد" کا لفظ جس کا معنی کوڑا ہے "جلد" (یعنی کھال) سے ماخوذ ہے۔ اس سے تمام اہلِ لغت اور علمائے تفسیر نے یہی سمجھا ہے کہ کوڑے کی ضرب ایسی ہونی چاہئے جس کا اثر جلد تک رہے، گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضربِ تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے قرآن کے خلاف ہے۔

مار اوسط درجے کی ہونی چاہئے۔ حضرت عمرؓ مارنے والے کو حکم دیتے تھے کہ اس طرح مارو کہ تمہاری بغل کھلنے نہ پائے یعنی پوری طاقت سے ہاتھ کو تان کر نہ مارو۔ تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہئے، یعنی زخم ڈال دینے والی۔ منہ اور شرم گاہ کے علاوہ تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہئے۔

Marfat.com

مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہئے اور عورت کو بٹھا کر۔ مار کے وقت عورت اپنے پورے کپڑے پہنے رہے گی بلکہ اس کے کپڑے اچھی طرح باندھ دیئے جائیں گے تاکہ اس کا جسم کھل نہ جائے۔ مرد کے معاملے میں اختلاف ہے کہ اس کی قمیض اتاری جائے گی یا نہیں۔ البتہ اس کے پاجامہ پہننے پر سب کا اتفاق ہے۔

شدید سردی اور شدید گرمی میں سزا جاری کرنے سے روکا گیا ہے۔ مار کر باندھنے کی بھی اجازت نہیں۔ بجز اس کے کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔

مار کا کام اجڈ جلادوں سے نہیں لینا چاہئے بلکہ صاحب علم وبصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہئے جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کیلئے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، مقداد بن عمروؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن ثابتؓ اور ضحاک بن سفیانؓ جیسے صلحا ومعززین اس کام پر مامور رہے۔

مجرم اگر مریض ہو تو اس کی صحت یابی تک سزا کو التواء میں رکھا جانا چاہئے۔ ہاں اگر بہت بوڑھا ہو یا صحت کی امید کھو چکا ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینا چاہیے تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔

آپ نے تازیانہ اور ضربِ تازیانہ کی تفصیلات ملاحظہ کیں۔ انہیں دیکھ کر کون مہذب آدمی یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ ان سزاؤں میں وحشیانہ پن کا کوئی عنصر موجود ہے۔ ہم نے بڑے اختصار سے جن چند احتیاطوں کا ذکر کیا ہے وہ دنیا کے کسی قانون میں دیکھی نہیں جاسکتیں۔ اسلام تو ایک بہت بڑے جرم پر یہ سزا تجویز کرتا ہے جبکہ اعتراض کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جیلوں کیلئے جو قانون بنا رکھا ہے اس میں جیل کا ایک معمولی سپرنٹنڈنٹ بھی ایک قیدی کو حکم عدولی یا گستاخی کے قصور میں تیس ضرب بید تک کی سزا دینے کا مجاز ہے۔ یہ بید لگانے کیلئے ایک آدمی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس غرض کیلئے بید بھی خاص طور پر بھگو بھگو کر تیار کئے جاتے ہیں تاکہ جسم کو چھری کی طرح کاٹ دیں۔ مجرم کو ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ تڑپ بھی نہ سکے۔ صرف ایک پتلا سا کپڑا اس کے ستر کو چھپانے کیلئے رہنے دیا جاتا ہے۔ جلاد دور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور پوری طاقت سے مارتا ہے۔ ضرب مسلسل سرین پر لگائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ گوشت قیمہ بن کر اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایسا قانون بنانے والے اور نافذ کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اسلامی قانون کی سزائے تازیانہ کو وحشیانہ سزا سے تعبیر کرتے ہیں۔

دین اللہ کی تعبیر

اس آیتِ کریمہ میں اس فوجداری قانون کو دین اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ ہی دین نہیں ہیں مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون اور نظامِ شریعت کو قائم کرنا بھی ہے۔

حدود کے نفاذ میں انسانی احساسات مانع نہیں ہونے چاہئیں

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ میں قابلِ توجہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی یہ تنبیہ ہے کہ زانیہ اور زانی پر میری تجویز کردہ سزا نافذ کرنے میں مجرم کیلئے رحم اور شفقت کا جذبہ تمہارا ہاتھ نہ پکڑے۔ یعنی جب تم اس پر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق حد جاری کرو اور کوڑے لگانے لگو یا تم اس کے بارے میں قانون سازی کرنے لگو تو تمہارے اندر ایسے نام نہاد رحم اور شفقت کا رویہ جنم نہیں لینا چاہئے جو تمہیں اس قانون سازی یا اس کے نفاذ سے روکے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حاکم کے ایسے ہی رویئے کے بارے میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا

Marfat.com

اس کا ترجمہ یہ ہے "کہ قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا، پوچھا جائے گا کہ یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہوگا اچھا تو ان کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا، پھر حکم ہوگا اسے دوزخ میں لے جاؤ۔ ایک اور حاکم لایا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا تو نے یہ کس لئے کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا تا کہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا اچھا تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا۔ پھر حکم ہوگا اسے بھی دوزخ میں لے جاؤ۔ (تفسیرِ کبیر ج ۶ ص ۲۲۵)۔ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ کمی بیشی کا عمل رحم یا مصلحت کی بنا پر ہو۔ لیکن اگر کہیں احکام میں ردوبدل مجرموں کے مرتبوں کی بنا پر ہونے لگے تو پھر یہ ایک بدترین جرم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ میں فرمایا لوگو! تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ ہلاک ہو گئیں۔ اس لئے کہ جب ان میں کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ایک حد جاری کرنا اہلِ زمین کیلئے چالیس دن کی بارش سے زیادہ مفید ہے۔

سزا لوگوں کے سامنے دی جائے

اس آیتِ کریمہ میں آخری بات جو کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سزا علی الاعلان عام لوگوں کے سامنے دی جانی چاہئے۔ یہ بات جب قرآنِ کریم کی سزاؤں کے حوالے سے دوسری آیات کو ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں تو اس سے اسلام کے نظریہ سزا پر روشنی پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں سزا کے تین مقصد ہیں اول یہ کہ مجرم نے جس نوعیت کا جرم کیا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا اس سے بدلہ لیا جائے اور اس برائی کا مزا چکھایا جائے۔ دوم یہ ہے کہ ایسی سزا دی جائے کہ اس کیلئے جرم کا اعادہ مشکل ہو جائے بلکہ سزا کے تصور سے ہی اس کے جسم پر کپکپی چھوٹ جائے اور سوم یہ کہ اس کی سزا کو ایک عبرت بنا دیا جائے تا کہ معاشرے میں جو دوسرے لوگ برے میلانات رکھنے والے ہوں ان کے دماغ کا آپریشن ہو جائے اور وہ ایسے کسی جرم کی جرأت نہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ علی الاعلان سزا کی صورت میں حکام سزا دینے میں بیجا رعایت یا بیجا سختی کرنے کی کم ہی جرأت کر سکتے ہیں۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً ۡ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ۳

(زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر زانیہ یا مشرکہ سے، اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک اور حرام کر دیا گیا ہے یہ اہلِ ایمان پر۔ ۳)

آیت کے الفاظ میں دو احتمالات

اس آیتِ کریمہ کے الفاظ میں دو احتمالات ممکن ہیں اور ہمارے مفسرین نے دونوں میں سے کسی نہ کسی احتمال کو اختیار کیا ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ لَا یَنْکِحُ خبر کے مفہوم میں نہیں بلکہ نہی کے مفہوم میں ہے۔ بظاہر یہ صیغہ نفی کا ہے لیکن معنی نہی کا ہے۔ فَلَا یَنْکِحُ کا معنی یہ ہوگا لَا یَلِیْقُ بِہٖ اَنْ یَّنْکِحَ یعنی پیشہ ور زانیہ کے ساتھ نکاح کرنا مومن کی شان کے لائق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی حرمت اور اس کے ارتکاب پر سزا کے ذکر کرنے کے بعد پروردگار مسلمانوں میں غیرتِ ایمانی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں زنا سے اتنی نفرت اور

Marfat.com

بیزاری ہونی چاہئے کہ کوئی زانی اگر تمہارے اندر نکاح کرنا چاہے تو کوئی صاحب ایمان اس کو منہ لگانے کیلئے تیار نہ ہو۔ اخلاق تربیت اور مفسد عناصر کا قلع قمع کرنے کیلئے سخت ترین سزا کا نفاذ یقیناً زنا جیسے قبیح فعل کے ارتکاب کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، لیکن جو لوگ اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اسلامی معاشرے کی ایمانی حس غیرتِ ایمانی کی شکل اختیار نہیں کرتی۔ مجرد قانون خواہ وہ کیسا ہی بے لاگ اور حکیمانہ ہو معاشرے کی حفاظت اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک خود معاشرے کے اندر برائی سے نفرت موجود نہ ہو۔ میڈیکل سائنس کی تعلیم، ہسپتالوں کا وجود، میڈیکل سٹورز کی فراوانی اور ماحول کی پاکیزگی صحت کیلئے یقیناً بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ چیز جو انسانوں کی صحت کی ضمانت دے سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسانوں میں بیماری کیخلاف ایک ردِعمل پیدا ہو جائے۔ اور اگر یہ پیدا نہیں ہوتا تو متذکرہ بالا ساری چیزیں اپنی تمام تر افادیت کے باوجود بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں ایسے ہی ردِعمل کو پیدا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس آیت کے شانِ نزول سے بھی اس بات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت مرثدؓ کا یہ دستور تھا کہ مشرکین مکہ کے پاس جو مسلمان قیدی ہوتے یہ رات کی تاریکی میں وہاں جاتے اور کسی نہ کسی طرح سے انہیں کفار کی اسیری سے نکال لاتے۔ اسی سلسلہ میں وہ ایک دفعہ مکہ گئے۔ چاندنی رات تھی، ایک مکان کے سایہ میں سمٹے بیٹھے تھے کہ کوئی دیکھ نہ لے، اتفاقاً عناق نامی ایک عورت جس سے زمانۂ جاہلیت میں ان کے برے تعلقات رہ چکے تھے، ادھر آنکلی۔ اسے کچھ شبہ ہوا اور وہ قریب آ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ خوش آمدید کہتی ہوئی آگے بڑھی اور رات اپنے پاس گزارنے کی دعوت دی۔ حضرت مرثدؓ نے کہا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام کر دیا ہے، میں اب تمہارے پاس شب باشی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس نے اس انکار پر مشتعل ہو کر شور مچانا شروع کر دیا۔ حضرت مرثدؓ کہتے ہیں کہ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ آٹھ آدمیوں نے میرا تعاقب کیا۔ میں نے ایک غار میں پناہ لی۔ وہ اس غار کے دہانے تک پہنچ گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا اور وہ واپس لوٹ گئے۔ جب وہ چلے گئے تو میں پھر اپنے کام کیلئے مکہ واپس آیا اور جس آدمی کو رہا کرانے کیلئے میں آیا تھا اسے کسی نہ کسی طرح میں نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے اپنے ہمراہ لے کر مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر میں نے سارا ماجرا بیان کیا اور آنحضرت ﷺ سے عناق سے نکاح کی اجازت مانگی۔ حضور خاموش رہے، کچھ دیر بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ مجھے بلایا اور حکمِ الٰہی پڑھ کر سنایا۔

اس شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ زانیہ سے مراد وہ عورت ہے جو زنا سے تائب نہ ہوئی ہو اور زانی سے مراد وہ مرد ہے جو اس فعل کے ارتکاب میں شہرت رکھتا ہو اور اس نے شرم و حیاء کی چادر اتار پھینکی ہو۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ ایسے کسی شخص کو جو بداخلاقی کی شہرت رکھتا ہو اور شرم و حیاء کی ہر قدر کو پامال کر چکا ہو اسے کبھی اپنی بیٹی دینے کی غلطی نہ کرنا کیونکہ ایسے لوگ جس کسی سے بھی نکاح کرتے ہیں وہ نکاح کی حقیقت کو سمجھنے کی بجائے صرف لطف و لذت کیلئے نکاح کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان مردوں سے کہا جا رہا ہے کہ کبھی کسی ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا جو عفت مآبی کے معاملے میں لاپرواہ واقع ہوئی ہو اور اپنے کندھے سے کسی کا ہاتھ اٹھانا پسند نہ کرتی ہو۔ ایسی عورت نکاح کے بعد بھی ذواقات میں شامل رہے گی۔ نہ اس سے نسب محفوظ رہے گا اور نہ گھر میں شرم و حیاء کی فصل بارآور ہو سکے گی۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اپنے بیٹوں کا نکاح بھی کبھی ایسے گھر میں نہ کرنا جس میں اخلاقی قدروں کی پاسداری کا چلن باقی نہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسے نفی کے معنی میں ہی لیا جائے اور علامہ پانی پتی نے اپنی تفسیر مظہری میں اسی معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے کہ زانی اپنے فسق و فجور کے باعث کسی نیک خاتون سے نکاح کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ اسی طرح نیک مرد بھی زانیہ سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ طبیعتوں کی مناسبت باہمی الفت و محبت کی علت ہے۔ جہاں طبیعتوں میں تضاد ہو گا وہاں باہمی الفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سورۃ میں نفی اپنے معنی پر محمول ہو گی۔

Marfat.com

آیت میں زانی اور مشرک اور زانیہ اور مشرکہ کا ایک ساتھ ذکر بڑا معنی خیز ہے۔ اس میں شاید اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ زنا اور شرک میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے قدیم آسمانی صحیفوں میں مشرک کو چھنال عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک مشرک اپنے عقیدے کی حرمت میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک زانی اور زانیہ اخلاقی حرمت میں دوسرے کو شریک کرتے ہیں۔ اس وصفی اشتراک کی وجہ سے قرآنِ کریم نے یہاں زانی کے ساتھ مشرک کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں ایک طرح سے اخلاقی حس کو مہمیز بھی کیا گیا ہے کہ جس طرح کوئی مسلمان کسی مشرکہ عورت سے اور کوئی مسلمان عورت کسی مشرک مرد سے نکاح کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح زانی مرد اور زانی عورت سے نکاح کرنا بھی ایمانی غیرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش ہے۔

ذٰلِکَ کا مرجع اور اس کا مفہوم

وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ مفتی محمد شفیع صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا: اس میں بعض حضرات مفسرین نے تو ذٰلِکَ کا اشارہ زنا کی طرف قرار دیا ہے تو معنی جملے کے یہ ہو گئے کہ جب زنا ایسا خبیث فعل ہے تو زنا مومنین پر حرام کر دیا گیا۔ اس تفسیر پر معنی میں تو کوئی اشکال نہیں رہتا لیکن ذٰلِکَ سے زنا مراد لینا سیاقِ آیت سے کسی قدر بعید ضرور ہے اس لئے دوسرے مفسرین نے ذٰلِکَ کا اشارہ نکاحِ زانی و زانیہ اور مشرک و مشرکہ کی طرف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں مشرکہ سے مسلمان مرد کا نکاح اور مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح حرام ہونا تو دوسری نصوصِ قرآن سے بھی ثابت ہے اور تمام امت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے اور زانی مرد سے پاکدامن عورت کا نکاح یا زانیہ عورت سے عفیف مرد کا نکاح حرام ہونا جو اس جملے سے مستفاد ہوگا وہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ عفیف مرد زانیہ عورت سے نکاح کر کے اس کو زنا سے نہ روکے بلکہ نکاح کے بعد بھی اس کی زناکاری پر راضی رہے کیونکہ اس صورت میں یہ دیوثیت ہوگی جو شرعاً حرام ہے۔ اسی طرح کوئی شریف پاکدامن عورت زنا کے خوگر شخص سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد بھی اس کی زناکاری پر راضی رہے۔ یہ بھی حرام ہے یعنی ان لوگوں کا یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا باہمی نکاح صحیح نہ ہو، باطل ہو جائے۔ لفظ حرام شریعت کی اصطلاح میں دو معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ گناہ ہے اس کا کرنے والا آخرت میں مستحق سزا ہے اور دنیا میں بھی یہ عمل بالکل باطل کالعدم ہے۔ اس پر کوئی شرعی ثمرہ احکام دنیا کا بھی مرتب نہیں ہوگا جیسے کسی مشرک عورت سے یا جو عورتیں ہمیشہ کیلئے حرام ہیں ان میں سے کسی سے نکاح کر لیا تو یہ گناہ عظیم بھی ہے اور ایسا نکاح شرعاً کالعدم ہے۔ زنا میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ دوسرے یہ کہ فعل حرام ہے یعنی گناہ موجب سزا ہے مگر دنیا میں اس فعل کے کچھ ثمرات رہتے ہیں۔ معاملہ صحیح ہو جاتا ہے جیسے کسی عورت کو دھوکہ دے کر یا اغوا کر کے لے آیا پھر شرعی قاعدے کے مطابق دو گواہوں کے سامنے اس کی مرضی سے نکاح کر لیا تو یہ فعل تو ناجائز و حرام تھا مگر نکاح صحیح ہو گیا۔ اولاد ثابت النسب ہوگی۔ اسی طرح زانیہ اور زانی کا نکاح جبکہ ان کا مقصود اصلی زنا ہی ہو، نکاح محض کسی دنیوی مصلحت سے کرتے ہوں اور زنا سے توبہ نہیں کرتے، ایسا نکاح حرام ہے مگر دنیوی احکام میں باطل کالعدم نہیں۔ نکاح کے ثمرات شرعیہ نفقہ، مہر، ثبوت نسب اور میراث سب جاری ہوں گے۔ اس طرح لفظ حرام اس آیت میں مشرکہ کے حق میں پہلے معنی کے اعتبار سے اور زانیہ اور زانی کے حق میں دوسرے معنی کے اعتبار سے صحیح اور درست ہو گیا۔ اس تفسیر پر آیت کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہ رہی جیسا کہ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو ۸۰ کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔ ۴) مگر ان میں سے وہ لوگ جو توبہ کرلیں اس بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ۵)

بے حیائی کے فروغ کا ایک ذریعہ قذف بھی ہے، اس کی سزا

اسلام کی نظر میں بے حیائی کا ارتکاب بھی نا قابلِ برداشت ہے اور بے حیائی کا فروغ بھی۔ زنا بے حیائی کے ارتکاب کی آخری صورت ہے۔ اسلام اپنی تعلیم وتربیت، ماحول کی پاکیزگی اور قانون کی گرفت سے بے حیائی کی ہر صورت کے ارتکاب پر پہرے بٹھاتا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا بھی انتظام کرتا ہے کہ بے حیائی کے فروغ اور اس کے چرچے سے چونکہ بے حیائی کے ذوق میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کے احساس میں گندگی اترنے لگتی ہے اس لئے جن باتوں اور جن ذرائع سے بے حیائی کو فروغ ملتا ہو ان میں سے کسی بات کو بھی گوارا نہ کیا جائے۔ اس لئے اس نے مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط اور عورتوں کے بے حجابانہ اور بن سنور کے نکلنے پر پابندی لگائی۔ حتیٰ کہ عورتوں کو گفتگو کے ایسے طریقے سے بھی منع کر دیا جس سے بیمار دلوں میں گناہ کی خواہش یا انگیخت پیدا ہوسکتی ہو۔ چنانچہ بے حیائی کے فروغ ہی کے سلسلے کی ایک کڑی دوسروں پر تہمتیں لگانا بھی ہے۔ کسی پاکدامن مرد یا کسی پاکدامن عورت پر بدکرداری کا بہتان باندھنا جس طرح ان مرد و عورت کو جن پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے معاشرتی حیثیت اور ذاتی وجاہت سے محروم کر دیتا ہے، اسی طرح معاشرے کے دیگر افراد میں بھی بے حیائی کی باتوں کو زبان پر لانے پھر دوسروں میں اسے نمک مرچ لگا کر پھیلانے اور مزے لے لے کر انہیں دہرانے کا موقع پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسی سے کردار کی معصومیت اور احساس کی پاکیزگی گدلانا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ معاشرے کو بداخلاقی کے ایسے جراثیم اور محرکات سے بچانے کیلئے اسلام نے یہ کوشش کی ہے کہ جس طرح زنا کا ارتکاب نہیں ہونا چاہئے اسی طرح دوسروں کے حالات کا تجسس اور محض ظن و گمان پر کسی پر زنا کا الزام بھی نہیں لگنا چاہئے۔ کیونکہ اگر زبانوں کو ایسے معاملات میں کھلنے کی اجازت دی گئی تو نہ صرف اس سے عزتوں کو نقصان پہنچے گا بلکہ ماحول کی پاکیزگی بھی مکدر ہو کر رہ جائے گی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی سلسلے کا ایک قانونی حکم دیا گیا ہے۔ آیت کے آغاز میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ اگرچہ مذکر کیلئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرد تو کسی پر تہمت نہیں لگا سکتے لیکن عورتوں کو اس کی آزادی ہے کیونکہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اس معاملے میں مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ جس طرح مرد کسی پر تہمت لگانے کے بعد جوابدہی پر مجبور کیا جاتا ہے اسی طرح عورت کو بھی جوابدہی کرنا ہوگی۔

Marfat.com

الزام سے مراد زنا کا الزام ہے

دوسری یہ بات کہ آیت کے الفاظ سے ہر قسم کا الزام مترشح ہوتا ہے لیکن سیاق وسباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد ہر قسم کا الزام نہیں بلکہ مخصوص طور پر زنا کا الزام ہے۔ چونکہ پہلے زنا کا حکم بیان ہوا ہے اور آگے لعان کا حکم آ رہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان اس حکم کا آنا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں الزام سے مراد زنا کا الزام ہے۔ اسی طرح آیتِ کریمہ میں پاکدامن عورتوں پر الزام لگانے کی بات ہو رہی ہے۔ اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس سے مراد وہ الزام ہے جو پاکدامنی کے خلاف ہو۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانونِ اسلامی میں صرف زنا کا نصابِ شہادت ہے۔ ان تمام قرائن کی بنا پر تمام امت کے علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت میں صرف الزامِ زنا کا حکم بیان ہوا ہے۔

مرد پر الزام بھی عورت پر الزام کی طرح موجبِ سزا ہے

اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ پاکدامن عورتوں پر الزام لگانے کی بات کی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کسی مرد پر یہ بہتان لگایا جائے تو باز پرس نہ ہوگی، ہرگز نہیں بلکہ مرد اور عورت کا حکم یکساں ہے۔ یہاں فقط محصنات کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اس میں الزام ایک پاکدامن عورت پر لگایا گیا تھا۔ پاکدامن مرد پر بہتان لگانے کا حکم اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

الزام لگانے والا جب کسی پر الزام لگاتا ہے تو اگر وہ شخص جس پر الزام لگایا گیا ہے عدالت سے رجوع کرتا ہے تو عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ الزام لگانے والے سے چار گواہ طلب کرے۔ اگر وہ چار گواہ پیش کر دے جو گواہی دینے کی اہلیت رکھتے ہوں تو اس پر حدِ زنا جاری ہو جائے گی اور اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو پھر الزام لگانے والے پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔

حدِ قذف صرف اس شکل میں نافذ ہوگی جب الزام لگانے والے نے کسی محصنہ عورت پر اور یا کسی عورت نے محصن مرد پر الزام لگایا ہو اور پھر وہ اسے چار گواہوں سے ثابت نہ کر سکے اور اگر الزام کسی غیر محصن یا غیر محصنہ پر لگایا گیا ہو تو اس صورت میں اس پر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر وہ غیر محصن شخص بدکاری میں معروف ہو تب تو اس پر الزام لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلاثبوت الزام لگانے والے کیلئے قاضی خود سزا تجویز کر سکتا ہے یا ایسی صورتوں کیلئے پارلیمنٹ حسبِ ضرورت قانون بنا سکتی ہے۔

کسی فعلِ قذف کے مستلزمِ سزا ہونے کیلئے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بدکاری کا بلاثبوت الزام لگایا بلکہ اس کیلئے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں اور کچھ مقذوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) میں اور کچھ خود فعلِ قذف میں پائی جانی ضروری ہے۔ اس کی تفصیلات کے تو یہ اوراق متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ اس سلسلے میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

قاذف، مقذوف اور فعلِ قذف کی شرائط

قاذف میں جو شرطیں پائی جانی ضروری ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ 1- وہ بالغ ہو۔ بچے پر حدِ قذف نہیں لگائی جا سکتی، البتہ اسے تعزیر دی جا سکتی ہے۔ 2- وہ عاقل ہو، مجنون پر حدِ قذف جاری نہیں ہو سکتی۔ 3- اس نے کسی جبر کے بغیر اپنے آزاد ارادے سے قذف کا ارتکاب کیا ہو۔ 4- وہ مقذوف کا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ ان پر حدِ قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔

Marfat.com

مقذوف میں جو شرائط پائی جانی ضروری ہیں، وہ یہ ہیں: 1- وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالت عقل زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ امام مالک اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مجنون کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ بہرحال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔ 2- وہ بالغ ہو، کیونکہ بچے پر الزام لگانا حدِ قذف کا موجب نہیں ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ سنِ بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو قاذف حد کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسی عمر کسی لڑکی پر زنا کرنے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو جاتی ہے۔ 3- مقذوف مسلمان ہو یعنی اس پر بحالت اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ 4- وہ آزاد ہو، لونڈی یا غلام پر الزام موجب حد نہیں ہے۔ 5- وہ عفیف اور پاکدامن ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبہ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرم زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبہ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاحِ فاسد یا خفیہ نکاح یا مشتبہ ملکیت یا شبہ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو۔ نہ اس کے حالاتِ زندگی ایسے ہوں جن میں اس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں کیا جا سکتا ہو۔

ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجنون یا بچے یا کافر یا غلام یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزامِ زنا لگا دینے والا مستحقِ تعزیر بھی نہیں ہے۔ اگر عدالت مطمئن ہو تو ان میں سے ہر ایک پر تعزیر جاری کی جا سکتی ہے۔

وہ شرطیں جو خود فعلِ قذف میں ہونی چاہئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ 1- قاذف نے مقذوف پر اگر ایسی بدکاری کا الزام لگایا جو شہادتوں سے ثابت ہونے کے بعد موجب حد ہو سکتا ہو یا اس نے مقذوف کو ولد الزنا قرار دیا ہو۔ دونوں صورتوں میں الفاظ صاف اور صریح ہونے چاہئیں، کنایات کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح جو الفاظ محض گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں انہیں صریح قذف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ میرا ناچیز گمان یہ ہے کہ اس کا دارومدار ہر زبان کے طریقِ استعمال اور محلِ استعمال پر ہے۔

جو الزام لگانے والا ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے جرم قذف سے بری کر سکتی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے تین سزائیں رکھی ہیں۔

1- ۸۰ کوڑے لگائے جائیں گے۔ 2- آئندہ مالی حقوق میں ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ 3- اسے فاسق قرار دے دیا جائے گا۔

دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بہتان لگانے کے بعد توبہ کر لے تو حدِ قذف تو اس سے ساقط نہیں ہوگی البتہ اس کے فسق سے جو عذاب اسے روزِ قیامت دیا جانے والا تھا وہ معاف کر دیا جائے گا۔ توبہ کے بعد کیا اس کی گواہی منظور ہوگی یا نہیں، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ احناف کا مسلک یہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی وہ مردود الشہادت رہے گا۔ دیگر آئمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کیلئے تفسیر اور فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ
شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ
رَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝

Marfat.com

(اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام) میں سچا ہے۔ ۶) اور پانچویں بار یہ کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہو۔ ۷) اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص اپنے الزام میں جھوٹا ہے۔ ۸) اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہو اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ ۹) اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا دانا ہے۔ ۱۰)

آیات کا شانِ نزول

جب حدِ قذف کے بارے میں سابقہ آیت نازل ہوئی تو سعد بن عبادہؓ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! أَهٰكَذَا أُنْزِلَتْ ''کیا یہ آیت یونہی نازل ہوئی ہے؟'' حضورؐ نے فرمایا: اے انصار! سنتے ہو، تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے۔ سعد بولے، یارسول اللہ ﷺ! خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ یہ حق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا ہے، لیکن میں یہ خیال کر کے پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر میں کسی بدبخت کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث دیکھوں تو جب تک میں چار گواہ تلاش کر کے نہ لاؤں، اس کیخلاف زبان نہیں کھول سکتا، اور اگر گواہوں کو بلانے جاؤں گا تو وہ اپنا کام تمام کر کے جا چکا ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بجائے کسی گواہ کے تلاش کرنے کے میں تو ان دونوں کا سر قلم کر دوں گا۔ اس گفتگو کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک رات حضرت ہلال بن امیہؓ اپنے کھیتوں سے جب گھر آئے تو اپنی اہلیہ کے ساتھ ایک آدمی کو ملوث پایا۔ انہوں نے سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ صبح بارگاہ نبوتؐ میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضورؐ کو یہ سن کر بڑی کوفت ہوئی۔ آپؐ نے حضرت ہلال بن امیہؓ سے کہا کہ تم اس پر گواہ پیش کرو، ورنہ تم پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ لیکن روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلالؓ بالکل مطمئن تھے، انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشت کو محفوظ فرمائے گا، اور کوئی ایسی آیت نازل فرمائے گا جو اس الجھن کا حل پیش کر دے گی۔ اسی اثناء میں آنحضرت ﷺ پر نزولِ وحی کے آثار نمودار ہوئے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اے ہلال تمہیں مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری مشکل کا حل نازل فرما دیا۔ حضرت ہلالؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اسی کی امید لگائے ہوئے تھا۔ اب رسول اللہ ﷺ نے ہلال بن امیہؓ کی بیوی کو بھی بلوا لیا۔ جب دونوں میاں بیوی جمع ہو گئے تو آپؐ نے انہیں پہلے حکمِ خداوندی سنایا، پھر فرمایا خوب سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت ہے۔ حضرت ہلالؓ نے عرض کیا، میں نے اس پر بالکل صحیح الزام لگایا ہے۔ عورت نے کہا یہ بالکل جھوٹ ہے۔

الزام سے انکار پر دونوں میں ملاعنت

حضورؐ نے فرمایا، اچھا تو ان دونوں میں ملاعنت کرائی جائے۔ چنانچہ پہلے حضرت ہلالؓ اٹھے، انہوں نے حکمِ قرآنی کے مطابق قسمیں کھانی شروع کیں۔ نبی کریم ﷺ اس دوران میں بار بار فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم میں سے ایک ضرور جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا۔ پانچویں قسم سے پہلے حاضرین نے ہلالؓ سے کہا خدا سے ڈرو، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے ہلکا ہے۔ پانچویں قسم تم پر عذاب واجب کر دے گی، مگر انہوں نے پانچویں قسم بھی کھا لی۔ پھر عورت اٹھی اور اس نے بھی قسمیں کھانی شروع کیں۔ پانچویں قسم سے پہلے اسے بھی روک کر کہا گیا کہ خدا سے ڈر، آخرت کے عذاب کی بہ نسبت دنیا کا عذاب برداشت کر لینا آسان ہے۔ یہ آخری قسم تجھ پر عذابِ الٰہی کو واجب

Marfat.com

کردے گی۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر رکی اور جھجکتی رہی۔ لوگوں نے سمجھا اعتراف کرنا چاہتی ہے، پھر کہنے لگی میں ہمیشہ کیلئے اپنے قبیلے کو رسوا نہیں کروں گی اور پانچویں قسم بھی کھا گئی۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی۔ حضورؐ نے فرمایا، اب جو بچہ پیدا ہو اس کی نسبت اس کی ماں کی طرف کی جائے، اور ساتھ ہی ایک اور حکم بھی دیا کہ اگر اس کے بعد کسی نے اس عورت کو زنا سے متہم کیا یا اس کے بچے کو حرامی کہا تو اس پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔ اس ارشاد سے واضح ہو گیا کہ جس کو شریعت کسی الزام سے بری کردے پھر اس پر کسی کو زبان درازی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس طریقہ کار کو لعان کہتے ہیں۔ لعان کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہ عورت زندگی بھر اس کے نکاح میں نہیں آسکتی۔

آخری آیتِ کریمہ کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر کیا ہے، اور دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے والا اور صاحبِ حکمت ہے تو تم اس کی پکڑ میں آجاتے۔

یہ آیت دراصل تنبیہ اور تذکیر کی آیت ہے اور اس میں جوابِ شرط نحو کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس کو کھول دیا ہے اور آگے آیت ۱۴ اس کی تائید کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی معاشرہ اخلاقی کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کو مناسب قانون نہ دیا جائے یا اس کی جہت متعین نہ کی جائے یا اس کی تعلیم و تربیت پر پورا دھیان نہ دیا جائے تو وہ معاشرہ کبھی اپنی اخلاقی منزل کو نہیں پا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ منافقین نے تو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے اور سازشیوں نے اپنے مذموم ارادے پورا کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے برے ارادوں اور مساعی ذمیمہ کا علاج کرتے ہوئے ایسا قانون دیا اور ایسے نصائح سے نوازا جس نے مسلمان معاشرے کی نہ صرف کمزوریوں کو دور کیا بلکہ ان میں بہتر سے بہتر اخلاق کیلئے زمین ہموار کردی۔ اور شاید ایک اور بات کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح جرمِ زنا کی انتہائی سزا مقرر فرمائی اسی طرح اس کے ثبوت میں نہایت احتیاط سے کام لیا اور ہر طرح کی بے احتیاطی کرنے والوں کو سخت سزا کی تنبیہ کی، لیکن یہی احتیاط جس میں کوتاہی سے حدِ قذف تک نوبت پہنچ سکتی تھی، میاں بیوی کے معاملے میں اگر اسے باقی رکھا جاتا تو شوہر اپنی بیوی کی بدچلنی پر کڑھتا اور خون کے آنسو پیتا، لیکن اس کا کوئی علاج نہ کر پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاص کرم فرمایا کہ اس نے ان پیچیدگیوں سے نجات کا راستہ اس امت کو دیا جس کی وجہ سے بداخلاقی کا انسداد بھی ہو گیا اور دلوں کو اطمینان بھی مل گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ
بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ
وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ
ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَاۤ
اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۲﴾ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا
بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ

Marfat.com

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ
اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٤﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ
بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ
اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ
نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ
اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ
الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٩﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ
رَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٠﴾ ع

رکوع: ۲۔ (بیشک جو لوگ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے، تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کیلئے تو ایک عذاب عظیم ہے۔ ۱۱) ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سنی تو مومن مرد اور مومن عورتیں اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک صریح بہتان ہے۔ ۱۲) وہ لوگ اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے، تو جب یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ ۱۳) اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی دنیا اور آخرت میں، تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں ایک بڑا عذاب تمہیں آ پکڑتا۔ ۱۴) ذرا خیال کرو (اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ۱۵) اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں، اے اللہ تو پاک ہے، یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ ۱۶)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ ۱۷) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ ۱۸) بیشک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلے، ان کیلئے دنیا اور آخرت میں ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۱۹) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم بھی نہ بچ سکتے۔ ۲۰)

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْکِ عُصْبَةٌ مِّنْکُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّکُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ؕ لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ مَّا اکْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱﴾

(بیشک جو لوگ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے، تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کیلئے تو ایک عذابِ عظیم ہے۔ ۱۱)

اس آیتِ کریمہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر لگائے جانے والے بہتان سے براءت کا اعلان کیا جا رہا ہے اور اس کے ضمن میں اس بہتان کی حقیقت اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات سے متعلق ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں۔

اِفک کا مفہوم

سب سے پہلی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس بہتان کو اِفک کے نام سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اِفک جھوٹی، من گھڑت، خود تراشیدہ اور خلافِ حقیقت بات کو کہتے ہیں۔ اس بہتان کو اِفک کے نام سے تعبیر فرما کر بہتان کی قلعی کھول دی گئی ہے کہ یہ بہتان جن لوگوں نے لگایا ان کی سیرت و کردار اور اسلام کے بارے میں ان کے ارادے بجائے خود اس بات کی شہادت ہیں کہ اس بہتان کی کوئی حقیقت نہیں اور جس ذاتِ عزیز پر لگایا گیا اس کا مقام و مرتبہ، اس کا سیرت و کردار، اس کی اعلیٰ نسبتیں اور ذاتِ رسالت کیلئے اس کا انتخاب، ان میں سے ایک ایک بات اس بہتان کے اِفک ہونے کی قطعی شہادت دیتی ہے چونکہ یہ بہتان نہ اپنے اندر کوئی اصل رکھتا تھا اور نہ کوئی وزن۔ اس لئے پروردگار نے اس کی طرف اشارہ ضرور کیا لیکن اس کی تفصیلات کو ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور مزید یہ بات کہ جس طرح باغیرت بیٹے کے سامنے اس کی عفیفہ ماں پر لگائے جانے والے بہتان کا تذکرہ بجائے خود ایک عیب ہوتا ہے اور بیٹا کبھی اسے برداشت نہیں کرتا کہ کوئی شخص اس کی ماں کا تذکرہ اس طرح کے بہتان کے حوالے سے کرے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حیثیت اس امت کیلئے حقیقی ماں سے بھی بڑھ کر ہے۔ جن لوگوں نے ان کے بارے میں یہ ناپاک جسارت کی ہے یہ جسارت بجائے خود اسلام کے بارے میں ان کے بغض کو ثابت کرنے والی ہے، اور وہ اپنے اسی بغض کے باعث مسلمانوں سے کاٹ دیئے جائیں گے اور قیامت کے دن عذابِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ لیکن امت کے کسی ایک فرد کو بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس بہتان کو اپنی زبان پر لائے۔ اس لئے پروردگار نے اس کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھا۔ لیکن تفسیر کی ضرورت کے تحت مجبوری ہے کہ تفسیر کے قارئین کو بتایا جائے کہ واقعہ کی اصل حقیقت کیا تھی۔ یوں تو ہم اس کی تفصیل سورۃ کے تعارف میں ذکر کر چکے ہیں لیکن ہم بارِ دیگر ربطِ کلام کیلئے نہایت اختصار سے ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

واقعۂ اِفک کا مختصر ذکر

۶ ہجری میں غزوہ بنی مصطلق پیش آیا۔ آنحضرت ﷺ اس غزوہ سے فتح مند ہوکر واپس تشریف لا رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک الگ اونٹ پر آپ کی ہم سفر تھیں۔ راستے میں فوج نے رات کے وقت غالباً مدینہ سے ایک منزل دور پڑاؤ ڈالا۔ رات کے پچھلے پہر ام المومنین ضرورت سے باہر نکلیں۔ اتنے میں فوج کے کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ ام المومنین رفع حاجت سے فارغ ہوکر واپس آ رہی تھیں، معلوم ہوا کہ وہیں آپؓ کا ہار گر گیا ہے۔ آپؓ کو ہار ڈھونڈتے کچھ دیر لگی۔ اسی اثناء میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ ام المومنین کے ساربان اور ان کے ساتھی آپؓ کے ہودج کو اٹھاتے ہوئے یہ محسوس نہ کرسکے کہ آپؓ ہودج میں موجود نہیں ہیں۔ ام المومنین جب پڑاؤ کی جگہ پر واپس آئیں اور دیکھا کہ قافلہ روانہ ہوگیا ہے تو شب میں اس کے سوا انہیں اور کوئی تدبیر نہ سوجھی کہ وہیں ٹھہر جائیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ پیدا کردے۔ حضرت صفوان صحابی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ بھولی بسری چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ جب صبح کو پڑاؤ کی جگہ پر پہنچے اور دیکھا کہ ام المومنین پیچھے رہ گئی ہیں تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا۔ ان کی آواز سے حضرت عائشہ صدیقہؓ اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے اپنا اونٹ پاس لاکر بٹھا دیا۔ ام المومنین اس پر سوار ہوگئیں۔ انہوں نے مہار پکڑ کر اونٹ کو قافلے سے جا ملایا۔ فوج کے کوچ اور مقام کے دوران میں اس قسم کے واقعہ کا پیش آجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ لیکن منافقین نے اس ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا دیا۔ چونکہ یہ بات سراسر بے اصل تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اِفک قرار دیا۔ سفر سے واپسی پر ام المومنین بیمار پڑ گئیں۔ کافی دنوں کے بعد اجازت لے کر اپنے والدین کے پاس تشریف لے گئیں، لیکن انہیں کچھ پتہ نہیں کہ باہر ان کے بارے میں کیا غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں۔ اپنے والدین کے گھر جب انہیں علم ہوا تو ان کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ نہ دن کو آرام نہ رات کو چین، ہر وقت رونے سے کام۔ آخر ایک روز آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے اور وہیں آپؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضورؐ بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری براءت نازل فرمادی اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں پڑھ کر سنائیں جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی براءت کرنے سے پہلے پروردگار نے پورا ایک رکوع زنا اور قذف اور لعان کے احکام کے بارے میں وقف کیا ہے۔ توجہ شاید اس طرف دلانی ہے کہ زنا کے الزام کا معاملہ کوئی معمولی بات نہیں، بالخصوص وہ امت جس کا پیغمبر دنیا میں مکارمِ اخلاق کا پیکر بن کر آیا اور جس کا سب سے بڑا ہدف یہ ہے کہ وہ امت کو حُسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ کرے جس کے خیالات، تصورات، افکار، خواہشات، رجحانات اور اعمال اس قدر پاکیزہ ہوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر حیاء کی تلقین رکھتا ہو۔ بے حیائی کی پرچھائیں بھی اس امت کیلئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے نوجوان ایسی پاکیزہ جوانی کے حامل ہوں جو حفظِ فروج اور غضِ بصر کی احتیاطوں سے گراں بار ہوں۔ ایسی امت اور اس کے معاشرے میں زنا کا ذکر ایک زلزلہ برپا ہونے سے کم نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے اپنے معاشرے کو شرم و حیاء کا جوہر دینے کیلئے جس تعلیم سے آراستہ کیا اور ان کے دل و دماغ کو پاکیزہ بنانے کیلئے تزکیہ کی جس تربیت سے گزارا یقیناً اس میں کہیں کوئی خامی باقی رہ گئی ہے۔ چنانچہ ایسے سوتوں کو بند کرنے کیلئے جہاں سے بے حیائی کے جراثیم داخل ہوسکتے ہوں ضروری ہے کہ ایک سخت قانون نافذ کیا جائے جس سے وہ لوگ جو اصلاحی تدابیر سے متاثر ہونے کی بجائے ابھی تک اپنے اندر برائی کے میلانات رکھتے ہیں ان کا علاج کیا جائے اور معاشرے کو ان کے اثرات سے بچایا جائے اور جو لوگ محض تفریحِ طبع کے طور پر لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے اور پاکدامن مرد و عورت پر ایسے گھناؤنے الزامات لگا کر

Marfat.com

بے حیائی کے فروغ کا راستہ کھولتے ہیں انہیں سخت سزا دے کر معاشرے کو ان کے اثراتِ بد سے بچایا بھی جائے اور ان کے اصل چہرے بھی نمایاں کیئے جائیں۔ اور اگر خدانخواستہ بے حیائی کے اثرات گھروں میں داخل ہو جائیں تو انہیں بھی ایک سخت قانون کا پابند بنا کر گھروں کو صحیح معنی میں نئی نسل کا وہ حصار بنایا جائے جس میں حتی الامکان کوئی شیطانی اثر اپنا راستہ نہ بنا سکے۔

بہتان لگانے والے کون تھے؟

آیتِ کریمہ میں بہتان کی حقیقت کھولنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہر ذی فہم اور سنجیدہ شخص واقعہ کے مَالَهُ وَمَا عَلَيْهِ کو دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا کہ اس بہتان کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن عام سادہ دل مسلمان اس پراپیگنڈے سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہو رہے تھے جو شب و روز پوری قوت سے جاری تھا۔ اور چند گنتی کے افراد تو باقاعدہ اس بے ہودہ بات کو پھیلانے میں شریک ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام ذمہ دار لوگ اس انتظار میں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی صورتحال میں کوئی واضح احکام اتریں تاکہ اس پریشانی سے نجات ہو سکے۔ لیکن جیسے جیسے وحیِ الٰہی کے نزول میں تاخیر ہو رہی تھی، ویسے ویسے مسلمانوں کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس تمام صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی پریشانی اپنی جگہ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اس لایعنی اور بے ہودہ بات کو بتنگڑ بنا کر پھیلا رہے ہیں وہ کون لوگ ہیں، وہ خود تم ہی میں سے ایک گروہ ہے۔ اس میں اشارہ منافقین کی طرف ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو ابھی تک مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے ہیں اور سادہ دل مسلمانوں کو یقین دلائے رکھتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح مسلمان ہیں اور ہمیں بھی اسلام اسی طرح عزیز ہے جیسے تمہیں۔ اور پھر اسی پردے میں ان کے ذہن میں وہ باتیں اتاری جاتی ہیں جو سراسر اسلام کے خلاف ہوتی ہیں۔ یہ بہتان چونکہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں نے تراشا اور پھیلایا تھا اس لئے مِنْكُمْ سے ان کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور بعض مسلمانوں کی سادگی کا عالم یہ ہے کہ وہ اب بھی ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں اور بعض طبیعتوں میں ان کیلئے جو نرم گوشہ پایا جاتا ہے اس کا اظہار تو اسی واقعہ کے ضمن میں اس وقت ہوا جب قبیلہ اوس کے سردار حضرت اسید بن حضیرؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ حضور یہ شخص اگر خزرج سے تعلق رکھتا ہے تو آپؐ ہمیں حکم دیجئے ہم اس کی تعمیل کریں گے، تو حضرت سعد بن عبادہؓ اپنے تمام تر اخلاص اور دینی خدمات کے باوجود عبداللہ بن اُبی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منافقین کس طرح ابھی تک مسلمانوں کے دلوں میں زندہ تھے۔

شر میں خیر کے پہلو

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تم یہ گمان مت کرو کہ منافقین کی یہ کاوشیں تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ اور ایسا مکروہ بہتان تمہارے لئے شر کا باعث بنے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہی خیر ہے۔

اس حوالے سے جب ہم غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ خیر کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ مسلمان اپنی سادگی سے جن منافقین کو اپنا سمجھ رہے تھے اس واقعہ نے ان کو یقین دلا دیا کہ یہ تو سانپوں کا وہ گروہ ہے جو ہماری آستینوں میں گھسا ہوا ہے اور جب بھی اس کو موقع ملتا ہے یہ ہمیں ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی اس بہتان طرازی نے پوری طرح ان کا گھونگٹ الٹ ڈالا اور مسلمانوں کو ان کا اصل چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔

Marfat.com

دوسرا خیر کا پہلو اس میں یہ تھا کہ اس واقعہ کی اشاعت نے سادہ دل مسلمانوں کی اس کمزوری کو نمایاں کر دیا کہ اگر کوئی شخص پراپیگنڈے کے زور سے ان سے کوئی ایسی بات منوانا چاہے یا ان کی زبانوں پر لانا چاہے جو کسی طرح بھی ان کیلئے مناسب نہیں، تو اسے کہیں نہ کہیں اس کیلئے مناسب جگہ مل جاتی ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے نتیجہ میں مسلمانوں نے خود اپنی اس کمزوری کو محسوس کیا اور پروردگار نے اس سورۃ میں ایسے احکام نازل فرمائے جس سے مسلمانوں میں اس طرح کی کمزوریوں کا علاج ہو گیا۔ اور تزکیہ کا وہ پہلو جو نگاہوں سے اوجھل تھا وہ نکھر کر سامنے آ گیا۔

اور خیر کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ نے معاشرے کی اصلاح و تنظیم سے متعلق بہت سے احکام و ہدایات کے نزول کیلئے ایک نہایت سازگار فضاء پیدا کر دی۔ ان احکام کو تو بہر صورت مسلمانوں پر تو لاگو ہونا ہی تھا لیکن اگر یہ فضاء پیدا نہ ہوتی تو شاید ان احکام کی حقیقی قدر و قیمت بہت سے مسلمانوں پر واضح نہ ہو سکتی۔

اسی بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تمام اسلام دشمن قوتیں میدانِ حرب و ضرب میں شکست کھا جانے کے بعد یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ مسلمان چونکہ اخلاقی میدان میں اتنا واضح تفوق رکھتے ہیں کہ اس کا مقابلہ کرنا تو ممکن نہیں البتہ یہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ان کیلئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے جائیں کہ وہ آپس میں الجھ جائیں اور وہ کمزوریاں جو اختلافات اور اتہامات کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتی ہیں اس میں پھنس کر رہ جائیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ اس بہتان نے اگرچہ مسلمانوں کو سخت ابتلاء میں ڈالا لیکن وہ بجائے کسی کمزوری کا شکار ہونے کے اعلیٰ کردار کا نمونہ ثابت ہوئے۔ نبی کریم ﷺ ایک ماہ تک سخت اذیت میں مبتلا رہے لیکن آپؐ کے ضبط و تحمل نے کہیں بھی آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آپؐ کا ایک اشارہ ان لوگوں کی گردنیں اڑا دینے کیلئے کافی تھا جنہوں نے آپؐ کی عزت پر حملہ کیا تھا، مگر آپؐ نہایت کریم النفسی سے وحیِ الٰہی کا انتظار کرتے رہے اور کہیں بھی آپؐ نے انتقامی کارروائی کا تاثر نہیں دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لختِ جگر کو اس الزام کا ہدف بنایا گیا، لیکن آپؓ شدتِ غضب میں بے قابو ہونے کی بجائے نہایت صبر سے معاملہ کو دیکھتے رہے۔ آپؓ کا اپنا بھانجا باوجود اس کے کہ آپؓ اس کی کفالت کرتے تھے اور وہ آپؓ کے احسانات کا مرہون تھا وہ برابر آپؓ کے دل و جگر پر تیر چلاتا رہا۔ لیکن نہ آپؓ نے اس سے قرابت داری کا تعلق توڑا اور نہ اس کے خاندان کی کفالت سے انکار کیا۔ سوکن کا رشتہ ہر معاشرے میں بدنام اور نازک رشتہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس ابتلاء کے موقع پر کسی نے بھی کوئی منفی رویہ اختیار نہ کیا۔ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں ازواج رسول اللہ ﷺ میں سب سے زیادہ حضرت زینبؓ ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر جب رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کے ضمن میں ان سے پوچھا کہ عائشہ کے متعلق تم کیا جانتی ہو؟ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ خدا کی قسم میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسان ابنِ ثابت نے انہیں بدنام کرنے میں نمایاں حصہ لیا، مگر وہ ان کے ساتھ ہمیشہ عزت و تواضع سے ہی پیش آتی رہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا حال تھا جن کا اس معاملے سے براہ راست تعلق تھا، جہاں تک عام مسلمانوں کا معاملہ ہے ان کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ان کی بیوی نے جب ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے، ایوب کی ماں! اگر تم عائشہ کی جگہ اس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟ تو وہ بولیں خدا کی قسم میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی۔ حضرت ابوایوب نے کہا عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں، اور میں کہتا ہوں اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا۔ صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔ اس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔

Marfat.com

اس واقعہ میں خیر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قومیں ہمیشہ عقیدت میں غلو کے باعث گمراہ ہوتی رہی ہیں۔عیسائی آج تک اس غلو سے باہر نہ نکل سکے۔انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم رسول کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا لیکن اللہ تعالیٰ کے اس آخری دین کو چونکہ اس طرح کے ہر خطرے سے محفوظ رکھنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں (حالانکہ آپؐ سید الاولین والآخرین ہیں) ایسے حالات پیدا فرمائے جس نے مسلمانوں کے عقائد کی صحیح تربیت کی اور ان کے خیالات کو صحیح نہج پر قائم رکھا۔

قوموں نے اپنے نبیوں کے بارے میں جو غلط تصورات باندھے ان میں سے ایک غلط تصور ہمیشہ ان کی غیب دانی کا رہا ہے۔لیکن قرآنِ کریم میں جابجا آنحضرت ﷺ کی زبان سے اعلان کرایا گیا کہ میں غیب نہیں جانتا، عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، میں وہی جانتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھ پر وحی کرتا ہے۔میں دنیا کا سب سے بڑا عالم ہوں، انسانی اصلاح اور ہدایت کے حوالے سے کوئی میرا ہمسر نہیں۔ بااین ہمہ میں وہی کچھ جانتا ہوں جو میرا اللہ مجھے عطا فرماتا ہے۔اس واقعہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ ایک مہینے تک سخت پریشان رہے۔کبھی خادمہ سے پوچھا، کبھی ازواجِ مطہرات سے، کبھی حضرت علیؓ سے اور کبھی حضرت اسامہؓ سے۔بالآخر خود حضرت عائشہؓ سے اس معاملے کے بارے میں استفسار کیا۔لیکن آپؐ کو حقیقت کا علم اس وقت تک نہ ہوا جب تک آپؐ پر وحی کا نزول نہیں ہوا۔آپؐ کے چہرے پر اس وقت مسکراہٹ آئی جب اللہ تعالیٰ نے ام المومنین کی براءت کیلئے سورۃ النور کی دس آیتیں نازل فرمائیں۔اور ان آیتوں کے ذریعے آپؐ کو وہ علم حاصل ہوگیا جو اس سے پہلے نہ تھا۔یہ ایک بالکل سادہ سی بات ہے جو اس واقعہ میں معمولی غور و فکر سے بھی سامنے آجاتی ہے، لیکن نہ جانے کچھ لوگوں کو اس بات کا خیال کیوں ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اس بات کو تسلیم کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو جس بات کا چاہتا ہے علم دیتا ہے۔وہ اس بات پر زور لگاتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول وحیِ الٰہی کے نزول سے پہلے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔

عام حالات پر تبصرے کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے بھی اس بہتان کو پھیلانے میں حصہ لیا ہے وہ اس کے بارِ گناہ سے بچ نہیں سکتا۔اور جتنا حصہ لیا ہے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں معتوب ہوگا۔اور جس شخص نے اس معاملے میں سب سے زیادہ حصہ لیا بلکہ اس بہتان کو تراشا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عذابِ عظیم کا مستحق ہوگا۔اشارہ عبداللہ بن اُبی کی طرف ہے۔بعض لوگوں نے اس اشارے کا مشار الیہ بعض دوسرے لوگوں کو ٹھہرایا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے اس الزام کی نشر و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ان میں دو منافق ہیں عبداللہ بن اُبی اور زید بن رفاعہ۔اور تین مسلمان ہیں مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش۔تین مسلمانوں پر حدِ قذف جاری کی گئی۔ منافقین کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ ان پر حد جاری کی گئی یا انہیں قیامت کے عذاب کیلئے چھوڑ دیا گیا۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

(ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سنی تو مومن مرد اور مومن عورتیں اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو ایک صریح بہتان ہے۔ ۱۲)

Marfat.com

نامناسب بات پر مسلمانوں کا ردِ عمل کیا ہونا چاہئے

واقعۂ اِفک کے بارے میں جس طرح کچھ زبانوں کو کھلنے کا موقع ملا اور کچھ طبیعتیں ان کے پراپیگنڈے سے متاثر ہوئیں اور بیشتر مسلمان جس طرح زبانیں بند کئے غم میں ڈوبے رہے اور ایک ایسا اجتماعی ردِ عمل سامنے نہیں آیا جس سے پہلے ہی مرحلے میں زبانیں بند ہو کے رہ جاتیں۔ اس پر توجہ دلاتے ہوئے پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ مسلمانو جب تم نے اپنے کانوں سے یہ افواہ سنی تو تم اس بات کا خیال کیوں نہ کر سکے کہ تمام مسلمان جسدِ واحد کی مانند ہیں۔ جب کسی شخص کے بارے میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں کے جسم کے کسی حصے کو چھیدنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کسی مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ درحقیقت ہر مسلمان کی عزت پر حملہ ہے۔ اس امت کو تعلیم و تزکیہ کے جن مراحل سے گزارا گیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ جن مکارمِ اخلاق کی ان میں تخم ریزی کی گئی ہے ان کی موجودگی میں اس طرح کی افواہوں کا جنم لینا اور پھر ان کا زبانوں پر چڑھ جانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے احساسات میں ابھی تک محبت کا وہ رنگ پیدا نہیں ہوا جس سے اجتماعی یکرنگی وجود میں آتی ہے اور وہ اپنائیت پیدا نہیں ہوئی جس سے مختلف قالب یکجان ہو جاتے ہیں اور امت کے تمام افراد جسدِ واحد کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور وہ جب کسی دوسرے کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس طرح سوچتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اگر ایسی صورتحال پیدا ہو چکی ہوتی تو فوراً طبیعتوں میں یہ ردِ عمل پیدا ہونا چاہئے تھا کہ اگر میں سفر میں تنہا کسی عورت کو دیکھتا تو یقیناً اسے اپنی بہن سمجھتا اور کبھی کوئی ناشائستہ تصور بھی میرے ذہن میں راہ نہ بنا سکتا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ صفوان میرے ہی جسم کا ایک حصہ ہیں اور ہم ایک ہی نوبہار کے پروردہ ہیں اور ہمیں ایک ہی فکر اور عقیدے نے وجود بخشا ہے، تو میں ان کے بارے میں یہ کیسے گمان کر سکتا ہوں کہ وہ ام المومنینؓ کو دیکھ کر جبکہ وہ ان کیلئے حقیقی ماں سے بڑھ کر محترم ہیں اپنے دل میں کوئی نامناسب جذبہ محسوس کرتے۔ اگر ایسے ہی تصورات تمام دلوں میں پیدا ہوتے تو منافقین کی زبانیں کبھی کھلنے کا حوصلہ نہ کر سکتیں۔

شاید اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مومن اپنے ایمان کی سلامتی کے ساتھ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے بارے میں اس وقت تک حُسنِ ظن رکھا جائے جب تک دلیل سے یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ وہ حُسنِ ظن کا مستحق نہیں رہا۔ اسی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ جب کسی مسلمان کے بارے میں کوئی نازیبا بات کانوں تک پہنچے تو سننے والا مسلمان اسے فوراً جھٹک دے اور دل میں اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں اس وقت تک بدگمانی نہ آنے دے جب تک کہ حالات وشواہد اڑتی ہوئی بات کو سچا ثابت نہ کر دیں، بلکہ اسلام نے اس سے بھی بڑھ کر ایک مومن کو یہ حق دیا ہے کہ اگر کسی دوسرے مومن کے سامنے اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو دوسرے مسلمان بھائی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اگر اس کا ازالہ کر سکتا ہو تو ضرور کرے اور اگر مدافعت کر سکتا ہو تو مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ قرنِ اول میں مسلمانوں کا طرزِ عمل ہم یہی دیکھتے ہیں۔ وہ کسی مسلمان کے بارے میں بغیر ثبوت کے کوئی ناشائستہ بات سننے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں میں سیرت و کردار کا قحط پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ مسلمان ہر سطح سے گرتے چلے گئے تو اب حال یہ ہے کہ کسی کے بارے میں اگر کوئی نامناسب بات کہی جاتی ہے تو دل اسے سوغات سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اور زبانیں اسے زیب داستاں بنا لیتی ہیں۔ کان انہیں آویزۂ گوش تصور کرتے ہیں اور جو اخبار یا مجلہ ایسی بے سروپا افواہیں پھیلانے میں سبقت کر جاتا ہے اس کی اشاعت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ تباہی مسلمان معاشرے میں اسی وجہ سے آئی ہے کہ مسلمانوں میں باہم جسدِ واحد کا تصور ختم ہو گیا اور باہمی حُسنِ ظن کی بجائے بدگمانیوں کو وطیرہ بنا لیا ہر شخص اپنی ذات کے گنبد میں مست رہنے لگا، مفادات اور خواہشوں نے عقلوں پر پردے ڈال دیئے۔ چنانچہ قرآنِ کریم اسی بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کر رہا ہے کہ تم میں تو کوئی ایسی کمزوری نہیں ہونی چاہئے۔ تمہیں تو یہ چاہئے تھا کہ جیسے ہی یہ بات تمہارے کانوں میں پہنچی تم صاف اعلان کر دیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان اور ایک صریح تہمت ہے، ہم کبھی اسے قبول نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

(وہ لوگ اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے، تو جب یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ ۱۳)

شہادت ہی اصل ثبوت ہے

ذہن میں اس بات کو تازہ کیجئے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک غلط فہمی کے باعث قافلے سے پیچھے رہ گئیں۔ حضرت صفوانؓ اپنے معمول کے مطابق قافلے کے بعد قافلے کے سامان کی دیکھ بھال کرتے ہوئے وہاں پہنچے۔ انہوں نے جیسے ہی آپؓ کو دیکھا، نہایت تأسف کا اظہار کیا، خاموشی سے قریب لا کر اونٹ بٹھایا، آپؓ اس پر سوار ہو گئیں، وہ مہار پکڑ کر پیدل چلتے ہوئے قافلے تک جا پہنچے اور آپؓ کو آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچا دیا۔ جو شخص غیر جانبداری اور خالی الذہن ہو کر اس واقعہ کو دیکھے گا اسے اس میں دور دور تک کوئی ایسی بات دکھائی نہ دے گی جس سے الزام کی بو آتی ہو، اور کوئی شخص یہ سوچنے کی کبھی غلطی نہیں کر سکتا کہ حضرت عائشہؓ قصداً پیچھے رہ گئی ہوں، کیونکہ آپؓ کے نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ حضرت صفوان سے کوئی تعلقات تھے۔ ایسی صورتحال میں اس واقعہ سے الزام کشید کرنا ایک مذموم اور مسموم ذہن کی کاوش تو ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ اور ایسی کاوش کو اسی صورت میں درخور اعتنا سمجھا جا سکتا ہے جب الزام لگانے والا چار گواہوں سے اس الزام کو ثابت کرے۔ کیونکہ گواہوں کے علاوہ اس الزام کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ سورۃ النساء میں ایسے الزامات کے ثبوت کیلئے چار گواہوں کی شرط پہلے سے اسلامی قانون کا حصہ بن چکی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ الزام لگانے والے گواہ پیش نہیں کرتے تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی نگاہ میں یہی لوگ جھوٹے ہیں، اور ان پر حدِ قذف جاری ہونی چاہیے۔ چہ جائیکہ ان کی باتوں کو سننے کیلئے دلچسپی کا اظہار کیا جائے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

(اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی دنیا اور آخرت میں، تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں ایک بڑا عذاب تمہیں آ پکڑتا۔ ۱۴) ذرا خیال کرو (اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ۱۵)

اَفَاضَ فِي الْحَدِيْثِ کا مفہوم ہے بات میں سے بات نکالتے چلے جانا، اور بات کا بتنگڑ بنا دینا۔

Marfat.com

ایک تنبیہ

واقعہ کی سنگینی کے باعث مزید تنبیہ فرمائی جارہی ہے کہ جس طرح تم میں سے ایک محدود گروہ نے سفر کے اس معمولی واقعہ کو بہت بڑا حادثہ بنادیا اور پھر اپنی شبینہ مجلسوں اور تنہائی کی محفلوں میں گفتگو کا موضوع بنائے رکھا اور بعض مخلص مسلمانوں نے کسی نہ کسی حد تک اس کا اثر قبول کرلیا، یہ ایسا واقعہ نہ تھا جسے آسانی سے برداشت کرلیا جاتا۔ چونکہ یہ امت ابھی زیر تربیت ہے اور آئے دن کے غزوات اور ہنگامی حالات فضاء میں ارتعاش پیدا کئے رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت میں تسلسل اور یکسانی باقی نہیں رہتی اور ان ہی حالات کے باعث منافقین کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے پروردگار بعض لوگوں پر سخت گرفت کی بجائے اور یہ بھی محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ وہ لوگوں کو سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے، ورنہ جس طرح کی صورتحال پیدا کردی گئی تھی اس میں تو شدید اندیشہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہت بڑا عذاب نازل ہوجاتا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ تم خود غور کرو کہ جب تم میں سے کچھ لوگوں کی زبانیں اس غمناک واقعہ کو مزے لے لے کر پھیلا رہی تھیں اور تم اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہہ رہے تھے جس کی حقیقت کی تمہیں کوئی خبر نہ تھی۔ اور تم یہ سمجھ رہے تھے کہ کسی مرد وعورت کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، لوگوں میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں، اس لئے اگر اس واقعہ میں دلچسپی لی جائے اور اسے غیر سنجیدہ گفتگو کا موضوع بنالیا جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ لیکن تمہیں معلوم نہ تھا کہ یہ واقعہ کسی عام مرد وعورت کا واقعہ نہیں۔ جس عظیم خاتون کے بارے میں یہ الزام لگایا جارہا ہے وہ آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ، آپؐ کی محبوب رفیقۂ حیات، مسلمانوں کی ماں اور حقیقی ماؤں سے بڑھ کر واجب الاحترام ہیں اور ان کے والد گرامی مسلمانوں کے سب سے بڑے محسن، آنحضرت ﷺ کے محرم اسرار اور آنحضرت ﷺ کے بعد مرجع خلائق ہیں اور خود آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کی قلبی اذیت کا سب سے بڑا سبب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ آپؐ کی اس محبوب بیوی پر الزام لگایا گیا جو آپؐ کی سب سے زیادہ توجہات کا مرکز اور آپؐ کی مزاج آشنا تھیں۔ ان پر الزام لگنے سے آپؐ کا عائلی سکون واطمینان غارت ہوکر رہ گیا، اور جب تک یہ آیاتِ براءت نازل نہیں ہوئیں، کسی نے آپؐ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ جن لوگوں نے یہ سب کچھ کیا، کاش انہیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اذیت پہنچانا، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا ہے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اس نے اپنی عاقبت تباہ کرلی۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾

(اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ افواہ سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر لائیں، اے اللہ تو پاک ہے، یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ ۱۶)

ایک اور پہلو سے تنبیہ

پیشتر ازیں آیت ۱۲ کا آغاز بھی ان ہی الفاظ سے ہوا ہے جن الفاظ سے اس آیت کا آغاز ہو رہا ہے، لیکن وہاں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب تمہارے اندر اس بہتان کی افواہ پھیلی تو تمہیں فوراً مسلمانوں کے آپس میں حقیقی رشتے کی یاد تازہ ہونی چاہئے تھی۔ اور اگر اس رشتے کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا تو اس الزام کو پھیلنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں ایک اور حوالے سے بھی اس بہتان کو زبان پر لانے سے اجتناب کرنا چاہئے تھا۔ اور اس حوالے کا ذکر سُبْحٰنَکَ کے لفظ سے کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے

Marfat.com

کہ اللہ تعالیٰ کا رسول کوئی کام اللہ تعالیٰ کے حکم یا اس کی اجازت کے بغیر نہیں کرتا۔ اور مزید یہ کہ اس کے ہر کام کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے، کیونکہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہے۔ اس اصول کے تحت اللہ تعالیٰ کا رسول جب کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے یہ نکاح بروئے کار آتا ہے۔ اگر آگے چل کر پیغمبر کی بیوی کسی ایسی کمزوری کا شکار ہوتی ہے جو ذاتِ رسالت مآب کی صحبت کے شایانِ شان نہ ہو تو اس کا حرف جہاں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر آتا ہے، وہیں اللہ تعالیٰ کی ذات جل جلالہ پر بھی آتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ آنحضرت ﷺ کی سب سے محبوب رفیقہ حیات ہیں اور احادیث کی صراحت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؓ کا آنحضرتؐ سے نکاح ہوا، اور ہجرت کے بعد رخصتی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام امہات المومنین میں سب سے زیادہ آپؓ کو علمِ شریعت عطا فرمایا۔ اور آنحضرت ﷺ پر اس وقت وحی نازل ہوتی جب آپؐ حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہوتے تھے۔ آپؐ کی زبان فیض ترجمان سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بیشمار فضائل بیان ہوئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ کسی کمزوری کا شکار ہوتی ہیں تو اس کی زد براہِ راست اللہ تعالیٰ کے انتخاب اور آنحضرت ﷺ کے اعتماد پر پڑتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کی طرف کسی کمزوری کو منسوب کیا جائے یا اس کا کوئی انتخاب غلط ثابت ہو۔ چنانچہ جیسے ہی یہ بہتان مسلمانوں کے کانوں تک پہنچا تھا، انہیں یہ سوچ کر کہ یہ بہتان درحقیقت ام المومنین پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عظیم پر ہے۔ فوراً کہہ دینا چاہئے تھا کہ ہم ایسی بے ہودہ بات کو کبھی زبان پر لانے کی جسارت نہیں کرسکتے، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے جسے دشمنوں نے اختراع کیا ہے۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

(اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ ۱۷) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ ۱۸)

گزشتہ تین آیات کی طرح اس آیت میں بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے اور یہ تنبیہات کا بار بار آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اِفک کا جو واقعہ پیش آیا انسانی زندگی کے عام معمولات کے اعتبار سے وہ کوئی حیرت انگیز اور تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں اور ہر معاشرہ اپنے طریقے کے مطابق ان سے عہدہ برآ ہوتا رہتا ہے، لیکن یہ واقعہ اس لحاظ سے نہایت تکلیف دہ اور حیرت انگیز ہے کہ اس کے پیچھے یہود کی سازش کارفرما ہے اور اس کیلئے منافقین کو آلۂ کار بنایا گیا ہے اور یہ جان کر اس کی خطرناکی میں اور اضافہ ہوجاتا ہے کہ اس کا نشانہ کاشانہ نبوی اور اہلِ بیتِ رسول اللہ کو بنایا گیا ہے۔ عام لوگ تو اس بات کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن صاحبِ ایمان لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دلآزاری کس قدر خطرناک نتائج کا باعث ہوسکتی ہے۔ تو اس واقعہ نے چونکہ آنحضرت ﷺ کو بے حد پریشان رکھا اس لئے اس بات کا شدید امکان ہوسکتا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوجاتا۔ لیکن بعض دینی مصالح کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس امت پر فضل فرمایا اور رحمت کا معاملہ کیا، اور بار بار تنبیہات کے ذریعے اچھی طرح اس بات کو واضح کردیا کہ ایسا واقعہ پھر کبھی نہیں ہونا چاہئے ورنہ ممکن ہے دوبارہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنے کی کوئی سبیل نہ ہوسکے۔ اور آیات کی وضاحت سے شاید اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم نے نہایت تفصیل سے احکام بھی دے دیئے ہیں جس سے اس طرح کی صورتحال کے روکنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ علیم اور حکیم ہے اس لئے اس نے انسانی فطرت کو جانتے ہوئے مناسب احکام بھی دیئے اور بار بار تنبیہات بھی فرمائیں اور چونکہ وہ حکیم ہے اس لئے اس نے اس اٹھتی ہوئی نوزائیدہ امت کو مزید سنبھلنے، منافقین کو پہچاننے اور ان کا استیصال کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

(بیشک جولوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلے، ان کیلئے دنیا اور آخرت میں ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۱۹)

منافقین کی طرف اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں منافقین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہ فتنہ برپا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہود کے زیرِ اثر تھے اور ان کے آلۂ کار کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یہود نے جب محسوس کیا کہ مسلمانوں کی قوت کا اصل راز ان کا ایمان باللہ اور بلند کردار ہے تو چونکہ وہ پڑھے لکھے لوگ تھے اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی کہ مسلمان جس میدان میں دوسرے تمام لوگوں سے غیر معمولی تفوق رکھتے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے ہمسری تو کیا، برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے، انہیں اسی میدان میں ہدف بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اِفک کی صورت میں ایک ایسا فتنہ اٹھایا جس نے اگر ایک طرف ذاتِ نبوت اور کاشانۂ نبوی کو برہم کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو ادھیڑنے کا منصوبہ بنایا تو دوسری طرف انہوں نے سوچا کہ اگر یہ ہمارا منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے مسلمان معاشرے میں بے حیائی کی ایک لہر اٹھے گی۔ زبانیں بے روک ہوں گی، منافقین کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا، کسی گھر کی عزت اور اس کا اعتماد باقی نہیں رہے گا، بے حیائی کی باتیں جب زبانوں تک پہنچیں گی تو دلوں تک اترنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس طرح سے مسلمانوں کا وہ اخلاقی تفوق بہت حد تک کمزور پڑ جائے گا، لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم اور مسلمانوں کا مضبوط کردار تھا جس نے ان کے ارادوں کو ناکام کر دیا۔ پروردگار نے ان لوگوں اور ان کے برے ارادوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی کہ اگر یہ لوگ اس سے تائب نہ ہوئے تو ان کیلئے دنیا و آخرت میں عذابِ الیم ہے۔ دنیا میں بھی اپنا اصل چہرہ بے نقاب ہو جانے کے بعد یہ لوگ ذلت کی تصویر بن جائیں گے اور آج جو لوگ ان کی باتیں سننا گوارا کر لیتے ہیں، کل کو ان کے منہ پر تھوکیں گے اور نفرت کا اظہار کریں گے۔ لیکن آنے والے دن کو اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں علم کے باعث جانتا ہے، کیونکہ تم نہیں جانتے ابھی تک اس پر حالات کا غبار پڑا ہوا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ بے حیائی پھیلانا، نوجوانوں کو بدراہ کرنا، صنفِ نازک کو نسوانیت سے محروم کرنا، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور بے حیائی کے محرکات سے سفلی جذبات کو فطری جذبات کی صورت دے دینا، یہ آج کے دور کی گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی ہے اور جس کے پھیلانے بلکہ نافذ کرنے میں حکمران اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جو کام کبھی یہود منافقین سے لیتے تھے، آج وہی کام یہ جدید منافقین سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ ایک تو مسلمان ان منافقین کو پہچاننے سے قاصر ہو رہے ہیں اور اگر کہیں انہیں پہچان بھی لیا گیا ہے تو وہ اقتدار کی مسندوں پر فائز ہیں اور اپنے اقتدار کی قوت سے صرف اس لئے بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں تاکہ ہم مغرب کو یقین دلا سکیں کہ تم ہم پر اعتماد کر سکتے ہو۔ والی اللہ المشتکیٰ

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۰﴾

(اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم بھی نہ بچ سکتے۔ ۲۰)

Marfat.com

اس آیت کا پہلا حصہ آیت ۱۰ میں گزر چکا، البتہ دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ کی دو مختلف صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لَوْ کا جواب وہاں بھی نہیں دیا گیا تھا اور یہاں بھی نہیں دیا گیا۔ اس سے تنبیہ کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ وہاں مسلمانوں کو اپنی غلطیوں سے توبہ کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ رأفت ورحمت کا ذکر فرما کر شاید یہ تصور دیا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی امت ہے، سازشیں کرنے والے ہزار کوشش کریں چونکہ اللہ تعالیٰ کی رأفت ورحمت اس امت کو حاصل ہے اس لئے وہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ آئندہ مسلمانوں کا ہر قدم ان شاء اللہ فلاح وکامرانی کی طرف اٹھے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ
فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ
رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢١﴾ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ
اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا
فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ ﴿٢٣﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ
اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ
يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿٢٥﴾

Marfat.com

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

رکوع: ۳۔ (اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو، اور جو شخص شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ شیطان ہمیشہ بے حیائی اور برائی کی راہ دکھاتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا لیکن اللہ ہی ہے وہ جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۱) اور جو تم میں سے صاحبِ فضل اور کشادہ حال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے، انہیں چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۲۲) بیشک جو لوگ پاکدامن، بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ ۲۳) جس دن گواہی دیں گی ان کیخلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۲۴) اس دن اللہ تعالیٰ انہیں ان کا پورا بدلہ دے گا جس کے وہ حقدار ہیں اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق اور واضح کر دینے والا ہے۔ ۲۵) خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے، یہ مبرا ہیں ان تہمتوں سے جو وہ لگاتے ہیں، ان کیلئے ہی بخشش اور عزت والی روزی ہے۔ ۲۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًاۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

(اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی نہ کرو، اور جو شخص شیطان کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتا ہے تو وہ یاد رکھے کہ شیطان ہمیشہ بے حیائی اور برائی کی راہ دکھاتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا لیکن اللہ ہی ہے وہ جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۱)

خُطُوٰتِ، خُطْوَۃ کی جمع ہے۔ دو قدموں کے درمیان کی جگہ کو کہتے ہیں، یہ مصدر نہیں بلکہ اسم ہے۔

Marfat.com

برائی کا سرچشمہ

کسی پر تہمت لگانا، بہتان باندھنا، بے حیائی کو عام کرنے اور فروغ دینے کی ایک کوشش ہے۔ اسی سے عزتیں پامال ہوتی ہیں، باہمی تعلقات مجروح ہوتے اور ملی شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ اس پر مناسب تنبیہات کے بعد پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب بھی کہیں کوئی ایسا کام ہوتے دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ وہ مسلمانوں میں ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے مسلمانوں کے اخلاقی تفوق کو نقصان پہنچے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت جو مسلمان کا اصل زیور ہے اس میں کمزوری آئے۔ اس لئے قطع نظر اس سے کہ واقعۂ اِفک منافقین کی سازشوں اور کاوشوں سے پیش آیا۔ اس لئے ان پر گہری نگاہ رکھنا ضروری ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے اندر اور اپنی صفوں میں شیطانی اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ منافقین تو اپنی کوششوں میں پہچانے بھی جاتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی حرکتیں خود اپنا پردہ فاش کر دیتی ہیں، لیکن شیطانی وساوس دکھائی نہیں دیتے۔ لوگ اس کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں لیکن انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ شیطان کے نقوشِ قدم ہیں۔ ایک مومن کی اصل فراست یہ ہے کہ وہ شیطان کی تزویرات کو پہچاننے کی کوشش کرے۔

ایک لطیف تنبیہ

آیت کے دوسرے حصہ میں وہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے جو پہلی بات کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے منافقین کی اڑائی ہوئی باتوں کو بے احتیاطی سے قبول کر لیا اور یہ سنی سنائی باتیں اپنی زبانوں سے کہنے لگے، انہوں نے دراصل اس بات کا گمان کر لیا کہ مسلمانوں کا ہر مرد و عورت برائی میں ملوث ہو سکتا ہے لیکن ہم ملوث نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنے بارے میں صرف حُسنِ ظن ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا اِدّعا بھی رکھتے ہیں کہ ہم کسی حالت میں برائی کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اگر اللہ تعالیٰ نے آج تک کسی برائی میں مبتلا ہونے سے بچایا ہے تو یہ سراسر اس کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ ورنہ شیطانی وساوس اس قدر خطرناک اور اس کی تدبیریں اتنی باریک ہیں کہ آدمی اگر توفیقِ ایزدی سے بہرہ ور نہ ہو تو وہ کبھی بھی پاک رہنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے قدم کسی وقت بھی لغزش کا شکار ہو سکتے ہیں، اس کی نیت میں کسی وقت بھی فتور آ سکتا ہے۔ شیطان ایسا گرگِ باراں دیدہ ہے کہ اس کی فریب کاریوں سے بچنا اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بغیر ممکن نہیں۔ بڑے سے بڑا زاہد ایک رات میں لٹ سکتا ہے اور بڑے سے بڑا مجرم اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق دستگیری کرے تو نوازا جا سکتا ہے۔ اس لئے کسی شخص کو بھی اپنے تقویٰ اور تزکیہ کا اتنا غرہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں ہر قسم کی باتیں بے تحقیق قبول کرنے لگے۔ کسی شخص کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا اور ہر بات کو جانتا ہے۔ زبانیں جو کچھ اگلتی ہیں وہ انہیں سنتا ہے، دل میں جو چور پلتے ہیں، وہ انہیں جانتا ہے۔

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَۃِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲﴾

(اور جو تم میں سے صاحب فضل اور کشادہ حال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہ کریں گے، انہیں چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے، اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ۲۲)

Marfat.com

اسلامی رشتے کی اہمیت

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے اعلانِ براءت کے بعد اس بات کا اندیشہ پیدا ہوسکتا تھا کہ جن لوگوں نے محض اپنی سادگی اور نیک نفسی کے باعث منافقین کی باتوں کا اعتبار کرلیا اور اس الزام کی نقل و روایت میں ملوث ہوگئے اور انہیں اس واقعہ کی سنگینی کا احساس نہ ہوا۔ وہ لوگ ایسے لوگوں کی مالی معاونت بند کردیں اور ان کی امداد و سرپرستی سے دست کش ہوجائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور خوشحالی عطا کر رکھی ہے۔ انسانی نقطۂ نگاہ سے ایسا ہونا نہ صرف ممکن تھا بلکہ انسانی احساسات کے حوالے سے دیکھنے والا ہر شخص ایسے لوگوں کو حق بجانب سمجھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کو جن مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی تھی اور اس امت کا ایک ایک فرد جس طرح اخوت کے رشتے میں منسلک کیا گیا تھا اس رشتے میں یقیناً دراڑیں پڑ جاتیں، اور دل ایک دوسرے سے دور ہوجاتے۔ اس لئے حکم دیا گیا کہ ایسے لوگ عفو و درگزر سے کام لیں اور وہ اپنے زخمی احساسات کو بہلانے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید باندھیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا اعلیٰ کردار

یہ صرف ایک اندیشہ ہی نہ تھا بلکہ روایات میں ہے کہ مسطح ؓ بن اثاثہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے حضرت صدیقہ ؓ پر بہتان لگانے والوں کی معاونت کی تھی، اور اس فتنہ کو پھیلانے والوں میں شامل رہے تھے جبکہ یہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، ان کی مالی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ ہمیشہ ان کی اعانت فرمایا کرتے تھے بلکہ ان کے گھر بھر کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ جب آپ ؓ کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس فتنہ میں شریک ہیں تو قدرتی طور پر آپ ؓ کو نہایت صدمہ ہوا۔ آپ ؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ مسطح کی اعانت نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور ایسے ہی دوسرے لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا اور رزق و مال کی کشادگی عطا فرمائی تھی، ارشاد فرما دیا کہ وہ اپنے مستحق قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو ان کی کسی غلطی کی بنا پر اپنی سرپرستی وامداد سے محروم کردینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں، غلطیاں اور کوتاہیاں کس سے نہیں ہوتیں لیکن اللہ تعالیٰ کسی کا رزق بند نہیں کرتا، تو تم ایسے لوگوں کا رزق کیوں بند کررہے ہو جو کسی وجہ سے کوئی غلطی کرچکے ہیں بلکہ یہاں تک فرمایا کہ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمادے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو حضرت صدیق اکبرؓ باوجود اس کے کہ مسطح کی جانب سے آپ ؓ کو بہت تکلیف پہنچی تھی، آپ ؓ کے احسانات کے جواب میں مسطح نے آپ ؓ کی ناموس پر حملہ کیا تھا اور ایسا چرکا لگایا تھا جس کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ یہ آیتِ کریمہ سنتے ہی فوراً پکار اٹھے بَلٰی وَاللّٰہِ یَارَبَّنَا اِنَّا لَنُحِبُّ اَنْ تَغْفِرَلَنَا (روح المعانی) ”ہاں کیوں نہیں، اے پروردگار! مجھے تیری قسم، ہم تو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تو ہمیں معاف فرمادے۔“ اور آپ ؓ نے پہلے سے بھی زیادہ مسطح کی امداد اور دلداری شروع کردی۔

ایک اہم مسئلہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کرکے وہ بات اختیار کرلے جس میں بھلائی ہے تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہئے یا نہیں۔ فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کرلینا ہی قسم کا کفارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش

Marfat.com

کرتے ہیں کہ من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیر امنھا فیات الذی ھو خیر وذٰلک کفارتہٗ (جو شخص کسی بات کی قسم کھالے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے تو اسے وہی بات کرنی چاہئے جو بہتر ہے اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفارہ ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کیلئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے۔ (البقرۃ، آیت ۲۲۵۔ المائدہ، آیت ۸۹) جسے اس آیت نے نہ تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے۔ اس لئے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کیلئے تو ضرور فرمایا ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے۔ رہا نبی کریم ﷺ کا ارشاد تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھا لینے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے ڈھل جاتا ہے۔ اس ارشاد کا مقصد کفارۂ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری حدیث اس کی توضیح کر دیتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیرا منھا فلیات الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہ (جس نے کسی بات کی قسم کھالی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہئے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۳﴾ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

(بیشک جو لوگ پاکدامن، بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ ۲۳) جس دن گواہی دیں گی ان کیخلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۲۴)

پاکدامن اور بھولی بھالی مومن عورتوں پر الزام کی سنگینی

اس سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ذاتِ گرامی پر الزام لگانے والوں کی کمینگی اور خست کو بیان فرمایا گیا ہے اور ان کی اس سزا کا ذکر ہوا جس سے انہیں دنیا اور آخرت میں واسطہ پڑنے والا ہے۔ اب ان خواتینِ اسلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں عفت اور پاکدامنی کے ان بلند مدارج تک پہنچی ہیں جن کیلئے دو صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ (1) محصنات: یعنی وہ ایسی پاکدامن اور شریف زادیاں ہیں کہ ان کی عفت و عصمت کے قلعے میں کسی نقب لگائے جانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ (2) غافلات: وہ ایسی سیدھی سادھی اور چھل فریب سے ناآشنا اور بھولی بھالی خواتین ہیں کہ کسی گھٹیا اور فضول حرکت کا ان کے دماغ میں خیال تک نہیں گزرتا۔ وہ اپنی فطری عفت کے باعث زمانے کی ناہمواریوں سے بالکل انجان ہیں۔ بلاشبہ ان دونوں خصلتوں کی اعلیٰ ترین مصداق، آنحضرت ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں۔ لیکن یہ دونوں صفات ان کی خصوصیت نہیں بلکہ ان کا تقاضا ہر خاتونِ اسلام سے اخلاقی تعلیمات کی فطرت ہے۔ جو شخص ایسی پاکدامن اور بھولی بھالی اور لوگوں کے طور اطوار سے ناواقف عورتوں پر الزام لگاتا ہے وہ یوں سمجھئے ان پاکدامن بیبیوں کو سوتے میں اپنی تیراندازی کا نشانہ بناتا ہے۔ ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی لعنت ہوگی۔ نہ یہ دنیا میں برومند ہوں گے نہ

Marfat.com

آخرت میں۔ دنیا میں عنقریب ان کی جڑ کٹ کے رہے گی اور آخرت میں تو ان کیلئے بہرحال عذاب عظیم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاک کردینے والی چیزوں سے بچو۔ عرض کی گئی وہ کون سی چیزیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: (1) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، (2) جادو کرنا، (3) کسی بے گناہ کو قتل کرنا، (4) سود کھانا، (5) یتیم کا مال کھانا، (6) میدانِ جنگ سے بھاگ آنا اور (7) پاکدامن، انجان، ایماندار خواتین پر جھوٹی تہمت لگانا۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: قَذْفُ الْمُحْصَنَةِ يَهْدِمُ عَمَلَ مِائَةِ سَنَةٍ (طبرانی) ''ایک پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، سو برس کے اعمال کو غارت کردینے کیلئے کافی ہے۔''

آج تو یہ لوگ اپنی چرب زبانی سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانیوں کا زہر اتار دیتے ہیں اور اپنی طلاقتِ لسانی سے پاکدامن بیبیوں پر تہمت لگاتے ہوئے دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں اور اپنے اثر و رسوخ سے غلط سے غلط بات کو پھیلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں خود ان کی بداعمالیوں کیخلاف گواہی دیں گے۔ اس وقت ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ باہر کی کسی گواہی پر وہ سو اعتراض کرسکتے ہیں اور ہر بات کیلئے تاویل کا سہارا لے سکتے ہیں، لیکن جب ان کا اپنا جسم اور اپنے اعضاء جن سے وہ الزام تراشی میں مدد لیتے رہے ہیں ان کیخلاف گواہی دیں گے تو ان کی گواہی پر انکار کیسے کرسکیں گے اور سخن سازی سے کیسے کام لے سکیں گے۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

(اس دن اللہ تعالیٰ انہیں ان کا پورا بدلہ دے گا جس کے وہ حقدار ہیں اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی حق اور واضح کردینے والا ہے۔ ۲۵)

دین سے مراد وہ بدلہ اور جزاء ہے جو ان کے کرتوتوں کے باعث ان پر لازم ہو چکی ہے اور جس کے وہ ہر طرح سے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس میں ان کیلئے کوئی کمی بیشی نہیں کرے گا، نہ کوئی رعایت ہوگی اور نہ کوئی زیادتی کی جائے گی۔

آج تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ نہ وہ اس کو سراپا حق و عدل سمجھتے ہیں اور نہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ باطل کو نابود کر کے حق کو غالب کردے گا۔ لیکن ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ جب ان پر اچھی طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ ہی سراپا حق و عدل ہے اور وہی تمام حقائق کو آشکارا کرنے والا ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

(خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کیلئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کیلئے، یہ مبرا ہیں ان تہمتوں سے جو وہ لگاتے ہیں، ان کیلئے ہی بخشش اور عزت والی روزی ہے۔ ۲۶)

Marfat.com

ایک فطری اور واقعاتی دلیل

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت اس طرح بنائی ہے کہ انسان اپنی رفاقت اور اپنی معاشرت کیلئے ہمیشہ ایسے ساتھی کو تلاش کرتا ہے جس کے ساتھ فطری ہم آہنگی ہو، عادتوں میں یکسانی ہو، میلانات اور رجحانات ملتے جلتے ہوں، طبعی ذوق میں باہمی مناسبت ہو۔ اور اگر ایک ساتھ رہنے والوں میں ان چیزوں کا فقدان ہو تو کوئی شخص بھی ایسے شخص کو ساتھی بنانے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ جبر اور حبس ہو تو ایک مجبوری ہے، ورنہ اختیار اور ارادہ کے ساتھ ہر طرح کا اختلاف ہوتے ہوئے بھی مصاحبت اور معاشرت ایک خواب تو ہو سکتا ہے، حقیقت نہیں۔

وقتی رفاقت بھی کسی قسم کی یکسانی کے بغیر ایک سزا سے کم نہیں، لیکن اگر میاں بیوی کی طرح زندگی بھر کی رفاقت کا تعلق ہو جس میں خلوت و جلوت کا امتیاز بھی ختم ہو جائے تو ایسی صورت میں اگر طبیعتوں میں مناسبت نہ ہو اور دونوں ایک دوسرے سے وفا کے رشتے میں منسلک نہ ہوں، ایک دوسرے کا لباس ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بیگانہ اور بیزار ہوں، ایک شرم و حیاء کا پتلا اور دوسرا شرم و حیاء کو رجعت پسندی، تنگ نظری اور گاؤدی اخلاق کی علامت سمجھتا ہو تو ایسے زندگی بھر کے ساتھی چند روز کے ساتھی بھی نہیں رہ سکتے اور مزید یہ بات بھی ہے کہ انسان اگرچہ اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کی کئی پرتیں ہیں لیکن چند دنوں کی ہر وقت کی رفاقت بھی ہر گہرائی میں جھانکنے کے قابل بنا دیتی ہے اور شخصیت کی پرتیں کھلنے میں دیر نہیں لگتی۔ تعلق میں خیانت اور وفا میں کمزوری ہزار کوشش سے بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ شوہر اگر برا ہے تو برائی صرف ایک برائی تک محدود تو نہیں رہتی، برائی، برائی کو جنم دیتی ہے تو وہ کس کس برائی پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بیوی نام کی حد تک صالحات، قانتات اور حافظات میں شامل ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، تو جس طرح متعفن کھانا اپنے تعفن کو چھپا نہیں سکتا اسی طرح برائی اور تعلقات میں خیانت اور وفا میں فریب دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ اصول صحیح ہے اور کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ طیب ہی نہیں اطیب ہیں۔ جس طرح ان کے اعمال پاکیزہ، ان کا احساس معصوم، ان کے ہر کام پر عصمتِ الٰہی کا سایہ اور ان کے ہر تعلق میں وفا کی خوشبو رچی بسی ہے اور ان کا پاکیزہ مزاج کسی طرح کی برائی، بے وفائی اور ناگواری کو برداشت نہیں کر سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی رفیقۂ حیات جو تمام ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، جنہیں سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا اعتماد حاصل ہو، اور وحی لے کر آنے والا وہ فرشتہ جسے اللہ تعالیٰ نے مطاع ملائکہ اور امین بنایا ہے، وہ اس وقت وحی لے کر نازل ہو جب آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لحاف میں ہوں، لیکن ان تمام فضائل اور قربتوں کے باوجود آنحضرت ﷺ کو اپنی محبوب رفیقۂ حیات کی بے وفائی کی بھنک بھی نہ پڑ سکے۔ ایک معمولی علم و دانش کا آدمی تو شب و روز کی یکجائی میں اس طرح کی غلطی کا ارتکاب نہ کر سکے لیکن جس ذاتِ عظیم پر وحیِ الٰہی اترتی ہو وہ ایسا بے خبر ثابت ہو تو یہ ایک ایسی بات ہے جسے نہ عقل قبول کرتی ہے، نہ اخلاق قبول کرتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے اس حقیقت سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ طیب مرد اور طیب عورتیں ہی انسانیت کا وہ اثاثہ ہیں جو باتیں بنانے والوں کی فضول باتوں سے بری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے بخشش لکھ دی ہے اور وہ ان تمام نعمتوں کی مستحق ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ
حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ
لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ
مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ
اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ
اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْۤ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ
مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ

Marfat.com

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا
إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣١﴾ وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى
مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَآئِكُمْ ؕ إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ
يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٢﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ
الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ
يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ
خَيْرًا ۖق وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ
عَلَى الْبِغَآءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ
مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ
أَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ
وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٤﴾ ع

رکوع: ۴۔ (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک تعارف نہ پیدا کرلو، اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو، یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم اس کی حکمتوں میں غور وفکر کرو۔ ۲۷) پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس چلے جاؤ، یہی طریقہ تمہارے لئے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۲۸) تم پر کوئی حرج نہیں ہے ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں جن میں تمہارا سامان رکھا ہے (یا کوئی منفعت ہے) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ ۲۹) اے پیغمبر! مومنوں کو ہدایت کیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ طریقہ ان کیلئے پاکیزہ ہے، بیشک اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔ ۳۰) آپ ایماندار عورتوں کو حکم دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر ان میں سے جو خود بخود ظاہر ہو جائیں اور اپنے

Marfat.com

عصمتوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر ان میں سے جو خود بخود ظاہر ہو جائیں اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کی بُکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کیلئے یا اپنے باپوں کیلئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے یا اپنے بیٹوں کیلئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے بھائیوں کیلئے یا اپنے بھتیجوں کیلئے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے تعلق کی عورتوں کیلئے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے جو عورتوں کی شرم والی چیزوں سے آگاہ نہیں، اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ معلوم ہو جائے وہ بناؤ سنگھار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ ۳۱) اور نکاح کر دو اپنے میں سے مجرد لوگوں کا، اور اپنے ان غلاموں اور لونڈیوں کا جو ذی صلاحیت ہوں، اگر وہ تنگدست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔ ۳۲) اور جو لوگ نکاح کی مقدرت نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے، اور جو تمہارے مملوکوں میں سے مکاتب ہونے کے طالب ہوں ان کو مکاتب بنا دو، اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ اور ان کے اس مال میں سے دو جو خدا نے تم کو دیا ہے اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں محض اس لئے کہ کچھ متاع دنیا تمہیں حاصل ہو جائے اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کیلئے غفور و رحیم ہے۔ ۳۳) اور بیشک ہم نے تمہاری طرف صاف صاف ہدایت دینے والی آیات بھیج دی ہیں اور ان لوگوں کی عبرتناک مثالیں بھی نازل کر دی ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے نصیحت بھی (ہم نے اتار دی ہے)۔ ۳۴)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو جب تک تعارف نہ پیدا کر لو، اور گھر والوں کو سلام نہ کر لو، یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے تا کہ تم اس کی حکمتوں میں غور و فکر کرو۔ ۲۷) پس اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس چلے جاؤ، یہی طریقہ تمہارے لئے پاکیزہ ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۲۸)

تمہید

سابقہ آیاتِ کریمہ میں وہ اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمان معاشرہ میں اخلاقی برائیاں پیدا ہو جائیں تو ان کی سزا کیا ہے اور ان کے روکنے کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ زنا جیسی انتہائی برائی کا ارتکاب کسی بھی معاشرے میں اچانک نہیں ہوا کرتا جب تک کہ محرکاتِ زنا کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور مقدماتِ زنا معاشرے میں قابلِ قبول حیثیت اختیار نہ کر جائیں۔ اسلام کے پیشِ نظر صرف یہ بات نہیں ہے کہ لوگ بداخلاقی کا ارتکاب کرتے رہیں اور

Marfat.com

اسلامی قانون انہیں سخت سے سخت تر سزائیں دیتا ہے بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں برائی کا تصور قابلِ نفرت حیثیت اختیار کر جائے، لوگ اس سے اس طرح بچنے لگیں جیسے کوئی شخص آگ میں جلنے سے بچتا ہے۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے اسلام نے کچھ ایسے احکام دیئے ہیں جس سے بداخلاقی کا صدور اگرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے اور اگر معاشرے کے افراد اپنے طور پر ان ہدایات پر عمل کرتے رہیں تو پھر وہ محرکات اور اسباب عام طور پر پیدا نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں زنا جیسا بدترین جرم وجود میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں حُسنِ معاشرت چونکہ تمدن کی بنیاد ہے اور اس میں خرابی پیدا ہونے سے باہم اخوت کے رشتے مجروح ہوتے اور شرم وحیاء کے جذبات زوال پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروردگار نے قرآنِ کریم میں جو احکام دیئے ہیں اس میں اگر ایک طرف ان سوتوں کو بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں سے مقدماتِ زنا کے وجود میں آنے کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو دوسری طرف ایک صالح تمدن کی مضبوط بنیاد کے طور پر گھروں میں آنے جانے کے آداب سکھائے گئے ہیں اور انسان کی پرائیویسی کو نہ صرف محفوظ کیا گیا ہے بلکہ اسے احترام بھی دیا گیا ہے اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ انسانوں کے گھر درندوں کے بھٹ نہیں بلکہ انسانوں کیلئے آرام گاہیں اور پناہ گاہیں ہیں اور اس کی پرائیویسی کی حفاظت کا ایسا حصار ہیں جس میں انسان نہ صرف آرام کرتا ہے بلکہ اس کی شخصیت بھی تعمیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے گھروں میں داخل ہونے کا طریقہ سکھایا گیا جسے طریقِ استیذان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

گھروں میں داخل ہونے کیلئے استیذان کی ہدایت

وہ گھر جو انسان کے آرام اور عافیت کی جگہ ہے استیذان کے ذریعے اسے دوسروں کی دستبرد اور بے وقت کی دخل اندازی سے محفوظ کر دیا گیا۔ اس سے انسان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ گھر میں پرسکون زندگی گزار سکے اور جو کام بھی کرنا چاہے کوئی اس کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اسلام نے یہ بنیادی حکم دیا کہ کسی شخص کی دیوار کے اوپر سے جھانکنا یا اسے کوئی ناحق تکلیف پہنچانا قطعی طور پر حرام ہے۔

اس استیذان کے ذریعے اس شخص کی عزت واحترام میں بھی اضافہ کیا گیا ہے جو کسی سے ملنے جاتا ہے تو نہایت شائستہ انداز میں اجازت لے کر گھر میں داخل ہوتا ہے تو اہلِ خانہ اسے شائستہ اور معزز مہمان سمجھ کر عزت بھی کرتے ہیں اور بجائے بلائے ناگہانی سمجھنے کے اسے نعمت خیال کرتے ہیں۔

اسی استیذان سے فواحش اور بے حیائی کا انسداد بھی کیا گیا۔ جو شخص بلا اجازت کسی کے مکان میں داخل ہوگا یقیناً اس کی نظر کسی نہ کسی غیر محرم پر بھی پڑے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نظر شیطان کے تیروں میں سے کوئی تیر ثابت ہو اور کسی کے ایمان کو غارت کر دے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان گھر میں کوئی ایسا کام کر رہا ہے جس کیلئے اسے تنہائی کی ضرورت ہے یا وہ یہ نہیں چاہتا کہ میرا یہ کام کسی اور کے علم میں آئے یا وہ بیمار ہے اور آرام کرنا چاہتا ہے۔ بلا اجازت آنے والا اس کی ایسی تمام ضرورتوں کو پامال کر کے اس کیلئے اذیت کا باعث بنتا ہے۔ اور جس بات کو وہ چھپانا چاہتا ہے اس سے مطلع ہو کر ایک مستقل گناہ کو اپنے سر لے لیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اب جو احکام شروع کئے جا رہے ہیں اس سے جہاں ہر طرح کی اخلاقی برائی کو روکنا مقصود ہے وہیں صالح تمدن کی تعمیر بھی پیشِ نظر ہے، اور انسانی گھروں کو ان کا حقیقی مقام ومرتبہ دے کر انسان کو راحت وآرام مہیا کرنا بھی مقصود ہے۔

Marfat.com

آیت میں عموم کا مفہوم

آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے کیا گیا ہے جو مردوں کیلئے استعمال ہوتا ہے، لیکن قرآنِ کریم کے اسلوب کے مطابق یہ مردوں کیلئے مخصوص نہیں بلکہ عورتیں بھی بالتبع اس میں شامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ حضرت ام ایاس فرماتی ہیں کہ ہم چار عورتیں اکثر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس جایا کرتی تھیں اور گھر میں جانے سے پہلے ان سے اجازت طلب کرتی تھیں۔ اگر وہ اجازت دیتیں تو ہم اندر داخل ہوتی تھیں ورنہ نہیں۔

آیت کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے۔ مرد، عورت، محرم اور غیر محرم سب کو شامل ہے۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد، مرد کے پاس، سب کیلئے اجازت طلب کرنا واجب ہے۔ سب سے زیادہ احترام کا رشتہ ماں کے ساتھ ہے۔ حضورؐ نے اس کیلئے بھی استیذان کا حکم دیا۔ امام مالک نے موطا میں مرسلاً عطا بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی استیذان کروں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں۔ اس نے کہا یارسول اللہ ﷺ میں تو اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا پھر بھی اجازت لئے بغیر گھر میں نہ جاؤ۔ انہوں نے مزید سوال کیا، تو آپؐ نے فرمایا کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تم اپنی والدہ کو برہنہ حالت میں دیکھو۔ اس نے کہا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا اسی لئے استیذان ضروری ہے۔ ممکن ہے وہ گھر میں کسی ضرورت سے ستر کھول چکی ہوں۔

گھر میں صرف اگر اپنی بیوی ہو تو گھر میں داخل ہوتے وقت اگرچہ اس سے استیذان واجب نہیں مگر سنت یہ ہے کہ گھر میں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے نہ جائے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی اہلیہ محترمہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب بھی باہر سے گھر میں آتے تھے تو داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح سے پہلے باخبر کر دیتے، پھر گھر میں داخل ہوتے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ جب تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے گھر میں جانا چاہو تو مسلمانوں میں اگرچہ دینی اخوت کا رشتہ ہے، لیکن یہ اخوت وہ نہیں جس سے رشتۂ حرمت پیدا ہوتا ہے۔ اس اخوت کا مطلب تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات ایک ہیں اور ہر مسلمان ان مفادات کا نگہبان ہے، لیکن جہاں تک اخلاقی پابندیوں کا تعلق ہے وہ ان پر اسی طرح عائد ہوں گی جیسے بیگانوں پر ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی مسلمان کا گھر بھی اخلاقی پابندیوں کے حوالے سے اپنے گھر کا غیر ہے، یعنی وہ دوسرا گھر ہے، جس میں اگر آپ کو جانے کی ضرورت پیش آئے تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تَسْتَاْنِسُوْا یہ اُنس سے ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ تم داخل ہونے سے پہلے ان میں اُنس معلوم کرو، یا یہ مطلب ہے انہیں مانوس کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں سلام کرو۔ اولاً تو سلام ہی بیگانگی کے بہت سے پردے اٹھا دیتا ہے۔ ثانیاً جس کو سلام کہا جائے گا وہ یقیناً یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ جو آدمی مجھے سلام کہہ رہا ہے وہ بھروسے کا آدمی ہے یا نہیں۔

استیذان کا طریقہ

جاہلیت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ وقت کے مطابق آج کے اہلِ مغرب کی طرح سلام کہتے تھے اور بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے۔ صبح کا وقت ہوتا تو صباح الخیر کہتے اور شام کا وقت ہوتا تو مساء الخیر کہتے۔ اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے کہ اہلِ خانہ کس حال میں ہوں گے، ہماری نظر کس پر اور کس حال میں پڑے گی۔ اسلام نے سب سے پہلے اس بات پر پابندی لگائی کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کرو۔ اور اجازت کا طریقہ یہ رکھا کہ دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر اجازت طلب کی جائے تا کہ

Marfat.com

اہلِ خانہ میں سے جب کوئی باہر آئے تو دروازہ کھلتے ہی اندر نظر نہ پڑے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اذا دخل البصر فلا اذن "جب نگاہ داخل ہوگئی تو پھر خود داخل ہونے کیلئے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا" اور اجازت کا طریقہ بھی متعین فرما دیا، کہ اجازت طلب کرنے والا السلام علیکم کہے۔ اور ساتھ ہی کہے، ءَاَدْخُل "کیا میں داخل ہو جاؤں؟" اگر جان پہچان ایسی ہو کہ آواز ہی سے اہلِ خانہ پہچان لیتے ہوں تو پھر تو اجازت لینے کا یہ طریقہ کافی ہے۔ لیکن اگر جان پہچان اس طرح کی نہ ہو تو پھر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو حضرت عمر فاروقؓ کا تھا۔ آپؓ جب آنحضرتؐ کے درِ اقدس پر حاضر ہوتے تو اجازت طلبی کیلئے کہتے، السلام علیک یارسول الله أَيَدْخُلُ عُمَرُ "یارسول اللہ آپ پر سلام ہو، کیا عمرؓ حاضر ہو سکتا ہے؟" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجازت طلب کرنے والے کو اپنا نام بتانا چاہئے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کے دروازے پر آیا اور کہا ءَاَدْخُل "کیا میں داخل ہو جاؤں۔" آنحضرت ﷺ نے خادم سے فرمایا، کہ جاؤ اسے اذن مانگنے کا طریقہ سکھاؤ۔ اسے یوں کہنا چاہئے السلام علیکم ءَاَدْخُل۔

اگر صاحبِ خانہ اذن طلب کرنے والے سے پوچھے کہ تم کون ہو؟ تو اسے اپنا نام بتانا چاہئے۔ صرف یہ کہنا کہ میں ہوں، درست نہیں، حضورؐ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ اور اگر صاحبِ خانہ نام کو تعارف کیلئے کافی نہ سمجھے تو پھر تعارف میں وہ کچھ بتانا ضروری ہے جو صاحبِ خانہ کے اطمینان کیلئے کافی ہو۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اجازت طلبی کیلئے دروازہ کھٹکھٹانا بھی کافی ہے۔ آج کے دور میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ گھر اگر بڑا ہو اور سلام کی آواز اہلِ خانہ تک نہ پہنچ سکتی ہو تو بہتر ہے کہ دروازے پر دستک دی جائے اور یا گھنٹی بجا کر اذن طلب کیا جائے۔ لیکن اس اذن کو سلام کے قائم مقام نہ سمجھا جائے، سلام کی اپنی ایک اہمیت اور افادیت ہے، اس لئے ایسی صورت میں اذن ملنے کے بعد جب اندر جانے کا موقع ملے تو وہاں سلام کہا جائے تاکہ نہ جانے والا ثواب سے محروم رہے اور نہ اہل خانہ برکت سے محروم رہیں۔ البتہ دروازے پر دستک دینے کا بھی ایک ادب ہے۔ صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے دروازے پر عام طور پر ناخنوں سے دستک دیتے تھے تاکہ آپؐ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ خاص طور پر اس طرح دستک دینا کہ اہلِ خانہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں، یہ آداب کے خلاف ہے۔

زیادہ سے زیادہ تین بار اذن طلب کرنا چاہئے۔ اگر تیسری بار جواب نہ آئے تو واپس چلا آئے، کیونکہ اس سے زیادہ اذن طلب کرنا صاحبِ خانہ کو اذیت دینا اور پریشان کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس وقت ایسے کام میں مشغول ہو جسے وہ منقطع نہ کر سکتا ہو۔ آنحضرت ﷺ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ ایک مرتبہ آپ حضرت سعد بن عبادہؓ کے یہاں گئے اور سلام کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت سعد اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں آپؐ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے میری لئے جتنی بار بھی سلام اور رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لئے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا۔ یہ تین مرتبہ پکارنا، پے در پے نہ ہونا چاہئے، بلکہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پکارنا چاہئے تاکہ صاحبِ خانہ کو اپنی مصروفیت سے فراغت کا موقع مل جائے۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ صاحبِ خانہ اس وقت آرام کرتے ہیں اور تھوڑی دیر میں نماز کا وقت ہونے والا ہے، وہ اٹھ کر باہر آئیں گے تو صحابہ کرامؓ کا یہ طرزِ عمل بھی رہا ہے کہ وہ باہر انتظار میں بیٹھ جاتے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ احادیث کی طلب میں انصار صحابہ کے دروازوں پر انتظار میں بیٹھے رہتے۔ جب صاحبِ خانہ باہر نکلتے تو ان سے اپنی ضرورت کہتے۔ وہ ہر چند تاسف کا اظہار کرتے، آپ نے ہمیں پہلے اطلاع دی ہوتی، لیکن حضرت ابن عباسؓ کہتے کہ علم سیکھنے کیلئے ہمیں یہی طریقہ سکھایا گیا ہے۔

اجازت یا تو خود صاحبِ خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے۔ مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذمہ دار قسم کا فرد۔ کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آ جاؤ، تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہئے۔

Marfat.com

پرائیویسی کا لحاظ

آنحضرت ﷺ نے صاحبِ خانہ کے تخلیئے اور پرائیویسی کا اس قدر لحاظ فرمایا ہے کہ اسے صرف گھروں میں داخل ہونے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دے دیا، جس کی رو سے دوسرے کے گھروں میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتیٰ کے دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار ”جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی، وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔“ صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے، تو تجھے کوئی گناہ نہیں۔

اجازت نہ ملنے پر واپسی کی ہدایت

دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ اگر اجازت طلبی پر اہلِ خانہ اجازت نہ دیں یا گھر میں کوئی شخص ایسا موجود نہ ہو جو جواب دے سکے تو اجازت طلب کرنے والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت گھر میں گھس جائے اور اگر اندر سے یہ کہا جائے کہ اس وقت میں نہیں مل سکتا، واپس چلے جایئے تو اس پر برا نہ ماننا چاہئے بلکہ کبیدہ خاطر بھی نہیں ہونا چاہئے، ممکن ہے کہ صاحبِ خانہ اس وقت کسی تحقیقی کام میں مشغول ہوں۔ اس وقت اپنے کام کو چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری دماغی کاوش غارت ہو جائے گی، تو اس پر ناراض ہونے کی بجائے صاحبِ خانہ کی مجبوری کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ اس طرح کا جواب آدمی کی طبیعت پر شاق گزرتا ہے، لیکن اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہی طریقہ پاکیزہ ہے اور اسی سے ایک مومن کے احساسات کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ ہم لوگ چونکہ ایسی تربیت سے گزارے نہیں گئے، تو عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ اچھے اچھے لوگ ایسے کسی واقعہ کو قطع تعلق کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، اور اگر کوئی طالب علم اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے تو وہ بعض دفعہ ہمارے ردِعمل سے ڈر کر اپنا پیپر خراب کر لیتا ہے، لیکن آنے والے سے ملنا اور اس کے پاس بیٹھنا اپنی مجبوری سمجھتا ہے۔ اس طرح بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی وکیل کیس کی تیاری میں مصروف ہے، کوئی عالمِ دین کسی علمی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا ہے، کوئی ڈاکٹر کسی پیچیدہ مرض کے حل کیلئے اپنے وسائل فراہم کر رہا ہے، کہ ایسے میں کوئی ملنے والا آ جاتا ہے، اگر وہ ملنے سے انکار کرتا ہے تو تعلقات بگڑتے ہیں اور اپنی مصروفیات چھوڑتا ہے تو علمی نقصان ہوتا ہے، اگر اسلام کی دی ہوئی اخلاقی تعلیمات پر توجہ دی ہوتی اور ہمارے مزاج اس کے مطابق بن چکے ہوتے تو یہ باتیں ہمارے معمول کا حصہ بن چکی ہوتیں۔ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ تمہیں بیشک یہ باتیں ناگوار گزریں لیکن تمہاری معاشرتی اور سماجی زندگی کیلئے یہی بہتر ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کی بہتری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے ہر عمل سے پہلے اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے کا کس حد تک یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ دولت میسر نہ ہو تو پھر مجرد احکام وہدایات سے ان رخنوں کا بند کرنا ممکن نہیں ہے جہاں سے شیطانی اثرات داخل ہو سکتے ہوں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

(تم پر کوئی حرج نہیں ہے ان غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے میں جن میں تمہارا سامان رکھا ہے (یا کوئی منفعت ہے) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ ۲۹)

Marfat.com

غَیرَ مَسْکُوْنَۃٍ کا مفہوم

سابقہ آیات میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکانوں میں داخلے سے پہلے استیذان کی پابندی اس لئے لگائی گئی تھی تاکہ بدنگاہی سے پیدا ہونے والے فتنوں کو روکا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فتنوں کا امکان صرف ایسے گھروں میں ہوسکتا ہے جہاں خواتین رہتی ہوں اور وہ رہائشی مکان ہوں۔ لیکن ایسا مکان جس میں کسی کی رہائش نہ ہو یا وہ رہائش کیلئے بنایا ہی نہ گیا ہو بلکہ اس کے مصارف دوسرے ہوں۔ مثلاً دکانیں، سرائے، مہمان خانے اور ہوٹل وغیرہ۔ اسی طرح رفاہ عام کے عام ادارے۔ ان میں داخل ہونے کیلئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے مکانات بنائے ہی اس لئے جاتے ہیں تاکہ لوگ وہاں آتے جاتے رہیں۔ اور اگر وہاں جانے والا کا سامان رکھا ہوا ہو یعنی کوئی سٹور ہو تو پھر تو اسے بجا طور پر حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جائے اور سامان اٹھالے اور کبھی متاع کا معنی سامان نہیں بلکہ منفعت ہوتا ہے یعنی وہ ایسی جگہ ہو جس سے جانے والے کی منفعت متعلق ہو، جیسے رفاہی ادارے۔ تو وہاں بھی داخلے کیلئے استیذان ضروری نہیں۔ البتہ وہ ادارے جو عوام کی ضرورت کیلئے بنائے گئے ہیں لیکن اس کے بعض مکانات بعض کارکنان کی دفتری ضرورت کیلئے ہوتے ہیں یا بعض جگہ ایسی ہوتی ہیں جس کو غیر ضروری اجتماع سے بچانے کیلئے کوئی ٹکٹ لگا دیا جاتا ہے، جیسے پلیٹ فارم۔ یا حفاظت کے نقطۂ نگاہ سے بعض پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ ایسی پابندیوں کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ تم جو کچھ چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس میں اپنے علم کا حوالہ دے کر اسے مستحضر رکھنے کا اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اس بات کا یقین نہیں رکھتا کہ میری ہر حرکت اور اس کی پسِ پردہ نیت کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے تو وہ ہر طرح کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتا۔ اس سے یہ بات بعید نہیں کہ کسی رہائشی مکان میں جا گھسے اور پھر یہ عذر کرے کہ میں یہ سمجھا تھا کہ غیر رہائشی مکان ہے۔ اس لئے ان آیات میں بار بار پروردگار اپنی ذات اور اپنے علم کے استحضار پر زور دیتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ
ذٰلِکَ اَزْکٰی لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۝۳۰

(اے پیغمبر! مومنوں کو ہدایت کیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ طریقہ ان کیلئے پاکیزہ ہے، بیشک اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔ ۳۰)

اسلام اور دیگر نظام ہائے زندگی میں فرق

ہم پہلے بھی یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اسلام اور دیگر نظام ہائے زندگی کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اولاً تو ان کے نزدیک گناہ کا تصور ہی غلط یا مبہم ہے۔ اور اگر وہ کسی چیز کو گناہ یا جرم قرار دیتے بھی ہیں تو ان کے نزدیک اس جرم کے ارتکاب کی سزا ہی اصلاح کیلئے کافی ہے۔ وہ نہ جانے اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے کہ جس طرح انسانی جسم اس وقت کسی عارضے کا شکار ہوتا ہے جب اس جسم کے اندر اس عارضے کو پیدا کرنے اور پھر اسے قبول کرنے والے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جسم میں پھوڑے کبھی نہیں نکلتے جب تک خون گندہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی جرم اور گناہ بھی اس وقت تک ارتکاب کی منزل تک نہیں پہنچتا جب تک اس کے محرکات کو کام کرنے کا

Marfat.com

موقع نہیں ملتا۔ معاشرے کی قوتِ مدافعت کمزور نہیں ہوتی اور فضا اس کے حسبِ حال نہیں ہو جاتی۔ اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ جس طرح کسی جرم کے خاتمے کیلئے سخت قانون دیتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے محرکات کو ختم کرنے کے احکام جاری کرتا ہے اور وہ ان سوتوں کو بند کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے برائی پھوٹتی ہے۔ چنانچہ حدِ زنا کا قانون دینے سے پہلے اس نے ایک طرف تو افرادِ معاشرہ کو تعلیم اور تزکیہ کے اس پراسس سے گزارا جس سے دل میں برائی کے پیدا ہونے کے اسباب کم سے کم ہو جاتے ہیں اور نیکی کے پیدا ہونے کے اسباب افزوں تر ہو جاتے ہیں۔ پھر اس نے ایسے محرکات پر پابندیاں لگائیں جو انسان کو گناہ اور جرم پر اکساتے ہیں اور ان تمام عوامل کو روکنے کی کوشش کی جن سے گناہ کے ارتکاب میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

پردے کے احکام میں ترتیب

چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کچھ احکام سورۃ الاحزاب میں دیئے اور اب ان کی تکمیل سورۃ النور میں کی جارہی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے پردے کا حکم جاری فرمایا، ایک آزاد منش اور ایک بے قید معاشرے میں چونکہ پردے کا چلن عام کرنا آسان نہیں تھا، اگرچہ صحابہ کرامؓ کا ایمان اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے کبھی اباء نہیں کرتا تھا لیکن اسلامی معاشرہ چونکہ تیزی سے دعوت کے مراحل طے کر رہا تھا اور جہاد کی قوت سے راستے کی رکاوٹیں اٹھتی جارہی تھیں اور تیزی سے لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے، اس لئے سب کیلئے ایک عام حکم نازل کر دینا اور اس کی پابندی کرانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اس کیلئے نمونے کے طور پر آنحضرت ﷺ کے اہلِ خانہ کو سب سے پہلے اس کا پابند ٹھہرایا اور مسلمان عورتوں کو ان کی پیروی کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلا حکم انہیں کو خطاب کر کے دیا گیا، لیکن اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ یہ حکم ان کیلئے خاص نہیں بلکہ اس میں تمام مسلمان عورتیں شامل ہیں۔ وہ احکام جو اہلِ بیت یعنی آنحضرت ﷺ کے اہلِ خانہ کیلئے دیئے گئے وہ سورۃ الاحزاب کی آیات ۳۲، ۳۳، ۵۳ اور ۵۵ میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ دوسرے وہ احکام ہیں جو آنحضرت ﷺ کے اہلِ بیت کے ساتھ دوسری عام خواتین کو بھی دیئے گئے اور ان میں یہ بتایا گیا کہ کسی مسلمان عورت کو جب گھر سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس حالت میں اس کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، یہ احکام سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ میں بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ تیسرے وہ احکام ہیں جو عام مردوں اور عورتوں کو مخاطب کر کے گھروں کے اندر آنے جانے سے متعلق دیئے گئے اور جن میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان جب اپنے کسی بھائی کے گھر میں داخل ہو تو اس کو کن آداب و قواعد کی پابندی کرنی چاہیے اور گھر کی عورتوں پر ایسی حالت میں کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں، یہ احکام سورۃ النور کی پیشِ نظر آیات میں دیئے گئے ہیں۔

سابقہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بدکاری کے محرکات میں سب سے خطرناک محرک نظر بازی اور بدنگاہی ہے۔ کسی بھی مسلمان عورت کے باہر نکلنے پر حجاب اور نقاب کا حکم دے کر اس جرم پر پہرا بٹھا دیا گیا، لیکن ابھی تک ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا معاشرتی ضرورت کے تحت چونکہ باقی تھا اور جسے ختم بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن کچھ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی معاشرے کی پاکیزگی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور خود اپنے آپ کو بھی تباہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس محرک کو ختم کرنے کیلئے پہلے تو گھروں میں داخلے کیلئے استیناس اور استیذان کا حکم دیا اور مزید پابندیاں گھروں میں داخل ہونے کے بعد حسبِ ضرورت لگائی گئیں جن میں مردوں کیلئے غضِ بصر اور حفظِ فروج کی پابندیاں عائد کی گئی کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے بعد اگر ان دو باتوں میں بھی بے احتیاطی کی

Marfat.com

جائے تو گناہ کے پیدا ہو جانے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔نزولِ قرآن کے وقت معاشرے کی جو کیفیت تھی اس میں مردانہ نشست گاہیں گھروں میں الگ نہیں ہوتی تھیں اور دیہات میں تو آج تک ہمارے یہاں بھی ایسا نہیں ہوسکا کیونکہ کوئی معاشرہ بھی اس حال کو صدیوں میں نہیں پہنچتا کہ اس کے مالی حالات اس کے ایک ایک فرد کو پرتکلف اور حسبِ ضرورت رہائش گاہ بنانے کی اجازت دے سکیں، تو ایسی صورتحال میں ضروری ہے کہ جب دور پار کے قرابتدار گھروں میں آئیں تو آنے والوں کو بعض آداب کی پابندی کرنی چاہئے۔ جن میں پہلا ادب غضِ بصر ہے۔یعنی وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھیں تاکہ کسی نامحرم پر ان کی نگاہ نہ پڑے اور نہ وہ اس طرح آنکھیں بند کر کے اندر داخل ہوں کہ ٹھوکر کھا کے یا الجھ کر گر جائیں۔اس لئے مِنْ اَبْصَارِهِمْ کا لفظ استعمال کیا گیا۔اس میں مِنْ تبعیض کیلئے ہے۔یعنی راستہ دیکھنے کیلئے آنکھ کھلی رہے،لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے سے آنکھ بند رہے۔

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کی احتیاطیں

پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو سابقہ تین آیات کے ساتھ جب ہم ملا کر پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ اور بعد کی آنے والی آیتِ کریمہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ اس صورت میں ہیں جبکہ دور پار کے عزیزوں میں سے کوئی مہمان تشریف لائیں۔ظاہر ہے کہ وہ محرم تو نہیں ہوں گے تو ان کیلئے گھر میں داخل ہونے کے بعد متذکرہ بالا ہدایات کی پابندی ضروری ہے۔لیکن اس صورت میں بھی صاحبِ خانہ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ رشتے داروں میں بھی ہر شخص اخلاق کے اعتبار سے بھروسے کا آدمی نہیں ہوتا۔اس لئے پہلے انہیں اطمینان کر لینا چاہئے کہ ہم جس مہمان کو اندر لا رہے ہیں اس کے سیرت و کردار پر کہاں تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ احکام اس صورت میں ہیں جب مردوں اور عورتوں کی نشست گاہیں الگ الگ نہ ہوں۔لیکن اگر دور پار کے عزیزوں اور یا اجنبیوں کیلئے الگ نشست گاہوں کا انتظام ہے تو پھر اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ مردوں کو گھر کی عورتوں سے الگ بٹھایا جائے۔

اس آیت میں چونکہ سب سے پہلے غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں جس طرح نگاہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، اسی طرح ایک بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔مرد و عورت کے درمیان برائی پیدا کرنے کیلئے یہ اولین قاصد کا کام دیتی ہے۔اسی کے بہک جانے اور بے باک ہو جانے سے فواحش کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف کا پہرہ بٹھا دیا جائے تو انسان شیطان کے بہت سے فتنوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔جنسی بگاڑ میں اس کی تاثیر کو دیکھتے ہوئے قرآن و سنت میں اس کے بارے میں ضروری ہدایات دی گئی ہیں۔اگرچہ موقعہ کلام کے تقاضے کے تحت بہت زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن اس کے اثرات کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ چند ضروری ہدایات کو ذکر کر دیا جائے۔

ا۔ کسی بھی مومن کیلئے حلال نہیں کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے۔لیکن یہ معاف نہیں کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو، وہاں پھر نظر دوڑائے۔نبی کریم ﷺ نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا۔ایک موقع پر حضرت بریدہؓ کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یاعلی لاتتبع النظرة النظرة فان لک الاولی ولیست لک الاخرة ''اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری معاف نہیں۔حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے، جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا، میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (طبرانی)

Marfat.com

کسی کو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مسلمان عورتیں چہرے پر نقاب ڈالتی ہوتیں تو غضِ بصر کا حکم دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بات کو کج فہمی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ امت کا تعامل اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک شریعت کی پابندی کرنے والی خواتینِ اسلام نے ہمیشہ چہرے پر نقاب ڈالا ہے۔ غضِ بصر کا حکم دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہونے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ سے نقاب ہٹالے۔ اور پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مسلمان ملکوں اور معاشروں میں ہمیشہ غیر مسلم عورتیں بھی رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ وہ تو بے پردہ ہی رہتی ہیں، حجاب یا نقاب استعمال نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ اور بھی مصلحتیں ہیں جن کی وجہ سے غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے۔

غضِ بصر میں استثناء

۲۔ غضِ بصر کا حکم تو واضح ہے لیکن اس سے وہ صورتیں مستثنیٰ ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت پیش آجائے۔ مثلاً کوئی کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو، اس غرض کیلئے عورت کے علم میں لائے بغیر اسے دیکھ لینے کی اجازت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کو نکاح سے پہلے اس کی ہدایت فرمائی۔ اسی طرح تفتیشِ جرائم کے سلسلے میں اگر کسی مشتبہ عورت کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہو تو اس کی بھی اجازت ہے۔ عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کسی گواہ عورت کو دیکھنا چاہے یا علاج کیلئے طبیب مریضہ کو دیکھنا ضروری سمجھے تو شریعت نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔

حفظِ فروج کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا حکم جو دیا گیا ہے وہ حفظِ فروج کا ہے۔ جس کا لفظی معنی شرمگاہوں کی حفاظت ہے، لیکن مراد اس سے شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی ہے۔ بظاہر تو اس لفظ سے یہ تأثر ملتا ہے کہ شاید ناجائز شہوت رانی سے روکا گیا ہے، لیکن حقیقت میں اس کی مراد میں وسعت پائی جاتی ہے۔ ناجائز شہوت رانی تو آخری بات ہے، لیکن جو چیزیں اس کے مقدمات کا درجہ رکھتی ہیں، ان سے روکنا بھی ان میں شامل ہے۔ مثلاً کسی مرد کیلئے اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے کی اجازت نہیں۔ اور مرد کیلئے ستر کی حدود آنحضرت ﷺ نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائی ہیں۔ دار قطنی کی روایت میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، **عورة الرجل مابین سرته الی رکبته** ''مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے۔'' حضرت جرھد اسلمیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا **اماعلمت ان الفخذ عورة** ''کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کی چیز ہے۔'' آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا **احفظ عورتک الامن زوجتک اوماملکت یمینک** ''اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو، اپنی بیوی یا لونڈی کے سوا۔'' اس صحابی نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اگر انسان تنہا ہو تو پھر اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حفظِ فروج میں صرف یہی احتیاط کافی نہیں کہ آدمی اپنا ستر کھلنے نہ دے اور دوسرے کے ستر کو نہ دیکھے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا لباس نہ پہنے جس سے اعضائے مخصوصہ نمایاں ہوں۔ اور وہ لباس شرم وحیاء پیدا کرنے کی بجائے جنسی جذبات کو انگیخت کرنے والا

Marfat.com

ہو۔ آج کل جس طرح کا لباس عام طور پر نوجوانوں نے پہننا شروع کر دیا ہے جس میں ستر پوشی کا جذبہ تو دور دور تک محسوس نہیں ہوتا، صرف زینت اور اظہارِ زینت کو مقصد بنا لیا گیا ہے اور زینت بھی ایسی کہ جسے کوئی شرم وحیاء والی نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے، لیکن مسلسل استعمال سے اب نگاہیں اس طرح عادی ہو گئی ہیں کہ وہ گھرانے جو شرم وحیاء کے پیکر سمجھے جاتے تھے اب ان گھروں میں بھی نوجوان بے ہودہ سے بے ہودہ لباس پہنتے ہیں اور کوئی برا محسوس نہیں کرتا۔

ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ "یہ طریقہ ان کیلئے پاکیزہ ہے، بیشک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔" گھروں کے اندر جن احتیاطوں کا حکم دیا گیا ہے اگر ان کی پابندی کی جائے تو گھروں کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے اور ہر طرح کے اخلاقی فساد سے محفوظ رکھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ البتہ اس میں یہ لازمی شرط ہے کہ میزبان اور مہمان ان احتیاطوں کی پابندی کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کو مستحضر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور ہماری نیتوں تک سے آگاہ ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے اعمال کی درستی کی ضمانت بن سکتا ہے اور اگر یہ تصور دل کا عقیدہ نہ بنے تو پھر نگاہ کی پاکیزگی اور دلوں کی طہارت کی کوئی چیز ضمانت نہیں بن سکتی۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِھِنَّ اَوْ اٰبَآئِھِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِھِنَّ اَوْ اَبْنَآئِھِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِھِنَّ اَوْ اِخْوَانِھِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِھِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِھِنَّ اَوْ نِسَآئِھِنَّ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْھَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِھِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِھِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

(آپ ایماندار عورتوں کو حکم دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر ان میں سے جو خود بخود ظاہر ہو جائیں اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کی بکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کیلئے یا اپنے باپوں کیلئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے یا اپنے بیٹوں کیلئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے بھائیوں کیلئے یا اپنے بھتیجوں کیلئے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کیلئے یا اپنے تعلق کی عورتوں کیلئے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے جو عورتوں کی شرم والی چیزوں سے آگاہ نہیں، اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں تاکہ معلوم ہو جائے وہ بناؤ سنگھار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ ۳۱)

Marfat.com

گھر کے اندر عورتوں کو ہدایات

اب اس آیتِ کریمہ میں گھروں میں نامحرموں کے آنے کی صورت میں ہدایات دی جارہی ہیں۔ دو ہدایات تو وہی ہیں جو سابقہ آیتِ کریمہ میں مردوں کو دی گئی ہیں، یعنی غضِ بصر اور حفظِ فروج۔ البتہ حفظِ فروج کے حوالے سے کچھ مزید ہدایات دی گئی ہیں جو عورتوں کیلئے مخصوص ہیں اور جس سے یہ اندازہ کرنا کسی بھی صاحب علم اور صاحب ایمان کیلئے مشکل نہیں رہتا کہ اپنی شخصیت کی تعمیر اور حفاظت کے حوالے سے عورت اور مرد کیلئے احکام یکساں نہیں۔ مردوں کیلئے نگاہوں اور ستر کی جگہوں کی حفاظت کافی ہے۔ لیکن عورتوں کیلئے ان دونوں ہدایات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

۱۔ اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں، بجز اس کے جس کے ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں۔

۲۔ اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سینوں کو ڈھانپ لیا کریں۔

۳۔ زمین پر پاؤں اس طرح نہ ماریں کہ مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔

۴۔ درمیان میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے سامنے زینت کا اظہار ممنوع نہیں۔

اس طرح سے وہ قواعد وضوابط بیان کر دیئے گئے ہیں جن سے گھروں کے ماحول میں پاکیزگی کی امید کی جاسکتی ہے اور اسلامی معاشرے کو ایسے گھر میسر آسکتے ہیں جو ایک طرف ان کیلئے ہر طرح کی بداخلاقی اور لادینیت کی یورش سے پناہ گاہ کا کام دیں گے اور دوسری طرف وہیں سے وہ نسلیں نکلیں گی جو اسلامی اخلاق کی پیکر اور اسلامی قوت کا ہراول دستہ ہوں گی۔

اب ہم آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمودہ ہدایات میں سے ایک ایک کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ گھر کے اندر جب کوئی غیر محرم داخل ہو تو گھر میں موجود خواتین اپنی نگاہیں جھکالیں تاکہ گزرنے والے مہمان پر ضرورت سے زیادہ نگاہ نہ پڑے۔

۲۔ اپنی شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی کریں یعنی جب انہیں معلوم ہو کہ باہر سے کوئی مہمان آرہا ہے اور وہ نامحرم ہے تو اگر مکان میں عورتوں کے الگ بیٹھنے کی گنجائش ہو تو پھر اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ عورتیں الگ بیٹھیں اور مہمانوں کو الگ بٹھایا جائے۔ لیکن اگر مکان تنگ ہے اور مہمانوں نے وہیں سے گزر کے جانا ہے تو پھر وہ اپنی شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی کریں، یعنی اپنے لباس کو درست کریں، اپنی بُکل کو ٹھیک کرلیں۔ لباس اس طرح کا نہ ہو جو بجائے پردہ پوشی کے جذبات میں تحریک پیدا کرے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو باریک لباس پہننے سے روکا۔ حضرت اسماءؓ جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن ہیں جب انہیں باریک لباس میں دیکھا تو آپؐ نے منہ پھیر لیا اور ارشاد فرمایا کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو پھر اسے ایسا لباس نہیں پہننا چاہئے جس سے جسم جھلکتا ہو اور اس کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا سارا جسم محجوب ہونا چاہئے اور پھر آپؐ نے کلائی اور ہاتھ کے جوڑ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس سے زیادہ کلائی کھلی نہیں ہونی چاہئے۔

۳۔ تیسرا حکم یہ دیا کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ بجز اس کے کہ جو خود بخود ظاہر ہو جائے۔ بعض لوگوں نے زینت سے مراد چہرہ لیا ہے حالانکہ میں پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ سیاقِ کلام سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں حجاب اور نقاب کی بحث نہیں ہو رہی، اس کا حکم سورۃ الاحزاب میں ہے۔ یہاں بحث گھر کے پردے کی ہے۔ اس لئے جب ایک مومنہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو اسے بڑی چادر سے چہرے پر گھونگٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے جسے ادنائے جلباب کہتے ہیں۔ لیکن گھر میں پردے کیلئے ادنائے جلباب نہیں ضرب خمار کا حکم دیا گیا ہے

Marfat.com

یعنی اوڑھنیوں سے بُکّل مارنے کا۔ اور ہر صاحب علم وعقل اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ خمار سے بُکّل مارنے میں چہرہ شامل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے چہرے کو اس میں شامل کرنا تکلف کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں زینت سے مراد بناؤ سنگھار کا سامان یعنی زیور لیا جائے۔ اور آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ عورتوں کو چاہئے کہ گھر میں چلتے ہوئے زمین پر پاؤں زور سے نہ ماریں تا کہ ان کی مخفی زینت ظاہر نہ ہو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخفی زینت سے مراد وہ زیور ہے جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں جسے عام طور پر پازیب کہا جاتا ہے۔

۴۔ چوتھا حکم یہ دیا گیا ہے کہ گھروں میں عورتیں اپنے دوپٹوں اور اوڑھنیوں سے بُکّل مارلیا کریں یعنی اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ صاحب کشاف اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے یہ وضاحت کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتیں اپنے سروں پر دوپٹہ لینے کا تکلف کرتی تھیں لیکن ایک دھجی اور چیتھڑے کی طرح دوپٹہ ان کے سر سے کمر پر لٹکتا رہتا اور سینے پر قمیض کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے قرآنِ کریم میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ اس طرح اپنے سروں پر دوپٹے لیں جس سے سر بھی ڈھکا رہے، کمر بھی اور سینہ بھی چھپا رہے اور سینے کا ابھار چونکہ شرم کی جگہ ہے اس لئے بطورِ خاص اس پر دوپٹہ ڈالنے کا حکم دیا۔

انسانی سیرت وکردار میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کا رجوع اسی جاہلیت کی طرف ہوتا ہے جس سے اسلام نے انسانوں کو نکالا ہے۔ آج بھی جو لوگ تہذیب مغرب کے زیرِ اثر اسلامی تہذیب سے برگشتہ ہیں ان کے گھروں کی خواتین اپنے طور اطوار میں اسی جاہلیت کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ ان کے دوپٹے ان کے کندھوں پر جھولتے رہتے ہیں۔ وہ چاکِ گریباں اور سینے کے ابھار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کو لازمۂ تہذیب سمجھتی ہیں۔

وہ لوگ جن کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں

متذکرہ بالا ہدایات کے بعد پروردگار نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے سامنے زینت کا اظہار ممنوع نہیں۔ جب ہم اس فہرست پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو قدر مشترک ہے وہ ان کا محرم ہونا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان رشتوں کی خصوصیت نہیں بلکہ ان کے سامنے اظہارِ زینت کی اجازت کی علت ان کا محرم ہونا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں جبکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی محرم رشتہ داروں میں شامل ہیں۔ اس فہرست میں جن لوگوں کو ذکر کیا گیا ہے یوں تو ان میں کوئی معنوی الجھن نہیں البتہ بعض الفاظ مصداق کے حوالے سے وضاحت طلب ضرور ہیں مثلاً اٰبَـآئِہِنَّ، اٰبَـآء، اَبٌ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے باپ۔ لیکن یہاں یہ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد تمام اجداد واعمام ہیں۔ ان میں دادا، پردادا اور نانا، پرنانا بھی شامل ہیں، لہٰذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال اور اپنے شوہر کی ددھیال اور ننھیال کے ان سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح اپنے والد اور اپنے خسر کے سامنے آسکتی ہے۔

بھائیوں میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہیں۔ یعنی ان کے پوتے، پرپوتے اور نواسے، پرنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

اَوْنِسَآئِہِنَّ:۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے، ان کی عورتیں۔ اس میں مطلق عورتوں کا ذکر کرنے کی بجائے ان کی عورتیں فرمایا گیا ہے، جس کا معنی اپنی عورتیں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے ہر طرح کی عورتیں مراد نہیں لی جاسکتیں۔ کیونکہ اگر ایسا

Marfat.com

ہوتا تو پھر صرف نساء کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ اس لئے بعض اہلِ علم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہئے، جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے ایک مکتوب سے بھی استدلال کیا ہے جو انہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں حالانکہ جو عورت اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہے، اس کیلئے حلال نہیں کہ اس کے جسم پر اس کے اہلِ ملت کے سوا کسی اور کی نظر پڑے۔ یہ خط جب حضرب ابوعبیدہؓ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، خدایا جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کیلئے ان حماموں میں جائے، اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے۔ (ابن جریر، بیہقی، ابن کثیر)

بعض دیگر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد اپنے میل جول اور تعلق اور خدمت کی عورتیں ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ کیونکہ وہ جانی پہچانی اور بھروسے کی خواتین ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کی اجنبی عورتوں کے سامنے خواہ وہ مسلمان ہی ہوں اپنی زینت کا ظاہر کرنا فتنہ اور خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری کا ذکر آتا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جانا چاہئے وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیاء اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیاء، آبرو باختہ اور بد اطوار عورتیں خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہئے، کیونکہ اخلاق کیلئے ان کی صحبت غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کن نہیں۔

اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اس سے بعض لوگوں نے لونڈیاں مراد لی ہیں اور بعض لوگوں نے لونڈیاں اور غلام دونوں مراد لئے ہیں، لیکن آج چونکہ غلاموں اور لونڈیوں کا وجود ختم ہو گیا اس لئے یہ بحث آج کی ضرورت نہیں رہی۔ علمی دلچسپی کیلئے دیگر تفاسیر دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن عملی رہنمائی کیلئے چونکہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ "یعنی مردوں میں سے وہ مرد جو زیرِ کفالت ہوں اور جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں۔ یعنی ایک مسلمان عورت ان مردوں کے سامنے اظہارِ زینت کر سکتی ہے جو اس کے زیرِ کفالت ہوں یا اس کے بزرگوں کے زیرِ کفالت ہوں اور اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ حدود سے تجاوز کا تصور بھی نہ کر سکتے ہوں اور دوسری یہ بات کہ وہ اپنی عمر یا جسمانی عدمِ اہلیت یا اپنی کمزوری یا فقر و مسکنت کے باعث یہ طاقت اور جراٴت نہ رکھتے ہوں کہ وہ صاحبِ خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کے متعلق کوئی بری نیت دل میں لا سکیں۔ لیکن گھر کے وہ ملازم جنہیں ان کی تنخواہ ایک طرح کی جراٴت دلاتی ہے پھر ان کی مناسب عمر اور صحت جنسی جذبات پر آمادہ کر سکتی ہے ان کے سامنے عورتوں کا بے پردہ آنا اور اظہارِ زینت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان مخنثین سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا ہے جو اگرچہ گناہ پر قادر نہیں، لیکن کسی حد تک جنسی خواہشات کے باعث عورتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بخاری اور مسلم اور بعض دیگر کتب میں بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک مخنث تھا جسے ازواجِ مطہرات اور دوسری خواتین غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ میں شمار کر کے اپنی ہاں آنے کی اجازت دے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی کریم ﷺ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپؐ نے اس کو حضرت ام سلمہؓ کے بھائی عبداللہ بن امیہ سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہو جائے تو غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ کو حاصل کئے بغیر نہ رہنا، پھر اس نے بادیہ کے حُسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی۔ اور اس کے ایک ایک عضو کی صفت بیان کر ڈالی نبی کریم ﷺ نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا "خدا کے دشمن تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں۔" پھر آپؐ نے حکم دیا کہ اس

Marfat.com

سے پردہ کرو، آئندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپؑ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مخنثوں کو بھی گھروں میں آنے سے منع فرما دیا کیونکہ ان کو مخنث سمجھ کر عورتیں ان سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غَيْرِ اُوْلِي الْاِرْبَةِ ہونے کیلئے صرف یہ بات کافی نہیں کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہر حال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

بوڑھے ملازمین کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے باعث اس قابل ہیں کہ انہیں غَيْرِ اُوْلِي الْاِرْبَةِ کا مصداق سمجھا جائے، لیکن یہ بات دیکھنا بہت ضروری ہے کہ صنفِ نازک کے بارے میں ان کے احساسات کا حال کیا ہے اور کیا وہ اپنی نجی مجلسوں میں صنفِ نازک کے اوصاف کو گفتگو کا موضوع بناتے ہیں یا نہیں۔ جب تک اس حوالے سے اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک انہیں گھروں کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ "یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہ ہوں۔" یعنی ان بچوں کے سامنے عورتیں اظہارِ زینت کر سکتی ہیں جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ رہی یہ بات کہ صنفی احساسات بچوں میں کس عمر میں بیدار ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک بچہ نابالغ ہے وہ بہت حد تک صنفی ضروریات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بلوغ سے پہلے بھی بچوں میں صنفی احساسات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کیلئے کسی عمر کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ جن بچوں کا ماحول نہایت پاکیزہ ہو اور ان کی تعلیم تزکیۂ نفس کیلئے معاون ہو اور ان کے گھروں میں ٹی وی اور اس طرح کی دوسری سہولتیں میسر نہ ہوں اور ان کے دوستوں اور ہمجولیوں میں بگڑے ہوئے بچے موجود نہ ہوں تو ایسے بچے تو یقیناً بلوغ کے قریب پہنچ کر ان احساسات سے آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن جن تعلیمی اداروں میں جنس کو سبجیکٹ کے طور پر پڑھایا جاتا ہو اور جن کے گردوپیش میں صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور جن کا ماحول اور جن کے بڑے اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوں وہ تو دس گیارہ سال کی عمر میں بھی ان باتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں شروع میں تو بچوں کو ہر وقت عورتوں کے یہاں آنے جانے کی اجازت تھی لیکن بعد میں تین اوقات میں ان کے اوپر بھی پابندی لگا دی گئی۔ بلا شبہ عرب کا معاشرہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ لیکن ان میں بھی غیرت کا کسی حد تک تصور پایا جاتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے بچوں میں ہر طرح کی انارکی کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن آج کا مغرب اور ان کے زیرِ اثر مشرق میں رہنے والے متغربین ہر طرح کی اخلاقی حدود سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اگر اپنے بچوں کی صالح تربیت منظور ہے تو انہیں صرف ان کے ظاہری اعمال نہیں بلکہ ان کے احساسات پر بھی نظر رکھنی چاہئے۔

مخفی زینت کے اظہار کی ممانعت

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ "وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں تاکہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔" جو ذوقِ زینت کو پسند کرتا ہے اس کے اندر زینت کا اظہار ایک فطری بات ہے۔ ایسا ذوق مردوں میں بھی رکھا گیا ہے اور عورتوں میں بھی، لیکن عورتوں میں یہ جذبہ مرد کی نسبت زیادہ ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عورت سرتاپا حُسن ہے اور اسی نے اس کے اندر ایک کشش پیدا کی ہے جس کے جواب میں مرد اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ فطری جذبہ نہ ہوتا تو مرد جس طرح اس کیلئے بیتاب ہوتا ہے یہ بیتابی کبھی پیدا نہ ہوتی۔ اسلام نے اس جذبے کی تحسین فرمائی ہے۔ البتہ اس کیلئے ایک مخصوص دائرہ اور ایک مخصوص محل متعین کر دیا

Marfat.com

ہے۔ جب یہ جذبہ اس دائرے سے باہر نکلتا ہے تو یہیں سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس آیتِ کریمہ میں ان رشتوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جن کے سامنے اس جذبے کا اظہار ہوسکتا ہے، لیکن جب گھر میں نامحرم موجود ہوں اور خاتونِ خانہ کو ان کے پاس سے گزرنا پڑے تو اسی جذبے کو حدود میں رکھنے کیلئے حکم دیا کہ پاؤں کو زمین پر زور سے مار کر نہ چلو تاکہ تم نے اگر اپنے پاؤں میں کوئی زیور پہن رکھا ہے تو اس کی کھنک نامحرموں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ زیور پہننے پر اعتراض نہیں لیکن نامحرموں تک اس کے اظہار پر اعتراض ہے۔ یہی اسلام کا وہ اعتدال ہے جس سے اخلاقِ صالحہ وجود میں آتے ہیں۔

زینت کے مفہوم میں وسعت

نبی کریم ﷺ نے اس حکم کی حقیقت کو کھولتے ہوئے اسے زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا کہ نگاہ کے سوا دوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اس مقصد کے خلاف ہیں جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہارِ زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ ایسی خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں جس کی مہک دوسروں تک بھی پہنچتی ہو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اذا استعطرت المرأة فمرت علی القوم لیجدوا ریحھا فھی کذاوکذا قال قولا شدیدا ”جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے اور آپؐ نے اس کیلئے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔“ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

اسی طرح آپؐ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ عورتیں بلاضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ کوئی ضرورت پیش آ جائے تو پروردگار نے بات کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن جہاں کوئی دینی یا اخلاقی ضرورت درپیش نہ ہو وہاں اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، لیکن اگر عورتیں امام کے پیچھے ہوں اور انہیں امام کی غلطی پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو انہیں بولنے کی بجائے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی کو تصفیق کہا گیا ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ یہ ہدایات چونکہ پورے مسلم معاشرے کی اصلاح و تطہیر کیلئے دی گئی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ معاشرے کا ایک ایک فرد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ سب مل کر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں جو احکام دیئے گئے ہیں انہیں محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم پر یقین رکھتے ہوئے زندگی کا رہنما بنائیں۔ اس صورت میں امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فوز و فلاح سے نوازے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۚ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

(اور نکاح کردو اپنے میں سے مجرد لوگوں کا، اور اپنے ان غلاموں اور لونڈیوں کا جو ذی صلاحیت ہوں، اگر وہ تنگدست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے گا، اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔ ۳۲)

Marfat.com

ایَامٰی سے مراد

اَلْاَیَامٰی ...... ایّم کی جمع ہے۔ اہلِ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ اصل میں اس کا اطلاق اس عورت پر ہوتا ہے جس کا خاوند نہ ہو، خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ یا مطلقہ۔ اب اس کا اطلاق ایسے مرد پر بھی ہونے لگا ہے جس کی بیوی نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد تمام وہ مرد و عورت ہیں جو مجرد ہوں، چاہے ان کا نکاح نہ ہوا ہو، یا نکاح کے بعد اپنے ساتھی سے محروم ہو گئے ہوں۔

تجرد کی حوصلہ شکنی کیونکہ یہ بھی گناہ کے عوامل میں سے ہے

ان آیات میں چونکہ اسلامی معاشرے کو ان عوامل سے پاک کرنا ہے جو اخلاقی مفاسد کا باعث بنتے اور شیطان کی دراندازیوں کیلئے دروازہ کھولتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایسے ہی ایک عامل کا ذکر فرمایا گیا ہے جس کی طرف سے غفلت اور لاپرواہی بہت سے اخلاقی مفاسد کا موجب بن سکتی ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ معاشرے میں وہ مرد و عورت جو نکاح کی عمر کو پہنچ چکے ہیں اور یا وہ کسی وجہ سے اپنے رفیقِ حیات سے محروم ہو گئے ہیں تو انہیں مجرد رہنے کیلئے نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو رشتۂ نکاح میں پرونے کی کوشش کرے کیونکہ ان کا مجرد رہنا معاشرے میں اخلاقی مفاسد کا سبب بن سکتا ہے۔ تجرد جہاں ناجائز تعلقات کے امکانات میں اضافہ کرتا ہے وہیں تہمتوں اور الزامات کا باعث بھی بنتا ہے اور اسی سے معاشرے میں بے حیائی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے مسلمان معاشرے کو اس بات کی فکر ہونی چاہئے کہ ایسے حالات پیدا کرے جس سے شادی بیاہ آسان ہو جائے اور لوگوں میں اس طرح کے احساسات پیدا کرے جس سے تجرد کی حوصلہ شکنی ہو، اور لوگ اسے صرف اس مرد یا عورت کی ضرورت نہ سمجھیں جو تجرد کی زندگی گزار رہا ہے بلکہ معاشرے کی اخلاقی استواری کیلئے اس راستے کو بند کرنے کی کوشش کریں۔

جو لوگ نکاح کے قابل ہیں ان کے نکاح نہ ہونے کے دو سبب ہو سکتے ہیں (۱) غربت، (۲) برادریوں اور قبیلوں کے رسم و رواج۔ لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہو جاتے ہیں تو نکاح کے تصور کے ساتھ ہی نکاح کے مصارف اور اخراجات کا سوال گھروں میں پیدا ہوتا ہے کہ لڑکا جب تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے یعنی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی بیوی اور آئندہ چل کر بچوں کا کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گا اس وقت تک اس کا نکاح کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یا تو آنے والی لڑکی مصائب کا شکار ہو جائے گی اور یا اگر مشترکہ خاندان ہے تو دوسروں پر اس کا بوجھ پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں ان کی ازدواجی زندگی ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب لڑکی کے سرپرست لڑکے کو دیکھتے ہیں کہ وہ ابھی تک کمانے کے قابل نہیں ہوا تو وہ کبھی بھی رشتہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بعض خاندان اور قبائل ایسے ہیں جو عقدِ بیوگان کو معیوب سمجھتے ہیں اور ہندو معاشرے کے زیرِ اثر بعض مسلمان خاندان ایسے بھی ہیں جو صرف معیوب ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے اخلاقی سطح سے ایک گری ہوئی بات سمجھتے ہیں۔ ایسے تمام مفاسد کا علاج صرف یہ ہے کہ مسلمان معاشرے میں تجرد کی زندگی کو معاشرے کیلئے خطرناک تصور کیا جائے اور لوگوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ جن عوامل کے باعث عقدِ نکاح مشکل ہو رہا ہے اور ان کی کوئی مذہبی اور اخلاقی حیثیت نہیں انہیں اپنی زندگیوں سے خارج کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

Marfat.com

ذی صلاحیت غلاموں کے نکاح کی ہدایت

جس طرح آزاد لوگوں میں تجرد اخلاقی ناہمواری کا سبب بن سکتا ہے اس طرح غلاموں اور لونڈیوں میں بھی برائی کا موجب ہوسکتا ہے۔اس لئے اسلام نے ان کے بارے میں ایک ہی سلسلۂ بیان میں برابر کی سطح پر رکھ کر حکم دیا کہ تمہارے وہ غلام اور لونڈیاں جن میں تم اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت دیکھتے ہو کہ وہ نکاح کے بعد اپنی ازدواجی زندگی کو حُسن وخوبی نبھا سکتے ہیں انہیں بھی قید نکاح میں لانے کی کوشش کرو۔لیکن اگر تم یہ محسوس کرو کہ جس غلام یا لونڈی کا رویہ تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں اور جس کے مزاج میں ایسی خرابی موجود ہے کہ وہ اپنی بیوی کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتا تو پھر اس کے نکاح کی ذمہ داری اس کے آقا پر نہیں۔

نکاح رزق میں اضافے کا سبب

غربت کا معاملہ زندگی کے مسائل میں سب سے مشکل مسئلہ ہے۔اگرچہ اس میں شدت لوگوں میں غلط رسم ورواج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لیکن اگر ان میں صحیح احساس پیدا ہوجائے اور وہ رسمِ نکاح کو سادگی سے انجام دینے کو ہلکا پن سمجھنے کی بجائے صحیح طریقہ سمجھیں تو اس میں بہت حد تک کمی آسکتی ہے۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنگدستی کا اندیشہ بہرحال اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔اس لئے پروردگار نے اسی آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ جو لوگ غربت کے باعث ازدواجی زندگی اختیار کرنے سے ڈرتے ہیں ان کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ اگر انہوں نے محض پاکدامن رہنے کیلئے نکاح کی ذمہ داری قبول کی تو اللہ تعالیٰ انہیں غنی کردے گا۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کی مدد اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ (۱) وہ نکاح کرنے والا جس کی غرض پاکدامن رہنا ہو،(۲) وہ مکاتب جو زرِ مکاتبت ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو،(۳) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے وعدے اور اس کے کرم پر اعتماد ایک مومن کی سب سے بڑی دولت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عقدِ نکاح کے بعد میاں بیوی اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہُن برسنا شروع ہوجائے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریب لوگ اس بات پر اطمینان رکھیں کہ نکاح فقر میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ خدا کے رزق وفضل میں اضافہ کرتا ہے۔جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر ازدواجی زندگی کا بوجھ اٹھالیتا ہے تو پھر وہ گھر کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے جو بھی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتا ہے۔اور اگر میاں بیوی دونوں مل کر اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو اب تک ان کی سوچ کا محور صرف اپنی ذات تھی۔اب ان کے محور میں وسعت آجانے کے بعد ان کے عزائم اور کوششوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ان کی وہ صلاحیتیں جو سکڑی اور دبی ہوئی تھیں انہیں کھلنے کا موقع ملے گا۔دونوں کی رفاقت ایک دوسرے کی معاون بنے گی۔دونوں ایک دوسرے کے سہارے کے ساتھ جدوجہد کا سفر کریں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نوازے گا۔

بیشمار لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ شادی سے پہلے جن لوگوں کے گھروں میں افلاس کی حکومت تھی لیکن وہ افلاس کو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتے تھے۔شادی کے بعد بہت جلدی ان کے گھروں میں تبدیلی آنے لگی۔رزق کے دروازے کھلنے لگے،اللہ تعالیٰ نے صالح اولاد عطا فرمائی۔وقت کے ساتھ ساتھ ایک بالکل نئی دنیا وجود میں آگئی۔تب اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی حقانیت کھلی کہ وہ کس طرح اپنے اوپر اعتماد کرنے والوں کو غنی کردیتا ہے۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بشارت کو مؤکد کرنے کیلئے اپنی صفات کا حوالہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دامنِ کرم میں بڑی گنجائش ہے اور کسی کے حالات اور ضروریات بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے نہ اسے عطا کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور نہ یہ جاننے میں کہ کون اس کا اہل ہے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۗ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ ۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

(اور جو لوگ نکاح کی مقدرت نہ پائیں انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کردے، اور جو تمہارے مملوکوں میں سے مکاتب ہونے کے طالب ہوں ان کو مکاتب بنا دو، اگر تم ان میں صلاحیت پاؤ اور ان کے اس مال میں سے دو جو خدا نے تم کو دیا ہے اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں محض اس لئے کہ کچھ متاعِ دنیا تمہیں حاصل ہو جائے اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کیلئے غفور و رحیم ہے۔ ۳۳)

نکاح کی عدمِ مقدرت میں ہدایت

معاشرے کی بہر حال یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شادی بیاہ کے معاملے کو نہایت سادہ اور سستا بنانے کی کوشش کرے تاکہ کوئی شخص مالی دشواریوں کے باعث اس سے محروم نہ رہے اور کسی بچی کے ہاتھ اس لئے پیلے ہونے سے نہ رہ جائیں کہ اس کے ماں باپ اس کو جہیز دینے کی ہمت نہیں رکھتے۔ لیکن جہاں تک افرادِ معاشرہ کا تعلق ہے ان میں ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے کہ اگر معاشرہ اپنا فرض انجام نہیں دیتا یا کسی اور وجہ سے کوئی شخص عقدِ نکاح سے محروم رہ جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اسے بدکاری کیلئے عذر بنالے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا گیا ہے کہ انہیں بہر صورت پاکدامنی کی زندگی گزارنی چاہیے۔ جب تک اللہ تعالیٰ انہیں نکاح کے مصارف اور ازدواجی زندگی کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں دیتا وہ نہایت صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس طرح پاکدامنی کی زندگی گزاریں جیسے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء ''نوجوانو تم میں سے جو شخص شادی کرسکتا ہو اسے کر لینی چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے، اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔'' (بخاری و مسلم)

Marfat.com

مکاتبت کا مفہوم اور اس کا حکم

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ''اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں۔'' مکاتبت کا لفظی معنی تو لکھا پڑھی ہے لیکن اصطلاح میں اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا سے درخواست کرے کہ میں اتنا معاوضہ ادا کرنے کیلئے تیار ہوں، آپ معاوضے کی ادائیگی کے بعد مجھے غلامی سے آزاد کر دیں، اور آقا اسے قبول کر لے اور مدت کا تعین ہو جائے اور اگر کچھ اور شرائط ضروری ہوں تو وہ بھی طے ہو جائیں اور اس معاہدے کو لکھ لیا جائے تو اسے معاہدۂ مکاتبت کہتے ہیں۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی کیلئے جو آسانیاں پیدا کی ہیں ان ہی میں سے مکاتبت بھی ہے، جس غلام کو یہ حق دیا جاتا ہے اسے مکاتب کہتے ہیں۔ اور جو وہ معاوضہ ادا کرتا ہے اسے زرِ مکاتبت کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کے طے ہو جانے کے بعد اگر مدتِ مقررہ کے اندر غلام زرِ مکاتبت ادا کر دے تو اس کے آقا کو اس کی آزادی کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ نہ اسے کام سے روک سکتا ہے اور نہ معاوضہ کی پیشکش کے وقت معاوضہ قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو مکاتب کو عدالت میں جانے کا حق حاصل ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مکاتبت کی اور مدتِ مقررہ سے پہلے ہی مالِ کتابت فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا میں تو یکمشت نہ لوں گی بلکہ سال بسال اور ماہ بماہ قسطوں کی صورت میں لوں گی۔ غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا، رقم بیت المال میں داخل کر دو اور جاؤ تم آزاد ہو۔ پھر مالکہ کو پیغام بھیجا کہ تمہاری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے چاہو تو یکمشت لے لو ورنہ ہم تمہیں سال بسال اور ماہ بماہ دیتے رہیں گے۔ (دار قطنی بروایت ابوسعید مقبری)

فَکَاتِبُوْهُمْ کا مفہوم اور اختلاف کا حل

فَکَاتِبُوْهُمْ ...... کہ جب کوئی لونڈی یا غلام تم سے مکاتبت کی درخواست کرے تو اسے مکاتب بنا دو۔ یہ چونکہ امر کا صیغہ ہے اس لئے بعض اہلِ علم نے اسے وجوب کے معنی میں لیا ہے، یعنی کسی غلام کی درخواست پر آقا کیلئے اسے مکاتب بنانا واجب ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل میں حضرت عمر فاروق ؓ کے ایک فیصلے سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مشہور فقیہ و محدث حضرت محمد بن سیرین کے والد سیرین نے اپنے آقا حضرت انسؓ سے جب مکاتبت کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سیرین حضرت عمر فاروق ؓ کے پاس شکایت لے گئے۔ انہوں نے واقعہ سنا تو حضرت انسؓ کو ڈانٹتے ہوئے حکم دیا کہ انہیں مکاتب بناؤ۔ اور محولہ بالا آیت کے اس لفظ سے استشہاد کیا۔

دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ آیتِ کریمہ میں صرف فَکَاتِبُوْهُمْ نہیں فرمایا گیا بلکہ اس کے ساتھ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا بھی فرمایا گیا ہے۔ ''یعنی ان سے مکاتبت کر لو، اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ۔'' بھلائی کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے اور کوئی متعین معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جان سکے۔ ویسے بھی قانونی احکام کی شان یہ نہیں ہوا کرتی، اس لئے اس حکم کو تلقین اور ہدایت ہی کے معنی میں لیا جائے گا نہ کہ قانونی حکم کے معنی میں۔ رہی یہ بات کہ حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت انسؓ کو اس حکم کے ماننے پر مجبور کیا تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپؓ نے اسے قانون کے طور پر نافذ کیا کیونکہ آپؓ کی حیثیت صرف حاکمِ عدالت کی نہیں تھی بلکہ آپؓ افرادِ ملت کیلئے ایک باپ کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بسا اوقات ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں صرف باپ ہی دخل دے سکتا ہے۔

میرا ناقص گمان یہ ہے کہ اگر خیر اور بھلائی کا مفہوم سمجھ لیا جائے تو متذکرہ بالا دونوں گروہوں کے اختلاف میں تطبیق ہو سکتی ہے۔ خیر اور بھلائی سے یہاں تین چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔

Marfat.com

(۱) غلام میں مالِ کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو، یعنی وہ اس قابل ہو کہ جس معاوضے کی بنیاد پر وہ مکاتبت کرنا چاہتا ہے وہ معاوضہ کما کر مہیا کرسکتا ہو۔ ہنر مند آدمی ہو، صحت مند ہو، محنتی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ محض اس خیال سے کہ اسلام نے چونکہ ہمیں مکاتبت کا حق دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ چند سال زرِ مکاتبت ادا کرنے کی مدت مقرر کرلو۔ اس دوران خوب گھومو پھرو عیش کرو اور تھوڑا بہت جو کماؤ اسے کھا کر برابر کردو، اور پھر مدت کے اختتام پر حاضر ہو کر کہہ دو کہ میں زرِ مکاتبت ادا نہیں کرسکتا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بدنیت شخص معاہدۂ مکاتبت کے بعد اسے بہانہ بنا کر لوگوں سے مانگنا شروع کردے اور چونکہ اسلام نے ایسے لوگوں کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے اس لئے مسلمان خواہی نخواہی اس کی کچھ نہ کچھ مدد کریں اور یہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہے اور آخر عجز کا اظہار کردے۔ اس لئے یہ بات دیکھنا ازبس ضروری ہے کہ یہ شخص زرِ مکاتبت ادا بھی کرسکتا ہے یا نہیں۔

(۲) جو مکاتبت کا مطالبہ کررہا ہے اس میں یہ بات بھی دیکھی جائے کہ وہ کہاں تک دیانتدار اور راست باز آدمی ہے۔ کیا اس کے قول پر اعتبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۳) مکاتبت کے خواہاں آدمی میں اخلاقی رجحانات اور مسلمانوں کے ساتھ معاملات کا اندازہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے مالک سے مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس کا غلام اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک خیر خواہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر اسے مکاتبت کے ذریعے آزادی مل جائے تو وہ آستین کا سانپ ثابت ہو۔ کیونکہ غلاموں میں ایسے لوگ بھی تھے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئے۔ ضروری نہیں کہ گرفتاری کے بعد وہ مسلمانوں سے اپنی دشمنی کو بھول چکے ہوں۔

خیر کے مندرجہ بالا مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ جو غلام ذی صلاحیت، دیانتدار، قابلِ اعتماد اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مخلص ہے تو ایسے شخص کو حقِ مکاتبت نہ دینا یقیناً زیادتی ہے۔ ایسے شخص کیلئے حضرت عمر فاروق ؓ کا اسوہ ہمارے لئے حجت ہے۔ لیکن وہ شخص جو راست باز نہ ہو، مکاتبت کو محض مالک سے چھٹی پانے کا ذریعہ سمجھتا ہو یا وہ مسلمانوں کا بہی خواہ نہ ہو تو اس کے بارے میں مالک کو بجا طور پر حق پہنچتا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰـکُمْ ”اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔“

مکاتبت میں تعاون کا حکم

اللہ تعالیٰ نے غلاموں کیلئے آزادی کے حصول میں جو آسانیاں مہیا فرمائی ہیں تاکہ انسانوں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا جائے اور غلامی کی لعنت ختم کی جائے۔ ان میں دوسرے امکانات کے ساتھ ساتھ ایک حقِ مکاتبت بھی ہے، جس سے ایک باہمت آدمی اگر چاہے تو غلامی سے نجات حاصل کرسکتا ہے، لیکن اسے مزید آسان بنانے کیلئے پیشِ نظر آیت کے مذکورہ الفاظ میں تمام مسلمانوں کو ایسے شخص کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے مخاطب مکاتبت کا حق مانگنے والوں کے آقا بھی ہیں اور عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔ تینوں کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے کہ جب یہ لوگ معاونت کے خواستگار ہوں تو انہیں مایوس نہ کیا جائے۔

آقاؤں کو ہدایت کی گئی کہ جو تم سے حقِ مکاتبت مانگیں اور ان سے مکاتبت کا ایک معاوضہ طے ہوجائے تو مالِ کتابت کا کچھ نہ کچھ حصہ انہیں معاف کردو۔ چنانچہ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ اپنے مکاتبوں کو مالِ کتابت کا ایک معتدبہ حصہ معاف کردیا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا تو ہمیشہ یہ معمول رہا کہ وہ ہمیشہ اپنے مکاتبوں کو مالِ کتابت کا چوتھائی حصہ معاف کردیتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔

Marfat.com

عام مسلمانوں کو بھی چونکہ اس کی ہدایت کی گئی تھی اس لئے جو شخص بھی مالِ کتابت ادا کرنے کیلئے ان سے مدد کی درخواست کرتا تھا وہ دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ حتیٰ کہ قرآنِ کریم نے غلاموں کو غلامی کی قید سے آزاد کرانے کیلئے مدد کرنے کو مصارفِ زکوٰۃ میں شمار کیا ہے۔ اور فَکُّ رَقَبَۃٍ ''گردن کا بند کھولنا'' کو ایک بڑی نیکی کا کام قرار دیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا، مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔ حضورؐ نے فرمایا: تو نے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈالی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور تیرا جو رشتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر، اور اگر یہ نہیں کرسکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلائی کی تلقین کر، برائی سے منع کر، اور اگر یہ بھی نہیں کرسکتا تو اپنی زبان کو روک کر رکھ، کھلے تو بھلائی کیلئے کھلے ورنہ بند رہے۔ (بیہقی فی شعب الایمان، عن البراء بن عاذب)

اسلامی حکومت کو بھی ہدایت کی کہ اگر کچھ لوگ مجبور ہو کر حکومت سے رجوع کریں تو بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع ہو اس میں سے مکاتب کی رہائی کیلئے ایک حصہ خرچ کرے۔

مکاتبت کا حق لونڈیوں کو بھی ہے

مکاتبت کا یہ حق اسلام نے جس طرح غلاموں کو دیا اسی طرح لونڈیوں کو بھی دیا۔

مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ کی عمومیت بھی اس پر دلیل ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عمل بھی۔ روایات میں حضرت بریرہؓ اور حضرت جویریہؓ کے واقعات موجود ہیں جو اس کی عملی شہادت ہیں۔

اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد تمام ذی صلاحیت غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی نہایت وسیع راہ کھل گئی۔ اس کے بعد صرف وہی غلام باقی رہے جو یا تو اپنی حالت پر قانع اور مطمئن تھے یا ان کے اندر ہاتھ پاؤں مارنے اور معاشرے کے اندر خود اپنی جگہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا اعلانِ عام کر دیا جاتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ اپنے مالکوں کی سرپرستی سے بھی محروم ہو جاتے اور خود بھی اپنی کفالت کا انتظام نہ کر پاتے، جس کے سبب سے وہ معاشرے پر ایک بار بن کے رہ جاتے۔ ان کے عزتِ نفس اور عام ضروریات کی انجام دہی کیلئے ان کے آقاؤں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور حکم دیا کہ جو خود کھاؤ انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو، انہیں پہناؤ، انہیں اپنا بھائی سمجھو اور کبھی انہیں غلام کہہ کے مت پکارو۔

غلاموں کو مکاتبت کی سہولت اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو جس تعاون اور حُسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہ ہم نے پیشِ نظر آیت کی توضیح میں پڑھا ہے جس سے فی الجملہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کس قدر حقوق دیئے ہیں لیکن جب تک یکجا طور پر ان اسلامی احکام کو ذکر نہ کیا جائے جو غلامی ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے دیئے ہیں اس وقت تک اسلام کا انسانیت پر احسان اور دیگر نظام ہائے عالم میں اس کا امتیاز پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے ہم بڑے اختصار سے اس سلسلہ میں چند گزارشات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غلامی اسلام کے نظام کا کوئی جزء نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے تمام ممالک اور تمام اقوام میں ایک مروج طریقہ تھا جو مختلف حوالوں سے وجود میں آیا تھا۔ اسلام نے صرف وقتی طور پر اسے گوارا کیا تھا۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جس طرح اسلام نے صدیوں سے جمی ہوئی بعض خرافات کو بہ یک قلم ختم کر ڈالا، اسی طرح اس غلامی کی لعنت کو بھی ختم کیا جا سکتا تھا، تو آخر اسلام نے ایسا کیوں نہ کیا؟ یہ بات بظاہر دل کو اپیل کرتی ہے لیکن جس شخص کی نگاہ اس وقت کے تمدنی اور بین الاقوامی حالات پر ہے وہ یہ کہنے کی جرأت کبھی نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ اسلام کے

Marfat.com

نزول کے وقت تمام دنیا بالخصوص عرب میں تین طرح کے غلام موجود تھے۔ (۱) وہ غلام جو بعض ظالم اور جابر قسم کے لوگ زبردستی کسی کو پکڑ کر غلام بنا لیتے تھے اور پھر بیچ ڈالتے تھے۔ اب یہ بکنے والا شخص ہمیشہ کیلئے غلام بن کر رہ جاتا۔ (۲) وہ لوگ جو نسلوں سے غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے اباؤ اجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور نہ یہ معلوم تھا کہ یہ کسی جنگ میں پکڑے گئے یا ظلماً ان کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ (۳) وہ لوگ جو جنگ میں پکڑے جاتے اور اگر فریق مخالف ان کے چھڑانے کی کوئی تدبیر نہ کرتا تو وہ غلام بنا لئے جاتے۔ ان میں سے پہلی دونوں قسم کے غلام عرصہ دراز سے چلے آ رہے تھے اور جو کسی نہ کسی حد تک آبادی کا حصہ بن چکے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ان میں وہ غلام جو کسی حد تک سمجھدار اور کاروبار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ اپنے مالک کی طرف سے یا اس کی معیت میں کاروباری زندگی میں شریک ہوتے تھے۔ بہت حد تک گھروں کی ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کر دی جاتی تھیں۔ معاشی نظام کا بیشتر حصہ ان کے دم قدم سے چل رہا تھا۔ اب اگر اسلام انہیں آزاد کرنے کا حکم دے دیتا تو ملک کا معاشرتی اور معاشی نظام تلپٹ ہو کے رہ جاتا اور بہت ممکن تھا کہ امریکہ کی طرح خانہ جنگی پھوٹ پڑتی جس کی آگ میں سارا عرب جل اٹھتا۔

۲۔ غلاموں میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو معاشرے میں اپنا مقام بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو اپنے پیٹ کا دھندا چلانے پر بھی قادر نہ تھے۔ غلامی کی صورت میں تو ان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے مالکوں کے اوپر تھی، لیکن آزاد ہو جانے کے بعد ان کیلئے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ بھیک مانگیں اور معاشرے پر ایک بوجھ بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام بھیک منگوں کا ایک طبقہ پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

۳۔ غلاموں میں صرف مرد ہی نہیں تھے، عورتیں بھی تھیں جنہیں لونڈیاں کہا جاتا تھا۔ ان کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ ان کے بے سہارا ہونے میں بہت سے اخلاقی مفاسد کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسلام اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اٹلی اور جرمن کی طرح قیدیوں کے باڑے بنا دے اور پھر وہاں سے زناکاری کے نتیجے میں ایک ایسی نسل وجود میں آئے جن کے باپوں کا کچھ علم نہ ہو۔ شرم و حیاء اور غیرت و حمیت اسلام کے امتیازی اوصاف ہیں۔ اسلام انہیں جوہر انسانیت قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ انسانیت کو اس سے کہیں ٹھیس تو نہیں لگے گی۔

۴۔ اسلام نے اگرچہ غلامی کو ایک ناگزیر ضرورت کے تحت قبول کیا تھا لیکن تبلیغ و دعوت اور انسان کو اللہ تعالیٰ کے آستانے پر جھکانا چونکہ اس کا بنیادی مقصد ہے اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ دوسری دنیا کی طرح وہ غلاموں کو صرف خدمت کا ایک ذریعہ سمجھتا۔ اس لئے اس نے قیدیوں اور صدیوں کے غلاموں کو گھروں میں اس طرح جگہ دی اور اس طرح انہیں گھر کے افراد بنا کے رکھا کہ گھر میں رہنے والے مسلمانوں کا ایک ایک عمل ان کی نگاہوں کے سامنے رہے اور وہ بھی مسلمانوں کی نگاہ میں رہیں تاکہ وہ مسلمانوں کو دیکھ کر اچھے انسان کا تصور قائم کر سکیں اور وہ مسلمانوں کی نگرانی میں رہ کر تربیت کے عمل سے گزر سکیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شاید ہی کوئی ایسا غلام باقی رہ گیا ہو جس نے اسلامی معاشرے میں اسلام قبول نہ کیا ہو اور پھر انہیں میں معتدبہ لوگوں کی ایک کھیپ تیار ہوئی جنہوں نے اسلامی علوم میں اپنا نام پیدا کیا بلکہ مسلمانوں کی امامت و قیادت کی، اور خاندانِ غلاماں کے نام سے ایک خاندان وجود میں آیا جس نے ملکوں پر حکومت کی اور تاریخ میں درخشاں کارنامے چھوڑے۔

رہی غلاموں کی پہلی قسم یعنی جنگی قیدی، یہ جنگوں میں گرفتار ہونے والے اس لئے غلام بنا لئے جاتے تھے کہ اس دور کا یہی وطیرہ تھا کہ جو لوگ بھی جنگ میں گرفتار ہوتے، فاتحین ان کو غلام بنا لیتے۔ اسلام نے ایسا کرنے کی اجازت ضرور دی لیکن حکم نہیں دیا، بلکہ اس بات کو ترجیح دی کہ اگر تم ملکی مفادات اور ملی مصالح کے پیشِ نظر ازراہِ احسان جنگی قیدیوں کو چھوڑ دو تو تمہیں اس کی اجازت ہے اور اگر فدیہ لے کر چھوڑنا چاہو

Marfat.com

تو اس کی بھی اجازت ہے، لیکن اگر دشمن اپنے قیدیوں کو نہ فدیہ دے کر چھڑانا چاہے اور نہ قیدیوں کا تبادلہ کرے اور پکڑے جانے والوں کے بارے میں یہ اطمینان بھی مشکل ہو کہ یہ واپس جا کر دشمنی نہیں کریں گے تو پھر مسلمانوں کے پاس اس کے سوا اور کیا چارۂ کار تھا کہ وہ زمانے کی روش کے مطابق انہیں غلام بنالیں۔ البتہ ان کی بتدریج آزادی کیلئے قانونی طریقے کی بجائے اخلاقی طریقہ اختیار کیا اور اسے ایک ایسی معاشرتی نیکی بنادیا جس کے نتیجے میں غلاموں کی آزادی کا ایک راستہ کھل گیا۔ اسلام نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے، میں ایک ترتیب سے صرف ان کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ اسلام نے جبراً اور ظلماً کسی کو غلام بنانے پر قطعاً پابندی لگادی اور قانوناً اسے حرام ٹھہرایا۔

۲۔ مکی زندگی کے بالکل ابتدائی دور ہی سے فَکُّ رَقَبَۃٍ یعنی غلام آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا اور اس کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دے ڈالی۔ جیسے جیسے مسلمانوں کے حالات بہتر ہوتے گئے اس تحریک میں توانائی آتی گئی۔ تنگدستی کے باوجود بھی مسلمانوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا اور اسے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے حصول کا ذریعہ سمجھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ۶۳ غلام آزاد کیے۔ آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے صرف حضرت عائشہ صدیقہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ ہے۔ آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے اپنی زندگی میں ۷۰ غلاموں کو آزاد کیا۔ حضرت حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰ غلام آزاد کیے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک ہزار غلام آزاد کیے۔ ذوالکلاع حمیریؓ نے آٹھ ہزار، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کا نام تو اس حوالے سے بہت معروف ہے۔

۳۔ بعض گناہوں اور کوتاہیوں کی صورت میں غلام آزاد کرنے کو کفارہ اور صدقہ ٹھہرایا گیا۔ مثلاً قتلِ خطا میں، روزہ توڑنے میں، قسم توڑنے میں اور ظہار وغیرہ میں۔ آنحضرت ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ نہ صرف حُسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی بلکہ مالکوں پر ان کے انسانی حقوق کو شرعی درجہ دے دیا جس سے ان کے معاملہ میں مالکوں کی وہ خودمختاری اور مطلق العنانی ختم ہوگئی جو زمانۂ جاہلیت میں ان کو حاصل تھی۔

۴۔ لونڈی کے ام ولدہ بن جانے پر اس کے بیچنے پر پابندی لگادی اور آقا کے مرجانے پر اس کے آزاد ہوجانے کی ضمانت دی۔

۵۔ کوئی شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور بعد کیلئے وصیت کردے کہ اس کے مرتے ہی وہ آزاد ہوجائے گا، اسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدبیر کہتے ہیں۔ تو یہ شخص آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہوجائے گا۔

۶۔ تمام ذی صلاحیت لونڈیوں اور غلاموں کے نکاح کردینے کی ہدایت فرمائی تاکہ معاشرے کے اندر ان کا اخلاقی و معاشرتی معیار اونچا ہو اور ان کو غلام یا لونڈی کہہ کر بلانے پر پابندی لگادی، بلکہ حکم دیا کہ انہیں فتیٰ اور فتات کہہ کر پکارو۔

۷۔ زمانۂ جاہلیت میں جن مالکوں نے لونڈیوں سے پیشہ کرانے کیلئے چکلے قائم کر رکھے تھے ان کے چکلے زنا کے جرم قرار پا جانے کے بعد ختم ہوگئے اور قانوناً ان پر پابندی لگادی گئی۔

۸۔ آخر میں مکاتبت کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی اور ان کی امداد اور حوصلہ افزائی کیلئے عام لوگوں کو بھی ابھارا گیا اور ان کی مدد کیلئے بیت المال میں بھی ایک خاص مد رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافتِ راشدہ میں ہی قانونی طور پر غلامی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد صرف وہ غلام بچ رہے جو ہاتھ پاؤں مارنے کی صلاحیت سے عاری تھے اور وہ خود بھی آزادی کے خواہاں نہ تھے کیونکہ وہ جانتے

Marfat.com

تھے کہ ہم آزاد ہوکر اپنی ضروریاتِ زندگی کیلئے گداگری کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جبکہ مسلمانوں کے گھروں میں انہیں وہ تمام سہولتیں حاصل تھیں جو گھر کے دیگر افراد کو میسر تھیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کی انتہائی ترغیب دی تھی اور بدسلوکی کی صورت میں قیامت کے دن خود استغاثہ کی تنبیہ فرمائی تھی۔

یہ وہ مختصر اقدامات ہیں جو اسلام نے بتدریج غلامی کو ختم کرنے کیلئے کیے اور اسے خدمت کا ذریعہ اور ذلت کی علامت بنانے کی بجائے تربیت کا ذریعہ بنایا جس کے نتائج قرنِ اول کی تاریخ سے نمایاں ہیں۔ کوئی شخص ان کو سامنے رکھ کر دیانتداری سے بتائے کہ کیا اس سے بہتر غلامی ختم کرنے کا کوئی اور حل بھی ممکن تھا۔ اور یہ بھی تقابل کر کے دیکھے کہ اعتراض کرنے والی دنیا نے خود اس معاملے میں کیا اور کیسی اندوہناک مثالیں چھوڑی ہیں۔

معاشرتی مقام کی بلندی اصلاح کا ذریعہ

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ''اور اپنی لونڈیوں کو پیشہ پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ عفت کی زندگی کی خواہاں ہیں۔'' اسلام نے ہر طرح کی بے حیائی کو روکنے اور اس کے محرکات کو ختم کرنے کیلئے جو قانونی اور اصلاحی تدابیر کی ہیں وہ گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ انہی اصلاحی تدابیر میں ہم نے دیکھا ہے کہ نفسیاتی عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، بلکہ طریقے طریقے سے باہر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اندر بھی ایک ایسی قوتِ مدافعت اور ایک ایسا احساسِ تشخص پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر شخص کو برائی پر غالب آنے کیلئے اکساتا ہے۔ مثلاً مخلص مسلمانوں کو بار بار اس بات کا احساس دلایا ہے کہ تم اگر صاحبِ ایمان ہو تو ایمان اور بے حیائی تو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کوئی بھی صاحبِ ایمان اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے علم کا استحضار رکھنے والا نہ تو خود گناہ کے قریب جاتا ہے اور نہ کسی دوسرے پر تہمت باندھتا ہے کیونکہ ایمان ایک ایسا نور ہے جس کے سامنے ہر طرح کی برائی کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں میں اخلاقی اصلاح کیلئے ایمان کی قوت کے ساتھ ساتھ احساسِ ذات بھی پیدا کیا گیا۔ غلام جو ہر لحاظ سے اپنے آپ کو دوسروں سے فروتر سمجھتے تھے، ان کیلئے آزادی کے راستے کھولے گئے اور انہیں اس طرح کی مراعات دی گئیں جس نے معاشرتی طور پر ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا۔ اسی طرح لونڈیوں میں بھی عفت مآبی اور پاکدامنی کا احساس پیدا کیا گیا جبکہ انہیں اسلام سے پہلے جنسی کھلونوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اِمَاءً (لونڈیاں) کہنے کی بجائے فتیات کہا گیا ہے جو فتاة کی جمع ہے۔ اس کا معنی لڑکی اور چھوکری کے ہیں اور یہ عام طور سے نوخیز بچیوں کو پیار سے کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال ہی بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اب وہ معاشرتی طور پر بلند مقام کی حامل ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے اسی احساس کی تائید میں یہ حکم دیا کہ کسی غلام کو عبد اور کسی لونڈی کو امة کہہ کر نہ پکارا جائے۔ الفاظ کی یہ تبدیلی انہیں اصلاحات کا جزء ہے جو ان کے معاشی مقام کو بلند کرنے کیلئے اسلام نے رائج کیں۔ چنانچہ ایک طرف ایمان نے عفت مآبی پیدا کی اور دوسری طرف برتری کے احساس نے قدیم تصورات کو بدلنے پر مجبور کیا اور ان کے اندر شدت سے یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ہم اگرچہ آزاد عورتیں نہیں ہیں لیکن جہاں تک عفت و عصمت کا تعلق ہے اس میں ہم آزاد عورتوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لئے اب اس بات کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ ہمیں جنسی آسودگی کیلئے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ یہی وہ لونڈیاں ہیں جن کیلئے اس آیتِ کریمہ میں یہ حکم جاری فرمایا گیا، لیکن اسے سمجھنے کیلئے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

Marfat.com

اہلِ عرب میں قحبہ گری

اس حکم کے نزول کے وقت اور اس سے پہلے عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں تھیں۔ایک کو خانگی کا پیشہ کہا جاتا تھا اور دوسرے کو باقاعدہ چکلے کا نام دیا جاتا تھا۔خانگی کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔یہ کسی کے گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت معاہدہ کر لیتیں کہ وہ اگر اس کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھائیں گے تو وہ اس سے اپنی جنسی حاجت پوری کر سکیں گے۔بچہ پیدا ہونے کی صورت میں باپ کے حوالے سے اس عورت کا فیصلہ قبول کیا جاتا اور بچہ اس باپ کی طرف منسوب ہوتا۔یہ اس وقت کے معاشرے کا مُسلّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیت ایک قسم کا نکاح سمجھتے تھے،اسلام نے اسے یکسر ختم کر دیا۔

قحبہ گری کی دوسری صورت تمام تر لونڈیوں کے ذریعے سے ہوتی تھی۔اس کے دو طریقے تھے۔ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں کو مجبور کرتے تھے کہ تم ہر مہینے اتنا کما کر لاؤ۔اور ان کے پاس کمانے کا ذریعہ بدکاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔مالک جانتے تھے کہ وہ اسی ذریعہ سے کما کے لاتی ہیں اور وہ شوق سے کسبِ حرام کی کمائی کھاتے تھے۔دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ بدکاری کے اڈے ہیں اور اس قماش کے لوگ اپنی حاجت براری کیلئے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ایسے گھروں کو''مواخیر'' کہا جاتا تھا۔عرب کے بڑے بڑے رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔مدینہ منورہ میں عبداللہ بن اُبی جو اوس وخزرج کا بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا اور آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔اس کا مدینے میں باقاعدہ ایک چکلہ تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی گئی تھیں۔ان ہی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی جس کا نام''معاذہ'' تھا مسلمان ہوگئی اور اس نے توبہ کرنی چاہی۔ابن اُبی نے اس پر تشدد کیا۔حضرت ابوبکرؓ کے واسطے سے اس نے اپنی شکایت آنحضرت ﷺ تک پہنچائی۔سرکارِ دوعالم ﷺ نے حکم دے دیا کہ لونڈی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے۔یہ وہ پس منظر ہے جسے سامنے رکھتے ہوئے اس آیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ انہی حالات میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے۔

حرف اِن کا مفہوم

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس میں''حرفِ اِن'' استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم اس بات سے مشروط ہے کہ اگر کوئی لونڈی پاکدامنی کا ارادہ کرے تو تب تو اسے اس کا مالک مجبور نہیں کر سکتا،لیکن اگر وہ اس کا ارادہ نہ رکھتی ہو تو پھر مالک کیلئے اس سے قحبہ گری کرانا اور اس کی کمائی کھانا ناجائز نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی قید یہاں بطور شرط کے نہیں بلکہ صورتِ واقعہ کی تعبیر کیلئے ہے۔یعنی جبکہ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کی ہدایت فرمائی گئی ہے اور زنا پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے اور مختلف احکام سے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا ایک کشادہ راستہ کھول دیا گیا ہے تو اب بجا طور پر لونڈیاں یہ چاہتی ہیں اور ان کے دل کی یہ آواز ہے کہ ان کے مالکوں کا دباؤ ان کی عفت وحرمت پر ختم ہونا چاہیئے۔وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں تو آقا کو اس بات کا حق نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ انہیں زناکاری پر مجبور کرے۔چنانچہ ان کی اس آرزو کی تکمیل کیلئے اور ان کی دعا کو قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرمایا۔اور آنحضرت ﷺ نے اس حکم کی وضاحت اور اس کے نفاذ کیلئے اعلان فرمایا کہ **لامساعاة فی الاسلام** ''اسلام میں قحبہ گری کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔''

Marfat.com

زنا کی کمائی کی حرمت

لِتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ''تاکہ تم حیاتِ دنیا کا سامان حاصل کرو'' اس میں خطاب لونڈیوں کے مالکوں سے ہے جوان کی عزتوں کی کمائی کھاتے تھے۔ انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ اسلام نے زنا کو حرام قرار دے دیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے سزاؤں پر مشتمل قانون بھی نازل کر دیا گیا ہے۔ مسلمان لونڈیاں اسلامی ہدایت کے مطابق پاکدامن رہنا چاہتی ہیں اور تم محض چند ٹکوں کی خاطر ان کی عزتوں کا سودا کرتے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زنا کی کمائی نہایت خبیث اور حرام ہے۔ تم اس سے اپنی دنیا بنانے کی فکر میں ہو، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ آخرت میں تمہیں اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے حکم جاری فرمایا کہ زنا کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لونڈی سے آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ آمدنی اسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ رافع بن رفاعہ انصاریؓ کی راویت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع فرمایا، بجز اس کے کہ جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے اور آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی وضاحت فرمائی۔ یعنی روٹی پکانا، سوت کاتنا یا اون یا روئی دھکنا وغیرہ۔ (مسند احمد، ابوداؤد کتاب الاجارہ)

اس طرح نبی کریم ﷺ نے قرآن کی اس آیت کے منشا کے مطابق قحبہ گری کی ان تمام صورتوں کو مذہبا ناجائز اور قانوناً ممنوع قرار دے دیا جو اس وقت عرب میں رائج تھیں۔

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کیلئے غفور و رحیم ہے۔'' عبداللہ بن اُبی اور اس قماش کے لوگوں نے جگہ جگہ چکلے قائم کر رکھے تھے اور اسی پر ان کی چودھراہٹوں کا دارومدار تھا۔ اس لئے ان کیلئے اس سے بڑی تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان چکلوں کو بند کرنے کا حکم دے دیا جائے اور انہیں پابند کر دیا جائے کہ وہ اپنی لونڈیوں سے ہاتھوں کی کمائی کے سوا کوئی اور کام نہیں لے سکتے۔ بنابریں اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ آسانی سے اس حکم کی تعمیل کریں گے اور یا اپنی لونڈیوں کو پاکدامنی کی زندگی اختیار کرنے کی اجازت دیں گے۔ چنانچہ انہیں وارننگ دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اب ان لڑکیوں کو جبکہ وہ پاکدامنی کی زندگی اختیار کرنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ اکراہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ ان کو تو معاف کر دے گا البتہ وہ لوگ اپنا انجام سوچ لیں جو ان کی عفت کے ساتھ یہ گھنونا کھیل، کھیل رہے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾

(اور بیشک ہم نے تمہاری طرف صاف صاف ہدایت دینے والی آیات بھیج دی ہیں اور ان لوگوں کی عبرتناک مثالیں بھی نازل کر دی ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے نصیحت بھی (ہم نے اتار دی ہے)۔ ۳۴)

ایک تنبیہ

اس آیت کا تعلق اس پورے سلسلہ بیان سے ہے جو آغاز سورۃ سے لے کر یہاں تک چلا آ رہا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسانی اخلاق کی اصلاح کیلئے ایک سے ایک بڑھ کر ہدایات جاری فرمائی ہیں اور پھر بدقماش لوگوں کیلئے زنا اور قذف اور لعان کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ معاشرے کو فواحش اور بے حیائی سے پاک کرنے کیلئے ان تمام محرکات پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہے جو مسلمان معاشرے میں

Marfat.com

فواحش کو فروغ دیتے ہیں۔ گھروں کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے کیلئے غضِ بصر اور حفظِ فروج کی تاکید کی گئی ہے اور عورتوں کیلئے پردے کی حدود قائم کردی گئی ہیں۔ تجرد کی زندگی چونکہ ذہنی آوارگی کا باعث بنتی ہے اس لئے معاشرے کے آزاد لوگوں اور غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کرنے کا حکم دیا ہے اور معاشرے کو مکمل طور پر فحبہ گری سے پاک کرنے کے احکام جاری فرمائے ہیں۔ ان تمام ہدایات اور احکام کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہاری اصلاح کیلئے اور اخلاقی بگاڑ سے بچانے کیلئے جو ہدایات اور احکام تمہاری ضرورت تھے وہ ہم نے تم پر نازل کردیئے اور جن لوگوں نے ان ہدایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو بگاڑا ان کے انجام کی طرف بھی اشارے کردیئے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس تعلیم کو قبول کرتے ہو یا نہیں۔ لیکن اس کے بین السطور میں یہ بات جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ اگر تم نے ان ہدایات کو قبول نہ کیا تو پھر غضب الٰہی تم سے دور نہیں۔ ویسے بھی یہ ہدایات اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کیلئے نصیحت ہیں لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے نہیں وہ ان ہدایات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

جس طرح اس آیت میں روئے سخن اس وقت کے لوگوں کی طرف تھا، آج کے مسلمانوں کی طرف بھی ہے۔ ان سے بھی یہ آیت پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ اگر تم نے ان ہدایات کی روشنی میں اصلاحِ احوال کی کوشش نہ کی اور قدیم وجدید جاہلیتوں کے سحر میں اپنے آپ کو مبتلا کرلیا اور دوسری بے حیاء قوموں کی تقلید میں اپنی شرم وحیاء کی چادر کو اتار پھینکا تو سوچ لو، تمہارا انجام کیا ہوگا۔ پھر مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق اگر تم پر غضب الٰہی کی بجلیاں گریں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کیلئے یکساں ہے۔

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ

Marfat.com

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ
اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ
بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ
الظَّمْاٰنُ مَآءً ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ
فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ
لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۗ ظُلُمٰتٌۢ
بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ
اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿٤٠﴾

رکوع: ۵۔ (اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو، اس میں ایک چراغ ہو، وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو، وہ شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو جو روشن کیا جاتا ہے ایک برکت والے زیتون کے درخت سے، جو نہ شرقی ہو نہ غربی، اس کا تیل بھڑک اٹھتا ہے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے، روشنی کے اوپر روشنی، اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ مثالیں لوگوں کی رہنمائی کیلئے بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ۳۵) (اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ وہ تعمیر (اور بلند) کیے جائیں اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے ان میں تسبیح کرتے ہیں صبح اور شام۔ ۳۶) ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے بھی (غافل نہیں کرتے) وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔ ۳۷) تاکہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اور ان کو اپنے فضل سے مزید نوازے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب عطا فرماتا ہے۔ ۳۸) اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں چمکتی ہوئی ریت، جس کو پیاسا پانی گمان کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اپنے پاس اللہ کو پائے گا، پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۳۹) (یا (ان کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں، چھا رہی ہو اس پر موج، اس کے اوپر ایک اور موج، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیاں ایک دوسرے کے اوپر، جب وہ نکالے اپنا ہاتھ تو اس کو بھی دیکھ نہ پائے اور (سچ تو یہ ہے) کہ جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کیلئے کوئی روشنی نہیں۔ ۴۰)

Marfat.com

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِىْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۙ ﴿۳۵﴾

(اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو، اس میں ایک چراغ ہو، وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو، وہ شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو جو روشن کیا جاتا ہے ایک برکت والے زیتون کے درخت سے، جو نہ شرقی ہو نہ غربی، اس کا تیل بھڑک اٹھتا ہے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے، روشنی کے اوپر روشنی، اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ مثالیں لوگوں کی رہنمائی کیلئے بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ۳۵)

پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو اہلِ علم آیتِ نور لکھتے ہیں کیونکہ اس میں نورِ ایمان اور ظلمتِ کفر کو بڑی تفصیلی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ یہ آیت اور اس سے پیوستہ چند آیات کی حیثیت سورۃ کے اندر ایک درخشندہ آفتاب کی سی ہے جس کا پرتو سورۃ کے تمام اجزاء پر پڑ رہا ہے۔ ہم اس کی وضاحت میں چند گزارشات پیش کرتے ہیں:۔

گزشتہ آیات سے ربط اور منافقین کو تنبیہ

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے قرآنِ کریم کے مخاطبوں کو وارننگ دی ہے کہ ہم نے تمہاری طرف تفصیل سے احکام نازل کر دیئے ہیں جو انسانی اصلاح کی ضمانت دے سکتے ہیں اور ان لوگوں کی مثالیں بھی ذکر کر دی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرتابی کی، تو تاریخ میں سامانِ عبرت بن گئے۔ اب تم پر اس بات کا دارومدار ہے کہ تم ان احکام سے فائدہ اٹھاتے ہو یا نہیں۔ اس کے بعد اچانک یہ آیتِ نور ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس سے بظاہر یہ تأثر ملتا ہے کہ شاید اس آیت اور بعد کی آیات کا سابقہ آیات سے کوئی ربط نہیں جبکہ قرآنِ کریم ایک مربوط کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تأثر قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اگر ان آیات کو گہری نظر سے پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ جو اوس و خزرج سے تعلق رکھتے تھے، ایمان اور اسلام کے مدعی تھے، مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے، لیکن بجائے اسلام سے فائدہ اٹھانے کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آئے دن فتنے اٹھانے میں لگے رہتے تھے۔ ان کی بدنصیبی پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ "نادانو! تمہارے سامنے قرآنِ کریم نازل ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول پوری شان کے ساتھ تمہارے سامنے جلوہ گر ہیں، اسلام قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے، وہ دن دور نہیں جب اس دھرتی کی قسمت اسلام سے وابستہ ہوگی، یہ ایک روشنی ہے جو چار سو پھیل رہی ہے لیکن تم تاحال اندھیری راتوں کے مسافر ہو اور تم ان تاریکیوں سے نہ جانے کیوں نکلنا نہیں چاہتے۔"

امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ آسمان و زمین بلکہ پوری کائنات اس شخص کیلئے عالمِ ظلمات اور اندھیر نگری کے سوا کچھ نہیں۔ جو خدا کو نہیں مانتا یا مانتا تو ہے لیکن اس کی صفات اور ان کے مقتضیات کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بظاہر سورج کی روشنی میں اور چاند کی چاندنی میں رہتا ہے۔ اس کے سامنے مسکراتی ہوئی بہار اپنے گیسو بکھیرتی ہے اور زمین پر پھیلا ہوا حُسن اور فضاء میں بکھری ہوئی رعنائیاں اس کے دل و دماغ کو روشن کرتی ہیں

Marfat.com

لیکن ان سب کے باوجود وہ یہ نہیں جان پاتا کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے اور نہ یہ جان سکتا ہے کہ اس کے وجود میں آنے کی غایت اور مقصد کیا ہے۔ وہ خود اپنے متعلق بھی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے۔ زندگی کیا ہے اور زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ اسے مسئول پیدا کیا گیا ہے یا غیر مسئول۔ اسے شتر بے مہار بنایا گیا ہے یا محکوم و مجبور۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ اسے ظلم کی روش اختیار کرنی چاہئے یا عدل کی۔ موت کی حقیقت کیا ہے۔ آخرت کیا ہے۔ کیا اسے کبھی اپنے خالق و مالک کے سامنے پیش ہو کر جوابدہی بھی کرنی ہے یا نہیں۔ یہی وہ سوالات ہیں جن پر انسان کی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کو اور اس کی صحیح صفات کو نہیں مانتا وہ ان سوالوں کا جواب کبھی نہیں پا سکتا۔ اس کیلئے یہ دنیا ہمیشہ اندھیر نگری بنی رہے گی۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بڑے سے بڑا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ وہ عالمِ ایجاد میں حیرت انگیز اضافے کر سکتا ہے۔ وہ انسانی ضروریات میں غیر معمولی تنوع پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقتِ نفس الامری تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن وہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی صفات اور ان کے مقتضیات پر ایمان لاتا ہے تو یہ نور کا ایسا رشتہ ہے جس سے اس کی زندگی کا ہر پہلو روشن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ ہی کائنات کی روشنی ہے، اس کے بغیر ہر چیز تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے اور جسے یہ روشنی نصیب نہیں ہوتی اس کیلئے کہیں اور سے روشنی کا حصول ناممکن ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کیلئے ان آیات کو یہاں لایا گیا۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔" قرآنِ کریم میں بالعموم آسمان اور زمین کو کائنات کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا نور ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نور سے مراد کیا ہے؟

نور کا مفہوم

آج جبکہ ہم اپنے وضعی علوم کا ایک قالب بنا چکے ہیں تو اس کی حدود میں رہنے کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو بعض اصطلاحات کا پابند بنا لیا ہے۔ اس لئے جب بھی ہم کوئی لفظ بولتے ہیں تو کبھی اہلِ لغت سے پوچھتے ہیں اور کبھی مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے۔ حالانکہ قرآنِ کریم ہماری وضعی قیود کا پابند نہیں۔ وہ ہماری اصطلاحات سے بے نیاز ہے اور جب کوئی بات اللہ تعالیٰ کی ذات جل وعلا کے بارے میں کہی جاتی ہے تو وہ ایسے تمام پیمانوں سے بلند ہوتی ہے۔ جب ہم عام معنوں میں نور کا لفظ بولتے ہیں تو ہم اسے اس معنی میں لیتے ہیں کہ وہ سورج کی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کی مرکزی بینائی کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے تعارف یا اس کی صفت کے طور پر بولا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مطلب وہ ہے جو علامہ ابوالفضل جمال الدین ابن منظور اپنی شہرہ آفاق کتاب لسان العرب میں النور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو خود ظاہر ہو اور اپنی روشنی سے دوسروں کو آشکارا کر دے، اسے نور کہا جاتا ہے۔ امام غزالی" فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہو۔ کسی چیز کے ظاہر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ موجود ہو۔ جو چیز موجود نہیں ہوگی اس کا ظاہر ہونا ممکن نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے اس لئے وہ ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گی۔ نیز وہ اپنے موجود ہونے میں کسی سبب، کسی علت اور کسی فاعل کی محتاج بھی نہیں۔ اس لئے وہی ہے جو صفتِ نور و ظہور سے متصف ہونے کی مستحق ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان نے فطری طور پر کچھ نہ سوجھنے کی کیفیت کا نام اندھیرا، تاریکی اور ظلمت رکھا ہے۔ اور اس کے برعکس جب سب کچھ سوجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ ہم ایک عام آدمی کو بھی دیکھتے ہیں کہ جب اس کے دل میں کوئی بات اتر جاتی ہے اور اس کا ہر شک اور تردد ختم ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا دل روشن ہو گیا یا مجھے روشنی مل گئی۔ اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کیلئے لفظِ نور کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔اور جب بھی ہم اس طرح کے الفاظ جو انسانوں کیلئے صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کیلئے بولتے ہیں، تو ان کے اندر ایک اطلاقی شان پائی جاتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے یا بولتا ہے یا سنتا ہے یا پکڑتا ہے تو اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ آنکھ جیسا ایک عضو رکھتا ہے، وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعے سنتا ہے اور ہمارے جیسے اس کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ بلکہ یہ ساری صفات اس کیلئے اطلاقی شان کے ساتھ ثابت ہیں جو ہر طرح کے آلات کی احتیاج سے پاک ہیں۔ہم نے جو لغوی اور عرفی معنی نور کے بنا رکھے ہیں ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جسم اور جسمانیات سب سے بری اور وراء الوریٰ ہے۔اسی لئے اکثر علمائے تفسیر نے نور کو منور کے معنی میں لیا ہے یا پھر صیغۂ مبالغہ کی طرح صاحبِ نور کو نور سے تعبیر کر دیا گیا ہے، جیسے صاحب کرم کو کرم اور صاحب عدل کو عدل کہہ دیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے پیشِ نظر آیت کے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کو نور اور روشنی بخشنے والا ہے۔اور ابنِ کثیر کے نزدیک اس نور سے مراد نورِ ہدایت ہے، یعنی وہ سب کو ہدایت عطا کرنے والا ہے۔

تمثیل کی وضاحت

مَثَلُ نُوْرِهٖ ...... علامہ ابنِ کثیر نے حضرت اُبی ابنِ کعبؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اقوال کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مَثَلُ نُوْرِهٖ کی ضمیر کے متعلق آئمہ تفسیر کے دو قول ہیں۔ایک یہ کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت جو مومن کے قلب میں فطرۃً رکھا گیا ہے اس کی مثال یہ ہے۔ کَمِشْكٰوةٍ ، الخ . یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ہی مومن کی طرف راجع ہو جس پر سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے، اور آگے اسی کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔

اس تمثیل میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں، بہتر ہے کہ ان کی تشریح کر دی جائے۔

مِشْكٰوةٍ ...... اس مخصوص جگہ کو کہتے ہیں جو دیوار میں چراغ رکھنے کیلئے بنائی جاتی ہے جو صرف ایک طرف سے کھلی اور باقی اطراف سے بند ہوتی ہے، اسے چراغ دان بھی کہتے ہیں۔

مِصْبَاحٌ ...... بڑے چراغ کو کہتے ہیں، جو خوب روشنی دے۔

زُجَاجَةٍ ...... شیشے سے بنا ہوا فانوس یا گلوب جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔

كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ...... وہ شیشہ جس میں چراغ رکھا گیا ہے وہ تارے کی مانند چمکدار ہے کیونکہ اگر وہ میلا ہوگا تو روشنی میں اضافے کی بجائے اس کیلئے حجاب بن جائے گا۔

مُّبٰرَكَةٍ ...... یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔یعنی ثمر آور درخت۔

لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ...... یہ شجرۂ مبارکہ کی صفت ہے، یعنی یہ درخت کھلے میدان میں اونچی جگہ واقع ہے جہاں صبح سے شام تک اس پر دھوپ پڑتی ہے۔کوئی اس کے سامنے رکاوٹ نہیں جو دھوپ کو روکنے والی ہو۔زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔

جس مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا نورِ ہدایت داخل ہو جاتا ہے اور مومن اس کو ایمان کی قوت سے اپنے دل کی زینت بنا دیتا ہے تو اس سے اس کے دل کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ایک طاق ہو۔اس سے مراد مومن کا دل ہے۔یہ دل چراغ رکھنے کیلئے ایک طاق یا چراغ دان

Marfat.com

کی مانند ہے۔ چراغ سے اگر زیادہ سے زیادہ روشنی لینا مقصود ہوتو اسے بلند جگہ پر رکھا جاتا ہے تاکہ روشنی پورے گھر میں پھیلے۔ انسان کے اندر دل ہی وہ جگہ ہے جہاں روشنی ہوتو وہ اس کے سارے ظاہر و باطن میں پھیلتی ہے۔ وہ چراغ ایک شیشہ کے اندر بند ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ چراغ کی لو ہوا کے جھونکوں سے منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک مرکز پر مرتکز رہتی ہے جس سے اس کی تابانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسان کا دل بھی جب تک ایمان کے فیض سے محروم رہتا ہے اور نورِ ہدایت ان کے اندر داخل نہیں ہوتا تو وہ ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ شیطانی وسوسے اور خواہشات کا دباؤ اسے مسلسل اضطراب میں رکھتے ہیں، لیکن ایمان سے وابستگی کے بعد وہ ہر حال میں راضی اور مطمئن رہتا ہے۔ ایسے ہی دل کو قرآنِ کریم میں نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس شیشہ کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ وہ ایک چمکتے ستارے کی مانند ہے۔ یعنی اس کی چمک دمک اور اس کا شفاف ہونا اس کی روشنی میں اور اضافے کا باعث بنتا ہے کیونکہ شیشہ اگر میلا ہو تو وہ بجائے اضافے کا باعث بننے کے حجاب بن جاتا ہے۔

روغنِ زیتون سے مراد

چراغ چونکہ تیل سے جلتا ہے تو اس لئے فرمایا کہ اس چراغ میں جو تیل ڈالا گیا ہے وہ نہایت شفاف روغنِ زیتون ہے۔ یہ دراصل فطری نورِ ہدایت کی مثال ہے جو مومن کی فطرت میں ودیعت رکھا گیا ہے جس کا خاصہ خود بخود بھی قبولِ حق کا ہے پھر جس طرح روغنِ زیتون آگ کے شعلہ سے روشن ہو کر دوسروں کو روشن کرنے لگتا ہے، اسی طرح نورِ فطرت جو قلبِ مومن میں رکھا گیا ہے جب وحیِ الٰہی اور علمِ الٰہی کے ساتھ اس کا اتصال ہو جاتا ہے تو روشن ہو کر عالم کو روشن کرنے لگتا ہے۔ یوں تو فطری نورِ ہدایت جو ابتدائے تخلیق کے ساتھ انسان کے قلب میں رکھا جاتا ہے وہ مومن کے ساتھ مخصوص نہیں، لیکن اس سے فائدہ چونکہ مومن ہی اٹھاتا ہے اس لئے اسے قلبِ مومن کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ مومن کو جب نورِ ہدایت نصیب ہو جاتا ہے جو وحیِ الٰہی اور پیغمبر کی تبلیغ و دعوت کا نتیجہ ہے۔ تو اس کا فطری نورِ ہدایت اس طرح اپنا کام دکھاتا ہے جیسے چراغ کی روشنی میں اس زیتون کا تیل جسے سورج کی تیز روشنی نے پالا ہو جو نہ دھواں دیتا ہے اور نہ اس کی روشنی مدھم پڑتی ہے۔ چنانچہ فطری نور کے سلامت رہنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ کے نبی کی صحبت اور قرآنِ کریم کی رفاقت میسر آتی ہے تو وہ اس طرح اس کی طرف لپکتا ہے جیسے خالص زیتون بغیر آگ کے مس کئے بھی بھڑکنے کیلئے تیار ہوتا ہے۔ اس میں شاید اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ ایمان ان لوگوں کے سینوں کو اپنا نشیمن بناتا ہے جن کی فطرت ہر قسم کے بگاڑ اور فساد سے محفوظ ہو اور جن کی فطرت کا روغن غیر فطری ملاوٹوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس طرح فطرت کے نور کے اوپر ایمان کے نور سے سینہ نورٌ علیٰ نور ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت معمولی متاع نہیں جو خود بخود ہاتھ آجائے۔ یہ ایسی جنسِ گراں مایہ ہے جو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی فطرت کے روغن کو محفوظ رکھتے ہیں اور اسے زیغ و انحراف سے بگاڑ کا شکار نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کو اپنی نظرِ کرم کا مورد بناتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کیلئے تمثیلیں بیان فرماتا ہے۔ یہاں لِلنَّاسِ میں مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی تعلیم و تذکیر کیلئے مثالیں بیان فرماتا ہے کیونکہ حقائق کا ادراک تمثیلات کے ذریعے نہایت احسن طریقے سے ہوتا ہے۔ سپاٹ لب ولہجہ یا مدلل گفتگو یقیناً اپنا ایک اثر رکھتی ہے۔ لیکن تمثیل کے ذریعے وہ حقائق جو عقل سے ماورا ہوں جس طرح دل و دماغ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور کسی طریقے سے نہیں ہوتے۔ یہ توضیحِ حقائق کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

Marfat.com

آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ہدایت کیلئے کون سے حقائق اس کے دل ودماغ میں اترنے چاہئیں اوراس کے اعمال کی درستی کیلئے کس طرح کے احکام کی ضرورت ہے۔زندگی اور کائنات کے حقائق اوراسرارورموز کو جاننے کیلئے جس علم اور روشنی کی ضرورت ہے اس کا منبع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔وحی سے وہ روشنی پھوٹتی ہے تو زندگی کا ہر گوشہ روشن ہوجاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا حوالہ ہماری فکرونظر کی درستی کیلئے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۪ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

(اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ وہ تعمیر (اور بلند) کئے جائیں اوران میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے ان میں تسبیح کرتے ہیں صبح اور شام۔ ۳۶) ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے بھی (غافل نہیں کرتے) وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔ ۳۷) تاکہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے اوران کو اپنے فضل سے مزید نوازے اوراللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب عطا فرماتا ہے۔ ۳۸)

سابقہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قلبِ مومن میں اپنا نورِ ہدایت ڈال دینے کی ایک خاص مثال بیان فرمائی ہے۔اب پیش نظر آیت کریمہ میں ان مومنین کا محل اور مستقر بیان کیا گیا ہے جہاں وہ اکثر پائے جاتے ہیں۔

فِیْ بُیُوْتٍ کا محل اور مفہوم

فِیْ بُیُوْتٍ کی نحوی ترکیب میں اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے۔بعض اہلِ علم کے نزدیک بُیُوْتٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مساجد اوراس کے معابد ہیں۔ان کے نزدیک تالیفِ کلام یہ ہے کہ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ ...... الایۃ۔ علامہ زمخشری نے اسی قول کو ترجیح دی۔وہ اس کا تعلق مشکوٰۃ سے جوڑتے ہیں۔

بعض حضرات نے اس کا تعلق لفظ یُسَبِّحُ محذوف کے ساتھ کیا ہے،جس پر آگے آنے والا لفظ یُسَبِّحُ دلالت کرتا ہے۔

اکثر آئمہ تفسیر نے جن میں ابنِ کثیر بھی شامل ہیں آیت کے اس جملے کا تعلق یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ کے ساتھ کیا ہے۔نسق کلام کے اعتبار سے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے یعنی سابق آیت میں اللہ تعالیٰ کے جس نورِ ہدایت کا ذکر ہوا ہے اس کے ملنے کی جگہ وہ بیوت ومکانات ہیں جہاں صبح وشام اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان بیوت سے مراد کیا ہے۔بعض لوگوں نے اس سے مراد اہلِ ایمان کے گھر لئے ہیں اور انہیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انہیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔اگر یہ مراد لیا جائے تو اس میں بھی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی،لیکن جمہور

Marfat.com

مفسرین کے نزدیک ان بیوت سے مراد مساجد ہیں۔قرطبی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور استدلال میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من احب الله عزّوجل فليحبّني و من احبّني فليحبّ اصحابي و من احبّ اصحابي فليحبّ القرآن ومن احبّ القرآن فليحب المساجد فانها افنية الله اذن الله في رفعها وبارك فيها ميمونة ميمون اهلها محفوظة محفوظا اهلها هم في صلاتهم والله عزّوجلّ في حوائجهم هم في المساجد والله من ورائهم (قرطبی)

جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ مجھ سے محبت کرے اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہئے کہ میرے صحابہ سے محبت کرے۔اور جو صحابہ سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہئے کہ قرآن سے محبت کرے۔اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہئے کہ مسجدوں سے محبت کرے کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں، اللہ نے ان کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور ان میں برکت رکھی ہے۔وہ بھی بابرکت ہیں اوان کے رہنے والے بھی بابرکت ہیں۔وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں اور ان کے رہنے والے بھی حفاظت میں ہیں۔وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں۔وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پیچھے ان کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔(قرطبی)

اَذِنَ کا مفہوم

اَذِنَ اللّٰـهُ اَنْ تُرْفَعَ ...... اَذِنَ، اِذْن سے مشتق ہے جس کے معنی اجازت دینے کے ہیں، لیکن علماءِ تفسیر کا اتفاق ہے کہ اس جگہ اذن امر اور حکم کے معنی میں ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہاں اذن امر اور حکم کے معنی میں ہے تو امر ہی کا لفظ لایا جاتا، اذن کا لفظ کیوں لایا گیا۔روح المعانی میں اس کی ایک لطیف مصلحت بیان کی گئی ہے کہ اس میں مومنین صالحین کو اس ادب کی تعلیم و ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے کے ہر کام کیلئے ایسے مستعد اور تیار رہیں کہ حکم کی ضرورت نہ پڑے۔صرف اس بات کے منتظر ہوں کہ کب ہمیں اس کام کی اجازت ملے اور ہم یہ سعادت حاصل کریں۔

رَفَعَ کا مفہوم

تُرْفَعَ ...... رَفَعَ سے مشتق ہے، جس کے معنی بلند کرنے اور تعظیم کرنے کے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک بلند کرنے سے مراد ان کی تعظیم کرنا ہے۔اور انہیں ہر لغو کام اور لغو کلام سے محفوظ رکھنا ہے۔ (ابنِ کثیر)

عکرمہ اور مجاہد ارشاد فرماتے ہیں کہ رفع سے مراد مسجد کا بنانا ہے۔اور قرآنِ کریم سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ واذ یرفع ابراهيم القواعد من البيت ''اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادیں تعمیر کر رہے تھے۔'' حقیقت یہ ہے کہ رفع کے مفہوم میں تعمیر اور تعظیم دونوں شامل ہیں۔کیونکہ اسلام نے مساجد کے بارے میں دونوں باتوں کا حکم دیا ہے کہ مساجد تعمیر بھی کی جائیں اور پھر

Marfat.com

انہیں پاک وصاف رکھا جائے اوران کا احترام بجالایا جائے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسجد میں جب کوئی نجاست لائی جائے تو مسجد اس سے اس طرح سمٹتی ہے جیسے انسان کی کھال آگ سے سمٹتی ہے۔

تعظیم وتکریم اور پاک صاف رکھنے میں یہ بھی داخل ہے کہ اسے ہر بدبو سے بچایا جائے۔اس لئے رسول اللہ ﷺ نے لہسن یا پیاز کھا کر منہ صاف کئے بغیر مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔سگریٹ، حقہ، پان کا تمباکو کھا کر مسجد میں جانا بھی اسی حکم میں شامل ہے۔مسجد میں مٹی کا تیل جلانا بدبو کی وجہ سے وہ بھی ناجائز ہے۔صحیح مسلم میں حضرت فاروق اعظمؓ سے روایت ہے۔فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس شخص کے منہ سے لہسن یا پیاز کی بدبو محسوس فرماتے تھے اس کو مسجد سے نکال کر بقیع میں بھیج دیتے تھے اور فرماتے تھے جسے لہسن یا پیاز کھانا ہو تو اسے چاہئے کہ اسے خوب اچھی طرح پکا کر اور اس کی بدبو مار کر کھائے۔فقہائے کرام کہتے ہیں جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہو کہ اس کے پاس کھڑے ہونے والوں کو اس سے تکلیف پہنچے اس کو مسجد سے ہٹایا جاسکتا ہے۔اس کو خود چاہئے کہ جب تک ایسی بیماری ہے، نماز گھر میں پڑھے۔

تعمیر مساجد میں اعتدال کا رویہ

بعض حضرات نے تعمیر مساجد میں ظاہری شان وشوکت اور تعمیری بلندی کو بھی داخل قرار دیا ہے اور استدلال کیا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر حضرت عثمان غنیؓ نے ساگوان یا سال کی لکڑی سے کرائی تھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد نبوی میں نقش ونگار اور تعمیری خوبصورتی کا اہتمام فرمایا تھا اور یہ زمانہ کبار صحابہ کا تھا۔کسی نے ان کے اس فعل پر انکار نہیں کیا۔اور بعد کے بادشاہوں نے تو مسجدوں کی تعمیرات میں تزئین و آرائش کے حوالے سے بہت اموال خرچ کئے۔ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانہ خلافت میں دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر وتزئین پر ملکِ شام کی سالانہ آمدنی سے تین گنا زیادہ مال خرچ کیا تھا۔ان کی بنائی ہوئی یہ مسجد آج تک قائم ہے۔امامِ اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اگر نام ونمود اور شہرت کیلئے نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے نام اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی تعظیم کی نیت سے کوئی شخص مسجد کی تعمیر نہایت بلند و مستحکم اور نہایت خوبصورت کرتا ہے تو کوئی ممانعت نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں افراط وتفریط ہو رہی ہے۔بعض لوگ اپنے مکانات کی تزئین وآرائش میں نہایت اہتمام کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے لیکن مسجدوں کو سادہ رکھنے پر زور دیتے ہیں اور بعض لوگ مسجدوں کی تزئین وآرائش پر اس حد تک زور دیتے ہیں کہ مسجد ایک اعجوبہ بن کر رہ جاتی ہے۔علمائے کرام نے ایسی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے جس کی تزئین وآرائش نمازی کی توجہ بار بار اپنی طرف کھینچتی ہو کیونکہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر وتسبیح کیلئے بنائی گئی ہیں۔اگر کسی وجہ سے اس میں کمی آتی ہو اور یا اس سے ہٹ کر تزئین وآرائش کو مقصود بنالیا جائے تو یہ بات یقیناً اسلام کی روح کے خلاف ہے۔جس معاشرے میں سر بفلک عمارتیں کھڑی ہوں اور ایک سے ایک بہتر مکان موجود ہو، وہاں مساجد کا پرانی سادگی پر رہنا ان کے مقام ومرتبہ کو کم کرنے کا باعث بنتا ہے۔اسی طرح ذکر وعبادت کو نظرانداز کر کے ضرورت سے زیادہ مساجد کی تزئین وآرائش پر زور دینا مساجد کے اصل مقصد کو فنا کر دیتا ہے۔ان دونوں باتوں میں توازن ضروری ہے۔اقبال نے شاید اسی کو محسوس کرتے ہوئے پروردگار کی طرف سے یہ بات کہی:

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اور شاید اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب تم بھی یہود ونصاریٰ کی طرح اللہ تعالیٰ کے گھروں کو بہت خوبصورت بناؤ گے، لیکن اس میں ذکر وعبادت میں روز بروز کمی ہوتی جائے گی اور

Marfat.com

آج سارے عالمِ اسلام میں ہم اسی منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات از بس ضروری ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے گھروں کو ہر لحاظ سے عزت و وقار دیں اور ساتھ ہی ساتھ اصل فکر ان کی آبادی کی کریں۔

تفسیر بحر محیط میں ابوحیان نے فرمایا کہ " فِیْ بُیُوْتٍ " کا لفظ قرآن میں عام معنوں میں ہے۔ جس طرح مساجد اس میں داخل ہیں، اسی طرح وہ مکانات جو خاص تعلیم و تعلم، وعظ و نصیحت یا ذکر و شغل کیلئے بنائے گئے ہوں جیسے مدارس اور خانقاہیں، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ ان کا بھی ادب و احترام لازم ہے۔ شاعر نے خوب کہا:

خوشا منزل و مسجد و درسگاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمد

رِجَالٌ سے مراد

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ ...... اللہ تعالیٰ نے وہ نورِ ہدایت جو قلبِ مومن میں ڈالا جاتا ہے اور جس کی مثال سابقہ آیت میں بیان فرمائی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھانے والے جو لوگ ہیں پہلے تو ان کے مستقر اور محل کو بیان فرمایا اور اب ان لوگوں کا ذکر فرمایا جا رہا اور ان کی صفات بیان کی جا رہی ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ زندگی کی سب سے خوبصورت مصروفیت اور انسانی نفس کیلئے سب سے زیادہ دلکش چیز تجارت ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نورِ ہدایت کی وجہ سے ایسی خوبصورت اور دلکش مصروفیت کی خاطر بھی کبھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتے۔ وہ کاروبارِ زندگی میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اپنے اللہ کو یاد رکھتے ہیں۔ زبان پر اس کا نام رہتا ہے، دل اسی کی محبت میں دھڑکتا ہے اور کاروبارِ زندگی اسی کی ہدایت اور اسی کی شریعت کے اتباع میں سرانجام پاتا ہے۔ وہ جب تولتے یا ناپتے ہیں تو ان کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کا علم مستحضر ہوتا ہے۔ جب وہ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں یا کسی محنت پر اجرت طلب کرتے ہیں تو انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھ بھی رہا اور سن بھی رہا ہے۔ یہاں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں ایک تجارت اور دوسرا بیع، حالانکہ بیع تجارت کا حصہ ہے، لیکن شاید یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ تجارت تو ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ جس کے فوائد و منافع بعض دفعہ مدتوں میں وصول ہوتے ہیں، لیکن کسی چیز کی بیع اور فروخت یہ ایک وقتی اور فوری نفع کی حامل مصروفیت ہے۔ اس لئے ایک تاجر کے نزدیک تجارتی معاملات میں بیع کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن ان اللہ تعالیٰ کے بندوں کا حال یہ ہے کہ نہ انہیں تجارت کا طویل عمل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتا ہے اور نہ فوری نفع کی کوئی مصروفیت اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہٹاتی ہے اور نہ انہیں کوئی سخت سے سخت محنت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مانع ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عہدِ رسالت میں دو صحابی تھے، ایک تجارت کرتے تھے اور دوسرے لوہار کا کام کرتے اور تلواریں بنا کر بیچتے تھے۔ پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ دوسرے بزرگ کا یہ عالم تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں اذان کی آواز آ گئی تو اگر ہتھوڑا کندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں کندھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کو چل دیتے تھے۔ اٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ تھا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کی تعریف اس آیتِ کریمہ میں کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے حضرت سالمؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ بازار سے گزرے نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ لوگوں کو دیکھا کہ دکانیں بند کر کے مسجد کی طرف جا رہے ہیں، تو فرمایا کہ انہی لوگوں کے بارے میں قرآنِ کریم کا یہ ارشاد نازل ہوا ہے۔

Marfat.com

مردانِ خدا کا ایک وصف

یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ...... اوپر جن مردانِ خدا کا ذکر ہو رہا ہے، یہ ان کا آخری وصف ہے۔ باوجود اس کے کہ انہیں زندگی کی کوئی مصروفیت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی، یعنی وہ ہر وقت اپنے اللہ کو یاد رکھتے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، پھر بھی وہ قیامت کے ہولناک دن یا اس روز پیش آنے والی صورتحال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس میں دلوں کا اضطراب اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا اور آنکھیں اس منظر کا تاب لانے سے انکار کر دیں گی۔ حیرانی کی بات ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کبھی غافل نہ ہوں انہیں تو قیامت کے دن اس اعتماد سے سرشار ہونا چاہئے کہ آج ہمارے اجر و ثواب پانے اور انعام حاصل کرنے کا دن ہے۔ چہ جائیکہ اس دن بھی وہ انتہائی اضطراب اور خوف و ہراس کا شکار ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کا معاملہ ایک ایسے خداوندِ ذوالجلال سے ہے کہ بندوں کی کوئی اطاعت اور عبادت بھی اس کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق نہیں ہو سکتی۔ اور مزید براں یہ کہ اس کی بے نیازیاں ایک ایسی حقیقت ہیں جنہیں ایک بندہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس دن ان کے دل اس خوف سے دھڑک رہے ہوں گے کہ آج کہیں ہماری عبادت و اطاعت کو رد نہ کر دیا جائے اور پروردگار کے جس التفاتِ خاص کی آج ہمیں ضرورت ہے ہمیں اس سے محروم نہ کر دیا جائے۔ اس لئے ان کے پیشِ نظر صرف یہ بات ہو گی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو قبول کرے اور ان کو ان اعمال کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس آیتِ کریمہ میں ان صاحبِ ایمان بندوں کو جن کے دل نورِ ہدایت سے روشن ہیں ان کے دلوں میں یہ کہہ کر امید کے چراغ روشن کر رہا ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ اپنے ان مومن بندوں کو نہ صرف اعمال کی بہترین جزاء عطا فرمائے گا بلکہ عطا و بخشش میں جزائے عمل کے متعینہ قوانین سے بڑھ کر انہیں نوازے گا کیونکہ وہ ذات ہی ایسی ہے کہ جب وہ کسی پر مہربان ہوتی ہے تو انسانوں کے اجر و ثواب کے پیمانے وہاں ناکام ہو جاتے ہیں۔

ہماری ان گزارشات کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو پھر اس بحث کی ضرورت نہیں پڑتی کہ "لِیَجْزِیَهُمْ" کا لام، لامِ علت ہے یا لامِ عاقبت۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

(اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں چمکتی ہوئی ریت، جس کو پیاسا پانی گمان کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے قریب آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اپنے پاس اللہ کو پائے گا، پس وہ اس کا حساب چکا دے گا اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۳۹)

اہلِ کفر کی تمثیل

اب تک ان مومنین صالحین کا ذکر تھا جن کے سینے نورِ ہدایت کے مشکوٰۃ ہوتے ہیں اور جو نورِ ہدایت کو خاص طور سے قبول کرتے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کفار کا ذکر ہے جن کی فطرت میں تو اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت کا مادہ رکھا تھا لیکن جب اس مادہ کو روشن کرنے والی وحیِ الٰہی ان تک پہنچی تو اس سے روگردانی اور انکار کر کے نور سے محروم ہو گئے۔ اور ان کی وہ کیفیت ہو گئی جسے اس آیت میں تمثیل کے انداز میں بیان فرمایا گیا ہے کہ اب ان سے جو اعمال ظہور پذیر ہو رہے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بے آب و گیاہ ریگستان میں کوئی مسافر سفر

Marfat.com

کررہا ہو کہ اسے شدید پیاس آ پکڑے اور اس کے پاس پانی کی ایک بوند تک نہ ہو۔ وہ اس صحرا کی وسعتوں میں دور دور تک نظر ڈالے کہ کہیں اسے کوئی چشمہ ابلتا ہوا دکھائی دے کہ اچانک اس کی نظر چمکتی ہوئی ریت پر پڑے اور دھوپ میں چمکتی ہوئی یہ ریت جسے یہاں سراب کہا گیا ہے اسے ایسے لگے جیسے کوئی پانی کا دریا بہہ رہا ہے تو وہ لپکتا، بھاگتا اور خوشی سے جھومتا ہوا وہاں یہ سمجھ کر پہنچے کہ وہاں مجھے پانی مل جائے گا اور میں اس سے سیرابی حاصل کروں گا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہو کہ میں جس چیز کو لہریں لیتا ہوا پانی سمجھ رہا تھا وہ درحقیقت چمکتی ہوئی اور لہریں لیتی ہوئی ریت تھی۔ اس وقت اس کی پریشانی اور مایوسی کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ وہ بالکل عاجز و درماندہ ہو کر اس طرح ریت پر گرے کہ وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ یہی حال ان کافروں کا بھی ہوگا جو آج اپنے اعمال پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں جن کو شریک کر رکھا ہے وہ یقیناً قیامت کے روز ہمارے کام آئیں گے اور ہم جو ان کیلئے چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں دیتے ہیں یہی ہمارے لئے ذریعہ نجات ثابت ہوں گی۔ اسی طرح ہم قرابتداروں کے حق قرابت کا لحاظ رکھتے ہیں، حجاج کی خدمت انجام دیتے ہیں اور بھی بعض بھلائی کے کام کرتے ہیں۔ ہمارے یہ اعمال یقیناً قیامت کے دن ہمارے کام آئیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے یہ اعمال دشتِ بے آب میں سراب کی مانند ہیں۔ جیسے ایک پیاسا آدمی سراب کو پانی سمجھ کر دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو جاتا ہے اور بالآخر موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی قیامت کے دن جب اپنے اعمال کے پاس پہنچیں گے تو ان پر یہ راز کھلے گا کہ ان کے یہ سارے اعمال خاک اور راکھ بن کر پراگندہ ہو چکے ہیں۔ البتہ اس دن یہ اپنے رب کے سامنے جوابدہی کیلئے کھڑے کیے جائیں گے، انہیں اپنے اعمال کی جگہ اپنے رب کے سامنے جوابدہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ تو وہ اس وقت ان کی زندگی کا پورا پورا حساب کرے گا اور جس انجام کے یہ مستحق ہوں گے اس سے انہیں دوچار کر دیا جائے گا۔ اور آج ان میں سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اولاً تو قیامت ہی ایک تصور سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی لیکن اگر واقعی قیامت ایک حقیقت بن کر سامنے آ گئی تو تب بھی ایک ایک فرد کا حساب اور اس کے تمام اعمال کی جانچ پرکھ اور پھر ہر ایک کو مناسب جزاء وسزا یہ کیسے ممکن ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ تمہارے اوہام وخرافات ہیں اللہ تعالیٰ کیلئے حساب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی بلکہ پلک جھپکنے میں ہر معاملہ طے ہو جائے گا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ
سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ
وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

(یا (ان کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک گہرے سمندر کے اندر تاریکیاں، چھارہی ہو اس پر موج، اس کے اوپر ایک اور موج، اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں، تاریکیاں ایک دوسرے کے اوپر، جب وہ نکالے اپنا ہاتھ تو اس کو بھی دیکھ نہ پائے اور (سچ تو یہ ہے) کہ جس کو اللہ روشنی نہ بخشے تو اس کیلئے کوئی روشنی نہیں۔ ۴۰)

اہلِ کفر کی ذہنی تاریکی کی مثال

اس سے پہلے کافروں کے اعمال کی مثال دی گئی تھی، اب ان کی ذہنی تاریکی کی تمثیل ہے۔ اس رکوع کے آغاز میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ یہ کائنات اس شخص کیلئے ایک عالمِ ظلمات اور اندھیر نگری ہے جو خدا کو نہیں مانتا کیونکہ اس کائنات کی روشنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے مقتضیات پر حقیقی ایمان ہے جس کے بعد دل ودماغ کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں اور ہر طرف اجالا پھیل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کی ذات پر ایمان اپنی ذات کی حقیقت کا شعور، اس کائنات کی حقیقت اور انسان کا اس سے تعلق اور پھر انسان کا مسئول ہونا اور آخرت کا یقین اور اس میں جوابدہی کی فکر یہ وہ کلید ہے جس سے انفرادی، اجتماعی اور کائناتی زندگی کے بند قفل کھل جاتے ہیں۔ انسان کو اپنے ہر سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ اس کے اعمال کو صحیح نہج مل جاتی ہے، اس کی ذات کو صحیح منزل نصیب ہو جاتی ہے، اس کی خواہشات کی حدود کا تعین ہو جاتا ہے اور اس کے عزائم کو اصل ہدف مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس شمع کے ہاتھ آ جانے کے بعد نہ افراد ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں اور نہ قومیں گمراہی کا شکار ہوتی ہیں لیکن جس شخص یا جن لوگوں کو یہ روشنی نصیب نہیں ہوتی ان کی ذہنی کیفیت وہی ہوتی ہے جس کا اس آیت کریمہ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ اپنے تصورات اور خیالات کی وادیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی خواہشات کی موج حملہ کرتی ہے، کبھی مفادات کا طوفان حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی اپنے ہی اوہام و خیالات کے بُنے ہوئے اضطرابات بادل کی طرح چھا جاتے ہیں اور یہ تاریکیاں اس قدر گہری ہو جاتی ہیں کہ انسان اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو کر رہ جاتا ہے، اسے اپنا ہاتھ بھی سوجھائی نہیں دیتا اور یہ حادثہ صرف ایک کلید کھو جانے کا نتیجہ ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ اسی سے ہر بند دروازہ کھلتا ہے اور اسی سے وہ روشنی حاصل ہوتی ہے جس سے اس کی زندگی میں اجالے پھیلتے ہیں اور جس شخص کو یہ دولت نصیب نہیں اور ایمان کی شاہراہ پر آنا اس کے مقدر میں نہیں، وہ ہمیشہ تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا اور کبھی اس پر سحر طلوع نہیں ہو گی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِىْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ

Marfat.com

مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۵﴾ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ
وَاللّٰهُ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۴۶﴾ وَيَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوۡلِ وَاَطَعۡنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ؕ
وَمَاۤ اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ
بَيۡنَهُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ يَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَـقُّ يَاۡتُوۡۤا
اِلَيۡهِ مُذۡعِنِيۡنَ ﴿۴۹﴾ اَفِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ يَخَافُوۡنَ
اَنۡ يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾ ع

رکوع: ۶۔ (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اس چیز سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۴۱) اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی۔ ۴۲) کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہانک کر لاتا ہے بادلوں کو، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے بارش نکلتی ہے اور آسمان سے۔ اس کے اندر کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے۔ پس جسے چاہتا ہے نقصان پہنچاتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو اچک لے جائے۔ ۴۳) اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے (یا الٹ پھیر کرتا ہے) بیشک ان چیزوں میں اہلِ نظر کیلئے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ ۴۴) اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ہر جاندار کو پانی سے، ان میں سے کچھ تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان میں سے کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور ان میں سے بعض چار ٹانگوں پر چلتے ہیں، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ۴۵) ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو حق کو صاف صاف بیان کرنے والی ہیں، اور اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ ۴۶) اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی ہے، پھر ان میں سے ایک گروہ اس دعویٰ کے بعد منہ پھیر لیتا ہے، اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں۔ ۴۷) جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔ ۴۸) اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہو تو اس کی طرف نہایت

Marfat.com

فرمانبردانہ آتے ہیں۔ ۴۹) کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی بیماری ہے یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے، اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔ ۵۰)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اس چیز سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۴۱)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کی دعوت

اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا نور ہے۔ مگر اس نور کے ادراک کی توفیق صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جن کا نورِ فطرت اس نورِ ہدایت سے مستنیر ہوتا ہے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ اس نور کا ادراک اور اس سے وابستگی کیلئے ان نشانیوں پر غور کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور کھلی آنکھوں سے ان حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی خبر دیتی ہیں۔ پیشِ نظر آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات میں اسی خدائے وحدہ لاشریک لہ کا تصرف ہے۔ اس سے بڑی اور نشانی کیا ہوگی کہ کائنات میں بیشمار مخلوقات ہیں۔ کچھ آسمانوں میں ہیں کچھ زمین میں اور کچھ فضاء میں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ ہی کی تسبیح کرتی نظر آتی ہے۔ آسمانوں میں فرشتے تو خیر پیدا ہی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کیلئے کئے گئے ہیں لیکن دیگر مخلوقات بھی جن میں سورج، چاند، ستارے، سیارے اور ثوابت شامل ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کی تسبیح میں مصروف ہیں۔ اسی طرح زمین میں جن وانس کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں چاہے ان کا تعلق حشرات الارض سے ہو یا آبی مخلوقات سے یا جنگل کی دنیا سے۔ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ جمادات بھی جن کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ بے جان چیزیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں۔ پہاڑوں اور پتھروں میں اللہ تعالیٰ کی خشیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح فضا میں اڑنے والے پرندے کبھی چہچہاتے ہوئے اس کی تسبیح کرتی ہیں اور کبھی پر پھیلائے ہوئے افتراش کی حالت میں تسبیح کناں نظر آتے ہیں۔

تسبیح سے کیا مراد ہے

سوال یہ ہے کہ ان کی تسبیح کیا ہے؟ اس کا حقیقی جواب تو وہی ہے جو قرآنِ کریم نے دیا۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ”ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کی تسبیح کرتی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق کی اپنی خاص زبان ہے جن میں جمادات بھی شامل ہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے۔ اسی زبان میں وہ تسبیح کرتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری بات قرآنِ کریم نے یہ کہی ہے کہ ہر مخلوق اپنی نماز اور اپنی تسبیح کو جانتی ہے یعنی جس طرح ہم جانتے ہیں کہ نماز کیسے پڑھنی ہے اور تسبیح کیسے کرنی ہے، وہ بھی جانتے ہیں۔ البتہ علماء نے یہ بات واضح کی ہے کہ نماز سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہوں، مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالاتے ہیں اور اس کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ چونکہ صلوٰۃ و تسبیح سے مراد بندگی اور اطاعت ہے اس لئے یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ تمام مخلوقات کو ان کی جبلت اور فطرت کے تحت زندگی گزارنے کا جو طریقہ سکھایا گیا ہے اس کی پابندی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح ہے۔ یہ تمام مخلوقات اس سے کبھی انحراف نہیں کرتیں۔ اور بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ان کی تخلیقی ساخت ہمارے بعض ارکانِ عبادت سے مشابہت بھی رکھتی ہے اور یہی ان کی تسبیح ہے۔ مثلاً حشرات الارض زمین پر سجدہ ریز رہتے ہیں، چارپائے رکوع میں ہیں، درخت اور پہاڑ وغیرہ حالتِ قیام میں ہیں اور بعض جانوروں کی ساخت ہمارے قعود سے مشابہ ہے۔ جب تک یہ مخلوقات اپنی مخصوص زندگی سے بہرہ ور رہتی ہیں تو وہ اپنی عبادت کی حالت پر قائم رہتی ہیں لیکن جب انہیں موت آتی ہے تو ان کی ساخت تبدیل ہوجاتی ہے۔ سانپ الٹ جاتا ہے، یعنی سجدہ ختم کردیتا ہے۔ درخت حالتِ قیام میں ہیں لیکن جب ان کی زندگی ختم ہوجاتی ہے تو پھر وہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔ یہی حال باقی پودوں کا بھی ہے۔ لیکن حقیقی جواب یہی ہے کہ سب مخلوقات اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف ہیں لیکن ہم ان کی تسبیح کو نہیں جانتے۔ البتہ بعض اہلِ کشف بعض دفعہ ان کی تسبیحات سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔ واللہ اعلم واحکم بالصواب۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تم تو ان کی تسبیح اور صلوٰۃ سے واقف نہیں ہو کیونکہ تم ان کے افعال واعمال کو نہیں سمجھتے، لیکن اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس لئے جب وہ تمہیں خبر دے رہا ہے تو اب اس میں شک کی کیا گنجائش ہے۔

دوسری مخلوقات کی تسبیح اور صلوٰۃ کا ذکر ایک تو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی طرف توجہ دلانے کیلئے ہے اور دوسرا ممکن ہے اس طرف بھی اشارہ ہو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کرتا یا اس کی عبادت سے منہ پھیرتا ہے وہ دراصل ایک ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جو ساری دنیا سے بالکل جدا راستہ ہے اور وہ ایک ایسی راگنی چھیڑتا ہے جو اس کائنات کے مجموعی نغمہ سے بالکل بے جوڑ ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہے چاہے وہ اپنے ماحول میں بالکل تنہا ہو، اسے حوصلہ رکھنا چاہیے کہ اس راہ کا مسافر کبھی تنہا نہیں ہوتا، اس کے دائیں بائیں اس کے ہمسفر موجود ہیں کیونکہ ساری کائنات اس کی تسبیح وتحمید میں مصروف ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

(اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ ہی کی طرف ہے سب کی واپسی۔ ۴۲)

عبادت کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے یہ اس کی دلیل ہے چونکہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی مملوک اور اس کی محکوم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا حاکمِ حقیقی اور کارسازِ مطلق ہے اور پھر سب کو اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کائنات کے نظام میں کسی اور کا دخل ہو اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کائنات کی کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے غافل ہوکر کسی اور کی تسبیح پر آمادہ ہوسکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب کائنات پر مکمل اختیار و اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تو پھر جو لوگ اس سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں انہیں سوچ لینا چاہئے کہ وہ کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ ؕ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

(کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہانک کرلاتا ہے بادلوں کو، پھران کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھران کو تہ بہ تہ کردیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے بارش نکلتی ہے۔ اور آسمان سے اس کے اندر کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے۔ پس جسے چاہتا ہے نقصان پہنچاتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو اچک لے جائے۔ ۴۳)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ یُزْجِیْ ...... دھکیلنا، ہانکنا، رُکَامًا...... رکم، کسی چیز کو اکٹھا کرنا، جب کسی چیز کو اکٹھا کیا جائے اور اسے اوپر نیچے رکھ دیا جائے تو عرب کہتے ہیں رکم الشی یرکمہ، کیچڑ کے ڈھیر کو الرکمۃ کہتے ہیں اور ریت کے ڈھیر کو رُکام کہتے ہیں۔ اسی طرح بادل جب گھر کر آ جائے اور گہرا ہو جائے تو اسے رُکام کہا جاتا ہے۔

وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ ''اس جملے کی ترکیب میں اصحابِ تفسیر کے ہاں اختلاف ہوا ہے اور اس کا اثر ترجمے پر بھی پڑتا ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ مِنْ جِبَالٍ اور مِنْۢ بَرَدٍ دونوں جگہ مِنْ زائد ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ بَرَدًا یَکُوْنُ کَالْجِبَالِ ''یعنی آسمان سے برف اتارتا ہے جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ علامہ پانی پتی اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ بَعْضَ جِبَالٍ مِنْ بَرَدٍ یعنی آسمان سے جب برف برستی ہے تو اتنی کثرت سے برستی ہے، معلوم ہوتا ہے برف کے پہاڑ ہیں جو آسمان سے اتر رہے ہیں۔ اور ایک توجیہ وہ ہے جو ترجمے سے ظاہر ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق ہے

اس سے پہلے کی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی اور اس کی بندگی میں مصروف ہے۔ اس کے خالق اور مالک ہونے اور اس کے حاکمِ مطلق اور کارسازِ حقیقی ہونے کا علم ہر ایک کی فطرت میں داخل ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ کائنات میں سارا اختیار و اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ وہ اپنے اختیارِ مطلق سے جو تصرف چاہتا ہے کرتا ہے۔ اہلِ زمین کو سمجھانے کیلئے یہ مثال دی گئی کہ دیکھو زمین پیاسی ہوتی ہے، پانی کی ایک ایک بوند کو ترستی ہے لیکن جن قوتوں کو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کر رکھا ہے کسی کی یہ قدرت نہیں کہ ان پر بارش کی چند بوندیں برسا سکے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو جوش آتا ہے تو وہ ہواؤں کے زور سے بادلوں کو ہانکتا ہوا وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں بارش برسانا مقصود ہوتا ہے۔ اور پھر بادلوں پر اس کے تصرف کا عالم یہ ہے کہ بادل کے چھوٹے چھوٹے آوارہ ٹکڑوں کو وہ ایک جگہ سمیٹتا اور جمع کرتا ہے۔ ان کو ایک دوسرے کے اوپر اس طرح رکھتا ہے کہ ان میں گہری کثافت پیدا ہو جاتی ہے پھر ان بادلوں کو برسنے کا حکم دیتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔ بارش کا برسنا بھی اسی کے حکم سے ہوتا ہے اور زمین کا اسے قبول کرنا جتنی ضرورت ہو اسے روک لینا اور نگل لینا اور باقی ندی نالوں میں پہنچا دینا یہ بھی اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں اس کی رحمت کی مزید نمود اس طرح ہوتی ہے کہ نئی نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ فضاء رنگ و نور میں ڈھل جاتی ہے، رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش تیز

Marfat.com

ہو جاتی ہے، چند ہی دنوں میں زمین مخملی لباس پہن لیتی ہے، انسانوں اور حیوانوں کیلئے نہ صرف پیاس بجھانے کا انتظام ہوتا ہے بلکہ چارے اور خوراک کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ فصلیں تیزی سے لہلہانے لگتی ہیں، ہر طرف اس کی رحمت برستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے تصرف کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ اسی رحمت کو وہ جب چاہتا ہے نقمت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ گھٹائیں جس طرح رحمت کا پیغام بن کے آتی ہیں اسی طرح بعض دفعہ عذاب کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ کتنی معذب قومیں اسی طرح عذاب کی نذر ہوئیں، لیکن عام حالات میں بھی وہ اسی بادل کو جما کر برف کی صورت میں ڈھال دیتا ہے اور پھر جس سرزمین پہ چاہتا ہے ژالہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں تو بادل کی وجہ سے سرسبزی اور ہریالی پیدا ہوتی ہے اور فصلیں لہلہانے لگتی ہیں لیکن کہیں یہی رحمت جب نقمت کی صورت اختیار کرتی ہے تو لہلہاتی فصلیں دیکھتے ہی دیکھتے برباد ہو جاتی ہیں، جانور مر جاتے ہیں، آبادیاں فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کے تصرف کی قوت کا عالم یہ ہے کہ ایک ہی آبادی سے بعض دفعہ ہوا اور بادل گزرتے ہیں لیکن ان کے اندر چھپی ہوئی آگ یا برف آبادی کے ایک حصے کو جلا ڈالتی ہے اور دوسرا حصہ محفوظ رہتا ہے۔ آج کی زبان میں اسی کو سائیکلون کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ بگولوں میں چھپ کر جنات آتے ہیں اور وہ تباہی مچا دیتے ہیں، لیکن اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے، وہ کبھی رحمت کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی نقمت کی صورت اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ دونوں پر قادر ہے۔ جب اس کے بادل اللہ تعالیٰ کے جلال کی صورت اختیار کرتے ہیں اور وہ کسی قوم کیلئے تنبیہ اور عذاب بن کر آتے ہیں تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اس آفت سے خود کو یا دوسروں کو بچا سکیں۔ ان بادلوں کے اندر جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک کا یہ حال ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کو اچک لے جائے گی۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۴۴﴾

(اللہ ہی ہے جو رات اور دن کو گردش دیتا ہے (یا الٹ پھیر کرتا ہے) بیشک ان چیزوں میں اہلِ نظر کیلئے بڑا سامانِ عبرت ہے۔ ۴۴)

اللہ تعالیٰ کے اختیار کی ہمہ گیری کی ایک مثال

اللہ تعالیٰ کے تصرف اور اختیار کی ہمہ گیری کے حوالے سے ایک اور مثال دی جا رہی ہے اور یہ مثال ایسی ہے جس سے ہر مخلوق کا براہِ راست ہر وقت کا تعلق ہے اور انسان اگر ہدایت حاصل کرنا چاہے تو کم از کم یہ منظر ہر وقت اس کے سامنے ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی جیسے ہی صبح کو آنکھ کھولتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ میں جب سویا تھا تو رات تھی، یہ اب صبح کہاں سے طلوع ہو رہی ہے۔ اور ابھی اس کی سوچ مکمل نہیں ہو پاتی تو اس کی نظروں کے سامنے خورشید کا نور ظہور ہونے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری کائنات روشنی میں نہا جاتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص جو دن کی ہمہ ہمی میں ڈوبا رہتا ہے اور دن کی روشنی اسے ہر کام کے انجام دینے اور آمدورفت میں معاون ثابت ہوتی ہے لیکن جیسے ہی شام ہوتی ہے تو ہر چیز پردۂ شب میں محجوب ہونے لگتی ہے۔ وہ سورج جو کائنات کا مطلق العنان بادشاہ معلوم ہوتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پردۂ عدم کے پیچھے چلا جاتا ہے اور اس کی حکمرانی ختم ہو جاتی ہے۔ اب رات کی تاریکی رفتہ رفتہ گہری ہو جاتی ہے۔ یہ وہ منظر ہے جو ہر شخص دیکھتا ہے اور ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور کوئی جاہل ہو یا پڑھا لکھا، عام آدمی ہو یا دانشور وہ آج تک اس راز کو نہ پا سکا کہ آخر وہ کون سی قوت ہے جو دن کو رات میں اور رات کو دن میں تبدیل کرتی ہے۔ دنیا کا کوئی حکمران یا سائنسدان نہیں جو اتنے بڑے تصرف پر قادر ہو۔ صرف ایک جواب ہے جو ہمیں مطمئن کرتا ہے کہ رات اور دن کی تبدیلی اور ان کے آنے جانے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو دخل نہیں۔ اسی کے حکم سے سورج طلوع ہوتا ہے

Marfat.com

چاہے اس کا طریقہ کچھ بھی ہو اور اسی کے حکم سے غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین جب سے وجود میں آئی ہے وہ مسلسل گردش میں ہے۔ اس کی ایک حرکت سال میں پوری ہوتی ہے اور ایک چوبیس گھنٹوں میں۔ اسی سے موسم وجود میں آتے، اسی سے بہار اور خزاں کا منظر نمایاں ہوتا ہے۔ سردی اسی کے دم سے ہے اور گرمی اسی کے سبب سے۔ زمین اپنے وجود کی پہلی ساعت سے آج تک کبھی اپنی حرکت میں تقدیم و تاخیر پیدا نہیں کر سکی۔ ورنہ ہمارے تمام حساب غلط ہو جاتے اور کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ باقی کُرّوں کی طرح زمین کے نظام کو اس قدر باندھ کے رکھنا اور اس کی حرکت میں کبھی کمی بیشی نہ ہونے دینا اور اس پر بسنے والی مخلوقات کیلئے کبھی دشواری پیدا نہ ہونے دینا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار واقتدار کا نتیجہ ہے اور اس میں اہلِ نظر کیلئے عبرت کا سامان ہے۔

عبرت کا مفہوم

عبرت ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانے کو کہتے ہیں، یعنی ایک چیز سے دوسری چیز تک اس طرح پہنچ جانا جس سے علم و فراست کے سامنے ایک نئی صبح طلوع ہو جائے، ایک نیا عقدہ کھل جائے اور جانی ہوئی باتوں سے انجانی باتوں کا استحضار ہو جائے اور دوسروں کے مسائل سے سبق حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہو، یہی انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ جوہر نہیں تو وہ انسان نہیں بلکہ وہ حیوان ہے۔ غالب نے اسی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے کہا:

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِىْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۚ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۵﴾

(اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ہر جاندار کو پانی سے، ان میں سے کچھ تو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور ان میں سے کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور ان میں سے بعض چار ٹانگوں پر چلتے ہیں، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ۴۵)

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک مثال

اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ کسی قانون کی پابند نہیں بلکہ اس کا ہر کام اس کی مشیت اور اس کی حکمت کے تابع ہے۔ ایسا نہیں کہ اس نے مخلوقات کا ایک سانچہ بنا لیا ہو یا ایک قانون نافذ کر دیا ہو اور مخلوقات اس کے مطابق تخلیق پاتی رہیں بلکہ اس کی تخلیق اس کی حکمت کے مطابق اپنے اندر تنوع رکھتی ہے۔ اس کی بے شمار مخلوقات کو چھوڑ کر وہ چند مخلوقات جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان میں کچھ زمین پر رینگتی اور اپنے پیٹ کے بل چلتی ہیں جنہیں ہم حشرات الارض کہتے ہیں اور ان میں سے کچھ جاندار ایسے ہیں جو دو پاؤں یا دو ٹانگوں پر چلتے ہیں ان میں خود حضرت انسان شامل ہے۔ اور کچھ ایسے ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں جنہیں ہم چار پائے کہتے ہیں۔ اور جنگل کی بیشتر مخلوق ایسی ہے۔ اس

Marfat.com

میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی واضح ہوتی ہے، اس کے تصرف کی وسعت بھی دکھائی دیتی ہے، اس کے اختیار کی ہمہ گیری بھی ذہن میں آتی ہے اور اس پر مزید حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ ان مخلوقات میں فرق صرف چلنے کا ہی نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا بھی ہے، صلاحیتوں کے اختلاف کا بھی ہے۔ معیشت اور اسباب معیشت کا بھی ہے۔ ان تمام اختلافات کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی قدرت جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، جیسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، یہ اس کی قدرت کاملہ پر یقین ایک ایسی کلید ہے جس سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

(ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو حق کو صاف صاف بیان کرنے والی ہیں، اور اللہ ہی جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔ ۴۶)

ہدایت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، الوہیت اور اس کے متصرف حقیقی ہونے پر دلائل دینے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان آیات میں ان تمام بنیادی حقائق کو کھول کر بیان کر دیا ہے جس سے اسلام کی دعوت کو سمجھنا نہایت آسان ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص صراطِ مستقیم پر چلنا چاہے تو ہم نے اس کیلئے صراطِ مستقیم روشن کر دی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق نہیں مانگتا اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو سمجھنے اور قبول کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ اسے کبھی ہدایت عطا نہیں فرماتا۔ اس نے یہ بات تو اپنی ذمہ داری بنا رکھی ہے کہ وہ انسانوں کیلئے ہدایت کا راستہ واضح کرے، نیکی اور برائی کے فرق کو کھول دے گا۔ ایمان کے فوائد اور کفر کے نقصانات سے باخبر کر دے اور مختلف النوع دلائل سے ایمانیات کو سہل بنا دے، لیکن اگر کوئی شخص ان دلائل اور ان آسانیوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے لاپراہی، بے نیازی بلکہ سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ غیور ہے۔ وہ ناقدروں کو بھی دین جیسی بیش بہا دولت عطا نہیں کرتا۔ جو اس سے مانگتا ہے، اسے محروم نہیں رکھتا۔ اور جو بے نیازی دکھاتا ہے اس کیلئے دنیا آسان کر دیتا ہے بلکہ کھول دیتا ہے۔ لیکن دین کا راستہ اس کیلئے مشکل بنا دیتا ہے۔ اس کے چاہنے سے اس کے اسی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ چاہنا اس کا علی الاطلاق نہیں بلکہ حکمت کے تابع ہے اور اس کی حکمت انسانی رویوں کے مطابق فیصلے کرتی ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی ہے، پھر ان میں سے ایک گروہ اس دعویٰ کے بعد منہ پھیر لیتا ہے، اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں۔ ۴۷)

Marfat.com

منافقین کے رویئے پر تنقید

اللہ تعالیٰ کے دین کی عام دعوت اور اس پر دلائل قائم کرنے کے بعد ایک اور حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، وہ یہ کہ اسلام چونکہ صرف ایک فرد کے عقیدے کا نام نہیں بلکہ ریاست کا آئین اور دستور بھی ہے۔ عام دستوری ریاستوں میں کسی شخص کا ریاست کے دستور کو تسلیم کر لینے کا اقرار اور اس کے جھنڈے کا احترام کافی سمجھا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے طرزِ عمل اور اس کے دل و دماغ کی کیفیت پر دستور کی حاکمیت قائم ہوئی ہے یا نہیں، لیکن اسلامی ریاست میں ہر فرد اور پوری امت کو خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے لئے بنیادی ایمانیات کا اقرار اور بنیادی احکام پر عمل کافی نہیں۔ جب تک تم انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اقرار کو یقین، اذعان اور عقیدے کی قوت میں تبدیل نہیں کر دیتے اور عمل کے ساتھ ساتھ دل کی تائید اور اخلاص شامل نہیں ہو جاتا اس وقت تک تمہارا دعویٰ ایمان معتبر نہیں۔ چنانچہ اس پابندی کے بعد حلقۂ اسلام میں آنے والے دو قسموں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک مومنِ قانت اور دوسرے منافق۔ جس طرح اسلام کی تاریخ اور اس کی کامیابیوں کی داستان سچے مومنوں اور مسلمانوں کے جذبۂ ایمان اور قربانیوں سے روشن ہے۔ اسی طرح کچھ منافق بھی ہیں جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر مسلمانوں کی معاشرت میں شریک رہ کر معاشرتی فوائد حاصل کرنے کی فکر میں تو رہتے تھے لیکن ان کے دل و دماغ میں نہ اخلاص پیدا ہوا تھا اور نہ ایمان ان کی ترجیح بنا تھا۔ چنانچہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ منافق لوگ بڑھ چڑھ کر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ اطاعت کا دم بھی بھرتے ہیں، لیکن جب دعویٰ ایمان واطاعت کے امتحان کا وقت آتا ہے تو پشت دکھا جاتے ہیں۔ سورۃ النساء اور بعض دیگر سورتوں میں اس مضمون کو زیادہ کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ ایسے لوگ ہزار ایمان واطاعت کا دعویٰ کریں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہرگز مومن نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان کا حق صرف کلمہ پڑھ دینے سے پورا نہیں ہوتا اور نہ اطاعت کے خالی دعوے کفایت کرتے ہیں بلکہ اللہ اور رسول کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت اس کی اولین شرط ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اور ایک اور شعر میں اس کو مزید واضح کیا گیا ہے:

زباں سے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿٤٩﴾

(جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔ ۴۸) اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہو تو اس کی طرف نہایت فرمانبردانہ آتے ہیں۔ ۴۹)

Marfat.com

نفاق کا ایک پہلو

منافق کبھی زبان سے اسلام کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار نہیں کرتا اور نہ کبھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کے دعویٰ ایمان میں کمزوری ہے بلکہ منافق لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر مسلمان کہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے پیشِ نظر آیت کریمہ میں ان کے نفاق کی دلیل کے طور پر ان کے رویئے کے ایک پہلو کو ذکر فرمایا ہے کہ جب کبھی ان کے درمیان کوئی قضیہ پیدا ہوتا ہے اور انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس قضیے کے فیصلے کیلئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف آؤ۔ تو یہ لوگ آپ کی طرف آنے سے اعراض کرتے ہیں۔ اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آنا، اللہ کے قانون کی طرف آنا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بیان کیا گیا ہے او آنحضرت ﷺ نے اس کی تشریح، تفصیل اور عملی شکل بیان فرمائی ہے۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دو مختلف حوالے نہیں بلکہ ایک ہی حوالہ ہے۔ رسول کی طرف آنا، اللہ کی طرف آنا ہے۔ اور اللہ کی طرف آنا، رسول کی طرف آنا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے متعدد جگہ ارشاد فرمایا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ”جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“ گویا دونوں کی اطاعت ایک قانون کی اطاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اسے برپا کر کے دکھایا ہے۔ تو جب اس قانون کی طرف ان منافقین کو بلایا جاتا ہے تا کہ اس قانون کے مطابق ان کے قضایا کا فیصلہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے رسول کریں گے۔ لیکن یہ فیصلہ صرف ان کا فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بھی ہوگا۔ کیونکہ آپ اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ تو ان منافقین کے ہر گروہ کو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس فیصلے کی طرف آنے سے پہلوتہی کرے گا یعنی اس کی کوشش یہ ہوگی کہ میں کسی اور عدالت سے اپنے معاملات کا فیصلہ کراؤں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے جن میں یہود پیش پیش تھے اپنی کتابوں کو تحریف اور ترمیم کے ذریعے خواہشات کی تصویر بنا لیا تھا اور مزید یہ بات کہ ان کے فیصلہ کرنے والوں کو رشوت دے کر مفید مطلب فیصلہ کرایا جا سکتا تھا۔

ہمارے آئمہ تفسیر نے ان آیات کا ایک شانِ نزول بھی بیان کیا ہے، اس کا ذکر کرنے سے پہلے ایک ضروری بات واضح کر دینا مفید ہوگا۔ وہ یہ کہ ہمارے یہاں عام طور پر شانِ نزول کے حوالے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کا نزول اس واقعہ کی وجہ سے ہوا۔ اور وہ شاید اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص بھی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بات صحیح نہیں۔ جب کسی واقعہ کے پیش آنے کے وقت کوئی آیتِ کریمہ نازل ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس واقعہ سے متعلق ہدایت موجود ہے اور اس کے علاوہ اگر اسی طرح کے کچھ اور واقعات پیش آئیں گے یا اس طرح کے حالات پیدا ہوں گے تو اس آیتِ کریمہ سے رہنمائی حاصل کی جانی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ مختلف واقعات کے بارے میں ایک ہی آیت یا ایک ہی سورت کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس موقع پر نازل ہوئی تھی۔ تو واقعات کے تعدد کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید اس آیت یا اس سورت کا نزول ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا ہے، حالانکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف واقعات یا مختلف حالات کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کو اس آیت کی طرف متوجہ فرمایا گیا کہ آپ اس موقع پر اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ کسی آیت یا سورت کا حکم کسی ایک واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا۔ اسی کو ہمارے اہلِ علم اس طرح بیان کرتے ہیں: الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب ”اس وضاحت کی روشنی میں یہ گزارش کی جا سکتی ہے کہ ان آیات میں منافقین کے مجموعی رویہ پر تنقید کی گئی ہے اور یہ تنقید کسی خاص واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

Marfat.com

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آیات ایک منافق کے بارے میں نازل ہوئیں، جس کا نام بشر تھا، اس کا ایک یہودی سے تنازعہ ہوگیا۔ اس یہودی نے بشر کو کہا کہ چلو رسول اللہ ﷺ کے پاس فیصلے کیلئے چلتے ہیں۔ بشر کے دل میں چور تھا وہ یہودی سے ناحق الجھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ فیصلہ اس کے حق میں دیں گے، کیونکہ وہاں نہ کسی کی رعایت کی جاتی ہے اور نہ سفارش چلتی ہے۔ تو اس نے یہودی سے کہا ان محمدا یحیف علینا ''کہ محمد ﷺ ہم پر ظلم کرتے ہیں۔'' چلو کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور اس آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ جو شخص آنحضرت ﷺ یا اس مسند پر فائز آپ کے کسی جانشین کے فیصلے کو قبول نہیں کرتا اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے دوسری عدالتوں یا دوسرے قانون کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ ہزار ایمان و اسلام کا دعویٰ کرے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مسلمان نہیں۔

خودغرضی کی اطاعت نفاق ہے

وَاِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْهِ مُذْعِنِیْنَ ''اور اگر انہیں یہ خیال ہو کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اللہ کے رسول کے پاس اطاعت کیش بن کر آتے ہیں۔'' یعنی جب انہیں تنازعات کے فیصلے کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو منافقین کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ بجائے آنحضرت ﷺ کی عدالت میں جانے کے یہودیوں کی کسی عدالت میں جائیں تاکہ وہاں مفید مطلب فیصلہ لے سکیں، لیکن اگر انہیں یہ خیال ہو کہ ہمارے قضیے میں فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا کیونکہ اسلامی شریعت ایسے قضایا میں جو احکام جاری کرتی ہے وہ اس قضیے میں ہمارے حسب حال ہیں تو پھر وہ لپکتے ہوئے فرمانبردارانہ اور اطاعت کیش بن کر آنحضرت ﷺ کی عدالت میں آتے ہیں۔ یہی وہ روش ہے جو ان کے منافق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں آنحضرت ﷺ کے فیصلے یعنی شریعت کے فیصلے کو قبول کرنا اور جہاں سے وہ فیصلہ مل سکتا ہو اس عدالت میں جانا ایمان کا تقاضا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ فیصلہ صاحب قضیہ کی خواہش اور مصلحت کے مطابق ہو یا اس کے خلاف ہو۔ ایک مومن ہر صورت میں شریعت ہی کو ترجیح دیتا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں کسی دوسری عدالت یا کسی دوسرے قانون کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم نے بعض دوسرے مواقع پر اسی کو تحاکم الی الطاغوت سے تعبیر کیا ہے اور اس کو شرک قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شرک ایمان کی ضد ہے۔ ایمان کا راستہ اور ہے اور شرک کا راستہ اور ہے۔ اور دونوں کا انجام بھی غایت درجہ ایک دوسرے سے الگ ہے۔

اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْھِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۵۰

(کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی بیماری ہے یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے، اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خود ہی ظالم ہیں۔ ۵۰)

Marfat.com

منافقین کے طرزِ عمل کا تجزیہ

منافقین کے رویئے اور طرزِ عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کی تین ہی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ (۱) ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، یعنی وہ حقیقت میں مومن نہیں، محض دھوکہ دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کیلئے ایمان کا دعویٰ کررہے ہیں۔ (۲) یا وہ ابھی تک شک میں مبتلا ہیں کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں یا نہیں۔ اور قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے یا نہیں۔ اور آخرت واقعی آنے والی ہے یا محض افسانہ تراشیدہ ہے۔ جو شخص ایسے شکوک میں مبتلا ہو ظاہر ہے کہ اس کے طرزِ عمل میں نہ یکسوئی پیدا ہوسکتی ہے اور نہ یک رنگی آسکتی ہے۔ اور نہ وہ اسلام کی خاطر کسی قربانی کی ہمت کرسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس ارتیاب کا مفہوم یہ ہو کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں اور اسلام کے مخالفین میں ایک کشمکش جاری ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جارہی ہے، لیکن ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوسکی کہ دونوں گروہوں میں سے کون غالب آسکتا ہے۔ انہیں اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کے بارے میں شبہ ہے۔ انہیں خیال ہے کہ شاید دوسرا گروہ غالب آجائے، تو اگر ہم کسی ایک گروہ کے ساتھ بتمام وکمال وابستہ ہوجائیں تو دوسرے گروہ کے غلبے کی صورت میں ہمارے لئے بے حد مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ یہ شک انہیں یکسو نہیں ہونے دیتا اور ان کے اندر اخلاص پیدا ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ (۳) وہ اللہ اور اللہ کے رسول سے ظلم کا اندیشہ رکھتے ہیں، یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے تمام احکام ہمارے حسبِ حال نہیں۔ ہم جس طرزِ زندگی کے عادی ہوچکے ہیں شریعت اس کے بالکل برعکس ہمارے اندر ایک نیا طرزِ زندگی، نیا اسلوبِ حیات، نئی ثقافت، نئی تہذیب اور نیا تمدن پیدا کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ ان میں سے بہت ساری باتیں ہم صریحاً ظلم سمجھتے ہیں، اس سے تو ہم بالکل اپنے ماضی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جیسے ہمارا آج کا جاگیردار اسلامی وراثت کے احکام کو اپنے لئے ظلم سمجھتا ہے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اگر ہم اسے اختیار کرلیں تو اس سے ہماری جاگیر بکھر کر رہ جائے گی اور ہم چند پشتوں میں عام آدمی کی سطح پر آجائیں گے۔ ہمارا آج کا تاجر اور اکانومسٹ سود کی حرمت کو اپنی معیشت کیلئے خطرہ قرار دیتا ہے۔ اس کا گمان یہ ہے کہ سود جدید معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے ختم کردینے سے ہماری معیشت کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ جو لوگ تقریبات میں حدودِ شرافت سے بڑھ جانے کو خوشی کا اظہار سمجھتے ہیں وہ اسلامی شریعت کے احکام کو خوشیوں کے قاتل اور زندگی کو بے رنگ بنادینے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ ایسا ہی حال اس دور کے منافقین کا تھا اور وہی سوچ آج کے منافقین کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہے۔

ان تین وجوہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ تینوں اسباب نفاق کی علامتیں ہیں، ان کا ایمان سے کوئی رشتہ نہیں۔ جو لوگ اس طرح کے خیالات کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہیں یا شامل رہنا چاہتے ہیں اور اس طرح سے مسلم معاشرے میں مختلف قسم کے ناجائز فائدے حاصل کرنے کی فکر میں ہیں، وہ درحقیقت خائن اور فریبی ہیں۔ وہ اپنے ضمیر کے قاتل ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کے اندر وہ ذلیل ترین خصائص پیدا ہوتے ہیں جو نفاق کو بڑھاتے اور ایمان کے واجبی تعلق کو بھی ختم کردیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جو یہ لوگ اپنے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے ظاہری کلمۂ شہادت پر اعتماد کرکے مسلمان ان کے ساتھ جب معاملات کرتے ہیں تو یہ انہیں اپنے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں۔

Marfat.com

اِنَّمَا

كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥١﴾ وَمَنْ يُّطِعِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٥٢﴾
وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ
لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٣﴾ قُلْ
اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ
وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٥٤﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص
وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٥٦﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٥٧﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (ایمان لانے والوں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۵۱) (اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کی حدود کی پاسداری کریں گے وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے۔ ۵۲) اور وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں بڑے زور شور سے کہ اگر آپ ان کو جہاد کا حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے، آپ ان سے کہئے کہ قسمیں نہ کھاؤ، دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے (یا تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے، اللہ اس سے خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۵۳) اے پیغمبر کہہ دیجئے! کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پس اگر تم روگردانی کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو ان پر ڈالی گئی ہے۔ اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ۵۴) اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے کہ ان کو ملک میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جسے اس نے ان کیلئے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو در حقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۵۵) اور نماز کو قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۵۶) یہ گمان ہرگز نہ کیجئے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے وہ زمین میں ہمیں عاجز کرنے والے ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ ۵۷)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵۱

(ایمان لانے والوں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۵۱)

سچے مومنوں کی شان

منافقین کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر تنقید کے بعد پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ ایک تو وہ طرزِ عمل ہے جو منافقین کا آپ نے دیکھا، لیکن اب ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جو سچے مومن ہیں ان کی شان کیا ہوتی ہے۔ وہ کس طرح سوچتے، کیا کہتے اور کیسے عمل کرتے ہیں۔
ان صاحبِ ایمان لوگوں کی پہلی صفت یہ ہے کہ جب بھی کبھی انہیں ان کے باہمی تنازعات یا زندگی کے معاملات میں فیصلے اور رہنمائی کیلئے دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف آؤ تاکہ وہ تمہارے تنازعات کا فیصلہ کریں اور تمہاری زندگی کے الجھے ہوئے معاملات میں رہنمائی دیں تو وہ کسی سوچ میں پڑے، کسی تحفظِ ذہنی کا شکار ہوئے اور حالات کی برہمی کی پرواہ کئے بغیر فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے

Marfat.com

سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ اس میں سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور ماحول ہزار مصلحتوں کے پردوں میں لپٹا ہوا ہو اور اسلام سے تعلق کا اظہار کیسے ہی خطرات کا باعث کیوں نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے رسول سے جو سمع و اطاعت کا تعلق رکھتے ہیں اس کے اظہار میں کبھی تأمل نہیں کرتے، کیونکہ ان کی ایمانی فراست ان پر یہ عقدہ کھول دیا گیا ہے کہ نامساعد حالات اور مخالفانہ ماحول میں حق کا اظہار ہی حق کی تقویت کا باعث بنتا ہے لیکن اگر حق کو ماننے والے ہر چند دل میں اعتراف و اقرار کی ہزار گہرائیاں رکھتے ہوں لیکن انہیں زبان پر لانا انہیں گوارا نہ ہو اور وہ اسے مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں اور یا محسوس کرتے ہو کہ اگر ہم نے اس کا اظہار کیا تو ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایسے لوگ ایمان کے پہلے زینے پر بھی پاؤں رکھنے کے قابل نہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اور میں یہ عرض کروں گا کہ مومنوں کا بھی ہمیشہ یہی طریق رہا ہے اور جس میں اس کی بھی جرأت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان کو جائز تعلق نہیں سمجھتا۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی اعلیٰ اختیاراتی میٹنگ ہو رہی ہو جس میں صاحب اقتدار کے ساتھ مختلف مناصب پر فائز لوگ میٹنگ میں شریک ہوں اور باہر سے آذان کی آواز آنے لگے تو کوئی شخص اپنے ساتھیوں یا امیر مجلس سے یہ کہنے کی جرأت کبھی نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہے اس کی طرف بلایا جا رہا ہے اور بلانے والا اس کی طرف سے اس کے حکم کا اعلان کر رہا ہے۔ اس لئے ہمیں پہلے اس کی تعمیل کرنی چاہئے۔ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی ایسی مجالس میں اگر کوئی شخص یہ بات کہنے کی ہمت کر دے تو یوں سمجھ لیجئے کہ اس نے قیامت کو آواز دے دی ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص ایسے مواقع پر نماز کی یاد دلانے کو ایک مشکل بات قرار دے لیکن مختلف تقریبات میں جس طرح شرم و حیا کا جنازہ نکلتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو سرِ عام توڑا جاتا ہے وہاں بھی کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی شریعت اپنی طرف بلا رہی ہے، ہمیں پہلے اس بلاوے پر کان دھرنا چاہئے۔ لیکن اسلام نے اپنے ماننے والوں میں ایسے جرأت اور جسارت پیدا کر دی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلے میں کسی دوسری بات کو ترجیح دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

غلامی نے ہمارے اندر جو خرابیاں پیدا کی ہیں اور جس طرح ہمارے ضمیر کے احساسات کو بگاڑا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم آزاد ہونے کے بعد بھی اس سرمایۂ افتخار سے محروم ہیں جو کسی نظریاتی قوم میں جرأت اور اظہارِ حق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس خرابی نے ہمارے اندر سے اسلامی عصبیت کے جذبے کو بہت حد تک کمزور کر دیا ہے۔ ظفر علی خان مرحوم نے دورِ غلامی میں دکھ کا اظہار کرتے ہوئے جو بات کہی تھی وہ آج بھی صحیح ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا
تمسخر کرنے والے دین سے ہی گر مہذب ہیں
تو ان تہذیب کے پتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھا

جو لوگ دل کی آمادگی، دل و دماغ کی ہمواری اور جذبۂ ایمانی کے ساتھ زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی سمع و اطاعت کا اعلان کرنے کی جرأت پیدا کر لیتے ہیں ان کی زندگی میں یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ہر طرح کے شیطانی اثرات اور طاغوتی بہلاوؤں سے محفوظ ہو کر صراطِ مستقیم کے مسافر بن جاتے ہیں۔ ان کی منزل ہر لوٹ اور طمع و خوف سے بالاتر ہو کر صرف آخرت بن جاتی ہے۔ ان کا سفینۂ نجات صرف اسلام ہوتا ہے۔ یہ کبھی منافقوں کی طرح دو کشتیوں پر سوار ہونے کی حماقت نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں فلاح کی منزل سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

Marfat.com

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾

(اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کی حدود کی پاسداری کریں گے وہی لوگ ہیں جو فائز المرام ہوں گے۔ ۵۲)

مسلمانوں کی کامیابی کی تین شرائط، اطاعت، خشیت، تقویٰ

مسلمانوں کی کامیابی کا پہلا زینہ سمع واطاعت کا بے پناہ جذبہ ہے۔ جس سے اس بات کا فیصلہ ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں حکمرانی کس نظریئے کی ہے اور وہ کون ذات ہے جسے وہ اپنا حاکم حقیقی اور رہنمائے حق سمجھتے ہیں۔ لیکن فوز وفلاح کے حصول کیلئے یہ جذبہ اور یہ دعویٰ اور یہ اقدام کافی نہیں۔ اس سے راستے اور منزل کا تعین ضرور ہوجاتا ہے لیکن منزل تک پہنچنے کیلئے سفر پر روانگی اور آدابِ سفر کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کے احکام کی سمع واطاعت کا عزم بالجزم کر لیتے ہیں اب ان کی کامیابی کیلئے شرطِ اول یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اطاعت بھی ایسی جس میں نہ توقف ہو نہ تأمل۔ تحفظِ ذہنی کا خلجان ہو اور نہ نفع وضرر کے پیمانوں کا خیال۔ صحابہ کرامؓ نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہر حکم کی زندگی بھر اسی طرح اطاعت کی کہ آپؐ کے دہنِ مبارک سے حکم کے الفاظ بعد میں الگ ہوتے تھے، صحابہ کرامؓ میں عمل کیلئے پہلے سے حرکت پیدا ہوجاتی تھی۔ اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے سورۃ الانفال میں واضح فرمایا کہ مسلمانو! اللہ اور اللہ کے رسول تمہیں جس بات کا حکم دیتے ہیں اسی میں تمہاری زندگی کا راز مضمر ہے۔ اس کی تعمیل میں کبھی تساہل سے کام نہ لینا۔ کیونکہ بعض دفعہ اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے، ممکن ہے یہ تساہل تمہاری محرومی کا باعث بن جائے۔

حضرت اُبی ابن کعبؓ کو آنحضرت ﷺ نے آواز دی۔ انہوں نے آمد میں کچھ تاخیر کی۔ آپؐ نے وجہ پوچھی تو عرض کی، کہ میں نماز میں مصروف تھا۔ آپؐ نے متذکرہ بالا حکم کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا: کہ نماز کی حالت میں بھی میرا حکم پہنچے تو نماز توڑ کر عمل کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور ضوابطِ حیات مسلمانوں کیلئے اجتماعی زندگی میں ریاستی قوانین کا درجہ رکھتے ہیں اور ریاست کے قانون پر عملدرآمد کیلئے ہم جانتے ہیں کہ صرف اعضاء وجوارح سے تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ نیت اور قلبی احساس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی شخص اگر کسی شعبے میں بھی ظاہری طور پر ملکی قوانین کو نہیں توڑتا لیکن دماغی طور پر اسے قبول نہیں کرتا، دل سے تنفر کا اظہار کرتا ہے اور زبان سے ایسے قوانین پر لعنت بھیجتا ہے، لیکن عملدرآمد میں کوئی کمی نہیں ہونے دیتا تو اس پر کبھی قانون شکنی کا الزام نہیں لگتا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل میں صرف ظاہری اطاعت کافی نہیں بلکہ دل ودماغ کی آمادگی بھی ضروری ہے۔ اور یہ احساس بھی ہر وقت دامن گیر رہنا لازمی ہے کہ میں اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے کہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے خوف اور اس کی رضا کی امید سے بیگانہ تو نہیں ہوجاتا۔ ایک مومن حد درجہ احکام کی اطاعت کرتے ہوئے بھی اطاعت پر اعتماد کر کے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ وہ برابر اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتا رہتا ہے۔ اور دل میں اس بات سے فکرمند رہتا ہے کہ کہیں میرے قلبی احساسات میں کوئی ایسی ویسی کمزوری نہ آجائے کہ میرے اعمال قبول نہ کئے جائیں۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دوسری بات یہ فرمائی کہ مومن صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا بھی رہتا ہے۔ اس کے اعضاء وجوارح جس طرح اطاعت میں متحرک رہتے ہیں اسی طرح اس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزاں اور ترساں بھی رہتا ہے۔ اس طرح سے مومن کا پورا سراپا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خشیت کی گرفت میں رہتا ہے۔ اقبال نے بہت صحیح کہا:

Marfat.com

تری دنیا جہاں مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں، میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری بادشاہی

اس آیتِ کریمہ میں تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، اس طرح حدودِ الٰہی کی پاسداری بھی کرتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ لیا جاسکتا ہے کہ خشیت کا تعلق باطن سے ہے اور تقویٰ کا تعلق ظاہر سے ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ تقویٰ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں ظاہر اور باطن دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ خشیت سے مراد یہ احساس ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کسی ایسی کمزوری کا شکار تو نہیں ہوزہا جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لازم آتی ہو، یعنی خشوع خضوع میں کمی واقع ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے خوف اور امید کا رشتہ کمزور ہوتا ہو۔ اور تقویٰ سے شاید یہاں یہ مراد ہو کہ میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی بجا آوری اور ادائیگی میں کسی کمزوری کا ارتکاب تو نہیں کررہا۔ کیونکہ جس طرح مومن کیلئے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی واجب ہے۔ جو لوگ ظاہر و باطن میں اپنے آپ کو ان ہدایات کا پابند بنالیتے ہیں اور ان کی زندگی اس کی تصویر بن جاتی ہے یہی لوگ ہیں جو دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گے۔

اس آیت کے فہم و ادراک کے ضمن میں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے میں اسے بیان کررہا ہوں۔ ایک روز حضرت فاروق اعظم ؓ مسجدِ نبوی میں کھڑے تھے تو روم کے دہقانوں میں سے ایک دہقان حاضر ہوا اور حضرت فاروق اعظم ؓ کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا۔ آپؓ نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے عرض کی میں مشرف بہ اسلام ہوگیا ہوں۔ آپؓ نے کہا تم نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دینِ اسلام کو کیوں قبول کیا۔ اس نے کہا، میں نے تورات، انجیل، زبور اور دیگر کتبِ انبیاء کا مطالعہ کیا۔ میں نے ایک مسلمان قیدی کو ایک ایسی آیت پڑھتے ہوئے سنا جس میں وہ تمام چیزیں جمع کردی گئی ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے۔ اس لئے میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ آپؓ نے دریافت فرمایا وہ کون سی آیت ہے، اس نے یہی آیت پڑھی۔ اور اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا۔ ومن یطع اللہ (فی الفرائض) ورسولہ (فی السنن) ویخش اللہ (فیما مضیٰ من عمرہ) ویتقہ (فیما بقی من عمرہ فاولئک ھم الفائزون الفائز من نجا من النار وادخل الجنۃ) ”جو شخص فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور سنتوں میں اس کے رسول کی پیروی کرتا ہے اور گزری ہوئی زندگی میں جو غلطیاں اس سے ہوئیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور آنے والی زندگی میں تقویٰ اختیار کرتا ہے، یہی لوگ کامیاب ہیں اور کامیاب وہ شخص ہے جسے آتشِ جہنم سے نجات مل گئی اور جنت میں داخل کردیا گیا۔“

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۗ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ۗ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۳﴾

(اور وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں بڑے زور شور سے کہ اگر آپ ان کو جہاد کا حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے، آپ ان سے کہئے کہ قسمیں نہ کھاؤ، دستور کے مطابق اطاعت اصل چیز ہے (یا تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے، اللہ اس سے خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۵۳)

Marfat.com

منافقین کی روش جہاد کے معاملے میں

منافقین جس طرح سمع واطاعت کا عہد کرنے کے باوجود اطاعت سے جی چراتے اور آنحضرت ﷺ کی عدالت میں جانے سے کتراتے تھے، اسی طرح وہ جہاد سے بھی گریز کرتے تھے۔ جہاد چونکہ ایمان کی چوٹی اور ایک مومن کے ایمان کی علامت ہے۔ اس لئے مخلص مومن جہاد سے پیچھے رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ جس طرح مال و دولت اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس کا مطالبہ کرے تو اس کے راستے میں دینا ضروری ہوجاتا ہے، اسی طرح جسم و جان بھی اس کی نعمت ہیں۔ اگر اس کے دین کی سربلندی اور مسلمانوں کے دفاع کیلئے جہاد وقتال کا حکم دیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا بھی ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ منافقین چونکہ ان باتوں سے واقف تھے اس لئے جب کبھی جہاد کا ذکر آتا تو وہ لاف زنی کرتے ہوئے دوسروں سے آگے بڑھ کر بڑی زوردار قسمیں کھا کھا کر آنحضرت ﷺ کو یقین دلاتے کہ جب آپؐ ہمیں جہاد کیلئے نکلنے کا حکم دیں گے تو ہم میں سے کوئی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دینے کیلئے حاضر ہیں۔ لیکن جب وقت آتا تو کسی نہ کسی طرح جہاد میں عدمِ شرکت کیلئے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرلیتے۔ چنانچہ ان کی قسمیں کھانے اور لاف زنی کرنے کے جواب میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ قسمیں کھا کھا کر اپنی اطاعت اور ایثار کا یقین مت دلاؤ۔ اصول کے مطابق تمہاری اطاعت کافی ہے۔ تمہاری اطاعت پر مبنی رویہ خود یہ بتادے گا کہ تم ایمان کے دعوے میں کہاں تک سچے ہو۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تمہاری اطاعت کا حال خوب معلوم ہے۔ اس لئے قسمیں کھانے کا کیا فائدہ۔ جس شخص کے پاس عمل کا جوہر نہیں ہوتا، وہ اس کی تلافی سخن سازی اور قسمیں کھا کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ منافقین کا یہی ہتھیار تھا جس سے وہ اپنے کردار کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔

آخر میں فرمایا کہ قسمیں کھا کر اور جھوٹے دعوے کرکے ممکن ہے تم مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجاؤ، لیکن تمہارا معاملہ اس پروردگار سے ہے جو علام الغیوب ہے۔ وہ تمہارے ہر قول و فعل سے واقف ہے۔ اسے تم کس طرح دھوکہ دے سکتے ہو۔

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ...... اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح ''فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ'' ہے۔ یہ خبر محذوف کا مبتداء بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اگر نکرہ موصوف ہو تو اس کے اندر مبتداء ہونے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور متبدائے محذوف کی خبر بھی ہوسکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے! کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پس اگر تم روگردانی کرو گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری ہے جو ان پر ڈالی گئی ہے۔ اور تم پر وہ ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاجاؤ گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ۵۴)

Marfat.com

منافقین کو تنبیہ

یہ منافقین کو تنبیہ ہے کہ تم نے جو رویہ اپنا رکھا ہے کہ نام تم ایمان کا لیتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت سے گریز بھی کرتے ہو۔ یہ دوعملی دنیا میں تمہاری رسوائی کا سبب بنے گی اور آخرت میں خسرانِ مبین کا۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں فوز وفلاح سے نوازا جائے تو پھر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کرو۔ محض اللہ تعالیٰ کے رسول کی خدمت میں بیٹھنا اور چرب زبانی سے انہیں اپنی اطاعت کا یقین دلانا تمہارے کام نہیں آئے گا۔ تمہیں اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ایمان میں اخلاص اور سچی اطاعت ہی تمہارا اصل سرمایہ ہے۔ اسی کی ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے۔ اگر تم نے اسی سے اعراض برتا تو اس کا سوال اللہ تعالیٰ کے رسول سے نہیں ہوگا بلکہ تم سے ہوگا۔ کیونکہ ہمارے رسول پر ذمہ داری صرف اللہ تعالیٰ کے دین کو پہنچانے کی ہے اور اس نے اپنی یہ ذمہ داری بتمام وکمال انجام دی ہے۔ اور ساتھ ہی تہدید کے انداز میں فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاجاؤگے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ تمہاری دنیا بھی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین میں اصل مطالبہ ایمان کے ساتھ اطاعت کا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کو ماننے کا اقرار کرتا ہے یا اللہ اور اس کے رسول کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اطاعت سے تہی دامن ہے تو صرف ایمان کا دعویٰ کام نہیں آئے گا۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت کے آغاز میں اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا الگ الگ حکم دیا گیا ہے لیکن وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا میں صرف اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کا ذکر فرما کر یہ بات واضح کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت ہے، اور دونوں کی اطاعتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی شخص صرف ایمان پر اتفاق کرتا ہے اور اطاعت کا نام نہیں لیتا یا صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اکتفا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کو ضروری نہیں سمجھتا تو اس آیت کے مطابق یہ دونوں باتیں گمراہی کا عنوان ہیں۔ آخرت میں نجات اور دنیا میں صحیح طرزِ عمل کیلئے ایمان کے ساتھ اطاعت یعنی عمل اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت لازم وملزوم ہیں۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ
کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۠ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ
وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ وَمَنْ
کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾

(اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے کہ ان کو ملک میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جسے اس نے ان کیلئے پسند فرمایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔ ۵۵)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے وعدے چند صفات کے ساتھ مشروط ہیں

اس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی وغلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے۔ لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔

خلافت کا غلط مفہوم

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت وفرمانروائی اور غلبہ وتمکن کے معنی میں لے لیتے ہیں، پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگی حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے اور اس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کیلئے ایمان، صلاح، دینِ حق، عبادتِ الٰہی اور شرک، ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو ان کے اس نظریئے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود ونصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنا دیئے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنہوں نے کبھی دنیا میں غلبہ وتمکن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں، خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق وفجور کی ان تمام آلائشوں میں بری طرح لتھڑے ہوئے ہوں جنہیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے، جیسے سود، زنا، شراب اور جواء۔ اب اگر یہ سب لوگ مومنِ صالح ہیں اور اسی لئے خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز کئے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانینِ طبیعی کو ماننے اور صلاح کے معنی ان قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت وحرفت اور تجارت وسیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ ان قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی وجہد کی کامیابی کیلئے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ ان مفید قواعد وضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کر لے؟ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عملِ صالح اور دینِ حق اور عبادتِ الٰہی اور توحید اور شرک کے یہی معنی ہیں؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات وتصورات کے مطابق ڈھال

Marfat.com

لیا ہو یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے ان سب آیات کو اپنے زعم میں سراسر لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور اِلٰہ اور اس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعۂ ہدایت اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس زندگی میں اپنی جوابدہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح و صاف الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہمارے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی ان غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیتِ استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظِ خلافت و استخلاف کے جس معنی پر انہوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنی کبھی نہیں لے سکتا۔

خلافت کا صحیح مفہوم

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق و سباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔

اس کے ایک معنی ہیں "خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا" اس معنی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔

دوسرے معنی ہیں "خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امرِ شرعی (نہ کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا" اس معنی میں صرف مومنِ صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے کیونکہ وہ مالک کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

تیسرے معنی ہیں "ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا"۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی "نیابت" سے ماخوذ ہیں اور یہ آخری معنی خلافت بمعنی "جانشینی" سے ماخوذ، اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغتِ عرب میں معلوم و معروف ہیں۔

اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق و سباق میں آیتِ استخلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کیلئے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانینِ فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لئے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لئے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسند کردہ دین

Marfat.com

یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لئے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جارہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر روس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں بج رہا ہو اس کے حضور اسے نذر کر دینا جہالت کی طغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصب عالی پر سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا؟

ایک ضروری بات

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے۔ بلا واسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی ﷺ کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دین اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالتِ خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں کرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومنِ صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمر فاروق ؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کیلئے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت وقلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا لشکر ہے جس کی اس نے تائید و نصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ...... اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قیم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے او پراگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قومی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں اور عرب کی چکی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آجائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہوگی اور ادھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظریں جما دیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے۔ اس لئے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہل عجم بڑی کثیر تعداد میں امنڈ آئے ہیں، تو

Marfat.com

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جوان سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں بلکہ اللہ کی تائید ونصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔"

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس تقریر میں جنابِ امیر کس کو آیت استخلاف کا مصداق ٹھہرا رہے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

مزید وضاحت کیلئے حضرت عدی کی روایت ملاحظہ فرمایئے:۔

حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں بارگاہِ رسالت میں حاضر تھا کہ ایک صحابی حاضر ہوا اور اس نے فقر وفاقہ کی شکایت کی۔ دوسرا آیا اس نے راہزنوں کی دست درازیوں کا شکوہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا اے عدی! کیا تو نے حیرہ کا شہر دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن میں نے لوگوں سے اس کے بارے میں سنا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اگر تیری زندگی دراز ہوئی تو، تو دیکھے گا۔ ایک عورت اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے روانہ ہوگی اور آ کر کعبہ کا طواف کرے گی اور خدا کے بغیر اسے کسی کا ڈر نہیں ہوگا۔ میں دل میں خیال کرنے لگا کہ بنی طے قبیلہ کے قزاق اور راہزن کہاں چلے جائیں گے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا اے عدی، تم کسریٰ کے خزانوں کو فتح کرو گے۔ میں نے عرض کی کیا کسریٰ بن ہرمز یعنی شہنشاہِ ایران۔ حضورؐ نے فرمایا وہی کسریٰ بن ہرمز۔ پھر حضورؐ نے فرمایا تم دیکھو گے لوگ ہاتھوں میں سونا اور چاندی لئے ہوئے کسی غریب کی تلاش میں پھر رہے ہوں گے لیکن مملکت اسلامی میں انہیں کوئی غریب نہیں ملے گا۔ عدی کہتے ہیں میں نے حیرہ سے اونٹنی پر سوار ہو کر آنے والی عورت کو بھی کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور میں خود ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے کسریٰ کے خزانے فتح کئے تھے۔ بعض لوگ جو صحابہ کرامؓ کی عظمتِ شان کا انکار کرنا ہی اپنے ایمان کا کمال سمجھتے ہیں وہ اگر اپنی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی زحمت ہی گوارا کرتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ انہیں یقین ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جو وعدہ فرمایا ہے اور حضور کریمؐ نے جو وعدے فرمائے ہیں جن کا ذکر خود ان لوگوں کی کتابوں میں موجود ہے وہ وعدے خلفاء راشدین کے عہدِ سعادت آثار میں پورے ہوئے ہیں۔ ان کے امام کلینی جن کی کتاب کافی ان کے ہاں حدیث کی معتبر ترین کتاب ہے ان کی روایت ملاحظہ فرمایئے۔

عن ابی عبدالله علیه السلام قال لما حضر رسول الله الخندق مروا بکدیة فتناول رسول الله المعول من ید امیر المؤمنین اومن ید سلمان فضرب بها ضربة فتفرقت بثلاث فرق وقال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لقد فُتحت علی فی ضربتی هذه کنوز کسریٰ و قیصر

(فروغ کافی کتاب الروضہ ص۱۰۲)

ترجمہ: "حضرت امام جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب حضور ﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا تو راستہ میں ایک چٹان حائل ہوگئی۔ حضورؐ نے گینتی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دستِ مبارک سے یا حضرت سلمان فارسیؓ لے لی اور اس چٹان پر ایک ضرب لگائی اور اس کے تین ٹکڑے ہوگئے۔ حضورؐ نے فرمایا **لقد فُتحت علی فی ضربتی هذه کنوز کسریٰ و قیصر**۔ میری اس ضرب سے میرے لئے کسریٰ اور قیصر کے خزانے فتح کر دیئے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ خزانے حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں فتح ہوئے۔ روایت میں فتحت علی کے الفاظ

Marfat.com

ایک حق بین کیلئے روشنی کا وہ مینار ہیں جس سے شک وشبہ کا ادنیٰ احتمال بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی واقعہ کو صاحب ''حملہ حیدری'' نے ان اشعار میں ذکر کیا ہے، یہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

بپاسخ چنیں گفت خیر البشر — کہ چوں جست برق نخست از حجر
نمودند ایوانِ کسریٰ بمن — دوم قصرِ روم، سوم از یمن
سبب راچنیں گفت روح الامین — کہ بعد از من اعوان و انصارِ دین
بریں مملکت ہا مسلط شوند — بآئینِ من اہل آں بگروند
بدیں مژدہ و شکر و لطفِ خدا — بہر بار تکبیر کر دم ادا
شنیدند آں مژدہ چوں مومناں — کشیدند تکبیر شادی کناں

ترجمہ:۔

۱۔ حضور نبی کریم ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا کہ جب اس چٹان کو ضرب لگانے سے پہلی مرتبہ آگ کا شعلہ نکلا۔
۲۔ تو مجھے کسریٰ کا محل دکھایا گیا۔ دوسری مرتبہ قیصرِ روم کا محل اور تیسری مرتبہ یمن۔
۳۔ اس کی وجہ جبرائیل امین نے یوں بیان کی کہ میرے بعد دین کے مددگار اور انصار۔
۴۔ ان ملکوں پر قابض ہوں گے اور وہاں کے باشندوں کو میری شریعت کا پابند کریں گے۔
۵۔ اس خوشخبری کو سن کر اور اس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے میں نے تین بار اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔
۶۔ جب اہل ایمان نے حضور کی زبان پاک سے یہ خوشخبری سنی تو سب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

یہ چیز غور طلب ہے کہ حضورؐ نے ان ملکوں کی فتوحات کو اپنی فتوحات قرار دیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا لطف اور احسان فرمایا ہے اور اظہارِ شکر کیلئے حضورؐ نے اور حضورؐ کے غلاموں نے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ اگر خدانخواستہ حضرت صدیق و فاروق خلیفہ برحق نہ ہوتے بلکہ (نعوذ باللہ) جابر اور غاصب ہوتے تو کیا ان کے زمانہ خلافت میں جو فتوحات ہوئیں انہیں حضورؐ کی فتوحات کہنا درست ہوتا؟ اور ایسی فتوحات پر حضورؐ فرحت و شادمانی کا اظہار فرماتے؟ کوئی ادنیٰ عقل وفہم رکھنے والا انسان بھی ان واقعات کی روشنی میں شیخین کی خلافت پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ جب امام مہدی علیہ السلام ظاہر ہوں گے تو اس وقت یہ وعدہ پورا ہوگا۔ ضد اور تعصب کا کوئی علاج نہیں لیکن حق کی جستجو کرنے والے کیلئے آیت میں ''منکم'' کا ایک لفظ ہی کافی ہے یعنی صحابہ کرامؓ جو اس آیت کے مخاطب تھے وہی ''منکم'' کا مرجع ہیں اور اولین وعدہ ان سے ہے۔ نیز اگر ان کی اس بات کو صحیح مان لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں بھی یہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ کم از کم ہم ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ (ضیاء القرآن)

Marfat.com

کفر کا مفہوم

وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ''اور جن لوگوں نے اس کے بعد کفر کیا یہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں۔ کفر کا لغوی معنی ناشکری، یعنی کفرانِ نعمت ہے۔ اور اصطلاحی معنی دین کی بنیادی باتوں، یعنی ایمانیات سے انکار ہے جو ایمان کی ضد ہے۔ یہاں دونوں معنی ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اصلاحی معنی کے لحاظ سے منافقین کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کئے گئے وعدوں کو پورا فرماتے ہوئے مسلمانوں کو خلافتِ ارضی سے نوازے اور ان کے دین کو تمکن عطا کردے اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے یعنی انہیں زمین پر مستحکم حکومت قائم کرنے اور اس کا وقار قائم کرنے کا موقع عطا فرمادے تو اب اگر منافقین اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر ایمان میں اخلاص پیدا کرنے سے کوتاہی کریں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ درحقیقت ہر حد سے آگے بڑھ جانے والے لوگ ہیں، اب یہ کسی رورعایت کے مستحق نہیں۔ چنانچہ جنگِ تبوک کے بعد شاید اسی اعلان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ایسے لوگوں کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا جبکہ اس سے پہلے آپؐ ہمیشہ ان کے ساتھ چشم پوشی کرتے اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ اور دوسرا لغوی معنی کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہوجانے اور اتنے بڑے انعامات سے سرفراز ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ اس خلافت اور حکومت سے اخلاص کا رشتہ قائم نہ رکھیں بلکہ خلیفہٴ راشد کیخلاف سازشیں کریں اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے حدود کی پاسداری کا علمبردار بنایا تھا، اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کر کے آگے نکل گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے ان سے کئے ہیں ان میں کمی آجائے گی۔ چنانچہ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے جب تک خلفائے راشدین اور ان کی خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ وفاداری اور اطاعت کا ثبوت دیا تو اللہ تعالیٰ نے زمین کی طنابیں ان کیلئے کھینچ دیں اور کافروں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا۔ جدھر بھی نکلے، کامیابی کے جھنڈے گاڑتے گئے۔ لیکن جب حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف ایک سازشی گروہ نے حالات کی خرابی کا راستہ اختیار کیا، حتیٰ کہ انہیں شہید کر ڈالا تو پھر اس کے بعد مسلمانوں کو ایک کلمے کے تحت جمع ہونے کا کبھی موقع نہ ملا۔

بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام کا یہ خطبہ نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف ہنگامہ کے وقت دیا تھا۔ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اللہ کے فرشتے تمہارے شہر کے گرد احاطہ کئے ہوئے حفاظت میں اس وقت سے مشغول تھے جب سے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ خدا کی قسم اگر تم نے عثمان کو قتل کردیا تو یہ فرشتے واپس چلے جاویں گے اور پھر کبھی نہ لوٹیں گے۔ خدا کی قسم تم میں سے جو شخص ان کو قتل کردے گا وہ اللہ کے سامنے دست بریدہ حاضر ہوگا اس کے ہاتھ نہ ہوں گے اور سمجھ لو کہ اللہ کی تلوار اب تک میان میں تھی، خدا کی قسم اگر وہ تلوار میان سے نکل آئی تو پھر کبھی میان میں نہ جاوے گی۔ کیونکہ جب کوئی نبی قتل کیا جاتا ہے تو اس کے بدلے میں ستر ہزار آدمی مارے جاتے ہیں اور جب کسی خلیفہ کو قتل کیا جاتا ہے تو ۳۵ ہزار آدمی مارے جاتے ہیں۔'' (مظہری)

Marfat.com

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٥٦﴾
(اور نماز کو قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۵۶)

مسلمانوں کو تین ہدایات

مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے دل نفاق کی آلودگی سے محفوظ رہیں اور تمہاری اجتماعیت میں دراڑیں نہ پڑیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ نماز قائم کرتے رہو۔ نماز ایک ایسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ سے وفاداری کے رشتے کو مستحکم کرتا اور دل کے اخلاص کو ہر آلودگی سے پاک کر دیتا ہے۔ باجماعت نماز مسلمانوں میں شیرازہ بندی کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر اسے پورے آداب اور مقاصد کے ساتھ ادا کیا جائے تو مسلمانوں کے دلوں کو آپس میں جوڑنے اور باہمی حالات سے آگاہ رہنے اور ایک ہی منزل کے مسافر بننے کیلئے سب سے کارگر ذریعہ ہے۔ مزید فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ مال و دولت تمہاری ترجیح نہ بننے پائے اور دولت کا فتنہ جو اس امت کیلئے سب سے بڑی آزمائش بنایا گیا ہے تمہیں اپنی گرفت میں نہ لینے پائے۔ اور تم اسلام کے اجتماعی مصالح کو ہر بات پر ترجیح دیتے رہو تو پھر ضروری ہے کہ پابندی سے زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ اس سے تمہارے اندر طبقات پیدا نہیں ہوں گے، غربت کو پر پھیلانے کا موقع نہیں ملے گا، مال و دولت کو ذاتی محنت کا نتیجہ اور ذاتی ملکیت سمجھنے کا فتنہ سر نہیں اٹھائے گا بلکہ تم مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حقوق کو ادا کرنے کی فکر کرتے رہو گے۔ اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے اندر نظریاتی انتشار پیدا نہ ہو، طبیعتیں اور عقلیں بے قابو نہ ہوں، اذواق و میلانات پراگندہ نہ ہونے پائیں۔ اور کسی غلط شخص کو شعبدہ بازی کے زور پر اپنی ذات کو بالا بلند کرنے کا موقع نہ ملے تو پھر نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔ اطاعت کا حکم انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس ایک حکم پر عمل کے نتیجہ میں زندگی کا ہر شعبہ فساد سے محروم ہو جاتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم ان تینوں ہدایات پر عمل کرنے میں یکسو رہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کی جانی چاہئے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے گا اور اپنی رحمت کی چادر تم پر تان دے گا۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰهُمُ النَّارُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٥٧﴾
(یہ گمان ہرگز نہ کیجئے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے وہ زمین میں ہمیں عاجز کرنے والے ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ ۵۷)

کافروں کو تنبیہ

آخر میں کافروں کو تنبیہ کی گئی ہے اور بالواسطہ منافقین کو سوچنے کا موقع دیا گیا ہے کہ جو لوگ ''وہ یہود ہوں یا مشرکینِ عرب'' یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ جو مسلمانوں کے ساتھ حکومت اور غلبے کا وعدہ کر چکا ہے اس کے ایفا میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کر دیں گے اور ان کی نام نہاد کوششیں اور سازشیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے دین کی بالا دستی کو خواب و خیال بنا دیں گے، تو انہیں یہ خیالِ خام اپنے دماغوں سے نکال دینا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں، وہ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کے دین کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں، وہ اسی دین کی بالا دستی کیلئے شب و روز کوشاں ہیں اور مسلمان اس کوشش میں ان کے دست و بازو ہیں۔ انہوں نے اپنے ایمان و عمل سے اس دین کی تائید کی ہے اور اپنی قربانیوں سے اس قافلے کو آگے بڑھایا ہے اور اس تمام تگ و دو میں انہیں اللہ تعالیٰ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ انہیں شکست دینا گویا کہ اللہ تعالیٰ کو شکست دینا ہے اور جو قوم بھی اللہ تعالیٰ کی شکست دینے اور عاجز کرنے کا ارادہ لے کر اٹھے گی وہ ہمیشہ خائب و خاسر ہوگی۔ اس لئے مشرکین اور یہود کو بھی اپنے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کر لینا چاہئے کیونکہ اب اس سرزمین پر ان کی صف لپیٹی جانے والی ہے۔ اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اگر یہ لوگ اسی حالت میں موت کا شکار ہوتے ہیں تو انہیں بہر صورت لوٹ کر اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانا ہے اور وہاں ان کا انجام جہنم ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان کا ٹھکانہ بننے والا ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۚ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ
وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ
الْعِشَاءِ ۚ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ
بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّافُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ
الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ
اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ
غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ ۖ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا
عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ

Marfat.com

آبَآئِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا
مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا
أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ
اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦١﴾

ترجمہ: ۵۸ (اے ایمان والو! لازم ہے کہ تمہارے مملوک (غلام اور باندیاں) اور تمہارے وہ بچے جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں، نماز فجر سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور نماز عشاء کے بعد، یہ تین اوقات تمہارے پردے کے ہیں، ان اوقات کے علاوہ بغیر اجازت آ جائیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر، تم ایک دوسرے کے پاس بار بار آتے جاتے رہتے ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ (۵۸) اور جب تم میں سے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں تو ان کو بھی اسی طرح اجازت طلب کرنی چاہئے جس طرح ان سے پہلے والے اجازت طلب کرتے رہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ (۵۹) اور بوڑھی عورتیں جو نکاح کی آرزو نہیں رکھتیں ان پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے (اوپر والے) کپڑے اتار رکھیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور اس سے بھی بچنا ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (۶۰) نہ تو اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے اور نہ تم پر کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جن گھروں کی کنجیاں تمہارے قبضہ میں ہیں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، تم پر کوئی گناہ نہیں کہ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔ پھر جب گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنوں کو سلام کیا کرو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت والی پاکیزہ دعا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (۶۱)

Marfat.com

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۚ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۗ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٨﴾

(اے ایمان والو! لازم ہے کہ تمہارے مملوک (غلام اور لونڈیاں) اور تمہارے اندر کے وہ جو ابھی بلوغ کو نہیں پہنچے تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔ ایک، نمازِ فجر سے پہلے دوسرا، دوپہر کو جب تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو اور تیسرا، نمازِ عشاء کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہاری بے پردگی کے ہیں، ان اوقات کے علاوہ وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر، تم ایک دوسرے کے پاس بار بار آمد و شد رکھنے والے ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے، اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۵۸)

توضیحی آیات، غلاموں اور بچوں کیلئے تین اوقات میں اجازت لینے کی ہدایت

آیت ۲۷ تا ۳۱ میں آدابِ معاشرت، طریقِ استیذان اور گھروں میں پردے کے بارے میں جو ہدایات دی گئی تھیں ان ہدایات کے سلسلے میں وقت گزرنے کے ساتھ بعض وضاحتوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور طبیعتوں میں ان ہدایات کے رچ بس جانے کے بعد کچھ ایسے احکام دیئے گئے جو حکمتِ تدریج کا نتیجہ تھے۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ گھروں میں داخل ہونے کے وقت استیذان کی جو پابندی لگائی گئی تھی اس سے غلاموں اور نابالغ بچوں کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا، لیکن اب اس استثنیٰ پر یہ قید عائد کردی گئی کہ عام اوقات میں تو وہ پہلی ہدایت پر عمل کریں ان کیلئے استیذان کی پابندی نہیں۔ البتہ تین اوقات میں ان کیلئے بھی لازم ہے کہ وہ جب گھر میں آئیں تو اہلِ خانہ سے اجازت طلب کریں اور پھر ان تین اوقات کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک تو نمازِ فجر سے پہلے۔ کیونکہ ایک مومن کیلئے رات کی نیند اور آرام کا وقت بغیر کسی مجبوری کے اذانِ فجر سے ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ اذانِ فجر ایک مومن کیلئے فجر کی نماز کا بلاوا ہے جس پر لبیک کہنا اور نمازِ فجر کیلئے اٹھ جانا ایک مومن کیلئے ضروری ہے۔ البتہ کوئی معذور اور بیمار شخص عذر کی حد تک رعایت کا مستحق ہے۔ دوسرا دوپہر کا وقت جب لوگ قیلولہ کیلئے کپڑے اتارتے ہیں۔ عرب گرم ملک ہے، دوپہر سے دن ڈھلنے تک کام کرنے میں شدید دشواری پیش آتی ہے۔ اس لئے عرب اپنے مزاج اور روایت کے مطابق دوپہر کو آرام کرنے کے عادی تھے، اسی کو قیلولہ کہتے ہیں۔ مرد بھی آرام کرتے تھے اور عورتیں بھی آرام کرتی تھیں۔ میاں بیوی جب دونوں آرام کے وقت یکجا ہوں گے تو ایک تو آرام کیلئے تنہائی اور یکسوئی چاہئے اور یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ تنہائی میں میاں بیوی بے تکلفی سے ایک دوسرے سے پیش آئیں۔ نیند کیلئے عورتیں عموماً اپنے وہ کپڑے جو گھروں میں پردے کیلئے پہنے یا اوڑھے جاتے ہیں وہ اتار کے رکھ دیتی ہیں اور مرد بھی بعض دفعہ ستر پوشی سے غافل ہوجاتا ہے۔ اور میاں بیوی کا بے تکلف اختلاط یقیناً ستر کھل جانے کا باعث ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں گھر کے کسی ملازم یا ملازمہ یا کسی بچے کا تنہائی کی جگہ میں آنا یقیناً شرم کا باعث اور ایذا کا سبب ہوسکتا ہے۔ تیسرا وقت صلوٰۃ العشاء کے بعد کا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو شب و روز کے جو آداب سکھائے تھے اس میں یہ ادب شامل تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد تا گزر

Marfat.com

امور کے علاوہ کسی کام یا باہمی گفتگو میں وقت صرف نہ کیا جائے اور سونے کی کوشش کی جائے تا کہ صبح جلدی اٹھنا آسان ہو۔ تہجد اور نماز بھی پڑھی جا سکے اور زندگی کے معمولات کا آغاز بھی جلدی ہو سکے۔ ویسے بھی آبادیوں میں بجلی آنے سے پہلے سرِ شام کاروبار کا بند ہو جانا اور عشاء کی نماز کے بعد خواب گاہوں میں چلے جانے کا معمول ہمیشہ رہا۔ بجز ان لوگوں کے جنہوں نے بیکار تفریحات میں وقت ضائع کرنا معمول بنا لیا ہو۔

چونکہ یہ وقت نیند کا ہے، اس وقت یقیناً مرد و زن اپنے شب خوابی کے لباس میں ہوں گے۔ اور میاں بیوی باہمی اختلاط کیلئے آزاد ہوں گے۔ ایسے وقت میں کسی کا بلا اجازت چلے آنا یقیناً شرم و حیاء کے مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔

ان تین اوقات کے علاوہ گھروں میں رہنے والے ایک دوسرے کی خواب گاہوں اور آرام گاہوں میں آنے جانے اور ایک دوسرے کے معمولات میں شریک ہونے میں آزاد ہیں کہ وہ بغیر اذن طلب کئے آتے جاتے رہیں۔ البتہ یہ بات اسلامی تعلیمات کی وجہ سے جان چکے کہ تین اوقات کے علاوہ کوئی وقت تنہائی کا نہیں، بجز اس کے کہ کسی خاص سبب کے باعث اس کی ضرورت پیش آ جائے اور آنے جانے والوں کو اس پر متنبہ کر دیا جائے۔ اس لئے عام اجازت دے دی گئی کہ گھروں میں رہنے اور آنے جانے والوں کو معمولاتِ زندگی میں شریک ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد اور عورت بلوغ سے پہلے کسی حکم کے مکلف نہیں، تو یہاں بچوں کو استیذان کا پابند کیوں کیا جا رہا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے مخاطب درحقیقت بچوں کے سرپرست اور ان کے مربی ہیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں آداب سے آگاہ کریں اور اس کی پابندی کرائیں اور اگر اس میں کوتاہی کریں تو سرزنش کریں۔ جس طرح نماز کا حکم دینا اور اس کی پابندی کرانا والدین کی ذمہ داری ہے اور کوتاہی پر ان کی سرزنش کرنا والدین کو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ یہاں بھی درحقیقت ان کے والدین اور مربی ہی اس حکم کے مخاطب ہیں۔

مملوکوں سے غلام اور لونڈیاں دونوں مراد ہیں

آیتِ کریمہ میں مطلق مملوکوں کا ذکر آیا ہے جس میں غلام اور لونڈیاں دونوں شامل ہیں۔ لونڈی اپنے مالک سے ہر طرح کی بے تکلفی رکھتی ہے۔ تنہائی اور آرام کے وقت میں اس پر استیذان کی پابندی لگانا بظاہر عجیب سی بات ہے۔ اس خیال کے حوالے سے بعض اہلِ علم کو یہ گمان ہوا کہ یہاں مملوک سے مراد لونڈی نہیں بلکہ صرف غلام ہیں۔ لیکن یہ قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ مرد جب آرام کرنا چاہتا ہے اور بیوی اس کے پاس موجود ہے تو کسی ملازمہ یا لونڈی کو بھی ایسے وقت میں بلا اجازت اندر چلے آنا یقیناً شرم و حیاء کے تقاضوں کے خلاف ہے اور کوئی مہذب اور غیرت مند آدمی کبھی اس صورتحال کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اس سے مراد غلام اور لونڈیاں دونوں ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ جو استثنائی حکم اب دیا جا رہا ہے اس کا علم شاید اللہ تعالیٰ کو پہلے سے نہیں تھا، ورنہ آیت ۳۱ میں اس کا پہلے سے ذکر کر دیا جاتا۔ اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی قصور نہیں لیکن اس کی حکمت بعض دفعہ تدریج کا تقاضا کرتی ہے۔ اس میں بندوں کی کمزوریوں کا لحاظ کیا جاتا ہے تا کہ ایک ہی دفعہ کے احکام ان کی طبیعتوں پر شاق نہ گزریں۔

Marfat.com

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

(جب تم میں سے بچے بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ بھی اسی طرح اجازت طلب کریں جس طرح ان کے پہلوں نے اجازت طلب کی، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے، اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ ۵۹)

آیت ۳۱ میں جن لوگوں کو استیذ ان سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا بلکہ اجازت دی گئی تھی کہ ان کے سامنے اظہارِ زینت بھی ہو سکتا ہے، ان میں وہ بچے شامل تھے جو عورتوں کی خفیہ باتوں سے ابھی آگاہ نہیں ہوئے۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان نابالغ بچوں یا عورتوں کی پسِ پردہ چیزوں سے آگاہ ہو جانے والوں پر استیذ ان کی پابندی لگا دی گئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ جس طرح ان سے پہلے بڑی عمر کے لوگ استیذ ان کے پابند تھے، اسی طرح اب یہ بھی پابند ہوں گے۔ ان کی اس عمر کیلئے جس میں ان پر یہ پابندی لگائی گئی ہے قرآنِ کریم نے "حلم" کا لفظ استعمال کیا۔ حلم بلوغ پر بھی بولا جاتا ہے اور عقل اور سمجھ پر بھی۔ اس لئے اس ناچیز کا دھیان بار بار اس طرف جاتا ہے کہ جن بچوں کو اس پابندی سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا وہ، وہ بچے تھے جو عورتوں کی پسِ پردہ چیزوں سے واقف نہیں تھے۔ لیکن پھر ایک ایسی عمر آتی ہے جو بلوغ کے قریب کی عمر ہے، لیکن بلوغ کی عمر نہیں۔ اس وقت بچے عام طور پر عورتوں کی پسِ پردہ باتوں سے دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور آج کے عریانی کے دور نے اور شرم وحیاء کے بندھن کمزور ہو جانے کے باعث اور بعض تعلیمی اداروں میں سیکس کو تعلیم کا حصہ بنا دینے نے بلوغ سے پہلے ہی بچوں کو بالغ کر دیا ہے۔ یورپ میں عام سکولوں کی رپورٹیں جو بلوغ سے پہلے بچوں اور بچیوں کے بارے میں شائع ہوتی رہتی ہیں کا ذکر کرنا تو شرم کے باعث ممکن نہیں لیکن ان سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ بلوغ سے پہلے ہی باخبری کی عمر شروع ہو جاتی ہے، اس وقت ان پر استیذ ان کی قید عائد ہو جانی چاہئے۔ اور اس آیتِ کریمہ میں بلوغ کے لفظ کی بجائے حلم کا لفظ لا کر شاید اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

ان دونوں آیتوں کے بعد یہ وضاحت کہ یہ آیتیں احکام کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ اشارہ کر دینے کیلئے کافی ہیں کہ یہ توضیحی آیات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت پر مبنی ہونے کی وجہ سے بندوں کی تربیت واصلاح کیلئے جس حکمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جس میں ترتیب اور تدریج تو بالکل سامنے کی باتیں ہیں، اس کے علاوہ کیا حکمتیں مضمر ہیں، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

(اور بوڑھی خانہ نشین عورتیں جو اب نکاح کی آرزو نہیں رکھتی ہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ اگر وہ اپنے دوپٹے اتار دیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں، اور ان کا اس سے بھی اجتناب کرنا ان کیلئے بہتر ہے، اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۶۰)

Marfat.com

بوڑھی عورتوں کیلئے ایک رخصت

قَوَاعِدُ، جمع ہے اس کا واحد قاعد ہے، قاعدۃ نہیں ہے۔ تاء تانیث کی اس لئے حذف کی گئی ہے تاکہ پتہ چلے کہ یہ بیٹھنا بڑھاپے کی وجہ سے ہے، شکم میں بچے کے ہونے کی وجہ سے نہیں۔ اسی لئے ایسی عورت کو امراۃ حامل کہتے ہیں حاملۃ نہیں کہتے۔ قواعد سے مراد وہ عورتیں ہیں جو نکاح کی عمر سے گزر چکی ہوں اور اس سے مراد وہ عمر ہے جس میں عورت بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ ایسی عورتوں کیلئے اجازت ہے کہ وہ اپنے کپڑے اتار دیں۔ اس سے مراد جسم کے سارے کپڑے نہیں، اس لئے کہ برہنہ ہونے کی اجازت تو عمر کے کسی حصے میں بھی نہیں۔ یہ درحقیقت اسی شرط میں کمی کی جارہی ہے جس کا آیت ۳۱ میں ذکر فرمایا گیا۔ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ”گھروں کے اندر غیر محرم کی موجودگی میں عورتوں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اپنی اوڑھنیوں کی اپنے سینے پر بکل مارلیا کریں۔ یعنی اپنے گریبان ڈھانک لیا کریں۔ اس حکم میں جس اوڑھنی اور دوپٹے کا ذکر کیا گیا، اسی کو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اتارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ بڑھاپے اور بڑی عمر کے باعث بعض دفعہ دوپٹے کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ وہ کسی دوسرے کیلئے فتنہ کا باعث نہیں بن سکتیں اور نہ خود کسی فتنہ میں مبتلا ہو سکتی ہیں، اس لئے انہیں مجبوری کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی لگائی گئی ہے۔ اس کیلئے قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ ”کہ وہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔“ تبرج کے معنی اظہارِ زینت کے ہیں۔ بارج اس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں، جس پر چھت نہ ہو۔ اس معنی میں عورت کیلئے یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مردوں کے سامنے اپنے حُسن اور اپنی آرائش کا اظہار کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بوڑھی عورت کو چادر اتار دینے کی اجازت اس وقت ہے جب اسے اچھے کپڑے پہننے، بن ٹھن کے رہنے کا شوق ختم ہو گیا ہو، اور اس کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن اگر بڑھاپے کے باوجود اپنے زیورات اور اپنی ثروت کی نمائش کا شوق ابھی تک اندر سے نہیں نکلا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک اس آگ میں چنگاریاں باقی ہیں۔ تو پھر اس کیلئے سر سے کپڑا اتارنے کی اجازت نہیں۔

اتنی احتیاطوں کے بعد بھی فرمایا کہ ایسی عمر رسیدہ خواتین کیلئے بھی بہتر یہ ہے کہ استعفاف اختیار کریں، یعنی وہ اپنے دوپٹے یا اپنی چادر کو اتارنا پسند نہ کریں، یہی ان کیلئے بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہی میں سراسر بھلائی ہے۔ ضرورت کے تحت بھی کسی جائز رعایت سے فائدہ اٹھانا اگر فتنہ کا باعث ہو سکتا ہو تو اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

ہماری آج کی خواتین جو ماشاء اللہ اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں وہ جس طرح کندھے پر دوپٹہ لٹکائے مردوں میں اٹھتی بیٹھتی اور گھومتی پھرتی ہیں اور سر پر دوپٹہ یا چادر لینا اور اپنے گریبان کو ڈھانکنا انہیں معیوب معلوم ہوتا ہے۔ کاش وہ، قرآنِ کریم کی ان آیات پر غور فرمائیں اور یہ کبھی نہ بھولیں کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں سمیع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ

Marfat.com

اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا
جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًاؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً
طَیِّبَةًؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۠ (۶۱)

(نہ نابینا پر کوئی تنگی ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے اور نہ مریض پر کوئی تنگی ہے اور نہ خود تمہارے اوپر کوئی تنگی ہے کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جس گھر کی چابیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے، تم پر کوئی حرج نہیں کہ کھاؤ اکٹھے ہو کر یا الگ الگ، بس یہ بات ہے کہ جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت والی اور پاکیزہ دعا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۶۱)

گزشتہ احکام سے متعلق بعض توضیحی ہدایات

یہ آیت بھی توضیحی آیات میں سے ہے۔ گزشتہ آیات میں گھروں میں داخل ہونے اور گھر کے اندر نامحرموں کے سامنے پردے وغیرہ کے جو احکام دیئے گئے اور بعض پابندیاں عائد کی گئیں اس سے صحابہ کرامؓ میں مختلف احساسات نے جنم لیا۔ ایک احساس تو یہ تھا کہ اسلام شاید سوشل آزادیوں کو محدود کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ بات پسند نہیں کہ اپنے عزیزوں، قریبوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں کوئی شخص آزادی اور بے تکلفی سے آئے جائے۔ چنانچہ اس احساس کے تحت لوگوں نے ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا کم کر دیا اور بہت سے معذور اور نادار لوگ جو اپنی مجبوری کے باعث اپنے خوشحال عزیزوں کے یہاں پڑے رہتے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ اب ہمیں اپنے رویئے میں تبدیلی کرنا ہوگی اور اہلِ خانہ نے بھی محسوس کیا۔ اہلِ عرب چونکہ جاہلیت کے زمانے میں غیر محدود آزادی اور بے قید زندگی کے عادی تھے اس لئے انہیں ان پابندیوں کو قبول کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن اسلام سے گہری محبت نے انہیں نہ صرف اس بات پر آمادہ کیا بلکہ بعض احساسات کو بھی پیدا کیا جن میں سے ایک احساس یہ تھا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس کے ازالے کیلئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

آیت کی تفسیر میں مختلف آراء اور ان میں تطبیق

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات میں چونکہ حقوق العباد کی رعایت پر بہت زور دیا ہے اور ساتھ ہی حلال رزق کے حوالے سے بہت تاکید کی ہے اور یہاں تک فرمایا ہے کہ ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔ تو صحابہ کرامؓ جو اسلامی تعلیمات سے گہرا اثر قبول کر چکے تھے۔ ایک دوسرے کے مال کھانے کے بارے میں سخت احتیاط برتنے لگے اور حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حس انتہائی نازک ہو گئی۔ چنانچہ اس خیال سے انہوں نے اپنے قریبی عزیزوں کے یہاں آنے جانے میں بھی کمی کر دی اور اگر کبھی جاتے تو اس وقت تک کسی چیز کے کھانے سے گریز کرتے تھے جب تک نہایت قانونی پابندیوں کے ساتھ انہیں اس کی اجازت کا یقین نہیں ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اسی حوالے سے امام بغوی نے حضرت سعید بن جبیر اور ضحاک جیسے آئمہ تفسیر سے نقل کیا ہے کہ دنیا کا

Marfat.com

معمول یہ ہے کہ وہ عام طور پر معذور لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے گھن کرتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں جو لوگ معذور تھے یعنی کوئی لنگڑا تھا، بیمار تھا یا اندھا تھا اس نے محسوس کیا کہ میں اگر کسی صحت مند آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا تو معمول کے تنفر کے باعث اسے یقیناً مجھ سے تکلیف ہوگی۔ اس لئے مجھے تندرست آدمیوں کے ساتھ کھانا کھانے سے گریز کرنا چاہئے۔ اور بعض معذور لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ جب چند آدمی آپس میں مل کر کھانا کھاتے ہیں تو عدل و مروت کا تقاضا یہ ہے کہ کھانے میں شریک کوئی فرد دوسرے سے زیادہ نہ کھائے کیونکہ کھانے میں حصہ سب کا برابر ہوتا ہے۔ نابینا آدمی کو اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ میں نے دوسروں سے کم کھایا ہے یا زیادہ۔ ہوسکتا ہے وہ زیادہ کھا لے۔ لنگڑے نے محسوس کیا کہ میں عام تندرست لوگوں کی طرح بیٹھ نہیں سکتا، میں بیٹھنے میں دو آدمیوں کی جگہ گھیر لیتا ہوں، کھانے میں دوسروں کے ساتھ بیٹھوں گا تو ممکن ہے انہیں تنگی اور تکلیف پیش آئے۔ اس لئے بہتر ہے کہ دوسروں کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے سے احتیاط کی جائے حضرت سعید بن مسیبؓ کہتے ہیں کہ مسلمان جب کسی جہاد یا غزوہ کیلئے جاتے تو اپنے گھروں کی کنجیاں ان معذوروں کے سپرد کر دیتے تھے اور یہ کہہ دیتے تھے کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ تم لوگ کھا پی سکتے ہو۔ مگر یہ لوگ اس احتیاط کی بنا پر ان کے گھروں سے کچھ نہ کھاتے تھے کہ شاید ان کی منشاء کی پابندی نہ ہوسکے۔ دوستوں کے گھروں سے کھانا ہمیشہ لوگوں میں مروج رہا ہے لیکن مسلمان اس گہرے احساس کے باعث اس میں بھی احتیاط برتنے لگے۔ حارث بن عمرو کسی جہاد میں جاتے ہوئے اپنے دوست مالک بن زید کو اپنے گھر اور گھر والوں کی نگرانی سپرد کر گئے۔ جب حارث واپس آئے تو دیکھا کہ مالک بن زید بہت کمزور ہورہے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے دوست کی غیر حاضری میں کچھ کھانا مناسب نہیں سمجھا اس لئے مسلسل فاقوں نے ان کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ ان تمام احساسات کی اصلاح کیلئے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

علامہ قرطبی کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا ایک حصہ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص نابینا، لنگڑا اور بیمار ہو تو اس پر ایسے افعال کا ادا کرنا ضروری نہیں جس سے اسے تکلیف ہوتی ہو۔ اس لئے جمعہ جہاد وغیرہ سے یہ لوگ مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔

آیت کا دوسرا حصہ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ سے شروع ہوتا ہے جس میں بتایا جارہا ہے کہ وہ رشتہ داریا احباب جن سے ایسی بے تکلفی ہو کہ اگر ان کے ہاں سے کھایا جائے تو ان کیلئے فرحت اور عزت کا موجب ہو۔ تو ایسے قریبی رشتہ داروں اور بے تکلف دوستوں کے ہاں سے کھا لینا مباح ہے۔ لیکن اگر وہ رشتہ داریا دوست اس چیز کو ناپسند کریں تو پھر بلا اجازت ان کے ہاں سے کچھ کھانا درست نہیں۔ جیسے متعدد احادیث سے واضح ہے۔ یہ لکھنے کے بعد علامہ قرطبی فرماتے ہیں فهذا معنى صحيح وتفسير بين مفيد يعضده الشرع والعقل ''یعنی آیت کا یہی معنی صحیح ہے اور آیت کی یہ تفسیر واضح اور مفید ہے، شریعت اور عقل دونوں اس کی تائید کرتے ہیں۔''

قرابتداروں اور احباب کے گھروں سے کھانے کا ذکر کرنے سے پہلے اپنے گھروں سے کھانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا۔

ہم نے آیت کی تفسیر میں جو مختلف آراء ذکر کی ہیں ان میں باہمی کوئی تضاد نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ میں ایسے تمام احساسات پیدا ہوئے جو ان کے تقویٰ اور تدین پر دلالت کرتے ہیں اور ان کے اس احساس کی غمازی کرتے ہیں جو قرآنی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کے فیضِ تربیت نے ان کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔ یہ آیت ان احساسات کی اصلاح کیلئے نازل ہوئی جس کا حاصل صرف یہ ہے کہ بعض احتیاطی پابندیوں کے عائد کرنے سے نہ تو یہ مقصود ہے کہ اندھے لنگڑے اور مریض اپنے تعلق کے لوگوں کے سہارے سے محروم ہوجائیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ اعزہ و اقرباء اور دوستوں کے ساتھ معاشرتی روابط منقطع ہوجائیں۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے میل جول رکھنا چاہئے، انفرادی

Marfat.com

اور اجتماعی تقریبات منعقد ہونی چاہئیں۔ البتہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں داخل ہوں تو سلام کر کے داخل ہوں اور گھروں کے اندر جو لوگ بیٹھے ہوں، انہیں بھی سلام کہیں۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مبارک اور پاکیزہ تحیت اور سلام کا طریقہ بھی ہے اور دعا بھی۔ اس سے باہمی تعلقات کی خوشگواری میں اضافہ ہوتا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ تم اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ، کوئی حرج کی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس سے عربوں میں بعض معمولات کی اصلاح مقصود ہے۔ بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ وہ لوگ اکٹھے بیٹھ کر کھانا معیوب سمجھتے تھے اور ہندوؤں کی طرح ہر شخص اپنی الگ کٹوری لے کر بیٹھتا اور کھانا کھاتا تھا۔ لیکن بعض قبیلے ایسے تھے جو تنہا کھانے کو خلاف مروت سمجھتے تھے۔ سفر میں بھی ہوتے تو کسی مہمان کو تلاش کرتے تا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں میں اعتدال پیدا کرنے کی ترغیب دی کہ نہ تنہا کھانا کوئی فضیلت کی بات ہے اور نہ کسی مہمان کے ساتھ بیٹھنا فرض اور واجب ہے۔ جس طرح کی صورتحال ہو اس کے مطابق طریقہ اختیار کرنا اسلام کا تقاضا ہے۔ مہمانوں کی موجودگی میں الگ بیٹھنا یقیناً معیوب ہے۔ اور کوئی مہمان نہ ہو تو کھانا چھوڑ دینا بھی برا ہے۔ اس لئے اصل چیز احساس کی اصلاح ہے جس کی یہاں فکر کی گئی ہے۔

آخری جملے میں ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو چونکہ ان پابندیوں کی وجہ سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں جو یقیناً نارسائی فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے تمہیں ان پابندیوں پر غور وفکر کرنا چاہئے تم خود محسوس کرو گے کہ معاشرتی ہمواری اور اصلاح کیلئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ
أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ
شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ
غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٢﴾ لَّا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ
قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ
عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ
أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ

Marfat.com

رکوع: ۹۔ (مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتے ہیں اور جب کسی اجتماعی موقع کیلئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس وقت تک وہاں سے نہیں جاتے جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنی کسی ضرورت سے اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں اجازت دے دیا کریں، اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کریں، بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۶۲) اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھو، اللہ تم میں سے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، پس وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی آزمائش آجائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آ پکڑے۔ ۶۳) خبردار! اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، تم جس حال پر ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے اور جس دن یہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انہیں ان کے کرتوتوں سے باخبر کرے گا اور اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۶۴)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۲

(مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتے ہیں اور جب کسی اجتماعی موقع کیلئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس وقت تک وہاں سے نہیں جاتے جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنی کسی ضرورت سے اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں اجازت دے دیا کریں، اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کریں، بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔ ۶۲)

منافقین کو تنبیہ

سورۃ النور کے نزول کا بظاہر سبب منافقین کا اٹھایا ہوا وہ فتنہ تھا جو واقعۂ اِفک کے نام سے معروف ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں پروردگار نے جس طرح اخلاقی اصلاح کیلئے قانونی احکام دیئے ہیں، اسی طرح ایسے ہدایات بھی جاری فرمائیں جس سے منافقین کی اصلاح بھی پیشِ نظر رہی اور ایمان کے مقابلے میں نفاق کے نقصانات کا بھی ذکر ہوا اور بعض پہلوؤں سے منافقین کو تنبیہ بھی کی گئی۔ اس تمام تفصیل سے یہ بات اچھی طرح مبرہن ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی نظم چاہے اس کا تعلق نظریئے سے ہو، معاشرت سے ہو یا سیاست و ریاست سے ہو اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتا جب تک اس میں نظریاتی منافقین موجود ہوں۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر سورۃ کو ختم کرتے ہوئے پروردگار نے منافقت کی مذمت فرمائی اور حقیقی ایمان اور سچے مومنوں کی حقیقت واشگاف فرمائی۔

ہمارے آئمہ تفسیر کہتے ہیں کہ یہ آیت غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی جبکہ کافر عرب کی متحدہ طاقت نے مسلمانوں کی نوزائیدہ مملکت اور مرکزِ اسلام کو ختم کرنے کے ارادے سے مدینہ منورہ پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے پاس افرادی قوت بہت محدود اور حملہ آور بہت بڑی تعداد میں تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس حملے سے بچاؤ اور مدینے کے دفاع کیلئے خندق کھودنے کا حکم دیا۔

Marfat.com

امر جامع سے مراد

امر جامع سے مراد ہر وہ کام ہے جس کیلئے آنحضرت ﷺ مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم ارشاد فرمائیں اور آپ کے بعد ہر اسلامی حکومت کا امیر جس کیلئے مسلمانوں کو اکٹھا ہونے اور مل کر کام کرنے کا حکم دے۔ لیکن یہاں امر جامع سے مراد غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا۔ اس موقع پر منافقین کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ مختلف طریقوں اور بہانوں سے آنحضرت ﷺ سے رخصت حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اور بیہقی اور ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق ایسے لوگ بھی تھے جو اولاً تو آنے میں سستی کرتے اور اگر آجاتے تو معمولی سا کام دکھانے کیلئے کرتے اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتے تھے جبکہ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ صبح سے لے کر شام تک اس کام میں مصروف رہتے اور آنحضرت ﷺ بھی بڑھ چڑھ کر اس کام میں ہاتھ بٹاتے۔ مسلمانوں کو کیسی ہی ضرورت پیش آتی، وہ کبھی آنحضرت ﷺ سے جانے کی اجازت طلب نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے آسانی سے اس آیت کریمہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقی مومن وہ ہیں جو کسی بھی اجتماعی کام میں اللہ تعالیٰ کے رسول کی اجازت کے بغیر جانے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ اور کبھی شدید ضرورت پیش آجائے آپؐ سے اجازت لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مزید ارشاد فرمایا کہ جو لوگ جانے کیلئے آپؐ کی اجازت کو لازمی سمجھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہیں۔

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عام مجلس میں اجازت لے کر جانے کی پابندی نہیں تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض صحابہ کرامؓ بدوں اجازت مجلس سے اٹھ کر چلے گئے اور آپؐ نے کبھی ناخوشی کا اظہار نہیں فرمایا۔ یہ الگ بات ہے کہ صحابہ حتی الامکان دین سیکھنے کی اہمیت کے پیشِ نظر آپؐ کے گرد ہجوم کیے رہتے تھے۔ لیکن استیذان کی بہرحال پابندی نہیں تھی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں عام مجلس کی بات نہیں ہو رہی بلکہ اس سے مراد وہ موقع ہے جب کسی امر جامع یعنی اجتماعی کام کیلئے آنحضرت ﷺ حاضری کا حکم دیں تو اس میں اس وقت تک حاضری ضروری تھی جب تک وہ کام ختم نہ ہو جاتا اور آنحضرت ﷺ جانے کی اجازت نہ دے دیتے۔

یہ بات بھی جاننا ضروری ہے اور میں نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے نہیں بلکہ مسلمانوں کا ہر امام و امیر جس کے قبضے میں زمامِ حکومت ہو، وہ جب کسی امر جامع کیلئے جمع ہونے کا حکم دے تو اس کی تعمیل واجب اور بغیر اجازت واپس جانا ناجائز ہے۔ (قرطبی، مظہری) البتہ یہ بات واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس کیلئے یہ حکم زیادہ مؤکد ہے۔ اور اس کی مخالفت کفر اور بدبختی ہے۔

آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے مزید ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص آپؐ سے اپنی کوئی ضرورت بتا کر جانے کی اجازت طلب کرے تو آپؐ کو اختیار ہے کہ اگر آپؐ اس کی ضرورت کی اہمیت کو محسوس کریں تو اسے اجازت دے دیں۔ اور اگر آپؐ نہ چاہیں تو اجازت نہ دیں۔ البتہ جسے آپؐ اجازت دیں اس کیلئے بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں۔ کیونکہ ذاتی ضرورت کو اجتماعی کام پر ترجیح دینا بہرحال ایک کمزوری ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ ہو سکتا ہے اجازت لینے والے کے دل میں اس درجے کا اخلاص نہ ہو جو حقیقی ایمان کیلئے ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گناہ ہیں اس لئے آپؐ اس کی مغفرت کی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ غفور و رحیم ہے وہ آپؐ کی دعا سے اس کی کمزوریوں کو معاف فرمائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اسے ایسی استقامت عطا فرمائے جس کی وجہ سے دوبارہ ایسی کمزوری کا ظہور نہ ہو سکے۔

Marfat.com

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ
اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

(اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھو، اللہ تم میں سے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں، پس وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی آزمائش آ جائے یا ان کو ایک دردناک عذاب آ پکڑے۔ ۶۳)

دعاء الرسول سے مراد اور اس کی اہمیت

اجتماعی امر میں آنحضرت ﷺ کے حکم کی اہمیت کو بیان کرنے کے بعد اب عام معمول کی زندگی اور آپ ؐ کی عام مجالس میں آپ ؐ کے حکم کی اہمیت کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ سب سے پہلی بات جو فرمائی گئی ہے اگرچہ اس کے الفاظ عام ہیں لیکن قرینہ دلیل ہے کہ کلام کا رخ منافقین ہی کی طرف ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے بلاوے کو اس طرح نہ سمجھو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ یہاں بلاوے کیلئے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے تین معنی ہو سکتے ہیں اور اس آیت میں تینوں ہی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

1- دعاء الرسول سے مراد، رسول اللہ ﷺ کا لوگوں کو بلانا ہے۔ اس سورۃ میں اضافت الی الفاعل ہوگی اور مفہوم یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ جب تمہیں بلائیں تو اس کو اس طرح نہ سمجھنا جیسے تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ کہ جس کو بلایا جاتا ہے اسے اختیار ہوتا ہے چاہے وہ آئے نہ آئے۔ بلانے پر نہ اس کا آنا فرض ہوتا ہے اور نہ جانے کیلئے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا بلانا اس سے بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ؐ کے بلانے پر لبیک کہنا، اس کی فوری تعمیل کرنا فرض اور واجب ہے اور اس میں تساہل کرنا فسق ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے۔ حضرت اُبی ابن کعب ؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص نماز میں مشغول ہو اور حضور ؐ اسے بلائیں تو نماز توڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

2- اور دوسرا اس کا معنی ہے رسول کو پکارنا اور بلانا۔ اس صورت میں اضافت الی المفعول ہوگی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ سے ابن کثیر اور قرطبی نے یہی نقل کیا ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم جب رسول اللہ ﷺ کو پکارو یا بلاؤ یا مخاطب کرو تو عام لوگوں کی طرح آپ ؐ کا نام لے کر یا محمدؐ نہ کہو، یہ بے ادبی ہے۔ بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ وغیرہ الفاظ سے آپ ؐ کو پکارا جائے۔ کیونکہ آپ ؐ کی تعظیم و توقیر مسلمانوں پر واجب ہے۔ اور ایسی ہر چیز جو آپ ؐ کو تکلیف دیتی اور ادب کے خلاف ہو اس کا ارتکاب حرام ہے۔ سورۃ الحجرات میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ ؐ کے سامنے آواز کو پست رکھو۔ جس طرح آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے ہو، آنحضرت ﷺ سے مت کرو۔ آپ ؐ اگر گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر سے آواز دے کر مت بلاؤ۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ آج کل بعض شعراء نے اپنے اشعار میں یا محمدؐ کا استعمال عام کر دیا ہے اور بعض جاہل محبت کے جوش میں آپ ؐ کو یا محمدؐ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اسے اظہارِ عشق سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔

Marfat.com

3- دعا کو دعا ہی کے معنوں میں لیا جائے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو۔ اگر وہ خوش ہو کر کسی کو دعا دیتے ہیں تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔ اور اگر وہ ناراض ہو کر بددعا دیتے ہیں تو اس سے بڑھ کر بدنصیبی کوئی نہیں۔

یہ تینوں مفہوم اپنے اپنے محل کے لحاظ سے یقیناً صحیح ہیں۔ اور بعض حوالوں سے ان میں سے ہر ایک مطلب مراد لیا جا سکتا ہے۔ لیکن سیاقِ کلام کا جہاں تک تقاضا ہے پہلا مفہوم اس سے زیادہ میل کھاتا ہے۔

اس کے بعد منافقین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کے بلانے اور آپؐ کے حکم کو اپنے نفاق کے باعث وہ اہمیت نہیں دی جو اس کی شان کا تقاضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اجتماعی کاموں میں بھی آنحضرت ﷺ کے دکھانے کیلئے وقتی طور پر حاضر ہو جاتے ہو اور پھر ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے وہاں سے کھسک جاتے ہو۔ اور تم یہ سمجھتے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے چونکہ دیکھا نہیں، اس لئے تمہاری اس حرکت سے کوئی واقف بھی نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات مخفی نہیں۔ وہ تو تمہاری ہر حرکت سے واقف ہے اور وہ جانتا ہے جس طرح تم وہاں سے کھسکتے ہو۔

تَسَلَّلَ ...... کے معنی چل دینے اور چپکے سے کھسک جانے کے ہیں۔ لِوَاذًا ...... کے معنی ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لیتے ہوئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ یہ حرکتیں کرتے اور اجتماعی مواقع سے کھسک جاتے ہیں یا کسی اور مخفی طریقے سے آنحضرت ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، کیونکہ علانیہ اور کھلم کھلا آنحضرت ﷺ کی مخالفت کرنا منافقین کیلئے ممکن نہ تھا۔ وہ سامنے ہمیشہ امنا و صدقنا کہتے تھے لیکن درپردہ منافق ہونے کی وجہ سے ان کا رویہ مخالفانہ ہوتا تھا۔ انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ آپؐ کی مخالفت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی فتنے میں مبتلا کر دے اور یا دردناک عذاب ان پر بھیج دے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ نے فتنے کا مطلب ظالموں کا تسلط لیا ہے، یعنی اگر مسلمان آنحضرت ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو اندیشہ ہے کہ ان پر ظالم و جابر حکمران مسلط کر دیئے جائیں۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک فتنہ سے مراد بیشمار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً آپس کے تفرقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظامِ جماعت میں پراگندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادی طاقت کے ٹوٹ جانے کے باعث بے وقار ہو جانا، ریاست کی سالمیت کا خطرے میں پڑ جانا وغیرہ۔ اور جہاں تک عذاب کا تعلق ہے، قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ تمہارے اوپر سے عذاب نازل کرے، یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، اور یا تمہارے اندر خانہ جنگی برپا کر دے۔ آج ہم اپنے انتشار، بدنظمی اور اسلام سے انحراف کے باعث ایسی ہی صورتحال کا سامنا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں رکھے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۭ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۶۴

(خبردار! اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، تم جس حال پر ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے اور جس دن یہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انہیں ان کے کرتوتوں سے باخبر کرے گا اور اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۶۴)

Marfat.com

روئے سخن چونکہ گزشتہ آیات میں بھی منافقین کی طرف رہا ہے اس لئے قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ منافقین ہی کو اس سورۃ میں آخری تنبیہ کی جارہی ہے، اور تنبیہ کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ انہیں سب سے پہلے خبردار کیا گیا ہے کہ تم نے آج تک جس طرح آنحضرت ﷺ کی دعوت اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو غیر سنجیدہ انداز میں لیا ہے اس سے تمہیں رک جانا چاہئے۔ اور جن قوتوں کے بھروسے پر تم نے بہت سے فتنے اٹھائے ہیں اور آئندہ بھی اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ قوتیں فریب نظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زمین و آسمان میں اصل حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور تمہیں یہ بھی غلط فہمی ہے کہ تم در پردہ جو کچھ کرتے ہو اسے کوئی جاننے والا نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم جس حال میں رہے ہو اور تم نے آج تک جو کچھ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہر بات اور ہر چیز سے واقف ہے اور وہ تمہارے مخفی ارادوں کو بھی جانتا ہے۔

تنبیہ کی قوت کو مزید مستحکم کرنے کیلئے ان سے منہ پھیرتے ہوئے بے التفاتی کو بھی اس میں شامل فرمادیا اور یہ تأثر دیا کہ تم سے براہِ راست خطاب تمہاری بھلائی کیلئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم اس عزت افزائی کے لائق نہیں ہو۔ اس لئے ان سے منہ پھیر کر فرمایا کہ جس دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اس کے حضور ان کی پیشی ہوگی اس روز انہیں ان کے ایک ایک عمل سے آگاہ کیا جائے گا۔ جس سے انہیں اندازہ ہوگا کہ ہم جو کارروائیاں ہزار پردوں میں چھپ کر کرتے رہے ہیں آج وہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور اس کا انجام بھی ہمیں نظر آرہا ہے۔ تب تمہیں یقین آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر تھا اور باخبر ہے۔ لیکن اس وقت یہ علم اور یقین تمہارے کام نہیں آئے گا کیونکہ اب چڑیاں کھیت چگ چکی ہوں گی اور تم دارالعمل سے دارالجزاء میں پہنچ کر جزاء کا سامنا کررہے ہوگے۔ شاعر نے شاید اسی تأثر کو نمایاں کرتے ہوئے کہا تھا:

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ

(۲۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الفرقان ہے جو اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ الفرقان کا لفظ چونکہ اپنے اندر بڑی معنوی جامعیت رکھتا ہے اور پھر اس کے مفہوم کی اس سورۃ کے مضامین سے قریبی مناسبت بھی ہے۔ اس لئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ سورۃ کا عنوان ہو۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ سورۃ کا عنوان نہیں بلکہ اس کا نام ہے جو صرف علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس میں ۶ رکوع ۷۷ آیتیں اور ۸۹۲ کلمات، ۳ ہزار ۷۰۳ حروف ہیں۔ اس کے اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول اور سورۃ المومنون کا زمانۂ نزول قریب قریب ہے۔ ابنِ جریر اور امام رازی نے ضحاک بن مزاحم اور مقاتل بن سلیمان کی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ سورۃ، سورۃ النساء سے ۸ سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کا زمانۂ نزول مکی زندگی کا دورِ متوسط قرار پاتا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورۃ میں مکی سورتوں کی طرح اسلامی دعوت کے تمام ادوار یعنی دعوت، ہجرت اور جہاد اور تمام بنیادی موضوعات یعنی توحید، رسالت اور معاد زیرِ بحث آئے ہیں۔ البتہ اسلوب، انداز اور مواد مختلف ہے۔ اس سورۃ کا بنیادی مضمون مخالفین کے شبہات اور اعتراضات ہیں جو قرآن اور پیغمبر علیہ السلام کیخلاف اٹھائے گئے۔ اس سورۃ میں انہیں نقل کر کے ان کا جواب دیا گیا۔ اور ساتھ ہی اعتراض وانکار کے اصل محرکات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔

سورۃ کی پہلی آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت مبارک ہستی ہے۔ اس کے فیضان کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی رحمت اور برکت بے پایاں ہے۔ یوں تو اس کی ہر نعمت قدر و قیمت میں بے مثال ہے لیکن اس کی وہ نعمت جو اس کے فیضان کا سب سے بڑا ثمر ہے وہ قرآنِ کریم ہے۔ چنانچہ اس کو نازل فرما کر اس بے پایاں برکت والی ہستی نے انسانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ پھر قرآنِ کریم پر منکرین جو کچھ اعتراض کرتے تھے اور جس طرح اس کو افترا اور سازش قرار دے رہے تھے اور قرآنِ کریم سے لوگوں کو برگشتہ اور بدگمان کرنے کیلئے کوشاں تھے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

اس کے بعد کی آیات میں مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا اور اس مخالفت کے پسِ پردہ محرکات کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا۔ اور دعوتِ حق سے منہ موڑنے والوں کے برے نتائج بھی صاف صاف بیان فرمائے گئے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد کی آیات میں ان قوموں کی تاریخ اجمال کے ساتھ بیان کی گئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور اس کے ضمن میں نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام کو صبر واستقامت کی تلقین ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ اس کتاب کی تکذیب کر رہے ہیں وہ چوپایوں سے بھی گئے گزرے ہیں، انہیں صرف اپنی خواہشات کے اتباع کے سوا کوئی بات راس نہیں آتی۔ اس لئے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا کام صرف یہ ہے کہ ان پر حجت تمام کردیں۔ وہ لوگ اس انجام سے دوچار ہو کے رہیں گے جو ان کیلئے مقدر ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم کی دعوت کے اساسی مسائل، یعنی توحید اور معاد کے اثبات میں آفاق کے بعض دلائل بیان فرمائے گئے۔ اور آنحضرت ﷺ کو تلقین کی گئی ہے کہ آپؐ مخالفین کے مطالبۂ معجزات کی پرواہ نہ کریں اور پھر وہ باتیں واضح کی گئی ہیں جو اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں۔

آخری رکوع میں سورۃ المومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اخلاقی خوبیوں کا نقشہ کھینچ کر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اس سیرت وکردار کے ہیں وہ لوگ جو آنحضرت ﷺ کی تعلیم سے تیار ہوئے اور آئندہ بھی ایسے ہی مزید لوگ تیار ہوتے رہیں گے۔ اور دوسری طرف وہ معاشرہ اور وہ سوسائٹی ہے جو جزیرۂ عرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نمونۂ اخلاق سے عرب کا ہر فرد آگاہ ہے۔ غیر ملفوظ انداز میں یہ سوال ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ تم خود فیصلہ کرو کہ انسانیت کس میں دکھائی دیتی ہے اور انسانوں کی بھلائی کیلئے کس طرح کے افراد درکار ہیں اور وہ کون سا نمونۂ اخلاق ہے جس کی بنیاد پر ایک صالح سوسائٹی تیار ہوسکتی ہے۔ اور آج بھی یہی سوال آج کی دنیا کے سامنے بھی موجود ہے۔ اہلِ عرب اپنے سارے بگاڑ کے باوجود ۲۳ سالہ کشمکش میں اس سوال کے صحیح جواب تک پہنچ گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حقیر اقلیت کے سوا ساری قوم اسلام کی آغوش میں آگئی اور پھر انہیں کی کوششوں سے اہلِ دنیا کو وہ عظیم نعمت میسر آئی جس کا نام اسلام ہے۔ لیکن اے کاش! آج یہ دنیا بھی اس پیغام کو سمجھے اور اس پر غور کرے۔

اس سورۃ کی آخری آیت میں متمردینِ قریش کو اور آج کی دنیا کو بھی یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہاری طرف ہم نے جو اپنا آخری رسول بھیجا ہے اور قرآنِ کریم جیسی کتاب اتاری ہے اور تمہیں اس حد تک اہمیت دی گئی ہے کہ تم اس تعلیم ودعوت کا ہدف بنائے گئے ہو۔ تو اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ تمہارے بغیر اللہ تعالیٰ کا کوئی کام رکا ہوا ہے اور اگر تم راہِ راست پر نہ آئے تو کائنات کا نظام بگڑ جائے گا، بلکہ مقصود اس سلسلے میں تمہاری صلاح وفلاح ہے۔ اب اگر تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر کرنے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو کہ وہ چیز تمہیں لازماً پیش آ کے رہے گی جو اس ناقدری کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ قریش تو اس کی قدر کر کے ناقدری کے نتیجے سے بچ گئے۔ لیکن آج یہ سوال ہمارے اور اس دنیا کے سامنے ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۷۷	سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ (۲۵)	رُكُوْعَاتُهَا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ ﴿۱﴾
الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ
لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾
وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَ
لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً
وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ
وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿۴﴾ وَ
قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ
اَصِيْلًا ﴿۵﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۶﴾ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ
الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ
مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ
قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا

Marfat.com

لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا ۹ ع

رکوع: ۱۔ (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ وہ اہلِ عالم کیلئے ہوشیار کر دینے والا بنے۔ ۱) وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی اور جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ ۲) اور لوگوں نے اس کے سوا ایسے معبود بنالئے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو خود اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، نہ ان کو موت پر کوئی اختیار ہے نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر۔ ۳) اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ یہ (قرآنِ کریم) محض جھوٹ ہے جس کو اس شخص نے گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے، بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ ۴) اور کہتے ہیں یہ پہلے لوگوں کے فسانے ہیں جو اس شخص نے کسی سے لکھوالئے ہیں اور وہ صبح و شام اس کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ ۵) ان سے کہہ دیجئے کہ اس کو اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہے، واقعی وہ بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۶) اور وہ کہتے ہیں کہ کیا ہے اس رسول کو جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا۔ ۷) یا اس کیلئے کوئی خزانہ اتارا جاتا، یا اس کیلئے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ اپنی معاش حاصل کرتا اور ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ ۸) دیکھئے وہ آپ پر کیسی کیسی پھبتیاں چست کر رہے ہیں، ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔ ۹)

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ ۝۱

(بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ وہ اہلِ عالم کیلئے ہوشیار کر دینے والا بنے۔ ۱)

تبارک کا معنی و مفہوم

اس آیت میں متعدد الفاظ تشریح طلب ہیں۔ آیت کا سب سے پہلا لفظ تَبٰرَکَ ایسا وسیع المعنی ہے جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار، ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے۔ اس کا مادہ ب ر ک ہے۔ اس سے دو مصدر مستعمل ہیں (۱) بَـرَکَۃٌ (۲) بُـرُوْک برکت کے مفہوم میں رفعت و عظمت، افزائش اور فراوانی کے تصورات شامل ہیں۔ اور بُـرُوْک میں ثبات، بقا اور لزوم کا تصور پایا جاتا ہے۔ پھر جب اس مصدر سے تفاعل کا صیغہ تَبٰرَکَ بنایا جاتا ہے تو اس میں باب تفاعل کی خصوصیت مبالغہ اور اظہارِ کمال بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس

Marfat.com

صورت میں اس کا مطلب یہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو رفیع وعظیم ہے۔ وہ عظمتوں کا سرچشمہ ہے اور رفعتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ خیرات وحسنات اسی کے فیض سے وجود میں آتی ہیں۔ ہر چیز میں اضافہ اور کثرت اسی کی عنایت کا ثمر ہے۔ وہ ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ اپنی بزرگی اور عظمت میں سب پر فائق ہے۔ اور اپنی ذات وصفات اور افعال میں ہر ایک سے بالاتر ہے۔ اس کی ربوبیت اور فیضان بے مثال اور بینظیر ہے۔ اس کے کمالات کو کبھی زوال نہیں۔ اس کے بے مثال فیضان اور بے انتہا لطف وکرم کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بندے پر ایک ایسی کتاب اتاری جو حق وباطل کے درمیان امتیاز کیلئے حجتِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فرقان کا معنی ومفہوم

اس کتاب کیلئے اس آیت میں فرقان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرقان مصدر ہے ف ر ق اس کا مادہ ہے۔ یہ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اسمِ فاعل، یعنی فارق کے معنی میں۔ یعنی وہ کتاب فیصلہ کن حیثیت کی مالک، عدل وانصاف کا معیار، کھوٹے کھرے کی پرکھ کیلئے کسوٹی ہے۔ (۲) اسمِ مفعول، یعنی مفروق کے معنی میں۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ کتاب الگ الگ اجزاء پر مشتمل اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزاء پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ کتاب مختلف اوقات میں نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوئی ہے تاکہ اسے مختلف الخیال مزاجوں اور ناموافق طبیعتوں میں رسوخ کا موقع ملے اور اس کے اجزاء باہم مربوط ہونے کے باوجود اس قدر الگ الگ ہیں کہ ہر ایک اپنی جگہ دلیلِ قاطع اور ہر طرح کے ابہام اور الجھاؤ سے مبرا اور باہم دگر ایک ہی جسدِ حقیقت کے مختلف اعضاء ہیں۔ (۳) فرقان مبالغے کا صیغہ ہے۔ یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے گویا وہ خود ہی فرق بن کر رہ گیا ہے۔ جیسے عربی زبان میں زیدعادل کی بجائے زیدعدل کہتے ہیں جب زید عدل کرنے کی شہرت میں انتہا کو پہنچ جائے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب اپنی افادیت، اپنی حجیت، اپنی حقانیت اور اپنی قطعیت میں اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب بلکہ دنیا کا ذخیرۂ علم اس کے مقابلے میں کسی حیثیت کا مالک نہیں۔ سعدی نے ٹھیک کہا:

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اس نے جو احکام اور ہدایات دی ہیں، انہیں دیکھ اور برت کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح صحیح اور غلط اور حق اور باطل کو آخری حد تک نمایاں کر دیا گیا ہے۔ اور اس کی حکمت ایک ایسا خزانہ ہے کہ اس میں جب بھی تدبر کی نگاہ سے کوئی شخص محنت کرتا ہے تو اسے ہمیشہ نئے سے نئے موتی ہاتھ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بے پایاں فیضان ہے کہ اس نے ایسی عظیم کتاب جو انسانی قسمت سنوارنے کی ضمانت ہے انسانی ہدایت کیلئے نازل فرمائی۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس نعمت کی قدر اور اس کتاب کی روشنی میں اپنی گمراہیوں کی اصلاح کریں۔ وہ اگر چاہتا تو اس کتاب کی بجائے وہ اپنے رسول کو کسی تازیانہ عذاب سے مسلح کر کے بھیج سکتا تھا۔

عبدہ کا محل

اس کا مزید فیضان یہ ہے کہ اس نے اس فرقان کو اپنے بندے پر اتارا ہے۔ یہاں عبدہ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ کو اس لفظ سے یاد کرنا ایک خاص التفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں تک عبدیت کا تعلق ہے، دنیا کی ہر مخلوق بالخصوص سب انسان اللہ تعالیٰ کی عبدیت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو اس کا انکار کرتا ہے وہ اس کا بھی آقا اور مالک ہے اور وہ اس کا عبد ہے۔ لیکن عَبْدُہٗ میں صرف عبدیت کا اظہار نہیں بلکہ خصوصی تعلق اور التفات کا اظہار ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا:

عبد دیگر عَبْدُہٗ چیزے دگر

Marfat.com

یہاں اس التفات کا ایک خاص محل بھی ہے، وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کو تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں جن مخالفین کا سامنا تھا۔ وہ اگرچہ آپؐ کیلئے اجنبی نہ تھے۔ کسی کے ساتھ قبیلے کا تعلق تھا اور کسی کے ساتھ شہر کا۔ لیکن انہوں نے مخالفت میں ہر تعلق توڑ ڈالا۔ آگے قرآنِ کریم نے ان کے جو اعتراضات نقل کئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا انداز کس قدر تحقیر آمیز تھا۔ اور یہ رویہ ان کا صرف اس لئے تھا کہ وہ اپنی دولت مندی پر نازاں تھے اور اپنی مالی برتری کے گھمنڈ میں نبی کریم ﷺ کی دنیوی اسباب ووسائل سے بے تعلقی پر طنز وتشنیع کے تیر برساتے تھے۔ چنانچہ انہیں سنانے کیلئے کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جو کچھ تمہیں سنا رہے ہیں اس کی حیثیت فرقان کی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور آپؐ کی حیثیت عبدہ کی ہے۔ یعنی وہ ہمارے خاص بندے ہیں جن کا ہمسر اور ہم مرتبہ نہ کوئی پہلے گزرا ہے اور نہ کوئی آئندہ ہوگا اور نہ لمحۂ موجود میں ہے۔ وہ جس عظیم منصبی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں اس کیلئے انہیں درہم ودینار کے ٹھیکرے نہیں چاہئیں بلکہ کتاب وحکمت کی وہ دولت چاہیۓ جو ہم نے انہیں عطا کر دی ہے۔

انذار کا معنی ومفہوم

مزید فرمایا کہ حق وباطل میں فرق کرنے والی یہ کتاب ہم نے اپنے بندے پر اس لئے نازل کی ہے تاکہ وہ اہلِ عالم کو انذار کرنے والے بنیں۔ انذار کا معنی ہے، خبردار کرنا، متنبہ کرنا، غفلت اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرانا۔ انسان دنیا میں جن اسباب کے تحت اور جن نعمتوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے ان کے نفع وضرر کے پیمانوں کو بہت جلد اپنی عقل سے معلوم کر لیتا ہے اور انسانوں کے وضعی علوم شب وروز اسی خدمت میں جتے ہوئے ہیں۔ لیکن جو کام وہ اپنی عقل وخرد اور جستجو اور تجسس سے کرنے پر قادر نہیں، وہ یہ ہے کہ وہ کبھی یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ زندگی گزارنے کا وہ کون سا طریقہ اور وہ کون سا انداز ہے جس کے نتیجے میں عاقبت سنور سکتی اور اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ اور وہ کون کون سی برائیاں اور گمراہیاں ہیں جن کو اختیار کرنے سے قومیں اپنے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس لئے خبردار کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول آتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا وہ فیضانِ رحمت ہے جس سے وہ اپنے رسولوں کی معرفت انسانوں کو نوازتا ہے۔ دنیا میں جتنے رسول آئے وہ سب کسی ایک علاقے یا کسی ایک قوم کی طرف آئے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا کہ بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق وباطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تاکہ وہ اہلِ عالم کیلئے نذیر بنے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دعوت اور محمد ﷺ کی رسالت کسی ایک ملک کیلئے نہیں بلکہ پوری دنیا کیلئے ہے۔ اور اپنے ہی زمانے کیلئے نہیں بلکہ آنے والے تمام زمانوں کیلئے ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ اس مضمون کو بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ''اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' (الاعراف آیت ۱۵۸) سورہ سبا آیت ۲۸ میں ارشاد فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ''ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کیلئے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کے بھیجا ہے۔'' سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۷ میں ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ''اور ہم نے آپ کو تمام دنیا والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' اسی مضمون کو نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ ''میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّةً ''پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔'' (بخاری ومسلم) مزید فرمایا وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَآفَّةً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ ''میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر تمام نبی ختم کر دیئے گئے ہیں۔''

Marfat.com

الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝

(وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی اور جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ ۲)

قرآن کی حقیقت واہمیت

آنحضرت ﷺ اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کی حقیقت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب اس ذات کا کلام ہے اور اس نے اسے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے۔ ارض وسماء کی ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس لئے یہ کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ہم اس کتاب اور کتاب کے پیش کرنے والے سے کیسا ہی سلوک کریں ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اس کتاب کو کسی سائل کی درخواست نہ سمجھا جائے بلکہ وہ اس کائنات کے بادشاہِ حقیقی کا فرمان واجب الاذان ہے۔ دنیا میں اگر اس نے ڈھیل دی ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ انتقام لینے پر قادر نہیں۔ اس نے یہاں انسانوں کو مہلت دے رکھی ہے۔ لیکن وہ جب انتقام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

یہ بھی معلوم رہنا چاہئے کہ اس کا کسی سے کوئی نسلی تعلق نہیں۔ نہ اس نے کسی کو متبنیٰ بنایا۔ اس کی ذات یکتائے محض ہے کوئی اس کا ہم جنس نہیں اور کوئی خدائی خاندان نہیں ہے۔ اس لئے اگر کسی نے یہ سمجھ کر کسی کو خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے یا کسی خاندان میں خدائی خون تصور کر کے اس خاندان کے ایک ایک فرد کو دیوتا یا اوتار بنا رکھا ہے۔ یا کسی میں ایسی خصوصیات تسلیم کر لی گئی ہیں جو صفاتِ خداوندی ہیں تو یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں۔ ایسا کوئی تصور اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچا نہیں سکے گا۔ نہ اس نے اولاد بنائی ہے اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔ اس کی توحید و یکتائی کا حال تو یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر چیز کیلئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کی تقدیر مقرر کر دی ہے۔ یعنی اس نے ایک ایک چیز کیلئے صورت، جسامت، قوت واستعداد، اوصاف وخصائص، ذمہ داریاں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کا طریقہ، بقا کی مدت، عروج وارتقا کی حد اور دوسری وہ تمام تفصیلات مقرر کی ہیں جو اس چیز کی ذات سے متعلق ہیں۔ ہر مخلوق کا ایک محور ومدار مقرر کر دیا ہے۔ ہر ایک کی تگ وتاز کا ایک میدان مقرر کر دیا گیا ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی چیز اس کے ٹھہرائے ہوئے اندازہ سے سرِ مُو کم وبیش یا آگے پیچھے ہو سکے۔ ہوا اور بادل سب اس کے مقرر کئے ہوئے حدود کے پابند ہیں۔ سورج اور چاند ایک مخصوص محور ومدار کے ساتھ وابستہ اور اسی کے مقرر کئے ہوئے حدود وقیود کے پابند ہیں۔

والشمس تجری لمستقر لها ط ذلک تقدیر العزیز العلیم "اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے، یہ خدائے عزیز وعلیم کی منصوبہ بندی ہے۔" اور مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا وان من شی ء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم "اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں، لیکن ہم ان کو ایک خاص اندازے ہی کے ساتھ اتارتے ہیں۔"

Marfat.com

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

(اور لوگوں نے اس کے سوا ایسے معبود بنا لئے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو خود اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، نہ ان کو موت پر کوئی اختیار ہے نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد زندہ کرنے پر۔ ۳)

سابق مضمون کی مزید تشریح

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کبریائی اور یکتائی کو بیان فرمایا۔ لیکن اب اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ جن مخالفین سے نبی کریم ﷺ کو واسطہ پڑا ہے ان کی حماقت کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے واضح دلائل کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے کہ جو نہ صرف کسی چیز کو پیدا کر سکنے پر قادر نہیں بلکہ وہ خود خدا کی مخلوق ہیں۔ وہ چاہے جنات ہوں یا فرشتے یا ان کے مزعومہ شرکاء۔ اسی طرح وہ کسی کو نفع نقصان سے تو بہرہ ور کیا کریں گے خود اپنے کو بھی کسی نقصان سے بچانے یا کوئی نفع پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتے۔ نہ انہیں زندگی پر کوئی اختیار ہے اور نہ موت پر۔ اور نہ دوسری زندگی ان کے اختیار میں ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ ایسے بے بس فرضی معبودوں کے بل پر قرآن کے حقائق کو جھٹلانے کی نہ صرف جسارت کی جا رہی ہے بلکہ جو لوگ انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ان کا منہ نوچ لینا چاہتے ہیں۔ یہ تو حماقت اور سفاہت کی انتہا ہے جس کا کم از کم دنیا میں کوئی علاج نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿۴﴾ ۚ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۵﴾

(اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ یہ (قرآنِ کریم) محض جھوٹ ہے جس کو اس شخص نے گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے، بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ ۴) اور کہتے ہیں یہ پہلے لوگوں کے فسانے ہیں جو اس شخص نے کسی سے لکھوا لئے ہیں اور وہ صبح و شام اس کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ ۵)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ اکْتَتَبَهَا ...... اکْتَتَبَ فُلَانٌ کا مفہوم لغت میں یہ ہے سَاَلَ اَنْ يُّكْتَبَ لَهٗ ...... اس نے درخواست کی کہ اس کیلئے لکھ دیا جائے۔ تُمْلٰى ...... علیٰ کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ تلقیٰ علیه یا تقرء علیه کے مضمون پر متضمن ہے۔

قریش کے لیڈروں کے الزامات اور ان کا رد

ان آیات میں مخالفین کے وہ اقوال نقل کئے گئے ہیں جو وہ قرآن اور نبی کریم ﷺ سے لوگوں کو بدگمان کرنے کیلئے پھیلاتے رہتے تھے۔ جہاں تک قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت، زورِ بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا تعلق ہے اس کا انکار کرنے کی تو کسی میں ہمت نہ تھی۔ جو شخص سنتا تھا اس کلام کی عظمت کا اقرار کرتا تھا۔ لیکن اس کے توڑ کیلئے انہوں نے آنحضرت ﷺ کو شاعر کہنا شروع کر دیا تاکہ عوام کو یہ یقین دلائیں کہ اس کلام کی عظمت اس وجہ سے نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتا ہے۔ بلکہ اس کلام کے

Marfat.com

حُسن اور خوبی کی وجہ وہی ہے جو بڑے بڑے شعراء میں ہم دیکھتے ہیں۔ ان کیلئے اصل مسئلہ جو پریشان کن تھا وہ نبی کریم ﷺ کا دعویٰ رسالت اور قرآنِ کریم کے وحیِ الٰہی ہونے کا تھا۔ اب اگر وہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آپؐ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آپؐ پر وحی اترتی ہے تو پھر آپؐ کی دعوت کا انکار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ چنانچہ آپؐ کے دعویٰ رسالت اور قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کو غلط ثابت کرنے کیلئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (ﷺ) چونکہ خود بہت بڑے شاعر ہیں اور فصاحت و بلاغت اور حُسنِ بیان فطری طور پر آپؐ کے اندر موجود ہے اس لئے قرآنِ کریم کی صورت میں وہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے۔ اور وہ جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے تو وہ محض اپنی برتری کی دھونس جمانے کیلئے جھوٹ بولتے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر یہ ان کا اپنا کلام ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کی ذہنی اختراع ہے تو آخر چالیس سال کی عمر تک ان کی زندگی میں اس کا سراغ کیوں نہیں ملتا۔ اور مزید یہ بات کہ اس کام میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے ان میں کتنی ایسی باتیں ہیں جو گزشتہ انبیائے کرام، ان کی امتوں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں اور شریعتوں کے بارے میں ہیں۔ اور کتنے ایسے علمی محکمات ہیں جن تک آج بھی انسانی دماغ کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اور کتنے ایسے تاریخی محاکمات ہیں جن سے کتنی تاریخی اغلاط کی اصلاح ہوئی ہے اور کتنی فرسودہ باتوں کا ابطال ہوا ہے۔ اور پھر اس میں عالمِ الٰہیات، عالمِ آخرت اور عالمِ غیب کی کتنی ایسی باتیں ہیں جنہیں ایک پیغمبر کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ تو اگر محمد (ﷺ) پر وحی نازل نہیں ہوتی تو ان کا ذاتی مبلغِ علم تو وہی ہے جو باقی اہلِ مکہ اور اہلِ عرب کا ہے۔ بیشتر اہلِ عرب کی طرح انہوں نے آج تک کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا اور کوئی ایسا علمی ماحول انہیں میسر نہیں آیا جن سے وہ ایسی باتوں کو سیکھ سکتے۔ تو قریش نے اس کے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ دراصل محمد (ﷺ) کو کچھ ایسے لوگ میسر آ گئے ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں کے جاننے والے اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپؐ راتوں کو چھپ چھپ کر ان سے معلومات حاصل کرتے بلکہ ان سے لکھواتے اور پھر انہیں یاد کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر سوال اٹھا کہ ایسے نابغۂ روزگار لوگ کون ہیں جو اتنا عظیم علم و حکمت رکھتے ہیں۔ چنانچہ قریش نے اس پر کبھی کسی کا نام لیا کبھی کسی کا۔ کبھی عبید بن الحصر حبشی کاہن کا نام لیا۔ کبھی ابوفکیہ، یسار، عداس اور جبر کا نام لیا۔ یہ سب مختلف قبائل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس طرح سے انہوں نے آنحضرت ﷺ کے دعویٰ رسالت اور قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کو غلط ثابت کرنے کیلئے ایک ایسا مضبوط اعتراض اٹھایا اور اس میں جو جو لوگ شریک تھے باقاعدہ ان کے حوالے بھی دیئے۔ بظاہر نظر دیکھتے ہوئے اس اعتراض میں بڑی جان معلوم ہوتی ہے کیونکہ جب مجمع عام میں اس طرح کی بات کہی جائے اور ایک ایسی سازش کی خبر دی جائے جس کے ذرائع تک بتا دیئے جائیں تو یقیناً یہ بات دلوں کو لگتی ہے اور دماغ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم جس تبلیغ و دعوت کو نہایت اہمیت دے رہے تھے اس کی حیثیت تو ایک سازش سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسے وزنی اعتراض کے جواب میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ قرآنِ کریم اس کا دلائل سے جواب دیتا۔ لیکن اس اعتراض کا کوئی نوٹس لئے بغیر اس نے صرف یہ بات کہہ کر ختم کر دی کہ اشرافِ قریش اس بات میں شہرت رکھتے تھے کہ وہ جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں، بالخصوص اجتماعی جھوٹ جس کے ڈانڈے کسی سازش سے ملتے ہوں اس کا تصور بھی ان کے بارے میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ جو کچھ قریش کہہ رہے ہیں یہ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ صداقت پر ظلم اور صریح بے انصافی ہے۔ یہ لوگ جھوٹ کا ایک طوفان کھڑا کر رہے ہیں۔ صرف اتنی بات کہہ کر قرآنِ کریم نے ان کے تمام الزامات کو رد کر دیا ہے۔ قرآنِ کریم کا ان اعتراضات کو اس طرح حقارت سے رد کر دینا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس اعتراض میں جو وزن محسوس کر رہے ہیں، حقیقت میں اس میں وزن نہیں، بلکہ یہ سراسر لغو اور پوچ اعتراض ہے۔ کسی سنجیدہ کتاب میں

Marfat.com

اس کا نوٹس لینا بھی سنجیدگی اور متانت کیخلاف ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے اس دوٹوک اور مختصر جواب پر کسی نے آنحضرت ﷺ سے ان باتوں کا تفصیلی جواب طلب نہیں کیا اور نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں اس کی وجہ سے کوئی شک وشبہ پیدا ہوا۔ اور نہ مخالفین کو کبھی یہ کہنے کی ہمت ہوئی کہ ہمارے اعتراضات کا جواب محمد (ﷺ) نہیں دے سکے۔ لیکن جب ہم اپنے تئیں اس بات پر غور کرتے ہیں کہ آخر اس اعتراض کے لچر ہونے کی وجہ کیا تھی جس کی وجہ سے اس قرآنِ کریم نے اس کا جواب دینا پسند نہیں فرمایا۔ تو ہمیں اس کا جواب اس ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا تھا۔ اب ہم ایک ترتیب سے چند نکات کا ذکر کرتے ہیں جس سے اس اعتراض کی لغویت واضح ہو جائے گی۔

ا۔ آنحضرت ﷺ پر نبوت سے پہلے کی زندگی میں کبھی کسی نے جھوٹ کا الزام نہیں لگایا بلکہ آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر جب لوگوں سے استفسار کیا تو سب نے آپؐ کی صداقت کی بالاتفاق گواہی دی۔ تو اب جبکہ آپؐ کی عمر ڈھل رہی تھی اور معاملہ دنیا کا نہیں، عاقبت کا تھا اور بات اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کہی جا رہی تھی، اس میں کیسے امکان ہو سکتا تھا کہ آپؐ نعوذ باللہ جھوٹ کا ارتکاب کرتے۔

۲۔ آپ کی علمی اعانت کیلئے جن لوگوں کے نام لئے جا رہے تھے وہ سب آزاد کردہ غلام تھے۔ اور وہ انہیں قبیلوں اور انہیں افراد سے آزاد ہوئے تھے جو آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی غلام جس قبیلے سے آزاد ہوتا تھا اس کا لوا کا تعلق اس قبیلے سے رہتا تھا اور وہ اس سے آزاد ہو کر اجتماعی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ کیا کوئی عقل مند آدمی سوچ سکتا ہے کہ یہ آزاد ہونے والے غلام اچانک اتنے خوشحال اور طاقتور ہو گئے تھے کہ اپنے سابقہ آقاؤں کی پروا کئے بغیر نعوذ باللہ کسی سازش میں شریک ہو سکتے تھے۔

۳۔ اسلام دشمنی میں قریش نے شرافت کی ہر قدر کو پامال کر ڈالا تھا اور کسی کی عزت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھی۔ حضرت بلال کو تپتی ریت پر گھسیٹا جاتا اور حضرت خباب کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا تھا۔ لیکن یہ آزاد کردہ غلام جن کی وجہ سے بقول قریش سارا کاروبارِ نبوت چل رہا تھا کیا قریش کی دسترس سے باہر تھے، ان کیلئے کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان کے گھروں پر چھاپے مارتے بلکہ جب ان کے بقول محمد (ﷺ) ان کے ساتھ مل کر وہ کلام تیار کر رہے تھے جسے کلامِ خداوندی کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ اور وہ غلام مختلف کتابوں سے آپ کو مواد نکال کر اور ترجمہ کر کے دے رہے تھے۔ عین اس حالت میں چھاپہ مارتے اور سارا ذخیرہ برآمد کر کے عوام کے سامنے لے آتے اور انہیں دکھاتے کہ دیکھو یہ ہے وہ علمی سرمایہ جو فلاں فلاں کی مدد سے تیار ہو رہا ہے اور اس کے بل بوتے پر نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لیکن قریش کبھی ایسی کسی بات کیلئے تیار نہ ہوئے۔

۴۔ دنیا کا ہر ہوش مند آدمی جانتا ہے کہ جس کو کسی شخصیت کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس شخصیت کا تانا بانا اور اس کے تمام دعاوی کی بنیاد ایک سازش پر ہے اور فلاں فلاں لوگ اس سازش میں شریک رہے ہیں۔ تو وہ شخص ایسے شخص کے دعوؤں کو کبھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہے اور اگر وہ خود اس سازش میں شریک رہ چکا ہو تو پھر تو دور دور تک اس کا امکان نہیں کہ وہ دعویٰ کرنے والی شخصیت کی عظمت کا اسیر ہو جائے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کے نام لئے جا رہے ہیں وہ نہ صرف ایمان لائے بلکہ آنحضرت ﷺ کی محبت اور آپؐ کی عقیدت ہمیشہ ان کی زندگی کا سرمایہ بنی رہی۔

۵۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ کسی کی شخصیت بنانے، اس کی عظمت اجالنے اور اس کیلئے اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں پیش پیش ہوتے ہیں انہیں ہمیشہ اس شخصیت کا سب سے زیادہ قرب میسر ہوتا ہے اور اگر اقتدار مل جائے تو وہ اقتدار کا نمایاں

Marfat.com

ستون ہوتے ہیں۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا نام لیا جا رہا ہے وہ آنحضرت ﷺ کے جاں نثار صحابہ میں تو ضرور شامل ہیں لیکن نہ انہیں کوئی نمایاں مقام میسر ہے نہ وہ آنحضرت ﷺ کے دستِ راست بنے اور نہ آپؐ کے بعد ان میں سے کسی پر خلافت کی ذمہ داریاں ڈالی گئیں۔اور جنہیں امت میں عظیم مقام ملا اور امت نے سب سے زیادہ ان پر اعتماد کیا اور آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ جنہیں قرب نصیب ہوا ان کے بارے میں کبھی مخالفین نے بھی الزام نہ لگایا کہ وہ اس سازش میں شریک تھے یا انہیں اس کی خبر بھی تھی۔ہمارے نزدیک یہ ہیں بالکل پیش پا افتادہ حقائق جنہیں دیکھتے ہوئے اس بات کا ادراک کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے ان کے بظاہر وزنی اعتراض کا جواب دینا کیوں پسند نہیں فرمایا۔

یہ تو ان اعتراضات کی تفصیل اور ان کا تفصیلی رد تھا جس کا تعلق قریش اور اہلِ مکہ سے تھا۔لیکن آج کے مستشرقینِ مغرب قرآنِ کریم کے خلاف جو کچھ کہتے ہیں ان میں اور قریش میں قدرِ مشترک یعنی انکارِ نبوت تو موجود ہے لیکن جو الزام یہ لگاتے ہیں وہ آنحضرت ﷺ کے ہمعصر مخالفین نے کبھی نہیں لگایا تھا حالانکہ اس الزام کے مصادر کا جہاں تک تعلق ہے قریش براہِ راست ان سے آگاہ تھے۔اگر اس میں کوئی بھی حقیقت ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ الزام ضرور لگاتے۔مستشرقین کا کہنا یہ ہے کہ محمد (ﷺ) بچپن میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ ملک شام گئے تھے، وہاں آپ کی ملاقات بحیرہ راہب کے ساتھ ہوئی تھی۔قرآنِ کریم جن مضامین کو پیش کرتا ہے یہ تمام مضامین آپؐ نے اس راہب سے سیکھے تھے جبکہ وہ ملاقات اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو صرف ایک کھانے پر ہوئی تھی جس کا دورانیہ یقیناً گھنٹہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ پھر اس کے بعد پچیس سال کی عمر میں آپؐ نے جب تجارتی سفروں کا آغاز کیا تو ان سفروں کے دوران یقیناً آپؐ کی عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے ملاقاتیں رہی ہوں گی۔ان ملاقاتوں میں آپؐ نے یہ ساری معلومات حاصل کیں جبکہ یہ سفر آپؐ نے اکیلے نہیں کئے، قافلوں کے ساتھ کئے۔جہاں بھی آپؐ گئے قافلے کے ساتھ گئے۔اور کسی جگہ بھی اپنے ہم سفروں سے اجنبی شہر میں الگ ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔لیکن اس کے باوجود مستشرقین کے خیال میں ان چند ملاقاتوں اور ان اسفار میں آپؐ نے وہ تمام علوم حاصل کر لئے جو قرآنِ کریم میں پیش کئے گئے ہیں۔اور اس پر بھی عجیب بات یہ ہے کہ آپؐ کا پہلا سفر بچپن میں ہوا اور بعد کے چند سفر جوانی میں ہوئے لیکن چالیس سال کی عمر تک کسی شخص نے آپؐ کی زبان سے اس علم اور ہدایت سے متعلق ایک جملہ نہیں سنا۔چالیس سال کی عمر کے بعد یک لخت آپؐ کی زبان سے وہ سوتا پھوٹا جس نے علم اور ہدایت کی دنیا کو سیراب کر دیا۔حیرت کی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بچپن اور جوانی سے قریش سے بڑھ کر کون باخبر ہو سکتا تھا لیکن انہوں نے اس طرح کی کوئی بات کبھی آپؐ سے متعلق نہیں کہی۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مکے کے رہنے والے بھی اس بے سروپا بات کو قبول نہیں کریں گے۔چنانچہ وہ اپنی تمام تر جہالت اور بداخلاقی کے باوجود یہ سفید جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کر سکے۔لیکن ان کے بعد آنے والے مستشرقین کے نام سے ایسے بے حیا لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسی سفید جھوٹ کو علم اور تحقیق کے نام سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کے انکار کیلئے اس طرح بنا سنوار کے پیش کیا کہ یورپ آج تک ان کی سازش کی گرفت سے نکل نہیں سکا۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۶﴾

(ان سے کہہ دیجئے کہ اس کو اس نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہے، واقعی وہ بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۶)

Marfat.com

معترضین پر ایک لطیف طنز

نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ایسے لچر اور بے سروپا اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتمامِ حجت کیلئے آپ انہیں یہ بتادیں کہ قرآنِ کریم کی تصنیف انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ ایسا کارنامہ نہ کوئی عربی انجام دے سکتا ہے اور نہ کوئی عجمی۔ کیونکہ اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس وسیع علم پر موقوف ہے جس کا ادراک انسانی دسترس سے ماوراء ہے۔ اس لئے قریش نے جو مختلف لوگوں کے نام لئے ہیں ان بیچاروں کی کیا بساط ہے، ساری دنیا بھی اس علم وحکمت میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتی جو قرآنِ کریم کی سطر سطر سے مترشح ہوتی ہے۔ ایسی کتاب صرف پروردگار ہی نازل فرماسکتا ہے جو اس کائنات کے تمام بھیدوں سے واقف ہے اور اس کے ظاہر اور باطن اور آغاز وانجام ہر چیز سے آگاہ ہے۔ اس نے ماضی کے کتنے اوراق الٹ کر عبرتوں کا سامان کردیا ہے۔ اور حاضر کو زیرِ بحث لاکر انسانوں کی ذمہ داریاں واضح کردی ہیں اور مستقبل کے نتائج سے بھی پردہ اٹھادیا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ قریش جس طرح کے الزامات لگاتے ہیں اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ زمین پھٹ جائے اور آسمان سے ان پر آگ برسے۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں توبہ واصلاح کا موقع دینا چاہتا ہے، کیونکہ وہ نہایت رحیم وکریم اور جب بھی کوئی راہِ راست پر آجائے تو مغفرت فرمادینے والی ذات ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝

(اور وہ کہتے ہیں کہ کیا ہے اس رسول کو جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا۔ ۷) یا اس کیلئے کوئی خزانہ اتارا جاتا، یا اس کیلئے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ اپنی معاش حاصل کرتا اور ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ ۸)

قریش کے بعض مزید اعتراضات

اس آیتِ کریمہ میں قریش کے بعض اور اعتراضات کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ وہ صرف اعتراض ہی نہیں کرتے تھے بلکہ طنز اور تعریض کے تیر بھی چلاتے تھے۔ آیت کا پہلا لفظ اسی کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ وہ جب آنحضرت ﷺ کو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا دیکھتے تو وہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے کہ یہ طور اطوار تو عام انسانوں کے ہیں۔ رسول کو کھانے پینے اور ضروریات کی فراہمی سے کیا کام۔ وہ درحقیقت یہ سمجھتے تھے کہ بشر کبھی رسول نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے پاس فرشتوں کی فوج ظفر موج ہے۔ اس نے فرشتوں میں سے کسی کو رسول بنا کر کیوں نہ بھیج دیا۔

Marfat.com

چلئے اگر یہی منظور تھا کہ کسی بشر ہی کو رسول بنایا جائے تو پھر کم از کم یہ تو ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو بار بار لوگوں کو وارننگ دیتا اور اعلان کرتا کہ لوگو، یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، یہ جس چیز سے ڈرا رہے ہیں اس سے ڈرو، ورنہ میں تم پر عذاب کا کوڑا برساؤں گا۔

اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اپنے رسول کو معاشی احتیاجات سے ہی بے فکر رکھا ہوتا۔ اس پر کوئی خزانہ اتار دیا جاتا اور پھل کھانے کیلئے کوئی شاندار باغ دیا ہوتا۔ لیکن یہ کیسا رسول ہے جس کے ساتھ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں، ہماری طرح کا ایک عام آدمی اپنی معاش پیدا کرنے کا خود ذمہ دار، کوئی ہٹو بچو کہنے والا نہیں، نہ کوئی دولت وثروت ہمراہ اور نہ کوئی بڑا قطعۂ زمین جس میں سرو قامت درخت کھڑے ہوں اور رسیلے پھلوں سے لدے پودے بہار دے رہے ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو کم سے کم رسالت کے تقاضے ہیں اور جب ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو آخر اسے اللہ تعالیٰ کا رسول کیسے مانا جاسکتا ہے۔ لیکن تم نے ان تمام باتوں کو نظرانداز کر کے ایک تہی دست شخص کو اگر رسول مان کر اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا ہے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ تم ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو، یعنی تم اس کے دماغی اختلال یا اس کی آسیب زدگی اور یا جادو کے اثر کی وجہ سے دیوانگی کو نبوت سمجھ رہے ہو اور اس کی پیروی کرنے لگے ہو۔ تو اس پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾

(دیکھئے وہ آپ پر کیسی کیسی پھبتیاں چست کر رہے ہیں، ایسے بھٹکے ہیں کوئی ٹھکانے کی بات ان کو نہیں سوجھتی۔ ۹)

ضربِ مثل کا مفہوم

ضربِ مثل کا محاورہ جس طرح کوئی تمثیل بیان کرنے یا کوئی حکمت کی بات کہنے کیلئے آتا ہے، اسی طرح کسی پر اعتراض کرنے یا اس پر پھبتی چست کرنے کیلئے بھی آتا ہے۔ پروردگار نے ان کے خرافات اور ہفوات کو بیان کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے فرمایا کہ دیکھئے یہ آپؐ کے بارے میں کیسی کیسی لایعنی باتیں کرتے اور کیسی پھبتیاں کستے ہیں، لیکن آپؐ کی دعوت کے مقابلے میں ان کی حیثیت لچر اور پوچ باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ باتیں اس قابل نہیں کہ ان پر سنجیدگی سے بحث کی جائے۔ ایک طرف آپؐ کی دعوت اور اس پر دلائلِ آفاق، دلائلِ انفس، دلائلِ فطرت، تاریخی شواہد اور عقلی استدلال کا ذخیرہ ہے جس میں سے کسی کا جواب ان سے بن نہیں پڑتا۔ اور دوسری طرف یہ بے سروپا باتیں ہیں اور پھر آپ کی دعوت کے نتیجے میں برپا ہونے والا ایک اخلاقی انقلاب ہے اور خود مخالفین کے زمرے میں سے چھن چھن کر آنے والے وہ سعید لوگ ہیں جو اسلام کی آغوش میں چلے آرہے ہیں۔ جو شخص بھی ان دونوں میں تقابل اور توازن کر کے دیکھے گا اسے خود اندازہ ہو جائے گا کہ حق کدھر ہے اور باطل کہاں ہے، ذمہ داری کا احساس کہاں ہے اور غیر سنجیدگی کہاں ہے، نبوت کے اثرات کیسے ہوتے ہیں اور کفر وشرک کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ بس ان باتوں کی طرف توجہ ہی اصل اس آیت کا پیغام ہے۔

Marfat.com

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ

شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ
وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۗ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ
بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿۱۱﴾ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا
وَّزَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾
لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ
اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ
اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ
مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ
مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًاۢ بُوْرًا ﴿۱۸﴾ فَقَدْ
كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ
يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ
وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات، وہ جو اگر چاہے تو تمہیں اس سے بھی کہیں بہتر چیزیں بخش دے۔ بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور آپ کیلئے محل بنوا دے۔ ۱۰) بلکہ ان لوگوں نے اس گھڑی کو جھٹلا دیا ہے اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کیلئے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۱۱) وہ جب دور ہی سے ان کو دیکھے گی تو وہ اس کا بھڑنا اور دھاڑنا سنیں گے۔ ۱۲) اور جب وہ اس کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال لئے جائیں گے تو وہ اس وقت اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ ۱۳) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو۔ ۱۴) ان سے پوچھئے کیا یہ (انجام) بہتر ہے یا وہ ابدی جنت جس کا خدا ترسوں سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ ان کیلئے صلہ اور ٹھکانہ ہوگی۔ ۱۵) ان کیلئے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ آپ کے رب کے ذمہ وعدہ ہے جس کا ایفا لازم ہے۔ ۱۶) اور اس دن کا خیال کرو جس دن (اللہ تعالیٰ) ان لوگوں کو اور جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے۔ ۱۷) وہ جواب دیں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہمیں یہ بات زیب نہ دیتی تھی کہ ہم آپ کے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور ہلاک ہونے والے بنے۔ ۱۸) جھٹلا دیں گے وہ تمہارے معبود، تمہاری ان باتوں کو جنہیں تم کہہ رہے ہو، پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے اور نہ کہیں سے کوئی مدد پا سکو گے اور جو بھی تم میں سے شرک کا مرتکب ہوگا ہم اسے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۱۹) اے پیغمبر! ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اور ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کیلئے آزمائش بنایا ہے، کیا تم صبر کرتے ہو، اور تمہارا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ۲۰)

تَبٰرَکَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِکَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَیَجْعَلْ لَّکَ قُصُوْرًا ﴿۱۰﴾

(بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات، جو اگر چاہے تو آپ کو اس سے بھی کہیں بہتر چیزیں بخش دے۔
بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور آپ کیلئے محل بنوا دے۔ ۱۰)

سورۃ کا آغاز تبارک کے لفظ سے کیا گیا تھا۔ گزشتہ رکوع میں معترضین کے چند اعتراضات کا ذکر فرمایا گیا تھا، اب ان کا جواب دیا جا رہا ہے اور اس کا آغاز اسی لفظ تبارک سے ہو رہا ہے۔

اعتراضات کا جواب

تبارک کی تشریح میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس میں افزونی اور کثرت، بقا اور دوام اور مبالغے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ کا آغاز اس لفظ سے فرما کر اپنی ذات کا تعارف کرایا تھا جس سے خود بخود شرک کی تردید ہو جاتی ہے۔ اب اسی لفظ کی معنوی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جس ذات کی قدرت، حکمت اور فیضان کی کوئی انتہا نہیں اور جو ہر طرح کے تغیر و انقلاب کے تصور سے پاک ہے اس کی ہر صفت بقا اور دوام رکھتی ہے۔ اس کے رسول کے بارے میں مخالفین کا تمسخر کرتے ہوئے اس کی غربت

Marfat.com

اور ناداری کو نشانہ بنانا یہ درحقیقت اس ذات سے بدگمانی اور اس کی بے ادبی پر دلالت کرتا ہے جس کے خزانوں کی وسعت کا کوئی شخص اندازہ نہیں کرسکتا اور جس کا جود و کرم یوں تو تمام مخلوقات کیلئے ہر وقت ابلتا ہے لیکن اپنے مخصوص بندوں کیلئے تو اس کی عنایات بے پایاں ہیں۔ اس کے رسول کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ اگر اللہ تعالیٰ کے رسول ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایک باغ بھی اتارتا جس طرح مکے کے رئیسوں کے طائف میں باغات ہیں اور وہ انہیں باغات اور مال و منال کی وجہ سے تکبر کا اظہار کرتے اور آنحضرت ﷺ کی غربت پر طعن توڑتے ہیں۔ تو آپؐ کا اپنی ضروریات کی فراہمی کیلئے بازاروں میں جانا اور دوسرے عام لوگوں کی طرح رزق کے حصول کی کوشش میں لگے رہنا یہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے مقام سے بہت فروتر بات ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اپنے رسول کو مال و منال کی کثرت سے گراں بار نہ کرنا اور باغ وغیرہ کی مصروفیت میں نہ ڈالنا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا ہے، ورنہ اس کی قدرت اور اس کے فیضان سے ایک باغ کیا بہت سے باغات بھی آنحضرت ﷺ کیلئے مہیا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسی طرح آپؐ کیلئے بڑے بڑے محلات کھڑے کر دینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کیلئے معمولی بات ہے۔ لیکن قدرت کا ایسا نہ کرنا اس وجہ سے ہے کہ یہ باتیں رسالت کی ضروریات میں شامل نہیں۔ رسالت علم کی وسعت، کردار کی عظمت، مال و منال کی نگاہوں میں بے قدری، رشتہ و پیوند کی بے وقعتی، طلبِ دنیا کی بجائے طلبِ آخرت کی بیتابی، ضروریات کو ضروریات کی حد پر رکھ کر مقاصدِ زندگی کی بار آوری، مخلوقِ خدا کی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی جسم و جان کے اصل ہدف کے طور پر چارہ گری یہ اور اسی قسم کی صفات وہ سرمایہ ہے جس کی رسول کے گھر میں فراوانی ہوتی ہے اور جس سے اہلِ دنیا عموماً محروم رہتے ہیں، لیکن قریش کی ذہنی رسائی اور ان کی کامیابیوں کیلئے ہدف کی بلندی کا تعلق چونکہ صرف درہم و دینار، مال و دولت، محلات اور باغات ہیں اور جہاں کہیں انہیں اس کی کمیابی دکھائی دیتی ہے وہ اسے اپنی بساطِ علم کے مطابق کمزوری اور ناداری سمجھ کر تکبر کا اظہار کرتے اور تمسخر اڑانے لگتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ جس طرح دولت کی فراوانی اور دنیوی اعزازات نبوت و رسالت کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس عظیم منصب پر فائز ہونے والی عظیم شخصیات کے ذوق کی چیز بھی نہیں۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ اس آیت کو لے کر خازنِ جنت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ رضوان نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ پھر کہا، یا محمد (ﷺ) رب العزت آپؐ کو سلام فرماتے ہیں اور یہ ایک صندوقچی ہے اس صندوقچی میں سے نور چمک رہا تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **هذه مفاتيح خزائن الدنيا** "اس میں دنیا کے سارے خزانوں کی کنجیاں ہیں، آپؐ یہ لے لیں۔ اس کی وجہ سے آپؐ کے آخرت کے اجر میں مچھر کے برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دیکھا، گویا آپؐ ان کی رائے پوچھ رہے تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا، یہ اشارہ کرنے کیلئے کہ آپؐ تواضع اختیار کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: یا رضوان! **لاحاجة لی فیھا، الفقر اَحَبُّ الی وان اکون عبدا صابرا شکورا** "اے رضوان مجھے ان کی ضرورت نہیں، مجھے فقر زیادہ پسند ہے اور مجھے یہ چیز زیادہ مرغوب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا صابر اور شکر گزار بندہ بنوں۔" **قال رضوان اصبت، الله لک** "آپ کا یہ فیصلہ درست ہے، اللہ آپ کا ہے۔" (قرطبی)

اسی اختیار کردہ فقر کا نتیجہ تھا کہ جب فتوحات کا راستہ بھی کھل گیا اور بعض علاقوں سے عشر اور خراج بھی آنے لگا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے فقر و فاقہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ سچ کہا ظفر علی خان نے:

Marfat.com

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
ہے تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال کہ ہے چولھا بجھا ہوا

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۚ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴿١١﴾

(بلکہ ان لوگوں نے اس گھڑی کو جھٹلا دیا ہے اور جو اس گھڑی کو جھٹلائے اس کیلئے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۱۱)

اَلسَّــاعَة ...... ساعت کے معنی گھڑی اور وقت کے ہیں اور اس پر ال عہد کا ہے۔ یعنی وہ مخصوص گھڑی جو قیامت کے نام سے معروف ہے اور قرآنِ کریم میں جا بجا اس لفظ کو قیامت کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک مغالطہ

آنحضرت ﷺ کی غربت اور دنیوی مال واسباب میں کمی کے حوالے سے قریش جس طرح تمسخر اڑاتے تھے اور دولت وثروت اور دنیوی کامرانیوں کو وہ جس طرح بڑائی کی علامت اور اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اس آیتِ کریمہ میں ان کے اس مغالطے کو دور کیا گیا یا اس کی تردید فرمائی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو طعن وتشنیع کا ہدف بنائے ہوئے ہیں اور آپ پر عجیب وغریب اعتراضات کر رہے ہیں اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ واقعی آپ پر ایمان نہ لانے کے یہی حقیقی اسباب ہیں اور یہی وہ موانع ہیں جس کی وجہ سے وہ اسلام کے قریب آنے سے گریزاں ہیں۔ فرمایا کہ اصل بات یہ نہیں بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ وہ آخرت کا انکار کر چکے ہیں جبکہ آپ کی دعوت کا تمام تر دارومدار آخرت کو تسلیم کرنے پر ہے۔ کیونکہ جو شخص آخرت کو دارالجزاء نہیں مانتا اور وہاں جوابدہی کے تصور کو قبول نہیں کرتا اور دنیا کو دارالعمل نہیں سمجھتا اور اسی زندگی کو اصل زندگی اور اسی زندگی کے خاتمے کو حقیقی فنا سمجھتا ہے اسے کبھی عیش وعشرت کی زندگی اور من مرضی کے طور اطوار، دولت وثروت کی پوجا، طاقت کی حکمرانی اور لذت کی آرزو سے دستبردار ہونے کیلئے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آخر اپنی مرضی کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مرضی کو کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ اور وہ خودغرضی اور ہوس کا پتلا ہو کر قربانی اور ایثار کا راستہ کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ تو جب تک یہ لوگ آخرت کو قبول نہیں کرتے اس وقت تک کسی اور تبدیلی کی توقع رکھنا خام خیالی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کوئی بھی ہوشمند اور عقلمند شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس طرح آخرت کا منکر عقلی اور اخلاقی دلائل کو قیامت کے وجود کیلئے قطعی نہیں سمجھتا اسی طرح وہ آخرت کے انکار کو بھی کسی دلیل سے قطعی اور حتمی قرار نہیں دے سکتا۔ اولاً تو اقرار وانکار کے دونوں پلڑے برابر نہیں لیکن اگر عقل پر ہی اعتماد کرتے ہوئے دونوں کو برابر بھی سمجھ لیا جائے تو تب بھی ایک سوال ایسا ضرور ہے جو عقلمند آدمی کو آخرت کے تصور پر غور کرنے کیلئے مجبور کر دیتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر واقعی آخرت نہ ہوئی اور ہماری یہی موت آخری اور مکمل موت ثابت ہوئی تو انکار کرنے والا اور اقرار کرنے والا دونوں یکساں ہوں گے۔ نہ اقرار کرنے والے کا اقرار اس کے کام آئے گا اور نہ انکار کرنے والے کا انکار اس کیلئے کسی نقصان کا باعث ہوگا لیکن اگر یہ بات واقعہ بن کر سامنے آگئی کہ صور پھونکا گیا، قیامت برپا ہوگئی اور سب لوگ جوابدہی کیلئے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے۔ اب جس شخص نے آخرت کا اقرار کر کے اور دنیا کو دارالعمل سمجھ کر آخرت کیلئے تیاری کی ہوگی وہ تو وہاں بچ جائے گا لیکن جو آخرت کے انکار پر اڑا رہا وہ پکڑا

Marfat.com

جائے گا۔ چنانچہ خالصتاً عقل کو بنیاد بناتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جو شخص قیامت اور آخرت کی تکذیب کرتا اور اس کا انکار کرتا ہے ہم نے اس کیلئے بھڑکنے والی آگ تیار کر رکھی ہے۔ وہ دنیا میں چاہے دولت و ثروت کے کیسے انبار رکھتا ہو اور کتنی بڑی حکومت و ریاست کا مالک ہو، وہ اس دوزخ کے عذاب سے بچ نہیں سکے گا۔

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾

(وہ جب دور ہی سے ان کو دیکھے گی تو وہ اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔ ۱۲)

تَغَيُّظ ...... کے معنی غصہ سے بپھرنے کے ہیں۔ زَفِیْر ...... کے معنی چیخنے اور دھاڑنے کے ہیں۔

دوزخ اور اہلِ دوزخ کی تصویر

دوزخ آگ کی طرح ایک ایسی مخلوق ہے جس میں نہ روح ہے اور نہ حواس ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا دور سے دیکھنا محض ایک استعارہ ہے لیکن اس میں بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ دوزخ اور جہنم کو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے اور محسوس کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے۔ وہ دور سے آتے ہوئے کافروں کو دیکھ لے گی اور چونکہ کفر اور شرک سے نفرت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اس لئے وہ انہیں دیکھ کر ایسے بپھرے گی اور دھاڑے گی کہ گویا انتقام کے جوش میں وہ پہلے سے تلملا رہی ہے۔ اور جوشِ غضب کی وجہ سے شیر کی طرح بپھری ہوئی اور دھاڑ رہی ہے۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾

(اور جب وہ اس کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال لئے جائیں گے تو وہ اس وقت اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ ۱۳)

اہلِ دوزخ کی آخری خواہش

یہ تصویر ہے اس وقت کی جب ان ظالموں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یوں تو اس سے بھی بڑھ کر اور عذاب کیا ہوگا کہ کسی کو جہنم کی آگ کے حوالے کر دیا جائے لیکن ایسے بدترین کافر جو نبی کریم ﷺ کو ذہنی اذیت دیتے رہے اور آپ ؐ کا جینا دوبھر کئے رکھا، انہیں جہنم کی کسی تنگ جگہ میں ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینکا جائے گا۔ اس سے عذاب کی شدت کا تصور میں اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو جہنم کی آگ کی تیزی اور پھر مجرم کے ہاتھ پاؤں کا باندھنا اور پھر ایسی تنگ جگہ پر پھینکا جانا جہاں وہ حرکت تک نہ کر سکیں۔ تو اب ان کے پاس چیخنے چلانے کے سوا اور کیا چارہ ہوگا۔ لیکن جب وہ محسوس کریں گے کہ ہر لحظہ گزرنے کے ساتھ عذاب کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور قوتِ برداشت مسلسل جواب دیتی جارہی ہے تو پھر وہ موت کو پکارنا شروع کر دیں گے یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ انہیں موت دے دے تاکہ تکلیف کی شدت سے نجات پالیں۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا ممکن ہے داروغہ جہنم جواب میں یہ کہے گا یا غیب سے ان کو یہ آواز سنائی دے۔

Marfat.com

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝١٤

(آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو پکارو۔ ۱۴)

تم یہ سمجھتے ہو کہ موت تمہاری تکلیف کا خاتمہ کر دے گی، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہے ہے کہ ابھی تو تمہیں ایک مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہے مزید بے شمار مصیبتیں تم پر حملہ آور ہونے کیلئے تیار ہیں۔ تم کس کس مصیبت پر موت مانگو گے۔ آہ، اس شخص کے بارے میں کیا کہا جائے جو اپنی مصیبت میں تخفیف کیلئے بھی کوئی راستہ نہ پائے۔ اس کے پاس ایک ہی خواہش باقی رہ جاتی ہے کہ وہ موت کی تمنا کرے جبکہ وہ ہمیشہ موت سے بھاگتا رہا۔ لیکن جب یہ تمنا بھی اس کے کام نہ آئے تو اس کی بے بسی، محرومی اور ناامیدی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ٹھیک کہا غالب نے:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

قرآنِ کریم میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب جہنم کی آگ کافروں کے جسموں کو جلائے گی تو وہ اس انتظار میں ہوں گے کہ کھال جلنے کے بعد شاید جلن کی شدت میں کچھ کمی آ جائے اور یا موت واقع ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کی کھالوں کو جلنے کے بعد جسم سے اتار دے گا اور ہر شخص کو نئی کھال پہنائی جائے گی تاکہ وہ نئے سے نئے عذاب کا مزہ چکھیں۔ تکلیف اور عذاب دینے کی یہ قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی میں نہیں۔ قیامت کے دن یہ قوت پوری طرح بروئے کار آ چکی ہوگی۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ۝١٥
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ۝١٦

(ان سے پوچھئے کیا یہ (انجام) بہتر ہے یا وہ ابدی جنت جس کا خدا ترسوں سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ ان کیلئے صلہ اور ٹھکانہ ہوگی۔ ۱۵) ان کیلئے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ آپ کے رب کے ذمہ وعدہ ہے جس کا ایفا لازم ہے۔ ۱۶)

جنت اور اہلِ جنت کی تصویر

اب یہ اس اصل مدعا کا ذکر ہے جس کیلئے دوزخ کی یہ ساری تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ یہ قریش جو آپؐ کی بے مائیگی کا آپؐ کو طعنہ دیتے ہیں اور اپنی دولت وثروت پر نازاں ہیں ان سے پوچھئے کہ تمہاری دولت وثروت اور خواہشات کی غلامی اور من مرضی کی زندگی کا نتیجہ تو وہ ہے جو جہنم کی صورت میں ہم نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے۔ اور دوسری وہ بے مائیگی کی زندگی ہے جو آنحضرت ﷺ اور مسلمان گزار رہے ہیں اس کا نتیجہ وہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس کا وعدہ ان لوگوں سے کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ اب تم بتاؤ ان میں سے بہتر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے وعدے پر اعتماد نہ کرو اور آنحضرت ﷺ کی زبان سے اس وعدے کو سن کر تمسخر میں اڑا دو۔ لیکن تمہیں خوب معلوم ہے کہ جس کی زبان اس وعدے کو بیان کر رہی ہے اس زبان سے کبھی آج تک جھوٹ نہیں نکلا۔ تمہاری نگاہیں چونکہ اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہیں اس وجہ سے تم اپنے باغوں اور محلوں پر نازاں اور مومنین کی بے مائیگی پر طعنہ زن ہو۔ لیکن اگر تم نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو تم بصیرت کی نگاہ سے دیکھ سکتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کیلئے کس ابدی بادشاہی کا اہتمام کر رکھا ہے۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں جنت سے متعلق چار باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جس کا وجود دنیا سے باہر تصور میں بھی ممکن نہیں۔

۱۔ ہر صاحبِ ایمان جانتا ہے کہ آخرت میں نجات کا دارومدار ایمان وعمل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر ہے کیونکہ بہتر سے بہتر عمل بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ خیال کی کوئی نہ کوئی لغزش، ارادے کی کوئی نہ کوئی لرزش اور عمل کی کوئی نہ کوئی نارسائی وقوع پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ کون سی چال ہے جو لڑکھڑاہٹ سے پاک ہو اور کون سی نیکی ہے جس میں خلوصِ نیت، خشوع اور خضوع کے پیمانوں سے ہمیشہ تل کے نکلے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کی تلافی اپنے فضل سے فرما دیتا ہے۔ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی محض اپنے عمل کے اعتماد کو کافی نہیں سمجھتی۔ لیکن اس آیت میں سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اہلِ ایمان کو یہ جنت ان کے اعمال کے صلے اور بدلے کے طور پر ملے گی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جائے گا کہ تم نے یہ جنت اپنی سعی وعمل سے حاصل کی ہے اور تم اس کے پوری طرح حقدار ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہلِ جنت کو لطف ولذت کے ساتھ ساتھ سرفرازی کا اعزاز بھی حاصل ہو جائے گا۔

۲۔ جنت اہلِ ایمان کی ابدی قیام گاہ ہوگی اس لئے محروم ہونے کا کبھی اندیشہ نہیں ہوگا۔ اور یہ ایسی نعمت ہے کہ بادشاہ تک اس کا تصور نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں ہر نعمت کو زوال ہے۔ اسی لئے نعمت ملنے کے بعد اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ کبھی دل سے الگ نہیں ہوتا۔ آج کے شاہ کل کے گدا ہو جاتے ہیں اور آج کے گدا تخت وتاج کے مالک بن جاتے ہیں۔ لیکن جنت میں ہر نعمت کو ثبات وقرار میسر آئے گا۔

۳۔ جنت میں ہر وہ نعمت میسر آئے گی جس کی اہلِ جنت خواہش کریں گے۔ دنیا میں کتنی ایسی نعمتیں ہیں جو عالم پناہوں اور شاہجہانوں کے بھی بس میں نہیں۔ سکندر فتوحاتِ عظیمہ کا پھریرا لہرا کے بھی دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے۔ شداد اپنی تعمیر کردہ جنت دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ کتنی ناممکن چیزیں ہیں جنہیں انسان ممکن نہیں بنا سکتا، لیکن جنت میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوگی۔ ہر شخص جو چاہے گا جو خواہش اس کے دل سے اٹھے گی لبوں پر آتے ہی تعمیل کے قالب میں ڈھل جائے گی۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی قانون اور وعدے کا پابند نہیں۔ دنیا کا ہر قانون اس کے قانون کا پابند اور اس کی رضا کے تابع ہے۔ وہ قیامت کے دن سب سے جواب طلبی کرے گا لیکن کوئی شخص اس سے سوال کرنے کا حق نہیں رکھتا بایں ہمہ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اہلِ جنت سے جو وعدے فرمائے ہیں اس کا ایفا اپنے اوپر لازم کیا ہے اور بندوں کے سامنے اس کیلئے اپنے آپ کو ذمہ دار اور مسئول ٹھہرایا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿١٨﴾

(اور اس دن کا خیال کرو جس دن (اللہ تعالیٰ) ان لوگوں کو اور جن معبودوں کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے۔ ۱۷) وہ جواب دیں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہمیں یہ بات زیب نہ دیتی تھی کہ ہم آپ کے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور ہلاک ہونے والے بنے۔ ۱۸)

Marfat.com

آخرت میں انبیاء وصالحین کا اپنے پرستاروں سے اعلانِ براءت

قریشِ مکہ اور دیگر اہلِ عرب کی گمراہی اور اس کو باقی رکھنے کیلئے آنحضرت ﷺ کی دعوت کی اندھی مخالفت جس طرح قیامت کے انکار کے باعث تھی اسی طرح اس کا ایک سبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختلف قسم کا شرک بھی تھا۔ کہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا گیا تھا اور کہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے بہت سارے حقوق انہیں تفویض کر دیئے گئے تھے۔ شرک کی تمام اقسام کی تردید تو کئی مواقع پر گزر چکی ہے یہاں صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب یہ لوگ اپنے انکار و تمرد اور شرک کے باعث جہنم میں ڈالے جائیں گے تو جہاں انہیں سخت سے سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا وہیں انہیں ایک اور بھی رسوا کن اور اذیت ناک صورتحال سے واسطہ پڑے گا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ میدانِ حشر میں جب ان کو جمع کرے گا تو ان کے ساتھ ان تمام قوتوں کو بھی جمع ہونے کا حکم دے گا جن کی یہ پوجا کرتے تھے۔ اور ان میں وہ تمام معبود شریک ہوں گے جن کا تعلق فرشتوں، جنات، مظاہر فطرت اور اجرامِ فلکی سے ہے اور وہ بھی شامل ہوں گے جنہیں مشرکین نے اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔ چاہے اس کے پسِ پردہ انسانی شخصیات ہوں یا لوگوں کی مزعومہ اور مفروضہ قوتیں۔ ان کے تمام بت بھی ان کے ساتھ میدانِ حشر میں جمع کر دیئے جائیں گے۔

مایعبدون ...... میں مَا کے بارے میں بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ یہ غیر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتا ہے اور مَن ذوی العقول کیلئے بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں مَا سے مراد صرف بے جان پتھر ہیں، زندہ شخصیات نہیں۔ لیکن یہ تصور صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ مَا اور مَن کے استعمال میں عموماً اس کا لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن یہ دونوں ان معنوں کیلئے مخصوص نہیں۔ بسا اوقات مَا ذوی العقول کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اگر کسی صاحبِ عقل مخلوق کا ذکر تحقیر کے طور پر کیا جائے تو پھر اس کیلئے مَا کا استعمال سب کے نزدیک نہ صرف جائز ہے بلکہ فصاحت کا تقاضا ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ مشرکین نے جن جن کو بھی اپنی بندگی اور عبادت کا مستحق سمجھا ان کے سامنے سر جھکائے، قربانیاں دیں، ان سے استمداد کی، ان سے پناہ مانگی اور یہ یقین رکھا کہ اگر قیامت آ ہی گئی تو ہمارے یہ معبود اس دن ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس اعتماد اور بھروسے کی تردید کیلئے فرما رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں ان سب کو جمع کرے گا۔ جہاں تک بتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو دوسری جگہ فرمایا گیا انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم "بیشک تم اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہوں گے۔" سب کے نزدیک اس سے مراد بت ہیں انہیں قیامت کے دن ان کے پوجا کرنے والے کے ساتھ جہنم میں پھینکا جائے گا اور یہ جہنم کی آگ کیلئے ایندھن ثابت ہوں گے۔ رہے دوسرے لوگ جن میں انبیائے کرام بھی شامل ہیں اور اولیائے عظام، فرشتے اور صالحین بھی۔ ان سے پروردگار پوچھے گا کہ تم نے ان لوگوں کو گمراہ کیا تھا یا خود ہی یہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ کیونکہ مشرکین کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں ہمیں اس راستے پر ان بزرگوں اور عظیم شخصیتوں نے ڈالا آج جن کی ہم پوجا کر رہے ہیں۔ تو وہ جواب میں یہ کہیں گے کہ الٰہ العالمین ہماری تو یہ مجال بھی نہ تھی یا ہمیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی اور کو اپنا ولی یا کارساز بنا لیتے، تو دوسروں کو یہ کہنا کہ وہ ہماری بندگی کریں، یہ کیسے ممکن تھا۔ اسی مضمون کو سورۃ سبا کی آیات ۴۰ اور ۴۱ میں بیان فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "کہ جس روز اللہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی بندگی کر رہے ہیں، وہ کہیں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان سے۔ یہ لوگ تو جنوں یعنی شیاطین کی بندگی کر رہے تھے، ان میں سے اکثر انہیں کے مومن تھے۔"

Marfat.com

ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ گمان ہو کہ ہوسکتا ہے فرشتوں یا جنات کو لوگوں کے شرک اور پوجا پاٹ کی وجہ سے پروردگار قیامت کے دن اپنی عدالت میں طلب فرمالیں۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انبیائے کرام جن کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی قدر و منزلت سے نوازا ہے انہیں ان کی امتوں کی زیادتیوں کے باعث اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔ ان کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ سورۃ المائدہ کے آخری رکوع میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عیسائیوں کے غلط عقائد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط تصورات کے حوالے سے جب عیسائیوں سے جواب طلبی ہوگی تو ساتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی طلب کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا آپ نے ان لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو، تو وہ نہایت عاجزی سے جواب میں کہیں گے ماقلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی و ربکم ''میں نے ان سے بس وہی کچھ کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔''

کفار کی گمراہی کا اصل سبب

انبیائے کرام اور صلحائے عظام اپنی براءت کا اظہار کرنے کے بعد عرض کریں گے کہ ان کو کسی نے گمراہی اور برگشتگی کے راستے پر نہیں ڈالا بلکہ آپ نے معیشتِ دنیا کی جو فراوانی ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو بخشی اور یہ پشتوں تک دولت میں کھیلتے رہے اور وسائلِ رزق پر بلاشرکتِ غیرے ان کا قبضہ رہا۔ اس سے ان میں یہ تصور پیدا ہوا کہ امارت و ثروت ہمیشہ سے ہمارے گھر کی لونڈی ہے اور ہم اور ہماری اولاد ہمیشہ اسی حال میں زندگی گزاریں گے۔ ہماری یہ حالت ہماری شناخت اور ہمارا لازمہ ہے جو ہم سے کبھی الگ نہیں ہوگا۔ اس تصور نے انہیں دنیا اور دولتِ دنیا کے ساتھ اس قدر گہری وابستگی پیدا کردی کہ وہ آخرت کا تصور کھو بیٹھے۔ اگر کسی نے انہیں آخرت کی طرف بلایا تو انہوں نے محض اسے واہمہ سمجھا اور آخرت سے متعلق اگر کچھ تصورات ان کے معاشرے میں موجود تھے تو وہ یکسر انہیں بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے اخلاقی قدریں پامال ہوئیں پھر رفتہ رفتہ انسانی قدریں بھی دم توڑ گئیں۔ انسانی رشتے جو حقوق و فرائض کے تصور سے باقی رہتے ہیں وہ آخرت کا تصور ختم ہوجانے کے باعث اپنا وجود کھو بیٹھے جس کے نتیجے میں ایک ایک رشتہ ٹوٹتا چلا گیا۔ اب یہ لوگ بظاہر انسان تھے لیکن حقیقت میں بہائم کے انبوہ تھے جو انسانی آبادیوں میں حیوانوں کی طرح رہ رہے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ وہ ایک ہلاک ہونے والی قوم بن گئے۔

بُور...... واحد جمع مذکر اور مونث سب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں شور زمین اور فاسد و ناکارہ آدمی۔ جب یہ قوم کی صفت کے طور پر آتا ہے تو پھر اس کا مفہوم ہلاک ہونے والی قوم ہوتا ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوكُم بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ﴿١٩﴾

(جھٹلا دیں گے وہ تمہارے معبود، تمہاری ان باتوں کو جنہیں تم کہہ رہے ہو، پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے اور نہ کہیں سے کوئی مدد پاسکو گے اور جو بھی تم میں سے شرک کا مرتکب ہوگا ہم اسے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ۱۹)

Marfat.com

ایک بلیغ اسلوب

یہ مکالمہ تو قیامت کے دن ہوگا لیکن اس کے یقینی اور حتمی ہونے کو واضح کرنے کیلئے اسے ماضی کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے کہ تم قیامت کے دن یہ تصور لے کر پہنچو گے کہ ہم تو قیامت کا انکار کرتے رہے لیکن اب اگر قیامت آ ہی گئی ہے تو یقیناً ہمارے مزعومہ معبود آج ہماری مدد کریں گے۔ لیکن جب تمہارے معبود صاف تم سے براءت کا اظہار کریں گے کہ ہم نے ان سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی، یہ جو کچھ بھی کرتے رہے یہ ان کی اپنی بنائی ہوئی اور وضع کردہ بات تھی۔ تو اس پر پروردگار فرمائیں گے کہ اس انکار کے بعد اب تمہارے پاس کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی۔ اب تم نہ اپنے سے عذاب کو ہٹا سکو گے اور نہ تمہیں کہیں اور سے مدد پہنچ سکے گی اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ نہ تم کسی دوسرے کی ہی مدد کر سکو گے۔ اور تم میں سے جو بھی شرک کے مرتکب ہوں گے ہم ان کو ایک عذابِ عظیم چکھائیں گے۔

یہاں ظلم سے مراد کفر اور شرک ہے۔ ظاہر ہے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر حقیقت اور صداقت پر ظلم کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے آدمی اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور ان حقائق پر بھی ظلم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

(اے پیغمبر! ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجے تھے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اور ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کیلئے آزمائش بنایا ہے، کیا تم صبر کرتے ہو، اور تمہارا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ۲۰)

قریش کے اعتراضات کی لغویت

اوپر آیت ۷ میں کفار کا یہ اعتراض نقل کیا گیا ہے کہ یہ کیسا رسول ہے جو ضروریات کی فراہمی کیلئے بازار جاتا ہے، وہاں کاروبار کی دیکھ بھال میں دوڑ بھاگ کرتا ہے اور پھر کھاتا پیتا بھی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں تاریخی حوالے سے نہایت آسان انداز میں اس کا جواب دیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کھانا پینا اور لین دین کیلئے بازاروں میں جانا اگر منصبِ رسالت کے خلاف ہوتا تو پھر کبھی کوئی رسول یہ حرکت نہ کرتا جبکہ جتنے بھی رسول آئے ہیں یا کم از کم جن کو تم جانتے ہو وہ سب کھاتے پیتے اور بازاروں میں عام آدمی کی طرح چلتے پھرتے تھے۔ اہلِ عرب انبیائے کرام کی تاریخ سے زیادہ واقف تو نہیں تھے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مانتے بھی تھے اور جانتے بھی تھے۔ بلکہ انہیں ان کا وارث ہونے کا دعویٰ بھی تھا اور اس پر انہیں بجا طور پر فخر و ناز بھی تھا۔ ان دونوں کے بارے میں انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مافوق البشر تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے بشر ہی کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں یہ بات معروف تھی کہ وہ تیر بنایا کرتے اور شکار کھیلا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی اور مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کے کئی واقعات مشہور تھے۔ اسی طرح اگرچہ وہ لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے زیادہ آگاہ نہیں تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی حد تک شناسا تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشریت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اور جہاں تک مسیحیوں کا تعلق ہے اگرچہ پال نے مسیحیت کی شکل بگاڑ ڈالی تاہم ان کے کھانے کا تذکرہ تو آج تک انجیل میں موجود ہے۔ اور ان کی

Marfat.com

بشریت کے ثبوت میں قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا کانا یاکلان الطعام ''وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔'' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ تو اگر یہ باتیں منصب نبوت کے منافی ہوتیں تو یہ انبیائے کرام ان باتوں کا ارتکاب کیوں کرتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا یہ اعتراض تاریخ نبوت سے بے خبری نہیں، نظر انداز کرنے یا استفادہ نہ کرنے کی دلیل ہے۔

فتنہ کا مفہوم

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ''اور ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی کفارِ مکہ مسلمانوں کیلئے آزمائش ہیں اور مسلمان کفار کیلئے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۵۳ میں اس بات کو کسی حد تک کھول دیا گیا ہے۔ وہاں فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا ''اسی طرح ہم نے ایک کو دوسرے کیلئے آزمائش بنایا ہے تاکہ یہ متکبرین کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کیلئے منتخب کیا ہے؟'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غربت ان کیلئے آزمائش بن گئی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ مال و دولت اور ثروت و رفاہیت اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اور وہ نعمتیں ہمیشہ اپنے مقبول بندوں کو دیتا ہے۔ اگر یہ دین اللہ کا دین ہوتا جسے محمد (ﷺ) لے کے آئے ہیں تو یہ ہم میں سے کسی پر نازل ہوتا۔ ہمارے رئیسوں میں سے کوئی رئیس رسول بنایا جاتا اور اس پر ایمان لانے والے بھی امیر لوگ ہوتے۔

اور غربت جو انسان کو معاشرے کی نظروں سے گرا دیتی ہے اس میں ہمیشہ وہ لوگ مبتلا کیے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ناپسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین معزز اور دولت مند لوگوں کو نظر انداز کر کے غریبوں اور معاشرے کے گرے پڑے لوگوں کو دیا جائے اور امیر لوگ اس سے محروم رہیں۔ اس طرح سے مسلمانوں کی غربت قریش کیلئے قبولِ حق کی راہ میں حجاب بن کے رہ گئی۔ ممکن ہے آنحضرت ﷺ کی دعوت انہیں کسی حد تک اپیل کرتی ہو لیکن آپؐ اور مسلمانوں کی غربت انہیں اسلام کی طرف بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ یہ وہ آزمائش تھی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت و ثروت دی تو انہیں اس پر شکر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن بجائے شکر ادا کرنے کے یہی دولت ان کیلئے کفر پر اصرار کرنے کا باعث بن گئی۔

اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کفار کی طرف سے ان کے دین کا تمسخر اور پھر ان کی مخالفت و عداوت کا بڑھتے چلے جانا مسلمانوں کیلئے ایک آزمائش بن گیا۔ جیسے جیسے کفر کی اذیت رسانی میں تیزی آتی گئی مسلمانوں کیلئے آزمائش بڑھتی گئی۔ شروع میں تو صرف طنز و استہزاء تھا پھر بائیکاٹ تک نوبت پہنچی حتیٰ کہ غریب صحابہ ظلم و ستم کی چکی میں پیسے جانے لگے۔ حضرت بلالؓ جیسے مخلص مسلمان تپتی ریت پر کھینچے جاتے اور حضرت خبابؓ جیسے جاں نثار دہکتے انگاروں پر لٹائے جاتے۔ اس آزمائش میں پورا اترنا صرف انہیں لوگوں کا کام ہے جو نہایت سوچ سمجھ کر اور محکم ارادے سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہوں۔ اقبال نے حضرت بلالؓ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا اور حقیقت میں ہر صحابی اس خراج کے اہل ہیں۔

نہ چھٹا وہ آستانہ تجھ سے ایک دم کے لئے
کسی کے عشق میں تو نے مزے ستم کے لئے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

Marfat.com

کفار تو اپنی آزمائش اور امتحان میں ناکام ہوگئے۔ اور مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے اتصبرون "کیا تم صبر کرو گے۔" یعنی جس طرح کفار کا امتحان شکر میں تھا اور وہ بری طرح ناکام ہوئے، تمہارا امتحان صبر میں ہے۔ تو کیا تم اس امتحان میں پورے اترو گے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ کرام نے اس امتحان میں ثابت قدمی کے جو نقوش ثبت کئے ہیں دنیا آج تک اس سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔

یاد رہے کہ جب امر کے اندر ترغیب وتشویق اور حث وتحریص کا مفہوم پیدا کرنا ہو تو وہ خبریہ اسلوب کے قالب میں آتا ہے۔ اور اگر اس پر حرف استفہام آجائے تو اس کے اندر مزید زور پیدا ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس لفظ سے مسلمانوں سے صرف صبر کے بارے میں سوال نہیں کیا جارہا بلکہ نہایت پیار سے رغبت بھی دلائی جارہی ہے اور شوق بھی پیدا کیا جارہا ہے۔ اور پروردگار کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کی ترغیب دیتا ہے تو اس کی ہمت بھی عطا کرتا اور بڑی سے بڑی مشکل کیلئے راستہ آسان کر دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ
أَوْ نَرَىٰ رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ﴿٢١﴾
يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ
حِجْرًا مَحْجُورًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ
هَبَاءً مَنْثُورًا ﴿٢٣﴾ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ
مَقِيلًا ﴿٢٤﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَائِكَةُ تَنْزِيلًا ﴿٢٥﴾
الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمَٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا ﴿٢٦﴾
وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ
الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾
لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ
خَذُولًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ

Marfat.com

مَهْجُورًا ﴿٣٠﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَ
كَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ﴿٣١﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَ
رَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ
تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ أُولَٰئِكَ
شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٣٤﴾ ع

رکوع: ۳۔ (اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب ہی کو دیکھتے، انہوں نے اپنے جی میں اپنے کو بہت بڑا سمجھا اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی۔ ۲۱) جس دن وہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کیلئے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اور فرشتے کہیں گے تمہارے لئے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے۔ ۲۲) اور ہم ان کے ہر اس عمل کی طرف جو انہوں نے کیا ہوگا متوجہ ہوں گے اور اس کو پراگندہ غبار بنا دیں گے۔ ۲۳) اس دن جنت والے بہترین ٹھکانے اور نہایت خوب آرام گاہ میں ہوں گے۔ ۲۴) اور یاد کرو جس روز آسمان پھٹ جائے گا اور بادل نمودار ہوگا اور فرشتے گروہ در گروہ اتارے جائیں گے۔ ۲۵) اس دن حقیقی بادشاہی خدائے رحمٰن ہی کی ہوگی اور وہ منکرین کیلئے بڑا سخت دن ہوگا۔ ۲۶) اور جس دن اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کی معیت میں نجات کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ۲۷) ہائے میری بدبختی، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ ۲۸) اسی نے مجھے گمراہ کر کے اس یاددہانی سے برگشتہ کیا، بعد اس کہ وہ میرے پاس آ چکی تھی، اور شیطان انسان کیلئے بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے۔ ۲۹) اور رسول عرض کرے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ ۳۰) اسی طرح ہم نے جرائم پیشہ لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور آپ کا رب کافی ہے آپ کیلئے منزلِ مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا۔ ۳۱) اور ان کافروں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتار دیا گیا، ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ اس کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کر دیں اور اسی لئے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے (تدریج و اہتمام کے ساتھ نازل کیا ہے)۔ ۳۲) وہ آپ پر کوئی اعتراض پیش نہیں کریں گے مگر ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ آپ کو بتا دیں گے۔ ۳۳) جو لوگ ہانکے جائیں گے اوندھے منہ جہنم کی طرف، ان کا بہت برا ٹھکانہ ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے۔ ۳۴)

Marfat.com

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ
لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

(اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے یا ہم اپنے رب ہی کو دیکھتے، انہوں نے اپنے جی میں اپنے کو بہت بڑا سمجھا اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی۔ ۲۱)

متکبرین کے استکبار پر ایک ضرب

آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کے مخالفین ایک تو عام لوگ تھے اور عام لوگ کسی بات کو اختیار کرنے یا اس کی مخالفت کرنے میں بالعموم طبقۂ امراء کے پیروکار ہوتے ہیں۔ اہلِ مکہ کا بھی یہی حال تھا۔ مخالفین میں دوسرا گروہ طبقۂ خواص کا تھا جو مکے کی سیاست اور معاشرت کو اپنے اثرات سے متاثر کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کے انکار میں تو یہ سب لوگ متفق الرائے تھے لیکن خیالات اور مخالفت کے انداز میں اپنا اپنا اسلوب رکھتے تھے۔ جو لوگ نسبتاً مزاج میں اعتدال کے مالک تھے وہ آنحضرت ﷺ کا انکار کرتے اور آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ لیکن تمسخر، یاوہ گوئی اور اذیت رسانی سے دور رہتے تھے۔ اس بات کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھے کہ آپؐ پر وحی اترتی ہے۔ لیکن وحیِ الٰہی، فرشتوں اور خود پروردگار کے بارے میں زبان درازی کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ لیکن بعض ان میں ایسے تھے جو تمرد اور تکبر میں حد سے بڑھے ہوئے اور شرافت کی ہر قدر کو پامال کر چکے تھے۔ نہ ان کی زبانوں پر کوئی قدغن تھی اور نہ ان کے رویئے میں کوئی شرافت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ ذوالجلال کے بارے میں بھی بڑی سے بڑی بات کہہ دینا ان کیلئے معمولی بات تھی۔ وہ قیامت اور آخرت کے تصور کو محض ایک لطیفہ سمجھتے تھے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں ان کا ذکر الذین کفروا کے ساتھ کرنے کی بجائے اَلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ تکبر کے مارے ہوئے اس گروہ کی ہر بات اظہارِ تکبر کی علامت تھی۔ غیر معمولی دریدہ دہنی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے یہ کہا کہ محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ مجھ پر فرشتے اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر اترتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر اس میں کیا حرج ہے کہ محمد (ﷺ) ہمارے ہی ایک بھائی ہیں، ان پر اگر فرشتے اتر سکتے ہیں تو ہم پر کیوں نہیں اتر سکتے۔ جب ہم خود اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو دیکھ لیں گے تو تب ہمارے لئے ان کو نبی ماننا آسان ہو جائے گا۔

یہاں ملائکہ کو جمع لایا گیا ہے۔ اس سے ان کی مراد شاید یہ تھی کہ ہم میں سے ہر ایک پر الگ الگ فرشتہ نازل ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر فرد کو آ کر آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دعوت دے اور اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں پڑھ کر سنائے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ بہت سے فرشتے مجمع عام میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اعلان کریں۔

بعض بدباطن ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ہرزہ سرائی کرتے کہ اگر فرشتے ہم پر نہیں اترتے تو اس میں کیا حرج ہے کہ ہم براہِ راست اپنے رب سے باتیں کریں اور اس کو دیکھیں۔ اس طرح سے انہوں نے یہ گمان کیا کہ ہم شاید کوئی بہت بڑی چیز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک عظیم رسول کو ہماری طرف بھیجتا ہے۔ ہم اس کا تمسخر اڑاتے، بدزبانی کرتے اور تکلیفیں پہنچاتے ہیں لیکن وہ برابر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری ہدایت اور ہماری اصلاح ہر قیمت پر منظور ہے۔ ان کے اسی تصور نے انہیں انگیخت کیا اور وہ سرکشی کی ہر حد سے آگے نکل گئے۔ حالانکہ اگر تکبر نے انہیں عقل سے محروم نہ کر دیا ہوتا تو یہ بات جاننا ان کیلئے کوئی مشکل نہ تھا کہ فرشتے انسانوں کو نظر نہیں

Marfat.com

آتے۔اہلِ خانہ کے سامنے گھر کا ایک فردموت کی نذر ہو جاتا ہے لیکن کسی کو اس کی جان لینے والا فرشتہ نظر نہیں آتا۔اور جہاں تک پروردگار کی زیارت کا تعلق ہے اس کے بارے میں بھی یہ بات ان سے مخفی نہ تھی کہ کوئی آج تک پروردگار کو دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکا۔وہ ایک ایسی لطیف ذات ہے جو ہمارے حواس سے ماوراء اور ہماری قوتِ ادراک سے بالا ہے۔بنابریں یہ کیسے ممکن ہے کہ تم فرشتوں کو یا اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکو۔

ان میں اگر کچھ اہلِ دانش بھی تھے تو انہیں تو اس بات کا شعور ہونا چاہئے تھا کہ عالمِ غیب کی چیزیں عالمِ دنیا میں نظر نہیں آتیں۔اور اگر آدمی ان حقائق کو جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے عالمِ دنیا میں دیکھ لے تو اب اس کیلئے ان پر ایمان لانا کوئی امتحان نہیں۔کیونکہ دیکھی ہوئی اور سنی ہوئی چیزوں کو مان لینا انسانی زندگی کا معمول ہے۔البتہ عالمِ غیب اور عالمِ بالا کے ان حقائق کو دنیا میں تسلیم کرنا ہی اصل امتحان ہے جن پر انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

(جس دن وہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کیلئے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اور فرشتے کہیں گے تمہارے لئے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے۔ ۲۲)

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا مفہوم

مشکل الفاظ:۔ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ...... سخت پردہ اور اوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔حجر کے لفظی معنی محفوظ جگہ کے ہیں اور محجوراً اس کی تاکید ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی حراماً محرماً منقول ہیں۔مراد یہ ہے کہ قیامت کے روز جب یہ لوگ فرشتوں کو عذاب کے ساتھ دیکھیں گے اور ان سے معاف کرنے اور جنت میں جانے کی درخواست کریں گے یا تمنا ظاہر کریں گے تو فرشتے ان کے جواب میں کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔یعنی جنت کافروں پر حرام اور ممنوع ہے۔ (مظہری)
اس صورت میں يَقُوْلُوْنَ کا فاعل فرشتے ہوں گے۔بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ لفظ استعاذہ کے الفاظ میں سے ہے اور سیبویہ کی رائے یہ ہے کہ جب یہ اس مفہوم میں آتا ہے تو بالکل اسی شکل میں استعمال ہوتا ہے اور فعلِ محذوف سے منصوب ہوتا ہے۔جس طرح معاذاللہ میں استعمال ہوتا ہے۔

معاندین اور متکبرین کا مطالبہ تھا کہ جس طرح محمد (ﷺ) پر فرشتے اترتے ہیں اسی طرح ہم پر بھی اترنے چاہئیں۔ان سے کہا جا رہا ہے کہ دنیا میں تو تم فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے البتہ تم آخرت میں فرشتوں کو دیکھو گے اور یا موت کے وقت فرشتوں کو دیکھ سکتے ہو، لیکن اس وقت فرشتوں کو دیکھنا تمہارے لئے خوش آئند نہیں ہوگا۔موت کے وقت فرشتوں کا وجود موت کو زیادہ اذیت ناک بنا دیتا ہے اور کافر انہیں دیکھتے ہی چیخنے لگتا ہے۔اور قیامت کے دن فرشتے انہیں ہانکتے اور مارتے ہوئے میدانِ حشر میں لائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے وہ دل کو دہلا دینے کیلئے کافی ہے۔وہی موقع ہے جب تم فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ اور اس وقت تم چیخو گے اور پکارو گے، اللہ کی پناہ، اللہ کی پناہ۔لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ تمہیں میسر نہیں آئے گی۔

Marfat.com

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

(اور ہم ان کے ہر اس عمل کی طرف جو انہوں نے کیا ہوگا متوجہ ہوں گے اور اس کو پراگندہ غبار بنادیں گے۔ ۲۳)

متکبرین کے اعمال کی حقیقت

دنیا میں ایسے لوگ ہر دور میں گزرے ہیں جو خدا کے انکار اور رسالت و نبوت کو قبول نہ کرنے کے باوجود دنیا میں بعض بھلائی کے کام بھی کرتے رہے اور بعض لوگوں نے محض اپنی شہرت اور عظمت کو اجاگر کرنے کیلئے بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیئے اور اسی بنا پر اپنی اپنی قوم سے توقع باندھی کہ وہ انہیں اپنا ہیرو تسلیم کریں۔ ایسے لوگ اولاً تو قیامت کے وجود ہی کو نہیں مانتے لیکن اگر کبھی بحث کی خاطر تسلیم بھی کرلیں تو ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر قیامت واقعی برپا ہوگئی تو اس روز بھی ہم اپنے کارناموں اور بھلائی کے کاموں کے باعث جنت کے مستحق ٹھہریں گے۔ ایسے لوگوں پر ضرب لگاتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ جن کارناموں اور کاموں پر ان لوگوں کو فخر ہے ہم سب سے پہلے ان کے انہی کارناموں کی طرف متوجہ ہوں گے اور انہیں ہوا میں ذروں کی طرح منتشر کردیں گے۔ کیونکہ جب تک عمل کرنے والے میں ایمان اور عمل میں اخلاص نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ هَبَآءً ان ذروں کو کہتے ہیں جو روشن دان سے آنے والی دھوپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نہایت باریک اور بے وزن ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ متکبر لوگ اپنے جن اعمال اور کارناموں پر اتراتے اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے کام آئیں گے ہم انہیں اس حد تک بے قدر و قیمت بنادیں گے جس طرح ہوا میں منتشر ذرات ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے ان کے اعمال کے بارے میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت حقارت آمیز ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بڑے سے بڑا عمل بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے نہ کیا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ابن جدعان جو عرب بھر میں بھلائی کے کاموں میں مشہور گزرا ہے، کیا اپنے بھلائی کے کاموں کی وجہ سے بخشا جائے گا یا نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا، نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ یا اللہ تو مجھے بخش دے۔ آیت کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے جہاں تحقیر کا پہلو نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے وہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نہایت برہمی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ کیونکہ آیت کے الفاظ بالکل اس طرح کے ہیں جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ میں تو اس بات کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتا ہوں۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾

(اس دن جنت والے بہترین ٹھکانے اور نہایت خوب آرام گاہ میں ہوں گے۔ ۲۴)

اہلِ جنت کا مقام و مرتبہ

کفار کے متکبر لوگ جو مسلمانوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے ان کا حال بیان کرنے کے بعد ان غریب اہلِ جنت کا حال بیان کیا جارہا ہے کہ وہ اس دن بہترین مستقر اور اعلیٰ ترین آرام گاہوں میں ہوں گے جبکہ کفار کو اس دن کی ہولناکی انتہائی کرب اور اذیت میں جلارہی ہوگی اور ایک پل ان کو آرام سے گزارنا نصیب نہیں ہوگا، اپنے پسینے میں ڈوبے ہوئے اپنے ہولناک انجام سے وحشت زدہ موت سے بدتر صورتحال سے دوچار ہوں گے۔ لیکن ان کے مقابل دنیا میں ان کی نگاہوں میں نہایت چھوٹے اور معمولی لوگ اعلیٰ ترین رہائش گاہوں میں

Marfat.com

آرام کررہے ہوں گے۔ مقیل قیلولہ کی جگہ کو کہتے ہیں۔ لیکن اس معنی کیلئے مخصوص نہیں، عام استعمال میں آرام گاہ اور عیش گاہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عرب میں چونکہ موسمِ گرما میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ سایہ دار درخت نہ ہونے کے برابر تھے اور دوپہر کا وقت بطورِ خاص شدید وقت ہوتا تھا۔ موسم کی شدت کے باعث عموماً کام روک دیئے جاتے تھے اور دوپہر کو لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔ میدانِ حشر کی گرمی بھی چونکہ بہت شدید ہوگی اس لئے باہمی مناسبت کے باعث یہاں مقیل کا لفظ لایا گیا کہ قیلولہ کرنے یعنی دوپہر کا آرام کرنے کا کوئی موقع کافروں کو تو کیا میسر آئے گا البتہ اہلِ جنت کیلئے ایسی سخت اذیت کی گرمی میں بھی آرام گاہیں میسر ہوں گی۔

آیتِ کریمہ میں خیر اور احسن تقابل کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ یہ دونوں لفظ خوب ترین اور بہترین کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾

(اور یاد کرو جس روز آسمان پھٹ جائے گا اور بادل نمودار ہوگا اور فرشتے گروہ در گروہ اتارے جائیں گے۔ ۲۵)

اس دن حقیقی بادشاہی خدائے رحمٰن ہی کی ہوگی اور وہ دن منکرین کیلئے بڑا سخت دن ہوگا۔ ۲۶)

قیامت کے دن فرشتوں کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ

وقوعِ قیامت کی منظر کشی کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے کہ اس دن آسمان پھٹ جائے گا اور اس کی جگہ سفید رنگ کا پتلا سا بادل لے لے گا جو کہر کی مانند ہوگا۔ (قرطبی) مفسرینِ کرام نے عام طور پر یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ صاحبِ بیان القرآن نے اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ آسمان شق ہو کر اس میں سے ایک رقیق بادل اترے گا جس میں فرشتے ہوں گے۔ یہ ابر بشکلِ سائبان آسمان سے آوے گا اور اس میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور اس کے گرداگرد ملائکہ ہوں گے۔ یہ حساب شروع ہونے کا وقت ہوگا اور اس وقت آسمان کا پھٹنا صرف کھلنے کے طور پر ہوگا، وہ پھٹنا نہیں ہوگا جو پہلی مرتبہ نفخۂ صور کے وقت آسمان زمین کو فنا کرنے کیلئے ہوگا۔ کیونکہ یہ نزولِ غمام جس کا ذکر آیت میں ہے نفخۂ ثانیہ کے بعد ہے جبکہ سب زمین و آسمان دوبارہ درست ہو چکے ہوں گے۔

اس روز جو کچھ بھی ہوگا اس کے پس منظر میں صرف ایک حکومت کارفرما ہوگی جو خداوند ذوالجلال کی ہوگی۔ جن معبودوں پر لوگوں کو بڑا ناز و اعتماد تھا وہ ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ حقیقی اختیار اور حقیقی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ یوں تو آج بھی اسی کی حکومت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت کچھ اختیارات انسانوں کو تفویض کر رکھے ہیں تاکہ انسانوں کی آزمائش کی جاسکے۔ اس سے بعض نادانوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجانے لگ جاتے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ کر اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیں گے اور دوسرے ہاتھ میں زمینوں کو لے لیں گے۔ اور پھر فرمائیں گے انا الملک انا الدیان این ملوک الارض این الجبارون این المتکبرون "میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، کہاں ہے وہ سرکش اور متکبر۔" ہر طرف سناٹا چھا جائے گا، کوئی دم نہ مار سکے گا۔ قرآنِ کریم میں سورۃ المومن میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لمن الملک الیوم لله الواحد القهار "پوچھا جائے گا، آج بادشاہی کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب آئے گا، اکیلے اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔"

Marfat.com

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِينَ عَسِيرًا ''وہ دن کافروں کیلئے بڑا مشکل ہوگا۔'' جب اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سواہر سہارا جواب دے جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا جلال ہر طرف برس رہا ہوگا۔ ہر شخص اپنے انجام کی فکر میں لرزاں وترساں انتظار میں کھڑا ہوگا، لیکن اہلِ ایمان اس وقت بھی خوش وخرم ہوں گے۔ لایحزنھم الفزع الاکبر ''انہیں وہ دل دہلا دینے والی گھبراہٹ غمناک نہ کرے گی۔'' حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ بارگاہِ رسالت میں عرض کی گئی کہ یارسول اللہ ایسے شدید ہولناک اور طویل ترین دن میں وقت کیسے کٹے گا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا والذی نفسی بیدہ انہ لیخفف علی المومنین حتی یکون اخف علیہ من صلوۃ مکتوبۃ یصلیھا فی الدنیا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کا عظیم الشان اور خوفناک دن ایک مومن کیلئے بہت ہلکا کردیا جائے گا حتیٰ کہ اتنا ہلکا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے۔''

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلاً ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلاَنًا خَلِيْلاً ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ۗ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلاً ﴿۲۹﴾

(اور جس دن اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا حسرت سے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول کی معیت میں نجات کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ۲۷) ہائے میری بدبختی، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ ۲۸) اسی نے مجھے گمراہ کرکے اس یاددہانی سے برگشتہ کیا، بعد اس کہ وہ میرے پاس آچکی تھی، اور شیطان انسان کیلئے بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے۔ ۲۹)

قیامت کے دن مکذبین رسول کی حسرت

ہاتھ کاٹنا، اظہارِ حسرت وندامت کی تعبیر ہے۔ اور یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی موجود ہے۔ اور ظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی مخالفت کی۔ اس طرح سے اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ کیونکہ جس رسول کی پیروی دینوی اور اخروی فلاح وکامرانی کی ضامن ہے جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ یقیناً اپنی دنیا اور عاقبت تباہ کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اپنے اوپر ظلم کرنا اور کیا ہوگا۔

کفار کو قیامت کی منظر کشی کے بعد توجہ دلائی گئی ہے کہ قیامت کے دن ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی مخالفت کی ان پر ایمان لانے کی بجائے خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔ قومی عصبیت اور جھوٹی دینی حمیت میں مبتلا ہوکر قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے دین کا راستہ روکا اور رسول اور ان کے ساتھیوں پر ظلم ڈھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، وہ قیامت کے دن اپنے انجام کو سامنے دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹے گا کہ کاش، میں نے رسول کی مخالفت نہ کی ہوتی اور میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس کی دوستی مجھے لے بیٹھی، اس کی صحبت نے رفتہ رفتہ مجھے اس یاددہانی سے غافل کردیا جس نے مجھے اپنی عاقبت کی فکر پیدا کی، جس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ دنیا دارالعمل ہے دارالجزاء نہیں۔ یہاں کے کئے ہوئے ایک ایک عمل کا کل کو حساب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول تمہارے اندر اس لئے مبعوث کیا ہے تاکہ تمہیں اس نظامِ زندگی کی خبر دے۔ اور تم اس پر عمل کرکے اپنی عاقبت سنوارلو۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جب میرے پاس آگئی تو میں اپنے دوستوں کی رفاقت اور

Marfat.com

صحبت میں ایسا بگڑا کہ میرا دل اپنے گھر سے ہی اچاٹ ہوگیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت میرے پاس نہ آئی ہوتی تو میں کوئی بھی عذر پیش کرسکتا تھا۔ اب اتمامِ حجت کے بعد میرے پاس کوئی عذر بھی باقی نہیں رہا۔

سیاقِ کلام کے اعتبار سے ان آیات کی تشریح میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کفایت کرتا ہے لیکن ہمارے آئمہ تفسیر کا خیال ہے کہ لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، مگر حکم عام ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ عقبہ بن ابی معیط مکہ کے مشرک سرداروں میں سے تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جب کسی سفر سے واپس آتا تو شہر کے معزز لوگوں کی دعوت کرتا تھا۔ اور اکثر رسول اللہ ﷺ سے بھی ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ حسبِ عادت اس نے معززینِ شہر کی دعوت کی اور رسول اللہ ﷺ کو بھی بلایا۔ جب اس نے آپؐ کے سامنے کھانا رکھا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارا کھانا اس وقت تک نہیں کھا سکتا جب تک تم اس کی گواہی نہ دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا کوئی شریک عبادت میں نہیں ہے، اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ عقبہ نے یہ کلمہ پڑھ لیا اور رسول اللہ ﷺ نے شرط کے مطابق کھانا تناول فرمالیا۔

عقبہ کا ایک گہرا دوست ابی بن خلف تھا۔ جب اس کو خبر ہوئی کہ عقبہ مسلمان ہوگیا ہے تو یہ بہت برہم ہوا۔ عقبہ نے عذر کیا کہ قریش کے معزز مہمان محمد (ﷺ) میرے گھر پر آئے ہوئے تھے، اگر بغیر کھانا کھائے میرے گھر سے چلے جاتے تو میرے لئے بڑی رسوائی تھی۔ اس لئے میں نے ان کی خاطر سے یہ کلمہ کہہ دیا۔ ابی بن خلف نے کہا کہ میں تیری ایسی باتوں کو قبول نہیں کروں گا جب تک تو جا کر ان کے منہ پر نہ تھوکے (نعوذ باللہ) یہ کمبخت بدنصیب دوست کے کہنے سے اس گستاخی پر آمادہ ہوگیا اور کر گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان دونوں کو ذلیل کیا کہ غزوۂ بدر میں دونوں مارے گئے اور آخرت میں ان کے عذاب کا ذکر اس آیت میں کیا گیا کہ جب آخرت کا عذاب سامنے دیکھے گا تو اس وقت ندامت وافسوس سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے گا اور کہے گا کاش! میں فلاں یعنی ابی ابن خلف کو دوست نہ بناتا۔ (مظہری وقرطبی)

ذکر سے مراد

آیتِ کریمہ میں الذکر کے لفظ سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکات بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ ایسی عظیم نعمت سے اگر کسی کی دوستی اور رفاقت محروم کردیتی ہے تو اس سے زیادہ نقصان کی بات اور کیا ہوگی۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نیک اور صالح دوست منتخب کرنے کی اور بدکار لوگوں کی دوستی سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: المرء مع من احب ''کہ انسان کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔'' اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے دوستی اور محبت کا رشتہ استوار کرے۔ فساق وفجار اور بدعقیدہ لوگوں کی صحبت سے دور بھاگے۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ''اور شیطان انسان کیلئے بڑا ہی بے وفائی کرنے والا ہے۔'' اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے کہ یہ کفار کا قول ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے برمحل تذکیر وتنبیہ ہے۔ اختلاف اپنی جگہ لیکن گنجائش دونوں طرح کے خیالات کی ہے۔ ایک تجربہ کار شخص جس نے زندگی بھر شیطان سے دوستی کی اور ہمیشہ اس کی پیروی کی، اگر وہ بیدار مغز آدمی ہے تو اس پر یہ بات واضح ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ ہر شیطان خواہ وہ انسان ہو یا جن، اس کا یہ شیوہ ہے کہ پہلے طرح طرح کے چکمے دے کر نافرمانی پر اکساتا ہے، بڑے سبز باغ دکھاتا ہے اور لحظہ بہ لحظہ انسان کو اپنے رب سے دور کرتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنی دوستی اور وفاداری کا یقین دلاتا ہے کہ آپ بے خوف وخطر کام کرتے چلے جائیں اور کسی قسم کا فکر واندیشہ نہ کریں۔ اولاً تو یہ راہ ہی ہر خطرے سے

Marfat.com

بالکل محفوظ ہے اور اگر بفرضِ محال کوئی خطرہ پیش آ ہی گیا، کسی مصیبت نے راستہ روک ہی لیا تو میں جان کی بازی لگا دوں گا اور آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔لیکن جب ان بدکرداریوں کا انجام کسی لاعلاج بیماری، کسی تباہ کن معاشی بدحالی یا کسی ناقابل برداشت مصیبت میں رونما ہوتا ہے تو یہ شیطان بالکل آنکھیں پھیر کر الگ ہو جاتا ہے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰

(اور رسول عرض کرے گا کہ اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ ۳۰)

مَهْجُوْرًا کا مفہوم اور اس سے مراد

مَهْجُوْرًا ...... یہ متعدد معانی کیلئے بولا جاتا ہے۔ اگر اسے ھَجر سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو کا قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ نہ اسے قبول کیا نہ اس سے کوئی اثر لیا۔ اور اگر ھُجر سے مشتق مانا جائے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا، دوسرے یہ کہ انہوں نے اسے اپنے ہذیان اور اپنی بکواس کا ہدف بنا لیا اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے رہے۔

آنحضرت ﷺ کی یہ شکایت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قیامت کے روز ہوگی یا اسی دنیا میں آپؐ یہ شکایت فرما چکے ہیں۔ احتمال دونوں صورتوں کا ہے۔ جن اہلِ علم نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دنیا ہی میں کافروں کے رویئے کے بارے میں شکایت فرمائی، وہ اس پر اگلی آیت کو قرینہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یعنی اگر یہ لوگ قرآنِ پاک کی عظمت کی کی پرواہ نہیں کرتے۔ نہ اس کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں بلکہ جب آپؐ سنانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ ہنگامہ کرتے اور منہ چڑاتے ہیں، اور بات بات پر اعتراض کرتے ہیں۔ تو آپؐ اس کی پرواہ مت کریں۔ ہر دور میں ہر نبی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

بعض دیگر اہلِ علم نے سورۃ المائدہ کی ان آیات سے جن میں رسولانِ گرامی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے دن جمع کرے گا اور ان سے ان کی امتوں کے بارے میں پوچھے گا اور ان کی گواہی پر امتوں کا فیصلہ ہوگا، استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جب اہلِ مکہ کے بارے میں سوال ہوگا تو اس وقت آپ پروردگار سے شکوہ کرتے ہوئے کہیں گے کہ میں نے تیری کتاب بڑی دلسوزی کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے پیش کی، لیکن ان لوگوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی، بلکہ نہایت ناقدری کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔ آنحضرت ﷺ کا یہ شکوہ ان بدبختوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا جس کے بعد ان کیلئے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

آنحضرت ﷺ کی شکایت میں مھجور کا لفظ استعمال ہوا ہے، کہ میری قوم نے اس قرآنِ کریم کو بالکل مھجور اور متروک کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت صرف کافر ہی کر سکتا ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کافر مراد ہے۔ لیکن بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر نہ اس کی تلاوت کی پابندی کرتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کی، وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا **من تعلم القرآن وعلق مصحفه لم يتعاهده ولم ينظر فيه جاء يوم القيمة متعلقا به يقول يارب العالمين ان عبدك هذا اتخذني مهجورا فاقض بيني و بينه** (قرطبی)

Marfat.com

''جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اس کو بند کر کے گھر میں معلق کر دیا اس کی تلاوت کی پابندی کی نہ اس کے احکام میں غور کیا، قیامت کے روز قرآنِ کریم اس کے گلے میں پڑا ہوا آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرے گا کہ آپ کے اس بندہ نے مجھے چھوڑ دیا تھا، اب آپ میرے اور اس کے معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّ نَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

(اسی طرح ہم نے جرائم پیشہ لوگوں میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور آپ کا رب کافی ہے آپ کیلئے منزلِ مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا۔ ۳۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے رویئے سے شکایت پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ کا آپؐ کے ساتھ سلوک کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہم نے جس نبی اور رسول کو بھی اہلِ دنیا کی ہدایت کیلئے بھیجا ہے ان کی قوم میں سے بگڑے ہوئے اور سر برآوردہ لوگوں نے (جنہیں یہاں مجرمین کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔) اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے انتہائی ہمدردی اور خیر خواہی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور خون کے گھونٹ پی پی کر انہیں راہ راست دکھانا چاہا، مگر ان لوگوں نے ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کی قدر کرنے کی بجائے ہمیشہ ان کو اذیتیں پہنچائیں اور ان کا مذاق اڑایا۔ تو یہ لوگ اگر آپ کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ اس راہ کی لازمی سنتیں ہیں اور یہ اس سفر کے لازمی تقاضے ہیں جن سے بہر حال عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ سب کچھ ہماری مشیت اور حکمت کے مطابق ہو رہا ہے۔ ہم نے یہی چاہا ہے کہ حق و باطل میں یہ کشمکش برپا رہنی چاہئے تا کہ اہلِ حق اس بھٹی سے کندن بن کر نکلیں اور اہلِ باطل کو یہ شکایت نہ رہے کہ ہمیں کسی نے سمجھانے بجھانے کی کوشش نہیں کی۔ اہلِ حق کے اجر و ثواب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے اور اہلِ باطل اپنے برے رویئے سے اپنی فائل موٹی کرتے رہیں۔ چنانچہ سنت اللہ کے مطابق ہر دور میں حق کے مقابلے میں یہی کچھ ہوتا رہا اور آئندہ بھی یہی کچھ ہوگا۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
یہ درسِ صلح دیتے ہیں وہ ان سے جنگ کرتا ہے

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم نے آپؐ کو مخالفین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ ان کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں آپؐ کی داعیانہ کاوشیں صبر اور استقامت کے ساتھ مسلسل جاری رہنی چاہئیں۔ لیکن جہاں اسباب کی دنیا ٹوٹتی دکھائی دے گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ قافلۂ حق کسی بند گلی میں رک کر رہ گیا ہے تو آپ کا رب آپ کو منزل کا راستہ دکھائے گا۔ ان کی تدبیروں کے مقابلے میں آپ کو کامیاب تدبیریں بجھائے گا۔ ان کی سازشوں کے توڑ کیلئے محفوظ راستوں کی خبر دے گا، ان کی افرادی قوت کے مقابلے میں آپ کے دلوں کو مضبوطی سے باندھ دے گا ان کی تنظیم کو انتشار کا شکار بنا کر آپ کی صفوں میں استحکام پیدا کرے گا۔ اس کی تائید و نصرت قدم قدم پر آپ کے ہم رکاب ہوگی، ان کے وسائل کی فراوانی آپ کے وسائل کی قلت کے سامنے بے وزن ثابت ہوگی۔ غرضیکہ مدد و رہنمائی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ

Marfat.com

آپ کو بہرہ ور نہیں فرمائے گا۔ بس آپ کا کام داعیانہ مساعی اور صبر و استقامت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ہے۔ البتہ ان کو پھل کرنا اور مثمر بنانا یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اس وعدے کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ مخالفین کی مخالفت اور معاندت اہلِ حق کو شکست دے سکتی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

(اور ان کافروں نے کہا کہ محمد (ﷺ) پر پورا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتار دیا گیا، ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کر دیں اور اسی لئے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے (تدریج و اہتمام کے ساتھ نازل کیا ہے)۔ ۳۲)

قرآنِ کریم کے بیک وقت نہ اترنے کی وجہ

اس آیتِ کریمہ میں معترضین کا ایک اور اعتراض ذکر فرمایا گیا ہے اور یہ ان کا بڑا دلپسند اعتراض ہے جسے وہ بار بار لوگوں کو بدگمان کرنے کیلئے پیش کرتے رہتے تھے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہ کتاب خدا کی نازل کردہ ہے تو اللہ تعالیٰ کا علم تو اس قدر وسیع اور اس قدر منضبط ہے کہ اسے سوچنے اور اہتمام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کتاب کو مختلف اجزاء اور مختلف اقساط میں مرتب کرنا یہ انسانوں کی کمزوری ہے۔ کیونکہ کتاب کے تمام تر مندرجات ایک وقت میں مصنف کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے نئے نئے گوشے واشگاف ہوتے جاتے ہیں، اور یہ بات بھی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے کہ وہ بیک وقت ایک کتاب کو وجود دے دے۔ وہ اپنی فطرت اور محدودیت کے باعث کتاب کا آغاز ایک لفظ سے کرتا ہے اور پھر یہ الفاظ ایک طویل وقت میں ایک کتاب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ایسی تمام کمزوریوں اور ایسی تمام قیود سے پاک ہے۔ بایں ہمہ قرآنِ کریم کا تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونا یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ محمد (ﷺ) اسے لکھنے کی خود محنت کرتے ہیں۔ جتنا لکھ لیتے یا لکھوا لیتے ہیں اور مدد کرنے والے جتنی معلومات بہم پہنچا دیتے ہیں اسے بنا سنوار کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جا رہی ہے اور اس کو تھوڑا تھوڑا وقفے وقفے سے نازل کرنا یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے اس کا دھیرے دھیرے نزول اور ٹھہر ٹھہر کے اترنا کسی کمزوری کے باعث نہیں بلکہ انسانوں کی ہدایت کے تقاضے کے مطابق ہے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے مندرجہ ذیل نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ اگر یہ کتاب محض کسی مقابلے میں پیش کرنے کیلئے تیار کی جاتی یا محض اس سے اظہارِ علم مقصود ہوتا تو یقیناً اسے ایک ہی بار مکمل شکل میں نازل ہونا چاہئے تھا لیکن اس کا نزول انسانوں کی اصلاح کی غرض سے ہوا ہے۔ اور جو لوگ اس کے اولین ہدف اور سب سے پہلے حاملین ہیں سب جانتے ہیں کہ وہ امی محض ہیں۔ ان کی غالب اکثریت کسی کتاب کو پڑھ نہیں سکتی۔ اور جس عظیم پیغمبر کو ان کی طرف بھیجا گیا ہے وہ بھی امی ہیں۔ وہ انہیں پڑھ کے سنا نہیں سکتے۔ تو ایک مکمل کتاب ان کیلئے پریشانی کا باعث تو ہو سکتی تھی، ہدایت کا نہیں۔

۲۔ یہ کتاب چونکہ کتابِ زندگی ہے جو انسانی زندگی کے ایک ایک باب کو زیرِ بحث لاتی اور اس کی اصلاح کرتی ہے۔ اصلاح کا عمل ایک ترتیب اور تدریج چاہتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے خیالات اور اعتقادات کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور جب تک یہ اصلاح ایک خاص حد تک نہیں پہنچ جاتی اس پر احکام کی عمارت کا اٹھانا بے نتیجہ مشق کے سوا کچھ نہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں صالح تبدیلی پیدا کئے

Marfat.com

بغیران پر احکام کا بوجھ لاد دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عرب کے بدو جو کسی منضبط زندگی کے عادی نہ تھے، احکام کی پابندیوں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے اور اصلاح کا یہ عمل آغاز ہی میں رک کر رہ جاتا۔

۳۔ احکام میں اخلاق کے علاوہ معاشرت، معاملات، سیاست، حکومت، تعلیم اور باہمی روابط جیسے بے شمار ابواب ہیں جن میں ایک ایسی سوسائٹی جو تمدن کے معمولی تقاضوں سے واقف نہ ہو۔ اس میں عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق کی اصلاح کا عمل تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن باقی تمام ابواب اس وقت تک نہیں کھولے جا سکتے جب تک ان میں جماعتی تشخص اور حیاتِ ملی کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ ایسے حالات میں کسی حد تک بھی ممکن نہیں ہوتا جہاں چھپ کر نمازیں پڑھنے پر مجبور ہونا پڑے اور جہاں کوئی بھی معاملہ اپنی مرضی سے کرنا ممکن دکھائی نہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی میں عقائد اور اخلاق کے علاوہ کم سے کم احکام نازل ہوئے۔

۴۔ ہجرت کا معنی سب کچھ چھوڑ کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنا ہے۔ اس میں تعلقات کا نیا تصور، نیا سماج، نئی شیرازہ بندی اور تحفظ کے نئے احساسات کی ضروریات وجود میں آتی ہیں۔ اور سب سے پہلے انہیں کی فکر کرنا پڑتی ہے اور مزید یہ کہ جب تک کسی شہر پر مکمل کنٹرول نہیں ہوتا تو مخلوط معاشرے میں زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ ان حالات میں ایک کتابِ قانون مکمل شکل میں اور کتابِ زندگی مکمل تفصیلات کے ساتھ ہاتھوں میں تھما دی جائیں تو تصور کیجئے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

۵۔ ایک ایسا معاشرہ جو زندگی کے نئے ضوابط کے ساتھ اپنی تعمیر کر رہا ہے اس پر اگر دنیا بھر کے دشمن حملہ آور ہو جائیں جو انہیں ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں زندگی کا وہ حصہ جو جنگی حکمتِ عملی سے تعلق رکھتا ہو وہی زندگی کا اصل ہدف بن جاتا ہے۔ اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے آداب اسی کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ اگر ایک ایسی کتاب جو زندگی کی تمام جہتوں سے متعلق احکام دیتی ہے اس کا اچانک بوجھ اگر ایسی ہنگامی صورت میں اجتماعی زندگی پر ڈال دیا جائے تو کبھی بھی اس کے نتائج وہ نہیں ہو سکتے جن کا حاصل کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ان چند نکات پر غور کر لیا جائے تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ قرآنِ کریم کو کیوں نجماً نجماً ایک تدریج کے ساتھ نازل کیا گیا۔ اس کی حکمتیں خود بخود سامنے آنے لگتی ہیں۔ لیکن اگر یہ باتیں سامنے نہ ہوں تو بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے کہ قرآنِ کریم کا نزول یکبارگی کیوں نہ کر دیا گیا؟

ہم نے جن نکات کا ذکر کیا ہے یہ صرف امتِ اسلامیہ کی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی جو امتیں گزری ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے کتابیں اتاری ہیں جنہیں ہم آسمانی صحائف کہتے ہیں ان میں سے کوئی صحیفہ بھی بیک دفعہ نازل نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے یہ خیال کیا ہے اس کا خیال ان صحائف سے بے خبری پر مبنی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تورات کے احکامِ عشرہ بیک دفعہ نازل ہوئے ہیں، باقی ساری کتاب مختلف اوقات میں ضرورت کے تحت نازل ہوتی رہی۔ ان میں بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے متعلق قرآن اور تورات دونوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت سے پہلے نازل ہوئے ہیں۔ بہت سے احکام دریا کے عبور کے بعد یا صحرائے سینا کی زندگی کے دور میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی طرح انجیل تمام تر سیدنا مسیح علیہ السلام کے مواعظِ حکمت پر مشتمل ہے جو مختلف مواقع پر حسبِ اقتضائے حالات آپ پر نازل ہوئے۔ یہی حال باقی صحائف کا بھی ہے۔ یہ تمام صحائف تھوڑا تھوڑا کر کے وقفے وقفے کے ساتھ نازل ہوئے کیونکہ ان کتابوں کے ذریعے ان رسولوں نے جن پر یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں قوم کا علاج اور تزکیہ کرنا تھا۔ ان کیلئے ضروری تھا کہ ایک تدریج کے ساتھ اصلاح کے عمل کو آگے بڑھائیں۔ چنانچہ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت قرآنِ کریم کے بارے میں بھی روبہ عمل آئی ہے کہ اس کو بھی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے۔

Marfat.com

سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم کو تدریجاً نازل کرنے کی کئی حکمتیں بیان ہوئی ہیں جن کو ہم ایک ترتیب کے ساتھ عرض کردیتے ہیں۔

۱۔ اس طرح لوحِ قلب پر یہ اچھی طرح نقش ہوجاتا ہے۔

۲۔ ہر آیت کا مفہوم خوب ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

۳۔ ضرورت کے موقع پر آیات کا نزول ہوگا تو دلالاتِ لفظیہ کے ساتھ جب قرائنِ حالیہ بھی مل جائیں گے تو آیات کا مفہوم اور مصداق زیادہ واضح ہوجائے گا۔

۴۔ ہر موقعہ پر جب وحیِ الٰہی اترے گی تو دل کو اطمینان رہے گا کہ جس خالق نے مجھے اس کارِ عظیم کو سرانجام دینے کیلئے مقرر فرمایا ہے اس کی نظرِ عنایت ہر وقت میرے شاملِ حال ہے۔

۵۔ کیونکہ یہ ایک دستورِ حیات ہے اس کو تدریجاً نافذ کرنا ہی مناسب ہے تاکہ اس کو اپنانے میں آسانی ہو۔ اگر کسی قوم کو اپنے تمام اطوار و رسوم کو یکبارگی ترک کرکے بالکل جدید دستورِ حیات اپنانے کا حکم دیا جائے تو اس کیلئے بڑا مشکل ہوجاتا ہے لیکن اگر آہستہ آہستہ احکام نازل ہوں تو اس طرح ان پر عمل کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿۳۳﴾

(وہ آپ پر کوئی اعتراض پیش نہیں کریں گے مگر ہم اس کا صحیح جواب اور اس کی بہترین توجیہ آپ کو بتادیں گے۔ ۳۳)

قرآنِ کریم کے تدریجاً نزول کی ایک اور حکمت

قرآنِ کریم کیوں تدریجاً نازل کیا گیا، اس کی ایک حکمت پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی بیان فرمائی گئی، وہ یہ ہے کہ جب بھی نبی کریم ﷺ ان کے سامنے قرآنِ کریم کی دعوت یا قرآنِ کریم کا کوئی حکم پیش کرتے ہیں تو وہ اپنی عادت کے مطابق اس پر عجیب و غریب سوالات اٹھاتے ہیں، الٹے سیدھے اعتراض کرتے ہیں اور نئے سے نئی باتیں نکالتے ہیں۔ ''مثل'' کا اطلاق ان تمام باتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ وہ جو سوال بھی کریں ہم اس کا بہترین جواب آپ پر اتاریں۔ کوئی سوال اٹھائیں تو ہم اس کی توجیہ و تفسیر آپ پر نازل کردیں۔ اس طرح سے آپ کی دعوت کے راستے کے کانٹے سمٹ جائیں گے، علمی دشواریاں دور ہوتی جائیں گی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے راستے میں ایسے کندہ ناتراش لوگوں سے واسطہ پڑجاتا ہے جو ماحول کو پراگندہ کرتے اور حالات کو بے قابو کردیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک داعی کو جہاں علمی کمک کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں قرآنِ کریم جب اترتا ہے تو جہاں وہ سوالوں اور اعتراضات کا جواب لے کر آتا ہے، وہیں حوصلے کے اصل سرچشمے سے سیرابی اور وابستگی کا سامان لے کر بھی آتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی ضرورت بار بار انبیائے کرام کو پیش آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ انہیں دنیا کیلئے مینارۂ نور بناتا ہے اس لئے ان کی رہنمائی اور ان کے طرزِ عمل میں کسی کمزوری کا شائبہ بھی باقی نہیں چھوڑتا تاکہ قیامت تک آنے والے لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں۔

Marfat.com

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

(جولوگ ہانکے جائیں گے اوندھے منہ جہنم کی طرف، ان کا بہت برا ٹھکانہ ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے۔ ۳۴)

سابقہ آیت میں آنحضرت ﷺ کو اپنی تائید ونصرت سے نوازنے کا یقین دلایا اور اس طرح سے آپؐ کو تسلی اور اطمینان کا سامان فراہم کیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا انجام ذکر فرمایا جن کی سوچ الٹی، دماغ ٹیڑھا اور ارادے فاسد ہیں۔ وہ ہر وقت الٹے سیدھے اعتراضات سوچتے اور الجھاؤ ڈالنے کیلئے الجھے ہوئے سوالات کرتے ہیں۔ تو جس طرح ان کے دماغوں نے ہمیشہ الٹا سفر کیا، قیامت کے دن ان کو منہوں کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ وہ جس طرح دنیا میں اوندھے چلتے رہے، قیامت کے دن بھی اوندھے منہ چلائے جائیں گے اور یہ لوگ سب سے زیادہ برے ٹھکانے میں ہیں اور سب سے زیادہ راہ کھوئے ہوئے ہیں۔ تو ایسے گم کردہ راہ لوگوں کی اصل منزل اور ان کا اصل ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ
جَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿۳۶﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا
الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ
عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ
ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾ وَ
لَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا
يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۴۰﴾ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ
اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ
اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ

Marfat.com

الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ
اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ
اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

رکوع: ۴۔ (اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو ان کا مددگار بنایا۔ ۳۵) پس ہم نے ان سے کہا کہ تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی، آخر کار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۳۶) اور قومِ نوح کو بھی جبکہ انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہم نے ان کو غرق کر دیا، اور ہم نے انہیں لوگوں کیلئے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ہم نے ان ظالموں کیلئے ایک دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ ۳۷) اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کی بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ ۳۸) ہم نے ان میں سے ہر ایک کو مثالیں دے دے کر سمجھایا اور بالآخر ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا۔ ۳۹) اور یہ لوگ تو اس بستی پر سے گزر چکے ہیں جس پر بدترین بارش برسائی گئی، کیا یہ اس کو دیکھتے نہیں رہے ہیں بلکہ یہ لوگ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے۔ ۴۰) اور یہ لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو مذاق بنا لیتے ہیں، (کہتے ہیں) کیا یہ شخص ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ۴۱) اس شخص نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا، اگر ہم ان پر جم نہ گئے ہوتے، اور وہ وقت دور نہیں جب یہ عذاب دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ سب سے زیادہ گمراہ کون ہے۔ ۴۲) کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے، کیا آپ ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہیں؟ ۴۳) کیا آپ گمان رکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں، یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ۴۴)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿۳۵﴾ ۚ

(اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو ان کا مددگار بنایا۔ ۳۵)

قریش کو تنبیہ کیلئے تاریخِ انبیاء سے استدلال

گزشتہ آیات میں قریش اور دیگر اہلِ مکہ آنحضرت ﷺ کی نبوت اور قرآنِ کریم کے حوالے سے جو مختلف قسم کے اعتراضات کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا انجام بھی بیان کیا گیا ہے جس سے وہ قیامت کے دن دوچار ہونے والے ہیں۔ اب پیشِ نظر آیات میں بعض جلیل القدر انبیائے کرام اور ان کی قوموں کی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے مزید سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمہیں اگر اپنے انجام کی فکر نہیں اور اس سے فکرمند ہو کر اپنے رویئے پر نظرثانی کرنے کو تیار نہیں ہو تو تم سے پہلے کئی قومیں گزر چکی ہیں اور ان

Marfat.com

کی طرف متعدد رسول مبعوث ہو چکے ہیں اور ان کے حالات اور ان کی تباہ شدہ بستیوں کے احوال سے تم کسی حد تک واقف ہو۔ تو کیا اس آئینہ میں تم اپنے انجام کو دیکھ نہیں سکتے، کہ جس طرح تمہاری طرف ایک رسول آیا اور تم اس کی تکذیب کر رہے ہو، اسی طرح ان قوموں کی طرف بھی رسول آئے اور انہوں نے ان کی تکذیب کی۔ تو وہ اس جرم کی پاداش میں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہی جرم تم کرو تو اللہ تعالیٰ کا عدل کیا تمہیں چھوڑ دے گا، اور تم اس کی گرفت سے اس لئے بچ جاؤ گے کہ تم بیت اللہ کے متولی اور اس کے جوار میں رہنے والے ہو۔

سب سے پہلے حضرت موسیٰ ؑ کا ذکر ان کی جلالتِ قدر اور شہرت کے باعث

گزشتہ قوموں اور ان کی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے بنی اسرائیل کے سب سے زیادہ جلیل القدر صاحب کتاب و شریعت نبی اور رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، کہ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی۔ اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو مددگار بنایا۔ اس آیت میں سب سے پہلی بات جو قابلِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دی گئی اور ان کی درخواست پر حضرت ہارون علیہ السلام کو ان کا شریک کار بنایا گیا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ وہ کتاب جو تورات کے نام سے معروف ہے۔ وہ مصر سے خروج کے بعد وادیِ سینا میں آپ ؑ کو دی گئی جس کا آغاز ان احکامِ عشرہ سے ہوتا ہے جو طورِ سینا پر سنگین کتبوں کی شکل میں آپ کو دیئے گئے۔ اور یہاں جس کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اس کا تعلق تو اس وقت سے ہے جب آپ ؑ کو منصبِ نبوت پر سرفراز کیا گیا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کتاب سے مراد کیا ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جو نبوت کے منصب پر مامور ہونے کے وقت سے لے کر خروج تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی جاتی رہیں۔ ان میں وہ خطبے بھی شامل ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں دیئے اور وہ ہدایات بھی شامل ہیں جو فرعون اور اور آلِ فرعون کیخلاف جدوجہد کے دوران آپ ؑ کو دی جاتی رہیں۔ قرآنِ مجید نے جگہ جگہ ان کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن تورات میں ان چیزوں کا کہیں وجود نہیں۔ ہماری ناقص رائے میں ان ہدایات کی حیثیت وہی ہے جو آنحضرت ﷺ کی احادیث کی ہے۔ آپ ؐ کی تیئس سالہ تبلیغی مساعی اور غلبۂ دین کی کاوشوں کے سلسلے میں جو ہدایات دی جاتی رہی ہیں ان میں جو اصولی احکام ہیں وہ تو قرآنِ کریم کی شکل میں نازل ہوئے۔ لیکن جو تشریحی امور ہیں اور جن کا تعلق غلبۂ دین کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات سے ہے انہیں مضمون اور مفہوم کی شکل میں عموماً آنحضرت ﷺ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا گیا۔ اور آپ ؐ نے ان کے مطابق ہدایات بھی دیں اور احکام کی وضاحت بھی فرمائی۔ اور جہاں کہیں ضرورت لاحق ہوئی عمل کی صورت آرائی بھی کی۔ یہی کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی جانی والی ہدایات کی ہے۔ رہی یہ بات کہ انہیں کتاب کا نام دیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی احادیث اور سنت، کتاب کی تشریح و تعبیر اور تفصیل و وضاحت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور کتاب اللہ کے اقوال کو عملی شکل دینے اور اداراتی سانچے میں ڈھالنے کی کاوش ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کتاب سے ہٹ کر کوئی اجنبی چیز نہیں ہوتی۔ ثبوت کے اعتبار سے دونوں میں فرق ضرور ہے لیکن عمل کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت اہتمام دعوت کے حوالے سے

دوسری بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اظہار و بیان کے حوالے سے اپنے طبعی اشکال کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو رسالت دینے، آپ کا وزیر بنانے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں معاون بنانے کی درخواست کی۔ اور یہ فرمایا کہ واخی ھارون ھو افصح منی لسانا ”میرے بھائی ہارون بیان و اظہار میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔“ اور میں اپنے اندر جرأتِ اظہار میں کمی پاتا ہوں۔ تو انہیں میرے ساتھ لگا دیجئے تاکہ ہم دونوں مل کر اس کارِ عظیم کو انجام دے سکیں۔ کسی رسول کی دعا

Marfat.com

سے دوسرے شخص کو رسول بنا کر اس کا معاون و مددگار بنا دینا تاریخ رسالت میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ایک غیر معمولی احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا ہے۔ اور قرآنِ کریم بار بار اس احسان کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیت میں بھی اس احسان کا ذکر اس حوالے سے کیا جا رہا ہے کہ قریش کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ مصر کی اصلاح کیلئے کس قدر اہتمام سے کام لیا تھا، کہ ایک نہیں بیک وقت دو دو رسولوں کو ان کی طرف مبعوث کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے ابلاغ اور لوگوں کی تفہیم میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس طرح تبلیغ و دعوت کا حق بھی ادا ہو جائے گا اور اتمامِ حجت بھی ہو جائے گا۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان و اہتمام کی کوئی قدر نہ کی، تو پھر ان کا جو انجام ہوا تو تم اس سے واقف ہو اور اگلی آیت میں نہایت اختصار سے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۭ ﴿٣٦﴾

(پس ہم نے ان سے کہا کہ تم دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی، آخر کار ان لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۳۶)

یہاں نہایت اجمال کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قومِ فرعون کی سرگزشت کی طرف اشارہ مقصود ہے اس لئے صرف دو فقروں میں اس کو سمیٹ دیا گیا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ تم دونوں قومِ فرعون کی طرف ان کی ہدایت کیلئے جاؤ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دو۔ وہ جس کفر اور شرک کا شکار ہیں اس کی غلطی ان پر واضح کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی بندگی اور اطاعت کو پوری طرح کھول کر ان کے سامنے بیان کرو تا کہ اگر وہ ہدایت قبول کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ چنانچہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول ان کے پاس گئے اور افہام و تفہیم کا پوری طرح حق ادا کیا۔ لیکن انہوں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی اور جھٹلایا۔ سوال یہ ہے کہ یہاں آیات سے مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد تورات کی آیات لی جائیں تو یہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ابھی تورات آپ پر نازل نہیں کی گئی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس سے وہ معجزات مراد لئے جائیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور آلِ فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے دکھائے۔ آپ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ بہت بڑا اژدھا بن گیا۔ اپنے ہاتھ کو بغل میں دبا کر نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگا۔ یہ دو معجزات آپ کی ماموریت کی دلیل تھے۔ کیونکہ معجزہ ایک ایسے عمل کو کہتے ہیں جس کا ظہور پیغمبر کے ہاتھ سے ہوتا ہے اور اس کی نظیر لانا کسی اور کے بس میں نہیں ہوتا، اور کوئی اس کا توڑ بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے عمل کا ظہور اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جس کے ہاتھ پر اس معجزے کا ظہور ہو رہا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہے۔ لیکن فرعون اور آلِ فرعون نے اسے سحر قرار دے کر مسترد کر دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد انسان کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بیشمار نشانیاں ہوں جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں۔ ہر عقلمند آدمی جب ان پر غور کرتا ہے تو اگر وہ تحفظاتِ ذہنی یا گروہی تعصبات کا شکار نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن ان لوگوں نے ایسی تمام نشانیوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات پر دلیل ماننے سے انکار کر دیا۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے اور یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ آیات سے مراد توحید اور آخرت کے دلائل اور زیادہ تشریعی احکام ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان تک پہنچے۔ اور جن کی تبلیغ بعد میں ایک مدت تک بنی اسرائیل کے صلحاء کرتے رہے۔ ان لوگوں نے ایسی تمام آیات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ان میں سے ہر ایک کو سحر یا پرانے وقتوں کی باتیں کہہ کر مسترد کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

Marfat.com

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۳۷

(اور قومِ نوح کو بھی جبکہ انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہم نے ان کو غرق کر دیا، اور ہم نے انہیں لوگوں کیلئے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ہم نے ان ظالموں کیلئے ایک دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ ۳۷)

حضرت نوحؑ کا ذکر اولین رسول اور دیگر بعض خصوصیات کے باعث

گزشتہ دو آیتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر سب سے پہلے شاید اس لئے کیا گیا کہ اہلِ کتاب کی وجہ سے قریش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت سے آگاہ تھے۔ اور ان کی وجہ سے فرعون اور آلِ فرعون پر جو عذاب آیا اس کا تذکرہ اکثر وہ اہلِ کتاب سے سنتے رہتے تھے۔ اور اب قومِ نوح کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ طوفانِ نوح کے واقعات سینہ بہ سینہ نسلاً بعدِ نسلٍ قریش تک پہنچ چکے تھے اور لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول بھی ہیں اور دنیا کی تباہی کے بعد آدم ثانی بھی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کیا، شرک کی مذمت کی، اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف بلایا اور پھر چند سالوں تک نہیں، ساڑھے نو سو سال تک آپؑ نے ان میں حقِ رسالت ادا کیا۔ اور اس قدر جان ماری اور لوگوں کی اذیتیں برداشت کیں کہ تاریخِ مذہب میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن آپؑ کی قوم نے آپؑ کی بات سن کے بھی نہیں دی۔ بہت مختصر تعداد میں لوگ آپؑ پر ایمان لائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفانِ باد و باراں مسلط کیا اور زمین کے سوتے کھول دیئے گئے۔ بجز ان لوگوں کے جو آپؑ پر ایمان لائے، کسی شخص کو زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ اور یہ ایک ایسا ہولناک واقعہ تھا کہ طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود بھی لوگوں کے ذہنوں سے کبھی فراموش نہ ہوا۔ ہر نسل نے دوسری نسل کو یہ داستان پہنچائی اور اس طرح سے اس تباہ ہونے والی قوم کو تمام دنیا کے انسانوں کیلئے عبرت بنا دیا۔ تاکہ ہر دور کا انسان اس سے سبق حاصل کرے کہ جو لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں بالآخران کا حشر یہ ہوا کرتا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ایک پوری قوم کا طوفان میں ڈبو دیا جانا اور ہلاک کر دینا ایک بہت بڑی سزا تھی، لیکن جو لوگ صدیوں تک اللہ تعالیٰ کے رسول کی نہایت ہمدردی و غمگساری پر مبنی تبلیغ و دعوت کے باوجود ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں، ان کیلئے یہ سزا کافی نہیں۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار جبکہ وہ کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کے اختیارات میں کسی اور کو شریک کرنے کی جسارت اتنا بڑا جرم ہے جس کیلئے بڑی سے بڑی سزا بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے ہم نے ایسے ظالموں کیلئے آخرت میں دردناک عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ یہاں بھی وہ دنیا کیلئے نمونۂ عبرت بنے رہے اور آخرت میں بھی ان کی سزا عذابِ الیم ہوگی۔

ایک رسول کا انکار، سب کا انکار

اس آیت میں ''الرسل'' کا لفظ قابلِ غور ہے۔ ''الرسل'' رسول کی جمع ہے حالانکہ قومِ نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی اور آپؑ کو جھٹلایا تھا۔ آپؑ کی موجودگی میں کوئی دوسرا رسول مبعوث نہیں ہوا۔ لیکن الرسل کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔ ظاہر ہے یہ امرِ واقعی کے مطابق نہیں۔ اس کا ایک جواب بعض اہلِ علم نے یہ دیا کہ اس طریقِ تعبیر سے

Marfat.com

مقصود اس جرم کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو لوگ کسی ایک رسول کی تکذیب کرتے ہیں وہ درحقیقت سب رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام رسولوں کا پیغام ایک ہے، اور ان کا بھیجنے والا بھی ایک ہے۔ جو شخص ایک رسول کو ماننے سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت سلسلۂ رسالت اور سرچشمۂ رسالت کا انکار کرتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا نام کہنے تو ایک پیغمبر کا نام ہے، لیکن ان کا انکار سلسلۂ نبوت کا انکار ہے۔ مولانا روم کے اشارات اس معاملے میں از بس لطیف واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں فرمایا اور وہی بات حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں کہی جا سکتی ہے:

نامِ احمد نامِ جملہ انبیاء است
چونکہ صد آمد نود ہم پیشِ ما است

بعض اہلِ علم نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ قومِ نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کا انکار اس بنیاد پر کیا تھا کہ تم ایک بشر ہو اور بشر کبھی رسول نہیں ہو سکتا۔ وہ بشر کو ایک فروتر مخلوق سمجھتے تھے اور رسالت کا منصب ان کے نزدیک کسی برتر مخلوق کا استحقاق ہے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ تک جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں وہ سب بشر تھے۔ تو اگر بشریت اور نبوت میں منافات ہے اور اس کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا جا سکتا ہے تو پھر باقی انبیاء کو ماننے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ تو اس سے نتیجہ خود بخود یہ نکلتا ہے کہ انہوں نے ایک رسول کا انکار نہیں کیا بلکہ سب رسولوں کا انکار کر دیا۔

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاْ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًاۢ بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

(اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس اور بیچ کی صدیوں کی بہت سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ ۳۸)

یہاں فعل اَهْلَكْنَا قرینے کی دلالت کے باعث محذوف ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے قومِ فرعون اور قومِ نوح کو تباہ کیا صرف اس بنیاد پر کہ انہوں نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی۔ اسی طرح ہم نے قوم عاد، قوم ثمود اور اصحابِ الرس اور ان کے درمیان کئی صدیوں میں گزرنے والی قوموں کو تباہ کر دیا۔ ان کا جرم بھی صرف یہ تھا کہ جو رسول ان کی طرف مبعوث ہوئے انہوں نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جب تک وہ اپنی تبلیغی مساعی میں مصروف رہے انہوں نے کبھی انہیں آرام سے جینے نہ دیا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب نے آ کر ان کا کام تمام کر دیا۔

اصحابُ الرس سے کیا مراد ہے؟

اس آیت میں قومِ عاد اور قومِ ثمود تو تاریخ میں جانی پہچانی قومیں ہیں اور عرب ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ البتہ اصحاب الرس کے بارے میں کوئی متعین بات کہنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آج تک تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ تھے۔ ابنِ جریر نے متعدد نام ذکر کئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر ان کو خود بھی اطمینان نہیں۔ صاحب کشاف نے دوسرے ناموں کے ساتھ ساتھ قوم شعیب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ سورۃ ق میں اصحاب الرس اور اصحاب الایکۃ دونوں نام الگ الگ اور مستقل قوموں کیلئے آئے ہیں اور اصحاب الایکۃ سے خود قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق اصحابِ مدین یعنی حضرت شعیب کی قوم کے لوگ مراد ہیں۔ اگر اصحاب الرس سے مراد قومِ شعیب ہوتی تو پھر اس کے ساتھ اصحاب الایکۃ کے ذکر کا کیا محل تھا۔

Marfat.com

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قومِ ثمود کے کچھ بقایا تھے جو کسی کنویں کے پاس رہتے تھے، لیکن یہ محض ایک قول ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں اس سے اسماعیلی قبائل کے بارہ سلسلوں میں سے قیدار کو مراد لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کے حالات بالکل مجہول ہیں۔ حالات کے مجہول ہونے سے قطع نظر بنی اسماعیل میں آنحضرت ﷺ کے سوا کسی رسول کی بعثت ثابت نہیں۔ اور یہاں اصحاب الرس کا ذکر جس سیاق میں آیا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اور انہوں نے عاد و ثمود کی طرح اس کی تکذیب کی۔

اس وضاحت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اصحاب الرس کے بارے میں کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی قوم تھی جو کسی کنویں کے پاس آباد تھی۔ اور اس بدبخت قوم نے اپنی طرف مبعوث ہونے والے پیغمبر کو کنویں میں پھینک کر یا لٹکا کر مارا تھا۔ عربی زبان میں پرانے کنویں، کچے کنویں یا اندھے کنویں کو ''رس'' کہتے ہیں۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ﴿٣٩﴾

(ہم نے ان میں سے ہر ایک کو مثالیں دے دے کر سمجھایا اور بالآخر ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا۔ ۳۹)

ضربِ مثل کا مفہوم

ضرب مثل کا معنی ہوتا ہے کسی بات کو تمام ممکن ذرائع اور لوازم کے ساتھ واضح کر دینا۔ جس میں مثالیں بھی شامل ہیں، تذکیر و تنبیہ بھی، اور ہر بات کی پوری تفصیل بھی۔ پیشِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ بات کو اتنا کھول دیا جائے اور اس کے عواقب و نتائج کو اتنا واضح کر دیا جائے کہ سننے والے کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ کیونکہ حقائق کو سپاٹ انداز میں بیان کر دینے سے بات کہنے کا حق تو ادا ہو جاتا ہے لیکن تفہیم و تشریح کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس کیلئے اگر حقائق کو مصور و ممثل کر دینے کی ضرورت پڑے اور تاریخ کے احوال و واقعات کا سہارا لینا پڑے تو یہ عین مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول چونکہ لوگوں پر حجت تمام کرنے کیلئے آتے ہیں، اس لئے وہ صرف اصول و ضوابط بیان کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ تمثیلات اور تاریخ کے امثال و واقعات سے بات کو اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا انہیں یہ شکایت کبھی نہیں رہی کہ ان کی طرف بھیجے جانے والے رسول نے تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی کی یا افہام و تفہیم میں کوئی کمزوری رہ گئی ہے۔ ان کے انکار کا سبب ان کی ہٹ دھرمی، تکبر و غرور یا عالمِ غیب کے حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے پر اصرار تھا۔ اور جب کوئی قوم اس سطح پر اتر جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق قہرِ الٰہی اس پر برستا ہے اور وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا ﴿٤٠﴾

(اور یہ لوگ تو اس بستی پر سے گزر چکے ہیں جس پر بدترین بارش برسائی گئی، کیا یہ اس کو دیکھتے نہیں رہے ہیں بلکہ یہ لوگ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے۔ ۴۰)

Marfat.com

قومِ لوط کی بستی سے استشہاد

اس آیتِ کریمہ میں معذب قوموں کی تاریخ کے سلسلے میں قومِ لوط کی بستی کی طرف اشارہ کیا گیا، اور ایک مشاہداتی دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بستی ان کیلئے اجنبی نہیں، اپنے تجارتی اسفار میں یہ بار ہا اس بستی کے کھنڈرات سے گزرتے ہیں۔ ملکِ شام یا فلسطین کو جاتے ہوئے یہ ان کی گزرگاہ ہے چونکہ اس بستی کی تباہی غیر معمولی نوعیت کی ہے اور آس پاس کے رہنے والے بھی قومِ لوط کی عبرتناک داستانیں پوچھنے والوں کو سناتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس بستی سے متعلق کوئی بات قریش سے مخفی نہیں۔ اور جو عظیم تباہی اس بستی پر آئی، اس سے بھی عرب کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس قوم کی تباہی صرف زلزلے یا کسی طوفانِ باد و باراں سے نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تباہی اور ہلاکت کی بیشتر قوتوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ دھرتی الٹ ڈالی گئی، پھر پتھروں کی بارش کی گئی۔ آج ڈیڈ سی کے قرب و جوار میں ان کے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں۔ قریش سے کہا جا رہا ہے کہ اولاً تو قومِ عاد و ثمود کی بستیاں بھی تمہاری آگاہی سے دور نہیں۔ لیکن قومِ لوط کی بستیاں تو بالکل تمہارے راستے میں ہیں۔ تو کیا اس کی تباہی کو دیکھ کر بھی تمہیں خیال نہیں ہوتا کہ کہیں تم بھی اس انجام سے دوچار نہ کر دیئے جاؤ۔ کیونکہ جس جرم میں وہ پکڑے گئے تھے اسی جرم کا ارتکاب تم بھی شب و روز کر رہے ہو۔

آیت کے آخر میں قریش کا ان تمام آثار و مشاہدات سے متاثر نہ ہونے کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ ان بستیوں سے گزرنے کے باوجود بھی متاثر اس لئے نہیں ہوتے کہ یہ لوگ قیامت کے آنے، از سرِ نو زندہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جوابدہی کا یقین نہیں رکھتے۔ کسی کام کے نتائج اور کسی عمل کے اثرات کی پرواہ اس شخص کو ہوتی ہے جسے اپنے اعمال اور اپنے کاموں کے بارے میں کہیں جوابدہی کا اندیشہ ہو۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتا ہے کہ جب مجھے اس کام سے متعلق پوچھا جائے گا تو اگر میں نے اسے صحیح انجام نہیں دیا تو میں کیسے جوابدہی کر سکوں گا۔ لیکن اگر اسے اس بات پر یقین ہو کہ مجھے کہیں جوابدہی کیلئے کھڑا نہیں کیا جائے گا، کوئی عدالت مجھے طلب نہیں کر سکتی، میری زندگی کا چراغ گل ہو جانے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں جلے گا، میں مرنے کے بعد فنا ہو جاؤں گا۔ تو اسے اس بات کی فکر کیسے ہو سکتی ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ فرمایا گیا ہے کہ قریش کا اصل مسئلہ صرف یہ ہے وہ دوبارہ جی اٹھنے پر یقین نہیں رکھتے۔ تو اس لئے جو جی میں آتا ہے کر رہے ہیں۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

(اور یہ لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو مذاق بنا لیتے ہیں، (کہتے ہیں) کیا یہ شخص ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ۴۱) اس شخص نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا، اگر ہم ان پر جم نہ گئے ہوتے، اور وہ وقت دور نہیں جب یہ عذاب دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ سب سے زیادہ گمراہ کون ہے۔ ۴۲)

جب کوئی قوم اپنی گمراہی میں تباہی کے قریب پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر احسان فرماتے ہوئے ان میں اپنا رسول مبعوث کرتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو تباہی سے بچا کر راستی اور کامرانی کے راستے پر ڈال دے۔

Marfat.com

قریش کی بدنصیبی

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ساتھ بلاواسطہ اہلِ مکہ پر یہ احسان فرمایا کہ ان کو تباہی سے بچنے کا ایک راستہ دیا کہ اگر تم ہمارے رسول پر ایمان لے آؤ اور قرآنِ کریم کی تعلیمات کو قبول کرو تو تم جس تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ہو، اس سے بچ کر دنیا اور آخرت کی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہو، لیکن ان بدبختوں کا حاصل یہ ہے کہ بجائے اللہ تعالیٰ کے احسان کو جاننے اور اس کے حق کو ادا کرنے کے جب بھی آنحضرت کو دیکھتے ہیں تو ازراہِ طنز وتحقیر یہ کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہیں وہ صاحب جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی یہ غریب آدمی ہیں، کوئی ٹھاٹ باٹھ اور کروفر نہیں رکھتے، کسی باغ کے مالک نہیں، کوئی خزانہ ان کی تحویل میں نہیں، کسی قبیلے کے سردار نہیں۔ ثروت ورفاہیت کی کسی بات کا ان پر دور دور تک اثر نہیں۔ تو آخر کس بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا رسول بنا دیا ہے۔ اس طرح مذاق اڑاتے ہوئے آپ کو لوگوں کی نگاہ میں ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ان حضرت نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے۔ اندازہ کیجئے کہ دونوں باتوں میں کس قدر تضاد ہے۔ ایک طرف تو آنحضرت ﷺ کی حیثیتِ عرفی کو قبول کرنے سے بھی انکار ہے۔ آپؐ کی خاندانی عظمتیں، آپؐ کے کردار کی بلندی، نبوت سے پہلے آپؐ کی نیک نامی اور ہر دلعزیزی، ہر چیز کو مسترد کرتے ہوئے آپؐ کو نشانۂ استہزاء بنایا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف آپؐ کی قوتِ استدلال، آپؐ کے پیغام کی تسخیر، آپؐ کی شخصیت کا سحر اور آپؐ کے کردار کے اثر ورسوخ کو بھی تسلیم کیا جا رہا ہے کہ اگر ہم نے اپنے تعصب اور ہٹ دھرمی کا سہارا نہ لیا ہوتا اور ہمارے آبائی اور ذہنی تحفظات نے ہمارے قدم نہ پکڑ لئے ہوتے اور قومی شیرازہ بکھر جانے کے نام نہاد خطرات کا اندیشہ دامن گیر نہ ہوا ہوتا تو اس شخص کے دلائل کے سامنے تو ہم بالکل سپر انداز ہو چکے ہوتے۔ اس تضاد کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ کس ذہنی مخمصے اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں کہ ایک طرف بڑائی کے دعویدار ہیں اور دوسری طرف اندر سے بری طرح بوکھلائے ہوئے ہیں۔ پیغمبر کی حقانیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ بدترین مخالف بھی زبانوں سے شعلے اگلیں، لیکن ان کے اندر کی دنیا ڈگمگاتی دکھائی دے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۙ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

(کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے، کیا آپ ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہیں؟ ۴۳) کیا آپ گمان رکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں، یہ تو بس چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ۴۴)

قریش کی گمراہی کا ایک بہت بڑا سبب اتباعِ ہوائے نفس ہے

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قریش کا آنحضرت ﷺ پر ایمان نہ لانے بلکہ آپؐ کی ذات کو نشانۂ استہزاء بنا لینے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا یقین نہیں رکھتے، اس لئے ان کی زندگی سراسر غیر سنجیدہ اور کھیل کود کا تماشا بن کر رہ گئی ہے اور جو ذاتِ عزیز ہر طرح کا دکھ اٹھا کر محض ان کی خیر خواہی کیلئے انہیں زندگی کے حقائق اور آخرت کی فکر سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے یہ اسے کوئی اہمیت دینے کی بجائے مذاق کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی ایک دوسری

Marfat.com

خرابی کا ذکر کیا جارہا ہے کہ جس طرح ان کی زندگی کے تصورات کو آخرت سے لاتعلقی نے بگاڑا، اسی طرح ان کی زندگی کے تمام معاملات اس لئے بگاڑ کا شکار ہوئے ہیں کہ وہ خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا چکے ہیں۔ معبود بنا لینے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح خدا کی پوجا کی جاتی اور معبود کے سامنے سر جھکایا جاتا اور اطاعت کی جاتی ہے، اسی طرح یہ ہر معاملے میں اپنی خواہشِ نفس کی اطاعت کرتے ہیں۔ مذہب کیا کہتا ہے، یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ عقل جو ان کے اپنے سروں میں بھی ہے، یہ اس کی بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ ان کی عقل ان کی خواہشِ نفس کی تابع ہو چکی ہے۔ اپنی زندگی پر عقل کو حکمران بنانے کی بجائے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عقل کا کام خواہشِ نفس کی بجا آوری کیلئے آسانیاں پیدا کرنا، اس کیلئے راستے کھولنا اور مشکلات کو دور کرنا ہے۔ گویا حقیقی مطاع، حقیقی محبوب اور حقیقی متبوع خواہشِ نفس ہے، عقل نہیں۔ عقل تو اس کی ایجنٹ ہے اور اس کے اشاروں پر چلتی ہے اور اس کیلئے راستہ صاف کرتی ہے۔ تو جو شخص یا جو قوم اپنی عقل کا چراغ گل کر دے اور نفس کی خواہشات کی پرستار بن جائے، اس کو حق کا راستہ دکھانا اور صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں رہتی کہ کیا حق ہے، کیا باطل، کیا خیر ہے کیا شر۔ یہ اس کے نزدیک سراسر جذباتی باتیں ہیں۔ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے، یہ کمزور لوگوں کی سوچ ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ چیز ہونی چاہئے جو نفس کا تقاضا ہو۔ ایسی سوچ رکھنے والا شخص اور ایسے راستے پر چلنے والی قوم شیطان کے پھندے میں تو گرفتار ہو سکتی ہے، حق کے راستے کی مسافر نہیں بن سکتی۔ آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری کیسے قبول کر سکتے ہیں، آپ شب و روز اس فکر میں ہیں کہ میں انہیں اپنی بات سناؤں اور سمجھاؤں۔ اسلام دینِ فطرت ہے، شاید میری باتیں ان کی فطرت کو زندہ کر دیں، آپ کا یہ خیال صحیح نہیں۔ لوگوں کے ساتھ آپ کی ہمدردی اپنی جگہ، ان کی ہدایت کیلئے بے چین ہو جانا، سب بجا، لیکن جن لوگوں کی عقلیں ماؤف ہو چکی ہیں اور وہ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں سننے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ضائع کر چکے ہیں، آپ انہیں نہ سنا سکتے ہیں اور نہ سمجھا سکتے ہیں کیونکہ وہ انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر اتر گئے ہیں۔ انسان اگر حق کے راستے سے منحرف بھی ہو جائے لیکن عقل و خرد سے دستبردار نہ ہو۔ یعنی وہ عقل کو بہرحال زندگی کا حقیقی رہنما مانتا ہو۔ تو یہ کہا جائے گا کہ وہ انسان کی سطح سے نہیں گرا۔ اس کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ شاید اسے سمجھا بجھا کر حق کی طرف لایا جاسکے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے جوہرِ عقل سے منہ موڑ کر صرف خواہش کے پیچھے چلتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے۔ جس طرح بھیڑ بکریوں کو بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا ہانکنے والا انہیں چراگاہ کی طرف لے جارہا ہے یا بوچڑ خانے کی طرف۔ وہ بس آنکھیں بند کر کے ہانکنے والے کے اشارے پر چلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جو شخص عقل سے منہ موڑ کر خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور یا اپنے گمراہ کن لیڈروں کے اشاروں کی طرف چلتا رہتا ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان ہے جسے بھیڑ بکری کہنا بھی شاید بھیڑ بکری کے ساتھ زیادتی ہو۔ کیونکہ بھیڑ بکریوں کو خدا نے عقل و شعور سے نہیں نوازا، وہ اگر چرواہے یا قصائی میں امتیاز نہیں کرتیں تو کچھ عیب نہیں، لیکن حیف ہے ان انسانوں پر جو خدا سے عقل و شعور کی نعمتیں پا کر بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں کی سی غفلت و بے شعوری میں مبتلا کر لیں۔ چوپائے اور جانور ہر حال اور ہر شکل میں اپنی جبلت پر قائم رہتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں سرمو اپنی جبلت سے انحراف نہیں اختیار کرتے۔ لیکن انسان جب اپنی خواہشوں کا غلام بن جاتا ہے تو وہ جبلت اور فطرت کے تمام حدود توڑ کر چوپایوں سے بھی بدتر بن جاتا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ
تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا
الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَهُوَ
الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ
نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ
مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ
لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ
كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿۵۱﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾
وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ
وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ
الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾ وَيَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ
ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى
الْحَىِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ

Marfat.com

خَبِيْرًا ۝٥٨ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝٥٩ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَ
زَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝٦٠ السجدة ۩

رکوع: ۵۔ (اے مخاطب! کیا تو نے اپنے رب کی قدرت کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سایہ کو پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا بنا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ ۴۵) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۶) اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پردہ پوش، نیند کو باعثِ راحت اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔ ۴۷) اور وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کے بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں۔ ۴۸) تاکہ ہم اس سے کسی مردہ شہر (زمین) کو زندہ کر دیں، تاکہ ہم اس سے اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کر دیں۔ ۴۹) ہم نے اسے ان کے درمیان مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں لیکن اکثر لوگ ناشکری پر ہی اڑے ہوئے ہیں۔ ۵۰) اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ ۵۱) پس آپ کافروں کی بات کی طرف دھیان نہ دیں اور اس قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کریں۔ ۵۲) اور وہی ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو، ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ اور ان دونوں کے درمیان اس نے ایک پردہ بنا دیا ہے اور ایک مضبوط رکاوٹ۔ ۵۳) اور وہی ہے جس نے انسان کو پانی (کی بوند) سے پیدا کیا، پھر اس کو نسب والا اور سسرال والا بنا دیا اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے۔ ۵۴) اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو انہیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان، اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار رہتا ہے۔ ۵۵) اے پیغمبر! ہم نے آپ کو ایک مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ۵۶) ان سے کہہ دیجئے کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔ ۵۷) اور بھروسہ کیجئے اس زندہ خدا پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہئے اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ رہنے کیلئے کافی ہے۔ ۵۸) جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ ادوار میں، پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا (جیسے اس کی شان ہے) وہ رحمٰن ہے، پس اس کی شان باخبر سے پوچھو۔ ۵۹) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، وہ پوچھتے ہیں، رحمٰن کون ہے۔ کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو، اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ ۶۰)

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿٤٦﴾

(اے مخاطب! کیا تو نے اپنے رب کی قدرت کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سایہ کو پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا بنا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ ۴۵) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ ۴۶)

سابقہ آیات میں تاریخ کے شواہد کی روشنی میں مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کی دعوت وتبلیغ کے جواب میں مخالفت اور معاندت کا جو طوفان اٹھا ہے یہ کوئی پہلا موقع نہیں۔ آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کے ساتھ بھی ان کے مخالفین نے یہی رویہ اختیار کیا۔ لیکن آہستہ آہستہ حق غالب آیا اور باطل مغلوب ہو گیا۔ آپ کی دعوت بھی ان شاء اللہ تعالیٰ غالب ہو کے رہے گی اور سابقہ امتوں کو تکذیب رسل کے نتیجے میں جس طرح عذاب کا شکار ہونا پڑا آنحضرت ﷺ کے مخالفین کو اس سے تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو تمہارا انجام بھی سابقہ امتوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

رات اور دن کا آنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں بعض آفاقی اور کائناتی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن سے نبی کریم ﷺ کی ان تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جو آپ اپنی قوم کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ دلائلِ آفاق میں سے سب سے پہلی دلیل جو پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کے وسیع اطراف وجوانب اور اس کی پہنائیوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جو بے شمار نشانیاں ہیں ان میں سے اگرچہ ایک ایک نشانی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی بے پایاں قدرت پر دلالت کرتی ہے، لیکن انہیں سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک ایسی نشانی جس سے ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے اور وہ انسانی زندگی کی پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اور اس میں خطاب ایک ایسے لفظ سے کیا گیا ہے جس سے فرداً فرداً ہر مخاطب مراد ہے۔ یعنی ایک ایک شخص کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سائے کو کیسے پھیلا دیا ہے۔ ظِل عربی زبان میں اس سایہ کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے ہوتا ہے یعنی رات بھر کا سایہ۔ اور وہ سایہ جو دوپہر کے بعد ہوتا ہے جو سورج کے ڈھلنے سے وجود میں آتا ہے اسے فَيء کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رات بھر جو تم پر سایہ طاری رہتا ہے کبھی تم نے اس کی افادیت اور اپنی زندگی کیلئے اس کی اہمیت پر غور کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سائے کو مستقل تم پر مسلط رکھتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ حیوانی اور نباتاتی زندگی کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کیونکہ سورج ایک ایسا انجن ہے جس سے کائنات کا نظام چلتا اور ہمارے چولہے جلتے ہیں۔ سائے کے مسلط ہونے کے نتیجے میں چونکہ سورج طلوع ہونے میں نہ آتا تو زندگی کی رات دراز ہو جاتی۔ اور اگر اس سائے کو ہٹا کر سورج کی روشنی کو مسلط کر دیا جاتا تو تب بھی ہر طرح کی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ گرمیوں کا طویل دن پانی کو بھاپ بنا کے اڑا دیتا، سمندر صحرا میں تبدیل ہو جاتے۔ سورج کا مسلسل سامنا ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیتا۔ نہ انسانی زندگی باقی رہتی اور نہ حیوانی اور نباتاتی زندگی اپنا وجود باقی رکھ سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سائے کو دراز ضرور کیا ہے لیکن اس کو ساکن اور مستقل مسلط نہیں کیا۔ پھر اپنی قدرت اور حکمت کے مطابق سورج کو اس پر دلیل بنایا۔ جس طرح دلیل کسی چیز کو کھولتی اور واضح کرتی ہے اسی طرح سورج شب کی عالمگیر تاریکی کے اندر دلیلِ راہ بنتا اور اس کو ہٹاتا اور کھولتا ہے۔ ملاحوں کی اصطلاح میں دلیل اس شخص کو کہتے ہیں جو کشتیوں کو راستہ بتاتا ہوا چلے۔ سورج بھی

Marfat.com

دھیرے دھیرے اور آہستہ آہستہ طلوع ہوتا اور پھر اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے روشنی اس کی رکاب میں آگے بڑھتی ہے اور سایہ سمٹتا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ یک لخت سایہ اٹھالیا جائے اور سورج کی گرمی برسنے لگے۔ اگر ایسا ہوتا تو اچانک گرمی ہر چیز کو بھسم کر کے رکھ دیتی اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ اچانک گرمی سمٹ جائے اور ٹھنڈک برسنے لگے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو سردی ہر چیز کو منجمد کر دیتی۔ سائے کے سمٹنے اور سورج کے آگے بڑھنے میں جو ایک تدریج کا عمل پایا جاتا ہے یہی ہماری زندگی کا بقا کا اصل راز ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی جس قدرت اور نشانی کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ رات بھر سائے کا پھیلا رہنا اور پھر سورج کے طلوع ہونے سے اس کا آہستہ آہستہ سمٹنا یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمیں ہر روز واسطہ پڑتا ہے، ہم اس کی افادیت سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہماری بقا کا ضامن ہے۔ لیکن اس کا سررشتہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور رات طاری کر سکتا ہے؟ کیا کسی میں یہ قدرت ہے کہ وہ سورج کو نکلنے کا حکم دے سکے؟ جب ہر شخص اپنی آنکھوں سے اس کی اس قدرت کا نمونہ دیکھتا ہے تو یہ کس قدر حماقت کی بات ہے کہ اتنی واضح نشانی کے بعد بھی ہم دوسروں کو اس کا شریک کرنے لگتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کا سورۃ قصص میں ذکر فرمایا گیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (قصص: ۷۱ ـ ۷۳)

”ان سے کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ رات کو تمہارے اوپر قیامت تک کیلئے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لائے گا، کیا تم سنتے نہیں! ان سے پوچھو کہ بتاؤ، اگر اللہ تمہارے اوپر دن کو قیامت تک کیلئے مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لئے شب کو لائے گا جس میں تم سکون پا سکو! کیا تم دیکھتے نہیں! یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تا کہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تا کہ تم اسی کے شکر گزار بنو۔“

ایک اور حکمت جو ہمیں اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح رات کا سایہ اس قدر ہمہ گیر ہوتا ہے کہ جس شخص نے اپنی آنکھوں سے رات اور دن کی آمد و رفت کا منظر نہ دیکھا ہو وہ کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ رات کی حکومت بھی کبھی زوال پذیر ہوگی۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ آخر وہ ختم ہو کے رہتی ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت کفر و شرک اور جہالت کا سایہ پوری دنیا پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب کبھی روشنی طلوع نہیں ہوگی۔ اور یہ تاریکی ہمیشہ ہم پر مسلط رہے گی۔ لیکن جس طرح آفتاب کے طلوع ہو جانے کے بعد رات کی تاریکی چھٹ جاتی ہے، اسی طرح اب آفتابِ نبوت طلوع ہو چکا ہے۔ جیسے جیسے اس کی کرنیں پھیلتی جائیں گی اور جوں جوں یہ آفتاب اوپر اٹھتا جائے گا، کفر و شرک اور جہالت کی تاریکی سمٹتی جائے گی۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ جس طرح رات کی تاریکی ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ سمٹتی اور دن کا اجالا آہستہ آہستہ پھیلتا ہے، دھوپ اور سائے میں یک لخت تغیرات نہیں ہوتے، کیونکہ یک لخت تغیر ایک جھٹکے کی صورت میں کہیں بھی شکست و ریخت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حق کی روشنی بھی حادثاتی طور پر نہیں پھیلتی بلکہ تبلیغ و دعوت اور اخلاص کی قوت سے آہستہ آہستہ اس کا دائرۂ اثر پھیلتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب کفر و شرک کی تاریکیوں کو کہیں جائے پناہ نہیں ملتی، اب بھی ایسا ہی ہو کے رہے گا۔

Marfat.com

خبر ہوتا ہے اور جس طرح اس کی صلاحیتیں دم توڑ جاتی ہیں اس لحاظ سے نیند میں اور موت میں کوئی جوہری فرق نہیں رہتا۔ ایک سوئے ہوئے آدمی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جاگ سکے گا یا نہیں۔ لیکن ہم ہر روز اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کرتے ہیں کہ ہم گہری نیند سوتے ہیں پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی شخص اگر سوچنے سمجھنے اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے سے بالکل محروم نہیں ہے تو بڑی آسانی سے نیند کے پردے میں موت کا نظارہ کرسکتا ہے۔ اور نیند سے بیداری کے پردے میں قیامت کا یقین کرسکتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا ۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾
لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿۴۹﴾

(اور وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کے بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں۔ ۴۸) تاکہ ہم اس سے کسی مردہ شہر (زمین) کو زندہ کردیں، تاکہ ہم اس سے اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کردیں۔ ۴۹)

ایک اور نشانِ قدرت

شب و روز کی آمد و شد اور زمین پر بسنے والی مخلوقات بالخصوص انسانوں کیلئے اس میں مخفی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اب اپنی ایک اور نشانی کی طرف پروردگار توجہ دلا رہے ہیں جس میں پروردگار کی ان تمام صفات اور عظمتوں کا مشاہدہ ہو رہا ہے جن پر قرآن اور نبی کریم ﷺ کی دعوت کی بنیاد ہے۔

اس نشانی میں چونکہ اہلِ زمین کیلئے رحمت کا غلبہ ہے اس لئے اسے رحمت ہی کے نام سے یاد فرمایا گیا۔ مراد اس سے بارش ہے۔ قرآنِ کریم نے اور بھی متعدد مواقع پر بارش کو رحمت کے نام سے یاد فرمایا۔ اس کیلئے انسانوں کی زبانوں پر جو لفظ رائج ہے اس سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ بارانِ رحمت کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ بھی بارانِ رحمت ہی کیلئے دعا فرمایا کرتے تھے۔

اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی جس صفت کا ظہور ہو رہا ہے وہ بیک وقت قدرت بھی ہے اور رحمت بھی، کہ بارش آنے سے پہلے موسمی ہوائیں چلتی ہیں جو بارش کی دعائیں کرنے والوں کیلئے بشارت بن کر آتی ہیں۔ ہمیں نئی زندگی نے بہت ساری نعمتوں سے محروم کردیا ہے۔ اس لئے شہروں میں رہنے والے لوگ ہواؤں کے اس فیضان سے بہت کم محظوظ ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ وقت دور نہیں جس کے دیکھنے والے ابھی زندہ ہیں کہ جب برسات کی آمد آمد ہوتی تو ٹھنڈی ہواؤں کے ایک ایک جھونکے کو کس طرح رحمت کا پیغام سمجھا جاتا تھا۔ نیک لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور بےفکرے اور نوجوان لوگ میدانوں اور باغوں کا رخ کرتے۔ اور اس رحمت کے محسوس کرنے میں اس وقت اور اضافہ ہوجاتا ہے جب بارش دیر سے برستی، زمین جھلس چکی ہوتی، فصلیں جل رہی ہوتیں، پانی کے حوض خشک ہونے کے قریب ہوتے اور عرب جیسی سرزمین میں لوگ خانہ بدوشی پر مجبور ہوجاتے۔ جہاں کہیں جوہڑ میں پانی ملتا وہاں اپنے جانوروں کو لے کر پہنچ جاتے۔ بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا بھی نظر آجاتا تو نگاہیں انتظار میں لگ جاتیں۔ ایسے میں ہواؤں کا بارش کا پیغام بن کے آنا اللہ تعالیٰ کے فیضانِ رحمت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

Marfat.com

اسی رحمت کے ساتھ ساتھ اس کی قدرت بھی دکھائی دیتی ہے کہ ہوائیں آتیں تو منتشر بادلوں اور بادل کے آوارہ ٹکڑوں کو گھیر کر ہانکتی ہوئی وہاں پہنچادیتیں جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا۔ پھران کو تہ بہ تہ اکٹھا کر کے دبیز کردیتیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا حکم آتا تو بادل پاکیزہ اور پاکیزگی بخش پانی برسادیتے۔ پاکیزہ سے مراد یہ ہے کہ ایسا پانی برستا جس میں گندگی کی کوئی ملاوٹ نہ ہوتی۔ جراثیم سے پاک، صحت بخش، انسانوں اور فصلوں کیلئے زندگی اور قوت کا سامان۔ جہاں جہاں یہ پانی برستا مردہ زمین از سرِنو حیاتِ تازہ حاصل کر لیتی۔ جہاں کبھی گھاس کی ایک پتی دکھائی نہ دیتی تھی، چند ہی دنوں میں وہاں کی زمین مخملی لباس میں ملبوس ہوجاتی۔ ٹنڈ منڈ درخت ہرے ہوجاتے۔ ہر چیز پردۂ رنگ میں چھپ جاتی، رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش تیز ہوجاتی۔ جہاں کسی آبی مخلوق کا وجود نہ تھا، وہاں مینڈک ٹرانے لگتے، جابجا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا گھنا سایہ ہر ایک کو اپنی آغوش میں لے لیتا۔ اور زمین اور فضا جو موت کی گرفت میں تھی ہر جگہ زندگی کی نمود دکھائی دیتی۔ سوال یہ ہے کہ کہیں شب و روز کی آمد و شد اور کہیں بارانِ رحمت کے نتائج کا ظہور، اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتوں اور قدرتوں کی نمود کیا یہ سب کچھ کسی اندھی بہری عِلت العلل کا کرشمہ ہے۔ آخر وہ کون سی قوت ہے جس نے زمین کو بنایا، پھر اس پر مخلوقات پیدا فرمائیں اور پھر زمین اور ان مخلوقات کی ضروریات اور ابر، ہوا اور بارش کے درمیان ایک حیران کردینے والا ربط کیا خود بخود وجود میں آگیا۔ کیا اضداد کی اس باہمی ہم آہنگی کے مشاہدہ کے بعد یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں، یقیناً ایسا نہیں۔ زمین اور اس پر بسنے والی مخلوقات بالخصوص انسان اور اس پر کی جانے والی نعمتیں خود بخود بول رہی ہیں کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے۔ ساری کائنات اسی کے ارادے کے تابع ہے۔ ہر نعمت کے پیچھے اس کی قدرت کا ظہور ہے اور اسی کی رحمت نے ہر مخلوق کو تھام رکھا ہے۔

اس آیت میں تدبر سے ہمارے سامنے ایک اور عقدہ بھی کھلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت سے مردہ زمین زندہ ہوتی ہے اور اجڑی ہوئی زمین میں سرسبزی اور شادابی پھیل جاتی ہے اور کتنے مردہ آبی جانور از سرِنو زندہ ہوجاتے ہیں۔ کیا اس کی قدرت سے یہ بات بعید ہے کہ نفخ صور کے بعد تمام مردہ انسانوں کو از سرِنو زندہ کردے، ایک حشر برپا ہو اور سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال کی جوابدہی کیلئے کھڑے کردیئے جائیں۔ جو شخص بھی حقیقت کی نگاہ سے بارش برسنے سے پہلے کی حالت اور بارش برسنے کے بعد کی تبدیلی کو ملاحظہ کرے گا اس کیلئے اس بات پر یقین کرنا بالکل مشکل نہیں کہ جس قادرِ مطلق کی قدرت آج اپنے یہ رنگ دکھا رہی ہے وہ کل کو اپنا یہ رنگ کیوں نہیں دکھا سکتی۔

ایک اور بات بھی کھلتی ہوئی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ہر قحط سالی کے بعد سرسبزی اور شادابی کا زمانہ لاتا ہے، جس زمین پر خاک اڑتی ہے وہیں شاداب کھیت بھی لہلہاتے ہیں، اسی پروردگار کی یہ بھی سنت ہے کہ جب انسانوں کے دلوں کی آبادیاں اجڑ جاتی اور روحانی کھیتیاں خشک سالی کا شکار ہوجاتی ہیں تو وہ اپنے پیغمبر رحمت کو بھیجتا ہے جس کے نتیجے میں گلشنِ انسانیت میں بہار آجاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے اخلاقی اور روحانی طور پر پوری دنیا پر خشک سالی چھائی ہوئی تھی، ہر طرف موت کے پہرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر کرم فرمایا۔ قرآن اور حاملِ قرآن کی صورت میں پھر وہی ابرِ رحمت گھر کر آیا۔ اس کی گھنگھور گھٹائیں برسنے کیلئے بے تاب ہیں۔ بہت دنوں کی بات نہیں انسانوں کی خشک کھیتیاں پھر زندہ ہوکر لہلہانے لگیں گی۔ آج دیکھنے والوں کو یہ بات بہت دور معلوم ہوتی ہے، لیکن جس طرح جھلستی ہوئی زمین کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی قسمت بدل جائے گی، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے ابرِ رحمت کے آجانے کے بعد انسانوں کی قسمت کا فیصلہ جلد ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ چند سالوں میں ہو کر رہا۔

Marfat.com

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا
فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾

(ہم نے اسے ان کے درمیان مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے تاکہ وہ غور وفکر کریں لیکن اکثر لوگ ناشکری پر ہی اڑے ہوئے ہیں۔ ۵۰) اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ ۵۱) پس آپ کافروں کی بات کی طرف دھیان نہ دیں اور اس قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کریں۔ ۵۲)

تصریفِ آیات کا اعجاز

تصریفِ آیات قرآنِ کریم کا ایک اعجازی پہلو ہے۔ وہ ایک ایسی بات کو جس کا تعلق انسانی زندگی کی صلاح وفلاح سے بہت گہرا ہو مختلف اسالیب میں پیرایۂ بیان بدل بدل کر اس طرح لاتا ہے کہ جس سے نہ تو کہی جانے والی بات کی شگفتگی میں کمی آتی ہے اور نہ اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ بات پہلے بھی کہی گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر نئے پیرایۂ بیان میں تاثیر وتسخیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو یہ اسلوب ہمارے شعراء میں بھی رہا وہ بھی بعض دفعہ ایک ہی مضمون کو مختلف طریقوں سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیس نے تو ایک طرح سے شاعرانہ تفوق کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز اپنی جگہ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں، اس کی رحمتوں اور اس کی صفات کا بیان، ہم نے قرآنِ کریم میں مختلف اسالیب سے کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی غیر مشروط بندگی پر مختلف اسالیب سے دلائل قائم کیے ہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انسان یاددہانی حاصل کرے۔ اور یا ان میں سے ایک ایک بات پر غور وفکر کرے تاکہ اسے اپنے رویے کی غلطی کا احساس ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے رسول جن باتوں کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کی صداقت پر یقین پیدا ہو۔ لیکن ان بدنصیبوں کا حال یہ ہے کہ بیان واظہار کے معجزانہ اسالیب بھی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ چند خوش نصیبوں کے سوا باقی لوگ اپنے کفر اور ناشکری پر جمے ہوئے ہیں۔

بعض اہلِ علم نے ضمیر مفعول کا مرجع گزشتہ آیت میں بیان کی جانے والی بارش کی مثال کو بنایا ہے۔ تفہیم کے نقطۂ نگاہ سے یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی، لیکن یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ اس سے بات صرف ایک عنوان تک سمٹ کر رہ جاتی ہے جبکہ تصریفِ آیات ایک ہمہ گیر عنوان ہے جو قرآنِ کریم میں جابجا پھیلا ہوا ہے۔

بعض اہلِ علم نے ضمیر مفعول کا مرجع قرآنِ کریم کو بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس میں اور قرآنِ کریم کو مرجع بنانے میں مفہوم ومراد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

وَلَوْ شِئْنَا .... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں شاید بعض معترضین کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اعتراض کی بنیاد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ان کے سامنے یہ بات واضح فرمائی کہ میں ساری نوعِ انسانی کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بن کے آیا ہوں، تو لوگوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے آپ ہر ایک شخص تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا سکیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شاید یہ بات نہ تھی کہ وہ آپ کے ساتھ کسی اور کو نبی بنا دیتا اور آپ کا کام

Marfat.com

تقسیم ہو جاتا۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی قدرت صرف ایک ہی کو نبی بنا سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت تو محدود نہیں، البتہ آپ کا دعویٰ غلط ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے معترضین سے منہ پھیر کر فرمایا کہ ہم اگر چاہتے تو ہم ہر بستی میں ایک نذیر بھیج دیتے۔ اس سے پہلے ہم ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ نبی اور رسول بھیج چکے ہیں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانیت بلوغ کی عمر کو پہنچ رہی ہے۔ اس کے مواصلاتی نظام میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے، قومیں اور ملک ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں، انسانی علوم وفنون میں یکجائی پیدا ہو رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انسانیت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کیا جائے۔ بہت سی امتوں کی بجائے ایک امت نئی دنیا کی ضرورت ہے، جو حق کی امین بنائی جائے اور بجائے اس کے کہ قومیں قوموں سے ٹکراتی رہیں اور ہر قوم حق کی علمبردار ہونے کی مدعی ہو۔ اب حق بھی ایک ہوگا اور امت بھی ایک ہوگی۔ اب گھر گھر میں الگ الگ چراغ نہیں جلائے جائیں گے بلکہ اب آفتاب نبوت طلوع ہو گیا ہے جو پوری دنیا کے گوشے گوشے کو منور کر دے گا۔ اور اس کے فیض سے ایک ایسی جماعت تیار ہوگی جو دنیا کے کونے کونے میں اس کے دین اور اس کی دعوت کو لے کر پہنچے گی۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ .... رہی یہ بات کہ یہ کافر کیا کہتے ہیں، آپ ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیں۔ اطاعت کا معنی جس طرح کسی بات کو ماننا ہوتا ہے اسی طرح لحاظ کرنا اور دھیان دینا بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے کہ آپ بالکل پرواہ نہ کریں کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں اور نہ ان کے نئے نئے مطالبات پر توجہ دیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کا رہبر اور ہادی بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں قرآن کی مشعل ہے۔ اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو ید بیضاء سے بڑھ کر روشنی رکھتا ہے۔ اسی کے ذریعے آپ جہادِ کبیر کریں، یعنی لوگوں کو بدلنے میں اپنی سعی و جانفشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ اپنے تمام ممکن ذرائع کو اس میں جھونک دیں۔ جدوجہد کا کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑیں اور مقابلے کے کسی محاذ کو خالی نہ رہنے دیں۔

قرآن میں ہم نے اصولوں کے اثبات کیلئے ہر طرح کے دلائل فراہم کر دیئے ہیں۔ انسانی زندگی کے شیرازے کو منضبط کرنے کیلئے ہم نے ایک نظام دے دیا ہے۔ اس میں معاشرے کے اصول بھی ہیں، معیشت کے ضوابط بھی۔ سیاست کے آداب بھی ہیں اور حکومت کے طریقے بھی۔ عدالت کا ایک مستقل نظام اس میں وضع کر دیا گیا ہے۔ آپ اس قرآن کے ذریعے ان تمام شعبوں کے قیام اور اس میں اللہ تعالیٰ کے دین کے نفاذ کیلئے قرآن کے ذریعے جدوجہد کریں۔ اور اگر کبھی پر امن جدوجہد کام نہ آتی ہو اور دشمن آپ کا راستہ روکنے اور آپ کو مٹانے پر تل جائے تو پھر آپ قوت اور تلوار سے کام لیں۔ اس کے آداب بھی ہم نے قرآنِ کریم میں واضح کر دیئے ہیں اور اس کے اجمال کی تفصیل اور اس کے ابہام کی شرح اور اس کے قول کی عملی تعبیر ہم نے آپ کے دل پر نازل کر دی ہے جسے آپ حدیث اور سنت کی شکل میں اپنی امت کے سامنے واضح کر رہے ہیں۔ یہ وہ جہاد ہے جو آپ نے قرآن کے ذریعے کرنا ہے اور یہی جہاد آپ کی سنت اور روایت بن کر امت کو منتقل ہوگا اور اسی سے امت ہمیشہ سرخرو اور برومند ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ
وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

(اور وہی ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو، ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار اور دوسرے کا نہایت شور و تلخ اور ان دونوں کے درمیان اس نے ایک پردہ بنا دیا ہے اور ایک مضبوط رکاوٹ۔ ۵۳)

مَرَجَ ...... کے معنی چھوڑنے اور ملانے کے ہیں۔ فُرَاتٌ ...... کا معنی ہے شیریں اور خوشگوار۔
حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ...... کے معنی مضبوط آڑ اور محکم اوٹ کے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک اور نشانی

آفاق کی نشانیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ایک حیران کن کرشمے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس پروردگار کی بے پناہ قدرت کا کیا کہنا کہ وہ ایک طرف سے شیریں پانی کے دریا کو چھوڑتا ہے، دوسری طرف سے کھاری پانی کے سمندر کو۔ دونوں کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، لیکن کیا مجال ہے کہ شیریں پانی کھاری ہوجائے یا کھاری پانی شیریں بن جائے۔ دونوں اپنی اپنی حدود کے اندر اپنی مزاجی خصوصیات کو باقی رکھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہر اس جگہ دیکھی جاسکتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آ کر گرتا ہے۔ لیکن کیا مجال ہے کہ دریا کا پانی سمندر کے پانی میں مل جائے یا سمندر کا پانی دریا کے پانی کو کھاری بنادے۔ دریائے نیل جب بحرروم میں جا کر گرتا ہے تو کئی میلوں تک اس کا پانی سمندر میں جوں کا توں چلا جاتا ہے نہ اس کی رنگت بدلتی ہے، نہ اس کا ذائقہ تبدیل ہوتا ہے۔ زمین کے نیچے پانی کا سمندر بہہ رہا ہے، لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ایک جگہ سے پانی نکالا گیا تو پانی میٹھا نکلا، پھر دوسری جگہ چندفٹ کے فاصلہ پر نلکا لگایا گیا تو پانی کھاری نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے نیچے بھی قدرت نے کوئی ایسی غیر مرئی دیوار کھینچ رکھی ہے جو میٹھے اور کھاری پانی کو آپس میں ملنے نہیں دیتی۔ اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود سمندر میں مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ تفہیم القرآن میں سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتبِ رومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کیلئے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔

موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیج فارس کے ان چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران کے پاس کنویں کھود لئے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔

غور فرمایئے اللہ تعالیٰ کے سوا وہ کون سی طاقت ہے جو زیر زمین اور سمندروں کے اندر میٹھے پانی کے ذخیروں کو کڑوے پانی سے الگ رکھتی ہے۔ وہ کون قادرِ مطلق ہے جس نے ان کے درمیان ایک ایسی غیر مرئی دیوار کھڑی کر رکھی ہے جو نہ کسی کو نظر آتی ہے اور نہ دونوں کا باہمی تصادم اس کو توڑ سکتا ہے۔ اس سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کی بزرگ و برتر ذات ہے جس کے زیرِ تصرف کائنات کی ہر چیز ہے۔ وہ اپنی مشیت سے اپنی حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ وہیں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی اضداد ہیں سب ایک بالاتر حکیم وقدیر کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جس جگہ چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ وہ خدا کی مقررہ حدود سے سرمو تجاوز کرسکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز اور کوئی قوت مطلق العنان نہیں بلکہ سب کی باگ ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾

(اور وہی ہے جس نے انسان کو پانی (کی بوند) سے پیدا کیا، پھر اس کو نسب والا اور سسرال والا بنادیا اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے۔ ۵۴)

سابقہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر آفاقی دلائل ذکر فرمائے۔ اب ان انفسی دلائل کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے جو انسان کی اپنی ذات میں موجود ہیں۔

Marfat.com

اضداد میں توافق کی ایک انفسی دلیل

بلاشبہ انسان اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے اور اس زمین پر انسان کے وجود اور اس کے عقل وخرد کے معرکوں سے زمین کی سرسبزی و شادابی ودرخشندگی وجہاں تابی ہے۔ اس نے اگر ایک طرف سیرت وکردار اور روحانی بالیدگی کی حیرت انگیز مثالیں قائم کی ہیں تو دوسری طرف اس سرزمین کو حیرت انگیز ایجادات سے مالا مال کر دیا ہے لیکن ان تمام کمالات کے پیچھے اپنی کوئی ذاتی صلاحیت کارفرما نہیں، سب اللہ تعالیٰ کی دین اور اس کی قدرت کا ظہور ہے۔ اسے روحانی احساسات اور سوز وگداز کی دولت اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کی ہے۔ اور اس کی حیرت انگیز ایجادات اس عقل کی فتوحات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف انسانوں کو عطا ہوئی ہے۔ ورنہ انسان کی اپنی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ پانی کی ایک حقیر بوند سے پیدا ہوا۔ اور ماں کے پیٹ میں خون اس کی غذا بنتا رہا۔ لیکن پانی کی بوند سے بننے والا وجود اور لہو سے پلنے والی ذات جب دنیا میں آتی ہے تو اس کی طلعتِ زیبا اور گلگوں رخسار کو دیکھ کر ماں باپ نہال ہوتے جاتے ہیں۔ جو من موہنے چہرے کو دیکھتا ہے، دل تھام کے رہ جاتا ہے۔ اور پھر یہ جیسے جیسے زندگی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے اس کے حُسن ورعنائی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی انسانیت بھی درجۂ کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس میں سے ہر خوبی اور ہر تغیر کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں اللہ تعالیٰ نے پانی کی بوند سے جس بشر کو پیدا کیا ہے وہ کبھی مرد کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور کبھی عورت کی شکل میں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ دونوں کی تخلیق ایک پانی سے ہے، لیکن دونوں کے ظاہری اعضاء میں بھی اختلاف ہے اور ذہنی رجحانات اور قلبی احساسات اور جذبات میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہے۔ دونوں کے فطری داعیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن مزید حیران کن بات یہ ہے کہ اس بین تفاوت کے باوجود دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ مرد اپنی ساری قوتوں کے باوجود نامکمل ہے۔ عورت اپنی تمام تر لطافتوں کے باوجود ادھوری ہے۔ دونوں مل کر ایک مکمل وحدت بنتے ہیں۔ اور پھر عقل کی حیرانی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کہ یہ وحدت جو مرد وعورت کی ترکیب سے وجود میں آتی ہے کثیر التعداد وحدتوں کا سرچشمہ بنتی ہے۔ ان کے یہاں بچیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور بچے بھی۔ کسی کے یہ سسرال بنیں گے اور کوئی ان کے بچوں کے سسرال ہوں گے۔ باہمی رشتے ہوں گے، قرابتیں بڑھیں گی۔ اس طرح ایک انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا جس میں نسبی اور سسرالی رشتے دو خاندانوں کی صورت میں جب باہمی رشتوں کی لڑی میں پروئے جائیں گے تو خاندان، خاندان سے جڑ کر ایک ملک، ایک نسل اور ایک تمدن سے وابستہ ہو جائیں گے۔

اس پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے کہ جو پانی کی ایک بوند سے مرد اور عورت کو پیدا کرتا ہے اور پھر محض اپنی قدرت کے اظہار سے ایک مرد اور ایک عورت کو درجہ بدرجہ آگے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ اس سے خاندان وجود میں آتے ہیں اور پھر خاندان آپس میں ملتے ہیں۔ ایک نسل اور ایک تمدن کی تعمیر ہوتی ہے۔ آج یہ تجربہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہوتا، لیکن اگر صرف اس کی روایت پہنچتی تو شاید اس پر یقین کرنا آسان نہ ہوتا۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾

(اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو انہیں کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ نقصان، اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار رہتا ہے۔ ۵۵)

Marfat.com

کافر کی عصبیت

گزشتہ آیات میں جو آفاقی اور انفسی دلائل بیان کیے گئے ہیں اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ ان دلائل کے سننے والے اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق و مالک اور اللہ وحدہ لاشریک سمجھیں۔ اور اس کی الوہیت کے سامنے سر جھکا دیں۔ لیکن یہ احمق لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان قوتوں کی بندگی اور عبادت کرتے ہیں جو ذاتی اور حقیقی طور پر نہ کسی کو نفع پہنچانے پر قادر ہیں اور نہ نقصان۔ اور ان کے تعصبات اور قلبی رجحانات کا عالم یہ ہے کہ ان میں سے ہر کافر اور مشرک جو بظاہر کیسا ہی غیر متعلق ہو اپنی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے دین کی تبلیغ و دعوت اور اس کی سربلندی کیلئے شب و روز کوششیں کرنے والوں کے دشمن ہیں۔ اس سے جو بھی بن پڑتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا راستہ روکنے کیلئے ضرور کرتا ہے۔ اور جو قوتیں اسلام کا راستہ روکنے کیلئے زور لگا رہی ہیں ان کی حمایت اور تائید کرنا اور جس حد تک ہو سکے ان کی مدد کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

ظَهِيْرًا ...... کا معنی معین اور مددگار ہے۔ اور اس آیتِ کریمہ میں اس سے مراد معینا للشیطان ہے۔ یعنی وہ شیطان کا مددگار بن کر اپنے رب کیخلاف ہر قوت کا معاون اور دست و بازو بن جاتا ہے۔ کتنا واضح فرق ہے، دونوں باتوں میں۔ یعنی دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگ پیغمبر پر ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے علمبردار بن کر اٹھیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر اس قوت کے ساتھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس کا بظاہر کوئی جواب بن نہیں پڑتا کہ انسان عقل کا پرستار ہے اور دین کے مقابلے میں بھی عقل کی بالادستی چاہتا ہے۔ لیکن عملی طور پر حال یہ ہے کہ عقل اس سے جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے وہ اسے نظر انداز کر کے اپنے توہمات اور آباؤ اجداد کے چھوڑے ہوئے تعصبات کو سب سے بڑا سرمایہ سمجھ کر اسی کی پاسداری میں لگا رہتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

(اے پیغمبر! ہم نے آپ کو ایک مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ ۵۶) ان سے کہہ دیجئے کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔ ۵۷)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ آپؐ کی ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے، لوگوں کو زبردستی مومن بنانا نہیں۔ جو لوگ ایمان لائیں، آپ انہیں بہتر مستقل کی بشارت دیں۔ اور جو لوگ ایمان لانے سے انکار کر دیں اور کسی طرح بھی آپ کی دعوت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوں تو آپ انہیں تکذیب کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ اس حد تک ذمہ داری ادا کرنے سے آپ اپنے فریضے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو وہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی شخص انکار کرتا ہے تو وہ اپنی عاقبت برباد کرتا ہے، آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا اور ان کے ایمان سے متعلق آپ سے کوئی سوال بھی نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

ایک بات یادرہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی اس طرح کے ارشادات آئے ہیں ان کا اصل روئے سخن کفار کی طرف ہے۔ مقصود صرف انہیں یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی ایک بے غرض مصلح ہے۔ وہ محض تمہاری بھلائی کیلئے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی منفعت کوئی نہیں۔ وہ تمہارے سامنے ایمان کی برکات اور اس کے نتائج بھی واضح کر دیتا ہے اور ایمان نہ لانے کی صورت میں تمہیں جس صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا، اسے بھی کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک تعلق صاحب ایمان لوگوں کا ہے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول کا معاملہ اسی بات پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ان کے ساتھ تعلق صرف انذار وتبشیر تک نہیں بلکہ ان کیلئے اللہ تعالیٰ کے رسول معلم بھی ہیں اور مزکی بھی۔ حاکم بھی ہیں اور قاضی بھی اور امیر بھی ہیں اور مطاع بھی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر فرمان مسلمانوں کے حق میں حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ جس کی تعمیل کرنا اور قلب ونظر کی آمادگی کے ساتھ اس کا اتباع کرنا فرض اور واجب ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ میں جو شب وروز تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کر رہا ہوں اور تم اس کے مقابلے میں دریدہ دہنی کا ثبوت دیتے ہو، کبھی اذیت پہنچاتے ہو، کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر قتل کے منصوبے باندھتے ہو۔ تو میں ان میں سے ہر بات پر صبر کرتا ہوں۔ کیونکہ میں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے انجام دیتا ہوں۔ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا کیونکہ یہ کوئی دکانداری نہیں بلکہ ایک فریضے کی ادائیگی ہے۔ اگر تم اسے قبول کرلو گے تو اپنا بھلا کرو گے۔ اور اگر انکار کر دو گے تو یہ کوئی کاروبار نہیں کہ میرا نقصان ہو جائے گا۔ میرا اجر صرف یہ ہے کہ تم میں جو لوگ حق کو قبول کرنے کی استعداد رکھتے ہوں وہ حق کو قبول کرلیں۔ تمہارا حق کو قبول کرلینا اور شیطان سے منہ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب بن جانا، میری تمام جانکاہیوں اور مشقتوں کا بہترین صلہ ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ﴿٥٨﴾

(اور بھروسہ کیجئے اس زندہ خدا پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہیے اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ رہنے کیلئے کافی ہے۔ ۵۸)

اشرافِ قریش نبی کریم ﷺ کو ہمیشہ اپنی افرادی قوت، اپنی طاقت وشوکت اور اپنی رفاہیت وثروت سے ڈراتے رہتے تھے کہ آپ اپنی دعوت سے رک جائیں ورنہ ہم جب چاہیں آپ کو بھی ختم کر سکتے ہیں اور آپ کی دعوت کو بھی۔ ہمارے جواب میں نہ آپ کے پاس افرادی قوت ہے اور نہ کوئی اور قوت کا سامان۔ ان کے جواب میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اشرافِ قریش جن کے سہارے پر آپ کو دھمکیاں دیتے ہیں ان میں سے ہر سہارا فانی ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بقا حاصل نہیں۔ ان میں سے جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے ہیں وہ اپنی زندگی کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے آپ ان سب کے مقابلے میں اس اللہ پر بھروسہ کریں جسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ زندگی اس کا فیضان ہے۔ جہاں کہیں زندگی پائی جاتی ہے اس کی صفتِ تخلیق اور اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ جس کا وہ مددگار ہوتا ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ غارِ ثور میں چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے بھروسے پر آپ پناہ گزین تھے۔ اس بے پناہ قدرتوں والے نے ایک مکڑی کے جالے اور کبوتری کے گھونسلے سے آپ کی حفاظت فرمائی۔ یہ انتہائی ناپائیدار چیزیں بڑے سے بڑے قلعے سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئیں۔ جب ایک بدوی نے برہنہ تلوار آپ کے سر پر لہراتے ہوئے کہا کہ اب آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے تو آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا، اللہ۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

Marfat.com

البتہ صبر و توکل کے حصول کا وسیلہ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہنا ہے۔ نماز جس کی عملی صورت ہے اس کا زیادہ سے زیادہ اہتمام رکھنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بقدرِ استعداد طاقت بھی فراہم کرنی ہے، لیکن توکل اسلحے اور افرادی قوت پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے جسے تسبیح و تحمید سے اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ دشمن کتنا سرکش، منہ زور اور بپھرا ہوا ہے، آپ اس کی ہرگز پرواہ نہ کریں، ان کا معاملہ اپنے رب کے حوالے کریں۔ وہ ان کے تمام جرائم اور کرتوتوں سے باخبر ہے۔ اور جب باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی کرے گا جو ایسے لوگوں کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ﴿۵۹﴾

(جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ ادوار میں، پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا (جیسے اس کی شان ہے) وہ رحمٰن ہے، پس اس کی شان باخبر سے پوچھو۔ ۵۹)

پروردگار کی چند مزید صفات کا ذکر

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار کی مزید صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ صرف زندہ ہی نہیں بلکہ آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان تمام چیزوں کو اس نے چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ سورۃ الاعراف میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ دنوں سے کیا مراد ہے؟ یہ متشابہات کے قبیل سے ہے جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ عام طور پر اس سے چھ ادوار مراد لئے گئے ہیں۔ اس میں درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں نہیں آ گئی بلکہ اس کے خالق نے اسے نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ...... پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ اس کی حقیقت سے ہم واقف نہیں۔ عرش کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے متمکن ہونے سے کیا مراد ہے؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصور یہ دینا مقصود ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس کا خالق کسی گوشے میں چھپ کر نہیں بیٹھ گیا، جیسا کہ بعض فلاسفہ کا خیال ہے۔ کیونکہ اگر وہ کائنات کی تخلیق کے بعد خود لاتعلق ہو کے بیٹھ جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس نے بلاوجہ ایک کارِ عبث انجام دیا ہے جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور یہ چیز ایک مدبر و حکیم کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ وہ بالفعل اپنی کائنات کے عرشِ حکومت پر متمکن ہے۔ یعنی اس کے سارے انتظام کی نگرانی فرما رہا ہے۔ کائنات میں جو تبدیلیاں آئیں، جو ارتقاء ہوا اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا وہ سب اللہ تعالیٰ کی تدبیر و حکمت سے ہو رہا ہے۔ اور اس کائنات کو سنبھالنے اور اس کے نظام کو چلانے میں اس کے سوا کسی کو کوئی دخل نہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ...... الرحمٰن، خبر ہے۔ اس کا مبتدا "ھو" محذوف ہے۔ یعنی جس ذات نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے وہ رحمٰن ہے۔ اس لفظ سے کائنات کے بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جب اس کائنات کا وجود رحمت کی وجہ سے ہوا ہے اور رحمت ہی کیلئے اس کو پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں بے سہارا اور بے نوا لوگ ظلم کی چکی میں پستے رہیں۔ طاقتوروں کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہیں، لوٹنے والوں کے ہاتھوں لٹتے رہیں۔ اسی طرح اچھے لوگ خیر اور بھلائی کی سربلندی کیلئے قربانیاں دیتے ہیں اور بعض دفعہ اس راستے میں جانیں دے دیں۔ لیکن نہ انہیں اپنی قربانیوں کا صلہ ملے اور نہ مجبور و مقہور لوگوں کی محرومیوں کی تلافی ہو۔ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ اس کی رحمت کامل عدل کی صورت میں ظہور میں آئے۔ قربانیاں دینے والے بیش از بیش صلہ پائیں اور مظلوموں پر ظلم کرنے والے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کھڑے ہوں اور کمزوروں کو قتل کرنے والے قتل کے جرم میں پکڑے جائیں اور سب کو ویسی سزا ملے جس کے وہ حقیقت میں مستحق ہیں۔

Marfat.com

فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ...... علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر فوائدِ عثمانی میں اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی شانوں اور رحمتوں کو کسی جاننے والے سے پوچھو، یہ جاہل مشرک اسے کیا جانیں۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اپنی شئون وکمالات کا پوری طرح جاننے والا تو خدا ہی ہے۔ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ ''لیکن مخلوق میں سب سے بڑے جاننے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی ذاتِ گرامی میں اللہ تعالیٰ نے اولین وآخرین کے تمام علوم جمع کر دیئے۔ خدا تعالیٰ کی شانوں کو کوئی ان سے پوچھے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿٦٠﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، وہ پوچھتے ہیں، رحمٰن کون ہے۔ کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو، اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ ٦٠)

اسمِ رحمٰن پر قریش کا اعتراض اور اس کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں قریش اور دیگر مشرکین کی بے خبری اور جہالت کا حوالہ دیا گیا ہے جو حقیقت میں تمرد تک پہنچ چکی تھی۔ باوجود اس کے کہ کائنات کے خالق کی سب سے بڑی صفت رحمٰن ہے اور پروردگار کی اسی صفت کے باعث دنیا وجود میں آئی اور اسی صفت کے مکمل ظہور کیلئے قیامت برپا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ عدل کا بتمام وکمال ظہور ہوگا۔ لیکن ان نادانوں کا حال یہ تھا کہ جب ان سے یہ کہا جاتا کہ اس اللہ کو سجدہ کرو جو رحمٰن ہے تو بڑی رعونت سے جواب دیتے کہ رحمٰن کیا ہے، ہم اسے نہیں جانتے۔ اور یہ ہم سے نہیں ہوسکتا کہ تم جسے سجدہ کرنے کا حکم دو، ہم اسے سجدہ کرنا شروع کر دیں۔ بلکہ ان کی سرکشی کا عالم یہ تھا کہ قرآنِ کریم نے اس مبارک نام کی طرف توجہ دلائی تو بجائے اس کے کہ وہ اسے ایک بڑے خزانے کی خبر سمجھیں اور اس پر شکر گزار ہوں اور صدقِ دل سے اس کی قدر کریں، یہی بات ان کے اندر نفرت اور بیزاری کے بڑھانے کا سبب بن گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قریش رحمٰن کے لفظ سے بدکتے تھے۔ وہ پروردگار کے اسمِ ذاتی کے طور پر اللہ کے لفظ کو مانتے بھی تھے اور اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن رحمٰن کو اللہ کے ساتھ یا اس کی جگہ پر قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ معاہدۂ حدیبیہ کے آغاز میں جب آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے سفیر نے باسمک اللھم لکھنے پر اصرار کیا۔ اور صاف کہا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی رحمٰن کے نام سے واقف نہیں تھے، لیکن بعض اہلِ علم نے اس بات کو قبول کرنے سے اس بناء پر تامل کیا ہے کہ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ عرب میں اللہ تعالیٰ کیلئے قدیم زمانے سے رحمٰن کا لفظ معروف و مستعمل تھا۔ ان کے لٹریچر میں آج بھی اللہ اور رحمٰن دونوں نام ملتے ہیں۔ اس لئے ان اصحابِ علم کی رائے یہ ہے کہ رحمٰن سے ان کا انکار محض کافرانہ شوخی اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ اس سے واقف نہ تھے۔

کچھ اور اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ رحمٰن کا لفظ زیادہ تر اہلِ کتاب کے یہاں معروف تھا۔ مشرکینِ عرب اسمِ اللہ ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جب رحمٰن کے لفظ کا استعمال کیا اور قرآنِ کریم کی سب سے پہلی سورۃ، سورۃ الفاتحہ میں اس کا ذکر آیا۔ تو قریش نے یہ محسوس کیا کہ یہ اہلِ کتاب کی سازش ہے۔ اور محمد (ﷺ) نعوذ باللہ من ذالک ان کے آلۂ کار ہیں۔ انہیں کی مدد سے قرآنِ کریم لکھ رہے ہیں اور انہیں کے ایمان سے ان کے خیالات کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس تصور نے ان کے اندر رحمٰن سے نفرت پیدا کر دی۔

Marfat.com

سبب کچھ بھی ہو، قرآنِ کریم قریش کی حماقت پر توجہ دلاتے ہوئے انہیں یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ نادانو! تم نے دوسروں کی ضد میں اپنے آپ کو ایک ایسے نام سے محروم کرلیا ہے جو تمہارے لئے بیشمار برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔

یہ آیت سجدہ کی آیت ہے، یعنی اس آیت کی تلاوت ختم ہونے پر سجدۂ تلاوت ضروری ہے۔ اور تمام اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت کے پڑھنے والے اور اس کے سننے والے پر سجدہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ نیز یہ بھی مسنون ہے کہ آدمی جب اس آیت کو سنے تو جواب میں کہے زَادَنَا اللّٰهُ خُضُوْعًا مَّا زَادَ لِلْاَعْدَاءِ نُفُوْرًا ''اللہ تعالیٰ ہمارے اندر خضوع میں اضافہ کرے جتنا دشمنوں میں نفور بڑھے۔''

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ
فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً
لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا
سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ﴿۶۴﴾ وَ الَّذِیْنَ
یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖۗ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ
غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا
لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَ الَّذِیْنَ
لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ
لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ یَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ
وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ
وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَ مَنْ تَابَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ

Marfat.com

إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ
مَرُّوا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا
صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿٧٤﴾ أُولَٰئِكَ
يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ﴿٧٥﴾
خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿٧٦﴾ قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ
رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ۖ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾

رکوع: ۶۔ (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک منور چاند بنایا۔ ۶۱) اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا، ہر اس شخص کیلئے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔ ۶۲) اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان کے منہ آئیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ۶۳) اور جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ ۶۴) اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے، بیشک اس کا عذاب بالکل چمٹ جانے والی چیز ہے۔ ۶۵) بیشک وہ نہایت برا مستقر اور نہایت ہی برا مقام ہے۔ ۶۶) اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال سے ہوتا ہے۔ ۶۷) اور (عباد الرحمٰن وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ وہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے بغیر کسی حق کے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کوئی ان باتوں کا مرتکب ہوگا وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا۔ ۶۸) قیامت کے دن اس کیلئے عذاب بڑھایا جاتا رہے گا اور وہ ہمیشہ رہے گا اس میں ذلیل وخوار ہو کر۔ ۶۹) مگر وہ جو توبہ کر لیں گے ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے، تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ ۷۰) اور جو شخص توبہ کرتا اور عمل صالح اختیار کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ ۷۱) اور

Marfat.com

جاتے ہیں۔ ۷۲) اور (عبادالرحمٰن) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ ۷۳) اور جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ ۷۴) یہ ہیں وہ لوگ جنہیں ان کے صبر کے باعث بالاخانے دیئے جائیں گے اور ان میں ان کا خیر مقدم تحیت و سلام کے ساتھ ہوگا۔ ۷۵) وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، بہت عمدہ ہے وہ ٹھکانہ اور قیام گاہ۔ ۷۶) اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے اگر تمہیں دعوت دینا نہ ہوتا، سو تم نے اس کی تکذیب کر دی تو وہ چیز عنقریب لازم ہو کر رہے گی۔ ۷۷)

تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾
وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

(بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک منور چاند بنایا۔ ٦١) اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا، ہر اس شخص کیلئے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار بننا چاہے۔ ٦٢)

تَبٰرَكَ کا مفہوم اور سورۃ کی پہلی آیت سے ربط

عجیب بات یہ ہے کہ اس سورۃ کا آغاز بھی تَبٰرَكَ سے ہوا تھا اور اس کے آخری رکوع کا آغاز بھی اسی لفظ سے ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ و معانی میں کس قدر ہم آہنگی اور ربط پایا جاتا ہے۔ وہاں ہم نے تَبٰرَكَ کی تشریح کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یہ لفظ ایسا وسیع المعنی ہے جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے۔ اس کا مادہ ب، ر، ک ہے۔ اس سے دو مصدر مستعمل ہیں۔ (۱) بَرَكَة (۲) بُرُوْك، برکت کے مفہوم میں رفعت و عظمت اور افزائش و فراوانی کے تصورات شامل ہیں۔ اور بروک میں ثبات، بقاء اور لزوم کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو رفیع و عظیم ہے۔ وہ عظمتوں کا سرچشمہ ہے اور رفعتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ خیرات و حسنات اسی کے فیض سے وجود میں آتی ہیں۔ ہر چیز میں اضافہ اور کثرت اسی کی عنات کا ثمر ہے۔ وہ ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ اپنی بزرگی اور عظمت میں سب پر فائز ہے اور اپنی ذات و صفات اور افعال میں ہر ایک سے بالاتر ہے۔ اس کی ربوبیت اور فیضان بے مثال اور بےنظیر ہے۔ اس کے کمالات کو کبھی زوال نہیں۔ اس کے بے مثال فیضان اور بے انتہا لطف و کرم کے طور پر سورۃ کے آغاز میں قرآنِ کریم کے نزول کو فرقان کے نام سے ذکر فرمایا گیا۔ اور اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی فیضان کو بروج اور سراج اور منور چاند سے تعبیر کیا۔ جس میں شاید یہ کہنا مقصود ہے کہ جب ہم نے قرآنِ کریم کی صورت میں آفتابِ ہدایت کو نازل فرمانے کا ارادہ کیا تو اس سے پہلے آسمان پر برج بنائے۔ برج سے مراد وہ قلعے اور دیدبان ہیں جو اس نظامِ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے اس لئے بنائے ہیں کہ جن و انس ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے وہ جس طرح استراقِ سمع کا ارتکاب کرتے تھے اور پھر اپنی طرف سے اس میں جھوٹ سچ ملا کر کاہنوں کے کاروبار کو تقویت پہنچاتے تھے اور عالم الغیب ہونے کا بھرم رچا کر لوگوں کے عقائد کو بگاڑتے تھے۔ جب آخری آفتابِ ہدایت کے نزول کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے بروج میں پہرے بٹھا کر

Marfat.com

ملائے اعلیٰ کی حدود کو اس طرح کی دسترس سے بالکل محفوظ کر دیا تا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی القاء کی ہوئی غیب کی خبریں محفوظ حالت میں اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تک پہنچیں اور کسی اور کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع نہ ملے کہ وہ غیب دانی پر دسترس رکھتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فیضان کے حوالے سے سراج یعنی سورج اور روشن چاند کا ذکر فرمایا۔ یعنی جس طرح انسان کی معنوی اور روحانی زندگی کیلئے قرآن کے آفتاب کا مطلعِ نبوت پر طلوع ہونا ضروری تھا، اسی طرح انسان اور دیگر مخلوقات کی ظاہری اور جسمانی زندگی کیلئے سورج اور چاند کا بنایا جانا بھی ضروری تھا۔ نہ اس کے بغیر انسانی زندگی ممکن تھی اور نہ نبوت اور قرآن کے بغیر انسان کی فلاح ممکن تھی۔

نشانیوں کی کمی نہیں اصل ضرورت تذکر اور شکر گزاری کی ہے

جس طرح انسانی زندگی کیلئے سورج اور چاند کا وجود ضروری ہے اسی طرح انسانی زندگی اور انسانی مشاغل کیلئے رات اور دن کا ایک دوسرے کے بعد آنا بھی ضروری ہے۔ اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اگر پروردگار رات کے سائے کو مستقل کر دیتا اور دن کبھی طلوع نہ ہوتا تو ہر طرح کی حیوانی اور انسانی زندگی تباہ ہو جاتی۔ اور اسی طرح اگر دن کی روشنی اور سورج کی تپش کو مستقل یا دراز کر دیا جاتا تو سمندروں کا پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا اور ہر چیز بھسم ہو کے رہ جاتی۔ اور پھر رات اور دن جس طرح ایک لگے بندھے طریقے سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار بن کر ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور اس میں جو جو حکمتیں مضمر ہیں ہم سورۃ فاتحہ میں اس پر بحث کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔ ہر دیدۂ بینا اس سے متاثر ہوتی اور ہر قلبِ بیدار اس سے ہدایت پاتا ہے۔ لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں سے نصیحت حاصل کرنے اور شکر گزاری کا جذبہ پانے کا ارادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہمارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ خود انسان کا جسم، اس کی جان، اس کے احساسات اور اس کی صلاحیتیں ایک سے ایک بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، لیکن کافران سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ فائدہ اٹھانے کیلئے نیت اور ارادہ شرط ہے۔ جو آدمی پھول کی پنکھڑی کو دیکھتا ہے اگر اس کے اندر تذکر اور شکر گزاری کا جذبہ نہیں تو وہ صرف اسے خوشبو کا ذریعہ، ملائمت کا نمونہ اور یا بدرجۂ آخر گل قند کا سامان سمجھتا ہے۔ لیکن جس شخص میں تذکر کا مادہ پایا جاتا ہے وہ پھول کی ہر پنکھڑی کو معرفتِ کردگار کا ورق گردانتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ تذکر، عقل کا فعل ہے اور شکر، دل کا۔ یہی دونوں حقیقتیں انسانی شرف کی ضامن اور علامت ہیں۔ لیکن ان دونوں کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آدمی ان کے حصول کیلئے اپنے اندر جذبۂ بیدار اور ارادۂ بے پناہ رکھتا ہو۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝٦٣

(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان کے منہ آئیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ۶۳)

عباد الشیطان کے مقابلہ میں عباد الرحمٰن کا بیان

گزشتہ رکوع کی آیت نمبر ساٹھ میں بتایا گیا ہے کہ جب قریش سے کہا گیا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو انہوں نے نہایت تکبر سے جواب دیا، کون ہے رحمٰن؟ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ اور ان کے اس طرزِ عمل نے ان کے دلوں میں رحمٰن سے نفرت میں اضافہ کر دیا۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے اور آنحضرت ﷺ کی تربیت نے ان کے اندر وہ روحانی اور اخلاقی کمالات پیدا

Marfat.com

گئے کہ آج وہ مسلمانوں کی تاریخ کا قابلِ صد افتخار باب ہیں انہیں عباد الرحمٰن کے عنوان سے یاد کیا گیا اور ان کے وہ اوصاف بیان کئے گئے جو انسانیت کے جوہر ہیں۔ بتانا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اللہ اور رحمٰن میں کوئی فرق نہیں، دونوں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ تم جس ذاتِ بزرگ و برتر کو اللہ تعالیٰ کے نام سے جانتے ہو وہی رحمٰن ہے، لیکن تم اس کے سامنے جھکنا اور اس کی طرف اپنا انتساب کرنا اپنے لئے باعثِ عار سمجھتے ہو، لیکن جن لوگوں پر انسانیت ہمیشہ ناز کرتی رہے گی ان کیلئے عباد الرحمٰن کا نام اور عنوان نہایت عزت و افتخار کی علامت ہے۔

عباد کا مفہوم

رحمٰن کی طرف انتساب کے ساتھ ساتھ عباد کا لفظ بھی قابلِ توجہ ہے، یہ عبد کی جمع ہے جو غلام پر بولا جاتا ہے۔ آگے جن لوگوں کی صفات بیان کی جارہی ہیں ان صفات کے اصل سرچشمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان میں یہ صفات اس لئے آئی ہیں اور ان میں یہ حیرت انگیز تبدیلیاں اس لئے رونما ہوئی ہیں کہ انہوں نے دنیا بھر کی غلامیوں سے رشتہ توڑ کر اللہ تعالیٰ سے غلامی کا رشتہ جوڑا ہے، ان کا سر صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے، وہ صرف اس سے ڈرتے اور اس سے امید باندھتے ہیں، اسی پر بھروسہ کرتے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، ان کا قیام، رکوع، سجود اور قعود صرف اسی کیلئے ہیں۔ وہ اس شریعت کی پیروی کرتے ہیں جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔ اور وہ اس رسول کو اسوۂ حسنہ سمجھتے ہیں جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ اللہ اور رحمٰن کی بندگی ہے جس نے ان کے اندر وہ اوصاف پیدا کر دیئے ہیں جن کا آگے ذکر کیا جانے والا ہے۔

بالکل سامنے کی بات ہے کہ جو شخص انسانوں کی بندگی کرے گا اس کے اندر وہ اوصاف پیدا نہیں ہوسکتے جو اس کی ذات کو رفعتِ پرواز دے سکیں۔ جو توہمات کو اپنا معبود بنائے گا اس کے اندر انسانیت کی حقیقت پیدا نہیں ہوسکتی۔ جو مظاہر قدرت کے سامنے جھکے گا اس کے اندر قوتِ تسخیر کبھی جنم نہیں لے سکتی۔ جو لکشمی دیوی کی پوجا کرے گا وہ حرص، بخل، خودغرضی اور نفسانی جذبات سے کبھی بلند نہیں ہوسکے گا۔ علیٰ ہذا القیاس ملکوتی صفات اور الٰہی اخلاق صرف اس شخص میں پیدا ہوسکتے ہیں جس کا سر اللہ تعالیٰ کے آستانے کے سوا کہیں اور نہ جھکتا ہو اور جس کی بندگی کا رشتہ اللہ تعالیٰ اور رحمٰن کے سوا کسی اور سے نہ ہو۔

سیرت و اخلاق کے دو نمونے

ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلائی جارہی ہے وہ یہ کہ تمہارے سامنے سیرت و اخلاق کے دو نمونے ہیں۔ ایک وہ نمونہ ہے جو قرآنِ کریم کی دعوت کو قبول کرنے اور آنحضرت ﷺ کی پیروی کرنے کے نتیجے میں وجود میں آیا اور جسے اس رکوع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ایک وہ نمونہ ہے جو صدیوں کے توہمات، تقلیدِ آباء اور جاہلیت نے پیدا کیا ہے جو آج مکے اور عرب بھر میں چاروں طرف نظر آتا ہے۔ نہایت خاموشی کے ساتھ قریش اور دیگر اہلِ مکہ کو دعوت دی گئی ہے کہ تم ان دونوں نمونوں میں تقابل کر کے دیکھو۔ ایک نمونے کا عکس تو تمہارے اندر موجود ہے اور دوسرا نمونہ اصحابِ ایمان کی شکل میں تمہیں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور ان آیات میں اسی کا عکس دکھایا گیا ہے۔ پھر خود فیصلہ کرو کہ ان دونوں نمونوں میں سے انسانیت کو کس نمونے کی ضرورت ہے، اور وہ کون سا نمونہ ہے جس سے نفرتوں کے اس جہنم کی آگ بجھائی جاسکتی ہے۔

Marfat.com

عبادالرحمٰن کی پہلی صفت عاجزانہ رفتار

روئے سخن چونکہ اشراف قریش کی طرف ہے جن کے کبروغرور اور تکبر کا عالم یہ ہے کہ خدا کا محبوب نام رحمٰن بھی انہیں گوارا نہیں۔ اس لئے ان کے کبروغرور پر چوٹ لگانے کیلئے سب سے پہلے عبادالرحمٰن کی عاجزی اور فروتنی کو ذکر کیا جارہا ہے۔ کیونکہ انسانیت کی بقا اور اس کی ترقی وعروج کیلئے جباروں اور مفسدوں کی ضرورت نہیں بلکہ شریف الطبع، حلیم، بردبار اور ہمدرد وغمگسار لوگوں کی ضرورت ہے جو لوگوں کے کام آئیں اور ان کے زخموں پر مرہم رکھیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عاجزی اور فروتنی کے اظہار کیلئے عبادالرحمٰن کی رفتار اور چال کو حوالہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ رحمٰن کے بندے جب چلتے ہیں تو نرم چال چلتے ہیں یعنی نہایت عاجزی اور فروتنی سے چلتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا، طبیعت پر قابو رکھنے والا، غرور وتکبر سے دور اور تمام انسانوں کی بھلائی سوچنے والا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اس کا سر اٹھنے نہیں دیتا، لوگوں سے برابری اس کے سینے میں ہوا ابھرنے نہیں دیتی۔ عاجزی اور فروتنی اسے قدم پٹخنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا اور گزر جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی رفتار میں کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ نرم چال سے مریضانہ چال مراد نہیں اور نہ وہ چال مراد ہے جس میں ریاکاری اور انکساری کی نمائش پائی جاتی ہے وہ نبی کریم ﷺ کی طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے اس طرح چلتا ہے گویا اس کے قدم نشیب کی طرف اتر رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے ایک جوان آدمی کو مریل چال چلتے دیکھا، تو روک کر پوچھا کیا تم بیمار ہو؟ اس نے عرض کیا جی نہیں۔ آپؓ نے دُرہ اٹھا کر اسے دھمکایا اور بولے قوت کے ساتھ چلو، اسلام کو کمزوروں کی نہیں مضبوط نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

ممکن ہے ذہن میں یہ خیال آئے کہ کسی شخص سے تعارف حاصل کرنے کیلئے یہ کبھی نہیں پوچھا جاتا کہ وہ چلتا کیسے ہیں۔ نہ کسی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ وہ چلتا کیسے ہے، بلکہ ہمیشہ اس کی دیگر صفات، اس کی صلاحیتیں، اس کی مالی حالت یا اس کی علمی فتوحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں پروردگار نے عبادالرحمٰن کی صفات میں سب سے پہلے رفتار ہی کا ذکر کیوں فرمایا؟ بات دراصل یہ ہے کہ آپ اگر کسی شخص کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ معاملات کر کے دیکھیں، ظاہر ہے کہ یہ صورت ہر ایک کے ساتھ پیش نہیں آتی۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس سے گفتگو کر کے دیکھیں، کیونکہ گفتگو ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بولنے والے کی شخصیت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ سعدی نے ٹھیک کہا:

شخصے کہ تانہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

لیکن گفتگو کی نوبت بھی بہ اول مرحلہ نہیں آتی۔ تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور، بے تکلفی تک نوبت پہنچتی ہے تو تب کھل کر بات کرنے کا موقع آتا ہے۔ لیکن چال اور رفتار ایک ایسی علامت ہے جس کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں۔ آپ ہر گزرنے والے کو پہلی نظر چلتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں اور مزید یہ کہ آدمی کی چال صرف اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت وکردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو سیرت وکردار کے اعتبار سے مختلف افراد کے چلنے کا انداز آپ مختلف پائیں گے۔ ایک

Marfat.com

عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم وجابر کی چال، ایک خود پسند متکبر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے انسانوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر باآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمٰن کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لوگے کہ یہ کس طرح کے لوگ ہیں۔ ان کے چہروں کا نور، ان کی جھکی ہوئی نگاہیں، ان کی خم کی ہوئی گردنیں، ان کے جمتے ہوئے مضبوط قدم، لوگوں سے بے نیاز اپنی دھن میں مصروف، دنیا کی دلچسپیوں سے بیگانہ اور مقصد کی لگن میں منہمک یہ ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جو زمین پر بوجھ بن کر نہیں بلکہ زمین کا سہاگ بن کر جینا چاہتے ہیں۔

دوسری صفت مومنانہ گفتار

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ...... عبادالرحمٰن کے تعارف میں سب سے پہلے ان کی چال اور رفتار سے منعکس ہونے والی عاجزی اور فروتنی کو ذکر کرنے کے بعد دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جب جاہل لوگ ان کے منہ آئیں تو وہ سلام کہہ کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے عبادالرحمٰن کی رفتار کا ذکر فرمایا، اب ان کی گفتار کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ اس میں سب سے پہلی بات جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ بے ضرورت بات کرنے والے نہیں ہوتے۔ اور بے مقصد بحث کرنا بھی ان کا کام نہیں۔ وہ بولتے اس وقت ہیں جب بولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جا و بے جا بولنا ان کا طریقہ نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ منہ سے نکلا ہوا ہر بول قیامت کے دن ترازو کا تول بنے گا۔ ایک ایک بات کا جواب دینا پڑے گا اور یہ بھی جانتے ہیں کہ زبان جس لفظ کو اگلتی ہے کندھوں پر بیٹھے ہوئے نگران فوراً اسے لکھ لیتے ہیں۔ کوئی لفظ یا کوئی جملہ ایسا نہیں جس کو زبان ادا کرے اور وہ نامۂ عمل کا حصہ نہ بنے اور پھر قیامت کے دن اس کے بارے میں جوابدہی نہ کرنا پڑے۔ یہ وہ تصورات ہیں جس نے انہیں کم سے کم بولنے پر مائل کر رکھا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ بے ضرورت قوتِ گویائی کو حرکت نہ دی جائے۔ اور مقصد سے ہٹ کر کوئی بات نہ کی جائے۔ اقبال مرحوم نے صحابہ کرامؓ کی تعریف کرتے ہوئے ان کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے ان میں خاص طور پر اس خصوصیت کو نمایاں کیا ہے:

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

وہ فقرے باز، پھبتی کسنے والے، جملے پھینکنے والے اور تمسخر اڑانے والے لوگ نہیں ہوتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زبان آور نہیں ہوتے، یا طلاقتِ لسانی میں کمزور ہوتے ہیں بلکہ ان کا اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے جیسے حضرت حسن بصری نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے خوف نے ہماری زبانیں گنگ کر رکھی ہیں ورنہ ہم سے بہتر زبان آور کون تھا۔

کوئی ایسی ہی بات ہے کہ خاموش ہوں میں
ورنہ کیا بات ہے کہ کر نہیں آتی

البتہ ایک بات ہے کہ جب ظلم کا پہرہ شدید ہو جائے، جبر کی وجہ سے زبانوں کو لونی لگ جائے اور ہر شخص منقار زیر پَر ہو جائے تو ایسے ہُو کے عالم اور سناٹے میں یہی لوگ بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ بولنے سے احتراز اس لئے کرتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ ہر بات کا جواب دینا پڑے گا، لیکن جب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کیلئے کلمۂ حق کہنا واجب ہو جائے تو پھر وہ اس لئے بولتے ہیں کہ جانتے ہیں کہ اب خاموشی کا جواب دینا پڑے گا۔

Marfat.com

یہ گزارشات جو آپ کے سامنے کی گئی ہیں یہ دراصل وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ کے اسلوب سے استنباط کی گئی ہیں۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بولنے اور بات کرنے میں پہل نہیں کرتے،لیکن جب ان سے دوسرے بات کرتے ہیں تو پھر ان میں دو طرح کے لوگ ہوں گے۔ایک تو وہ لوگ جو معرفتِ حق، فہمِ دین، دریافتِ احوال، یا تبادلۂ خیالات کیلئے بات کرنا چاہیں گے تو عبادالرحمٰن ان کیلئے ابریشم کی طرح نرم اور پھول کی طرح ملائم ہوتے ہیں اور وہ لوگ ان سے بات کر کے یوں محسوس کرتے ہیں:

تم سے مل کر یہ تعجب ہے کہ اتنا عرصہ
آج تک تیری جدائی میں یہ کیونکر گزرا

جاہل کا مفہوم اور سلام سے مراد

اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جنہیں یہاں جاہل کہا گیا ہے۔اس سے مراد اَن پڑھ یا بے علم لوگ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو جہالت پر اتر آئیں اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگیں اور یا وہ لوگ ہیں جو اپنے خیالات میں اسیر اور اپنے توہمات کے پرستار ہیں۔وہ نہ عقل کے پیمانے کو مانتے ہیں، نہ دلیل انہیں اپیل کرتی ہے۔وہ دوسروں سے بات سمجھنے کیلئے نہیں کرتے بلکہ محض الجھانے کیلئے کرتے ہیں۔ایسے لوگوں کے بارے میں عبادالرحمٰن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ گالی کا جواب گالی سے اور بہتان کا جواب بہتان سے اور بے ہودگی کا جواب بے ہودگی سے نہیں دیتے۔بلکہ جو ان کے ساتھ جہالت کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک لغو اور بے ہودہ بات کا ارتکاب کر رہا ہے، تو وہ سلام کہہ کے اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔یہ سلام نہ سلام محبت ہے، نہ سلامِ اجازت بلکہ یہ سلامِ مفارقت ہے۔قرآنِ کریم نے دوسری جگہ عبادالرحمٰن کے اس طریقے کو کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا ہے۔ارشاد ہے کہ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (القصص، آیت ۵۵) ”جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اسے نظرانداز کر دیتے ہیں، کہتے ہیں بھائی ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، سلام ہے تم کو ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگتے۔“

سلام کر کے رخصت ہو جانا کسی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا ایک شائستہ اور بابرکت طریقہ ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، آپؑ اپنے والد سے اسی طرح الگ ہوئے تھے۔اس طرح اگر کسی سے علیحدگی اختیار کی جائے تو توقع ہے کہ اگر اس کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوگی تو وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کرے گا، اور الجھنے اور الجھانے کی بجائے بات سننے اور سمجھنے کی طرف مائل ہوگا اور اگر کسی کے اندر خیر کی کوئی رمق ہی نہیں ہے اور وہ محض مجادلہ اور مناظرہ کے درپے ہے تو ایسے شخص کو منہ لگانا عبادالرحمٰن کے شایانِ شان نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿٦٤﴾

(اور جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ ۶۴)

عبادالرحمٰن کے تعارف میں پہلے ان کی رفتار کا ذکر کیا، پھر گفتار کا اور اب کردار کے ذکر کا آغاز کیا جا رہا ہے۔اور کردار کے ذکر میں سب سے پہلے ان کی راتوں کی زندگی کا حوالہ دیا گیا ہے اور اسے ایسے خوبصورت پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے، جس سے ان کی جلوت اور خلوت دونوں روشنی میں آ جاتی ہیں۔

Marfat.com

تیسری صفت عباد الرحمٰن کا کردار اور خلوت کی زندگی

انسان کی زندگی شب وروز کے معمولات سے عبارت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان معمولات کی انجام دہی میں رفتار اور گفتار بھی شامل ہیں اور زندگی کے بناؤ سنوار میں ان کا بھی ایک رول ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی شخص یا کسی گروہ کی زندگی پر اصل چھاپ کس چیز کی ہے، اس کی ترجیحات میں کسے اولیت حاصل ہے اور اس کے تصورات، خیالات اور احساسات میں کون سی چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ تو اس کے ان معمولات کو دیکھنا چاہئے جو دن کی ہمہ ہمی اور حصولِ روزگار کی رواروی سے فراغت کے بعد رات کی مجالس یارات کی تاریکی میں سرانجام پاتے ہیں۔ ایک عیاش آدمی فراغت کے لحات میسر آتے ہی شبینہ مجالس اور نائٹ کلبوں کا رخ کرتا ہے۔ زندگی کے مقاصد سے بے نیاز شخص چار یاری، گپ بازی اور تفریح گاہوں میں وقت گزارنا پسند کرتا ہے۔ علم کا شوق رکھنے والا فراغت کو مطالعہ اور علمی تجسس میں صرف کرتا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے تقویٰ سے مالا مال، اس کے خوف سے گراں بار اور زندگی کے مقاصد سے بہرہ ور اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا طلبگار ہے وہ رات کے بیشتر لحات کو عبادت میں گزارنا پسند کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسی سے دل ودماغ کی تربیت ہوتی ہے، اسی سے بندگی کو جلا ملتی ہے، اسی سے عبدیت حقیقی معراج سے ہمکنار ہوتی ہے اور اسی سے انسان اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا مضبوط تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جس کے بعد دنیا کی ہر طاقت اس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عباد الرحمٰن کے کردار کی اصل پہچان، اصل رخ اور اصل جہت کو واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا کہ ان کی راتیں سجدہ اور قیام میں بسر ہوتی ہیں۔ سجدہ وقیام کا ذکر جس اسلوب میں کیا گیا ہے اس سے وہ شوق و اضطراب جھلکتا ہے جو ان کی عبادت میں پایا جاتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف فرض نمازیں نہیں بلکہ وہ کیفیت مراد ہے جو ایک مردِ مومن کو قیام اللیل میں نصیب ہوتی ہے اور جس کو اقبال نے بیان کرتے ہوئے کہا:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ عباد الرحمٰن کی اگر راتیں سجدہ وقیام میں گزرتی ہیں تو وہ آرام کس وقت کرتے ہیں جبکہ رات کی نیند اور آرام انسان کی ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر قوتِ کارکردگی بحال نہیں ہوتی اور انسان کی زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ سجدہ وقیام میں راتوں کا گزرنا یہ درحقیقت ان کی زندگی کی اولیں ترجیح اور زندگی کے غالب رویئے کی ایک تعبیر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ماں کا اکلوتا بیٹا جو اس کی زندگی کا واحد سہارا ہو، بیمار پڑ جائے تو وہ اگرچہ چولہا بھی جھونکتی ہے، پیٹ کا جہنم بھی بھرتی ہے، آرام بھی کرتی ہے لیکن اس کی توجہ تمام تر بیٹے کی طرف لگی رہتی ہے تو اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ شب وروز اپنے بیٹے کی تیمارداری اور غمگساری میں مصروف رہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وقت نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے اور نہ آرام کرتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا غم بچے کی بیماری اور اس کا اصل ہدف بچے کی تیمارداری ہے۔ یہاں بھی عباد الرحمٰن کے ہدف کو متعین کیا گیا ہے، ان کی زندگی کے اصل روپ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور ان کی اصل پہچان جس میں ان کا کردار جھلکتا ہے اس کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

Marfat.com

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾

(اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے، بیشک اس کا عذاب بالکل چمٹ جانے والی چیز ہے۔ ۶۵) بیشک وہ نہایت برا مستقر اور نہایت ہی برا مقام ہے۔ ۶۶)

عبادت ان میں نیکی کا پندار پیدا نہیں کرتی

غور فرمائیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جب چلتے ہیں تو ان کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کے خوف سے گراں بار ہوتا ہے۔ انسانیت کے مقام کو سمجھنے کی وجہ سے نہایت عاجزی سے چلتے ہیں۔ ان کا سر اللہ تعالیٰ کے خوف سے جھکا رہتا ہے اور ان میں عاجزی اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور انسانوں میں برابری کے تاثر کے باعث نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ وہ جب بولتے ہیں تو کبھی بولنے میں پہل نہیں کرتے۔ اپنے ایک ایک بول کو کل کا تول سمجھ کر نہایت احتیاط کرتے ہیں اور جہالت پر اترے ہوئے لوگوں سے اگر سابقہ پڑ جائے تو وقت کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتے ہوئے ضائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ گویا ان کے ایک ایک قدم پر اور ان کی زبان سے نکلنے والے ہر ہر لفظ پر جواب دہی کا احساس غالب رہتا ہے اور مزید یہ کہ دن بھر کلمۂ حق کی سربلندی اور دین کی تبلیغ و دعوت میں صرف کرنے کے بعد جب رات کو بستر پر لیٹتے ہیں تو نیند میں ڈوب نہیں جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت اور اس سے غائت درجہ تعلق کی وجہ سے بار بار عبادت کیلئے اس کے دربار میں کھڑے ہوتے اور عاجزانہ التجائیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جہنم میں ڈالے گا۔ اگر اس طرح کے لوگ جہنم میں جائیں گے تو پھر جنت میں جانے والا کون ہوگا؟ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ اپنی تمام تر نیکیوں، عبادتوں، ریاضتوں اور اللہ تعالیٰ سے قرب کا رشتہ رکھنے کے باوجود کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے کہ ہماری یہ صفات جنت میں جانے کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ ان کا تقویٰ ان کے اندر نیکی کا پندار پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں ہزار محنت کرے اور جان مارے لیکن وہ اس قابل کبھی نہیں ہوسکتی کہ جنت کا حصول یقینی ہوجائے۔ انسان کبھی اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ عبادت کے دوران میرے نفس نے کبھی خیانت نہیں کی۔ میرے خیالات ہمہ تن یکسوئی کی تصویر بنے رہے۔ میں کبھی ایک لمحے کیلئے بھی غفلت کا شکار نہیں ہوا جبکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اس قدر عظیم ہے کہ وہاں بڑی سے بڑی عبادت اور بڑی سے بڑی اطاعت کو بھی بار ملنا یقینی نہیں ہے۔ ان اعتقادات کے باعث وہ اپنی انتہائی پاکیزہ زندگی کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعا کرتے رہتے ہیں کہ الٰہی ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے رکھنا۔ وہ جانتے ہیں کہ جہنم کا عذاب ایک ایسی چمٹ جانے والی چیز ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس سے بچنے کیلئے جو کچھ کیا جاسکتا ہے اسی زندگی میں کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کا فضل ہی ایک مومن کیلئے جائے پناہ ہے۔ جب تک وہ میسر نہیں تب تک بھروسے کی کوئی بات نہیں۔

غَرَامًا ...... ہمیشہ رہنے والا جو کبھی جدا نہ ہو۔ قرض خواہ کو غریم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قرضہ لئے بغیر جان نہیں چھوڑتا۔

Marfat.com

مستقر اور مقام کا مفہوم

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۶۶﴾ مستقر اور مقام ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے بھی استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن جب یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہوں تو پھر ان کے درمیان کچھ نہ کچھ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مستقر، مستقل قیام گاہ کو کہتے ہیں اور مقام عارضی جائے قیام کو۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جہنم ایک ایسی ہولناک جگہ ہے جسے نہ مستقر بنایا جاسکتا ہے اور نہ مقام۔ یعنی اس میں مستقل طور پر ٹھہرنا اور قرار پکڑنے کا تو خیر کیا سوال ہے، وہ تو ایسی تکلیف کی جگہ ہے جس میں آدمی ایک لمحہ گزارنا بھی پسند نہ کرے۔ یہ بات شاید اس لئے فرمائی گئی ہے کہ بعض مقامات مختصر قیام کیلئے تو گوارا ہوتے ہیں لیکن مستقل قیام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ریلوے سٹیشن کی انتظار گاہیں یا ہوائی اڈوں کی انتظار گاہیں۔ مختصر وقت کیلئے انتظار میں بیٹھنا ایسی جگہ میں گراں نہیں گزرتا بلکہ وہاں بڑی سہولتیں بھی میسر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کسی کو اسے رہائش گاہ بنانے کیلئے کہا جائے تو کبھی کوئی تیار نہیں ہوتا، کیونکہ گاڑیوں اور جہازوں کا شور انسان کیلئے اعصاب شکن ثابت ہوتا ہے جس سے بہت سے عوارض پیدا ہوتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾

(اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال سے ہوتا ہے۔ ۶۷)

عبادالرحمٰن کی ایک اور صفت

عبادالرحمٰن کی ایک صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اگر دولت عطا کرے تو وہ دولت کے نشے میں مخمور ہو کر بے اعتدالی کی روش اختیار نہیں کرتے۔ زندگی کے باقی معاملات کی طرح ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی نہایت اعتدال کی تصویر ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس مال و دولت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، ہماری ملکیت نہیں۔ ملکیت رکھنے والا شخص تو کسی حد تک اپنی مملوک چیز میں من مرضی کا رویہ اختیار کرسکتا ہے لیکن کسی امانت کا حامل ان حدود سے ہرگز تجاوز نہیں کرسکتا جو امانت رکھنے والے نے امانت رکھتے ہوئے اس پر لازم کی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے زیرِ تصرف مال و دولت میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اس لئے ہم خرچ کرتے ہوئے ایسا طریقہ اختیار نہیں کرسکتے جس میں دوسروں کے حقوق متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ ان تصورات کی وجہ سے وہ اپنے زیرِ تصرف مال میں نہ اسراف کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور نہ بخیل بن کر خزانے کا سانپ بن جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مال و دولت خرچ کرتے ہوئے آدمی کے سامنے وہ کیا معیار رہنا چاہیے جس سے اسراف سے بھی بچا جاسکے اور بخل سے بھی۔ علماء نے اسراف کی تعریف کرتے ہوئے تین چیزوں کی نشاندہی کی ہے۔ (۱) ناجائز کاموں میں دولت صرف کرنا اسراف ہے، خواہ وہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی کوئی ایسی چیز خریدنا جو بجائے خود حرام ہو یا حرام کا ذریعہ بن سکتی ہو، ایسے لوگوں کی خدمت کرنا جن کی وجہ سے برائی پھیل رہی ہو، ایسے ذرائع پر پیسہ لگانا جس سے غربت بڑھے اور بے حیائی پھیلے۔ (۲) جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر جانا، یعنی اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرنا جس سے ان کے حقوق کو نقصان پہنچے جو اس کے پاس مال و دولت پر عائد ہوتے ہیں۔ (۳) نیکی کے کاموں میں ریا اور نمائش کیلئے خرچ کرنا یا شہرت کے حصول کیلئے پیسہ لٹانا، یہ سب اسراف کی مختلف شکلیں ہیں۔

Marfat.com

بخل کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ (۱) آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ مثلاً بچوں کی تعلیم و تربیت میں جائز حد تک بھی دولت خرچ کرنے سے گریز کرے۔ بچوں کو ایسا لباس بنا کر نہ دے جو ان کی جائز ضرورت ہو۔ جس معاشرے میں رہائش ہو استطاعت رکھتے ہوئے بھی ایسا مکان نہ بنائے یا گھر کی ایسی حالت رکھنے سے گریز کرے جو عزتِ نفس کیلئے ضروری ہو۔ اہلِ خانہ پر ایسی مالی پابندیاں لگا دے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ (۲) نیکی اور بھلائی کے کاموں میں پیسہ خرچ کرنا گوارا نہ کرے۔ ذاتی ضروریات اور اہلِ خانہ کی ضروریات پر بے دریغ روپیہ لٹائے، لیکن غریب لوگوں، رفاہی کاموں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کیلئے ایک پیسہ بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ، اسلام کی راہ ہے۔ اس کیلئے ایک معین معیار مقرر کرنا اگرچہ مشکل ہے کیونکہ حالات کے تغیر کے اعتبار سے فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص زندہ ضمیر رکھتا ہے اور اس کے اندر بصیرت، نام کی کوئی چیز بھی پائی جاتی ہے اور وہ اپنے معاشرے کی جائز ضروریات کو بھی سمجھتا ہے اور بچوں اور خواتین کیلئے احساسات کو بھی جانتا ہے، تو اس کیلئے اعتدال کی راہ اختیار کرنا اور اس کیلئے ایک معیار مقرر کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ہمارے سلف صالحین نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کا رجحان انفاق فی سبیل اللہ کی طرف ہے۔ وہ معیارِ زندگی اونچا کرنے کی خبط میں مبتلا ہونے کی بجائے زیادہ سے زیادہ غریبوں کی بھلائی اور دینی ضروریات پر خرچ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے برائیاں بھی روکی جا سکتی ہیں اور معاشرے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جو مرض پیدا ہوتا جا رہا ہے اس کا بھی علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ احتیاطیں ملحوظ نہ رکھی جائیں تو پھر اس کے نتیجے میں ایک ایسی سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے جس میں اخلاقی قدریں عدمِ تحفظ کی وجہ سے دم توڑ جاتی ہیں اور ایسے معاشرے پر بالآخر اشتراکیت کا عذاب مسلط ہو کر رہتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾

(اور (عباد الرحمٰن وہ لوگ ہیں) جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ وہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے بغیر کسی حق کے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کوئی ان باتوں کا مرتکب ہوگا وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوگا۔ ۶۸)

عباد الرحمٰن کا کبائر سے اجتناب

عباد الرحمٰن کی صفات کا ذکر ہو رہا ہے، اسی ضمن میں ان کی انتہائی پاکیزہ زندگی کے تین مزید روشن ابواب کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جسے اگر لپیٹ کر کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پاکیزہ لوگ کسی کبیرہ گناہ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ اور کبیرہ گناہوں میں سے ان گناہوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن میں اہلِ عرب کثرت سے مبتلا تھے۔ علاوہ ازیں یہ تینوں گناہ بعض حوالوں سے زندگی میں ایسا بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جس سے دوسرے کبائر و صغائر کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے متعدد احادیث میں ان کبائر کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا

Marfat.com

وَهُوَ خَلَقَكَ ''یہ کہ تو کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔'' پوچھا گیا، اس کے بعد۔ فرمایا: اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ ''یہ کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔'' پوچھا گیا، پھر۔ آپ نے فرمایا: اَنْ تَزْنِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ ''یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔''

قرآن وسنت میں جا بجا ان گناہوں کی مذمت کی گئی اور ان کی شناعت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ توحید اسلام کے تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ اسلامی زندگی کا اصل الاصول اور اس کا مبدا و معاد ہے۔ اسی سے پہلا قدم اٹھتا ہے اور یہی ایک مومن کی منزل اور معراج ہے۔ اور اس توحید کا متضاد شرک ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے توحید کی وسعتوں کو بھی بیان فرمایا اور شرک کی تمام اقسام واصناف اور اس کے تمام الوان و آثار کی طرف بھی اشارے فرمائے۔ اسلام کی نگاہ میں ایک مومن کی انفرادی طور پر اور ایک امت کی اجتماعی طور پر شخصیت کی تکمیل صرف عقیدۂ توحید سے ہوتی ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں طہارتِ قلب سے لے کر طہارتِ اخلاق و اعمال تک جن مؤثرات کی ضرورت ہے وہ تمام عقیدۂ توحید سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے وہ اللہ کی ذات کے مقابلے میں کسی اور ذات کو اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابلے میں کسی اور کی صفات کو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے مقابلے میں کسی اور کے حقوق کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی ذات بھی یکتا ہے، اس کی صفات بھی بے مثال ہیں اور اس کے حقوق بھی کسی اور کی ہمسری سے پاک ہیں۔ ایک مومن جس طرح اپنا سر غیر اللہ کے سامنے جھکنے نہیں دیتا، اپنے دل میں کسی اور محبت کو بھی غالب نہیں ہونے دیتا، کسی اور کی غیر مشروط اطاعت کا تصور بھی قبول نہیں کرتا، کسی اور کا خوف اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتا۔ کسی اور سے لو لگانے کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نا قابلِ قبول سمجھتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے اجتماعی معاملات میں کسی اور کو رہنمائی کی غیر مشروط طور پر اجازت نہیں دیتا۔ کسی شخص یا کسی ادارے کو ایسی حکمرانی کا حق نہیں دیتا جو اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کو چیلنج کرتی ہو۔ کسی کو ایسی قانون سازی کی سند نہیں دیتا جو اللہ تعالیٰ کے قانون سے متصادم ہو۔ یہ وہ توحید کا ایک سادہ سا تصور ہے جو اپنی جامعیت اور مانعیت میں اتنا مکمل ہے جس میں کسی طرح کی پیوند کاری ممکن نہیں۔ اور یہی ایک مومن اور امتِ مسلمہ کی قوت کی علامت اور اس کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے اِلٰہ کو پکارنے یعنی ماننے اور تسلیم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ہمارے آج کے مذہبی طبقات کی بحثیں عموماً یہاں تک محدود رہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا، کسی کیلئے قیام اور رکوع و سجود کی اجازت نہیں، کسی سے غیر عادی طریقے پر استمداد نہیں ہو سکتی، کوئی نفع و ضرر کا مالک نہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کو اولاد دینے پر قادر نہیں، وہی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے، عزت و ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح اور نہایت بیش قیمت ہیں۔ لیکن آج عالمِ اسلام میں توحید کو جو سب سے بڑا حادثہ درپیش ہے وہ یہ باتیں نہیں بلکہ وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی بیشتر آبادی نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کو رد کر دیا ہے۔ غیر مشروط قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو دینے کی بجائے انہوں نے بادشاہوں، آمروں اور پارلیمنٹ کو دے رکھا ہے۔ وضعی قوانین کے مقابلے میں اسلامی شریعت اپنا وزن کھو چکی ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام ایک پرائیویٹ معاملہ ہو کر رہ گیا ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر اسلام کے سوا نہ جانے کس کس کی حکومت ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت سے بیگانہ ہو چکے ہیں جبکہ اس آیتِ کریمہ میں عباد الرحمٰن جو درحقیقت مسلمانوں ہی کا نام ہے کو عباد الشیطان سے الگ کرنے کیلئے ان کی جس پہلی صفت کا ذکر فرمایا گیا ہے اسے قبول اور اختیار کرنے سے جو زندگی وجود میں آتی ہے اس میں ان کمزوریوں کو راہ پانے کا موقع نہیں ملتا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

عبادالرحمٰن کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ناحق کبھی کسی نفس کو قتل کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔ قتلِ نفس، یعنی کسی بھی مرد وعورت کا قتل چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اور اسلامی حکومت اسے پناہ دے چکی ہو اسلام کی نگاہ میں بہت بڑا جرم ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں ایسے واقعات پیش آئے کہ کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم ذمی کو قتل کر دیا تو خلیفۂ وقت نے اس جرم کی پاداش میں مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے آنحضرت ﷺ نے ایک مسلمان کی جان، مال اور آبرو کو ایسا ہی محترم ٹھہرایا ہے جس طرح کی حرمت اللہ تعالیٰ کے گھر یوم عرفہ اور حرم کو دی گئی ہے۔ قتل تو بہت دور کی بات ہے آنحضرت ﷺ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا ''جس شخص نے مارنے کیلئے ہم پر ہتھیار اٹھایا، وہ ہم میں سے نہیں۔'' یعنی اس کا اس امت سے کوئی تعلق نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ حکومتِ وقت ہو، یا ملک کی فوج۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے سامنے سب کی حیثیت یکساں ہے۔

البتہ اس شخص کا خون مباح ہو جاتا ہے جو کوئی ایسی حرکت کرے جس کی وجہ سے اس کے خون کی حرمت اٹھالی جائے۔ ایسے اقدامات جس سے کسی شخص کا خون اور جان اسلامی یا مسلمان حکومت کیلئے مباح ہو جاتی ہے وہ تین ہیں۔

ا۔ قتلِ نفس، یعنی اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا اور عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو گیا تو ایسے شخص کو مقتول کے قصاص میں عدالت قتل کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ مقتول کے وارث معاف کر دیں یا دیت پر صلح کر لیں تو دوسری بات ہے ورنہ حکومت اور ریاست کا سربراہ بھی اس کی موت کی سزا کو معاف نہیں کر سکتا اور نہ اس میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہے۔

۲۔ ارتداد، یعنی کوئی شخص اسلام سے نکل جانے کا اعلان کر دے، کوئی دوسرا مذہب قبول کر لے یا لامذہب ہونے کا فیصلہ کر لے، ایسی صورت میں اسلامی حکومت اسے گرفتار کرے گی، اس کے اشتباہات اور اعتراضات کو ہر ممکن طریقے سے دور کرنے کی کوشش کرے گی۔ تمام کوششوں کے باوجود اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کے دین کیخلاف سرکشی اور بغاوت سے باز نہ آئے تو پھر اسے موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔

۳۔ زنا، کوئی شادی شدہ شخص زنا کا ارتکاب کرے اور ملوث حالت میں پکڑا جائے۔ چار صالح شخص اسے ملوث حالت میں دیکھنے کی گواہی دے دیں تو عدالت اسے سنگسار کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ ان تین مواقع کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی معصوم اور بے گناہ شخص کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اس آیتِ کریمہ میں عبادالرحمٰن کی تیسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ زنا کس درجے کا جرم ہے اور اسلام نے اسے روکنے کیلئے کیسے احکام دیئے ہیں، ہم سورۃ النور میں اس کی تفصیل ذکر کر چکے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ تینوں جرائم۔ شرک، قتل اور زنا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے بڑے جرائم میں سے ہیں۔ اور تمام آسمانی مذاہب نے اپنے اپنے وقت میں ان پر تنقید کی ہے۔ اور ہر پیغمبر نے اپنی امت کو ان کے نقصانات سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ عبادالرحمٰن اسلامی تعلیم و تربیت کے باعث اس طرح کے کبائر کا کبھی ارتکاب نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے یقیناً ان کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

اَثَامٌ ...... اہلِ لغت کے نزدیک نتیجۂ گناہ کو کہتے ہیں۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

(قیامت کے دن اس کیلئے عذاب بڑھایا جاتا رہے گا اور وہ ہمیشہ رہے گا اس میں ذلیل و خوار ہو کر۔ ۶۹)

Marfat.com

کبائر کی ہولناک سزا

اوپر کی آیت میں جن بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے اثرات کے اعتبار سے اس قدر دوررس اور نتائج کے اعتبار سے ایسے شدید واقع ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کے اثرات و نتائج کے اعتبار سے ایسے شدید عذاب کا سزاوار ٹھہرایا ہے کہ جس سے زیادہ شدید عذاب کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

بڑی سے بڑی سزا بھی غیر محدود نہیں ہوتی کیونکہ دنیا میں کوئی عمل بھی غیر محدود نہیں۔ کسی شخص کو عمر قید بھی دے دی جائے تو وہ بھی عمر ختم ہونے سے ختم ہوجائے گی اور یا عام روایت کے اعتبار سے چودہ سال میں اس کا اختتام ہوجائے گا۔ اور شدت کے اعتبار سے بھی کوئی سزا قانونی طور پر ایسی نہیں ہوتی جو جان لیوا ثابت ہو۔ اور اگر کسی ظالم نے جان لیوا قسم کی سزا بھی دے ڈالی تو جب بھی اس کا اختتام انتہائے عمر پر ہوجائے گا۔ لیکن ان جرائم کی سزا ایسی حیرت انگیز ہے کہ جیسے جیسے سزا کی مدت گزرتی جائے گی ویسے ویسے اس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جہنم کی ابدی سزا میں اس بات کا تو امکان ہی نہیں کہ کبھی اس کا خاتمہ بھی ہوجائے۔ البتہ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ مسلسل سزا برداشت کرنے کی وجہ سے کسی حد تک احساس میں کمی ہوجائے۔ کیونکہ جو لوگ جیل میں چکی پیسنے پر لگائے جاتے ہیں شروع شروع میں ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں جو بعض دفعہ زخموں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں جن سے خون بہتا ہے۔ لیکن آخر ایک وقت آتا ہے کہ یہ چھالے اور زخم گٹوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور پھر چکی کا پیسنا اس قدر تکلیف دہ نہیں رہتا جیسا پہلے دنوں میں ہوتا ہے۔ غالب نے انسانی فطرت کے اسی حوالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

لیکن قیامت کا عذاب عجیب عذاب ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صرف اس کی مدت ہی نہیں بڑھے گی بلکہ شدت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ آگ کھال کو جھلس دے گی تو نئی کھال پہنا دی جائے گی۔ جلنے والا موت کی تمنا کرے گا لیکن موت کبھی نہیں آئے گی۔ عذاب کی اسی شدت اور اسی بڑھتی ہوئی مدت میں انسان ہمیشہ رہے گا جس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا۔

بعض سزائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو عزت و سرفرازی کا باعث بن جاتی ہیں۔ ملک کی آزادی کیلئے جہاں جہاں بھی لوگوں نے جیلیں کاٹیں اور سزائیں برداشت کیں آزادی کے بعد انہیں کو حکومت کے مناصب بھی ملے۔ اور جن لوگوں نے کسی عظیم مقصد کیلئے تکلیفیں اٹھائیں، تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کیلئے زندہ ہوگیا اور وہ ہمیشہ آخرت میں بہتر زندگی کیلئے پرامید رہے۔ مولانا ظفر علی خان نے لمبی قید کاٹی، لیکن نہایت فخر اور عجز کے ساتھ کہا:

محمدؐ پر شفاعت کا مری اس عرض کا حق ہے
کہ آقا تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی

لیکن آخرت کا عذاب صرف عذاب ہی نہیں ہوگا بلکہ اس عذاب میں ذلت کی مار بھی ہوگی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ویسے ویسے عذاب جھیلنے والا اپنی اور دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتا جائے گا۔

Marfat.com

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنۡ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوۡبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

(مگروہ جو توبہ کرلیں گے ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے، تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ ۷۰) اور جو شخص توبہ کرتا اور عمل صالح اختیار کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ ۷۱)

توبہ، مژدۂ جانفزا

اوپر کی آیات میں جن تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی ہولناک سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے اسے پڑھ کر آدمی ہل کر رہ جاتا ہے۔ اور دل سے بار بار یہ آواز اٹھتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھے تو کیا اس کے دوبارہ سنبھل جانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پیش نظر آیت کریمہ میں ہمیں ایسی ہی خوشخبری سنائی گئی ہے اور توبہ کی صورت میں ایک ایسی نوید جانفزا دی گئی ہے جس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے لیکن اس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیگر مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اسلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے وہ اگرچہ دنیوی اور اخروی کامیابی کے دعوے دار تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پوجا پاٹ کی چند ظاہری رسوم اور شریعت کے ایک بے جان ڈھانچے کے سوا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دیئے ہوئے اعتقادات سے نہ تو انابت الی اللہ کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور نہ کسی شخص کو اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ ہوتی تھی اور اگر کبھی کسی شخص کو خیال پیدا ہوتا کہ میں ڈھیروں گناہ کر چکا ہوں اگر اللہ کے سامنے حاضری ہوئی تو کیا جواب دوں گا، مجھے اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی چاہئے تو یہ مذاہب گناہوں سے نکل کر نیکی اور اطاعت کی زندگی اختیار کرنے کیلئے نہ صرف کہ اس کی کوئی مدد نہیں کرتے تھے بلکہ اسے مایوس کرتے تھے کہ ایک دفعہ گناہوں کی زندگی اختیار کر لینے سے آدمی اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ اسے بہرصورت اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ یہ ایک ایسا تصور تھا جس نے انسان کی کمر پر بے انتہا بوجھ لاد دیا تھا اور اسے اپنی اصلاح اور اپنے مستقبل کی تعمیر سے مایوس کر دیا تھا۔ ہندوؤں میں تناسخ اور آواگون کے تصورات اسی مایوسی کا نتیجہ تھے اور عیسائیوں نے اس کیلئے کفارہ کے نام سے ایک راستہ نکالا، جو نامعقولیت کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے نجات کا سررشتہ مذہبی پروہتوں کے ہاتھ میں دے کر اصلاح اور توبہ کے عمل کو اور مشکل بنا دیا اور انسان کی مایوسی کو اور گہرا کر دیا۔

اسلام اہل دنیا کیلئے ایک نوید جاں فزا بن کر آیا۔ اس نے انسانوں کو امید کی ایک روشنی دی، انہیں بتلایا کہ انسان کی معنوی اخلاقی اور روحانی زندگی اسی قانون کے مطابق چل رہی ہے جو قانون ہم اپنے گردوپیش میں کارفرما دیکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تکوینی اور تشریعی قوانین کا پیراہن جدا جدا ہے، لیکن ان کے اصل مزاج اور روح میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جس طرح ایک درخت بیمار ہوتا ہے اور علاج سے درست ہو جاتا ہے، چارپائے بیمار ہوتے ہیں اور علاج سے شفا پا جاتے ہیں، انسانی جسم بیماریوں کا شکار ہوتا ہے اور بروقت علاج سے صحت پا جاتا ہے، بالکل اسی طرح انسانی روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔ اس کی بیماری کبھی عقیدے کی خرابی ہے، کبھی اخلاق کا بگاڑ ہے، کبھی معاملات کی بے اعتدالی ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ باقی مخلوقات کی طرح اس کی بیماریوں کا علاج نہ ہو سکے اور وہ بروقت علاج سے شفایاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ جس طرح باقی اجسام کا علاج معالج کے پاس جانا اور اس کے بتائی ہوئی ادویہ کو استعمال کرنا ہے اسی طرح روحانی بیماریوں کا علاج بھی اللہ کی طرف پلٹنا اور اس کے پیغمبر کی ہدایات کے مطابق زندگی کے اعمال کو درست کرنا ہے۔ اللہ کی طرف پلٹنے کو توبہ کہتے ہیں کیونکہ توبہ کا معنی ہی ”پلٹنا

Marfat.com

اور رجوع کرنا'' ہے۔ایک بندہ جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا آستانہ چھوڑ دیتا ہے اور شیطان یا اپنے نفس کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے آقا کا راستہ اور آستانہ چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کر گیا ہوں اب وہ اپنے غلط رویہ اور معصیت سے اللہ کی اطاعت کی طرف پلٹتا ہے اور دوبارہ پھر اس آستانے پر جھک جاتا ہے جسے وہ چھوڑ گیا تھا۔پھر وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہے ان میں سے ہر وہ عمل جس سے اللہ کی نافرمانی جھلکتی ہے اسے وہ چھوڑ دیتا ہے اور بھلائیوں اور نیکی کے کاموں میں سبقت اپنا شعار بنا لیتا ہے۔وہ کوشش کرتا ہے کہ مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اس کی معافی مانگ کر میں اپنے اللہ کو راضی کر لوں۔یہی درحقیقت توبہ ہے۔

انسان جب بگاڑ کا شکار ہوتا ہے تو وہ صرف گناہ گار ہی نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کی سطح سے بھی گر جاتا ہے کیونکہ انسانیت اور اللہ کی معصیت دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اس کو اپنے خاص انداز میں خوبصورت تعبیر دی ہے۔امام صاحب فرماتے ہیں کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں۔پہلا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیائے کرام کی۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے اور پھر ان پر اصرار جاری رہے کبھی ان پر ندامت نہ ہو اور نہ کبھی ان کے ترک کا خیال آئے یہ درجہ شیاطین کا ہے۔تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔یہی وہ چیز ہے جس کا قرآنِ کریم نے بار بار حکم دیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بے شمار فضائل بیان فرمائے ہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اس توبہ میں حقیقت کا رنگ ہو محض الفاظ کا کھیل نہ ہو۔آدمی زبان ہی سے توبہ نہ کرے بلکہ اس کا پورا سراپا توبہ کی تصویر بن جائے۔اسی کو ''توبۃ النصوح'' کہا گیا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ ایسی توبہ کے تین ارکان ہیں۔

توبہ کے تین ارکان:

۱:۔ اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انما التوبۃ الندم ''توبہ نام ہی ندامت کا ہے''۔آدمی اپنے گناہ پر اس حد تک نادم ہو کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برسے اور دل اس تصور سے پگھلتا جائے کہ مجھ سے یہ جرم کیوں سرزد ہوا۔

۲:۔ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ اس سے باز رہنے کا پختہ عزم کرے۔

۳:۔ تلافیِ مافات کی فکر کرے یعنی جو گناہ ہو چکا ہے، اس کا جتنا تدارک ممکن ہو کرے۔یعنی نمازیں چھوٹ گئی ہیں تو تمام چھوٹی ہوئی نمازوں کا حساب کر کے ان کی قضا کرے، روزے چھوٹ گئے ہیں تو ان کی قضا کرے، جتنے سالوں کی زکوٰۃ نہیں دی، حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا کرے، جتنے لوگوں کے حقوق اس کے ذمہ ہیں سب کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرے، جو لوگ مر چکے ہوں ان کی اولاد کو دے اور اگر کوئی بھی باقی نہ ہو تو پھر خیرات کر دے اور اللہ سے معافی مانگے۔جن کی دل آزاریاں کی ہیں عزتوں کو صدمہ پہنچایا ہے سب سے معافی مانگے اور اگر مالی حقوق ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہی ہو تو پھر اہلِ حقوق سے معاف کرانے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو زندگی بھر اللہ سے معافی مانگے۔اللہ فرماتا ہے کہ اگر واقعی تم ایسی توبہ کر و تو اللہ اسے قبول کرنے والا ہے بلکہ اس نے انسانوں کو سہارا دیتے ہوئے فرمایا: لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو اللہ سب گناہ بخش دے گا اس لئے کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔آنحضرت کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کے گناہوں سے زمین اور آسمان کی فضا بھر جائے اور وہ سچے دل سے توبہ کرے اللہ اسے بھی معاف کر دے گا کیونکہ:

این درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جہالت کا مفہوم:

جوشخص اللہ کے دروازے پر اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور اس کی رحمت کا طلبگار رہتا ہے۔اس کی رحمت کے متوجہ ہونے میں اگرچہ کوئی دیر نہیں لگتی لیکن اس میں پروردگار نے محض اپنے فضل وکرم سے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۷اور ۱۸میں بعض احتیاطوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے ملحوظ رکھنے سے اس کی رحمت کا آنا یقینی ہوجاتا ہے۔ان آیات کا ترجمہ یہ ہے "اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری توانہی لوگوں کیلئے ہے جو براکام جہالت سے کرتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے o اوران لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو کئے جاتے ہیں برے کام یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پرآن کھڑی ہوئی توبولا کہ اب میں نے توبہ کرلی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو حالتِ کفر میں مرتے ہیں ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے o" پہلی آیتِ کریمہ میں جہالت کا لفظ غلط فہمی کا باعث ہوسکتا ہے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ توبہ کی وضاحت کیلئے جہالت کا مفہوم واضح کردیا جائے۔

عام طور پر جہالت کا معنی "بے علمی، بے خبری، نہ جاننا اور نادانی" سے کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جوشخص جان بوجھ کر قصداً اور عمداً گناہ کرے اس کا گناہ توبہ کرنے سے بھی معاف نہیں ہوگا۔

اکثر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو گناہ تو قصد اور ارادے سے کرتا ہے لیکن اسے گناہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ اس گناہ کا نتیجہ کیا ہوگا، آخرت میں اس پر کتنی بڑی سزا ملے گی؟ اس انجام بداور اخروی عذاب سے غفلت اس کے گناہ کا سبب بن جاتی ہے۔تو اس آیت میں جہالت سے مراد یہی اخروی عذاب سے غفلت ہے۔اسی سے ملتا جلتا معنی حماقت اور بے وقوفی بھی ہے۔سورۂ یوسف میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا:ھل علمتم مافعلتم بیوسف واخیہ اذانتم جاھلون "کیا تمہیں معلوم ہے جو تم نے یوسف اور اس کے بھائی سے کیا جبکہ تم جاہل تھے"۔یہاں بھائیوں کو جاہل کہا گیا ہے حالانکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ جان بوجھ کر اور عمداً کیا تھا۔مگر انہیں اس کا اندازہ نہ تھا کہ اس فعل کا انجام کیا ہوگا؟ اور یہی بیوقوفی ہے اور اسی لئے ان کو جاہل کہا گیا۔شائد اسی وجہ سے صحابہ کرام اس بات پر متفق تھے کہ بندہ جو گناہ کرتا ہے چاہے وہ بالقصد ہو یا بلاقصد وہ بہر حال جہالت ہے۔

ابوحیان نے تفسیر بحرِمحیط میں مثال سے سمجھایا کہ اس کو ایسا ہی سمجھو جیسے حدیث میں آتا ہے **لایزنی الزانی وھومومن** "زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا"۔یعنی وہ مومن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا کیونکہ جب وہ اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے،تو ایمان کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے یہی چیز جہالت ہے جو گناہ کا باعث بنتی ہے۔لیکن بعض اہلِ علم اسی بات کو ایک اور انداز میں سلجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں جہالت کا لفظ جس طرح نہ جاننے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کرگزرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ عام طور پر علم کی بجائے حلم کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔معلقات کا مشہور شعر ہے

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا
فَنَجْھَلُ فَوْقَ جَھْلِ الْجَاھِلِیْنَا

(خبردار کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہوجائیں۔)

Marfat.com

اس شعر میں دیکھ لیجئے جہالت کا لفظ حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ شاعر اپنے مخالفوں سے کہہ رہا ہے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھو اور اگر تم نے مشتعل ہو کر کوئی کام کیا تو پھر ہمارے اشتعال کو کوئی نہ روک سکے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر (جبکہ ارادہ کام نہیں کرتا) کوئی گناہ کر گزرے اور پھر فوراً اس پر ندامت کا اظہار کرے اور اللہ کی طرف پلٹے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ میرا ناقص خیال یہ ہے کہ جہالت کو حلم کا ضد قرار دے لیں یا اسے حماقت کہہ لیں یا اخروی عذاب سے غفلت کی تعبیر اختیار کریں۔ مآل کار سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ آدمی گناہ ضرور اپنے ارادہ سے ہی کرتا ہے لیکن اس وقت اس کا ارادہ دوسرے احساسات سے مغلوب ہوتا ہے اور یہی وہ گناہ گار ہے جسے توبہ کی توفیق نصیب ہو سکتی ہے اور جو شخص گناہ کو گناہ کے جذبے سے کرتا ہے ایسے شخص کے بارے میں بہت کم امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کبھی گناہ سے پلٹنے کی کوشش کرے گا۔

اس آیتِ کریمہ میں دوسری شرط لگائی گئی ہے "من قریب" یعنی توبہ اس کی قبول ہوگی جو فوراً پہلی فرصت یعنی قریب زمانہ میں توبہ کرے۔ جن لوگوں نے اس لفظ کو عام معنی میں لیا ہے، وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ جس نے توبہ کرنے میں تاخیر سے کام لیا اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی لیکن جب ہم احادیث کو دیکھتے ہیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کی قبولیت کیلئے آنحضرت کے بعض ارشادات بالکل واضح ہیں۔ معلوم ہوتا ہے من قریب کی یہی صحیح تعبیر ہے۔ آپ نے فرمایا: ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر "اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس پر موت اور نزع روح کا غرغرہ طاری نہ ہو جائے"۔ ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا "جو بندۂ مومن موت سے ایک مہینہ پہلے اپنے گناہ سے توبہ کرے یا ایک دن یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ سچی توبہ کی جائے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان پر نزع کی کیفیت طاری نہیں ہوتی اور انسان موت کو سامنے نہیں دیکھ لیتا اس وقت تک اس کیلئے توبہ کا موقعہ ہے اور اللہ کی صفتِ کریمی سے امید واثق ہے کہ جب بھی بندہ توبہ کرے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔

مولانا تھانوی نے تفسیر بیان القرآن میں ایک اور طرح سے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں ایک تو یأس و ناامیدی کی جب کہ انسان ہر دوا و تدبیر سے عاجز ہو کر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالتِ بأس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری حالت اس کے بعد کی ہے جبکہ نزع روح شروع ہو جائے اور غرغرہ کا وقت آجائے، اس حالت کو 'یاس' کہا جاتا ہے۔ پہلی حالت یعنی حالتِ بأس تک تو من قریب کے مفہوم میں داخل ہے اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے مگر دوسری حالت یعنی حالت یاس کی توبہ مقبول نہیں جبکہ فرشتے اور عالمِ آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے آجائیں کیونکہ وہ من قریب کے مفہوم میں داخل نہیں۔

دوسری آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا رویہ ذکر کیا گیا ہے جو زندگی کے بارے میں عملی طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ زندگی بہت دراز ہے، ابھی سے آخرت کی باتیں کرنا زندگی کو بے رنگ اور بے نمک بنانے والی بات ہے۔ جس زندگی میں خوشیاں نہ ہوں اور عیش و عشرت کی امنگ نہ ہو وہ زندگی تو بوجھ بن جاتی ہے۔ اس طرح کی زندگی جس میں آنے والی ناکامی کا خوف، جوابدہی کے اندیشے، موت کے لہراتے ہوئے سائے، بداعمالیوں کے پچھتاوے، طبیعتِ ثانیہ بن جائیں، اس میں زندگی گزارنے کا کیا لطف رہ جاتا ہے۔ نیکی کی باتیں اچھی باتیں ہیں، آخرت کی فکر بھی بجا ہے، لیکن جب بڑھاپا آئے گا تو یہ باتیں بھی ہو جائیں گی۔ آخرت کی تیاری بھی کر لیں گے، گزری ہوئی زندگی کی بداعمالیوں کا جائزہ لے کر توبہ کا بھی سوچ لیں گے، لیکن ابھی اتنی جلدی کیا پڑی ہے۔ یہ زندگی کا وہ رویہ ہے جس میں عام اہلِ دنیا گرفتار ہیں۔ مومن، مومن ہوتے ہوئے بھی اپنی بے فکر زندگی پر مطمئن ہے اور کافر اپنے کفر پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں۔ جوانی کی دیوانگی کسی کو فرزانگی کی خبر نہیں لینے دیتی۔ دنیا ایک نشہ ہے، جس میں ہر آدمی مخمور نظر آتا ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ توبہ کیلئے وہ رویہ درکار ہے جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اسی رویہ کی وجہ سے توبہ کی دولت نصیب ہوسکتی ہے، ورنہ یہ رویہ جس کا ذکر اس آیت میں کیا جارہا ہے یہ تو سراسر بدقسمتی اور محرومی کا غماز ہے، جس میں آدمی برائیوں پر برائیاں کیے چلا جارہا ہے۔ لیکن اسے بالکل ہوش نہیں کہ میں کس طرح اپنی زندگی ضائع کررہا ہوں، مہلتِ عمل میرے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے۔ لیکن اچانک جب موت اس کے سر پر آکھڑی ہوتی ہے، تو پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ اب میں اس دنیا کی طرف جانے لگا ہوں جس میں مجھے اپنی گزشتہ زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ تو تب اسے خیال آتا ہے کہ اب میں اپنے اللہ سے معافی مانگوں اللہ فرماتا ہے کہ جب سکرات الموت طاری ہوجائیں اور آنے والی دنیا کی علامات ظاہر ہونے لگیں تو اس وقت کی توبہ اللہ قبول نہیں فرماتا۔ جس طرح جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے فوراً اللہ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اسے جواب دیا گیا: اٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ''اب تجھے یاد آیا، اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد پھیلانے والوں میں سے تھا''۔ اس کے بعد اس کو ڈبو دیا گیا۔

اسی طرح وہ آدمی جو کفر کی حالت میں ساری زندگی گزار دیتا ہے اور جب موت کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں اور فرشتے تک نظر آنے لگتے ہیں تو پھر وہ ایمان لانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ اس حال میں اس کا ایمان بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایمان لانا ہی اس کی توبہ ہے۔ توبہ کا وقت دوسری زندگی کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے ہے یا اس کا مطلب شائد یہ ہے کہ جب ایک آدمی کفر کی حالت میں مرجاتا ہے، تو موت کے بعد عالمِ برزخ یا عالمِ آخرت میں اللہ سے دعائیں کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج میں تیرے فرمانبردار بندوں جیسی زندگی گزاروں گا۔ ظاہر ہے اب اسے دوبارہ دنیا میں آنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔ اسے بتایا جائے گا کہ توبہ کا وقت موت سے پہلے تھا جو تم نے ضائع کردیا۔

مختصر یہ کہ اللہ کا اپنے بندے پر کتنا بڑا انعام ہے کہ وہ زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے پہلے اگر کسی وقت بھی اللہ کی طرف پلٹ آئے، معصیت کی زندگی چھوڑ دے، گناہوں سے توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ نہایئت رحمت کا سلوک فرماتے ہیں۔ نہ صرف گناہ معاف کیئے جاتے ہیں بلکہ گزشتہ گناہوں کو سرے سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر توبہ اور استغفار میں اخلاص اور ندامت کا بھرپور اظہار کیا جائے اور بندگی کا پورا سرمایہ اس کے آستانے پر ڈھیر کردیا جائے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ گناہوں کو نیکیوں کی شکل دے دیتا ہے اور گناہ گار کو اتنا نوازتا ہے کہ نوازشات کی انتہا ہوجاتی ہے۔ اس کی ندامت کے آنسو موتیوں کی طرح عزیز ہوجاتے ہیں اور اس کا پگھلتا ہوا دل اللہ کی رحمت وعنائت کا مورد بن جاتا ہے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

حقیقت یہ ہے کہ نیکی ایک بڑی سعادت ہے۔ لیکن گناہوں پر ندامت سحرگاہی کی آہیں اور نالہ نیم شب کا نیاز وہ سرمایہ ہے جس سے بندگی کو رفعتِ پرواز مل جاتی ہے۔

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اللہ کے فضل وکرم سے انسان کی اصلاح کا بند دروازہ کھول کر ایک ایسا احسان فرمایا اور اس زور و شور سے اس کی تبلیغ فرمائی کہ انسانوں کی مردہ زندگی میں نئی امنگ دوڑنے لگی۔ رحمتِ خداوندی سے مایوس لوگوں نے محسوس کیا کہ ہمیں نئی زندگی کی نوید دی جا رہی ہے۔ چنانچہ جو لوگ محض رحمتِ خداوندی سے مایوس ہونے کی وجہ سے گناہوں پر دلیر ہو گئے تھے اور یہ سمجھ کر کہ آخرت کا دروازہ ہم پر بند ہو ہی گیا ہے تو دنیاوی عیش وعشرت کا دروازہ ہم خود اپنے اوپر بند کیوں کریں۔ وہ نئی توانائی اور نئی امید کے ساتھ اصلاح کے اس عمل کی طرف پلٹے انہیں اپنی تہائی اور پسماندگی کا احساس جاتا رہا۔ وہ احساسِ کہتری کے ہر اثر سے آزاد ہو کر اپنی زندگی بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے اور قرآنِ کریم نے اس مضمون کی دلنوازی اور اثر آفرینی میں جس طرح اضافہ کیا وہ بجائے خود اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ اس طرح سے انسان کی قسمت جو صدیوں سے سو رہی تھی اسے جاگنے کا موقعہ ملا اور اللہ سے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ نئے سرے سے قائم ہو گیا۔

توبہ کی اس نعمت نے عرب کے بگڑے ہوئے لوگوں کو کس طرح سنبھالا اس کا اندازہ بہت سے واقعات سے ہوتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو جسے ابنِ جریر اور طبرانی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مسجدِ نبوی سے عشاء کی نماز پڑھ کر پلٹا تو دیکھا کہ ایک عورت میرے دروازے پر کھڑی ہے، میں اس کو سلام کر کے اپنے حجرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے نوافل پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پوچھا کیا چاہتی ہے۔ وہ کہنے لگی میں آپ سے ایک سوال کرنے آئی ہوں۔ مجھ سے زنا کا ارتکاب ہوا، ناجائز حمل ہوا، بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے مار ڈالا۔ اب میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ معاف ہونے کی بھی کوئی صورت ہے۔ میں نے کہا، ہرگز نہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ آہیں بھرتی ہوئی واپس چلی گئی اور کہنے لگی افسوس یہ حُسن آگ کیلئے پیدا ہوا تھا۔ صبح نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ کر جب میں فارغ ہوا تو میں نے حضور کو رات کا قصہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا، ابو ہریرہ تم نے بڑا غلط جواب دیا۔ کیا تم نے قرآنِ کریم کی یہ آیت نہیں پڑھی۔ اور آپ نے وہی آیت تلاوت کی جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ حضورؐ کا یہ جواب سن کر میں نکلا اور اس عورت کو تلاش کرنا شروع کیا۔ رات کو عشاء ہی کے وقت وہ ملی۔ میں نے اسے بشارت دی اور بتایا کہ سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے تیرے سوال کا یہ جواب دیا ہے۔ وہ سنتے ہی سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی، شکر ہے اس اللہ کا جس نے میرے لئے معافی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے گناہ سے توبہ کی اور اپنی لونڈی کو اس کے بیٹے سمیت آزاد کر دیا۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾

(اور (عباد الرحمٰن وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، اور اگر کسی بے ہودہ بات پر ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ ۷۲)

عباد الرحمٰن کا لغویات سے احتراز

زُور ...... جھوٹ یا جھوٹی بات کو کہتے ہیں۔ باطل کیلئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کسی باطل اور کسی جھوٹی بات میں کبھی شریک نہیں ہوتے۔ اور کسی ایسی تقریب اور ایسی مجلس میں جانا پسند نہیں کرتے جہاں کوئی باطل بات ہو رہی ہو یعنی کوئی خلافِ شریعت کام سرانجام دیا جا رہا ہو۔ اور کسی جھوٹ میں کبھی شامل ہونے یا شریک ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہر وہ کام جو خلافِ واقعہ ہو یا اللہ تعالیٰ سے جس طرح کی زندگی کا ہم وعدہ کر چکے ہیں اس کیخلاف ہو۔ وہ ایسی کسی مصروفیت میں شامل

Marfat.com

نہیں ہوتے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالتے جو خلافِ واقعہ ہو یا ان کے علم کے خلاف ہو۔حق کی گواہی کو وہ کبھی باطل کی گواہی سے تبدیل نہیں کرتے اور حتی المقدور حق کی گواہی کیلئے کمربستہ رہتے ہیں اور اس طرح کے اخفاء سے کام نہیں لیتے جس سے جھوٹ کو فروغ یا سپورٹ ملنے کا امکان ہو۔

لغو ہر ایسی بات کو کہتے ہیں جو سنجیدہ اور شائستہ انسانوں کے کہنے یا کرنے کی نہ ہو۔اور ایسی بات کو بھی لغو کہا جاتا ہے جس میں نہ دنیا کا فائدہ ہو نہ دین کا۔جسے آنحضرت ﷺ نے لایعنی قرار دیا۔اور اگر کہیں انہیں ایسی مجلس کے قریب سے گزرنا پڑے جہاں اس طرح کی حرکتیں ہو رہی ہوں تو وہاں سے ایسے گزرتے ہیں جیسے ایک مہذب اور پاکیزہ مزاج آدمی گندگی کے ڈھیر کے قریب سے گزرتا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایسی ہی ایک تقریب کے پاس سے گزرے تو آپؓ نے اپنی چادر سے منہ اور سر لپیٹ لیا اور اس طرح خاموشی سے گزر گئے کہ کسی کو احساس تک نہ ہوا۔دور سے کسی نے آپ کو پہچانا۔صبح کی نماز کے بعد آنحضرت ﷺ سے ان کے اس طرزِ عمل کا ذکر کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کی تائید میں یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ﴿۷۳﴾

(اور (عبادالرحمٰن) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات کے ذریعے سے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ ۷۳)

لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا ...... قرطبی اور بحر محیط کی وضاحت کے مطابق لَمْ يَخِرُّوْا گر پڑنے کے مفہوم پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کا مفہوم روگردانی اور سرتابی ہے۔

عبادالرحمٰن کا نصیحت سے شغف

انسان میں بعض کمزوریاں ایسی ہیں کہ جب تک انسان نہایت ہوشمندی سے اپنا احتساب نہ کرے اسے ان کمزوریوں کا احساس نہیں ہو پاتا۔انہی میں سے ایک کمزوری یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ نیکی اور عبادت کی توفیق دیتا ہے بالعموم اس کے اندر نیکی کا پندار پیدا ہو جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اسے کسی بھلائی کی نصیحت کی جاتی یا کسی حقیقت کی یاددہانی کرائی جاتی ہے تو وہ عموماً اس پندار کی وجہ سے اس یاددہانی کی طرف توجہ نہیں دیتا اور سمجھتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔لیکن وہ لوگ جو اپنی تمام تر عبادت، ریاضت اور نیکی سے شغف کے باوجود نصیحت کی ہر بات کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے ہیں حقیقت میں یہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہوتا ہے۔چنانچہ ایسے ہی لوگوں کو یہاں عبادالرحمٰن کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں قرآن کے ذریعے تعلیم و تذکیر کی جاتی ہے تو وہ اعراض کی بجائے لپکتے ہوئے اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے ہیں جس طرح ایک پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ایک بھوکا کھانے کی ہر چیز کو اپنے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتا اور تھکاوٹ سے چور آدمی جہاں بھی جگہ ملے بے قرار ہو کر سو جاتا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ قرآنِ کریم کے مخالفین پر تعریض بھی کی گئی ہے کہ جب ان کے سامنے قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ پڑھنے والے کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے اندھے ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم کو اس طرح سنتے ہیں جیسے بہرے ہوتے ہیں لیکن عبادالرحمٰن کا شوق ایسے مواقع پر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔وہ قرآنِ کریم کی ہر بات سے گہرا اثر قبول کرتے، اس کی پیروی کرتے، اس کے فرائض کی پابندی کرتے اور اس کے نواہی سے اس طرح اجتناب کرتے ہیں جیسے مہلک چیزوں سے بچا جاتا ہے اور قرآنِ پاک کی تعلیم اور نصیحت ان کیلئے آبِ حیات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾

(اور جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ ۷۴)

عباد الرحمٰن کی جامعیت

عباد الرحمٰن کی صفاتِ حمیدہ کو پڑھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید یہ لوگ علائقِ دنیا سے لاتعلق، گھریلو زندگی سے بے نیاز اور حقوق و فرائض کی گراں باریوں سے گریزاں ہوں گے۔ لیکن پیشِ نظر آیت کریمہ میں یہ بتا کر ہماری اس غلط فہمی کو دور کر دیا گیا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے گراں بار اور بیوی بچوں کے حقوق سے بہرہ ور بھی ہیں۔ وہ نہ صرف ان رشتوں سے گریزاں نہیں بلکہ ان کے اندر ان رشتوں کی چاہت بھی پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ان رشتوں کی چاہتیں اور دلبستگیاں سیرت و افکار میں آلودگی پیدا کرنے کا باعث ہوں، لیکن ہم اس کے برعکس یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں سے محبت اور اپنی اولاد سے گہری وابستگی رکھنے کے باوجود ان کیلئے وہ کچھ نہیں چاہتے جو ہمیشہ شوہر اپنی بیوی اور باپ اپنی اولاد کیلئے چاہتا ہے۔ وہ بیوی کو اچھا مکان اور آرام و راحت ضرور بہم پہنچاتے ہیں اور اولاد کے خوب سے خوب تر مستقبل کیلئے کوشاں بھی رہتے ہیں، لیکن حقیقت میں جو ان کے دل کے ارمان ہیں وہ ان کی دعاؤں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ دعا ایک ایسی چیز ہے جو انسانی سیرت کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ دعا ہی سے انسان کے ارادوں کی بھنک پڑتی اور اس کی بلند نظری اور عالی ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ تنہائی میں جب اپنے رب سے عجز و نیاز کا رشتہ جوڑ کر دعا کیلئے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو نہ وہ دولت کی ریل پیل مانگتے ہیں اور نہ بچوں کیلئے امارت و سیادت کی درخواست کرتے ہیں بلکہ صرف یہ عرض کرتے ہیں یا اللہ ہماری بیویوں اور ہمارے بچوں سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک دنیوی سربلندی میں نہیں بلکہ اخروی فوز و فلاح میں ہے۔ ہمارے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے، جس میں بیوی کی امانت و دیانت، عفت مآبی، غیرت و حمیت اور تقویٰ و طہارت کی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔ اور اولاد ایک مومنِ قانت کی تصویر، تقویٰ و اخلاص کی پیکر، اپنے والدین کی فرمانبردار اور اللہ اور رسول کی کامل وفادار ہو۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو جنت میں لے جانے والی اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہیں۔ اور یہی وہ بشارتیں ہیں جن سے ایک مومن کو آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو سکتی ہے۔

عباد الرحمٰن کے ہدف کی بلندی

دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کیلئے دعا سے فارغ ہو کر پھر اپنے اللہ سے اپنے لئے دعا مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور وہ دعا صرف اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ طیبہ کیلئے نہیں ہوتی، کیونکہ یہ دولت وہ پہلے بھی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ الٰہی! ایمان لانے کے بعد مکہ کی سرزمین ہر مومن کیلئے تنگ ہوتی جا رہی ہے، اذیتیں بڑھتی جا رہی ہیں، حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں، ہر گھر میں ایک تصادم برپا ہے، مسلمان کمزور ہونے کے باعث ظلم کی چکی میں پسے جا رہے ہیں۔ اس لئے ہر ایمان لانے والا استقامت میں دشواری محسوس کر رہا ہے اور ہر ایمان کا ارادہ کرنے والا اپنے سامنے رکاوٹوں کے انبار دیکھ رہا ہے۔ انسانی ہمت جواب دیتی جا رہی ہے، زمین گرمی سے جھلس گئی ہے لیکن بارش کا ہر قطرہ اس لئے برسنے کی ہمت نہیں کر رہا کہ برسنے کا نتیجہ جھلس جانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ الٰہی ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم ایسے مومنوں اور تقویٰ شعار لوگوں کیلئے امامت اور پیشوائی کا فرض انجام دے سکیں، ہم مخالفتوں کو انگیخت کریں اور برداشت کریں، ہماری استقامت دوسروں کیلئے حوصلے کا سامان بن جائے۔

Marfat.com

آج کے حالات میں کہا جا رہا ہے کہ مہنگائی بڑھ جانے کے باعث تنخواہوں میں گزارہ نہیں ہو رہا اس لئے رشوت سے بچنا یا دیگر حرام ذرائع سے اجتناب کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ آج ہر مومن اور متقی کا فرض ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے اپنے عمل سے ایسے ہی مشکل حالات میں جینے کا راستہ پیدا کرے۔ جب دفتر میں لوگ یہ کہیں کہ ہم رشوت کیوں نہ لیں، تنخواہ سے کسی طور گزارہ نہیں ہو سکتا تو دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا کوئی کلرک رشوت سے اجتناب اور پرہیز کی تصویر بن کر اپنے رفیقوں کو یہ سبق دے سکے کہ میرا عمل دیکھو میں بھی تمہاری طرح بیوی بچوں کی ذمہ داریاں رکھتا ہوں، مجھے بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلانا ہے، میری ضرورتوں میں اور تمہاری ضرورتوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ اس کے باوجود میں رشوت کے قریب نہیں جاتا، تنخواہ میں سمٹ کے رہتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے میری تنخواہ میں ایسی برکت دے رکھی ہے کہ میں بڑی آسانی سے زندگی گزار رہا ہوں۔ فرق صرف استقامت اور بے صبری، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اللہ سے ناامیدی اور جذبۂ کفایت اور ہوس کی اسیری میں ہے۔ یہ دو مختلف رویوں کے نام ہیں۔ ان میں سے ایک رویہ متقین کیلئے رہنما پیدا کرتا ہے جس سے وہ اپنی زندگیوں میں روشنی پاتے ہیں۔ اور دوسرا رویہ کم ظرف، ہوس کے اسیر اور خواہشات کے پرستار پیدا کرتا ہے جو دھرتی کا بوجھ بن کر دھرتی کیلئے عذاب بن جاتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾

(یہ ہیں وہ لوگ جنہیں ان کے صبر کے باعث بالا خانے دیئے جائیں گے اور ان میں ان کا خیر مقدم تحیت و سلام کے ساتھ ہوگا۔ ۷۵) وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، بہت عمدہ ہے وہ ٹھکانہ اور قیام گاہ۔ ۷۶)

عباد الرحمٰن کا اخروی مقام و مرتبہ

گزشتہ آیات میں ہم جن بلند قامت انسانوں کی صفاتِ حمیدہ عباد الرحمٰن کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن جنت میں اس طرح خوش آمدید کہا جائے گا کہ کہیں انہیں دعائیں دی جا رہی ہوں گی، اور کہیں سلامتی کے ترانے گائے جا رہے ہوں گے۔ نہایت احترام اور اجلال کے ساتھ فرشتوں کے جلو میں انہیں جنت کے بالا خانوں میں لایا جائے گا۔ اب ہمیشہ کیلئے یہ بالا خانے ان کی قیام گاہیں ہوں گی۔ انہوں نے دنیا میں تواضع اور فروتنی کی زندگی گزاری۔ اس وجہ سے جنت کی عالی مقامی کے سزاوار ٹھہریں گے۔ ہماری زبان میں بالا خانہ دوسری منزل پر بنے ہوئے مکان کو کہتے ہیں، لیکن اس آیت میں جس طرح اس لفظ کا استعمال ہوا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنت کا کوئی نہایت بلند مقام ہے جسے زندگی بھر کے صبر کے صلے میں اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو عطا فرمائے گا۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مخالفین کے مظالم کا نہایت مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کیلئے بڑی سے بڑی مخالفت کو خاطر میں نہ لائے۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر ثابت قدم رہے۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات ان کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئیں۔ لطف و لذت کا کوئی مطالبہ انہیں ایمان کے راستے سے نہ ہٹا سکا۔ اور گناہ کی ساری لذتیں اور مال و دولت کی ساری منفعتیں ان کے راستے کا غبار بن گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں آنے والی ہر مصیبت پر صبر کیا، ہر اطاعت پر جمے رہے، اور ہر خواہش کا مقابلہ کیا۔ ان تینوں کیفیتوں کیلئے عربی زبان میں صبر ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو جن لوگوں نے ایسی غیر معمولی زندگی گزاری اور غیر معمولی جرأت و استقامت سے دنیا

Marfat.com

کی خواہشات کوشکست دی وہ یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بالاخانوں سے نوازے اور تہنیت وسلام سے ان کا استقبال کیا جائے۔ اور پھر یہ اعزاز ایسا پائیدار ہو جس پر کبھی زوال کا سایہ نہ پڑے۔ اور آخر میں فرمایا کہ تم کیا جانو جنت کا مستقر یعنی عارضی ٹھکانہ اور مقام یعنی مستقل قیام گاہ کتنی عظیم چیز ہے جس کا نہ کماحقہ ادراک کیا جاسکتا ہے اور نہ الفاظ میں اس کے اظہار کا حق ادا ہوسکتا ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے اگر تمہیں دعوت دینا نہ ہوتا، سو تم نے اس کی تکذیب کر دی تو وہ چیز عنقریب لازم ہو کر رہے گی۔ ۷۷)

مخالفین کو وارننگ

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مخالفین کو دھمکی دی ہے اور براہ راست ان سے کچھ کہنے کی بجائے آنحضرت ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا کہ آپ انہیں یہ وارننگ دے دیں، کیونکہ وہ آپ ہی کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دین کا انکار کرتے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا تمسخر اڑاتے ہیں اور آپ جس طرح خونِ جگر پی پی کر ان کی اصلاح کی خاطر تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دے رہے ہیں وہ اس سے اثر لینے کی بجائے اسے آپ کی دیوانگی قرار دے رہے ہیں۔ وہ جیسے جیسے مخالفت میں آگے بڑھتے جارہے ہیں آپ کی تبلیغی کاوشوں میں ویسے ویسے سرگرمی آتی جارہی ہے۔ وہ بدزبانی کرتے ہیں اور آپ ان کی ہدایت کیلئے دعائیں مانگتے ہیں۔ انہیں کہہ دیجئے کہ میں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہا ہوں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اسے قبول نہ کر کے شاید اللہ تعالیٰ کا یا میرا کچھ بگاڑ رہے ہو۔ حالانکہ میری تبلیغ و دعوت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل قرآنِ کریم کا نزول محض اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر رکھی ہے کہ میں اس وقت تک کسی قوم کو عذاب نہیں دے گا جب تک اس پر اتمامِ حجت نہ ہو جائے تاکہ قیامت کے دن کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے پاس کوئی انذار کرنے والا نہیں پہنچا۔ یہ ہے وہ ذمہ داری جس کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ رسول بھیجتا اور کتاب نازل کرتا ہے، ورنہ زمین پر بسنے والی ایک ادنیٰ مخلوق کی اللہ تعالیٰ کا کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔ اب جبکہ تم اس کو جھٹلا چکے ہو اور میری ہمدردیاں اور خیرخواہیاں تمہاری اس سرکشی کو روکنے سے عاجز رہ گئی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تکذیب و انکار کرنے والی قوموں پر اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد جس طرح عذاب آتا رہا ہے تم بھی اپنے رویئے سے اس کے قریب پہنچ چکے ہو۔ کیونکہ تکذیب کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ قدرت اس میں مہلت تو دیتی ہے لیکن وہ ایسی لازم ہو جانے والی چیز ہے جس سے کوئی امت اپنے آپ کو تبدیل کئے بغیر بچ نہیں سکتی۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

دروسِ قرآن

سُورَةُ الشُّعَرَآءِ

(۲۶)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الشُّعَرَآءِ ہے جو آیت ۲۲۴ سے ماخوذ ہے۔اس سورۃ میں گیارہ رکوع اور ۲۲۷ آیتیں ہیں۔یہ ۱۲۷۹ کلمات اور ۵۵۴۰ حروف پر مشتمل ہے۔

مقام نزول:۔ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔اس لئے اسے مکی کہا جاتا ہے۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سورۃ کی چار آخری آیتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔

زمانۂ نزول:۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق سورۃ طٰہٰ کے بعد سورۃ الواقعہ نازل ہوئی اور اس کے بعد الشعراء کا نزول ہوا۔اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ جب ایمان لائے ہیں تو اس سے پہلے سورۃ طٰہٰ نازل ہو چکی تھی۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سورۃ الشعراء کا زمانۂ نزول حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان لانے کے زمانے سے قریب کا زمانہ ہے۔اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اس سورۃ کا نزول مکی زندگی کے دورِ متوسط میں ہوا ہے۔

موضوع اور مباحث:۔ اس سورۃ کے زمانۂ نزول کے تعین سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں نبی کریم ﷺ نہایت تلخ حالات کا سامنا کر رہے تھے۔آپؐ کی تبلیغی کاوشیں صبر آزما موانع سے دوچار تھیں۔آپ مختلف قسم کے اعتراضات اور اتہامات کا ہدف بنے ہوئے تھے۔آپ کے مشن کو ناکام کرنے کیلئے قسم قسم کے سوالات اٹھائے جارہے تھے اور آئے دن نئی سے نئی نشانیوں کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔مخالفتوں کے اس ہجوم اور موانع کی شدت نے آپ کو حد درجہ رنجیدہ خاطر اور پریشان کررکھا تھا۔آپ ہر وقت اس غم میں گھلتے رہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان نہ لاکر کس قدر عظیم خطرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔چنانچہ سورۃ کے آغاز ہی میں ان کے مطالبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آپ پر جو کتاب اتاری گئی ہے وہ اپنی ذات میں اس قدر روشنی کا سامان رکھتی ہے کہ اس کے سمجھنے کے راستے میں کوئی تاریکی حائل نہیں ہوسکتی۔اس کی ہر بات اس قدر واضح ہے اور ہر دلیل اس قدر مستحکم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور نشانی نہیں ہوسکتی۔یہ لوگ اگر اس روشن کتاب کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے۔تو کسی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنے آپ کو پریشانیوں کے حوالے کردینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ان کیلئے گردوپیش میں نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور آپ نے خونِ جگر پی پی کر جس طرح انہیں سمجھایا ہے اس کے بعد نہ انہیں کسی نشانی کی ضرورت ہے اور نہ آپ کی ہمدردی وغمگساری کی۔وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی نشانی نازل کی جائے جو انہیں ماننے پر مجبور کردے جبکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے انسانوں کو ردوقبول کی فی الجملہ آزادی دے کر امتحان کا ایک راستہ نکالا ہے اور اسی پر جزاء وسزا کا ترتب ہوگا۔اگر زبردستی ایمان نافذ کرنا ہوتا تو پھر سلسلۂ وحی اور رسالت کی ضرورت ہی کیا تھی۔

Marfat.com

اس مختصر تمہید کے بعد سات انبیائے کرام اور ان کی امتوں کے احوال بیان کئے گئے ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی امتوں کی سرگزشتیں شامل ہیں۔ اور ہر امت پر عذاب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد آخر میں دو آیتیں بطور ترجیع لائی گئی ہیں جس سے شاید یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کیلئے کوئی نشانی کارگر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کا انجام بالآخر عذاب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ان واقعات کے ضمن میں قریش اور اہلِ مکہ کے سامنے چند باتیں واضح فرمائی گئی ہیں جن میں پہلی بات یہ ہے کہ ہر دور میں کفر کا رنگ اور آہنگ یکساں رہا ہے۔ ان کے حیلے بہانے اور اعتراضات ایک جیسے رہے ہیں اور آخر کار ان کا انجام بھی ایک سا رہا ہے۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیائے کرام کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ بھی ایک تھا۔ مخالفتوں کے مقابلے میں انہوں نے ایک ہی طرح سے استقامت دکھائی۔ ان کی دلیل و حجت کی قطعیت میں ایک ہی شان جھلکتی ہے۔ اور پھر ان سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معاملہ بھی یکساں رہا ہے۔ یہ دونوں نمونے آج بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ معاندین بڑی آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس تصویر سے ملتی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو ایک خاص حد تک مہلت دیتا ہے۔ جب مہلت کی مدت گزر جاتی ہے تو پھر اس کی گرفت حرکت میں آتی ہے لیکن گمراہ قومیں اسی گمراہی میں ماری جاتی ہیں کہ انہیں شاید پکڑنے والا کوئی نہیں۔ وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ زبردست و توانا ہے۔ وہ پکڑنے میں جلدی اس لئے نہیں کرتا کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے۔ قریش کو سوچنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق بنانا چاہتے ہیں یا قہر کا۔

خاتمۂ سورہ میں بحث کو سمیٹتے ہوئے بعض اشارات کئے گئے ہیں جنہیں ہم نہایت اجمال سے یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ قرآنِ کریم منبعِ وحیِ الٰہی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت روح الامین کے ذریعے سے آنحضرت ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم کا عربی زبان میں نازل کیا جانا اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے۔ اور پھر قریش کے اسلوب میں قرآنِ کریم کا نزول ایک بہت بڑی رحمت ہے جس سے فائدہ نہ اٹھانا بہت بڑی محرومی ہے۔

۳۔ قرآنِ کریم کی حقانیت اور قطعیت کے دلائل گزشتہ صحیفوں میں ذکر کئے گئے ہیں۔ اور علماء اہلِ کتاب ان سے واقف ہیں۔ اس کو جنوں اور شیطانوں کی وحی قرار دینا خرد باختگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ بات بھی کہ قرآنِ کریم کسی شاعر کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ پھر بعض ایسے اشارے کئے گئے ہیں جن سے قرآن اور شعر میں فرق کیا گیا ہے اور پیغمبر اور شاعر میں امتیاز کو واضح کیا گیا ہے۔

آخر میں مخالفین کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے انہیں خود اپنے آپ سے حقیقت معلوم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور یہ بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنے دلوں کی گواہی پر کان نہ دھرا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ظلم کے راستے پر چلنا چاہتے ہو اور ظالموں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔

Marfat.com

اٰیَاتُھَا ۲۲۷	سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ مَکِّیَّۃٌ (۲۶)	رُکُوْعَاتُھَا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿٢﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا
يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ
اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿٤﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ
مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا
مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿٧﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٩﴾ ع

رکوع: ۱۔ (ط۔س۔م ۱) یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ۲) (اے پیغمبر!) شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ۳) اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار دیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہی رہ جائیں۔ ۴) ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے تو یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ۵) بلاشبہ وہ تکذیب کر چکے تو آ جائیں گی ان کے پاس اطلاعات اس چیز کی جس کا وہ استہزاء کیا کرتے تھے۔ ۶) کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی کثرت سے ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں اگائی ہیں۔ ۷) اس میں بیشک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۸) اور بیشک آپ کا رب بہت زبردست بھی ہے اور مہربان بھی۔ ۹)

Marfat.com

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾

(ط. س. م ۱) یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ۲)

یہ کتاب خود اپنی حقانیت کی دلیل ہے

بعد میں آنے والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار آنحضرت ﷺ کے تبلیغی مشن کو ناکام کرنے کیلئے کبھی آپ کو شاعر یا کاہن قرار دیتے اور اس سے یہ تصور دینا چاہتے کہ جس طرح کاہنوں کی باتیں الجھی ہوئی اور ناقابلِ فہم ہوتی ہیں اسی طرح تمہاری باتیں بھی ہماری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ اور کبھی آپ سے نئی نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے رسول ہوتو ہمیں یہ یہ حیرت انگیز کارنامے دکھاؤ جس کی تفصیل متعدد مواقع پر گزر چکی ہے۔ چنانچہ ان دونوں باتوں کے رد کیلئے اس سورۃ کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ مبین کا معنی ہے خود روشن یا دوسری چیزوں کو روشن کرنے والی۔ یعنی اس کتاب کی بنیادی صفت یہ ہے کہ یہ اپنی ذات میں ایک روشن کتاب ہے جس کی کوئی بات الجھی ہوئی نہیں۔ اس کی زبان فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس نے اپنی دعوت کے ہر پہلو کو گوناگوں اسلوبوں سے مدلل و مبرہن کر دیا ہے۔ کون سی ایسی گرہ ہے جسے اس کتاب نے نہیں کھولا، کون سا ایسا عقدہ ہے جس کا حل قرآن نے پیش نہیں کیا۔ ایسی کتاب پیش کرنے والے کو شاعر قرار دینا یا کاہن کہنا حقیقت کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

اگر نشانی ہی کی طلب ہو تو اس کتاب سے بڑھ کر اور نشانی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کو پیش کرنے والا امی قوم کا فرد، امی ماحول میں پروان چڑھنے والا اور خود اپنی ذات میں امی ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، جس نے زندگی بھر کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کئے، جو کبھی کسی لائبریری میں نہیں گیا اور جائے بھی تو امی ہونے کی وجہ سے علمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے وہ کتاب پیش کی ہے جس کا ایک ایک لفظ اپنے اندر اعجازی شان رکھتا ہے۔ اس نے ان علمی اسرار و رموز کی گرہیں کھولی ہیں جن کے سامنے دنیا کی عقل و خرد سپر انداز ہو چکی تھی۔ اس نے وہ علمی محاکے کئے ہیں جو آج تک کوئی نہ کر سکا۔ اس نے تاریخی صداقتوں کو مبرہن کیا ہے اور تاریخی خیانتوں کو پکڑا ہے۔ اس نے ایک ایسا مربوط نظامِ زندگی دیا ہے جس میں کہیں تضاد نہیں پایا جاتا۔ اور جس کی کوئی بات علمی مسلمات سے متصادم نہیں۔ یہ وہ نشانی ہے جو ہدایت حاصل کرنے والے کیلئے اپنے اندر ہدایت کا بیش بہا سامان رکھتی ہے۔ ایسی نشانی کی موجودگی میں کسی اور نشانی کی کیا ضرورت ہے۔

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾

(اے پیغمبر!) شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ۳)

بَاخِعٌ ...... جو رگ ریڑھ کی ہڈی میں سے گزرتی ہوئی گردن میں پہنچتی ہے اسے بَخَاعٌ کہتے ہیں۔ جب ذبح کرتے وقت چھری یہاں تک پہنچ جائے تو ذبح مکمل ہو جاتی ہے، اسی سے بَاخِعٌ ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا ذبح کرنے والا جس نے چھری بخاع تک پہنچا دی۔

نبی کریم ﷺ کی جس حالت کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے سورۃ کہف میں بھی یہی بات تھوڑی سے وضاحت سے کہی گئی ہے۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ''شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہیں، اگر وہ لوگ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔''

Marfat.com

ان آیات سے تین حقائق کا استحضار

ان آیتوں کو دیکھتے ہوئے تین باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ پہلی یہ بات کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی دعوت کی حقانیت اور اس کے انکار کرنے والوں کے ہولناک انجام کا انتہائی حد تک یقین تھا۔ کیونکہ جو شخص کسی بات کی دعوت دیتا ہے اگر وہ اسے محض ایک علمی نظریہ سمجھتا ہے تو وہ اس کے قبول یا عدم قبول پر اس قدر حساس نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ اپنی کہی ہوئی باتوں کو ظنی گمان کرتا ہے تب بھی ان باتوں کو وہ اپنی جان پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری باتوں کو قبول کر لینے سے دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور رد کر دینے سے چند نقصانات کا اندیشہ ہے تب بھی وہ اسے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بناتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ جس طرح اپنی جان کو ہلکان کئے دے رہے تھے اور اس حد تک صدمے سے دوچار تھے کہ قرآنِ کریم کو بار بار تسلی کیلئے مداخلت کرنا پڑی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس بات کا حتمی یقین رکھتے تھے کہ میں جس بات کی دعوت دے رہا ہوں وہ دنیا کی سب سے بڑی صداقت ہے اور انسانی زندگی کیلئے اس کی حیثیت آبِ حیات سے بڑھ کر ہے۔ اسی سے دنیوی عزت و کرامت وابستہ ہے اور اسی سے اخروی کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوں گی۔ اور اس کا انکار کرنے والے ایک ہولناک انجام سے دوچار ہوں گے۔

دوسری بات جس کا احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے قلبِ مبارک میں اللہ تعالیٰ کے آستانے سے کٹے ہوئے لوگوں اور انسانیت سے گرے ہوئے انسانوں سے اس حد تک محبت ہے کہ آپ ان کی بھلائی کیلئے بار بار ان کا دامن کھینچتے ہیں، بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، بار بار انہیں یقین دلاتے ہیں کہ تم کھائی کی طرف بڑھ رہے ہو، لیکن وہ اس کے جواب میں گالیاں دیتے ہیں، اذیتیں پہنچاتے ہیں، الزامات لگاتے ہیں، حتیٰ کہ آپ کے قتل کے منصوبے باندھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ ان کی حرکتوں سے مکدر یا متنفر ہو کر انہیں دعوت دینا چھوڑ دیں اور انہیں تقدیر کے حوالے کر کے خاموشی سے گھر بیٹھ جائیں۔ آپ نہ صرف کہ اپنی تبلیغی مساعی میں کسی طرح کی کمی نہیں کرتے بلکہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے ان کیلئے ہدایت مانگتے ہیں۔ یہ وہ رویہ ہے جو دنیا کے کسی انسان میں دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ماں باپ جو ہمدردی اور غمگساری کا استعارہ ہیں وہ بھی بعض دفعہ اولاد سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول کبھی اپنے مخالفین سے لاتعلق اور بے نیاز نہیں ہوتے۔

تیسری بات جو محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دیکھتے ہیں کہ گھر میں فاقوں کی حکمرانی ہے۔ ایمان لانے والے نانِ شبینہ کے محتاج ہو رہے ہیں۔ آپ کے جانثار جان لیوا مصائب سے دوچار ہیں۔ ابتلاء و آزمائش کی بھٹی گرم سے گرم تر ہوتی جا رہی ہے لیکن ان میں سے کوئی بات بھی آپ کیلئے پریشانی کا باعث نہیں بنتی۔ آپ کو پریشان کرنے اور ہلکان کرنے والا وہ منظر ہے جس سے آپ کو روزانہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پوری قوم میں گمراہی وضلالت، اخلاقی پستی، ہٹ دھرمی اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اندھی مزاحمت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ خیر اور بھلائی کی ہر بات کو اپنے لئے ناقابلِ قبول سمجھ رہے ہیں۔ یہ وہ صورتحال ہے جس سے آنحضرت ﷺ کے دل پر وہ ہلاک کر دینے والی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے آپ روز بروز ہلاکت کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

یہ تینوں کیفیات جو اس آیتِ کریمہ کے الفاظ سے خود بخود پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول کے سوا یہ کیفیت کسی اور میں نہیں ہوتی۔ یوں تو آپ کی نبوت اور رسالت کے بے شمار دلائل ہیں لیکن اگر کسی کو باقی دلائل سے آگاہی نہ ہو تو اس کیلئے یہ کیفیات ہی آپ کی حقانیت کو اجاگر کرنے کیلئے کافی ہیں۔

Marfat.com

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾

(اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار دیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہی رہ جائیں۔ ۴)

اس آیت میں اَعْنَاقُهُمْ، ظَلَّتْ کا اسم ہے۔ خَاضِعِيْنَ خبر ہے۔ نحوی قاعدے کے مطابق خَاضِعَة ہونا چاہیے تھا، لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسم اگر مرکب اضافی ہو تو اس کی خبر میں مضاف کی بجائے مضاف الیہ کی مطابقت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔

بعض اہلِ لغت کے نزدیک اعناق رؤساء کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس صورت میں اس تاویل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کیلئے تہدید

آیت کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ نے ایسی نشانی دکھانے کا مطالبہ کیا ہوگا جو اس قدر غیر معمولی اور حیرت انگیز ہو کہ اسے دیکھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار نہ کرسکے۔ چنانچہ اس کا جواب دیتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ہم اگر چاہیں تو ایسی کسی نشانی کا اتار دینا ہماری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اولاً تو امتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کے منہ مانگے معجزات بھی بعض دفعہ انہیں دکھا دیئے گئے لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ قومِ صالح نے پہاڑ سے نکلتی ہوئی اونٹنی دیکھی جو ان کے مطالبے پر دکھائی گئی تھی لیکن انہوں نے اسے جادو قرار دے کر رد کردیا۔ اور ثانیاً یہ بات بھی ہے کہ اگر ایسی کوئی نشانی دکھا کر بالجبر کسی قوم کو مسلمان بھی بنا دیا جائے تو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ کیونکہ جبری ایمان تو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ سوچ سمجھ کر اپنے اختیار اور ارادہ سے ایمان لائیں۔ اسی صورت میں جزاء اور سزا کی معقولیت سمجھ میں آتی ہے۔ اگر زبردستی کسی کو مومن بنا دیا جائے تو ایمان پر جزاء کیسی۔ اسی طرح اگر کسی کو جبراً کافر بنا دیا جائے تو کفر پر سزا کیسی۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر بالجبر لوگوں کو مومن بنانا ہوتا تو ہر انسان کو اسی فطرت اور ساخت پر پیدا کیا جاتا جس میں کفر نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا بلکہ ہر انسان پیدائشی طور پر فرشتوں کی طرح فرمانبردار ہوتا۔ لیکن اس سے انسانوں کی وہ آزمائش جو انہیں عقل وشعور دے کر اور پیغمبروں کی بعثت اور کتابوں کے نزول سے کی گئی ہے وہ سب ختم ہو کے رہ جاتی۔ اس لئے قرآنِ کریم میں سورۃ یونس آیت ۹۹ میں ارشاد فرمایا گیا ہے (اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والی سب کے سب لوگ ایمان لے آتے، اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے)۔ سورۃ ہود آیت ۱۱۹ میں فرمایا (اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا، وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے، اسی لئے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا)۔ البتہ منہ مانگے معجزات دیکھنے اور ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس قوم کیلئے مہلت کا وقت ختم ہوجاتا ہے۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ وہ ایمان لائیں تو بچ جائیں، ورنہ عذاب کا شکار ہوجائیں۔ قریش کو وارننگ دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر ہم تمہارے مطالبے کے مطابق ایسی کوئی نشانی نازل کردیں تو پھر تم پر عذاب کا ایسا کوڑا برسے گا جس کے بعد تم کبھی گردنیں اٹھا نہ سکو گے۔

Marfat.com

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ۝٥

(ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے تو یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ۵)

مخالفین کے اصل مرض کی نشاندہی

مخالفین کے اصل مرض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ آئے دن ان کی طرف سے مختلف قسم کی نشانیوں کا مطالبہ یہ اصل مرض چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ ان کا حقیقی روگ یہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغمبر اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہے تو اس کے مخاطب لوگوں نے ہمیشہ اسے جھٹلایا اور اس کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ مرض اتنا بڑھا کہ علاج کے ساتھ ساتھ انہیں معالج سے بھی نہ صرف نفرت بلکہ دشمنی ہوگئی۔ مریض کی اصل بدنصیبی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ علاج سے بے نیاز اور معالج سے دشمنی پر اتر آئے۔ معالج اس کے مرض کی تشخیص کرے اور نہایت ہمدردی سے نسخہ تجویز کرے تو وہ اسے ہذیان اور بکواس سمجھے اور معالج کا تمسخر اڑائے۔ ایسے مریض کا دنیا میں کہیں علاج نہیں ہوسکتا اور وہ اپنے مرض سے کبھی شفایاب نہیں ہوسکتا۔ اسے اپنے مرض کی فکر کی بجائے معالج کو ناکام کرنے کی فکر رہتی ہے۔ یہی حال قریش اور دیگر اہلِ مکہ کا ہے۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں کہ ان کی اس روش کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝٦

(بلاشبہ وہ تکذیب کر چکے تو آجائیں گی ان کے پاس اطلاعات اس چیز کی جس کا وہ استہزاء کیا کرتے تھے۔ ۶)

مخالفین کا علاج غلبۂ دین

جن لوگوں کا مرض یہ صورت اختیار کر جائے کہ وہ ہر نصیحت کا تمسخر اڑائیں اور عذاب کی تنبیہ کو مذاق سمجھیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تبلیغ و دعوت کے مقابلے میں ناشائستہ حرکتیں کریں۔ ان کا علاج یہ نہیں کہ ان پر ایسی نشانیاں اتاری جائیں جسے دیکھ کر وہ ایمان لانے پر مجبور ہوجائیں بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ لیکن یہ اس صورت میں مناسب ہے جب اس قوم کو مٹانے کا فیصلہ ہو چکا ہو بصورت دیگر ان کی سزا کیلئے یہ بات کافی ہے کہ وہ جس دین کا مذاق اڑاتے اور غلبۂ دین کی خبروں کو پیغمبر کی بڑ سمجھتے ہیں اور قرآنِ کریم کو اساطیر الاولین قرار دیتے ہیں اس دین کو غالب کر دیا جائے۔ مکہ جو ان کا مرکزِ اعصاب اور قوت کا سرچشمہ ہے اس سے انہیں محروم کر دیا جائے اور جزیرۂ عرب کی حد تک چند ہی سالوں میں اللہ تعالیٰ کے دین کا پھریرہ لہرانے لگے۔ تب انہیں یقین آئے گا کہ وہ جو کچھ کہتے رہے سراسر باطل تھا۔ اور اس راہ میں جو کچھ انہوں نے مساعی انجام دیں وہ سب رائیگاں گئیں۔ حقیقت وہی تھی جسے اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول پیش کر رہے تھے۔ اَنۡبٰٓـؤُا سے مراد یہی انقلابات و تنبیہات ہیں جن سے ان بڑے بڑے سنگدلوں کا علاج ہونے والا تھا۔ چنانچہ اسی تنبیہ اور خبر کے مطابق چند ہی سالوں میں مکہ سرنگوں ہوا، عرب کے بیشتر علاقے مفتوح ہوگئے، رفتہ رفتہ جزیرۂ عرب اسلام کی آغوش میں آگیا اور کل کے فراعنہ اور نمارِدہ اسلام لانے پر مجبور ہوگئے یا ملک چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اور یا حق و باطل کی کشمکش میں قتل ہوگئے۔

Marfat.com

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ کَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ﴿۷﴾

(کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی کثرت سے ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں اگائی ہیں۔ ۷)

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

مخالفین کا اصل مرض مشخص کرنے اور اصل علاج واضح کرنے کے بعد فرمایا کہ ہر چند ان لوگوں کو کسی نشانی کی طرف متوجہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم اگر کچھ طبیعتوں میں جستجوئے حق کا مادہ موجود ہو تو ان کیلئے آسمان سے نشانی اترنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ اس کے منتظر بھی کیوں ہیں جبکہ اس زمین پر گوناگوں نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس زمین کو دیکھو بظاہر مٹی کا ایک تودہ ہے لیکن نہ جانے قوتِ روئیدگی کا خزانہ چھپا کر کہاں رکھا گیا ہے کہ کوئی کارآمد تخم بکھیر کر دیکھو زمین اسے اگانے میں بخل سے کام نہیں لے گی۔ زمین کے مختلف قطعات ایک ہی جیسے ہیں اور اس میں اگانے کی مشینیں بھی یقیناً ایک ہی جیسی ہوں گی، لیکن جتنے اقسام کے تخم ڈالے جائیں ویسے ہی پودے سر اٹھاتے اور پھل دینے لگتے ہیں۔ اور بعض دفعہ تو اس سے بھی حیرت انگیز منظر سامنے آتا ہے کہ زمین بھی ایک اور بیج بھی ایک۔ لیکن اس سے اگنے والے پودے جو پھل دے رہے ہیں اس کے رنگ میں بھی فرق ہے اور لذت اور تاثیر میں بھی۔ موسم کی شدت بعض دفعہ لہلہاتی فصل کو خشک کرنے لگتی اور یا نوزائیدہ بیجوں کو گرمی سے اگنے میں رکاوٹ بننے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے تو دریا اور سمندروں سے بھاپ اٹھتی، فضاء میں ابر کی چادریں پھیلتیں اور جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں بارش برسنے لگتی ہے۔ لیکن زمین کے حوالے سے یہ عجیب صورتحال سامنے آتی ہے کہ موسلا دھار بارش میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ زمین سارا پانی نگل لے اور دلدل بن جائے اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ سارا پانی اگل دے اور پتھر بن کر روئیدگی کے قابل بھی نہ رہے۔ یہ تو چند حیران کن نشانیاں ہیں جو زمین کی قوتِ روئیدگی کے حوالے سے سرسری نگاہ سے سامنے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ زمین کے اندر اور اس سے ہونے والی پیداوار میں جو بے شمار عجائب وغرائب ماہرینِ ارض نے آج تک سمجھے ہیں انہیں پڑھ کر نہ صرف حیرانی ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تخلیق پر بھی یقین بڑھ جاتا ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے پاؤں کے نیچے اور ہمارے دائیں بائیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انسان آسمان سے نشانی اترنے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اپنے سامنے دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸﴾

(اس میں بیشک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۸)

ہر طرف نشانیاں ہیں مگر اندھے پن کا کیا علاج؟

یہ لوگ بار بار نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم نے زمین کی جس نشانی کا ذکر کیا ہے جس میں بے شمار انواع واقسام کی چیزیں جس فراوانی سے اگ رہی ہیں اور جن مادوں اور قوتوں سے کام لیا جا رہا ہے اور جو قوانین یہاں کارفرما ہیں اور پھر زمین سے پیدا ہونے والی ہر نبات کے جو خواص اور صفات رکھی گئی ہیں اور پھر جس طرح سے زمین سے اگنے والی ہر چیز مخلوقات کی طبیعتوں کے ساتھ ہم آہنگ پیدا کی گئی ہیں حتیٰ کہ اس کے اندر اگنے والی جڑی بوٹیاں انسان کے تجسس کو دعوت دیتی ہیں تو بے شمار فوائد سامنے آتے ہیں اور ان میں سے کتنی بوٹیاں ایسی ہیں

Marfat.com

جوانسان کے مختلف امراض کا علاج بنتی ہیں۔ ایک عالم نے جنوبی افریقہ کے سفر کا حال لکھتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ وہاں ایک ایسا پودا ہے جس کے پتوں کی خوبصورتی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن اگر اس کا پتا توڑ لیا جائے تو جسم میں زہر کی ایک لہر سی اٹھتی ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اسی پودے کے نیچے چھوٹے چھوٹے پتوں والی ایک بوٹی پیدا کی گئی ہے جس کے پتے اس زہر کا تریاق بنائے گئے ہیں۔ یہ نہایت معمولی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین میں کیسی کیسی حیران کن نشانیاں موجود ہیں، لیکن انسان کی کوتاہی فکر کا کیا کہنا کہ ایک طرف وہ ستاروں کی گزرگاہوں کو روندتا ہے اور دوسری طرف زمین پر پھیلی ہوئی نشانیوں سے سبق نہیں سیکھتا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٩﴾

(اور بیشک آپ کا رب، بہت زبردست بھی ہے اور مہربان بھی۔ ۹)

غلط فہمی کا ازالہ

انسانوں کی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے بے اعتنائی اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت سے سرکشی اور تمرد تو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ لیکن جب اس طرف سے کوئی گرفت نہیں ہوتی تو انسان سرکشی میں اور بڑھ جاتا ہے اور یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ مجھے کوئی پکڑنے والا نہیں۔ پروردگار اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے کہ تمہارا رب عزیز یعنی غالب ہے۔ وہ اگر کسی کو سزا دینا چاہے تو کوئی اس کو روکنے والا نہیں۔ وہ ایسا زبردست ہے کہ ہر چیز اس سے پناہ مانگتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ رحیم بھی ہے۔ اس لئے وہ مہلت پر مہلت دیئے چلا جاتا ہے، عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا، تاکہ اگر کوئی شخص سنبھلنا چاہے اور اپنے انجام کو بہتر بنانا چاہے تو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس کی رحمت کا سزاوار بن سکتا ہے۔ اور اگر کوئی برسوں کی نافرمانیوں کے بعد بھی اس کی رحمت کو دعوت دیتا ہے اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے ندامت و عجز کے ساتھ معافی مانگتا ہے تو اس کی طرف سے معاف کرنے میں کوئی دیر نہیں ہوتی۔ وہ عمر بھر کی نادانیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت کا یقین اور دوسری طرف اس کی رحمت کی امید یہ دو چیزیں ہیں جو ایمان کی بنیاد اور مغفرت کی اساس ہیں۔ انہی کے استحضار سے زندگی میں تبدیلی آتی اور انہی کو بھول جانے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہو جاتی ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ
مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿١١﴾
قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿١٢﴾ ۭ وَيَضِيْقُ صَدْرِىْ وَلَا
يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ
اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿١٤﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿١٥﴾

Marfat.com

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ
مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ
فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ
اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾
فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ
مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ
اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ
اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ
اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ
بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾
فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا
هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (یاد کرو جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا کہ جاؤ ظالم لوگوں کے پاس۔ ۱۰) یعنی قومِ فرعون کے پاس، کیا وہ ڈریں گے نہیں۔ ۱۱) (حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، اے رب! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ ۱۲) اور میرا سینہ گھٹتا ہے اور روانی سے میری زبان نہیں چلتی، آپ ہارون کی طرف وحی بھیجیں۔ ۱۳) اور ان کا میرے ذمے ایک جرم بھی ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۱۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں، تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سننے والے ہیں۔ ۱۵) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔ ۱۶) کہ تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔ ۱۷) فرعون نے کہا کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر نہیں پالا اور تو رہا ہمارے اندر اپنی عمر کے کئی سال۔ ۱۸) اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا، اور تو بڑا احسان فراموش ہے۔ ۱۹) موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں نے اس کا ارتکاب اس وقت کیا تھا جبکہ میں ناواقف تھا۔ ۲۰) تو جب مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں سے بنا دیا۔ ۲۱) اور وہ احسان جو تم مجھ پر جتلا رہے ہو، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔ ۲۲) فرعون نے کہا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے۔ ۲۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا (رب العالمین وہ ہے جو) آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کا رب (مالک) ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ ۲۴) فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا کیا تم سن نہیں رہے ہو۔ ۲۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا وہ جو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی۔ ۲۶) فرعون نے کہا بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے بالکل ہی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ۲۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا (کہ میں اس رب العالمین کی طرف سے آیا ہوں) جو مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے، اگر تم لوگ کچھ بھی عقل رکھتے ہو۔ ۲۸) (فرعون نے دھمکی دیتے ہوئے) کہا اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں داخل کر دوں گا۔ ۲۹) اگرچہ میں تیرے پاس ایک واضح چیز بھی لے آؤں۔ ۳۰) فرعون نے کہا پیش کرو اسے اگر تم سچے ہو۔ ۳۱) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو یکا یک وہ ایک صریح اژدھا بن گیا۔ ۳۲) تو انہوں نے اپنا ہاتھ (بغل سے) باہر نکالا تو وہ یک لخت سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ ۳۳)

وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾

(یاد کرو جب آپ کے رب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پکارا کہ جاؤ ظالم لوگوں کے پاس۔ ۱۰) یعنی قومِ فرعون کے پاس، کیا وہ ڈریں گے نہیں۔ ۱۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت

قریش اور دیگر اہلِ مکہ کو ان کے عبرتناک انجام سے متنبہ کرنے اور نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو حق و باطل کی اس کشمکش میں کامیابی و کامرانی کی نوید سنانے کیلئے آگے چند انبیائے کرام اور ان کی امتوں کی سرگزشتیں بیان کی جا رہی ہیں جن میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور آلِ فرعون کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

اس سرگزشت کو وہاں سے شروع کیا گیا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس مصر جاتے ہوئے راستہ بھول گئے اور ایک یخ بستہ تاریک رات میں پہاڑی درے میں راستے کی تلاش میں حیران کھڑے تھے کہ دور سے ایک آگ دکھائی دی۔ وہاں پہنچے تو وہ وادیِ مقدس طویٰ تھی جہاں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور منصبِ رسالت پر سرفراز کر کے فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کیلئے جانے کی ہدایت کی۔

سرگزشت سے پہلے چند باتوں کی طرف توجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کی تفصیلات سے پہلے چند ایسی باتوں کی طرف توجہ ضروری ہے جو اس سرگزشت سے نمایاں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی بات جس کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور مسلمان یقیناً قریش کی اذیت رسانیوں کے باعث نہایت جانگسل صورتحال سے دوچار ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے آغاز سے بھی پہلے جن حالات سے واسطہ پڑا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نبی کریم ﷺ ایسی صورتحال سے دوچار نہیں ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کے فرد تھے جسے فرعونیوں نے ظالمانہ طریقے سے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ آپؑ کی قوم کے ہر نومولود کو اس خیال سے قتل کرنے کے درپے تھے کہ ان کو کسی نجومی نے اس خبط میں مبتلا کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو فرعون کا تختہ الٹ دے گا۔ اور یا وہ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی افرادی قوت سے خوفزدہ تھے اور وہ آج کے دور کی خاندانی منصوبہ بندی کی بجائے نرینہ بچوں کو قتل کر کے اس خطرے سے بچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپؑ کی زندگی کی حفاظت کیلئے آپؑ کو ایک ٹوکرے میں ڈال کر دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر دیا کہ شاید وہ اس طرح سے اپنے خطرناک انجام سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی کہ ایسے مایوس کن حالات میں آپؑ کو فرعون کے گھر پہنچا دیا اور وہیں آپؑ کی پرورش کے امکانات پیدا کر دیئے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کو ایسی کسی صورتحال سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ آپؐ قریش کے معزز گھرانے کے فرد تھے۔ آپؐ نے یتیمی کے دکھ ضرور اٹھائے لیکن آپؐ کی نمود و پرداخت ایک آزاد بچے کی طرح ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو ایک اسرائیلی کی مدد کرتے ہوئے ایک قبطی ان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چنانچہ آپؑ کی گرفتاری کا فیصلہ ہوا، قتل کے منصوبے تیار ہوئے اور آپؑ اپنی جان بچانے کیلئے مصر سے بھاگے اور مدین پہنچ گئے۔ اور پھر دس برس روپوش رہنے کے بعد واپس مصر آ رہے تھے تو آپؑ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا اور فرعون کی ہدایت کیلئے جانے کا حکم دیا۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ آپؐ اپنے ملک میں نہایت عزت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے کہ جب آپؐ کو نبوت دی گئی۔ قتل جیسا کوئی الزام آپؐ کی ذات پر نہ تھا۔

فرعون کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت تھی اور فرعون آپؑ کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل ہو جانے کی وجہ سے آپؑ سے ذاتی انتقام کی خواہش دل میں رکھتا تھا، لیکن قریش کو فرعون کی طاقت اور حکومت سے کوئی نسبت نہ تھی اور انہیں نبی کریم ﷺ سے کوئی عناد نہ تھا اور نہ کسی کا انتقام آپؐ کے ذمہ تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہایت خطرناک حالات اور خطرناک دشمن کے سامنے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کیلئے بھیجے گئے تھے جبکہ آپ کی جان بھی خطرے میں تھی اور آپ کی پشت پناہی کیلئے کوئی طاقت بھی نہ تھی اور فرعون اور آلِ فرعون بے پناہ وسائل کے مالک اور نہایت قوت و وجاہت رکھتے تھے۔ لیکن جب ہم تاریخ کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں بتاتی ہے کہ فرعون اپنی تمام تر حکومت اور وسائل کی فراوانی کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخر کار ان سے ٹکرا کر تباہ

Marfat.com

ہو گیا۔ اس سے قریش اور دیگر اہلِ مکہ کو یہ سبق دینا ہے کہ تم اپنی جس طاقت وقوت پر ناز کرتے ہو وہ فرعون کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، اور نبی کریم ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت بہتر پوزیشن میں ہیں۔ جب فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی بے بس اور بے کس شخصیت کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو تم بھی نبی کریم ﷺ، اسلامی دعوت اور مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اور اس کشمکش میں بالآخر ناکام ونامراد ٹھہرو گے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور آلِ فرعون کے سامنے ایسی کھلی نشانیاں دکھائیں اور آپؑ کے ہاتھ سے ایسے حیرت انگیز معجزات کا ظہور ہوا جس سے زیادہ واضح نشانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ فرعونیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جادو کہہ کر بے اثر کرنا چاہا، لیکن جادوگروں کے ساتھ آپؑ کے مقابلے میں جادوگروں کی بے بسی اور پھر ان کے اعترافِ حق نے اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کردی کہ آپؑ جادوگر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ بایں ہمہ فرعون اور اس کی قوم نے آپؑ پر ایمان لانے سے انکار کردیا۔ کیا قریش کو اس سے سبق نہیں ملتا کہ جب قومیں ہٹ دھرم ہوجاتی ہیں، تو بڑی سے بڑی نشانی کو دیکھ لینا بھی ان کیلئے سودمند نہیں ہوتا۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ یہ ہٹ دھرمی انہیں تباہی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ قریش کو اگر اپنے انجام کی کچھ بھی فکر ہے تو انہیں بجائے نشانیوں کا مطالبہ کرنے کے پہلی امتوں کی تباہی کے اسباب پر غور کرنا چاہئے اور ان اسباب کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے جن اسباب کی وجہ سے معذب قوموں میں سے ہر قوم بدترین تباہی کا شکار ہوئی۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد پیشِ نظر آیات پر غور کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپؑ فرعون اور قومِ فرعون کے پاس جائیں جو نہایت ظالم قوم ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے جیسے ایک انسان کو رب بنا رکھا ہے۔ وہ سر جو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا چاہئے وہ فرعون کے سامنے جھکتا ہے اور وہ تمام اختیارات انہوں نے فرعون کو سونپ رکھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ مزید برآں ان کے ظلم کا حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کررکھا ہے، ان سے سخت بیگار لی جاتی ہے، عمارتوں کی تعمیر کیلئے بڑے بڑے پتھر ان سے اٹھوائے جاتے ہیں اور پھر اسی ظلم پر اکتفا نہیں، ان کے بیٹوں کو قتل کیا جاتا ہے اور بیٹیوں کو گھروں کی صفائی اور اپنی ہوس رانی کیلئے زندہ رکھا جاتا ہے۔ ان کے اس بڑھتے ہوئے ظلم کو روکنے کیلئے ان کے پاس جایئے اور انہیں توجہ دلایئے کہ ان کا یہ ظلم اور ان کی یہ سرکشی آخر کہاں تک پہنچے گی کیا وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ کائنات کا ایک خالق و مالک بھی ہے۔ باقی مخلوقات کی طرح فرعون کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ کیا یہ لوگ اس کے قہر و غضب سے کبھی نہیں ڈریں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی
هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾

(حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا، اے رب! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے۔ ۱۲) اور میرا سینہ گھٹتا ہے اور روانی سے میری زبان نہیں چلتی، آپ ہارون کی طرف وحی بھیجیں۔ ۱۳) اور ان کا میرے ذمے ایک جرم بھی ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں وہ مجھے قتل کردیں گے۔ ۱۴)

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چند اندیشے

نبوت اور رسالت ایک بہت نازک اور کٹھن ذمہ داری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا شدید احساس تھا۔ اس احساس کے تحت آپ نے عرض کی کہ اے میرے رب، مجھے اندیشہ ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون میری تکذیب کریں گے اور مجھے جھٹلا دیں گے۔ اسی شدید احساس کے تحت میرا سینہ بھنچتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا خیال بھی ہے کہ میری زبان اظہارِ مدعا اور بحث میں بہت روانی سے نہیں چلتی۔ اور رسالت ایک ایسا منصب ہے جس میں قدم قدم پر لوگوں کے سامنے خطبہ دینے اور بعض دفعہ بحث کرنے کی نوبت آتی ہے۔ میں نے غور وفکر اور خاموشی کی زندگی گزاری ہے۔ اب اچانک مجھے ایک ایسی ضرورت سے دوچار کر دیا جائے گا تو میں شاید اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں، اس لئے ذمہ داری میں حضرت ہارون علیہ السلام کو میرا معاون بنا دیجئے۔ وہ میرے شریکِ کار کی حیثیت سے میری مدد کریں کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی ساتھ اس منصب میں شریک کرنے کی دعا کی ہے اور اس کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ وہ ان سے زیادہ فصیح واقع ہوئے ہیں یعنی بات کو زیادہ موثر طریقے سے اور رواں دواں انداز میں کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور مزید یہ عرض کی کہ الٰہی آپ جانتے ہیں کہ ان کا ایک گناہ اور جرم بھی میرے ذمے ہے۔ یہ دراصل اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس کا ذکر سورۃ القصص میں ہے کہ بے خیالی میں ایک اسرائیلی کی مدد کرتے ہوئے ایک قبطی آپ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ آپؑ اس کے ظلم سے ایک اسرائیلی کو بچانے کیلئے آگے بڑھے تو اس نے آپ پر بھی دست درازی کی۔ آپ نے اسے روکتے ہوئے ایک مکا رسید کیا۔ مکا نہ تو آلہ قتل ہے اور نہ اقدامِ قتل پر دلالت کرتا ہے۔ یہ محض کسی کو روکنے یا سرزنش کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ اتفاق تھا کہ وہ شخص اس سے مر گیا۔ فرعون کی کابینہ میں پہلے ہی کچھ لوگ آپ کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے، ان کو جیسے ہی اس واقعہ کی خبر ہوئی، انہوں نے آپ کے قتل کے منصوبے باندھے اور آپ کی گرفتاری کیلئے سازش کی۔ آپ کو جیسے ہی کسی مخبر نے اطلاع دی تو آپ مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور مدین جا کر پناہ لی۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ یہ فرما رہے ہیں کہ ان کا ایک قتل بھی میرے ذمے ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ اس جرم میں مجھے قتل کر ڈالیں گے۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں، تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سننے والے ہیں۔
۱۵) تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔ ۱۶) کہ تو ہمارے ساتھ
بنی اسرائیل کو بھیج دے۔ ۱۷)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دہانی

اللہ تعالیٰ نے پوری شدت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس اندیشے کو رد کردیا کہ وہ لوگ آپ کو قتل کردیں گے اور اطمینان دلاتے ہوئے یہ فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ جب تم فرعون کے پاس جاؤ گے تو کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوں گے، ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہوں گے اور جو کچھ قبطی تم سے کہیں گے وہ ہم سب کچھ سنیں گے۔ ان کی کوئی بات بھی ہم سے مخفی نہیں ہوگی۔ اس لئے آپ پورے اطمینان کے ساتھ اس کے پاس جایئے اور اسے کہئے کہ ہم رب العالمین کے نمائندہ بن کے آئے ہیں۔ تم اپنے آپ کو مصر اور اہلِ مصر کا رب کہتے ہو، لیکن تم اس بات کو بھول گئے ہو کہ اس کائنات کا بھی ایک رب ہے، اس نے اس کائنات میں بسنے والوں کو کچھ فرائض کا پابند بنا رکھا ہے۔ انسان بھی اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے جو زمین پر آباد ہے، اسے بھی کچھ فرائض دے کر زمین پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور کچھ حدود ہیں جن میں اس کی آزادی کو محدود کردیا گیا ہے جو کائنات کا رب اور مالک ہے وہی اس زمین کا بھی مالک ہے۔ وہ مختلف اوقات میں اہلِ زمین کی اصلاح اور ان کی حدود کی یاددہانی کیلئے اپنے پیغمبر بھیجتا رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص بھی اس زمین کے بنانے والے اور تمہیں پیدا کرنے والے کی مرضی سے آزاد نہیں۔ تمہیں یقیناً ایک محدود آزادی دی گئی ہے لیکن اس کے استعمال کی حدود اور اس کے طریقے بھی واضح کئے گئے ہیں۔ انتظامی ضرورتوں کے تحت تمہیں جو نظمِ اجتماعی دیا گیا ہے اس میں تمہارا ایک امیر ہوتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کا اسی طرح پابند ہوتا ہے اور اس کے احکام کا اسی طرح مکلف ہوتا ہے، اور اس کی حدود میں اسی طرح محدود رہتا ہے جیسے اس کا ایک عام بندہ اور عام انسان رہتا ہے۔ اس کائنات کے حاکم نے ہمیں تمہارے پاس اپنا نمائندہ اور رسول بنا کر بھیجا ہے تاکہ ہم تمہیں تمہاری اصل حیثیت کا احساس دلائیں۔ ہم تمہاری بھی اصلاح چاہتے ہیں اور مصر کے باقی لوگوں کی بھی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کو محض ظلم کا نشانہ بناتے ہوئے جس طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اس کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اگر تم یہاں انہیں آزادی نہیں دے سکتے تو پھر انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو، تاکہ وہ اپنے اصل وطن کی طرف لوٹ جائیں۔

اَنْ اَرْسِلْ، اصل میں بِاَنْ اَرْسِلْ ہے۔ عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ب حذف ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس پیغام کے ساتھ رسول بن کر آئے ہیں۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

(فرعون نے کہا کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر نہیں پالا اور تو رہا ہمارے اندر اپنی عمر کے کئی سال۔ ۱۸) اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا، اور تو بڑا احسان فراموش ہے۔ ۱۹)

Marfat.com

فرعون کی برہمی

فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ دو باتیں سنیں، ایک تو یہ بات کہ ہم رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آئے ہیں اور دوسری یہ بات کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، تو اسے تو آگ لگ گئی۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ اس کی غلام قوم کا ایک فرد اس کے سامنے دو بدو باتیں کرے اور پھر اس کی حیثیت کو چیلنج کرتے ہوئے رب العالمین کا نام لے اور اپنے آپ کو اس کا نمائندہ ٹھہرائے۔ فرعون اپنے آپ کو ربکم الاعلیٰ کہتا تھا، یعنی میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں، تو یہ رب العالمین کہاں سے آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سارے جہانوں کا رب کوئی اور ہے تو میں کیا ہوں۔ اس کیلئے اس سے بڑھ کر تکلیف دہ بات اور کیا ہوسکتی تھی اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ مطالبہ کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے، یہ تو نہایت خطرناک مطالبہ تھا۔ دنیا میں کبھی غلامی کی زنجیریں یوں بھی کٹی ہیں کہ اچانک کسی استعماری قوت نے کسی قوم کو اپنی غلامی سے نکلنے کی آزادی دے دی ہو۔ کیونکہ غلاموں سے ہمیشہ گھروں کی خدمت لی جاتی ہے، بڑی سے بڑی بیگار میں انہیں جوتا جاتا ہے، زمین کی کھیتی باڑی انہیں کے دم سے ہوتی ہے، آقاؤں کے شاندار محلات انہیں کی محنت اور پسینے سے تعمیر ہوتے ہیں، وہ اپنے آقاؤں کو ہر طرح کا آرام پہنچانے کیلئے آٹھوں پہر بے زبان چوپایوں کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دے کر ملکی زندگی کو تلپٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت برہمی سے کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم مجھ سے اس طرح کی باتیں کرو، کیا تم وہی نہیں جو پانی میں بہتے ہوئے ایک بے کس بچے کی صورت میں ہمارے محلات کے قریب آیا تو ہم نے اسے ترس کھا کر محل کی خادماؤں کے حوالے کردیا۔ پھر عرصۂ دراز تک ہمارے گھر میں تم ناز و نعم سے پلتے رہے اور جب تم ہمارے گھر کا ہی کھا پی کر جوان ہوئے تو ہمارے ہی ایک آدمی کو قتل کر کے بھاگ نکلے اور آج تمہاری جرأت کا عالم یہ ہے کہ تم میرے سامنے مطالبات لے کر آ گئے ہو۔ تمہیں تو ایک قاتل ہوتے ہوئے پھانسی کی کوٹھڑی میں ہونا چاہیے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا
وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢١﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٢﴾

(موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں نے اس کا ارتکاب اس وقت کیا تھا جبکہ میں ناواقف تھا۔ ۲۰) تو جب مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں سے بنا دیا۔ ۲۱) اور وہ احسان جو تم مجھ پر جتلا رہے ہو، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔ ۲۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب

فرعون نے اپنے جن احسانات کا تذکرہ کیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احسان فروشی کا طعنہ دیتے ہوئے ایک آدمی کے قتل کا الزام لگایا، اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جہاں تک قتل کے الزام کا تعلق ہے وہ مجھ سے اس وقت سرزد ہوا جب میں ضالین میں سے تھا۔ ضالین، ضال کی جمع ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ گمراہ کیا جاتا ہے کیونکہ ضلالت گمراہی کو کہتے ہیں، لیکن ہمیشہ ضلالت کا مفہوم گمراہی ہی نہیں ہوتا بلکہ عربی زبان میں کبھی اس لفظ کو ناواقفیت، نادانی، خطا، نسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال

Marfat.com

کیا جاتا ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک ضال سرگشتہ، جویائے راہ اور کھوئے ہوئے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ سورۃ الضحٰی میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قبطی کے قتل کا واقعہ جو مجھ سے سرزد ہوا اس کے پیچھے ارادۂ فعل کام نہیں کر رہا تھا، نہ میرے ہاتھ میں کوئی آلۂ قتل تھا، میں نے اسے اس کے ظلم سے روکنے کیلئے ایک گھونسا مارا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص اس سے مر جائے گا۔ وہ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ تو یہ جو کچھ ہوا، بے خبری اور بے خیالی میں ہوا۔ لیکن جب مجھے اندیشہ ہوا کہ میرے قتل کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں تو میں تم سے ڈر کر بھاگ نکلا۔ میں یقیناً تمہارے ظلم سے ڈر کر بھاگا تھا۔ لیکن آج جبکہ میں لوٹ کے آیا ہوں تو میں ایک بھاگا ہوا مجرم نہیں بلکہ ایک ایسا شخص ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے علم و دانش اور پروانۂ نبوت عطا فرمایا ہے۔ کیونکہ حکم ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور آپ کو رسول بنانے کا تذکرہ تو اس آیت میں صراحۃً کیا جا رہا ہے۔ رہا تمہارا یہ احسان کہ میں تمہارے گھر میں پلا بڑھا ہوں تو اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی یہ بات کہ مجھے اس احسان کا اعتراف ہے جو تمہارے اہلِ خانہ نے مجھ پر کیا۔ لیکن کیا یہ احسان اس ظلمِ عظیم کو جائز ثابت کرنے کیلئے کافی ہے جو تم بنی اسرائیل پر کر رہے ہو کہ تم نے ان کی آزادی سلب کر رکھی ہے اور تم ان سے وہ سلوک کر رہے ہو جو کوئی مہذب شخص جانوروں پر کرنا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے اس بات کا جواب دے سکتے ہو کہ میں تمہارے محل میں کیونکر پہنچا۔ تم نے بنی اسرائیل پر مظالم کی انتہا کرتے ہوئے یہاں تک نوبت پہنچادی کہ تم نے ان کے بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جبکہ دنیا کی کوئی مہذب قوم بدترین حالات میں بھی بچوں کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تمہارے اس ظلم سے بچوں کو بچانے کیلئے ماؤں نے نہ جانے کیسے کیسے ظلم کے چرکے سہے۔ میری ماں نے بھی مجھے بچانے کیلئے صبر کی سل اپنے سینے پر رکھی اور مجھے ٹوکرے میں ڈال کر دریائے نیل کے سپرد کر دیا۔ اگر تم نے میری قوم پر یہ ظلم روا نہ رکھا ہوتا تو میں تمہارے گھر کیوں پہنچتا۔ کیا میری پرورش کیلئے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا۔ اور کیا مجھے دودھ پلانے کیلئے میری ماں کی آغوش نہ تھی۔ اور کیا میرا بوجھ اٹھانے کیلئے میرے باپ کے کندھے سلامت نہ تھے۔ کیا اس ظلم کے بدلے میں تمہیں یہ بات زیب دیتی ہے کہ تم مجھ پر اپنا احسان جتلاؤ۔ یہ تو میرے اللہ کا کرم ہے کہ تم جس بچے سے ڈر کر بچوں کو قتل کروا رہے تھے اس نے اسی بچے کو تمہارے گھر میں رکھ کر تربیت کروایا۔ آج اسی رب العالمین کا نمائندہ بن کر میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾

(فرعون نے کہا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے۔ ۲۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مسکت جواب پر فرعون کا خلط مبحث

فرعون جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا جواب نہ دے سکا تو اس نے کہا کہ تم جس رب العالمین کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے ہو وہ کیا ہے؟ جبکہ سب سے بڑا رب تو میں ہوں۔ ذرا اس کی حقیقت تو بیان کرو، کیونکہ عربی زبان میں ''ما'' کا لفظ کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت معلوم کرنے کیلئے آتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال سے فرعون رب العالمین کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت پر آگاہ ہونا انسان کیلئے ناممکن ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مسئلہ میں الجھنے کی بجائے ان دلائل و شواہد کی طرف اس کی توجہ مبذول کی جن پر اگر غور و فکر کیا جائے تو انسان رب العالمین کو پہچان سکتا ہے۔ لیکن بڑی حکمت سے ان دلائل و شواہد کو بیان کیا

Marfat.com

گیا ہے جن سے رب العالمین کی پہچان بھی آسان ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس رب کی نمائندگی کر رہے ہیں وہ درحقیقت محدود معنی میں رب نہیں بلکہ وہ سارے جہان والوں پر حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ ربِ اعلیٰ ہے وہ درحقیقت اس پروردگار کا تابع ہے جو حقیقت میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ وہ اپنی بالاتر شان کے حوالے سے اپنے نمائندہ کے ذریعہ سے فرعون کو حکم دے رہا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ایک حصے کو اس کے نمائندہ کے حوالے کر دے تاکہ بنی اسرائیل کو آزاد فضا میں وہ تربیت دی جا سکے جس کے نتیجے میں وہ اپنے اصل مالک و فرمانروا کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو سکے جن سے فرعون نے ظلماً انہیں روک رکھا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی اصل حیثیت کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۴﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا (رب العالمین وہ ہے جو) آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کا رب (مالک) ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ ۲۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمۂ حق

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے جواب میں فرمایا کہ میں اس رب العالمین کا نمائندہ بن کر آیا ہوں جو آسمانوں اور زمین اور اس کے درمیان پوری کائنات کا مالک ہے۔ تم بھی اسی کی فرمانروائی کا ایک حصہ ہو اس لئے تمہیں اپنی اصل حیثیت کا احساس اور میری حیثیت کا ادراک کرتے ہوئے میری دعوت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میں نہ تو اپنی مرضی سے آیا ہوں اور نہ کسی مخلوق کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ میں اس کی طرف سے آیا ہوں جس کی تم بھی اسی طرح رعایا ہو جس طرح میں اس کی رعایا ہوں۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

(فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا کیا تم سن نہیں رہے ہو۔ ۲۵)

فرعون کی بوکھلاہٹ

فرعون نے اپنے درباریوں اور حاشیہ نشینوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ تم سن رہے ہو یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، یہ درحقیقت میری حیثیت کو چیلنج کر رہا ہے اور ایک ایسے بالاتر حکمران کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہا ہے جس کے مقابلے میں، میں ایک ادنیٰ حیثیت کا مالک ہوں۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا وہ جو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی۔ ۲۶)

Marfat.com

کلمۂ حق کی وضاحت

اسلوب بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون نے چونکہ اپنے درباریوں اور حاشیہ نشینوں کو بھی اس گفتگو میں شامل کرلیا تھا اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی انہیں اپنے خطاب میں شامل فرماتے ہوئے کہا کہ میں جس کا نمائندہ بن کے آیا ہوں وہ جس طرح میرا اور فرعون کا رب ہے، اسی طرح وہ تمہارا اور تمہارے آباؤاجداد کا بھی رب ہے۔ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو کل تھے اور آج نہیں ہیں۔ اور جو آج ہیں اور کل نہیں ہوں گے۔ یہ فرعون جسے تم اپنا مالک اور رب سمجھتے ہو یہ کل نہ تھا اور ایک وقت آئے گا کہ یہ نہیں ہوگا۔ اور جو تمہارے آباؤاجداد گزر چکے ہیں وہ ان فرعونوں کو اپنا رب سمجھتے تھے جو آج اپنا وجود کھو چکے اور قعرِ زوال میں ڈوب چکے ہیں۔ سوچ لو کیا رب کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ آج ہے اور کل نہیں ہوگا اور کل تھا آج نہیں ہے۔ رب تو وہ ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

(فرعون نے کہا بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے بالکل ہی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ۲۷)

فرعون کی جھنجلاہٹ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو سے فرعون چکرا کر رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے حاشیہ نشین بھی اس گفتگو کی کاٹ محسوس کر رہے ہیں اور ان کیلئے یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ ایک غلام اور پسی ہوئی قوم کا فرد جو اپنی ظاہری حالت سے بے کسی کی تصویر نظر آتا ہے کس جرأت و جسارت سے مدعیِ ربوبیت کو کھری کھری باتیں سنا رہا ہے اور اس کی باتوں میں کتنی معقولیت اور کتنا زور ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس گفتگو کے بہاؤ میں بہہ جاتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کے قائل ہو جاتے، اس نے آپ کی باتوں کو ہلکا کرنے کیلئے ازراہِ استخفاف کہا کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو رب العالمین کا رسول کہتا ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، یہ تو مجھے بالکل دیوانہ معلوم ہوتا ہے، اسے اندازہ ہی نہیں کہ اس کی باتیں کیا نتائج پیدا کرسکتی ہیں اور یہ اپنے لئے کیسے خطرات کو انگیخت کر رہا ہے اور باتیں بھی اس طرح کی کر رہا ہے جو آج تک کبھی کسی نے نہ کہیں اور نہ سنیں۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا (کہ میں اس رب العالمین کی طرف سے آیا ہوں) جو مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے، اگر تم لوگ کچھ بھی عقل رکھتے ہو۔ ۲۸)

فرعون کی خدائی پر آخری ضرب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے فرعون! تم مصر کی محدود مملکت پر اترا کر الوہیت کا دعویٰ کر رہے ہو اور میں تمہیں حقیقت کی خبر دے رہا ہوں تو تم مجھے پاگل قرار دے رہے ہو، حالانکہ میرا بھیجنے والا وہ ہے جس کی الوہیت کا پھریرا مشرق اور مغرب میں لہرا رہا ہے اور مشرق و مغرب کے درمیان ہر جگہ اس کی سلطانی کا نقارہ بج رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے جو تمہیں اس ربِ اعلیٰ کی خبر دے رہا ہے اور اس کی

Marfat.com

ربوبیت کی وسعتوں کی طرف توجہ دلا رہا ہے وہ پاگل ہے اور تم جو ان وسعتوں سے بے خبر محدود حکومت کے حاکم ہو کر اپنے ربوبیت کے فریب میں مبتلا ہو، تو تم عقلمند ہو اور تمہیں ماننے والے بھی عقلمند ہیں۔ ذرا اندازہ کرو کہ تمہیں کس فریب نظر نے حقیقت سے بے خبر بنا رکھا ہے۔ اگر تم واقعی عقل وخرد کے راستے کے شناور ہوتے تو میری باتوں سے حقیقت کا سراغ پا سکتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرعون اور اس کے ماننے والے ربوبیت کے ایک محدود تصور میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کیلئے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ ایک ایسے رب اور معبود کو تسلیم کریں جو قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست حیثیت کا مالک ہو اور جو یہ حق رکھتا ہو کہ معاملاتِ دنیا میں جو حکم چاہے جاری کر سکے اور انسانوں کا یہ فرض ہو کہ اس کے امرونہی کو قانونِ برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کی باتیں اس کیلئے حماقت کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتوں سے عاجز آ کر اس کے سوا کچھ نہ کر سکا کہ آپ کو دھمکی دینے پر اتر آیا۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾

(فرعون نے دھمکی دیتے ہوئے) کہا اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں داخل کردوں گا۔ ۲۹)

فرعون کی دھمکی

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل سے عاجز آ کر دھمکی دیتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر تم نے میرے اقتدارِ اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدارِ اعلیٰ کی بات کی اور میرے سوا کسی اور کو معبود مانا اور اس کی کبریائی کی دعوت دی تو میں تمہیں جیل میں ڈال دوں گا۔ اس دور میں جیل میں ڈالے جانے والے لوگ موت سے پہلے کبھی نہیں نکالے جاتے تھے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تم وہاں سے مر کر ہی باہر آؤ گے، زندگی میں باہر کا سورج کبھی نہ دیکھ سکو گے۔ تو دوسرے لفظوں میں آپ کو ختم کر دینے کی دھمکی دی گئی۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَىْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

(اگرچہ میں تیرے پاس ایک واضح چیز بھی لے آؤں۔ ۳۰)

سندِ ماموریت کا اظہار

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تو مجھے انتہائی سزا دینے کا ذکر کر رہا ہے اور تیرا گمان شاید یہ ہے کہ میں ایک بے نوا اور بے سہارا آدمی ہوں اور تو میرے ساتھ جو کچھ بھی کر گزرے تیرے لئے بہت آسان ہے اور میں بار بار اس بات کا اظہار کر چکا ہوں کہ میں رب العالمین کا نمائندہ بن کر آیا ہوں، لیکن تمہیں شاید اس کا یقین نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس کا یقین دلانے کیلئے ایسی نشانیوں کا تمہارے سامنے اظہار کروں جو ایک طرح سے میرے لئے سندِ ماموریت کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ اس کے بعد تم فیصلہ کر سکو کہ میری سزا کا فیصلہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

(فرعون نے کہا پیش کرو اسے اگر تم سچے ہو۔ ۳۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سوال پر فرعون نے کہا کہ اگر تم واقعی رب العالمین کی نمائندگی کے دعوے میں سچے ہو تو پھر کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جو تمہارے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہو۔

Marfat.com

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

(تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو یکا یک وہ ایک صریح اژدھا بن گیا۔ ۳۲) تو انہوں نے اپنا ہاتھ (بغل سے) باہر نکالا تو وہ یک لخت سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ ۳۳)

معجزات کا ظہور

فرعون کے کہنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو اچانک وہ ایک اژدھا بن گیا۔ قرآنِ کریم نے کسی جگہ اس کیلئے حَيَّةٌ اور کسی جگہ جَآنٌّ (جو بالعموم چھوٹے سانپ کیلئے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور یہاں اسے ثُعْبَانٌ (اژدھا) کہا جا رہا ہے۔ اہلِ علم نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ عربی زبان میں سانپ کی جنس کیلئے متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں حَيَّةٌ سب کیلئے ایک مشترک لفظ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ ثُعْبَانٌ کا لفظ اژدھا کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کیلئے ان تین لفظوں کے استعمال کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی جسامت میں تو ایک اژدھا تھا لیکن اپنی پھرتی اور تیزی کے اعتبار سے چھوٹے سانپ کی مانند تھا۔ جہاں تک ہاتھ کا تعلق ہے جسے یدِ بیضا کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر باہر نکالا تو وہ اس طرح چمکتا ہوا دکھائی دیا جیسے سورج چمکتا ہے اور سارا ماحول اس سے جگمگا اٹھا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا
تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾
يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾
وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ
اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ
اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ
اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾

Marfat.com

فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ
الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾
فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ
مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٤٨﴾ قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ
لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ لَأُقَطِّعَنَّ
أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٩﴾
قَالُوا لَا ضَيْرَ ۖ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا
رَبُّنَا خَطَايَانَا أَن كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥١﴾

رکوع: ۳۔ (فرعون نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا، بیشک یہ شخص بڑا ہی ماہر جادوگر ہے۔ ۳۴) یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے تو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔ ۳۵) وہ بولے کہ اسے اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالئے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔ ۳۶) جو آپ کے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لے آئیں۔ ۳۷) چنانچہ ایک روز مقررہ وقت پر جادوگر اکٹھے کر لئے گئے۔ ۳۸) اور لوگوں سے کہا گیا کیا تم (مقابلہ دیکھنے کیلئے) جمع ہو گے۔ ۳۹) تا کہ ہم جادوگروں کا ساتھ دیں، اگر وہ غالب رہنے والے ثابت ہوں۔ ۴۰) پس جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا، اگر ہم غالب رہے۔ ۴۱) فرعون نے کہا، ہاں۔ اور اس وقت تم مقربین میں سے ہو گے۔ ۴۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔ ۴۳) انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے ناموسِ فرعون کی قسم ہم ہی غالب رہنے والے ہیں۔ ۴۴) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا، تو یکایک وہ نگلنے لگا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا۔ ۴۵) تو ساحر بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ ۴۶) بولے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔ ۴۷) موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ ۴۸) فرعون نے کہا تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو

Marfat.com

اجازت دوں، ضرور یہ تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، تو تم عنقریب جان لوگے میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تم سب کو سولی چڑھادوں گا۔ ۴۹) انہوں نے جواب دیا کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۵۰) ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کردے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ۵۱)

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖۗ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(فرعون نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا، بیشک یہ شخص بڑا ہی ماہر جادوگر ہے۔ ۳۴) یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے تو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔ ۳۵)

معجزات کی قاہری اور فرعون کی ہشیاری

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی اپنے عصا اور اپنے ید بیضا کے دو معجزے دکھائے تو سب دیکھنے والے حیران وششدر اور ہک دک رہ گئے۔ کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہ موسیٰ جو فرعون کے گھر میں پلے بڑھے اور پھر دس سال پہلے حادثۃً ایک شخص کی موت سے پریشان ہوکر مصر سے غائب ہوگئے اور اب دس سال کی روپوشی کے بعد منصۂ شہود پر آئے ہیں ان کے ہاتھ سے ایسے معجزات کا ظہور بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن فرعون بڑا ذہین آدمی تھا اس نے لوگوں کے تأثرات سے اندازہ لگالیا کہ یہ بات صرف دربار تک محدود نہیں رہے گی، رفتہ رفتہ لوگوں میں پھیلے گی تو پہلے لوگوں کے ذہن ان معجزات کی ہیبت سے مرعوب ہوں گے اور پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت سے ہموار ہوکر ایمان کے راستے پر چل نکلیں گے جو ہمارے لئے مشکلات کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اس کی ذہانت اور عیاری نے فوراً اس کا حل سوچا اور اپنے گردوپیش بیٹھے ہوئے درباریوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ یہ شخص جسے تم بظاہر بہت سیدھا سادہ دیکھ رہے ہو اور اس کے ہاتھوں سے غیر معمولی کمالات کا اظہار دیکھ کر مرعوب ہوئے جارہے ہو، یہ درحقیقت ایک بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے۔ اور جادوگری کا فن چونکہ مصر میں کمال کو پہنچا ہوا ہے اور عام بھی ہے، تو اس نے اپنی دس سالہ غیر حاضری میں معلوم ہوتا ہے اسی فن میں کمال پیدا کیا ہے۔ اور مزید یہ بات کہ یہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو ماضی میں اس ملک کی حکمران رہ چکی ہے۔ اب اگرچہ اس کا ماضی ایک افسانہ بن چکا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض دماغ ابھی تک اس کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ ذہین نوجوان جسے ہمارے گھر میں رہنے کی وجہ سے شعور کا جوہر اور علم کی دولت مل گئی ہے یہ اس سے کام لے کر اس ملک کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی قوم ایک بڑی تعداد میں پہلے سے اس ملک میں موجود ہے اور وہ خاندان بھی موجود ہے جو اس ملک کا حقیقی حکمران تھا۔ اگر اس شخص کی قیادت نے ان دونوں خاندانوں کو جمع کرکے ان میں حکومت کی امنگ توانا کردی تو یہ بات بہت بعید نہیں کہ یہ ملک پر قبضہ کرکے تمہیں اس ملک سے نکال دیں۔ تم تو صرف اس کے کمالات کو دیکھ رہے ہو، میں اس کے پسِ پردہ مضمر خطرات کی بو سونگھ رہا ہوں۔ اب بتاؤ، ہمیں اس خطرے کو روکنے کیلئے کیا کرنا چاہئے اور تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔

Marfat.com

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۳۶﴾ یَاْتُوْکَ بِکُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ﴿۳۷﴾

(وہ بولے کہ اسے اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالئے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔ ۳۶) جو آپ کے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لے آئیں۔ ۳۷)

درباریوں کا مشورہ

درباریوں نے مشورہ دیا کہ آپ کے خیال میں یہ ایک بہت بڑا جادوگر ہے تو اس کے جادو کا توڑ تو جادو ہی سے کیا جا سکتا ہے اور ملک میں جادوگروں کی کمی نہیں۔ اس شہر میں بھی ان کی ایک بڑی تعداد ہوگی، لیکن مقابلہ چونکہ ایک بڑے جادوگر سے ہے اس لئے ہمیں صرف مقامی جادوگروں پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ ملک بھر میں اپنی طرف سے ہر شہر میں ہرکاروں کو بھیج دیجئے جو ایک سے ایک بڑا جادوگر تلاش کر کے لائیں، پھر دیکھیں گے کہ یہ دو آدمی ملک بھر کے جادوگروں کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ کَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۰﴾

(چنانچہ ایک روز مقررہ وقت پر جادوگر اکٹھے کر لئے گئے۔ ۳۸) اور لوگوں سے کہا گیا کیا تم (مقابلہ دیکھنے کیلئے) جمع ہو گے۔ ۳۹) تا کہ ہم جادوگروں کا ساتھ دیں، اگر وہ غالب رہنے والے ثابت ہوں۔ ۴۰)

مقابلے کی تیاری

درباریوں کے مشورے پر پورے ملک میں جادوگروں کو جمع کرنے کیلئے لوگ پھیلا دیئے گئے اور وہ پورے ملک سے جادوگروں کو ایک معین دن اور معین وقت پر جمع کر کے لے آئے۔ وہ معین دن سورۃ طٰہٰ کی صراحت کے مطابق قبطیوں کی عید کا دن تھا جسے قرآنِ کریم نے یوم الزینۃ کے نام سے یاد کیا ہے اور معین وقت چاشت کا وقت تھا۔ عید کے دن ویسے ہی لوگ فارغ اور میلوں ٹھیلوں میں جانے کیلئے بیتاب ہوتے ہیں، اس لئے وہ دن مقرر کیا گیا۔ اور چاشت کا وقت اس لئے رکھا گیا تا کہ لوگ اس وقت تک آسانی سے پہنچ سکیں اور دور بیٹھنے والوں کو تیز روشنی کے باعث جادوگروں کے کرتب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کو دیکھنے کا موقع ملے۔ اور مقابلے کا جو بھی نتیجہ نکلے اس میں کسی کو اشتباہ پیدا کرنے کا بہانہ ہاتھ نہ آئے۔ علاوہ ازیں لوگوں میں دلچسپی بلکہ شوق پیدا کرنے کیلئے اس تاثر کو پھیلانے کا اہتمام کیا گیا کہ یہ مقابلہ محض مقابلہ نہیں بلکہ اہلِ مصر کے آبائی دین اور فرعون کی ربوبیت اور اس کی عظمت کی عزت کا سوال ہے جسے دو آدمیوں نے چیلنج کیا ہے۔ اور ہمارے ملک بھر کے جادوگر اس عظیم خطرے کو روکنے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے جمع ہو رہے ہیں۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ان کا ساتھ دینے کیلئے اس موقع پر ضرور پہنچے۔ ہمارے جادوگروں کی کامیابی درحقیقت ہمارے دین کی بقاء اور فرعون کی عظمت و جلال کی سربلندی ہے۔ ایسے نازک موقع پر شریک ہو کر اپنے جذبات سے جادوگروں کو طاقت فراہم کرنا درحقیقت اپنا فرض انجام دینا ہے۔

Marfat.com

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾

(پس جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا، اگر ہم غالب رہے۔ ۴۱) فرعون نے کہا، ہاں۔ اور اس وقت تم مقربین میں سے ہو گے۔ ۴۲)

ساحروں کی طلب اور فرعون کی حوصلہ افزائی

ان آیات کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان اس مقابلے کو فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت حق و باطل کا معرکہ قرار دے چکے ہیں اور اسی حوالے سے ملک بھر میں جوش و جذبہ پیدا کر دیا گیا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آج ہماری روایات اور فرعون کی عزت و حرمت جادوگروں کے ہاتھ میں ہے۔ آج اگر انہوں نے میدان مار لیا تو مصر اور اہلِ مصر اور فرعون کی ربوبیت سربلند ہو جائے گی۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایسے نازک موقع پر وہ جادوگر جو فرعون اور مصر کی عزت و حرمت کے امین بن کر آئے ہیں اور جو پورے ملک میں فنِ ساحری کے امام ہیں، ان کی ذہنی سطح اور ان کی خودداری کا عالم یہ ہے کہ وہ عین میدانِ معرکہ میں فرعون سے صلے اور انعام کا مطالبہ کر رہے ہیں، گویا کہ ان کے نزدیک زندگی کا اصل ہدف مال و دولت اور شہرت و ناموری ہے۔ چنانچہ ان کی ذہنیت کے مطابق فرعون انہیں جواب دیتا ہے کہ ہاں، تمہیں صرف انعام ہی سے نوازا نہیں جائے گا بلکہ غالب آنے کی صورت میں تمہیں فرعون کے دربار میں عزت و افتخار کی کرسی بھی ملے گی، اور تمہیں اس کے مقربین میں شامل کر لیا جائے گا۔

قومیں جب دین سے دور ہوتیں اور اللہ تعالیٰ سے رشتہ توڑ لیتی ہیں اور طاغوت اور دولت کی پجاری بن کر زندگی کے مقاصد طے کرتی ہیں تو ان کی ذہنی سطح ایک مردار خور جانور اور کلبِ دنیا سے بلند نہیں ہوتی۔ جس طرح پیٹ بھرا ہوا کتا ہر وقت زبان لٹکائے اور زمین کو سونگھتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کہیں بوئے طعام آئے تو میں کھود کے نکال لوں۔ اور جس طرح مردار خور گدھ ہمیشہ مردار پر ہی اترتا ہے اسی طرح بندۂ درہم و دینار اور دنیوی عزت و افتخار کا پجاری جب بھی سوچتا ہے دنیا اور دولتِ دنیا کے بارے میں سوچتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے معرکے میں بھی اس کا ہدف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، یہی وہ لوگ ہیں جو ضمیر کی زندگی سے محروم، قومی غیرت و حمیت سے بیگانہ اور اولوالعزمی اور حوصلہ مندی سے تہی دامن ہوتے ہیں۔

دوسری طرف ہم حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو دیکھتے ہیں کہ زخارفِ دنیا سے ان کا دامن خالی ہے۔ قوت اور ہیبت سے کوئی رشتہ نہیں، کوئی ان کی پشت پناہی کرنے والا نہیں۔ ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جو انتہائی پسماندہ حکومتِ وقت کی معتوب اور غلامی کی ستم خوردہ ہے۔ بایں ہمہ ان کی ذات غیرت و حمیت کا سرچشمہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں، حکومتِ وقت کا طنطنہ انہیں مرعوب کرنے سے عاجز ہے، ان کی شخصیت اور جادوگروں کی شخصیت کا تقابل یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ حق اور سچ کہاں ہے اور سچے لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ اور وہ کون ہیں جن پر انسانیت فخر کرتی ہے۔ اور جن کی رہنمائی گرے پڑے انسانوں کو عزت و افتخار عطا کر سکتی ہے۔

Marfat.com

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ
وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔ ۴۳) انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے ناموسِ فرعون کی قسم ہم ہی غالب رہنے والے ہیں۔ ۴۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحر میدانِ مقابلہ میں

میدانِ مقابلہ میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحرانِ مصر کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم جو اپنا ہنر دکھانا چاہتے ہو، دکھاؤ۔ وہ اپنے ساتھ رسیاں اور لاٹھیاں لے کر آئے تھے وہ انہوں نے پانسہ کے تیروں کی طرح پھینکیں اور انہیں چونکہ اپنی مہارت پر ناز اور اپنی فتح کا یقین تھا اس لئے انہوں نے فرعون کی عزت یعنی اس کی ناموس اور جلال کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ آج ہم ہی غالب رہیں گے۔ اہلِ مصر چونکہ فرعون کو دیوتا سمجھتے تھے اس لئے ہر اہم کام کرنے سے پہلے اس کے نام کی قسم کھاتے تھے۔

جادوگروں نے جب اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو سورۃ الاعراف سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں کو جادو سے مسحور کر دیا اور سب دہشت زدہ ہو کے رہ گئے۔ اور سورۃ طٰہٰ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں محسوس ہوا کہ جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑی چلی آ رہی ہیں تو آپؑ کے دل میں بھی خدشہ سا محسوس ہوا۔ تب پروردگار نے فرمایا، مت ڈرو، بیشک تم ہی سربلند رہو گے، کیونکہ کبھی بھی کوئی جادو معجزے پر غالب نہیں آ سکتا۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾

(تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا، تو یکایک وہ نگلنے لگا جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا۔ ۴۵)

معجزے کی قاہری

جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کے مقابلے میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن کر پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں جو سانپوں کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں انہیں ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے جو سوانگ رچا رکھا تھا سب کو نگل گیا اور ہر چیز ختم ہو کر رہ گئی۔ البتہ یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ اژدھا نے ان رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل لیا تھا یا اس طلسم کو ختم کیا تھا جس کی وجہ سے یہ سب چیزیں سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ صورتحال کچھ بھی ہو یہ بات واضح ہے کہ ان کا جادو بے اثر ہو کر رہ گیا اور دیکھنے والے سمجھ گئے کہ عصائے موسیٰ کے مقابلے میں جادوگروں کی طلسم آرائی ناکام ہو گئی۔

Marfat.com

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾

(تو ساحر بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ ۴۶) بولے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔ ۴۷) موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ ۴۸)

ساحروں کا اعترافِ حق

مصر کے یہ عظیم جادوگر، جادوگری کے فن کی حدود کے شناسا تھے۔ وہ اپنی علمی مہارت کے باعث خوب سمجھتے تھے کہ جادو کی حقیقت کیا ہے اور یہ دیکھنے والوں کو کہاں تک مسحور کرسکتا اور کسی شے میں کہاں تک تبدیلی پیدا کرسکتا ہے۔ انہوں نے عصائے موسیٰ کو جس طرح اژدھا کی صورت میں دیکھا اور پھر جس طرح اس نے ان کے سحر وساحری کے سارے طلسم کو ختم کر کے رکھ دیا وہ اپنی ماہرانہ نگاہ سے سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں اور کسی انسان کے کمال میں وہ طاقت نہیں جس کا اظہار اس معجزے کی صورت میں ہوا ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً کوئی غیر معمولی قوت ہے اور وہ وہی ہے جسے موسیٰ اور ہارون رب العالمین کا نام دے رہے ہیں۔

اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لیتے اور اقتدار کی ناراضی کا خطرہ مول نہ لیتے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کا ضمیر مردہ نہیں ہوا تھا، ان کے اندر ابھی تک قبولیتِ حق کی رمق باقی تھی۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ کمزوریوں کے باوجود انسانیت سے تہی دامن نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے سوئے ہوئے ضمیر نے انگڑائی لی اور وہ حیران کن حد تک قبولیتِ حق کی منزلیں طے کرتے ہوئے اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہارِ حق کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سب سے پہلے عملی اظہار کیلئے سجدے میں گرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعتراف حقیقت میں سجدے ہی میں ہوتا ہے۔ اور پھر سر اٹھا کر انہوں نے ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ اور فرعون نے جس رب العالمین کا مذاق اڑایا تھا اسی پر اپنے ایمان لانے کا دعویٰ کیا۔ اور ہر طرح کے اشتباہات کو ختم کرنے کیلئے یہ بھی کہا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کسی دل میں ایمان اپنی آماجگاہ بناتا ہے تو اس میں روشنی کا کیسا سروسامان کر دیتا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾

(فرعون نے کہا تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں، ضرور یہ تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، تو تم عنقریب جان لوگے میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا۔ ۴۹)

فرعون کی سیاست کاری

ساحرانِ مصر کا اس طرح برملا ایمان کا اعلان کرنا اور اعترافِ حق میں سجدہ ریز ہو جانا، یہ ایسی بات تھی جس کے نتیجے میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہوسکتا تھا۔ ہر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوگا کہ جن لوگوں پر فرعون اور آلِ فرعون کی سچائی ثابت کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی ان کی طرف سے علیٰ رؤس الاشہاد فریقِ مخالف کی برتری اور سچائی اور اپنی شکست کا اعتراف کر لینے کے بعد اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جاتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس بات کی دعوت دے رہے ہیں وہی حق ہے۔ اور فرعون اور اس کے حمایتی سب باطل کے نمائندے ہیں۔

Marfat.com

لیکن فرعون کی ذہانت اور شیطنت نے فوراً اس صورتحال کو بدلنے کیلئے ایک راستہ نکالا۔ اس نے انہیں جادوگروں کو جن پر اس معرکے کے سر کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا وہ ایک سازش تھی، ملی بھگت تھی، ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے تم خود ایک کردار تھے۔ ورنہ ایک بالکل سیدھی سادی بات تھی کہ اگر تمہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک راست باز آدمی ہیں اور ان کی دعوت حق پر مبنی ہے تو تمہاری خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ تم مجھے اعتماد میں لیتے، تنہائی میں مجھ سے بات کرتے تو میں سوچ سمجھ کے اس کیلئے راستہ نکالتا۔ لیکن تم نے میری اجازت کے بغیر سب کچھ بطورِ خود کر ڈالا جو اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ فتح و شکست کا سارا ڈرامہ تمہاری ایک سازش ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیتِ کریمہ کے پہلے جملے کا ایک اور طرح سے ترجمہ کیا ہے، اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ وہ اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ فرعون نے کہا کہ تم تو اس وقت ایمان لا چکے تھے جبکہ میں نے تمہیں ابھی موسیٰ سے مقابلے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ یعنی یہ معرکہ تو بعد میں وجود میں آیا، تمہاری باہمی منصوبہ بندی تو اس سے پہلے طے ہو چکی تھی۔ تو وہ اجازت کا تعلق ان کے ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کے معرکہ میں اترنے سے جوڑتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں انجام کار بات ایک ہی رہتی ہے کہ تم نے جو کچھ کیا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا اور اس لئے کیا کہ فنِ ساحری میں یہ تمہارا استاد اور گرو ہے۔ اسی سے تم نے اس فن میں کمالات حاصل کئے اور اسی کی وجہ سے تم اس سازش میں شریک ہوئے ہو۔ اب میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو ملک کے باغیوں کو دی جاتی ہے، یعنی میں تمہارے بے ترتیب ہاتھ پاؤں کاٹوں گا اور پھر تمہاری رسوائی کیلئے تمہاری لاشیں سولیوں پر لٹکائی جائیں گی۔ یہ باغیوں جیسی سزا تمہیں اس لئے دی جائے گی کہ تم نے یہ ساری سازش اسی لئے تیار کی ہے تاکہ اس طرح سے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا جائے اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دھاک دلوں پر بٹھا دی جائے جس کے نتیجے میں لوگ ان کی نبوت پر ایمان لے آئیں اور ان کی ذات مرجعِ خلائق بن جائے۔ اس طرح سے تم ملک میں انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ یہ درحقیقت مملکت کے خلاف ایک سازش ہے اور اس کی سزا وہی ہونی چاہیے جو باغیوں کی ہوا کرتی ہے۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّـآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَـطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَـآ اَنْ كُنَّـآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

(انہوں نے جواب دیا کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۵۰) ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ۵۱)

ایمان کی حیرت انگیز قوت

حیرت ہوتی ہے کہ یہ جواب وہ لوگ دے رہے ہیں جو اس معرکے کے آغاز میں نہایت لجاجت سے فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کا مطالبہ کر رہے تھے، گویا کہ ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا ہدف درہم و دینار یا وہ عزت و شہرت تھی جو انہیں فرعون کے دربار سے مل سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی اسی ذہنیت اور حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے فرعون نے جب انہیں انتہائی دھمکی دی تو ایک دنیادار آدمی کیلئے اس سے بڑی دھمکی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس سے ہراساں ہوتے انہوں نے نہایت جرأت و استقامت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ تم جو چاہو کرو، ہمیں اس کی بالکل پرواہ نہیں بلکہ ہم تو اس شہادت سے خوش ہیں کیونکہ اس نتیجے میں ہم اپنے اللہ سے یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس معرکے میں جس طرح حق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی وہ ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ اگر اس شہادت کے

Marfat.com

بدلے میں ہمیں اس کی معافی مل جائے تو یہ ہمارے لئے ایک بہت بڑا انعام ہوگا۔ رہی یہ بات کہ تم ہم سے زندگی چھین رہے ہو تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، ہر شخص نے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ زندگی کتنے دن یا کتنے لمحے باقی ہے، سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کے جانے والے ہیں۔ تو اگر ہم اس اعزاز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں کہ اسی کے نام کی سربلندی اور اس کے رسولوں کی معاونت کے سلسلے میں ہمیں شہادت کا تاج عطا کر دیا جائے اور ہمیں قبائے گلگوں کا لباس پہنا دیا جائے تو اس سے بڑی ہماری سعادت اور کیا ہوگی۔ اور یہی وہ حقیقی زندگی ہے جو درحقیقت مومن کی معراج ہے کیونکہ زندگی صرف جینے کا نام نہیں بلکہ مقصد کیلئے مرنے کا نام بھی ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی

اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٥٢﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِیْنَ ﴿٥٣﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا
لَغَآئِظُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ
وَّعُیُوْنٍ ﴿٥٧﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿٥٨﴾ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ
اِسْرَآءِیْلَ ﴿٥٩﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ
اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ
سَیَهْدِیْنِ ﴿٦٢﴾ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ
فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴿٦٣﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ
الْاٰخَرِیْنَ ﴿٦٤﴾ وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ ﴿٦٥﴾ ثُمَّ
اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿٦٦﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِیْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿٦٨﴾

Marfat.com

رکوع: ۴۔ (اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، بیشک آپ کا تعاقب کیا جائے گا۔ ۵۲) پس فرعون نے شہروں میں (فوجیں جمع کرنے کیلئے) ہرکارے بھیجے۔ ۵۳) اور کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ مٹھی بھر ہیں۔ ۵۴) اور بیشک انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے۔ ۵۵) اور ہم ایک مستعد جمعیت ہیں۔ ۵۶) سو اس طرح ہم نے نکالا انہیں ان کے باغوں اور چشموں سے ۵۷) اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے۔ ۵۸) ہم اسی طرح کرتے ہیں، اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ ۵۹) پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت۔ ۶۰) پس جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے۔ ۶۱) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۶۲) پس ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی کی کہ اپنا عصا سمندر پر مارو، سمندر پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا۔ ۶۳) اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو۔ ۶۴) موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے، ہم نے نجات دی۔ ۶۵) اور پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۶۶) بیشک اس واقعہ میں بہت بڑی نشانی ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ ۶۷) اور بیشک آپ کا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۶۸)

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾

(اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، بیشک آپ کا تعاقب کیا جائے گا۔ ۵۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا دوسرا باب، آپؑ کی ہجرت

گزشتہ رکوع کا اختتام اس بات پر ہوا ہے کہ جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مقابلے میں جب جادو معجزے کے سامنے بری طرح ناکام ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے ہاتھ پر حق کو فتح عطا فرمائی تو فرعون نے لوگوں کو یہ تاثر دینے کیلئے کہ یہ باطل پر حق کی فتح نہیں بلکہ حضرت موسیٰ اور جادوگروں کے درمیان ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ جادوگروں کو ڈرایا دھمکایا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی دھمکیاں دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان پر حق کو روشن کر دیا تھا، وہ بے سروسامان اور کمزور ہوتے ہوئے بھی فرعون کے جاہ و جلال کے سامنے ڈٹ گئے اور حق کی علامت بن گئے۔ اب اس سرگزشت کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے اور درمیان میں قصے کے بہت سے اجزاء کو چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ قرآنِ کریم اپنی عادت و روایت کے مطابق کسی تاریخی واقعہ کے ان اجزاء کا ذکر کرتا ہے جو سلسلۂ کلام کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ جادوگروں کی ناکامی اور پھر ان کے ایمان لانے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق کی علامت اور اس کے پیغمبر بن کر تشریف لائے ہیں۔ حق و باطل کی اس کشمکش کے ایک حصے کو جادوگروں کی ناکامی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فتح کو حق و باطل کے درمیان کشمکش کے ایک باب کے طور پر مکمل کرنے کے بعد اب اس دوسرے رکوع سے حق و باطل میں کشمکش کی سرگزشت کے آخری باب کو بیان کرنے کی ابتداء کی جارہی ہے اور درمیان میں مصر میں رہتے ہوئے جتنے واقعات پیش آئے ہیں وہ قرآنِ کریم کی دوسری سورتوں میں بیان کیے گئے

Marfat.com

ہیں۔ یہاں چونکہ صرف حق و باطل کی کشمکش کو نمایاں کرنا مقصود ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں سے مقابلے اور پھر براہِ راست فرعون کی قوتوں سے تصادم کے نتیجے میں جس طرح فیصلہ کن کامیابی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی صرف اس کا ذکر کرنا پیشِ نظر ہے۔

یہ واضح رہے کہ جادوگروں سے مقابلے میں کامیابی کے بعد مصر میں رہتے ہوئے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں جن کا دوسری سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر واقعہ حق کی فتح کی علامت اور باطل کی شکست کا عنوان رکھتا ہے اور اس پوری سرگزشت میں ہم بار بار دیکھتے ہیں کہ باطل سرنگوں ہوتا اور ایمان کی امید دلا کر اس مصیبت سے نجات حاصل کرتا ہے لیکن پھر اپنے عہد سے منحرف ہو جاتا ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشوں میں فرعون اور اہلِ مصر اس حد تک بے بس ہو جاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات میں کہانی کا یہ دوسرا منظر بیان کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ آباد نہ تھی بلکہ ملک کے مختلف شہروں اور مختلف دیہات میں بٹی ہوئی تھی۔ البتہ مصر میں منف سے رعمسیس تک کے علاقے میں ان کی بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ اسی علاقے کو جشن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جیسے ہی فرعون کی طرف سے اجازت ملی کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جائیں تو آپؑ نے بنی اسرائیل کے تمام علاقوں میں ہدایات بھیج دیں۔ تاریخ مقرر کر دی گئی، رات کا وقت ٹھہرا اور ہر علاقے کے رہنے والوں کو اپنی علاقے سے نکل کر جس مخصوص جگہ پہنچنا تھا اس کا تعین کر دیا گیا۔ اور پھر سب کے کمانڈر مقرر کرنے کے بعد حکم دے دیا گیا کہ تمام گروہ ایک خاص جگہ تک پہنچ جائیں تاکہ وہاں سے بحرِ قلزم کا رخ کیا جائے اور یہ بھی پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا گیا تھا کہ فرعون نے اگرچہ آپؑ کو شہر سے نکلنے کی اجازت دے دی ہے لیکن وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہے گا، وہ آپؑ کے تعاقب کی کوشش کرے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ دن کے اجالے میں آپ کا تعاقب کرے، آپ رات ہی رات میں اس کی دسترس سے دور نکل جائیں۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓـؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾
وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

(پس فرعون نے شہروں میں (فوجیں جمع کرنے کیلئے) ہرکارے بھیجے۔ ۵۳) (اور کہلا بھیجا) کہ یہ لوگ مٹھی بھر ہیں۔ ۵۴) اور بیشک انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے۔ ۵۵) اور ہم ایک مستعد جمعیت ہیں۔ ۵۶)

لَشِرْذِمَةٌ ...... الجمع القليل المختصر ...... مختصر اور حقیر گروہ کو شرذمة کہتے ہیں۔ اس کی جمع الشراذم ہے۔

تعاقب کیلئے فرعون کی تدبیریں

چنانچہ فرعون نے سرداروں اور فوجیوں کو اکٹھا کرنے کیلئے مملکت کے تمام شہروں میں اپنے آدمی دوڑا دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جادوگروں کے مقابلے سے لے کر کئی سالوں کی کشمکش میں اہلِ مصر دیکھ چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پشت پر کوئی غیبی قوت ہے۔ اس وجہ سے فرعون اور اہلِ مصر دل میں آپ سے بہت خوفزدہ تھے۔ زیادہ ڈرنے والے شخص کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ڈینگیں زیادہ مارتا اور اپنے خوف کو چھپانے کیلئے بہ کثرت احتیاطی تدابیر عمل میں لاتا ہے۔ فرعون کا رویہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ ایک طرف وہ ملک بھر سے فوجیں طلب کر رہا تھا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو ایک مٹھی بھر جماعت قرار دے کر ان کا خوف بھی دلوں سے نکالنا چاہتا تھا۔ اور اس

Marfat.com

احساس کے ساتھ کہ کوئی شخص ہماری تیاریوں کو ہماری خوفزدگی پر محمول نہ کرے۔ اپنی تمام تر کاوشوں کو احتیاطی تدابیر اور اپنی چوکسی کی علامت قرار دیتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے لوگوں کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی بعض حرکتوں نے ہمیں بہت ناراض کر دیا ہے۔ اس لئے ہم ان کو ہرگز اس کا موقع نہیں دینا چاہتے کہ وہ ملک میں کوئی گڑبڑ پیدا کریں یا ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں۔ اگرچہ ان کی حیثیت ہماری فوجوں کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے، وہ مٹھی بھر اور حالات کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ اور ہم ان کے مقابلے ایک بہت بڑی جمعیت اور ایک بڑی قوت کے مالک ہیں، ہمارے لئے فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔ تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ چیونٹی کو بھی کاٹنے کا موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح سے اس نے ملک بھر سے اپنی فوجیں اور اپنے قابلِ ذکر جرنیل مصر میں طلب کر لئے۔

فَاَخۡرَجۡنٰـھُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ ﴿۵۷﴾ وَّکُنُوۡزٍ وَّمَقَامٍ کَرِیۡمٍ ﴿۵۸﴾
کَذٰلِکَ ؕ وَاَوۡرَثۡنٰھَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۵۹﴾

(سو اس طرح ہم نے نکالا انہیں ان کے باغوں اور چشموں سے ۵۷) اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے۔ ۵۸)
(ہم اسی طرح کرتے ہیں، اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ ۵۹)

مفسرین کا اختلاف اور آیت کا مفہوم

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے انہی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کا مفہوم لازماً یہ ہونا چاہئے کہ فرعون کے غرق ہو جانے پر بنی اسرائیل پھر مصر واپس پہنچ گئے ہوں اور آل فرعون کی دولت وحشمت ان کے قبضے میں آ گئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآن مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اس آیت کا یہ مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔ سورۃ المائدہ، سورۃ الاعراف اور سورۃ طٰہٰ میں جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کی بجائے اپنی منزل مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے (۱۰۱۳،۹۷۳ ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہ سب اس علاقے میں پیش آئے جو آج جزیرہ نمائے سینا، شمالی عرب، شرق اردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ اور چشمے اور خزانے اور محلات بنی اسرائیل کو بخش دیئے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور امراء نکالے گئے تھے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آل فرعون کو ان نعمتوں سے محروم کیا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرما دیں، یعنی وہ فلسطین کی سرزمین میں باغوں، چشموں، خزانوں اور عمدہ قیام گاہوں کے مالک ہوئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورۃ الاعراف کی یہ آیت کرتی ہے۔ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡھُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰھُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّھُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوۡا عَنۡھَا غٰفِلِیۡنَ ۝ وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ مَشَارِقَ الۡاَرۡضِ وَمَغَارِبَھَا الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡھَا (آیات ۱۳۶، ۱۳۷) ''تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان

Marfat.com

سے بے پرواہ ہو گئے تھے اور ان کی بجائے ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے اس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا'' یہ برکتوں سے مالا مال سرزمین کا استعارہ قرآن مجید میں عموماً فلسطین ہی کیلئے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقے کا نام لئے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ۔ اور سورۃ انبیاء میں ارشاد ہوا وَنَجَّیْنٰہُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا لِلْعٰلَمِیْنَ O اور وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَۃً تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا۔ اسی طرح سورۃ سبا میں بھی اَلْقُرَی الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا کے الفاظ سرزمینِ شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

فَاَتْبَعُوْھُمْ مُّشْرِقِیْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ﴿۶۲﴾

(پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت۔ ۶۰) پس جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے۔ ۶۱) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۶۲)

قوم کی کمزوری اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتماد علی اللہ

صبح ہوتے ہی فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا، حتیٰ کہ بحر قلزم کے کنارے بنی اسرائیل کے قریب پہنچ گئے۔ جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، بنی اسرائیل حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سامنے سمندر کی موجیں اٹھ رہی ہیں اور پیچھے فرعون کی فوجیں چڑھی چلی آ رہی ہیں۔ سراسیمہ ہو کر کہنے لگے، ہم تو پکڑے گئے، اب کیا ہوگا؟ تورات میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ کیا مصر میں ہمارے دفن ہونے کیلئے جگہ نہیں تھی کہ تم نے یہاں لا کر ہمیں مروانے کا سامان کیا۔ ایسے ہی موقعوں پر نبوت کی شان ظاہر ہوتی ہے اور ان کے رویئے سے معلوم ہوتا ہے کہ توکل علی اللہ کسے کہتے ہیں۔ حالات اگرچہ حوصلہ شکن ہیں، سامنے بحر بیکراں ہے جس کی موجیں موت کا پیغام دے رہی ہیں اور پیچھے فرعون کی فوجیں ہیں جو غیظ و غضب کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ ان حوصلہ شکن حالات کا اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر پڑا ہو۔ آپؑ نے پورے جلال سے فرمایا، کَلَّا، ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی ذلیل نہیں ہونے دیتا۔ اس نے جو ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ تمہیں ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ تورات میں یہ ماجرا اس طرح بیان ہوا ہے۔

''جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیئے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا...... اور مصری فوج نے فرعون کے سب گھوڑوں اور رتھوں اور سواروں سمیت ان کا پیچھا کیا...... اور جب فرعون نزدیک آ گیا تب بنی اسرائیل نے

Marfat.com

آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ مصری ان کا پیچھا کئے چلے آتے ہیں اور وہ نہایت خوفزدہ ہو گئے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی۔ اور موسیٰ سے کہنے لگے کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تو ہم کو وہاں سے مرنے کیلئے بیابان میں لے آیا ہے؟......
تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا ڈرو مت، چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام کو دیکھو جو وہ آج تمہارے لئے کرے گا کیونکہ جن مصریوں کو تم آج دیکھتے ہو ان کو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے۔" (خروج: باب ۱۴: ۵۔۱۴)

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾

(پس ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی کی کہ اپنا عصا سمندر پر مارو، سمندر پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا۔ ۶۳) اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو۔ ۶۴) موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے، ہم نے نجات دی۔ ۶۵) اور پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۶۶)

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ

بنی اسرائیل کی گھبراہٹ اور چیخ و پکار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتماد علی اللہ کا اظہار کرتے ہوئے محکم لہجے اور حتمی یقین کے ساتھ اپنی قوم سے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تمہیں لے کر آیا ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ بحرِ قلزم ہمارا راستہ روک سکے۔ چنانچہ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم اپنے عصا کی ایک ضرب سمندر پر لگاؤ۔ ضرب پڑنے کی دیر تھی، سمندر کی اچھلتی اور شور مچاتی موجوں پر سکتہ طاری ہو گیا، جیسے کسی نے سرکش گھوڑے کے منہ میں لگام دے دی ہو۔ سمندر میں شگاف پڑ گیا اور پانی کی لہریں بلند و بالا پہاڑوں کی طرح جامد و ساکت دونوں طرف کھڑی ہو گئیں۔ قرآنِ کریم نے دونوں طرف کے رکے ہوئے پانی کو بڑے پہاڑ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ "طود" پہاڑ کو کہتے ہیں۔ دونوں طرف پانی کے رک جانے کے باعث جو راستہ بنا وہ چند لمحے پہلے پانی کی گزرگاہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ تیز ہواؤں نے لمحوں میں اسے خشک کر کے چلنے کے قابل بنا دیا اور مزید یہ کہ راستے کو اتنا کشادہ کر دیا گیا جس سے ہزاروں آدمی گزر سکتے تھے۔

بعض لوگوں نے اس عظیم واقعہ کو مدوجزر کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ بعض دفعہ طوفانی ہوائیں سمندر کے پانی کو پھاڑ دیتی ہیں۔ چاند اور زمین کی کشش اپنا اپنا کام کرتی ہیں اور بعض دفعہ اس کے نتیجے میں پانی پھٹ جاتا ہے اور زمین دکھائی دینے لگتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ زمین ایک لمحے کو پھٹی اور پانی نیچے اتر گیا اور دریا کا بہاؤ رک گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے ویسے ہی پوری تیزی سے بہنے لگا۔ ان کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ایسا یہاں کوئی واقعہ پیش آیا ہو جس سے بنی اسرائیل پار اتر گئے اور فرعونی ڈوب گئے۔ لیکن ایسے بعید از عقل مفروضے صرف وہی شخص باندھ سکتا ہے جس نے یہ بات طے کر لی ہو کہ مجھے بہر صورت معجزے کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا ہے ورنہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ سمندر کے پانی کا عصائے موسیٰ کی ضرب سے اس طرح دو حصوں میں تقسیم ہو جانا کہ دونوں طرف کا رکا ہوا پانی پہاڑوں

Marfat.com

کی مانند استادہ ہو اور کوئی لہر بھی اس کی اچھل کر آگے نکلنے کو تیار نہ ہو۔ اور پھر یہ دونوں طرف کے پہاڑ گھنٹوں اس طرح کھڑے رہیں کہ پہلے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیل گزریں اور پھر انہیں کے نقوش قدم پر ہزاروں کی تعداد میں فرعون کی فوج اپنی گھوڑوں پر سوار بار برداری کے جانوروں سمیت سمندر میں اتر جائے تو تب عصائے موسیٰ کی دوسری ضرب پانی کو ملا دے۔ اور وہی خاموش موجیں جو پہاڑوں کی صورت میں کھڑی تھیں گرجتی ہوئی حرکت میں آئیں اور چشم زدن میں تمام فرعونیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کے لے جائیں۔ کیا دنیا میں جب تک کی ہمیں تاریخ معلوم ہے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہوا ہے کہ مدوجزر کے نتیجے میں پانی گھنٹوں رکا رہے بلکہ کسی عظیم شخصیت کے اشارے پر رکے اور اشارے پر بہنے لگے اور درمیان میں خشک راستے نکل آئیں۔ قرآن کریم نے اس بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اور پہلی آسمانی کتابیں جو کچھ کہتی ہیں انہیں ایک طرف بھی رکھ دیا جائے تو بجائے خود سمندر کی عملی شہادت صریحاً یہ بات بتانے کیلئے کافی ہے کہ یہ ایک معجزے کا بیان ہے، عام قوانینِ فطرت کی کارفرمائی نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے یعنی بنی اسرائیل کو ان کے ایمان اور پیغمبر کی معیت کی برکت سے سمندر سے نجات دی اور فرعونیوں کے ظلم سے آزادی بخشی، لیکن وہ لوگ جو کل تک ظلم کی برہنہ تلوار تھے اور جنہیں اپنی بے اماں قوت کے مقابلے میں کوئی دکھائی نہ دیتا تھا، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے معجزات دیکھ کر بھی راہِ راست اختیار کرنے پر تیار نہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں غرق کر دیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٦٨﴾

(بیشک اس واقعہ میں بہت بڑی نشانی ہے مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ ٦٧)
اور بیشک آپ کا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ٦٨)

ترجیع کی آیت اور اس کا مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے آخر میں یہ آیتِ کریمہ وہی ہے جو اس کے بعد آنے والے ہر پیغمبر کی سرگزشت کے بعد آٹھ بار وارد ہوئی ہے۔ اس آیت کو ترجیع کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش آنحضرت ﷺ سے بار بار آپ کی حقانیت اور آپ کے دین کی صداقت پر کوئی نشانی مانگتے تھے۔ انہیں بار بار ہر پیغمبر کی سرگزشت کے بعد یہ آیت لا کر بتایا گیا ہے کہ تمہیں نشانی کو دیکھنے کی خواہش ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی نشانی ہو سکتی ہے کہ ایک نہایت جابر و قاہر حکمران کے سامنے نہایت بے سروسامانی کے ساتھ دو پیغمبر اللہ تعالیٰ کا دین لے کر پہنچتے ہیں اور اسے ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اور پھر ان کے مطالبے پر قدم قدم پر انہیں معجزے دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک ایک معجزہ ان پیغمبروں کی حقانیت کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ لیکن ان کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوئی ہے کہ سالہا سال تک نشانیاں دیکھ کر بھی وہ راہِ راست اختیار نہیں کرتے، حتیٰ کہ سمندر ان کے سامنے عصائے موسیٰ کی ایک ضرب سے پھٹ گیا اور پانی پہاڑوں کی مانند دونوں طرف کھڑا ہو گیا اور بیچ میں خشک اور کشادہ راستہ بن گیا۔ ایسی صریح علامتیں دیکھ کر بھی ان لوگوں کو ہوش نہ آیا حتیٰ کہ وہ اپنے کفر اور سرکشی سمیت پانی کی موجوں کے حوالے ہو گئے اور ان کا عبرتناک انجام آج تک دنیا کیلئے ایک مثال بنا ہوا ہے۔ لیکن ان کیلئے کوئی نشانی بھی راہِ ہدایت کا نشان نہ بن سکی۔ فرعون اس وقت ہدایت کی طرف آیا جبکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور چیختا ہوا کہنے لگا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (یونس: آیت ٩٠)

Marfat.com

قریش اور دیگر اہلِ مکہ کیلئے اس میں یہ نشانی ہے کہ ہٹ دھرمی اختیار کرنے والے ہمیشہ ہدایت کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

اور دوسری نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر کا انکار کرنے والوں کو فوراً نہیں پکڑتا، مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے اور اس وقت پکڑتا ہے جب اتمامِ حجت ہو جاتا اور مہلت کا وقت تمام ہو جاتا ہے۔ اور ایسا وہ اس لئے کرتا ہے کیونکہ وہ رحیم ہے اس لئے وہ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔

تیسری نشانی یہ ہے کہ جب وہ پکڑنے پر آتا ہے تو بڑی سے بڑی قوت بھی اس کے سامنے تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ فرعون اور آلِ فرعون اپنی تمام قہرمانی قوتوں کے باوجود اس کی پکڑ سے بچ نہ سکے اور بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہو گئے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ
اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ
اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ
تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا
كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَ
اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾
الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾
وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۸۲﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ
حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي
الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ
اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا

Marfat.com

يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ
الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا
كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾
فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا
وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ
نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا
مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

رکوع: ۵۔ (اور اے پیغمبر، انہیں حضرت ابراہیم کا قصہ سنایئے۔ ۶۹) جبکہ انہوں نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے کہا، تم کس کی پرستش کرتے ہو۔ ۷۰) انہوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے۔ ۷۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو۔ ۷۲) یا وہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں یا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ ۷۳) انہوں نے جواب دیا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ ۷۴) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کی تم پرستش کیا کرتے ہو۔ ۷۵) تم بھی اور تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد بھی۔ ۷۶) یہ سب میرے تو دشمن ہیں بجز اللہ رب العالمین کے۔ ۷۷) (جس نے مجھے پیدا فرمایا، پھر وہ میری رہنمائی کرتا ہے۔ ۷۸) اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ ۷۹) اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ ۸۰) اور جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا۔ ۸۱) اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔ ۸۲) (اے میرے رب! مجھے قوت فیصلہ عطا فرما اور مجھ کو صالحین کے ساتھ ملا۔ ۸۳) اور بعد کے آنے والوں میں مجھے سچی ناموری عطا فرما۔ ۸۴) (اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں شامل فرما۔ ۸۵) اور میرے باپ کو معاف فرما دے، بیشک وہ گمراہوں میں

Marfat.com

سے ہے۔ ۸۶) اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ۸۷) (جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ ۸۸) بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔ ۸۹) (اور جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی۔ ۹۰) اور دوزخ گمراہوں کیلئے بے نقاب کی جائے گی۔ ۹۱) (اور ان سے کہا جائے گا کہ اب کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کرتے تھے۔ ۹۲) اللہ کے سوا، کیا وہ تمہاری مدد کریں گے یا اپنا بچاؤ کریں گے؟ ۹۳) (پھر وہ اس میں اوندھے جھونک دیئے جائیں گے وہ بھی اور دوسرے سارے گمراہ بھی۔ ۹۴) اور ابلیس کی ساری فوجیں بھی۔ ۹۵) (وہ اہل جہنم آپس میں جھگڑتے ہوئے کہیں گے۔ ۹۶) خدا کی قسم، ہم کھلی گمراہی میں گرفتار تھے۔ ۹۷) جبکہ تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے۔ ۹۸) اور نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر ان مجرموں نے۔ ۹۹) (تو نہ اب کوئی ہمارا سفارشی ہے۔ ۱۰۰) اور نہ کوئی غمخوار دوست۔ ۱۰۱) پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا دنیا میں واپس جانا تو ہم اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔ ۱۰۲) (یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۰۳) اور بیشک آپ کا رب سب پر غالب اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۴)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾

(اور اے پیغمبر، انہیں حضرت ابراہیم کا قصہ سنایئے۔ ۶۹) جبکہ انہوں نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے کہا تم کس کی پرستش کرتے ہو۔ ۷۰) انہوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے۔ ۷۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت سے متعلق چند اہم امور اور دعوت کا آغاز

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے۔ آپؑ کی سرگزشت قرآنِ کریم میں مختلف مواقع پر حسبِ ضرورت بیان کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ انسانی ہدایت کیلئے نازل ہوئی ہے اس لئے جس سرگزشت کا جتنا حصہ کسی موضوع کو بیان کرتے ہوئے ضروری ہوتا ہے اتنا ہی بیان کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر رسولانِ گرامی کے حالات ایک سے زیادہ جگہوں پر موقع کی مطابقت سے بطورِ استشہاد ذکر فرمائے گئے ہیں۔ یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کا وہ حصہ بیان کیا جارہا ہے جب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپؑ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ آپؑ کیلئے ہجرت ناگزیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہجرت کے سفر سے پہلے آپؑ کی اپنے والد افرادِ خاندان سے غالباً جو آخری گفتگو ہوئی ہے وہاں سے اس سرگزشت کا آغاز کیا جارہا ہے۔

قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت و کردار کو بہت نمایاں حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ بالعموم اور قریش بالخصوص اپنے آپ کو حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیرو سمجھتے تھے۔ اور قریش کو تو آپؑ کی اولاد ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اور آپؑ ہی کی وجہ سے قریش کعبہ کے متولی تھے اور ملک بھر میں بڑی عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ اور انہیں ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ اسی طرح یہود و

Marfat.com

نصاریٰ بھی آپؑ کو اپنے دین کا پیشوا سمجھتے تھے۔اس لئے قرآنِ کریم نے یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے کہیں الگ الگ اور کہیں ایک ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ان کے خیالات پر تنقید کی ہے۔مشرکینِ عرب سے بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ تم نے شرک کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور اپنی علامت بنا رکھا ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی ملت پر ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے مشرک نہ تھے بلکہ ان کی ساری لڑائی ہی شرک کے خلاف تھی۔ اور اسی لڑائی کی بدولت انہیں اپنے باپ، خاندان، وطن سب کچھ چھوڑ کر شام و فلسطین اور حجاز میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔

یہود ونصاریٰ سے بھی بار بار کہا گیا ہے کہ تم بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیرو کہتے ہو جبکہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ کیونکہ ان کا زمانہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے۔اس لئے تمہیں یہ سوچنا چاہئے کہ جن مخصوص عقائد و اعمال پر تم لوگ اپنے دین کا مدار رکھتے ہو وہ اس دینِ قدیم کے اجزاء نہیں ہیں جو ابتداء سے چلا آرہا ہے اور جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گھر اور شہر چھوڑنے سے پہلے اپنے والد اور اپنی قوم سے جو گفتگو کی اس میں آپؑ نے ان سے پوچھا کہ تم جن چیزوں کی عبادت کرتے ہو ان کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ یہ تو آپؑ جانتے تھے کہ وہ لوگ بت پرستی کرتے ہیں۔ ''مَا'' کا لفظ کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے آتا ہے، اس سے محض سوال مقصود نہیں ہوتا۔اس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منشاء یہ تھا کہ آپؑ ان لوگوں کو ان کے معبودوں کی حقیقت کی طرف متوجہ کریں شاید وہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ہم انسان ہونے کی حیثیت سے اشرف المخلوقات ہیں لیکن ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے خداؤں کو پوجتے ہیں۔اس سے بڑھ کر شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

قومیں جب بگڑتی ہیں تو صرف ان کے اعمال ہی میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے افکار میں بھی بگاڑ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہاء درجہ کی عصبیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ غور و فکر سے محروم ہو جاتے ہیں اور اپنی غلط سے غلط بات کو بھی صحیح اور حق سمجھ کر اس طرح اڑ جاتے ہیں کہ اس سے مختلف بات کی طرف توجہ کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا۔چنانچہ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ جنہیں ہم پوجتے ہیں، وہ بت ہیں۔لیکن ہم برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے۔تم کتنا ہی زور لگا لو ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔یہی وہ حمیتِ جاہلی ہے جو عقل و شعور کیلئے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو۔ ۷۲) یا وہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں یا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ ۷۳) انہوں نے جواب دیا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ ۷۴)

دعوت ایک قدم آگے اور مخالفین کا جواب

لوگوں کی حمیتِ جاہلی کو دیکھتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بات کو آگے بڑھایا کہ تمہاری اپنی جاہلیت پر استقامت اپنی جگہ، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتا، البتہ یہ تو بتائیے کہ جب تم اپنے ان مصنوعی خداؤں کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری بات سنتے ہیں۔ سننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جواب دیتے ہیں اور جو کچھ تم ان سے مانگتے ہو، کیا وہ تمہاری طلب کو پورا کرتے ہیں اور تمہاری دعائیں ان کے یہاں بازیاب ہوتی ہیں اور کیا وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں کیونکہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص کسی کے سامنے سر جھکائے، اس

Marfat.com

سے دعائیں مانگے، اس سے استمداد کرے اور وہ جواب دینے پر بھی قادر نہ ہو، اور یہ پھر بھی اس کی عظمت کے گن گاتا رہے۔ اس کی قدرت وہیبت کو اپنی دل میں بسائے رکھے۔ اگر یہ تمہارے معبود نہ سنتے ہیں، نہ بولتے ہیں، نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان دے سکتے ہیں تو پھر وہ معبود کیسے ہیں، تمہیں تو یقیناً کوئی بڑی غلطی لگی ہے۔ اس کے جواب میں ان کے مخاطب لوگوں نے کہا کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ نفع نقصان دینے پر قادر نہیں۔ نہ وہ ہماری مناجاتیں سنتے ہیں اور نہ ہماری فریادیں سنتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی پوجا پاٹ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤاجداد یہی کچھ کرتے رہے ہیں اور یہ کام صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر اس کام کی کوئی حقیقت نہ ہوتی اور دینی نقطۂ نگاہ سے اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو ہمارے آباؤاجداد کیا پاگل تھے کہ وہ اس بیکار کام کو جاری رکھتے۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی حقیقت کارفرما ہے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل اور ہمارے تصورات سے ماوراء ہے۔

دنیا میں آباؤاجداد کا طرزِ عمل اور ان کی فکری وراثت ہمیشہ ایک بہت بڑی قوت رہی ہے۔ بعد کے آنے والے لوگ جب فکری جمود کا شکار ہوتے ہیں تو وہ اپنے باپ دادا اور یا ماضی کے بزرگوں کا ہمیشہ سہارا لیتے ہیں۔ نہ جانے یہ جہالت کب پیدا ہوئی ہے کہ غلطی صرف اس سے ہوسکتی ہے جو زندہ ہے، اور جو مر چکا ہے وہ غلطیوں سے پاک تھا اور اس کے افکار و اعمال بعد والوں کیلئے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتے ہیں حالانکہ جو آج زندہ ہے وہ ایک وقت کے بعد ماضی کا حصہ ہوجائے گا۔ اور جو لوگ آباؤاجداد میں شامل ہوگئے ہیں وہ چند سال پہلے زندہ تھے۔ جس طرح آج کے زندہ لوگ غلطیاں کرتے اور ٹھوکریں کھاتے ہیں، یہی حال ان کا بھی تھا۔ تو صرف آنکھوں سے اوجھل ہوجانے کے باعث ہم نے ان کے سر پر معصومیت کا تاج سجا دیا ہے اور ان کی ہر بات بعد کے آنے والوں کیلئے حجت بن گئی ہے۔

زندہ قومیں ہمیشہ علم کے سہارے زندہ رہتی اور ہدایت کے راستے منزل تک پہنچتی ہیں۔ وہ معقول اور محسوس معاملات کو عقل کے پیمانے سے ناپتی اور اخلاقی، روحانی اور دینی معاملات کو وحیِ الٰہی کی روشنی میں دیکھتی ہیں۔ یہی ان کیلئے رہنمائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور ان کا یہی طریقہ ہمیشہ انہیں ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رکھتا ہے۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٥﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿٧٦﴾
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾

(حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کی تم پرستش کیا کرتے ہو۔ ۷۵) تم بھی اور تمہارے گزشتہ آباؤاجداد بھی۔ ۷۶) یہ سب میرے تو دشمن ہیں بجز اللہ رب العالمین کے۔ ۷۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ براءت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تمہاری ہر بات کسوٹی پر، پرکھی جاتی ہے، اسی طرح تمہارے آباؤاجداد بھی نقد و جرح سے گزرتے ہیں۔ سب کیلئے رہنمائی غور و فکر میں ہے۔ کسی بھی بات کی صداقت کیلئے یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ باپ دادا کے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ مکھی پر مکھی مارتے چلے جانا، باشعور زندہ قوموں کا شیوہ نہیں۔ علم اور ہدایت نے انسانوں کے ہاتھوں میں چند پیمانے دیئے ہیں، ان کی روشنی میں غور و فکر کرنے سے صحیح بات سامنے آسکتی ہے اور غلط بات کی غلطی واضح ہوسکتی ہے۔ کسی کو معبود بنانا ایک بہت بڑی بات ہے۔ اسی ایک سوال کے جواب پر ساری زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے تم نے جن کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور تمہارے آباؤاجداد بھی جن

Marfat.com

کی پوجا کرتے رہے ہیں تو کیا تم سب لوگوں نے اس بنیادی بات کے ماله وما علیه پر غور کر لیا ہے۔ اور جن کی تم پوجا کر رہے ہو، کیا واقعی ان کے اندر خدائی کی کوئی صفت پائی جاتی ہے۔ اور کیا وہ فی الحقیقت ہماری قسمیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، تم نے ان باتوں پر کبھی غور نہیں کیا۔ میں اچھی طرح اس پر غور وفکر کر چکا ہوں، میرے غور وفکر کا حاصل یہ ہے کہ تم اللہ رب العالمین کے سوا جن کی پرستش کرتے ہو، وہ سب میرے دشمن ہیں۔ کیونکہ یہ شیطان کے ایجاد کئے ہوئے پھندے ہیں اور شیطان بنی نوع انسان کا دشمنِ ازلی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں ان کی پرستش کروں تو میری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ میری انسانیت کا سرمایہ نذرِ آتش ہو جائے گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ پتھروں کے سامنے جھک کر میری عظمت خاک میں مل جاتی ہے اور میری حیثیت کا جنازہ نکل جاتا ہے، میرے اخلاق کی دنیا تہ وبالا ہو کر رہ جاتی ہے، میرے احساسات سمٹ کر رہ جاتے ہیں، میری اولوالعزمیاں دم توڑ جاتی ہیں۔ اس لئے میں بت پرستی اور غیر اللہ کی پوجا کو انسانیت کیلئے سب سے زیادہ تباہ کن سمجھتا ہوں۔ صرف ایک اللہ رب العالمین ہے جس کی بندگی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے۔ اور جس کی عبادت میرے نزدیک ایک دشمن کی نہیں بلکہ اپنے اصل مربی کی عبادت ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿٧٩﴾
وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿٨١﴾
وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿٨٢﴾

(جس نے مجھے پیدا فرمایا، پھر وہ میری رہنمائی کرتا ہے۔ ۷۸) اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ ۷۹) اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ ۸۰) اور جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا۔ ۸۱) اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔ ۸۲)

ربِ حقیقی کی چند صفات

رب العالمین میری پرستش اور بندگی کا اس لئے مستحق ہے کہ اس نے مجھے پیدا کیا ہے اور مخالف اور موافق سب جانتے ہیں کہ اس کے تخلیقی عمل میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں، لیکن سب سے پہلا اور بڑا احسان انسان کو پیدا کرنا ہے کیونکہ باقی سارے مراحل اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس ذات نے انسان کو تخلیق کیا ہے اس سے ہٹ کر اس کی بندگی اور پرستش کا اور کون حقدار ہو سکتا ہے۔

رب العالمین کے معبود و مسجود ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے انسان کو ہمہ نوع اور ہمہ جہت قسم کی رہنمائی بھی عطا فرمائی ہے۔ انسان جب ایک خوبصورت بچے کی شکل میں دنیا میں آتا ہے تو وجدان کے ذریعے اس کی رہنمائی کی جاتی ہے، پھر حواس کا دیا جلایا جاتا ہے، پھر ضرورت پڑنے پر عقل کا فانوس روشن کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے انسان جزئیات سے کلیات اور محسوسات سے معقولات تک کا سفر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پھر اس کا مزید احسان یہ ہے کہ اس نے جس طرح انسان کی تمام مادی ضروریات کا اہتمام فرمایا، اسی طرح اس کی روحانی ضرورت کا بھی اہتمام فرمایا۔ اور اس کی ہدایت کیلئے نبوت و رسالت کا انتظام کیا۔ ایسی ذات کے مقابلے میں کسی اور کے سامنے سر جھکانا اور پرستش کے آداب بجالانا اپنی دشمنی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

صرف ایک اللہ کو مستحقِ عبادت ماننے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح اس نے مجھے تخلیق فرمایا، پھر میری رہنمائی کا سامان کیا، اسی طرح میری زندگی کی بقا کیلئے اس نے نہ صرف امکانات پیدا فرمائے بلکہ ہر طرح کی غذائی ضرورتوں کو بہم پہنچایا۔ میں بچہ تھا تو اس نے ماں کے سینے میں میری غذا کا سامان کیا، میری ماں کے دل میں ماں کے دیپ جلایا، جس نے دکھ اٹھا اٹھا کر میری پرورش و پرداخت کا انتظام کیا، میرے باپ کے دل میں شفقت کا بے کنار سمندر پیدا کر دیا جس کی وجہ سے اس کے کندھے میری ضرورتوں کیلئے جھک گئے، میرا معدہ جب تک کمزور تھا تو ماں کے دودھ میں مائیت کا عنصر زیادہ رکھا اور دہنیت کا کم۔ اور جب معدہ مضبوط ہو گیا تو دودھ کو گاڑھا کر دیا گیا، پھر حواس اور عقل کے ذریعے مجھے غذائی ضرورتیں حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا گیا۔ اور زندگی کے ساتھ ساتھ میری رہنمائی اور میری ضروریات عہد بعہد بدلتی چلی گئیں اور ہر موقع پر حالات کے مطابق میرے لئے اسباب فراہم کئے گئے۔ اگر وہ میرا رب میرا یہ سامانِ تربیت نہ کرتا اور اس کی ربوبیت کا فیضان زندگی بھر میرا معاون نہ رہتا تو میں زندگی تو کیا گزارتا، ایک دن کیلئے بھی زندہ نہ رہتا۔

صرف اللہ رب العالمین کے مسجود و معبود ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ اپنے فضل و رحمت سے مجھے شفا بخشتا ہے۔ اس نے میرے جسم میں ایسے خواص پیدا کر دیئے ہیں جو مضر اشیاء سے بچنے اور حیات بخش چیزوں کی طرف لپکنے پر مجبور کرتے ہیں، میری کھال میں ایسی قوتِ مدافعت رکھی ہے کہ معمولی سی چبھن بھی اسے محسوس ہوتی اور خود بخود بچاؤ کا سامان ہو جاتا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی زخم ہو جاتا ہے تو خود جسم کے اندر اندمال کی صلاحیت رکھی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ علاج کی بے شمار سہولتیں اور جڑی بوٹیوں کی شکل میں دواؤں کا ایک جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور ایسی عقل عطا کی گئی ہے جو مرض کو بھی پہچانتی ہے اور علاج کو بھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جسم اور اس کی غذا، بیماری اور اس کی مدافعت، مرض اور اس کے علاج اور ادویہ اور جسمانی کیفیت میں ایسی مناسبت رکھی گئی ہے جس کے نتیجے میں اخذ و رد اور تشخیص و تجویز کے تمام مراحل بحُسن و خوبی انجام پاتے ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصار میں اور اس کی شفابخشی کے سائے میں زندگی گزارتا ہے۔

وہی رب العالمین میری ہر طرح کی بندگی کا مستحق ہے، جس نے مجھے زندگی کی نعمت بخشی، اور پھر ایک دن مجھے موت دے گا اور پھر لازماً اس کے بعد ایک دن زندہ بھی کرے گا۔ جب اس نے مجھے پیدا کیا تو اس میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، تو اب دوبارہ زندہ کر دینے میں کیوں مشکل پیش آئے گی؟ اس نے زندگی میں ربوبیت کے جن فیوض سے مجھے نوازا اور میری ہدایت کے جیسے جیسے سامان کئے، عدل اور عقل کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دن ایسا لائے جب وہ مجھ سے ان تمام احسانات کا حساب مانگے اور وہ مجھ سے پوچھے کہ میں نے ان تمام احسانات کا شکر ادا کیا، یا ناشکری پر کمر باندھے رکھی اور آخر میں فرمایا کہ جب وہ آخری دن آئے گا جس کی حیثیت روزِ جزا کی ہے تو میں امید رکھتا ہوں، کیونکہ یہی امید ایک مومن کا اصل سہارا ہے کہ وہ میری خطائیں بخش دے گا اور میری مغفرت فرمائے گا۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾

(اے میرے رب! مجھے قوتِ فیصلہ عطا فرما اور مجھ کو صالحین کے ساتھ ملا۔ ۸۳) اور بعد کے آنے والوں میں مجھے سچی ناموری عطا فرما۔ ۸۴)

Marfat.com

ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا

معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے یہ دعا اعلانِ براءت اور ہجرت کے وقت فرمائی ہے۔ یہاں حکم سے مراد نبوت نہیں جبکہ قرآنِ کریم میں کئی مواقع پر اس معنی میں یہ لفظ استعمال ہو چکا ہے۔ کیونکہ جب آپؑ نے یہ دعا فرمائی ہے اس وقت آپؑ کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ اگر بالفرض یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ دعا نبوت سے پہلے کی ہے تو تب بھی ہمیں ایسی کوئی مثال اللہ تعالیٰ کے عظیم بندوں میں نہیں ملتی کہ انہوں نے کبھی نبوت کیلئے دعا کی ہو۔ یہ تو ایک وہبی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور پھر یہ ایک ایسی کٹھن ذمہ داری ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی چاہت سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہاں حکم سے مراد علم وحکمت، فہمِ صحیح اور قوتِ فیصلہ ہی لینا درست ہے۔

آپؑ اپنے گھر اور قوم سے نکل کر اجنبی وادیوں کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ خبر نہ تھی کہ آئندہ کیسے حالات پیش آنے والے ہیں اور کس طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ جب اپنے لوگوں نے آپؑ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو اجنبی لوگوں سے کیسے امید ہو سکتی ہے کہ وہ آسانی سے اسے قبول کر لیں گے۔ اور پھر یہ بات بھی کہ ان کے مزاج اور معروف سے ناآشنائی کے باعث تبلیغ ودعوت کے کام میں کیسی مشکلات پیش آ سکتی ہیں، اس کا اندازہ بھی مشکل تھا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے صحیح قوتِ فیصلہ کے عطا کرنے کی دعا مانگی۔ کیونکہ غلط فیصلہ آسان کام کو بھی مشکل کر دیتا ہے اور صحیح فیصلہ مشکلات پر غالب آنے کے امکانات کھول دیتا ہے۔ اور اجنبی لوگوں میں جاتے ہوئے اپنی قوم سے بڑھ کر بے رخی بلکہ اذیت رسانی کی توقع کی جا سکتی ہے اور ان کے بگڑے ہوئے لوگوں کی طرف سے مزاحمت کے زیادہ خطرات پیش آ سکتے ہیں۔ اس لئے آپؑ نے صالحین کی معیت اور رفاقت کیلئے استدعا کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی نشرواشاعت کیلئے صالحین ہی معاونت کر سکتے تھے اور انہیں کی رفاقت حوصلے کا سامان ہو سکتی تھی۔

دوسری آیتِ کریمہ میں بعد کے آنے والوں میں آپؑ نے لسانِ صدق کی دعا فرمائی۔ لسان کے معنی شہرت اور چرچا کے ہیں اور صدق کا معنی سچائی اور بلند مقام کے ہیں۔ چونکہ لسان کی اضافت صدق کی طرف ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لِسَانَ صِدْقٍ کا مفہوم ذکرِ جمیل اور ثنائے حسن ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلوں میں میرا ذکر، ذکرِ جمیل کے طور پر باقی رکھ۔ یعنی جس طرح بعض ظالم وجابر لوگ اپنے ظلم وجبر کے باعث لوگوں کے دلوں میں ایسی یاد چھوڑ جاتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ ان پر لعنت بھیجتی اور ان کے ظلم پر تنقید کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح میری زندگی خلقِ خدا کیلئے روشنی کا مینار بنا، مجھے انسانیت کے محسنوں میں شمار فرما۔ بعد کی آنے والی نسلیں ہمیشہ میرے کارناموں اور میری قربانیوں کو اچھے لفظوں میں یاد رکھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ آپؑ کے بعد آنے والی نسلوں میں آج تک آپؑ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ تاریخ میں ہمیں ایسی اور کوئی مثال نہیں ملتی کہ تمام آسمانی مذاہب کے ماننے والے کسی ایک شخصیت کو اس قدر احترام سے یاد کرتے ہوں۔ مشرکینِ عرب اپنے آپ کو آپؑ کی ملت کا امین سمجھتے ہیں۔ اہلِ کتاب آپؑ کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں اور ہر مسلمان اپنی نماز میں آپؑ پر اور آپؑ کی آل پر درود بھیجتا ہے۔ اور ہر سال آپؑ کی سنت کو تازہ کرتے ہوئے لاکھوں انسان لاکھوں جانوروں کی قربانی دیتے ہیں اور ہر ممبر سے آپؑ کی اثر آفریں قربانی کا تذکرہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾
وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾

(اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں شامل فرما۔ ۸۵) اور میرے باپ کو معاف فرمادے، بیشک وہ گمراہوں میں سے ہے۔ ۸۶) اور مجھے اس دن رسوانہ کر جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ۸۷)

رب العالمین! مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے بنا۔ تیرا انتہائی کرم ہے کہ تو نے مجھے نبوت سے نوازا اور لوگوں کی رہنمائی کے منصب پر فائز کیا، لیکن تیری دی ہوئی ہدایت سے میں یہ بات جانتا ہوں کہ تیری ذات انتہائی بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ اس لئے تیری بارگاہ کے مقربین بھی ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے ہیں جنت تیرا ایسا انعام ہے جو صرف اسے نصیب ہوگا جو ایمان وعمل کے ساتھ ساتھ تیرے فضل سے بہرہ ور ہوگا۔ تیری وہ عنایات جو تیرے فضل کو دعوت دیتی ہیں وہ سب تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ اب قیامت کے دن تیرا فضل ہوگا تو میں جنت میں داخل ہوسکوں گا۔ اس لئے میں تجھ ہی سے تیرا فضل اور تیری جنت مانگتا ہوں۔

والد کیلئے مغفرت کی دعا کا مفہوم ومراد

سعادت مند اولاد جب بھی اپنے اللہ کو پکارتی ہے تو اپنے والدین کو کبھی نہیں بھولتی۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے لئے جنت کے وارثوں میں سے ہونے کی دعا مانگی تو معاً خیال آیا کہ میرے والد نے تو ابھی تک بت پرستی چھوڑ کر توحید کے راستے پر چلنے کا اقرار نہیں کیا۔ یعنی اس نے ایمان کا راستہ اختیار نہیں کیا اور ایمان کے بغیر مغفرت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ بات بھی بہت تکلیف دہ ہے کہ قیامت کے دن میرا باپ کافروں کے ساتھ جہنم میں داخل کیا جائے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے بلند مراتب عطا فرمائے ہیں، لیکن جب میرا باپ جہنم میں جائے گا تو مجھے رسوائی سے کون بچا سکے گا۔ اس لئے بے ساختہ اللہ تعالیٰ سے اپنے والد کیلئے دعا مانگی۔ کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔ اگر اسے ایمان کی دولت نہ ملی اور وہ جنت میں جانے کا مستحق نہ ٹھہرا تو میری میدانِ حشر میں کیسی رسوائی ہوگی۔ لیکن قرآنِ کریم کی دیگر تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کیلئے اس وقت تک دعائیں مانگی ہیں جب تک آپؑ کو باپ کے ایمان لانے کے بارے میں بالکل مایوسی نہیں ہوگئی۔ اور آپؑ کی دعائیں جہاں پسرانہ محبت کی وجہ سے تھیں وہیں اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جب آپؑ اپنے والد کے ظلم سے تنگ آ کر ہجرت کرنے لگے تو آپؑ نے اپنے والد سے کہا تھا سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ''آپ کو سلام ہے، میں آپ کیلئے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے۔'' اس وعدے کے ایفاء کیلئے آپؑ اپنے باپ کیلئے دعا کرتے رہے۔ لیکن اس کی جب حق سے دشمنی انتہا کو پہنچ گئی تو تب آپؑ نے دعا کرنا چھوڑ دیا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کیلئے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا مگر جب یہ بات اس پر کھل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے اظہارِ بیزاری کردیا۔''

Marfat.com

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾

(جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ ۸۸) بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔ ۸۹)

دعا کی تکمیل پروردگار کی طرف سے ہے

پیشِ نظر دونوں آیات میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جز قرار دیا جائے۔اور اس بات کا بھی کہ یہ دونوں آیات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکمیل وتوضیح ہوں۔زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا پر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے کام کوئی چیز اگر آسکتی ہے تو وہ مال واولاد نہیں بلکہ صرف قلبِ سلیم ہے۔قلبِ سلیم سے مراد وہ دل ہے جو شرک ونفاق اور فسق وفجور کی ہر آلائش سے پاک ہو۔اگر کوئی شخص ایسے قلبِ سلیم کی دولت سے بہرہ ور ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اولاد بھی ایسے ہی قلبِ سلیم کی حامل دی ہے تو یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں نافع ہوں گے۔اسی طرح وہ مال جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں نہیں بلکہ دنیوی آلائشوں اور فسق وفجور کی اشاعت میں خرچ ہوتا ہے وہ بھی قیامت کے دن وبال تو بن سکتا ہے، کسی کام نہیں آسکتا۔البتہ اگر یہ مال اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اس کی تبلیغ ودعوت اور خلقِ خدا کی خدمت میں صرف ہوا ہو تو یقیناً یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو قیامت کے دن کام آئے گا۔''آذر'' ایمان وعمل سے خالی نہایت دولت مند شخص کا نام ہے، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم فرزند کا باپ ہونے کا شرف حاصل ہے۔لیکن ایمان کی دولت سے محرومی کے باعث حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا عظیم فرزند بھی اس کے کسی کام نہ آیا بلکہ دنیا ہی میں آپؑ نے اس کیلئے دعا مانگنا بھی چھوڑ دی۔کیونکہ آپؑ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے دین کی محبت پسری محبت پر غالب تھی۔اسے دین کی محبت پر قربان کیا جاسکتا تھا لیکن دین کی محبت کو باپ کی محبت پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾

(اور جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی۔ ۹۰) اور دوزخ گمراہوں کیلئے بے نقاب کی جائے گی۔ ۹۱)

اِزْلَاف کے معنی قریب لانے کے ہیں اور تَبْرِیْز کا معنی کھول دینا اور بے نقاب کر دینا ہے۔

متقین کا اعزاز

دنیا میں انسانوں نے اپنے آپ کو بہت سے گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔کہیں ذات پات کی تفریق ہے اور کہیں فرقہ بندیوں کی، کہیں لسانی تفرقے ہیں اور کہیں جغرافیائی نسبتیں۔اسلام کے نزدیک دنیا میں بھی قابلِ قبول تقسیم صرف ایک ہے۔وہ یہ ہے کہ انسان مومن ہے یا کافر۔اور اسی بنیاد پر قیامت کے دن بھی ایک ہی تقسیم ہوگی،اہلِ جنت یا اہلِ جہنم۔

اہلِ جنت نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے تکلیفیں اٹھائیں۔نہ جانے کتنی دنیوی لذتوں سے اپنے آپ کو روکا اور صبر کیا۔چنانچہ جب یہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے تو یہ لوگ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔وہ انہیں اپنے قریب کرے گا اور ان کو اس اعزاز سے نوازے گا کہ جنت خود ان کے قدم لے گی اور بجائے اس کے کہ یہ چل کر جنت تک پہنچیں، جنت ان کے قریب لائی جائے گی۔

Marfat.com

کافروں کا حشر

اہلِ جہنم نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی بجائے شیطان کی قربت حاصل کی۔ ہوائے نفس کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بھی ان کو دور کر دے گا۔ اور یہ چونکہ اہلِ جہنم کے راستے پر چلتے رہے اس لئے جہنم اور ان کے درمیان پردہ اٹھا دیا جائے گا اور یہ دور ہی سے جہنم کو دہکتا ہوا دیکھیں گے اور ان میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان کی جان ہوا ہونے لگے گی۔ اور اہلِ جہنم یہ بات محسوس کریں گے کہ جس دوزخ اور جہنم کو ہم نے ہمیشہ ایک افسانہ سمجھا اور اگر کبھی مفروضے کے طور پر مانا بھی تو یہ کہا کہ وہ ہم سے بہت دور ہے۔ آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جہنم اور ان کے درمیان صرف ایک پردہ ہی حائل تھا جو آج اٹھا دیا گیا ہے۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

(اور ان سے کہا جائے گا کہ اب کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کرتے تھے۔ ۹۲) اللہ کے سوا، کیا وہ تمہاری مدد کریں گے یا اپنا بچاؤ کریں گے؟ ۹۳)

نصر کے معنی دوسرے کی مدد کرنے کے ہیں اور انتصار کا معنی خود اپنی مدافعت کرنے کے ہیں۔
جہنم میں جانے والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم دنیا میں جن لوگوں کی اس خیال سے پیروی کرتے رہے کہ وہ قیامت کے دن تمہارے کام آئیں گے اور تمہیں ہر طرح کے عذاب سے بچا لیں گے۔ بتاؤ کیا آج وہ تمہاری مدد کریں گے یا کر رہے ہیں؟ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا گیا ہے کہ انہیں دیکھو وہ بھی تمہارے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں، ان سے پوچھو کیا وہ خود اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ اگر وہ آج اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے تو کس قدر غلط بات تھی وہ جس کی وہ تمہیں امید دلاتے رہے اور تم اس فریب میں مبتلا رہے۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾

(پھر وہ اس میں اوندھے جھونک دیئے جائیں گے وہ بھی اور دوسرے سارے گمراہ بھی۔ ۹۴) اور ابلیس کی ساری فوجیں بھی۔ ۹۵)

صاحبِ قاموس کا خیال ہے کہ کَبَّ، اَکَبَّ، وَکَبْکَبَ سب کا ایک ہی معنی ہے۔ یعنی سر کے بل اوندھا کر کے نیچے پھینک دینا۔ علامہ بیضاوی لکھتے ہیں کہ کَبَّ کو مکرر کر کے کَبْکَبَ بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انہیں دوزخ میں پھینکا جائے گا تو لڑھکنیاں کھاتے ہوئے نیچے جا گریں گے۔ کَبْکَبَ میں چونکہ حروف کی زیادتی ہے اس لئے اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔
گزشتہ آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جہنم سے پوچھا جائے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی پرستش کرتے تھے، بتاؤ اب وہ کہاں ہیں؟ کیا وہ اب تمہاری مدد کریں گے؟ جبکہ تم ان کی مدد پر یقین رکھتے تھے۔ یا اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنا دفاع کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں ندامت اور خاموشی کے سوا اور کیا ہوگا۔ اس طرح پوری طرح ان کی رسوائی اور تذلیل کے بعد انہیں اوندھے منہ جہنم میں اس طرح پھینکا جائے گا کہ وہ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے قعرِ جہنم میں جا گریں گے اور اس طرح سے اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔

Marfat.com

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾
اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾

(وہ اہلِ جہنم آپس میں جھگڑتے ہوئے کہیں گے۔ ۹۶) خدا کی قسم، ہم کھلی گمراہی میں گرفتار تھے۔ ۹۷)
جبکہ تم کو خداوندِ عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے۔ ۹۸) اور نہیں گمراہ کیا ہمیں مگران مجرموں نے۔ ۹۹)

اختصام کے معنی آپس میں لڑنے جھگڑنے کے ہیں۔

لیڈروں اور پیروکاروں میں جھگڑا

قرآنِ کریم نے اور بھی بعض مواقع پر اہلِ جہنم کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ جہنم میں جب وہ ان لوگوں کو دیکھیں گے جن کی پیروی نے ان کو برباد کیا اور جنہیں وہ دنیا میں بزرگ اور پیشوا، رہنما اور لیڈر مانتے رہے تھے اور عقیدت سے جن کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور جن کے قول وعقل کو سند مانا جاتا تھا اور اجتماعی معاملات میں جن کی رہنمائی کو حرفِ آخر سمجھا جاتا تھا جب انہیں اپنی طرح جہنم میں دیکھیں گے تو تب انہیں اندازہ ہوگا کہ دنیا میں ہم نے جن پر ہر معاملے میں بھروسہ کیا اور اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی ان کے سپرد کردی، آج معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح گمراہ لوگ تھے بلکہ ہماری گمراہی میں ان کا عمل دخل تھا۔ اور ہماری حماقت کا عالم یہ تھا کہ ہم انہیں رب العالمین کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے۔ تو یہ اپنی ساری محرومیوں کا ذمہ دار انہیں گردانتے ہوئے ان پر لعنت کی بوچھاڑ کریں گے اور اپنی بدنصیبی کی ذمہ داری ان پر ڈالیں گے۔ ابنِ کثیر نے درست فرمایا کہ رب العالمین کے ہمسر ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے احکام کو بھی اسی طرح واجب الاطاعت سمجھتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کے احکام کو سمجھتے تھے۔

سورۃ الاعراف آیت ۳۸ میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ”ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا، یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا، اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اب انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے، رب فرمائے گا، سب ہی کیلئے دوہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں۔“

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾

(تو نہ اب کوئی ہمارا سفارشی ہے۔ ۱۰۰) اور نہ کوئی غمخوار دوست۔ ۱۰۱) پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا دنیا میں واپس جانا تو ہم اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔ ۱۰۲)

Marfat.com

حسرت کا اظہار

یہ اظہارِ حسرت کے الفاظ ہیں، یعنی ہم دنیا میں جن کی شفاعت کی امید لگائے بیٹھے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن تھام لینے سے آخرت میں کسی غم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج ان میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہیں، سب ہوا ہو گئے۔ کوئی بھی سفارش کیلئے زبان کھولنے والا نہیں۔ جن کا عمر بھر جھنڈا اٹھائے پھرتے رہے ان میں سے آج کوئی ہماری حمایت و مدافعت کیلئے نظر نہیں آتا۔

پھر وہ اس تمنا کا اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ دنیا میں جانا نصیب ہوتا تو ہم ان مجرموں سے اظہار براءت کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ لیکن ان کی یہ تمنا بس تمنا ہی رہے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بار بار متنبہ کیا تھا کہ یہ دنیا دارالعمل ہے، یہیں آخرت کی تیاری کرنا ہوگی۔ اور موت سے اس کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے دوبارہ دنیا میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۴﴾

(یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۰۳) اور بیشک آپ کا رب سب پر غالب اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۴)

یہ ترجیع کی آیت ہے، اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ

الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیْ لَکُمْ
رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ
اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾
قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا
کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُھُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ
مَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَئِنْ
لَّمْ تَنْتَہِ یٰنُوْحُ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ

Marfat.com

كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ
اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

رکوع: ۶۔ (حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۰۵) یاد کرو جبکہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ ۱۰۶) بیشک میں تمہارے لئے ایک رسولِ امین ہوں۔ ۱۰۷) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۰۸) میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے۔ ۱۰۹) تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۱۰) انہوں نے جواب دیا کہ کیا ہم تم پر ایمان لے لائیں، حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کررہے ہیں۔ ۱۱۱) کہا مجھے اس کی کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۱۲) ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۱۳) اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔ ۱۱۴) میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۱۱۵) ان سرداروں نے کہا، اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تم سنگسار ہو کر رہو گے۔ ۱۱۶) حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، ۱۱۷) اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے دے۔ ۱۱۸) پس ہم نے حضرت نوح اور اس کے ساتھ والوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔ ۱۱۹) پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کردیا۔ ۱۲۰) بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۲۱) بیشک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۲۲)

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ ۚ
(حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۰۵)

حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی دعوت کی سرگزشت سے پہلے چند حقائق

آنحضرت ﷺ کی تسلی اور قریش پر دینِ حق کی حقانیت کو واضح کرنے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں تنبیہ کرنے کیلئے دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس کے بعد تاریخی واقعات سے استشہاد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا حضرت نوح علیہ السلام کا حوالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان واقعات کو پڑھتے ہوئے جو حقائق بار بار سامنے آتے ہیں ان میں سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری رسول کریم ﷺ تک جتنے انبیاء کرام اور رسولانِ عظام تشریف لائے ہیں یہ ایک دوسرے سے واقف نہ تھے۔ ان میں سے بیشتر

Marfat.com

جغرافیائی تعلق بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی زبانیں بھی باہم مختلف تھیں۔ ان کی بعثت بھی مختلف زمانوں میں ہوئی۔ یہ الگ الگ قوموں کی طرف بھیجے گئے۔ ان میں وحدت یکسانی اور یک رنگی کا کوئی سبب موجود نہ تھا۔ بایں ہمہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی دعوت ایک ہے، ان کا دین ایک ہے، ان کے دین کے مبادی ایک ہیں، ان کا اسلوب دعوت یکساں ہے، ہر بعد میں آنے والا رسول پہلے گزرے ہوئے رسول اور اس پر نازل کردہ کتاب کی سچائی کو تسلیم کرتا اور اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ان کے کردار میں بھی گہری یکسانی ہے، ان کے خیالات میں سرموفرق نہیں۔ اور مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان کے مخالفین نے مخالفت میں جو اعتراضات اٹھائے وہ سب رسولوں کے مخالفین میں یکساں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک ہی طرح سے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی۔ اور باہمی ملتے جلتے معجزات کا مطالبہ کیا۔ اور انجام کے اعتبار سے بھی تمام پیغمبروں میں گہری وحدت نظر آتی ہے۔ ہر قوم نے جب اپنے رسول کی تکذیب میں انتہا کر دی، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کو نجات دی اور تکذیب کرنے والوں کو عذاب کی نذر کر دیا۔

دنیا میں تصدیق اور اعتماد کیلئے ہمیشہ انفرادی یا چند افراد کی شہادت پر بھروسہ کیا گیا ہے جبکہ کسی ایک شخص یا چند افراد کا کسی جھوٹ یا غلط بات پر اتفاق کر لینا چنداں باعث حیرت نہیں، لیکن وہ حقیقت جس پر قوموں نے گواہی دی ہو اور جن کی تصدیق اور تائید کیلئے ان کی آبادیوں کے کھنڈرات آج بھی بول رہے ہیں اس گواہی کی تردید اور اس کے ابطال کی کون حماقت کر سکتا ہے۔ انبیائے کرام کی تاریخ اور ان کی امتوں کے حالات دینِ حق کی حقانیت پر مختلف زمانوں میں گزری ہوئی قوموں کی گواہی ہے۔ جس سے یہ بات حتمی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول جس دین کو لے کر آئے تھے وہ سب سے بڑی حقیقت تھی۔ جن لوگوں نے اسے قبول کیا وہ اس کے نتیجہ میں یقیناً ستائے گئے اور انہیں بہت تکلیفیں اٹھانا پڑیں، لیکن بالآخر وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ٹھہرے۔ اور جن لوگوں نے رسول کی تکذیب کی وہ اپنی تکذیب کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے اور ہمیشہ کیلئے عبرت کا سامان بنا دیئے گئے۔

یہ چند سامنے کے حقائق ہیں جو ان واقعات سے مترشح ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی واقعات سے اس راستے کے داعی اور منادا اور اس راستے پر چلنے والوں کی تسکین اور استقامت کا سامان ہوتا ہے۔ اور انہی واقعات سے مخالفین کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم نے اگر ایمان لا کر اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کی تو آخر اسی عذاب میں پکڑے جاؤ گے جس کا نشانہ پہلی امتیں بن چکی ہیں۔

رسولوں کی تکذیب کا مفہوم

رسولانِ گرامی کے سلسلے کی ایک عظیم کڑی حضرت نوح علیہ السلام بھی تھے۔ ان کی قوم نے بھی نے بھی ان کی تکذیب کی۔ غیر معمولی طویل زمانے تک آپؑ نے تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیا۔ کئی نسلیں آپؑ کے سامنے گزریں لیکن ایک مختصر تعداد کے سوا قوم نے آپؑ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قومِ نوح نے رسولوں کا انکار کیا حالانکہ آپؑ کی قوم نے آپؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا، باقی رسولوں کا تو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسولوں کی رسالت و دعوت میں اس حد تک وحدت اور یکسانی ہے کہ ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب کے برابر ہے۔ کیونکہ سب رسولوں کو ایک ہی پروردگار نے مبعوث فرمایا، سب اسی ذاتِ خداوندی کا پیغام لے کر آئے اور سب کا پیغام بالکل ایک ہے۔ اس لئے جو قوم ایک رسول کا انکار کرتی ہے وہ درحقیقت سب رسولوں کے انکار کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کو بھی کافر کہا گیا ہے جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہوں، بیشک باقی تمام انبیاء کو مانتے ہوں۔ کیونکہ اصل سوال مخاطب قوم کی ذہنیت کا ہے۔ قبول کرنے والوں کی ذہنیت کا سانچا انکار کرنے والوں کی

Marfat.com

ذہنیت کے سانچے سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ جس شخص کی ذہنیت میں رسالت کا انکار اپنی جگہ بنا چکا ہے اس سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ وہ کسی رسول کو بھی تسلیم کرے گا۔ کیونکہ رسولوں کی دعوت یکساں ہے تو جب بھی اس کے سامنے کسی رسول کی دعوت آئے گی تو چونکہ اس کی ذہنی ساخت سے وہ میل نہیں کھاتی تو وہ یقیناً اس کا انکار کر دے گا۔ اور اگر کہیں کوئی ایسی مثال موجود ہو کہ کوئی شخص ایک رسول کو مانتا ہے اور دوسرے رسول کا انکار کرتا ہے تو اگر تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے جس رسول کو مانا ہے پیغامِ رسالت کے حوالے سے نہیں مانا بلکہ کسی عصبیت یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر مانا ہے۔ اور جہاں کہیں کسی سچے رسول کا انکار کیا ہے تو اس کی تہ میں بھی کوئی عصبیت یا حسد کا عارضہ کام کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے نبی کریم ﷺ کی رسالت کا انکار صرف حسد کے باعث کیا۔ کیونکہ وہ بنی اسماعیل کو کسی طرح بھی اپنے برابر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور بنی اسرائیل یہ سمجھ رہے تھے کہ آخری آنے والا پیغمبر ہمارے خاندان میں سے ہوگا۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ آپؐ تو بنی اسماعیل میں سے ہیں تو حسد کے مارے ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ مسیلمہ کذاب پر ایمان لانے والوں میں سے بعض سے جب پوچھا گیا کہ تم نے مسیلمہ میں ایسی کیا خوبی دیکھی کہ نبی کریم ﷺ کے مقابلے میں اسے نبی تسلیم کر لیا، تو انہوں نے صاف اقرار کیا کہ ہم چونکہ قریش سے خاندانی عصبیت رکھتے ہیں اور بنی طی اور بنی تمیم قریش کی عظمت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے، اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا جھوٹا پیغمبر بھی قریش کے سچے نبی سے بہتر ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

(یاد کرو جبکہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ ۱۰۶)

حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کا بھائی کہنے کا مفہوم

یہاں حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کا بھائی کہا گیا ہے۔ چونکہ ہر پیغمبر عموماً اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے جن سے وہ نسبی رشتہ رکھتا ہے۔ اس لئے عموماً قرآنِ کریم نے قوم اور پیغمبر کے درمیان اخوت کے رشتے کا ذکر فرمایا ہے۔ ظاہر ہے یہ اخوت دینی نہیں نسبی ہے۔ البتہ اخوت کے حوالے سے دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ پیغمبر چونکہ تم سے اخوت کا رشتہ رکھتا ہے اس لئے اس کے دل میں تمہارے لئے گہری ہمدردی اور خیر خواہی اور جذبۂ اخلاص کارفرما ہے جس کی وجہ سے تمہیں تمہارے مالکِ حقیقی کی ناراضگی سے بچانا چاہتا ہے۔ اور دوسرا اس بات کی طرف کہ پیغمبر اپنی قوم کیلئے اجنبی نہیں ہوتا۔ قوم اس کی نبوت سے پہلے کی زندگی سے خوب آگاہ ہوتی ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کسی پہلو سے بھی کوئی نقص ہو تو جاننے والے فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ تم کس منہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلا رہے ہو۔ اور اگر وہ ان بدکردار لوگوں میں رہ کر بھی ایک بے عیب زندگی گزار چکا ہوتا ہے تو پھر ان کیلئے سیرت و کردار کے اعتبار سے کوئی الزام لگانا آسان نہیں ہوتا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے دعوت کے آغاز ہی میں انذار سے کام لیا ہے، یعنی قوم کو ان کے غلط رویئے کی بدانجامی سے متنبہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جس شخص کو بھی اپنی قوم سے ہمدردی ہوگی وہ اگر محسوس کرتا ہے کہ اس کی قوم کسی خطرے کی طرف بڑھ رہی ہے تو وہ اپنی قوم سے کوئی اور بات کہنے کی بجائے سب سے پہلے انہیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ اور ویسے بھی حکمتِ تبلیغ کے نقطۂ نگاہ سے بھی بگڑے ہوئے لوگوں کیلئے ترہیب،

Marfat.com

ترغیب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے دنیا میں آغازِ دعوت ہی میں ترہیب سے کام لیا ہے۔آنحضرت ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر جب اپنی قوم سے خطاب فرمایا اور یہ آپؐ کی دعوت کا نقطۂ آغاز تھا تو آپؐ نے ان سے یہی فرمایا تھا، بقول حالی:

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

(بیشک میں تمہارے لئے ایک رسولِ امین ہوں۔ ۱۰۷) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۰۸)

رسولِ امین کا مطلب

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی وہ راستہ تلاش کرے جس پر چل کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچا جاسکتا ہے۔اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرانے کے بعد فوراً اس راستے کی خبر دی کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچنا چاہتے ہو اور اس کی ناراضگی کا خطرہ نہیں مول لینا چاہتے تو پھر میں تمہیں اس راستے کی خبر دیتا ہوں جس پر چل کر تم عافیت کو پہنچ سکتے ہو، وہ راستہ میں ہوں۔ کیونکہ میں تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔اس کی وحی مجھ پر اترتی ہے اور میں تم تک پہنچاتا ہوں۔میں کوئی جھوٹا اور مفتری مدعی نہیں ہوں کہ تم مجھ پر اعتماد نہ کرسکو۔میں ایک رسولِ امین ہوں۔یعنی میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راست باز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔میرا بچپن، میرا لڑکپن، میرا عنفوانِ شباب اور میری عمر کے تمام مراحل تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔تم میرے خاندان تک سے واقف ہو۔میرے تمہارے ساتھ قرابت کے رشتے ہیں، میری زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تمہارے سامنے ہے، تم کسی حوالے اور کسی پہلو سے جانچ پرکھ کر دیکھو، تمہیں کہیں بھی خیانت یا بے اعتمادی کا کوئی چھینٹا نظر آتا ہے؟ تمہارا پورا معاشرہ گناہوں کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن میں نے تم میں اس طرح زندگی گزاری ہے جیسے پتھروں کے ڈھیر میں ہیرا چمکتا ہے۔اس سے بڑھ کر میری صداقت و امانت کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ ایک رسولِ امین کے آجانے کے بعد بے خبری کا عذر ختم ہوگیا۔اور تمام ان قوتوں کو چھوڑ کر جن کے ساتھ تم نے اطاعت کا رشتہ باندھ رکھا ہے صرف میری اطاعت کرو۔اور جو احکام میں تمہیں دیتا ہوں ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرو۔

وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

(میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے۔ ۱۰۹)

پیغمبر کی حقانیت پر دلیل

اس آیتِ کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی صداقت پر دلیل بھی ہے اور مخاطبوں کو حقیقت پر غور کرنے کی ترغیب بھی۔اور ساتھ ہی ساتھ بے نیازی کا اظہار بھی ہے۔گزشتہ آیت میں دعوائے نبوت سے پہلے کی زندگی سے اپنی صداقت پر استدلال تھا۔اور اب اپنی صداقت کی دوسری دلیل دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں۔میں جو کچھ کررہا ہوں، تمہاری زندگی کی اصلاح کیلئے کررہا ہوں، تمہارے طور اطوار کی درستی کیلئے کررہا ہوں اور تمہاری سیرت و کردار کی بہتری کیلئے کررہا ہوں اور اس میں میری شب و روز کی محنت اور تمہاری

Marfat.com

مخالفتوں پر میری استقامت تمہارے سامنے ہے۔ تمہارے برے سے برے رویئے پر میں جس طرح دعاؤں سے صلہ دیتا ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتا رہتا ہوں، اس سے بھی تم واقف ہو۔ کیا میری صداقت پر اس سے بڑھ کر بھی کوئی دلیل ہوسکتی ہے۔ تم نے آج تک دوسروں کی خاطر اس طرح بے غرضانہ طریقے سے کسی ذاتی نفع کے بغیر کسی اور کو کاوشیں کرتے دیکھا ہے۔ اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ میری اس شب و روز کی مساعی نے میرا کاروبار ختم کر کے رکھ دیا ہے اور میری ہمدردی اور خیر خواہی کے جواب میں تمہاری طرف سے مجھے قسم قسم کی اذیتیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔ میرے اپنے حصے میں تلخیوں کے سوا کچھ نہیں آیا۔ لیکن مجھے اس پر کوئی شکایت نہیں کیونکہ یہ ایک فریضہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے انجام دے رہا ہوں۔ ایک شخص جس کی زندگی نبوت سے پہلے بھی بے عیب گزری ہو اور جو فریضۂ نبوت انجام دیتا ہوا اپنا سب کچھ تباہ کر کے لوگوں کی اصلاح کیلئے شب و روز محنت کر رہا ہو اگر کسی شخص کو اس کی صداقت پر بھی شبہ ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سچائی کی کوئی دلیل باقی نہیں ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

(تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۱۰)

اس آیت کے تکرار کا سبب

ایک ہی رکوع میں اس آیت کا دوبارہ آنا بعض دفعہ وجدان پر گراں گزرتا ہے اور آدمی اسے تکرار سمجھ کر بدمزہ بھی ہوتا ہے، لیکن ایسا احساس قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان آیات میں اس فقرے کی تکرار بے وجہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے یہ فقرہ لانے کا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے رسولِ امین کے حوالے سے حضرت نوح علیہ السلام کی صداقت پر دلیل قائم کی گئی تھی۔ وہ دلیل چونکہ ناقابلِ انکار ہے اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ ایسی واضح اور مضبوط دلیل کے بعد بھی اگر تم میری نبوت سے انکار کرتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اب دوبارہ اس فقرے کو اس لئے لایا جارہا ہے کہ اس سے پہلے دوسری دلیل بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمہاری طرف آنے والا پیغمبر ایسا بے غرض آدمی ہے کہ جس نے محض اصلاحِ خلق کیلئے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔ اس کی زندگی کی ترجیحات بدل گئی ہیں، اس نے صرف اصلاحِ خلق کی خاطر دنیا کا ہر دکھ اٹھانا گوارا کرلیا ہے، حتیٰ کہ اپنا کاروبار، اپنے تعلقات اور اپنی تمام منفعتیں معرضِ خطر میں ڈال دی ہیں۔ تم اگر ایسے شخص کی نیت پر حملہ کرتے اور اس کی صداقت پر شبہ کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ میری اطاعت کرو۔ اس میں دراصل رسول کے مقام کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ماننے کو تو انسان مختلف لوگوں کو مانتا ہے۔ کسی کو کسی حیثیت سے مانتا ہے اور کسی کو کسی حیثیت سے۔ لیکن اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جسے تم مان رہے ہو اس کی اطاعت کرنا بھی لازم ہو۔ اس لئے یہاں یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا رسول مانو اور رسول ماننے کا مطلب یہ ہے کہ میری اطاعت بھی کرو، کیونکہ رسالت کے مفہوم میں چند تصورات شامل ہیں۔ (۱) رسول وہ ہوتا ہے جو معصوم ہوتا ہے اور کبھی اس سے گناہ کا صدور نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کی حفاظت کرتی ہے۔ (۲) وہ رہنمائی میں کبھی غلطی نہیں کرتا، کیونکہ وہ جو حکم دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ (۳) اس کا قول و عمل اور پسند و ناپسند حجت اور قانون ہوتا ہے جس کا انکار کرنا کفر ہے۔ (۴) اس کا طریقِ زندگی اسوۂ حسنہ ہوتا ہے، جس کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ (۵) اس کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس کی معصیت اللہ تعالیٰ کی معصیت ہے۔ یہ تصورات چونکہ رسالت کا حصہ ہیں، اس لئے اگر تم مجھے رسول مانتے ہو تو پھر ان تصورات کو بھی قبول کرو اور میری اطاعت کو بھی واجب جانو۔

Marfat.com

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

(انہوں نے جواب دیا کہ کیا ہم تم پر ایمان لے لائیں، حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کر رہے ہیں۔ ۱۱۱)

خوئے بدرا بہانہ بسیار

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں آپؑ کی قوم کے متکبرین اور رؤسا نے جواب دیا کہ ہم آپؑ پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں جبکہ تم پر ایمان لانے والے ایسے لوگ ہیں جو خاندانی لحاظ سے بڑے گھٹیا ہیں، مالی لحاظ بڑے مفلس اور کنگال ہیں، معاشرے میں انہیں کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ رہے اونچے طبقہ کے بااثر اور خوشحال لوگ ان میں سے کوئی شخص بھی آپؑ کی دعوت پر ایمان نہیں لایا۔ اگر آپؑ کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء، علماء، مذہبی پیشوا، معززین اور سمجھدار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن ان میں سے تو کوئی بھی شخص آپؑ پر ایمان نہیں لایا، آپؑ کے پیچھے لگے ہیں تو ادنیٰ درجہ کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شعور اور کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں۔

جو کچھ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے امراء نے آپؑ سے کہا، ہر قوم کے مالداروں اور سرداروں نے ہمیشہ اپنی طرف آنے والے پیغمبروں سے اسی قسم کی باتیں کی ہیں۔ ان لوگوں کی سوچ یہ تھی کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں، کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کسی پر ایمان لانا کیا اہمیت رکھتا ہے۔

قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾

(کہا مجھے اس کی کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۱۲) ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۱۳)
اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔ ۱۱۴) میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ۱۱۵)

طبقۂ امراء کے معارضے کا جواب

ان آیات میں طبقۂ امراء کے معارضے کا جواب ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار تو آدمی کے عمل و کردار پر ہے نہ کہ نسب و خاندان اور مال و جائیداد پر۔ اور نہ علم و دانش مال و دولت سے خریدے جا سکتے ہیں اور نہ ذہین لوگ ہمیشہ بڑے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ اب تک ان کا عمل کیا رہا ہے۔ ان کے ماضی کا احتساب میرے رب کے ذمہ ہے، میرے سامنے تو ان کا حاضر ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں اور اس سے ڈرنے والے ہیں۔

تم میں اگر شعور کی رمق ہوتی تو تم جس طرح شرافت و رذالت کو مال و دولت اور نام و نسب کے حوالے سے دیکھ رہے ہو، یہ خناس تمہارے ذہنوں میں نہ ہوتا اور لوگوں کی غریبی قبولِ حق میں تمہارے لئے حجاب نہ بنتی۔

Marfat.com

تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان غریبوں کو دھتکار دوں اور تمہیں اپنے قریب کروں اور اس طرح شاید تم ایمان لے آؤ۔ ایمان کی دعوت سب کیلئے ہے۔ ہر غریب اور امیر اور چھوٹا اور بڑا اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ کوئی امیر شخص اس لئے ہدایت سے دور نہیں رہ سکتا کہ غریب لوگ ہدایت کیوں قبول کر رہے ہیں۔ اور نہ عند اللہ اس کا یہ عذر مسموع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک اصل دولت قبولیتِ ایمان ہے۔ جو شخص اس غرض کیلئے میرے پاس آتا ہے وہی اسلام کا اصل سرمایہ ہے۔ میں یہ بے ہودہ طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے، میں ان کے پیچھے پھرتا رہوں۔ اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میں صرف نذیرِ مبین ہوں یعنی ایک بے لاگ اللہ تعالیٰ سے ڈرانے والا۔ میں نے اپنا فریضۂ انذار ادا کر دیا۔ جو شخص ایمان لے آیا، اس نے اپنی منزل کو پالیا۔ اور جو ایمان نہیں لائے گا اس کی مسئولیت اس پر ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾

(ان سرداروں نے کہا، اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تم سنگسار ہو کر رہو گے۔ ۱۱۶)

بحث کے میدان میں پسپا ہونے کے بعد رجم کی دھمکی

بحث کے میدان میں پسپا ہونے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے اپنی خفت مٹانے اور اپنی قوم کو سہارا دینے کیلئے کہا کہ اے نوح! اگر تم نے اپنی تبلیغ و دعوت کے کام کو نہ روکا اور تم نے ایک ایک آدمی کو متاثر کرنے کی کوشش نہ چھوڑی تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب باتوں کا وقت گزر چکا ہے، اب ہم تمہیں مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ تم یقیناً ہمارے ہاتھوں سے سنگسار ہو کے رہو گے۔ قوم کے لب و لہجہ کی سختی اور شدت خود بول رہی ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی دھمکیاں دے چکے اور سخت زبان استعمال کر چکے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے محسوس کر لیا کہ اب فیصلے کا وقت آ پہنچا ہے، کفر اپنا آخری وار کر گزرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾

(حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، ۱۱۷) اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے دے۔ ۱۱۸)

فتح و نصرت کیلئے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے نبوت کے اعلان اور دعوت کے آغاز ہی میں قوم نے آپؑ کو ماننے سے انکار کر دیا اور آپؑ کی نبوت کی تکذیب کر دی۔ تو آپؑ نے فوراً اپنے رب سے درخواست کی کہ میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے، اس لئے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیجئے۔ گزشتہ آیت کے الفاظ شہادت دے رہے ہیں کہ قوم کی دھمکی اور ان کا لب و لہجہ یہ بتانے کیلئے کافی تھا کہ وہ اب حضرت نوح علیہ السلام سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کو گزشتہ ساڑھے نو سو سال کی تبلیغی کاوشوں اور اس

Marfat.com

آخری دھمکی کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اب میری قوم میں کوئی ایک شخص بھی ایمان قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حق و باطل کی محدود کشمکش بھی جانبین کے ارادوں کے سمجھنے کیلئے کافی ہوتی ہے، چہ جائیکہ ساڑھے نوسو سال کی طویل اور شدید کشمکش کے بعد بھی کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہوتا۔ اس لئے حضرت نوح علیہ السلام نے صرف اپنے مخاطب لوگوں کے ایمان سے ہی مایوسی کا اظہار نہیں کیا بلکہ سورۃ نوح میں یہاں تک فرمایا کہ اے رب! اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا فاجر اور سخت منکرِ حق ہوگا۔ پروردگار نے بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے وسیع علم کے حوالے سے فرمایا لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (ہود: آیت ۳۶) ''تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے، بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔'' قوم کی ہدایت سے مایوسی کے بعد اب صرف فیصلے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ میرے اور قوم کے درمیان آخری فیصلہ کر دے، یعنی ایسا عذاب بھیج جو اس قوم کو تباہ کر دے اور مجھے اور مجھ پر ایمان لانے والوں کو نجات دے دے۔ یہ وہ دعا ہے جو ہر رسول نے قوم پر اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فراست سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اب تبلیغ و دعوت کا وقت گزر چکا، قوم کسی طرح بھی راہِ راست قبول کرنے کیلئے تیار نہیں بلکہ وہ اس زبان کو خاموش کر دینا چاہتی ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتی ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آتا ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

(پس ہم نے حضرت نوح اور اس کے ساتھ والوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔ ۱۱۹)

پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔ ۱۲۰)

دعا کی قبولیت اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا صحیح وقت پر زبان سے نکلی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فوراً قبول فرمالیا۔ تفصیل مختلف مواقع پر گزر چکی ہے کہ طوفان اٹھا جس نے ہر چیز کو تباہ کر ڈالا اور حضرت نوح علیہ السلام اور آپؑ پر ایمان لانے والوں کو ایک عظیم کشتی کے ذریعے بچایا جسے حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کی ہدایت کے مطابق پہلے سے تیار کر چکے تھے۔ اس کشتی کو مشحون یعنی بھری ہوئی اس لئے کہا گیا ہے کہ ہدایتِ خداوندی کے تحت ضرورت کی اشیاء اور مختلف حیوان اور نجات پانے والے انسان اس طرح لادے گئے تھے کہ کشتی ان سے پوری طرح بھر چکی تھی۔ ہر اس مخلوق اور ہر اس چیز کیلئے الگ الگ جگہ بنائی گئی تھی جسے طوفان سے بچانا مقصود تھا۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

(بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ۱۲۱)

بیشک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۲۲)

Marfat.com

یہ آخر میں وہی آیتِ ترجیع ہے جو اس سے پہلے بھی تین دفعہ گزر چکی ہے۔ روئے سخن قریش کی طرف ہے کہ یہ بار بار آپ سے نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو واقعی کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو طوفانِ نوح سے بڑی نشانی اور کیا ہوگی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی پوری سرگزشت بجائے خود ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ اگر نشانی سے ہی ایمان لانا ہے تو پھر اس نشانی پر ایمان لائیے لیکن جیسے قوم نوح میں اکثر ایمان لانے والے نہ تھے، یہی حال قریش کا بھی ہے۔ ان کے سامنے مسلسل نشانیاں آ رہی ہیں، لیکن یہ کسی سے سبق لینے کیلئے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے، وہ جب چاہے پکڑ سکتا ہے، لیکن وہ ساتھ ہی رحیم بھی ہے اس لئے مسلسل مہلت دیئے چلا جا رہا ہے، شاید یہ لوگ مہلت سے فائدہ اٹھائیں۔

كَذَّبَتْ عَادُ

كَذَّبَتْ عَادُ ࣙ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ هُوْدٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾ إِنِّيْ لَكُمْ
رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿١٢٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿١٢٦﴾ وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٧﴾ أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ
اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾ وَإِذَا
بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾ وَاتَّقُوا
الَّذِيْ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ
وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ إِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ
عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿١٣٦﴾ إِنْ هٰذَا إِلَّا خُلُقُ
الْأَوَّلِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿١٣٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَأَهْلَكْنٰهُمْ إِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الرَّحِيْمُ ﴿١٤٠﴾

Marfat.com

رکوع: ۷۔ (قومِ عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۲۳) جبکہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں۔ ۱۲۴) میں تمہارے لئے ایک رسولِ امین ہوں۔ ۱۲۵) پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۲۶) میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۱۲۷) کیا تم ہر بلندی پر عبث ایک یادگار بنا ڈالتے ہو۔ ۱۲۸) اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ ۱۲۹) اور جب تم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ہاتھ ڈالتے ہو۔ ۱۳۰) بس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۳۱) اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمہیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ ۱۳۲) اس نے تمہاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے۔ ۱۳۳) اور باغوں اور چشموں سے۔ ۱۳۴) بیشک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۳۵) انہوں نے جواب دیا کہ تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ہمارے لئے سب یکساں ہیں۔ ۱۳۶) یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں۔ ۱۳۷) اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ ۱۳۸) آخر کار انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلا دیا، اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳۹) بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں، اور بیشک تمہارا رب وہ غالب اور مہربان ہے۔ ۱۴۰)

كَذَّبَتْ عَادُ ِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾

(قومِ عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۲۳) جبکہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں۔ ۱۲۴) میں تمہارے لئے ایک رسولِ امین ہوں۔ ۱۲۵) پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۲۶)

حضرت ہود علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کی سرگزشت

قومِ نوح کے بعد جس قوم نے بہت ترقی کی اور جسے بہت عروج حاصل ہوا وہ قومِ عاد تھی جس کا ذکر اس رکوع میں ہو چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے واضح طور پر قومِ عاد کو قومِ نوح کا خلیفہ قرار دیا۔ ان کی جسمانی صحت اور مضبوطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً "اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔" ان کی ترقی کے حوالے سے فرمایا اَلَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ "جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔" اپنی ترقی کے اظہار کیلئے انہوں نے بلند و بالا عمارتیں بنانے کا ایک کلچر پیدا کر لیا تھا اور ان کی عمارتیں عموماً اونچے اونچے ستونوں پر قائم تھیں اور اپنی بلند و بالا عمارتوں کے حوالے سے تاریخ میں ان کی بہت شہرت تھی۔ ان کا سیاسی نظام اگرچہ بظاہر بڑا مضبوط دکھائی دیتا تھا لیکن طبقات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے طاقتور لوگ اس نظام پر حاوی تھے اور انہوں نے قوت کے زور سے اختیارات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے ایک اللہ کے قائل ہونے کے باوجود بندگی میں نہ صرف دوسروں کو شریک کرتے تھے بلکہ جا بجا طواغیت نے اپنی مسندوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں مذہبی وحدت کا بھی فقدان تھا اور سیاسی وحدت بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ وہ طاقت کی زبان سمجھتے اور طاقت کی زبان بولتے تھے۔ ظلم ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ ان

Marfat.com

مفاسد کی وجہ سے تمدن بری طرح بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ بالاتر طبقات کی حکومت کے باعث ایک مضبوط ریاست کا وہم ہوتا تھا۔ ان کی ریاست الاحقاف کے نام سے جانی جاتی تھی جو آج ایک خوفناک ریگستان بن چکا ہے اور جس میں زندگی کے دور دور تک آثار نہیں۔

حضرت ہود علیہ السلام ایسی طاقتور لیکن بگڑی ہوئی قوم میں مبعوث ہوئے انہوں نے بھی حضرت ہود علیہ السلام کی نبوت اور آپؑ کی دعوت کو جھٹلایا، چونکہ ان کی تکذیب درحقیقت پیغامِ رسالت کی تکذیب تھی، اس لئے انہوں نے صرف حضرت ہود علیہ السلام کو ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے تمام رسولوں کو جھٹلا دیا۔ حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ اخوت کا رشتہ رکھتے تھے اس لئے انہیں غائت درجہ اپنی قوم سے ہمدردی تھی۔ اس لئے ان کے بگڑے ہوئے حالات اور مخدوش مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے تبلیغ و دعوت کا آغاز انذار سے کیا۔ اور نہایت قوت سے انہیں جھنجوڑتے ہوئے کہا کہ کیا تم اپنے کرتوتوں کے باعث اللہ تعالیٰ اور اپنے برے انجام سے ڈرتے نہیں ہو۔ میں تمہارے پاس رسولِ امین کی حیثیت سے آیا ہوں، کیونکہ میری سابقہ زندگی سے تم پوری طرح واقف ہو۔ میرا بے عیب کردار میری حقانیت کی گواہی دیتا ہے۔ ایک معتبر اور معتمد رسول کے آجانے کے بعد تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا جس کے سہارے تم اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کی ہمت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام میں تمہارے سامنے کھول کر پیش کر چکا ہوں اور میری ذات اور میرا عمل اس کی حقانیت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو تا کہ تم حق و باطل اور صحیح اور غلط میں امتیاز کر کے صحیح راستہ اختیار کر سکو۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ ﴿۱۲۷﴾

(میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۱۲۷)

اطاعت کی دلیل

ایک تو اس لئے تمہیں میری اطاعت کرنی چاہئے کہ میں رسولِ امین ہوں، مجھ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، میری دیانت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا اس لئے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں جس کے پیشِ نظر تمہاری صلاح و فلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں نے تبلیغ و دعوت کے عمل میں دنیوی اور مادی لحاظ سے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اگر میری کوئی اپنی غرض ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ البتہ مجھے اس پر ملال نہیں۔ میرے لئے تم میں سے کسی ایک کا ایمان لے آنا کسی خزانے کے ہاتھ آجانے سے بہتر ہے۔ اگر اس جذبۂ اخلاص کی تم قدر نہیں کرو گے تو اپنا بہت کچھ نقصان کر لو گے۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

(کیا تم ہر بلندی پر عبث ایک یادگار بنا ڈالتے ہو۔ ۱۲۸) اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ ۱۲۹)

رِيْعٌ ...... بلند زمین کو بھی کہتے ہیں اور اس راستے کو بھی جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا ہو۔

اٰيَةً ...... یہاں نشانی اور یادگار کے مفہوم میں ہے۔

مَصَانِعَ ...... مَصْنَعٌ کی جمع ہے۔ محلوں اور ایوانوں پر بھی بولا جاتا ہے اور مضبوط قلعے پر بھی۔

Marfat.com

ترجیحات کے بگاڑ پر تنبیہ

قوموں کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کی قدر و قیمت نگاہوں سے گر جاتی ہے پھر کسی کی عظمت، سیرت و کردار سے نہیں بلکہ دولت و امارت سے جانچی جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں اخلاقی اور روحانی قدریں نہ صرف زوال پذیر ہو جاتی ہیں بلکہ رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں اور مادی زندگی کی محبت دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ آغاز میں لوگ اخلاقیات کو نظرانداز کر کے کثرتِ دولت کو ہدف بناتے ہیں۔ پھر اسی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوششیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ پھر نام و نمود اور دولت کے اظہار کا مرض پھیلتا جاتا ہے پہلے مکانات بلند اور وسیع ہوتے ہیں اور پھر اسی میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ایک منزل بناتا ہے، دوسرا، دوسری منزل اٹھاتا ہے۔ پہلا شخص اس کے مقابلے میں دوسری منزل تعمیر کرتا ہے تو دوسرا تیسری منزل کھڑی کر دیتا ہے۔ اس طرح سے عمارتیں بلند ہوتی جاتی ہیں، انسان چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ عمارات کی بلندی اپنے مکینوں سمیت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اسی کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: **ما الفقر اخشی علیکم ولکنی اخشی ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کماتنافسوھا فتھلککم کما اھلکتھم** ”میں تم پر ناداری سے نہیں ڈرتا، میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر کھول دی جائے گی، جیسے پہلی قوموں پر کھولی گئی۔ پھر تم دنیا طلبی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں لگ جاؤ گے۔ تو جس طرح اس سبقت نے پہلی قوموں کو تباہ کیا، تمہیں بھی ہلاک کر دے گی۔“

دولت جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، ویسے ویسے نفس پرستی اور مادہ پرستی کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب صرف مکانات کی وسعت اور بلندی ہی مقصود نہیں رہتی بلکہ ہر بلند جگہ پر محض یادگار کے طور پر بلند و بالا عمارتیں بنانے (تاکہ دوسروں کے سامنے اپنی دولت کا اظہار ہو اور یہ یادگاریں دیر تک اس کے نام کو زندہ رکھیں) کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مادی جنون کی کیفیت ہے جو تمدن کے فساد کا باعث بنتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی تعمیرات پر جو گرفت کی ہے اس سے مقصود تمدن و تہذیب کے اسی فساد کو روکنا تھا جس سے بالآخر قومیں تباہ ہو جاتی ہیں اور ان عمارتوں کا ذکر آپؑ نے اس حیثیت سے کیا تھا کہ یہ نظامِ تمدن و تہذیب کی خرابیوں کی علامتیں ہیں۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾

(اور جب تم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ہاتھ ڈالتے ہو۔ ۱۳۰)

فساد فی الارض پر تنبیہ

تم نے دولت و ثروت کے اظہار اور ضروریاتِ زندگی میں تکلف اور تعیش کے عناصر شامل کرنے میں اس حد تک غلو سے کام لیا ہے کہ اب تمہاری رہائش کیلئے مکان کافی نہیں بلکہ محلات درکار ہیں۔ پھر اسی پر تمہاری تسکین نہیں ہوئی تو تم نے اظہارِ قوت و ثروت کیلئے ہر نمایاں جگہ میں یادگاریں قائم کرنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس سے ایک طرف تمدن و تہذیب کو نقصان پہنچا تو دوسری طرف تمہارا انسانیت سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ قوم طبقات میں بٹ گئی۔ غریب، غریب تر اور کمزور، کمزور تر ہوتے چلے گئے اور تمہارے بگڑے ہوئے مزاج نے بجائے ان پر رحم کھانے کے ظلم کا ایسا بازار گرم کیا کہ کہیں انصاف کیلئے جائے پناہ باقی نہ رہی اور انسانی زندگی دکھوں سے زخم زخم ہو کر رہ گئی۔ اب

Marfat.com

تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنے لئے تو ہمیشگی اور دوام کی فکر میں ہو اور اس کیلئے جگہ جگہ بے فائدہ یادگاریں قائم کرتے پھرتے ہو۔ اور غریبوں کے ساتھ تمہارا معاملہ یہ ہے کہ تم جب بھی ان پر ہاتھ ڈالتے ہو تو ظالمانہ طریقے سے ڈالتے ہو۔ زمینوں پر کام کرنے والے ہاری اور مزارعے، کانوں میں کام کرنے والے مزدور اور سڑکوں اور گھروں میں کام کرنے والے کارکن تمہاری سختیوں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اپنے کتوں تک سے تم پیار کرتے ہو لیکن ان کے بلکتے بچوں پر تمہیں رحم نہیں آتا۔

ممکن ہے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کے مزاجِ فساد کو واضح کرنے کے بعد ان کے خارجی فساد فی الارض کی طرف اشارہ کر رہے ہوں کہ تمہیں جب بھی موقع ملتا ہے تو اپنے ہمسایہ ملکوں پر چڑھ دوڑتے ہو اور ان کو اپنا غلام و محکوم بنانے میں نہایت ظالمانہ طریقے اختیار کرتے ہو۔ تمہاری طاقت اپنے ہمسایوں کیلئے ایک تباہ کن قوت بن کر رہ گئی ہے۔ اس طرح سے خدا کی زمین تم نے خدا کے بندوں پر تنگ کر دی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾

(بس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۳۱)

قوم کے اعمالِ فاسدہ پر تنقید کرنے کے بعد انہیں تباہی کے حوالے نہیں کیا بلکہ اب بھی پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ کسی طرح اپنے برے انجام سے بچ جائیں۔ اس لئے نہایت دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ بار دگر تذکیر و تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے کانٹوں کی فصل بونے میں اگرچہ کوئی کمی نہیں کی لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، اگر اپنی غلط روش سے باز آ جاؤ اور اپنے مفسد لیڈروں کی پیروی کرنے کی بجائے میری اطاعت کرو تو اب بھی اس ڈوبتی کشتی کو بچایا جا سکتا ہے۔ اور از سر نو اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾

(اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمہیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ ۱۳۲) اس نے تمہاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے۔ ۱۳۳) اور باغوں اور چشموں سے۔ ۱۳۴) بیشک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۳۵)

کفرانِ نعمت سے بچو

گزشتہ آیت سے جو امید دلائی تھی اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تم پر پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے کتنے احسانات ہیں، وہ یقیناً تمہیں تباہ نہیں کرنا چاہتا، تمہاری اصلاح چاہتا ہے۔ تم اس کے غیظ و غضب کے ساتھ ساتھ ان نعمتوں کے چھن جانے کی فکر کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اب تک چارپایوں، مال و اولاد اور باغوں اور چشموں کی صورت میں عطا فرمائی ہیں۔ اور تم خوب جانتے ہو کہ کس کثرت کے ساتھ تمہیں نعمتوں سے نوازا گیا ہے۔ یہ ساری نعمتیں تمہیں اس لئے تو نہیں دی گئی تھیں کہ آنے والے دن کی فکر کی بجائے سرکش و جبار بن کر اہلِ زمین کیلئے مصیبت بن جاؤ بلکہ یہ نعمتیں تو تمہیں شکرگزاری اور فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے دی گئی تھیں۔ لیکن تم نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی زمین کو

Marfat.com

فساد سے بھر دیا ہے اس سے مجھے اندیشہ ہے کہ ایک ہولناک دن کا عذاب تمہیں نہ آ پکڑے۔ کیونکہ کسی بھی پیغمبر کی تکذیب جب آخری مرحلے پر پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب حرکت میں آ جاتا ہے اور وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے۔ میں ایسے ہی عذاب کا تمہارے بارے میں اندیشہ رکھتا ہوں اور تمہیں بار بار اس سے بچنے کی ترغیب دے رہا ہوں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

(انہوں نے جواب دیا کہ تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ہمارے لئے سب یکساں ہیں۔ ۱۳۶)

قلبی قساوت کی آخری حد

قوموں میں بگاڑ کے بھی درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ قومیں نصیحت سے لاپرواہی کا رویہ اختیار کرتی ہیں، پھر بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، لیکن دل میں اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنا وقت اور اپنی توانائی صرف کر کے ہمارے پاس نصیحت کیلئے آتے ہیں یقیناً وہ ہمارے خیر خواہ ہیں۔ نصیحت قبول نہ بھی کی جائے، دل میں ناصح کی خیر خواہی کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن بگاڑ کا آخری درجہ یہ ہے کہ نہ نصیحت سے تعلق رہے اور نہ ناصح سے، بلکہ ناصح سے بیزاری پیدا ہو جائے۔ اور صاف کہا جانے لگے کہ آپ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں، ہمارے دلوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، کیونکہ ہمارے ماحول، ہماری تعلیم و تربیت اور ہمارے طور اطوار نے ہمیں جو مزاج دیا ہے وہ تمہاری باتوں سے یکسر مختلف ہے۔ تم جو کچھ کہتے ہو ہمارے طبیعتیں اسے قبول نہیں کرتیں۔ تم اور وادی کے مسافر ہو، ہم اور وادی کے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

(یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں۔ ۱۳۷) اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ ۱۳۸)

تم ہمیں جس عذاب سے ڈرا رہے ہو، یہ ڈراوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں بگھارنے والے ایسی ہی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اگر ان باتوں پر عذاب آنا ہوتا تو پہلے لوگوں پر عذاب آ جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری باتوں کی حیثیت توہمات سے زیادہ نہیں۔ ہم ایسی فرضی باتوں سے یہ روگ نہیں پال سکتے کہ ہم پر عذاب آنے والا ہے۔ ہمیں ایسے کسی عذاب کا اندیشہ نہیں۔ سورۃ نمل آیت ۶۸ میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ "اس کی دھمکی ہمیں بھی سنائی جا رہی ہے، اور اس سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی سنائی جا چکی ہے، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔"

دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ان میں سے کوئی نئی بات نہیں، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے طور اطوار بھی ایسے تھے۔ ان کا دین بھی یہی تھا، ان کا تمدن اور ان کے اخلاق بھی ہم سے مختلف نہیں تھے۔ لیکن ان پر ایسا کوئی عذاب نہیں آیا۔ تو ہم پر آخر ایسی کوئی آفت کیوں آ پڑے گی۔ یہ بلاوجہ کے اندیشے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

Marfat.com

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنَٰهُمْ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾
وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٤٠﴾

(آخر کار انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلا دیا، اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳۹) بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں، اور بیشک تمہارا رب وہ غالب اور مہربان ہے۔ ۱۴۰)

تکذیب کا نتیجہ

جب قومِ ہود نے تکذیب میں انتہا کر دی حتیٰ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی زندگی کے درپے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی سنت حرکت میں آئی تو اس قوم کو ہلاک کر دیا گیا۔ بعض دیگر مواقع پر قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ایک زور کی آندھی اٹھی، قوم ہود کی وادیوں کی طرف بڑھی، یہ لوگ یہ سمجھے کہ گھٹا اٹھ رہی ہے، بارش کی شدید ضرورت تھی، نہایت خوش ہوئے، خوب خوشیاں منائی جانے لگیں کہ بارش ہو گی تو قحط سالی ٹل جائے گی اور زمین غلہ اگلنے لگے گی، مگر وہ گھٹا خدا کا عذاب تھا۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس نے ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا۔ اس کی گرمی اور خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ یہ طوفان اس وقت تک نہ تھما جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک متنفس ختم نہ ہو گیا۔ بس ان کی بستیوں کے کھنڈر ہی ان کے انجام کی داستان سنانے کیلئے کھڑے رہ گئے۔ اور آج کھنڈر بھی باقی نہیں ہیں۔ احقاف کا پورا علاقہ ایک خوفناک ریگستان بن چکا ہے۔ جس میں زندگی کے دور تک آثار نہیں۔ اس کے بعد وہی آیاتِ ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکیں اور ان کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٤١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَٰلِحٌ
أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٤٢﴾ إِنِّى لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٤٣﴾ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٤﴾ وَ
مَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٤٥﴾
أَتُتْرَكُونَ فِى مَا هَٰهُنَآ ءَامِنِينَ ﴿١٤٦﴾ فِى جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٧﴾ وَزُرُوعٍ
وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ﴿١٤٨﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ ٱلْجِبَالِ بُيُوتًا فَٰرِهِينَ ﴿١٤٩﴾
فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٥٠﴾ وَلَا تُطِيعُوٓا۟ أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ ٱلَّذِينَ
يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مِنَ

Marfat.com

الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٥٤﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾ فَعَقَرُوْهَا
فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿١٥٧﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَ
مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٨﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٥٩﴾

رکوع: ۸۔ (ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۴۱) جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۴۲) میں تمہارے لئے اللہ کا ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۴۳) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۴۴) میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو بس اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۴۵) کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش وطرب) میں جس میں تم یہاں ہو ہر خطرے سے محفوظ۔ ۱۴۶) باغوں اور چشموں میں۔ ۱۴۷) کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں۔ ۱۴۸) تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ ۱۴۹) پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۵۰) اور حدود سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو۔ ۱۵۱) جو ملک میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ ۱۵۲) ان لوگوں نے کہا کہ تم تو بس ایک سحر زدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ۱۵۳) تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو، تو تم کوئی نشانی لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۴) حضرت صالح (علیہ السلام) نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے، ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمہاری باری ہے۔ ۱۵۵) اسے کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ تمہیں ایک برے دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ ۱۵۶) پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر ہو گئے پچھتانے والے۔ ۱۵۷) بالآخر ان کو عذاب نے آ پکڑا، بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ ۱۵۸) اور بیشک تیرا رب عزیز اور رحیم ہے۔ ۱۵۹)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٤١﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٤٢﴾
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٤٣﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٤٤﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٥﴾

(ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۴۱) جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۴۲) میں تمہارے لئے اللہ کا ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۴۳) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۴۴) میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو بس اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۴۵)

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام اور آپؑ کی دعوت کی سرگزشت

اب قومِ ثمود کا ذکر ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا ہوا وہ یہی قوم تھی۔ لیکن اس قوم نے بھی اپنے انبیاء کی دعوت کے ساتھ وہی کچھ کیا جو پہلی قومیں کر چکی تھیں۔ ان کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی۔ یعنی ان کا معیارِ زندگی بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور معیارِ انسانیت روز بروز گرتا گیا۔ جس طرح قومِ عاد نے مادی زندگی کو اپنا ہدف بنا کر تکلف اور تعیش کی زندگی اختیار کی اور پھر بڑھتے بڑھتے عالی شان محلات زندگی کی ضرورت بن گئے اور دوام کی خواہش نے ہر بلند جگہ پر بلند و بالا عمارتیں بنا کر ہمیشہ کی یادگاروں کا سامان کیا۔ ان کے عقیدے کی تباہی جس نے ان کے اخلاق اور اعمال کو ابتری کے راستے پر ڈالا اور ساتھ ہی ساتھ مادی زندگی کی بے پناہ محبت نے تہذیب و تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ان کی طرف مبعوث ہونے والے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام نے بار بار انہیں انذار کیا، اور اپنی سابقہ زندگی سے استشہاد کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک رسولِ امین کی حیثیت سے پیش کیا۔ اور انہوں نے توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ سے رشتہ توڑ کر اور دنیا دار اور خواہش پرست لیڈروں کی پیروی نے چونکہ تمہیں ہلاکت کے راستے پر ڈال دیا ہے، ان کی پیروی چھوڑو اور میری اطاعت کرو، کیونکہ میرے پاس وہ علم ہے اور مجھ پر وہ رہنمائی اترتی ہے جو تمہارے ہر طرح کے بگاڑ کا علاج کر سکتی ہے۔ اور انہیں مزید توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح میری زندگی کا ایک ایک عمل اعتماد دلانے والا ہے، اسی طرح میری بے غرض دعوت اور ہمدردی اور خیر خواہی پر مشتمل تبلیغ تمہارے دکھوں کا مداوا کر سکتی ہے۔ تمہیں اپنے معاشرے میں ایک شخص بھی بے غرض نظر نہیں آئے گا، لیکن میں کس قدر بے غرضی اور ہمدردی و خیر خواہی سے شب و روز تمہاری اصلاح کیلئے کوشاں ہوں۔ کیا تمہیں اس سے اندازہ نہیں ہوتا کہ میرے پیشِ نظر تمہاری دنیا و عاقبت کے سنوارنے کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے تمہیں اپنی بھلائی کیلئے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور میری اطاعت کرنی چاہئے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِىْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾
وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾

(کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش و طرب) میں جس میں تم یہاں ہو ہر خطرے سے محفوظ۔ ۱۴۶)
باغوں اور چشموں میں۔ ۱۴۷) کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں۔ ۱۴۸)

خوشحالی سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ

دنیا کی محبت میں ڈوبے ہوئے لوگ جن بڑی بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں سب سے بڑی خوش فہمی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ عیش دائمی اور ابدی ہے، اس کو کبھی زوال نہیں ہوگا اور نہ کبھی ان نعمتوں کا حساب لیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی اپنی عاقبت کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں کرتے۔ یہی حال قومِ ثمود کا بھی تھا کہ وہ دنیوی نعمتوں کو ہمیشہ رہنے والی نعمتیں سمجھتے تھے اور پھر ان نعمتوں پر ذاتی استحقاق کا دعویٰ بھی رکھتے تھے۔

Marfat.com

درحقیقت نعمتوں کا حصول کوئی برائی نہیں۔ خوشحالی انسان کو آسودگی دیتی ہے۔ وسائلِ زندگی کی فراوانی کسی بھی قوم کی ترقی کی علامت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ قوم کی حقیقی زندگی کا باعث اس وقت بنتا ہے جب اسے اپنا ذاتی استحقاق یا اپنی ملک سمجھنے کی بجائے امانت اور اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھا جائے۔ اور یہ یقین رکھا جائے کہ جس منعم حقیقی نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں بجا طور پر اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں جواب طلبی کرے۔ اور ہر وہ شخص جس کو نعمتیں عطا ہوتی ہیں اس پر لازم ہے کہ وہ ان نعمتوں پر منعم حقیقی کا شکر بجالائے اور انہیں امانت سمجھ کر حقِ امانت کی ادائیگی کی فکر کرے۔ اور جو شخص امانتوں کی فراوانی سے گراں بار کیا گیا ہے، اسے جوابدہی کے احساس سے اتنا ہی زیادہ فکرمند ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کی صلاح و بقا کیلئے بار بار ان پر زور دیا کہ تمہارے اندر دولت کی جو ناہمواری اور خلقِ خدا کے حوالے سے بے التفاتی نے جو مسائل پیدا کئے ہیں اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم اپنے اندر یہ یقین پیدا کرو کہ یہ نعمتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ یہ باغات اور چشمے اور یہ نخلستان اور جھکی ہوئی شاخوں والے پھلدار درخت حقِ دوام لے کر وجود میں نہیں آئے۔ یہ تمہارے لئے امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت بھی دی ہے اس کے ساتھ مسئولیت بھی عائد کی ہے۔ جب تک مسئولیت کی فکر پیدا نہیں ہوگی نہ نعمتوں پر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا اور نہ راہِ ہدایت نصیب ہوگی۔

طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ...... طَلْعٌ خوشے کو کہتے ہیں هَضِيْمٌ وہ کھجور جس کے خوشے آپس میں گتھم گتھا ہوں، جو پھلوں سے لد کر جھک گئے ہوں۔ اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔ جو مٹھاس سے اتنے نرم اور گداز ہوں کہ منہ میں ڈالتے ہی گھل جائیں۔ یہ سارے مفاہیم ایک دوسرے سے قربت رکھتے ہیں اور ان سب کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾

(تم پہاڑ کھود کھود کر فخر یہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ ۱۴۹) پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۵۰)

آخرت فراموشی سے پیدا ہونے والے تمدن کا فساد

گزشتہ مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم چونکہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ شاید ہمیشہ یہیں رہنا ہے اس لئے عاقبت نااندیش ہو کر مادی زندگی کی محبت میں ڈوب گئے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم پہاڑوں کو کھود کھود کر اور تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے ہو تا کہ وہ بھی پہاڑوں ہی کی طرح پائیدار اور غیر معمولی مضبوط ہوں اور ایک طویل زمانے تک تمہارے نام کو زندہ رکھیں۔ قومِ عاد کو بھی اسی ذہنیت نے تباہ کیا اور قومِ ثمود بھی ان کی جانشینی کا حق ادا کر رہی تھی۔ صاحبِ تفہیم القرآن نے ان کے ان تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۃ فجر میں جس طرح عاد کو ذَاتُ الْعِمَاد (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے۔ اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ''وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں۔'' اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا (الاعراف، آیت ۷۴) اور ان تعمیرات کی غرض و غایت

Marfat.com

کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت وقوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کیلئے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کیلئے داعی نہ تھی۔ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے، دوسری طرف امراء اور اہلِ ثروت رہنے کیلئے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں ۱۹۵۹ء کے دسمبر میں، میں نے خود دیکھا ہے۔یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العلاء (جسے عہد نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانبِ شمال واقع ہے۔آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحجر اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔اس علاقے میں العلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز وشاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر الحجر کے گردو پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔آبادی برائے نام ہے۔روئیدگی بہت کم ہے۔چند کنوئیں ہیں۔انہی میں سے ایک کنویں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اسی سے پانی پیتی تھی۔اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سے فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے۔اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً پچاس میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کی حدود میں تیس چالیس میل اندر تک ملتے چلے گئے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور سو میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ثمود کی جو عمارتیں ہم نے الحجر میں دیکھی تھی، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلیج عقبہ کے کنارے مدین کے مقام پر، اور اردن کی ریاست میں پٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔خصوصیت کے ساتھ پٹرا میں ثمود کی عمارات اور نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرزِ تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے۔ انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کیلئے الحجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں لیکن دونوں قوموں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انہیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں اسے عروج پر پہنچایا اور پھر ایلورا میں (جس کے غار پٹرا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ (تفہیم القرآن)

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥١﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٢﴾

(اور حدود سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو۔ ۱۵۱) جو ملک میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ ۱۵۲)

Marfat.com

گمراہ لیڈر شپ تباہی کا باعث ہے

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے ایک اور بہت بڑی حقیقت منکشف فرمائی اور ایک تباہ کن چیز سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ وہ یہ ہے کہ قومیں جس طرح ہوائے نفس کے اتباع اور مادی محبت میں استغراق کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں، اسی طرح گمراہ لیڈر شپ بھی ان کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ اور اس میں قصور صرف لیڈر شپ کا نہیں ہوتا بلکہ ان گمراہ لیڈروں کے پیچھے چلنے والوں کا بھی ہوتا ہے۔ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے جو مزاج بنتا ہے اس کے نتیجے میں قوم، صالح قیادت کی پیروی کرنے سے ہمیشہ گریز کرتی ہے۔ وہ لیڈر انہیں مانتی ہے جو ان کی خواہشات کو غذا فراہم کرتے اور ان کے برے ارادوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ قوم ثمود بھی اسی حادثے کا شکار تھی۔ اس سے حضرت صالح علیہ السلام نے روکتے ہوئے کہا کہ تم جن لوگوں کی اطاعت کرتے ہو وہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہیں فواحش و منکرات سے روکیں وہ اس کی ترغیب دیتے اور خود آگے بڑھ کر اس کو اختیار کرتے ہیں۔ تمہاری اصلاح کا لازمی تقاضا ہے کہ تم ان کی اطاعت سے توبہ کرو اور میری فرمانبرداری اختیار کرو۔ کیونکہ تم جن لوگوں کی پیروی کر رہے ہو وہ نام تو تمہاری اصلاح کا لیتے ہیں لیکن حقیقت میں اصلاح کی بجائے افساد کر رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کی بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے، اسی طرح زمین کی اصلاح کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر اسی ایک خدا کا قانون چلے۔ اگر خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون اور نظام اس میں چلایا جائے تو یہ زمین کے امن و عدل کو درہم برہم کرنا ہے۔ اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت نام اور کتنے ہی نیک ارادے کے ساتھ چلایا جائے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور ان کے راستوں پر چلنے والوں کے سوا جتنے بھی قائدین ہیں وہ سب اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں، اپنی خواہشات پر مبنی قانون بنانے اور چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ زمین میں فساد برپا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾

(ان لوگوں نے کہا کہ تم تو بس ایک سحر زدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ۱۵۳) تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو، تو تم کوئی نشانی لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۴)

اَلْمُسَحَّرِيْنَ ، مُسَحَّرٌ کی جمع ہے، سحر زدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دماغی اختلال اور پاگل پن کسی جن کے اثر سے لاحق ہوتا ہے یا جادو کے اثر سے۔ اس لئے جب وہ کسی کو سحر زدہ قرار دیتے ہیں تو مراد اس سے یہ ہوتی تھی کہ تم پاگل اور مجنون ہو۔

قوم کا جواب

قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کی تنقید کو قبول کرنے کی بجائے پاگل پن قرار دیا، کہ تمہیں نہ ہماری ترقی اچھی لگتی ہے، نہ ہمارے وسائل کی فراوانی۔ تمہیں ہماری معاشرت پر بھی اعتراض ہے اور ہمارے فن سنگ تراشی پر بھی۔ حتیٰ کہ تم ہمارے لیڈروں اور رہنماؤں پر بھی معترض ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں تو ہر بات میں کیڑے ہی نظر آتے ہیں۔ یہ کیفیت پاگل پن میں تو ہوسکتی ہے، عقلمندی میں نہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہو، لیکن تمہارا دماغ تو معلوم ہوتا ہے کہ بالکل چل گیا ہے۔

Marfat.com

عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں تمہاری دماغی صحت پر بھی شبہ ہے اور تم اپنے آپ کو نبی اور رسول کہتے ہو۔ حالانکہ نبوت اور رسالت ایک عظیم منصب ہے جو کسی انسان کو نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ اس میں کوئی غیر معمولی باتیں پائی جاتی ہیں۔ تم تو ہماری طرح ایک عام آدمی ہو۔ ہم تمہیں خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اور تمہارے ڈراووں سے مرعوب ہو کر اپنی تہذیب و ترقی کی بساط کیسے لپیٹ دیں۔ تم اگر اپنے دعوائے نبوت میں واقعی سچے ہو تو پھر کوئی ایسی نشانی دکھاؤ، جسے دیکھ کر ہم یقین کر لیں کہ بیشک تم خدا کے رسول ہو۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿١٥٥﴾
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥٦﴾

(حضرت صالح (علیہ السلام) نے کہا یہ ایک اونٹنی ہے، ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمہاری باری ہے۔ ۱۵۵) اسے کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ تمہیں ایک برے دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ ۱۵۶)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قومِ ثمود نے آپؑ سے یہ مطالبہ کیا کہ اس چٹان سے سرخ رنگ کی اونٹنی نکلے، جو دس ماہ کی حاملہ ہو اور ہماری آنکھوں کے سامنے بچہ جنے، تو ہم تمہیں رسول مان لیں گے۔ آپؑ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور اس چٹان سے ان کی مطلوبہ اونٹنی نکل آئی۔

قوم کے مطالبے پر نشانی کا ظہور

بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ وہ ایک عام اونٹنی تھی، ہوسکتا ہے کہ وہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم ثمود کی آزمائش کیلئے اسے مقرر کر دیا گیا۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ قومِ ثمود نے معجزہ طلب کیا تھا اور کوئی سی اونٹنی بطور معجزہ اگر پیش کی جاتی تو قوم اسے یقیناً ایک مذاق سمجھتی۔ اور سورۃ ہود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے جو اونٹنی ان کے سامنے پیش کی، قرآنِ کریم نے اسے آیت، یعنی معجزہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق وہ اونٹنی ایک چٹان سے نکلی ہو تو کوئی بعید بات نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو اس قوم کیلئے ایک آزمائش بنا دیا۔ اولاً تو اونٹنی کا غیر معمولی طریقے سے وجود میں آنا ہی ان کے ایمان لانے کیلئے کافی ہونا چاہئے تھا لیکن مزید ان کیلئے اس بات کو آزائش بنایا گیا کہ یہ اونٹنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مقابل میں ایک بند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تم نے اس بند کو توڑا تو تم پر عذابِ الٰہی آدھمکے گا۔ ایک دن تنہا یہ اونٹنی تمہارے کنوؤں اور چشموں سے پانی پیئے گی اور ایک دن ساری قوم کے انسان اور حیوان پانی پیئیں گے۔ جو دن اونٹنی کی باری کا ہو اس دن کوئی اس کے مزاحم ہونے کی کوشش نہ کرے۔ عرب میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے اس کی جو اہمیت تھی اس کے پیشِ نظر یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ اور قوم چونکہ اپنی آنکھوں سے غیر معمولی طریقے سے چٹان سے اونٹنی کا نکلنا دیکھ چکی تھی اس لئے وہ اتنے سخت مطالبے پر بھی احتجاج تو کیا کرتی، خاموش رہی۔ اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کتنا عرصہ اس آزمائش کی بجا آوری میں گزرا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے اس اونٹنی کو کوئی نقصان پہنچایا تو ہم پر کوئی تباہی آسکتی ہے۔

Marfat.com

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

(پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر ہو گئے پچھتانے والے۔ ۱۵۷)

اگر یہ لوگ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر ایمان لے آتے تو یہ آزمائش ان سے ٹل جاتی۔ایک عرصے تک انہوں نے اس صورتحال کو برداشت کیا، لیکن ایمان لانے کیلئے تیار نہ ہوئے۔بغیر ایمان کے وہ کب تک اس پابندی کو نبھا سکتے تھے۔آخر ان میں سے سب سے بڑے بدبخت نے جسارت کر کے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔پھر ہوش آیا تو اپنے کئے پر پچھتانے لگے۔لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا کیونکہ انہیں یہ بتایا جا چکا تھا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانی ہے، کوئی نقصان پہنچایا تو تمہیں عذاب آدبوچے گا۔تو جب عذاب سر پر پہنچ جاتا ہے تو پھر کسی طرح کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔اس لئے ان کی ندامت بھی ان کے کام نہ آئی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو گئے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾

(بالآخر ان کو عذاب نے آپکڑا، بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان
لانے والے نہیں۔ ۱۵۸) اور بیشک تیرا رب عزیز اور رحیم ہے۔ ۱۵۹)

جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس نشانی کو بھی ظلم اور تعدی کا نشانہ بنایا اور اس کی حرمت کو پامال کر ڈالا تو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آ گیا۔اور قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ اب تمہارے لئے صرف تین دن کی مہلت ہے۔ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ''تین دن اپنے گھروں میں مزے کرلو'' اس مہلت کے ختم ہونے کے بعد رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سوکھی جھاڑیاں جانوروں کی آمدورفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔

اس کے بعد ترجیع کی آیت ہے جس کی وضاحت اس سے پہلے ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ

قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ
عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ

Marfat.com

مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ
قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾
قَالَ اِنِّىْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِىْ وَاَهْلِىْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا
الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

رکوع: ۹۔ (قومِ لوط نے بھی رسول کی تکذیب کی۔ ۱۶۰) یاد کرو جبکہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا، کیا تم
ڈرتے نہیں۔ ۱۶۱) بیشک میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۶۲) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت
کرو۔ ۱۶۳) اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو اس کے ذمہ ہے جو رب العالمین ہے۔
۱۶۴) کیا تم ساری مخلوق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ ۱۶۵) اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے
بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶۶) انہوں نے کہا، (خاموش) اے
لوط، اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا۔ ۱۶۷) حضرت لوط نے کہا میں تمہارے اس عمل
سے سخت بیزار ہوں۔ ۱۶۸) اے میرے رب! تو مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں (ان کے عمل کے
انجام) سے نجات دے۔ ۱۶۹) آخرکار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل وعیال کو نجات دی۔ ۱۷۰) بجز ایک
بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ ۱۷۱) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۷۲) پھر ان پر برسائی ایک
بارش، تو کیا ہی بری تھی وہ بارش جو ان پر برسی جن کو انجام سے آگاہ کیا جا چکا تھا۔ ۱۷۳) بیشک اس کے اندر بہت بڑی
نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ ۱۷۴) اور بیشک تیرا رب عزیز ورحیم ہے۔ ۱۷۵)

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۣالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾

Marfat.com

(قومِ لوط نے بھی رسول کی تکذیب کی۔ ۱۶۰) یاد کرو جبکہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۶۱) بیشک میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۶۲) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۶۳) اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو اس کے ذمہ ہے جو رب العالمین ہے۔ ۱۶۴)

یہ آیات گزشتہ انبیاء کرام کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

(کیا تم ساری مخلوق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ ۱۶۵) اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶۶)

سرکشی اور نافرمانی نئی نئی گمراہیوں کو جنم دیتی ہے

نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ جس طرح نیکیوں اور اچھائیوں کا ایک سلسلۂ نسب ہے کہ ایک نیکی دوسری سے پھوٹتی ہے اور اس طرح سے ایک سلسلۃ الذہب کو وجود دیتی ہے۔ اسی طرح برائی کبھی منفرد نہیں ہوتی۔ جب دلوں سے اللہ تعالیٰ کا خوف اٹھ جاتا ہے اور ان میں بعض دوسری چیزیں گھر کر جاتی ہیں تو ایسے دلوں سے نئی نئی برائیوں کی خواہشیں سر اٹھاتی اور نئی نئی قباحتیں جنم لیتی ہیں۔ پیشِ نظر آیات میں قومِ لوط کی ایک بہت بڑی برائی کا ذکر کیا جا رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اندر صرف یہی ایک برائی پائی جاتی تھی بلکہ اس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان کے مزاج اور ماحول کا فساد کس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جس نے ان کی فطرت تک کو بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔

فطرت کا بگاڑ

ہر شخص فطری طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل کیلئے عورت کی طرف میلان رکھتا ہے۔ اسی سے شخصیت کا خلاء بھرتا، فطرت کا تقاضا پورا ہوتا اور سلسلۂ نسب کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مرد کا مرد سے شہوت رانی کا تعلق یہ خلافِ فطرت فعل ہے جو مزاج کے فساد اور ماحول کے بگاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی قوم من حیث المجموع اس میں مبتلا ہو جاتی ہے یا اس فعل کی شناعت اس قوم سے اٹھ جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شرم و حیاء جو نظامِ اخلاق کی ریڑھ کی ہڈی ہے وہ اٹھ چکا ہے۔ اور اب اس قوم میں خیر کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔ چنانچہ قومِ لوط کی اس برائی کے ذکر کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

آیتِ کریمہ کے الفاظ میں دو مطالب کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے خواہشِ نفس پوری کرنے کیلئے چھانٹ لیا ہے حالانکہ دنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کیلئے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔

Marfat.com

دوسری آیتِ کریمہ میں ایک بہت بڑے فطری نقصان کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تم اس حد تک اس برائی کے رسیا ہو گئے ہو کہ تمہاری فطرت بالکل مسخ ہو کے رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہوت رانی کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے عورت کو پیدا کیا ہے اور مرد اور عورت دونوں میں ایک دوسرے کی طلب پیدا کی ہے لیکن تم اس فطری تقاضے سے محروم ہو گئے ہو۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کھیتوں کو تم نے خشک ہونے کیلئے چھوڑ دیا ہے اور بنجر کو سیراب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم فطرت کی تمام حدود پامال کر چکے ہو اور تمہارے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

(انہوں نے کہا، (خاموش) اے لوط، اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا۔ ۱۶۷)

قوم کی فیصلہ کن دھمکی

بعض اہلِ علم نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''اے لوط! اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے بھی مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں نے ان کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی، یا جو کچھ وہ چاہتے تھے اس کے خلاف چلنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے بستی سے نکال دیا۔ حضرت لوط علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم بھی اب اس طرح کی باتیں کرو گے اور اس برائی پر احتجاج کرو گے تو ہم تمہیں بھی ملک بدر کر دیں گے۔ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اس برائی پر نکیر ایک مدت سے جاری کر رکھی تھی، اور وہ آپؑ کی اخلاقی برتری اور بزرگی کے باعث آپؑ کو برداشت کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن اب شاید آپؑ کی نواؤں میں تیزی آ گئی یا آپؑ نے ان کے گریبان جھنجوڑنے شروع کر دیئے تھے تو انہوں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اب لوط (علیہ السلام) اور اس کے خاندان والوں کو اس بستی سے نکال دیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کے اثرات دوسروں پر اثر انداز نہ ہو جائیں۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ النمل میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ''لوط اور اس کے خاندان والوں کو بستی سے نکال باہر کرو، یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔

قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

(حضرت لوطؑ نے کہا میں تمہارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ ۱۶۸)

حضرت لوط علیہ السلام کی استقامت

حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی دھمکی کے جواب میں نہایت استقامت اور اعتماد علی اللہ کا ثبوت دیتے ہوئے نہایت جرأت سے کہا کہ تم اگر مجھے اس بستی سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں حق بات کہنے سے باز آ جاؤں۔ میں تم پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تم جس قابلِ نفرت عملِ بد کا شکار ہو، میں اس سے شدید بغض اور نفرت رکھتا ہوں۔ یوں تو ''قلی'' کا معنی ہی شدید بغض و نفرت ہوتا ہے لیکن مِنَ الْقَالِيْنَ میں جمع لانے سے کلام میں زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اس عملِ بد سے صرف میں ہی بیزار نہیں ہوں بلکہ ہر وہ شخص جو فطرتِ سلیم اور عقلِ مستقیم رکھتا اور کسی بھی حد تک شریفانہ قدروں کا پاسبان ہے وہ اس انتہائی قابلِ نفرت فعل سے گھن کھاتا اور نفرت کرتا ہے۔ تم اگر مجھے نکالنا چاہتے ہو تو مجھے اس کی پرواہ نہیں اس لئے کہ کوئی شریف آدمی بھی تم جیسے لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔

Marfat.com

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

(اے میرے رب! تو مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں (ان کے عمل کے انجام) سے نجات دے۔ ۱۶۹)

حضرت لوط علیہ السلام کی دعا

حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی دھمکیوں سے اندازہ کر لیا کہ اب میری قوم آخری اقدام کر گزرنا چاہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب فیصلے کی آخری گھڑی قریب آ گئی ہے۔ ایسے موقع پر ہمیشہ سنتِ الٰہی حرکت میں آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے متعلقین اور اپنے اوپر ایمان لانے والوں اور اپنے آپ کو نجات دینے کی استدعا کی، کیونکہ "اَهْلٌ" اہلِ بیت کے ساتھ ساتھ ایمان لانے والوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں سے بھی کچھ لوگ ایمان لائے ہوں۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾

(آخرکار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل وعیال کو نجات دی۔ ۱۷۰) بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ ۱۷۱) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۷۲) پھر ان پر برسائی ایک بارش، تو کیا ہی بری تھی وہ بارش جو ان پر برسی جن کو انجام سے آگاہ کیا جا چکا تھا۔ ۱۷۳)

قبولیتِ دعا اور قوم کا انجام

قرآنِ کریم نے بعض دوسری سورتوں میں کسی حد تک تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح نوجوان مہمانوں کی شکل میں دو فرشتے عذاب کی اطلاع دینے کیلئے آئے اور کس طرح قوم کے لفنگوں نے برائی کے ارادہ سے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کا محاصرہ کیا اور کس طرح حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں گھر سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا۔ آپؑ کو اور آپؑ کے اہلِ خانہ کو بستی سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا، لیکن بیوی کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو ساتھ نہ لے جایا جائے کیونکہ وہ آپؑ پر ایمان نہیں رکھتی تھی۔ صبح ہوتے ہی ایک زور کا دھماکہ ہوا اور ایک ہولناک زلزلے نے ان کی بستیوں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ پھر ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ قرآنِ کریم کے اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارش دو طرح کی تھی، ایک تو آتش فشاں کے پھٹنے سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسے۔ اور دوسرے ایک طوفانی ہوا چلی جس نے ان پر پتھراؤ کیا۔ صاحب تفہیم القرآن نے اس عذاب کے حوالے سے جو تحقیقی نوٹ لکھا ہے وہ استفادہ کے قابل ہے۔

بائیبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانے میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار

Marfat.com

سکے۔آثارِقدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی وخوشحالی کا دور ۲۳۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۰۰ قبل مسیح تک رہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز وشاداب حصہ وہ تھا جسے بائیبل میں ''سدیم کی وادی'' کہا گیا ہے جس کے متعلق بائیبل کا بیان ہے کہ ''وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی۔'' (پیدائش، باب ۱۳۔آیت ۱۰)۔موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بحیرۂ مردار کے اندر غرق ہے اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔قدیم زمانہ میں بحیرۂ مردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔شرق اردن کے موجودہ شہر الکرک کے سامنے مغرب کی جانب اس بحیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما ''اللسان'' پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ملحقہ نقشے میں ہم نے آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے) پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی سدیم تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، ادمہ، ضبوئیم اور ضغر واقع تھے۔دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرہ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اتھلا حصہ ہے، مگر رومی عہد میں یہ اتنا اتھلا تھا کہ لوگ اللسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات ڈوبی ہوئی ہیں۔

بائیبل اور قدیم یونانی ولاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نفطہ (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔اب بھی وہاں زیرِ زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اڑ گیا۔بائیبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے۔ (پیدائش باب ۱۹۔آیت ۲۸)۔ (تفہیم القرآن)

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۴﴾ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۷۵﴾

(بیشک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ ۱۷۴)

اور بیشک تیرا رب عزیز ورحیم ہے۔ ۱۷۵)

یہ آیات سابقہ سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

Marfat.com

كَذَّبَ أَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾ إِذْ قَالَ
لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَأَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ وَمَآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوْا
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا
فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿١٨٣﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿١٨٤﴾
قَالُوْٓا إِنَّمَآ أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٨٥﴾ وَمَآ أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِنْ
نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿١٨٦﴾ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ إِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ رَبِّيْٓ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۚ إِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٨٩﴾
إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٠﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٩١﴾

رکوع: ۱۰۔ (اَصْحٰبُ الْئَيْكَةِ نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۷۶) یاد کرو جب شعیب (علیہ السلام) نے تم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۷۷) میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۷۸) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۷۹) میں اس کام پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۱۸۰) تم لوگ پورا پورا ناپو، اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ بنو۔ ۱۸۱) اور صحیح ترازو سے تولو۔ ۱۸۲) اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین میں فساد نہ مچاتے پھرو۔ ۱۸۳) اور اس ذات سے ڈرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلی نسلوں کو بھی۔ ۱۸۴) انہوں نے جواب دیا، تم تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہو۔ ۱۸۵) اور تم کچھ نہیں ہو، مگر

Marfat.com

ہمارے ہی جیسے ایک انسان، اور ہم تو تم کو بالکل جھوٹوں میں سے ہی خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۶) پس تم ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گراؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۸۷) حضرت شعیب نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ۱۸۸) پس انہوں نے اسے جھٹلا دیا، پس آ دبوچا ان کو چھتری والے دن کے عذاب نے، بیشک وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۹) بیشک اس میں بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ ۱۹۰) اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۱۹۱)

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۚ ﴿۱۷۶﴾

(اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ ۱۷۶)

اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ کی تحقیق

ایکۃ ...... جھاڑی اور جنگل کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ اور اَصْحٰبُ مَدْيَنَ دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور حضرت شعیب کی بعثت ان دونوں کی طرف ہوئی، لیکن جمہور مفسرین دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مدین کے پاس ایک جنگل بھی تھا، اس لئے اَصْحٰبُ مَدْيَنَ کو اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ بھی کہا جاتا ہے۔ صاحب تفہیم القرآن نے اس پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے، اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ کا مختصر ذکر سورۃ الحجر آیت ۷۸۔۸۴ میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مدین اور اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کیلئے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کو اہل مدین کا بھائی فرمایا گیا ہے۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا اور یہاں اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ (جبکہ ان سے شعیب نے کہا) ''ان کے بھائی'' (اَخُوْهُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں کیونکہ سورۃ الاعراف اور سورۃ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحاب مدین کے بیان ہوئے ہیں وہی یہاں اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ کے بیان ہو رہے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی یا اصحاب مدین کہلایا اور اس کی آبادی شمال حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ

Marfat.com

نما سینا کے آخری گوشے تک بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔اس کا صدر مقام شہر مدین تھا جس کی جائے وقوع ابوالفدا نے خلیج عقبہ کے مغربی کنارے ایلہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔باقی بنی قطورا جن میں بنی ددان (Dedanites) نسبۃً زیادہ مشہور ہیں،شمالی عرب میں تیماء اور تبوک اور العلاء کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔(یاقوت نے معجم البلدان میں لفظ ایکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہل تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کیلئے ایک ہی پیغمبر مبعوث کئے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے،ایک ہی زبان بولتے تھے،اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔بائیبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بعلِ فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو ان کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زنا کاری کی وبا پھیلا دی (گنتی، باب ۲۵ آیت ۱-۵، باب ۳۱ آیت ۱۶-۱۷) پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر راہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لئے بغیر نہ گزرتے دیتے تھے،اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ "یہ دونوں (قوم لوط اور اصحاب الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے۔" اور ان کی راہزنی کا ذکر سورۃ الاعراف میں اس طرح کیا گیا ہے وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ "اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو" یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کیلئے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔ (تفہیم القرآن)

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

(یاد کرو جب شعیب (علیہ السلام) نے تم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں۔ ۱۷۷) میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ ۱۷۸) پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ۱۷۹) میں اس کام پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا،میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ ۱۸۰)

یہ آیات اوپر انبیائے کرام کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾

(تم لوگ پورا پورا ناپو،اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ بنو۔ ۱۸۱) اور صحیح ترازو سے تولو۔ ۱۸۲)

Marfat.com

قومِ شعیب کی سب سے نمایاں برائی پر تنقید

گزشتہ انبیائے کرام کی امتوں کے احوال میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ہر امت کی تمام برائیوں اور قباحتوں کا ذکر کرنے کی بجائے ان برائیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کی اجتماعی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی علامت بن جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ ان میں اتنی بڑی بڑی برائیوں کے پیدا ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے نیاز اور آخرت میں جوابدہی کے احساس سے تہی دامن تھے۔ اور اسی آخرت فراموشی نے ان کے سیرت و کردار کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور ان کے اجتماعی معاملات تلپٹ کر دیئے تھے۔ اصحابِ مدین جنہیں اصحابُ الایکہ کہا گیا ہے تجارت پیشہ لوگ تھے اور اس پیشے میں انہوں نے غیر معمولی ترقی کی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام انہیں کی طرف مبعوث ہوئے۔ خدا فراموشی اور آخرت فراموشی نے ان کے اندر جو سیرت و کردار کا فساد اور معاملات کی خرابی پیدا کی تھی۔ ان میں سب سے بڑی برائی جس نے ان کی اجتماعی زندگی کو بالکل تباہ کر دیا تھا، وہ ناپ تول میں کمی تھی۔ ان کے لینے کے باٹ اور تھے اور دینے کے باٹ اور۔ ہر ممکن طریقے سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس برائی سے چونکہ جلبِ زر کا جذبہ اور دولت کی ہوس بڑھتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا معاشی نظام خرابیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ نئی نئی معاشی بیماریاں پھوٹتی ہیں، بے ایمانی، ناپ تول میں دغا بازی، ملاوٹ، تہہ بازاری اور چور بازاری کی ایسی ایسی شکلیں وجود میں آتی ہیں کہ معاشرے کا ہر شخص بلبلا اٹھتا ہے اور پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ معاشی خرابیاں جس طرح اخلاقی خرابیوں کو جنم دیتی ہیں، اسی طرح معاشرے کے معاملات میں ابتری بھی پیدا ہوتی ہے، تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے سے شاکی اور اپنے ملک سے متنفر ہونے لگتا ہے۔ اجتماعی زندگی کا وہ توازن جو کسی بھی قوم کی شیرازہ بندی کی بنیاد ہے، شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ قوم ایسے تمام فسادات کا مرکز بن چکی تھی، لیکن تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ ایک ہولناک تباہی کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن انہیں اس بات کا ہوش نہ تھا۔ بگڑی ہوئی قوموں کا بالعموم یہی حال ہوتا ہے کہ ان کے مالدار مال مست ہو جاتے ہیں اور ان کے باقی طبقے حال مست۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں آ پکڑتا ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

(اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین میں فساد نہ مچاتے پھرو۔ ۱۸۳)

ناپ تول میں کمی اور ملاوٹ فساد کا پیش خیمہ ہے

ناپ تول میں کمی اور ڈنڈی مارنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی چیز میں کمی کی جائے۔ معاوضہ زیادہ لیا جائے اور چیز کم دی جائے۔ اس سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے اسی کے نتیجے میں ملاوٹ کی برائی جنم لیتی ہے۔ اس طرح بظاہر دکاندار گاہک کو چیز تو پوری دیتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ چیز پوری نہیں ہوتی بلکہ دوسری چیز ملا کر اسے پورا کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف ناپ تول میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف ملاوٹ کے ذریعے صحتوں کی بربادی کا راستہ کھلتا ہے۔ بعض دفعہ ملاوٹ تو ایسی چیز سے کی جاتی ہے جو اصل چیز سے قیمت میں کم ہوتی ہے۔ اس میں تو صرف مالی نقصان ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ ملاوٹ مضرِ صحت اشیاء کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس میں لینے والے کا صرف مالی نقصان نہیں ہوتا بلکہ صحت بھی برباد ہوتی ہے۔ دودھ اور دہی میں آج جو کچھ ملایا جاتا ہے اس کا تصور ہی کپکپا دینے کیلئے کافی ہے۔

Marfat.com

مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں ملائی جاتی ہیں، گھی میں چربی، شکر میں ریت، اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ملائی جاتی ہیں جو صحت کی تباہی کا باعث بن رہی ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ دوا جو علاج کیلئے کھائی جاتی ہے خود اس میں بھی ملاوٹ کی جاتی ہے۔ ایسی تمام برائیاں اہلِ مدین میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سرزمین میں زندگی کا توازن رخصت ہو جانے کے باعث بربادی کے راستے کھل گئے تھے، اور زندگی کا ہر شعبہ فساد کا شکار ہو گیا تھا بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم ہوسِ زر میں اس حد تک اندھی ہو گئی تھی کہ چونکہ بڑے بڑے تجارتی راستوں پر ان کا قبضہ تھا تو ان کی نفع اندوزی کی بڑھی ہوئی خواہش نے راستوں کو فساد کا مرکز بنا دیا تھا۔ جو قافلہ بھی ان راستوں سے گزرتا، ٹیکسوں کے نام پر اسے لوٹنے کی کوشش کی جاتی۔ مختصر یہ کہ ہوس کی مختلف صورتوں نے تمام تجارتی اور مالی معاملات کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا کہ بازاروں میں گاہک لٹتے تھے اور سرحدوں پر قافلے لوٹے جا رہے تھے۔ اور اس طرح انسانی زندگی فساد کا شکار ہو چکی تھی۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۴﴾

(اور اس ذات سے ڈرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تم سے پہلی نسلوں کو بھی۔ ۱۸۴)

جِبِلَّۃ کے معنی ہیں خلق و خلقت۔

تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تاریخ سے سبق لینے کی طرف توجہ دلائی کہ تمہیں اگر کوئی اور حقیقت اپیل نہیں کرتی تو گزشتہ تاریخ پڑھ کے دیکھ لو۔ جن قوموں نے بھی تمدن و معاشرت میں فساد پیدا کیا وہ نیست و نابود کر دی گئیں۔ تم ان سے بڑھ کر زمین کو فساد سے بھر چکے ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق تمہیں مہلت دیتا چلا جائے۔ اگر تم نے اپنے رویئے کو درست نہ کیا تو چونکہ وہ عادل ہے نہ کسی سے زیادتی کرتا ہے اور نہ بلاوجہ کسی کو ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔ جس جرم کے باعث پہلی قومیں عذاب کا شکار ہوئیں، کوئی وجہ نہیں کہ تم اسی جرم کے باوجود اس کے عذاب سے بچے رہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ
الْكٰذِبِیْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۷﴾

(انہوں نے جواب دیا، تم تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہو۔ ۱۸۵) اور تم کچھ نہیں ہو، مگر ہمارے ہی جیسے ایک انسان، اور ہم تو تم کو بالکل جھوٹوں میں سے ہی خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۶) پس تم ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گراؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۸۷)

قومِ شعیب کا مطالبۂ عذاب

قومِ شعیب نے بالکل وہی جواب دیا جو ہمیشہ بگڑی ہوئی قومیں پیغمبروں کو دیتی رہی ہیں۔ اور اس سے پہلے گزرنے والی سرگزشتوں میں ہم اسے پڑھ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم یہ جو الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو اور ہماری ترقی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور دنیاداری کے معاملات کو تم روحانیت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے تمہارے دماغ

Marfat.com

میں اختلال آ گیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ تمہیں کبھی عذاب نظر آنے لگتا ہے اور تم ہمیں ڈرانے لگتے ہو۔ رہی یہ بات کہ تم اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی وجہ سے ہمیں آنے والے خطرات سے باخبر کرنا چاہتے ہو، تو ہمارا گمان یہ ہے کہ تم رسول ہونے کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہو، کیونکہ رسالت ایک غیر معمولی منصب ہے، وہ ہر کہ ومہ کو تو نہیں مل سکتا۔ تم تو ہمارے جیسے ایک بشر ہو جس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں، تو ہم تمہیں رسول کیسے تسلیم کر لیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ تم یہ بھی کہتے ہو کہ اگر ہم نے تمہاری بات نہ مانی، تو آسمان ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔ تو ٹھیک ہے تم آسمان سے کوئی ٹکڑا گرا کے دکھادو۔ لیکن جب تک آسمان کا کوئی ٹکڑا نہیں گرتا ہم کیسے باور کر لیں کہ تم واقعی اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہو۔

قَالَ رَبِّيٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

(حضرت شعیب نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ۱۸۸)

اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے

جب پیغمبر اپنی قوم کی ہدایت سے مایوس ہو جاتا ہے تو ان کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوا اس طرح کی بات کہتا ہے۔ کہنا مقصود یہ ہے کہ آسمان سے ٹکڑے گرانا میرے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ میں تو اتنی بات جانتا ہوں کہ جو قوم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کی تکذیب کرتی اور اس پر نازل کئے جانے والے دین کا انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک خاص حد تک اسے سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ قوم عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ وقت کب آئے گا، اسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ اب تم میں قبولیت کی آخری امید بھی باقی نہیں رہی تو پھر اس کا عذاب نازل ہو جائے گا۔ وہ زمین سے ابل بھی سکتا ہے اور آسمان سے برس بھی سکتا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے جواب میں کفار قریش کیلئے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ نبی کریم ﷺ سے بھی ایسے ہی مطالبے کرتے رہتے تھے۔ اَوْتُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا ''یا پھر گرا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا، جیسے کہ تیرا دعویٰ ہے۔'' اسی لئے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا۔ جو جواب انہیں ملا، وہی تمہاری طلب کا جواب بھی ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

(پس انہوں نے اسے جھٹلا دیا، پس آدبوچا ان کو چھتری والے دن کے عذاب نے،
بیشک وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۹)

يَوْمِ الظُّلَّةِ کا عذاب آ گیا

قوم شعیب پر جو عذاب آیا، اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ اس آیت کے ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا، وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ سورۃ ہود آیت ۹۴ میں اس آیت کی تعبیر لفظ صَيْحَةٌ سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا ابر یا دھویں کے ایک ستون یا سائبان کی شکل میں نظر آیا۔ اور پھر اس نے صَيْحَةٌ کی شکل اختیار کر لی۔

Marfat.com

ابنِ جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے من حدثک من العلماء ماعذاب یوم الظلة فکذبه "علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلة کا عذاب کیا تھا، اس نے جھوٹ بولا۔" واللہ اعلم۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۹۱﴾

(بیشک اس میں بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ ۱۹۰) اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۱۹۱)

گزشتہ ہر سرگزشت کے بعد اس آیت کی تشریح ہو چکی ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ
الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ
عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً
اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ
الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ
فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾
فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ
مَّا كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا
مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰی ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا
تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّیٰطِیْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ

Marfat.com

تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ
مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾
هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ
اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ
بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

رکوع: ۱۱۔ (اور بیشک یہ (قرآنِ کریم) نہایت اہتمام سے پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ ۱۹۲) اسے لے کر آپ کے دل پر امانتدار روح اتری ہے۔ ۱۹۳) تاکہ آپ لوگوں کو انذار کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ ۱۹۴) (ایسی عربی زبان میں جو بالکل واضح ہے۔ ۱۹۵) اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے۔ ۱۹۶) کیا ان لوگوں کیلئے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اس کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔ ۱۹۷) اگر ہم اسے کسی عجمی پر اتارتے۔ ۱۹۸) اور وہ ان کو پڑھ کر سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔ ۱۹۹) ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح گزارتے ہیں۔ ۲۰۰) یہ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔ ۲۰۱) پس وہ ان پر اچانک آدھمکے گا اور وہ اس سے بے خبر ہوں گے۔ ۲۰۲) اس وقت کہیں گے کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی۔ ۲۰۳) کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کیلئے جلدی مچا رہے ہیں۔ ۲۰۴) کیا آپ نے غور کیا کہ اگر ہم ان کو چند سال تک اور بہرہ مند رکھیں۔ ۲۰۵) پھر ان کے پاس وہی چیز آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ۲۰۶) تو ان کے کس کام آئے گا جس سے وہ بہرہ مند رکھے گئے تھے۔ ۲۰۷) اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کیلئے پہلے ڈرانے

Marfat.com

والے بھیجے۔ ۲۰۸) یاددہانی کیلئے، اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۰۹) اس کو شیاطین لے کرنہیں اترے ہیں۔ ۲۱۰) نہ ان کیلئے لائق ہے اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ ۲۱۱) وہ تو اس کی سماعت سے بھی معزول کئے جا چکے ہیں۔ ۲۱۲) پس اے پیغمبر! اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکارو ورنہ آپ بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ ۲۱۳) اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ۔ ۲۱۴) اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ آپ کی پیروی اختیار کریں ان کیلئے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھیں۔ ۲۱۵) اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ۲۱۶) اور بھروسہ کیجئے خدائے عزیز ورحیم پر۔ ۲۱۷) جو آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے جس وقت آپ کھڑے ہوتے ہیں۔ ۲۱۸) اور دیکھ رہا ہوتا ہے آپ کی آمد وشد کو سجدہ کرنے والوں میں۔ ۲۱۹) بیشک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ ۲۲۰) کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ ۲۲۱) وہ اترتے ہیں ہر جھوٹ گھڑنے والے بدکار پر۔ ۲۲۲) وہ اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ ۲۲۳) اور شعراء، بہکے ہوئے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ۲۲۴) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ ۲۲۵) وہ کہا کرتے ہیں ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ ۲۲۶) بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے جنہوں نے نیک اعمال کئے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا، اور انہوں نے بدلہ لیا اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کئے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۷)

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾
عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

(اور بیشک یہ (قرآن کریم) نہایت اہتمام سے پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ ۱۹۲) اسے لے کر آپ کے دل پر امانتدار روح اتری ہے۔ ۱۹۳) تاکہ آپ لوگوں کو انذار کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ ۱۹۴)

خاتمۂ سورۃ کی آیات، قرآنِ کریم کا مرتبہ ومقام

یہاں سے خاتمۂ سورۃ کی آیات شروع ہو رہی ہیں اور اس سورۃ کی آخری آیات اپنے اسلوب کے مطابق اولین آیات کا تتمہ اور اس کے مرکزی مضمون سے وابستہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کس قدر مربوط کتاب ہے۔ سورۃ کے آغاز میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کا کتابِ الٰہی ہونا بالکل واضح ہے۔ جو لوگ اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں اور پھر اس پر کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ محض بہانہ جو ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہر طرح کی نشانی دکھا دینا کوئی بعید بات نہیں، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ نہ کسی کو زبردستی گمراہ رکھا جائے اور نہ کسی کو زبردستی ہدایت دی جائے۔ غیر معمولی نشانیاں دکھا کر ایمان کی طرف مائل کرنا درحقیقت عقل پر جبر کرنا ہے جبکہ اس کے پیشِ نظر یہ ہے کہ جو شخص بھی ایمان لائے وہ عقل وبصیرت سے کام لے کر ایمان لائے۔ البتہ ہٹ دھرمی اور طریقِ آباء پر عصبیت نے پہلے بھی قوموں کو تباہ کیا ہے اور اب بھی اس کی زہرناکی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پھر اس بات کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کرنے کیلئے متعدد انبیائے کرام کی سرگزشتیں بیان فرمائی گئیں اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ ان سرگزشتوں میں کتنی نشانیاں ہیں جو ان

Marfat.com

قوموں کو دکھائی گئیں لیکن وہ محض اپنی ہٹ دھرمی کے باعث ہدایت کا راستہ اختیار نہ کر سکیں۔ اور مزید یہ کہ خود ان قوموں کی سرگزشتیں بجائے خود اپنے اندر ایسی نشانیاں رکھتی ہیں جو نشانیوں کے طلبگاروں کیلئے کافی ووافی ہیں۔ ان سرگزشتوں کو ختم کرنے کے بعد کلام پھر اصل مضمون کی طرف پلٹ گیا ہے اور نہایت وضاحت سے بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اپنے آخری رسول پر جو کتاب اتاری ہے اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔

سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ قرآنِ کریم رب العالمین نے نہایت اہتمام کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔ تنزیل کے معنی اہتمام سے اتارنے کے ہیں۔ اس میں مخالفین کیلئے تنبیہ ہے کہ تم اس کلام کو عام کسی کلام پر قیاس مت کرو، اسے رب العالمین نے اتارا ہے اور رب العالمین کی شان یہ ہے کہ جس طرح اس کی ربوبیت نے انسان کی جسمانی ضروریات کو بہم پہنچایا ہے اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے تقاضوں کو جس طرح اس کے فیضانِ ربوبیت نے پورا کیا اور پھر جس طرح بوقتِ ضرورت حواس اور عقل کا نور عطا فرمایا ہے اور ایک فرد سے لے کر تمام نوعِ انسانی تک جس طرح اس کی ربوبیت نے جود و کرم کی بارش کی ہے اور کسی کو بھی اپنے فیضان سے محروم نہیں رہنے دیا، بالکل اسی رب العالمین نے ہمہ جہت، ہمہ نوع اور ہمہ گیر قسم کی معنوی اور روحانی ربوبیت سے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا ہے۔ اس میں انسانی ہدایت کی کسی ضرورت کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ جہاں تک اس کی حفاظت وصیانت کا تعلق ہے اس کی نزاکتوں اور باریکیوں کا اس حد تک لحاظ فرمایا گیا ہے کہ اسے لے کر وہ فرشتہ نازل ہوا ہے جو سب فرشتوں کا مطاع اور سردار ہے، جس کی قوتوں کا کوئی ہمسر نہیں، جو اپنے اندر ملکوتی صفات رکھنے کے ساتھ ساتھ روحانیت کا وہ اعلیٰ معیار رکھتا ہے کہ اسے پروردگار نے روح سے پکارا ہے اور اسے روح کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اپنی خلقی معصومیت اور فطری روحانیت کے باوجود اسے امین نام دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کلام اس کی حفاظت میں دیا جاتا ہے اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کا تصور بھی محال ہے۔ اور شاید اسی بات پر زور دینے کیلئے اس فرشتے کے اصل نام کی بجائے اس کی دو عظیم صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہونا چاہئے کہ روح الامین وہی فرشتہ ہے جس کا نام جبرائیل ہے۔ کیونکہ یہاں جس فرشتے کی صفات بیان ہو رہی ہیں وہ اس حوالے سے ہو رہی ہیں کہ وہ فرشتہ اس قرآنِ کریم کو لے کر نازل ہوا ہے اور قرآنِ کریم نے سورۃ بقرہ کی آیت ۹۷ میں صاف صاف فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ”کہہ دیجئے، کہ جو کوئی دشمن ہے جبرائیل کا تو اسے معلوم ہو کہ اسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے آپؐ کے دل پر نازل کیا ہے۔“

مزید فرمایا کہ وہ روح الامین یعنی جبرائیل اس قرآن کو لے کر آپؐ کے قلب پر نازل ہوا ہے، آپؐ کے نفس پر نہیں۔ قلب انسان کے وجود کا اشرف واعلیٰ حصہ ہے، اس وجہ سے اس شبے کا کوئی امکان نہیں رہتا کہ اس میں کسی نفسانی وسوسہ یا شیطانی دغدغہ کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے رسول کا نفس بھی طہارت وعصمت میں ملفوف ہوتا ہے، لیکن بہت دور کے شبہ کو دور کرنے کیلئے بھی پروردگار نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کلام کو آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا ہے۔ اور جو چیز براہِ راست قلب میں اترتی ہے اس میں کسی کمی بیشی کا احتمال نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اس کلام کے اس اہتمام کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ قرآن اس لئے آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا گیا ہے کہ آپؐ اس کے ذریعے سے ان لوگوں کو انذار اور خبردار کر دیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت سے بے پرواہ ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ان پر یہ بات واضح کر دیں کہ غفلت کے نتائج وعواقب کیا ہو سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام محض کلام نہیں بلکہ یہ انذار ہے اور آپ صرف ایک مبلغ نہیں بلکہ منذر ہیں۔ اس لئے لوگوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص اس انذار کو نظر انداز کرے گا اس کا انجام نہایت خطرناک ہوگا۔

Marfat.com

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾

(ایسی عربی زبان میں جو بالکل واضح ہے۔ ۱۹۵)

اہلِ عرب پر احسان اور تنبیہ

قرآنِ کریم کی حقانیت کو واضح کرنے کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس کو ایک ایسی زبان میں نازل کیا ہے جو خود تمہاری اپنی زبان ہے اور اسلوب ایسا رکھا گیا ہے جو تمہارے لئے اطمینان بخش طریقے سے قابلِ فہم اور واضح الدلالت ہے، جس کی کوئی آیت بھی چیستان کی طرح گنجلک زبان نہیں رکھتی۔ اس کا مفہوم و مدعا ہر عربی زبان جاننے والا شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر ایسی فصاحت و بلاغت اور ایسے اعلیٰ پائے کا اندازِ بیان رکھتی ہے کہ جس کی مثال لانا انسانی استطاعت سے باہر ہے۔

ایک ایسی کتاب جس کی حقانیت کو چیلنج نہ کیا جاسکے اور جس کا سمجھنا انسانی فہم کیلئے نہایت آسان ہو، اور جس کی ہر بات نہایت اطمینان بخش طریقے سے عمل میں لائی جاسکتی ہو، اور جس کی کوئی حقیقت اور کوئی خبر مرورِ زمانہ سے کہنہ نہ ہوسکے۔ وہ یقیناً اپنے اندر اتمامِ حجت کی شان بھی رکھتی ہے۔ جہاں اس کا آسان اور قابلِ عمل ہونا اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے وہیں وہ اہلِ دنیا کیلئے اتمامِ حجت بھی ہے۔ ایسی اوصاف کی حامل کتاب پر بھی اگر قریش اور دیگر مخالفین ایمان نہیں لاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی بیماری میں مبتلا ہیں جس بیماری میں وہ قومیں مبتلا تھیں جن پر اس سے پہلے عذاب نازل ہو چکا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾

(اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے۔ ۱۹۶) کیا ان لوگوں کیلئے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اس کو علماءِ بنی اسرائیل جانتے ہیں۔ ۱۹۷)

قرآنِ کریم کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت

یہ قرآنِ کریم کے حق میں سابقہ آسمانی کتابوں کی شہادت کا حوالہ ہے۔ کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کا ذکر اور اس کی پیشین گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اور نبی کریم ﷺ اور آپ ؐ کی تعلیم و دعوت سے متعلق تورات، زبور اور انجیل میں پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ قرآنِ کریم جن بنیادی باتوں کی دعوت دیتا ہے، یعنی ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کا بلاوا، آخرت کی زندگی کا عقیدہ، انبیائے کرام کی پیروی، اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا تصور اور انسان سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنی خود مختاری سے دستبردار ہو کر ان احکامِ الٰہی کی پیروی اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کئے ہیں۔ ان میں سے ہر بات پہلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے اور انہیں باتوں کو قرآنِ کریم پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی ذات اور آپ ؐ کی دعوت سے متعلق واضح پیشین گوئیاں سابقہ صحیفوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور اہلِ کتاب کے علماء انہیں پڑھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کو پہچانتے بھی ہیں کہ یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کا ہماری کتابوں میں ذکر ہے۔ اور یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کی نشانیاں ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ تو کیا اس کے بعد بھی قریش اور دیگر

Marfat.com

مخالفین کو کسی اور نشانی کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ عرب چونکہ اُمی تھے اور اہلِ کتاب شریعت کا علم رکھتے تھے اس لئے وہ دینی معاملات میں اہلِ کتاب کی برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ اس لئے ان کے سامنے اہلِ کتاب ہی کی شہادت پیش کی گئی ہے کہ ان میں سے جو لوگ اہلِ کتاب میں سے زندہ ضمیر رکھتے ہیں اور نسلی عصبیت نے انہیں اندھا نہیں کیا وہ ان سے پوچھ لیں، وہ شہادت دیں گے کہ یہ کتاب واقعی وہی کتاب ہے اور یہ نبی واقعی وہی نبی ہے جس کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔

علماء بنی اسرائیل کی گواہی

آنحضرت ﷺ کی مبارک زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے کہ اہلِ کتاب کے ان علماء نے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تھے آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی حقانیت کی گواہی دی۔ سیرت ابنِ ہشام میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حبش سے حضرت جعفرؓ کی دعوت سن کر تیس آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجدِ حرام میں کفارِ قریش کے سامنے رسول اللہ ﷺ سے مل کر دریافت کیا کہ آپؐ کیا تعلیم لائے ہیں؟ حضور ﷺ نے جواب میں ان کو قرآنِ کریم کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپؐ کے رسولِ برحق ہونے کی تصدیق کر کے آپؐ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضورؐ کے پاس سے اٹھے تو ابوجہل قریش کے چند لوگوں کے ساتھ ان سے ملا اور انہیں سخت ملامت کی۔ اس نے کہا، تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ نامرادو! تمہارے یہاں کے لوگوں نے تمہیں اس لئے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر تم ابھی اس سے ملے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ بیٹھے۔ وہ شریف لوگ ابوجہل کی اس زجر و توبیخ پر الجھنے کی بجائے سلام کر کے ہٹ گئے، اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ آپ اپنے دین کے مختار ہیں اور ہم اپنے دین کے۔ ہمیں جس چیز میں اپنی خیر نظر آئی، ہم نے اسے اختیار کر لیا۔ (جلد دوم، ص ۳۲) قرآنِ کریم میں بھی سورۃ القصص میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

(اگر ہم اسے کسی عجمی پر اتارتے۔ ۱۹۸) اور وہ ان کو پڑھ کر سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔ ۱۹۹)

قریش کے مطالبے کا جواب

قومیں جب بگڑتی ہیں تو فکر و عمل کی سلامتی سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ کوئی صحیح سے صحیح تر بات اور واضح سے واضح تر بات بھی جو ان کے مفادات اور مزعومات سے متصادم ہو، ان کیلئے اپیل نہیں رکھتی۔ قرآنِ کریم کا عربی مبین میں نازل کیا جانا اہلِ عرب کیلئے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا۔ وہ بجائے اس کے کہ اس احسان کی قدر کرتے اور آگے بڑھ کر قرآنِ کریم کو سینے سے لگاتے، انہوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ایک عربی اگر فصیح عربی زبان میں کوئی کتاب پڑھ کر سناتا ہے تو اس میں خوبی کی کیا بات ہے۔ جس شخص کی زبان عربی ہے اس کیلئے عربی پڑھنا یا سنانا یا چند لوگوں کی معاونت سے فصیح عربی کتاب مرتب کر دینا کوئی بڑا کام نہیں۔ قابلِ ذکر بات تو جب ہوتی جب قرآنِ کریم کو کسی عجمی پر نازل کیا جاتا تو وہ اسے فر فر لوگوں کو پڑھ کر سناتا تو ہم اسے واقعی ایک معجزہ سمجھ کر اس سے ایمان لے آتے۔ پروردگار اس کے جواب میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر ہم اس کتاب کو کسی عجمی پر نازل کر دیتے تو یہ تب بھی ایمان نہ لاتے، اور اسے جھٹلانے کیلئے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لیتے۔ کیونکہ جو فرد یا قوم تکذیب کے راستے پر چل نکلتی ہے تو وہ واضح سے واضح بات پر بھی کوئی نہ کوئی توجیہ پیدا کر لیتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم

Marfat.com

نے سورۃ الحجر آیات ۱۴۔۱۵ میں اس کی ایک مثال دی ہے۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ "اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس پر چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾
فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

(ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح گزارتے ہیں۔ ۲۰۰) یہ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔ ۲۰۱) پس وہ ان پر اچانک آ دھمکے گا اور وہ اس سے بے خبر ہوں گے۔ ۲۰۲) اس وقت کہیں گے کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی۔ ۲۰۳)

قرآنِ کریم کی دعوت قبول نہ کرنے کا سبب

قرآنِ کریم کی حقانیت، فہم وافہام کیلئے اس کی سہولت، پہلی آسمانی کتابوں اور علماء بنی اسرائیل کی شہادت کے بعد قرآنِ کریم کے قاری کو یہ توقع پیدا ہو جاتی ہے کہ اب قرآنِ کریم کی دعوت کے قبول کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کے مخاطب لوگ یقیناً آگے بڑھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ کے انکار اور تمرد میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ان کی مخالفت ضد اور عناد تک جا پہنچی ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی حیرت واستعجاب کو دور کرنے کیلئے اس کے حقیقی سبب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کا معدہ بگڑتا ہے اور نظامِ انہضام میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بہتر سے بہتر غذا اور مقوی اور مرغن اشیاء بھی نہ صرف اسے ہضم نہیں ہوتیں بلکہ اس کے اندر ہر اچھی سے اچھی غذا کے بارے میں ایک ایسی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ زندگی کی بقا کیلئے اگر زبردستی اسے کھانے پینے پر مجبور بھی کیا جاتا ہے تو وہ اس طرح کھاتا ہے جیسے اسے کوئی سزا دی جا رہی یا زہر نگلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کے دل و دماغ بھی بیمار ہوتے ہیں۔ ذکر سے دوری اور ہر بھلی بات سے مہجوری رفتہ رفتہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اس کے دین کی ہر بات سے سرکشی اور عناد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ وحیِ الٰہی کو واہمہ خیال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول کو کبھی مجنون کہتا اور کبھی مسحور قرار دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اساطیر الاولین سمجھتا ہے، معجزات کو جادو قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ یہ قریش اور دیگر لوگ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ان کے کانوں سے گزر کر دلوں تک اگر قرآن پہنچتا بھی ہے تو ایسے نہیں جیسے کوئی مرغوب چیز پہنچتی ہے بلکہ ایسے پہنچتا ہے جیسے سلاخ گزاری جاتی ہے اور ان کے دلوں میں اس سے مزید نفرت کی آگ بھڑکتی ہے۔ یہ لوگ قبولیتِ حق سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے تاوقتیکہ وہ عذابِ الیم کو نہ دیکھ لیں۔ لیکن عذابِ الیم اطلاع دے کر نہیں آتا کہ کوئی شخص اگر توبہ کرنا چاہے تو توبہ کر لے، وہ تو اچانک آ دھمکتا ہے اور اس کے بعد قبولیتِ توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ جب اس عذاب کو دیکھیں گے تو پھر نہایت حسرت سے تمنا کریں گے کہ کاش انہیں کچھ مہلت دے دی جائے تو وہ ایمان لے آئیں۔ لیکن اب مہلت کا وقت گزر چکا ہوگا۔

Marfat.com

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٢٠٤﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا
يُوْعَدُوْنَ ﴿٢٠٦﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿٢٠٧﴾

(کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کیلئے جلدی مچا رہے ہیں۔ ۲۰۴) کیا آپ نے غور کیا کہ اگر ہم ان کو چند سال تک اور بہرہ مند رکھیں۔ ۲۰۵) پھر ان کے پاس وہی چیز آ جائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ۲۰۶) تو ان کے کس کام آئے گا جس سے وہ بہرہ مند رکھے گئے تھے۔ ۲۰۷)

عذاب کیلئے جلدی مچانے والوں کو جواب

قرآنِ کریم کا اسلوب چونکہ خطابی اسلوب ہے اور قرآنِ کریم کی آیات خطبے کی صورت میں آپؐ پر نازل ہو رہی تھیں جسے آپؐ لوگوں کو پڑھ کے سناتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لوگوں کے سامنے آپؐ یہ خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ تو تحریر اور تقریر یا خطبے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ تحریر میں کوئی خلاء بھی مفہوم و مدعا کی وضاحت میں رکاوٹ بن جاتا ہے، لیکن تقریر اور خطبے میں سامعین کے رویئے کا حوالہ ان کا طرزِ عمل یا خطیب کا کوئی اشارہ ایسے خلاء کو بھرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ پیشِ نظر آیات میں بھی ایسی ہی کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ قریش اور اہلِ مکہ کی مسلسل سرکشی اور بغض و عناد نے بالآخر دعوت کے اس مرحلے تک انہیں پہنچا دیا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی وارننگ دینے لگے لیکن دیگر تباہ ہونے والی قوموں کی طرح بجائے اس کے کہ وہ اس انذار سے سہم جاتے، مزید دلیر ہو کر جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرنے لگے کہ اگر عناد اور سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آیا کرتا ہے تو پھر ہم پر عذاب آنے میں تاخیر کیوں ہے۔ چنانچہ ان کے مطالبے کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ اس تاخیر کو عذاب کے وہم ہونے پر محمول کر رہے ہیں کہ اگر عذاب کو آنا ہوتا تو اب تک آ چکتا، یہ محض ڈراوا ہے جس سے ہمیں ڈرایا جا رہا ہے، حقیقت کچھ نہیں۔ لیکن وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ عذاب میں تاخیر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے جس سے انہیں سنبھلنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ اگر ان کا رویہ نہ بدلا اور قبولیتِ حق کے راستے سے ان کا انحراف اسی طرح جاری رہا تو یہ تاخیر ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔ بالآخر انہیں اسی عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿٢٠٨﴾ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٠٩﴾

(اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کیلئے پہلے ڈرانے والے بھیجے۔ ۲۰۸) یاددہانی کیلئے، اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۰۹)

قریش کو تنبیہ

یہ آیت قریش کیلئے ایک طرح سے تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے جو اس نے قوموں کے معاملے میں خود اختیار فرمائی ہے کہ وہ ہر قوم کی طرف انذار کرنے والوں کو بھیجتا ہے۔ وہ انہیں خونِ جگر پی پی کر انتہائی ناموافق حالات میں بھی شب و روز یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک مکلف مخلوق کے طور پر پیدا فرمایا ہے۔ تمہیں قسم قسم کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ حواس اور عقل سے بھی بہرہ ور کیا ہے جبکہ کسی اور مخلوق کو یہ نعمتیں عطا نہیں فرمائی گئیں۔ مقصد اس کا صرف یہ ہے کہ تم اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھو، زندگی کے مقاصد کو پہچانو، تمہاری نفسانی

Marfat.com

خواہشات اور تمہارے مفادات کی ہوس تمہیں بار بار راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کریں گے لیکن تمہاری حقیقی منزل کی یاد دہانی کیلئے اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے اور کتابیں اتاری ہیں تاکہ تم اپنے مقصدِ زیست سے انحراف نہ کرو۔ اور اگر بھول گئے ہو تو تمہیں از سرِ نو یاد دہانی کرائی جائے، لیکن اگر ان تمام کاوشوں کے بعد بھی کوئی قوم یاد دہانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور جو شخص یہ حقِ نصیحت ادا کرتا ہے اس کی دشمنی پر اتر آتی ہے، تو پھر ایسی قوم کو اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے اور نئی قوم کو اسی جگہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ اور یہ بار بار رسولوں کا یاد دہانی کیلئے آنا اور حقِ نصیحت ہر طرح کے حالات میں ادا کرنا یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ رحیم ہے۔ لیکن جو قوم کسی طرح بھی راہِ راست پر آنے کو تیار نہیں ہوتی تو پھر وہ اس کو عذاب کے ذریعے مٹا دیتا ہے، کیونکہ وہ عادل بھی ہے۔ اس طرح سے قریش کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ سنتِ الٰہی کے مطابق ایک منذر انذار کیلئے آ چکا ہے۔ اگر تم نے اس کی دعوت کو قبول نہ کیا تو لازماً اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ہو گا اور تمہیں دنیا سے مٹا دیا جائے گا۔ اور یہ کوئی ظلم نہیں ہو گا بلکہ عین عدل ہو گا۔ کیونکہ جب کوئی قوم کارآمد نہ رہے تو پھل کی بجائے جھاڑ جھنکار بن جاتی ہے یا صحیح پھل دینے کی بجائے خاردار جھاڑیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اسے باغبان اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنی زمین کی کھیتی میں دیر تک ایسی خاردار جھاڑیاں برداشت نہیں کرتا جو نوعِ انسانی کیلئے اذیت کا باعث ہوں۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾

(اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ ۲۱۰)

مخالفین کے الزام کی تردید

اس سے پہلے آیت ۹۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآنِ کریم رب العالمین کا نازل کردہ ہے اور اسے لے کر روح الامین آنحضرت ﷺ کے قلبِ اطہر پر اترے ہیں۔ اب اسی بات کا منفی پہلو بیان کیا جا رہا ہے اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ قریش نبی کریم ﷺ کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے جو الزامات لگاتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد (ﷺ) جو حیرت انگیز کلام پیش کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے بلکہ اس کی تاثیر اور اعجاز کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام کے نزول میں شیاطین شامل ہیں۔ جس طرح عام کاہنوں پر شیاطین اپنا کلام القاء کرتے ہیں، اسی طرح محمد (ﷺ) پر بھی شیاطین اس کلام کو القاء کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کلامِ مبین کو شیاطین لے کر نہیں اترے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے جسے روح الامین لے کر آتے ہیں۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

(نہ ان کیلئے لائق ہے اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ ۲۱۱) وہ تو اس کی سماعت سے بھی معزول کئے جا چکے ہیں۔ ۲۱۲)

تردید پر پہلی دلیل

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ شیطانی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں جو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں وہ شیطانوں کیلئے کسی طرح مناسب نہیں ہیں۔ عرب کی اکثر بستیوں میں کاہن موجود تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ شیاطین سے ربط و ضبط رکھتے ہیں اور شیاطین انہیں بہت ساری باتیں القاء کرتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ دیکھنا ہو کہ شیاطین کس طرح کی باتیں پسند کرتے ہیں اور کون سی باتیں انہیں زیب دیتی ہیں اور وہ ان سے دلچسپی رکھتے ہیں تو کسی بھی کاہن سے مل کے دیکھ لیجئے کبھی بھی آپ کو کسی کاہن کی زبان سے خداپرستی اور

Marfat.com

خدا ترسی کی تعلیم سننے کو نہیں ملے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کاہن نے شرک اور بت پرستی سے روکا ہو، آخرت کی باز پرس کا خوف دلایا ہو، ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو، نیکوکاری اور راست بازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو، ان کا مزاج تو لوگوں میں فساد پیدا کرنا، برائیوں کی طرف مائل کرنا، گھروں کو اجاڑنا اور زندگی میں الجھنیں اور اڑچنیں پیدا کرنا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کہاں قرآنِ کریم کی تعلیم اور کہاں شیاطین کی باتیں ان کا آپس کا کیا مقابلہ اور باہمی کیا نسبت؟

اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآنِ کریم کا مقصد اور مشن اور شیاطین کے مقصد اور مشن میں بنیادی فرق ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ شیاطین ایک ایسا کلام اتار کر جو ان کے اپنے مقصد کے خلاف ہو، آخر اپنی سلطنت بربادیوں کریں گے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے جواب میں یہی بات فرمائی تھی۔ جب انہوں نے آپ کے معجزات کے اثر کو مٹانے کیلئے عوام میں یہ پھیلانا شروع کیا کہ یہ بدروحوں کو لوگوں کے اندر سے نکالنے کا جو کرشمہ دکھاتے ہیں یہ بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ ان کے جواب میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ انجیل کے الفاظ میں اس طرح سے ہے۔

”لیکن ان میں سے بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے یہ روحوں کو نکالتا ہے...... مگر اس نے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہوجاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہوجاتا ہے۔ اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہوجائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی؟ (لوقا: ۱۶۔۱۸) بعینہ یہی بات قرآنِ کریم نے مَا يَنْبَغِيْ لَهُمْ کے دولفظوں میں فرمادی ہے۔

دوسری دلیل

قرآنِ کریم شیطانی کلام نہیں ہوسکتا، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شیاطین اگر یہ کام کرنا بھی چاہیں تو یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے کیونکہ شیطان کی ایک فطرت ہے اور وہ اس سے ابا نہیں کرسکتا۔ اس کی کاوشوں کا ایک ہدف ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی جن مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے دنیا میں آتے ہیں اور جن بنیادوں پر اپنے ماننے والوں کی تربیت کرتے ہیں اور جو صفات ان کے اندر پیدا کرتے ہیں شیطان ان میں سے ہر چیز کو الٹ ڈالنا، ان کے برعکس صفات پیدا کرنا، اخلاق کی بجائے بداخلاقی کو فروغ دینا، نیکوکاری اور راست بازی کی بجائے برائی اور خیانت کو عام کرنا، گھروں کو بسانے کی بجائے اجاڑنا اور اللہ تعالیٰ کی زمین کو فساد سے بھر دینا اس کی اصل منزل ہے، یہ شیطنت کی فطرت بھی ہے اور شیاطین کے اہداف بھی ہیں۔ تو ان سے کیسے اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اس فطرت کو بدل دیں اور اپنے اہداف کو تبدیل کردیں۔ جس طرح خاردار جھاڑی کو کانٹوں سے بیگانہ نہیں رکھا جاسکتا اور ببول کے درخت پر کبھی پھول نہیں کھل سکتے اور زہر کبھی تریاق میں تبدیل نہیں ہوسکتا، اسی طرح رسالت اور شیطنت کے مقاصد یکساں نہیں ہوسکتے، دونوں کی فطرت ایک نہیں ہوسکتی۔ اس لئے فرمایا گیا کہ اگر شیاطین یہ کام کرنا بھی چاہیں تو نہیں کرسکتے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنی تعلیم کی بلندی و پاکیزگی اور اپنے مضامین کا ربط وضبط اور انسانی فطرت کا لحاظ اور حقائق کے علم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کی جو فصاحت وبلاغت رکھتا ہے اور اپنے اسلوب میں اعجاز اور ایجاز کی جو شان رکھتا ہے اس کے حوالے سے قرآنِ کریم نے انسانوں کے ساتھ ساتھ جنوں کو بھی بار بار چیلنج کیا کہ وہ اس قرآن کی مثال لائیں۔ لیکن ساتھ ہی واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ وہ اس کی مثال کبھی نہیں لاسکتے۔ اس حوالے سے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کا کلام تیار کرنا شیاطین کے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ ان کی فطرت اسے قبول کرتی ہے اور نہ ان کی کاوشوں کا ہدف اور ان کا مشن اس کی اجازت دیتا ہے۔

Marfat.com

تیسری دلیل

اور تیسری دلیل اس پر یہ دی گئی ہے کہ وہ اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں یعنی اس قرآن کے القا میں دخیل ہونا تو درکنار جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتے ہیں اور جس وقت محمد (ﷺ) کے دل پر وہ اس کو القا کرتے ہیں اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ اور مزید یہ کہ قرآنِ کریم ملأِ اعلیٰ کی باتیں کرتا ہے، عالمِ غیب کے اسرار منکشف کرتا ہے اور پیغمبر کی دعوت کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ہدایات جاری فرماتا ہے، ضرورت کے مطابق رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ ان میں سے کسی بات تک بھی شیاطین کے پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ قرآن کے نزول سے پہلے سورۃ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین آسمانوں کے قریب آتے جاتے تھے، وہاں فرشتوں کی گفتگو سے بعض دفعہ انہیں بعض آئندہ ہونے والے فیصلوں کی خبر ہو جاتی تھی اور ان میں کچھ جھوٹ شامل کر کے کاہنوں تک پہنچاتے تھے اور اس طرح سے زمین پر گمراہی کا ایک کاروبار چلتا تھا، لیکن سورۃ جن میں خود جنات نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اب آسمان کو پہروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی قریب جا کر کان لگانے کی کوشش کرے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ ایسی صورتحال میں ان کیلئے کیسے ممکن ہے کہ وہ قرآنِ کریم جیسا کلام اللہ تعالیٰ کے نبی پر نازل کر سکیں۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿٢١٣﴾

(پس اے پیغمبر! اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکارو ورنہ آپ بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ ۲۱۳)

خطاب آنحضرت ﷺ سے، عتاب مخالفین پر

یہ اور آگے کی چند آیات آنحضرت ﷺ کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض دفعہ کسی برائی کی شناعت کو نمایاں کرنے کیلئے اپنے پیغمبر کو اس برائی سے روکتا ہے اور ارتکاب کی صورت میں عذابِ الیم کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ آنحضرت ﷺ سے اس برائی کے ارتکاب کا اندیشہ ہو گیا تھا اور آپؐ کو دھمکا کر اسے روکا گیا۔ بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ برائی اور یہ جرم اللہ تعالیٰ کے یہاں اس قدر قابلِ نفرت اور شدید عذاب کا مستحق ہے کہ اگر پیغمبر بھی اس کا ارتکاب کرے جس کا کوئی امکان نہیں تو وہ بھی سزا سے نہ بچ سکے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے یعنی کسی اور کو معبود بنانے سے روکنے کیلئے آنحضرت ﷺ سے خطاب فرمایا گیا۔ لیکن اس میں روئے سخن قوم ہی کی طرف ہے۔ لیکن آپؐ سے خطاب کا مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض آپؐ بھی بندگی کی راہ سے بال برابر ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو معبود کی حیثیت سے پکارنے لگیں تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ کوئی اور شخص اس جرم کا ارتکاب کرے اور پھر وہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت نہیں آئے گی تو اسے اپنے دماغ کا علاج کرنا چاہئے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢١٥﴾

(اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ۔ ۲۱۴) اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ آپ کی پیروی اختیار کریں ان کیلئے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھیں۔ ۲۱۵)

Marfat.com

قریبی خاندان کو انذار کا حکم کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب برابر ہیں

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کی عظمت واہمیت کی وجہ سے اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کیخلاف بغاوت ہے جس کا ارتکاب کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی کرے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتی۔ اب پیش نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کی صورت میں جو عذاب آ سکتا ہے اور جس سے کسی کو بھی مفر نہیں اس سے اپنے قریبی خاندان والوں کو بھی خبردار کرو، کیونکہ اگر شرک کی سزا سے اللہ تعالیٰ کے رسول کو بالا نہیں رکھا گیا تو اور کوئی شخص کیسے بچ سکتا ہے چاہے خود وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے قریبی خاندان ہی سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس کے قانون میں کسی کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ گمراہی اور بدعملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کیلئے یکساں ہے۔ اس کی بارگاہ میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ جزا اور سزا میرٹ پر ہوگی، نسب اور نسبت پر نہیں ہوگی۔

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو ایک دعوت پر جمع کیا اور ایک ایک کو نام لے لے کر کہا، کہ ''اے بنی عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ، اے فاطمہ محمد (ﷺ) کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرلو، میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔'' پھر ایک مناسب وقفے کے بعد آپؐ نے صفا پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا، یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لوی، اے بنی مُرہ، اے آلِ قصی، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد شمس، اے بنی ہاشم، اے آلِ عبدالمطلب، اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپؐ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا، وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آ سکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کیلئے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بقول مسدسِ حالی:

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب
کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا

کہ میں خدا کے سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں، اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو، میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا، قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے، ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد (ﷺ) مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں، البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔ اس مضمون کی متعدد روایات احادیث کی تمام معتبر کتابوں میں موجود ہیں اور جلیل القدر صحابہ نے انہیں روایت کیا ہے۔

Marfat.com

قریبی عزیزوں کو انذار کرنے کے حکم کی وجہ ایک اور بھی تھی، وہ یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے قائدین کو انذار کیا ہے۔ عوام کی طرف اس وقت توجہ فرمائی جب قائدین نے اپنے رویئے سے مایوس کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اسی طریقے پر اپنے قریبی خاندان کو سب سے پہلے دعوت دی۔ کیونکہ وہ بیت اللہ کی تولیت اور اہلِ عرب کی دینی وسیاسی قیادت کا منصب اپنے پاس رکھتے تھے۔ چنانچہ قرابت اور سیاست دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ آپؐ ان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کریں۔ اگر وہ اصلاح قبول کر لیتے تو دوسروں کی اصلاح کا معاملہ بہت آسان ہو جاتا۔ لیکن حقیقی قدر و قیمت بہر حال اللہ تعالیٰ اور رسول کی نگاہ میں ان لوگوں کی تھی جو اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کرتے تھے۔ اس لئے بطورِ خاص ان کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ آپؐ کی پیروی کریں ان کیلئے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھیں، یعنی جس طرح کسی خطرے کو محسوس کر کے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے، اسی طرح آپؐ ان لوگوں کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھیں اور مسلسل ان کی ایسی تربیت کریں کہ کوئی غفلت کے سبب سے اس عذاب کی زد میں نہ آ جائے جس کی مسلسل خبر دی جا رہی ہے۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

(اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ۲۱۶)

آیت کے مفہوم کی وضاحت

اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے قریبی عزیزوں میں سے جو لوگ آپ کے انذار کی پرواہ نہ کریں تو آپ ان سے صاف الفاظ میں اعلانِ براءت کر دیں کہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والی چیز اس راستے پر چلنا ہے، میں جس کی دعوت دے رہا ہوں۔ اور ان عقائد و اعمال کا اتباع کرنا ہے جس کا میں حکم دے رہا ہوں۔ اس سے ہٹ کر میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد کا تعلق صرف رشتہ داروں سے نہ ہو بلکہ سب کیلئے عام ہو، جن میں رشتہ دار بھی شامل ہیں اور عام لوگ بھی۔ کہ جو لوگ بھی آپؐ کا اتباع کریں تو آپؐ ان کے ساتھ نہایت ہمدردی اور غمگساری کا معاملہ کریں کیونکہ وہی لوگ آپ کا اثاثہ ہیں۔ لیکن جو لوگ ایمان لانے کے باوجود آپ کی نافرمانی کریں، انہیں خبردار کر دیں کہ میں تمہارے اعمال کی ذمہ داری سے بری ہوں، یعنی میں تمہاری شفاعت نہیں کروں گا۔ اگرچہ بعض اہلِ علم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو ان کے اعمال سے براءت کے اظہار کا حکم دیا گیا ہے، خود ان لوگوں سے نہیں۔ ممکن ہے قیامت کے دن وہ اپنی سزا پا لینے کے بعد آنحضرت ﷺ کی شفاعت کے مستحق ٹھہریں اور نجات پا جائیں۔ واللہ اعلم۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۲۲۰﴾

(اور بھروسہ کیجئے خدائے عزیز و رحیم پر۔ ۲۱۷) جو آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے جس وقت آپ کھڑے ہوتے ہیں۔ ۲۱۸) اور دیکھ رہا ہوتا ہے آپ کی آمد و شد کو سجدہ کرنے والوں میں۔ ۲۱۹) بیشک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ ۲۲۰)

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

نافرمانوں سے اعلانِ براءت کے بعد یقیناً دشواریوں میں اضافہ ہوسکتا ہے، لیکن آپ ؐ کیلئے اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔آپ ؐ اس ذات پر بھروسہ کیجئے جو عزیز بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔اس نے پہلے بھی ہر مشکل وقت میں آپ ؐ کو سہارا دیا ہے اور آئندہ کے مراحل میں بھی وہ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ہر طرح مدد فرمائے گا۔وہ چونکہ عزیز ہے اس لئے جو کچھ وہ کرنا چاہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا۔جس کی پشت پر اتنی بڑی طاقت ہو کہ کوئی اسے چیلنج نہ کرسکے اسے دنیا میں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔وہ چونکہ رحیم بھی ہے تو آپ کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہئے کہ آپ اس کے راستے میں جو تکلیفیں اٹھائیں گے اور جو قربانیاں دیں گے وہ اس کا صلہ اپنی رحمت سے عطا کرے گا اور اس راستے میں کی جانے والی کاوشیں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی۔

یہ کبھی گمان مت کرنا کہ جس ذاتِ عزیز کی خاطر اور اس کے حکم کی تعمیل میں شب و روز محنت کرتے اور دکھ اٹھاتے ہیں وہ آپ سے بہت دور ہے۔نہ جانے آپ کے حالات کی صحیح تفصیل اس تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں اور آپ پر جو کچھ گزرتی ہے اسے اس سے آگاہی ہوتی بھی ہے یا نہیں۔وہ تو آپ کے اس حد تک قریب ہے اور اس حد تک آپ اس کی نگاہوں میں ہیں کہ جب آپ تہجد کیلئے اٹھتے ہیں اس سے جب دعا و مناجات کرتے ہیں اور آپ پر ایمان لانے والے بھی شب خیزی میں اپنی جان لڑاتے ہیں تو وہ برابر آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔اور آپ اپنے ماننے والوں کی شب خیزی و دعا و مناجات کی کیفیت کو دیکھنے کیلئے ان میں آتے جاتے اور نگرانی کرتے ہیں آپ اس وقت بھی اس کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔یوں تو دنیا میں کوئی مخلوق بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں، کوئی پتا زمین پر گرتا ہے یا کوئی شگوفہ پھوٹتا ہے تو وہ اس کی نگاہوں میں ہوتا ہے۔تمام کائنات کی وہ اس طرح نگرانی کرتا ہے کہ نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے اور نہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے غائب ہوتی ہے۔لیکن یہاں جس دیکھنے کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد نہ نگرانی کا دیکھنا ہے اور نہ ربوبیت کا دیکھنا۔نہ اس سے حفاظت کی نگاہ مراد ہے نہ اعمال کے جائزے کی۔بلکہ اس سے مراد محبت، نصرت اور تائید کا دیکھنا ہے اور یہ ایک ایسی نگاہ ہے جسے نگاہِ محبت کہنا چاہئے۔جس کی معمولی رمق حاصل کرنے کیلئے عشق کی دنیا کا ہر فرد متاعِ زیست قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔اور اگر اس کا کوئی شمہ بھی نصیب میں آجائے تو وہ قسمت کی یاوری پر پھولا نہیں سماتا۔اس کیلئے یہی بات فخر و مباہات کا باعث ہوتی ہے کہ میں کسی کی نگاہ میں تو ہوں۔سچ کہا شاعر نے:

وہ سرسری ہی دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
ہم خوش ہیں کہ ہیں کسی کی نگاہ میں

یہاں بھی درحقیقت یہی تصور دینا ہے کہ آپ اس طرح اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں رہتے ہیں کہ اس کی رحمت آپ پر قربان ہوتی رہتی ہے۔اور جو وقت اہلِ دنیا کی غفلت کا ہے، آپ ؐ کی اپنے اللہ سے محبت جس طرح اس وقت آپ کو اٹھا کھڑا کرتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و کرم، عنایت و رحمت اور محبت و قدر دانی کے اظہار کی بارش ہونے لگتی ہے۔جب آپ کے مقام و مرتبہ کا یہ عالم ہے تو آپ کو دشمنوں کی مخالفت و معاندت کی کیا پرواہ ہے۔

Marfat.com

حِيۡنَ تَقُوۡمُ کی تاویل

حِيۡنَ تَقُوۡمُ کی تاویل میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں اوران میں سے کوئی قول بھی غلط نہیں۔لیکن اگلی آیت کے قرینے کو دیکھتے ہوئے یہ بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس سے قیام اللیل مراد لیا جائے۔اور انبیائے کرام اور سلف صالحین کی زندگیاں بھی اسی پر دلالت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔انبیائے کرام کی دعوت کے سلسلے میں جیسے جیسے مشکلات میں اضافہ ہوا ہے اور مخالفین کی مخالفت میں شدت آتی گئی ہے ویسے ویسے ان کے قیام اللیل، شب بیداری اور دعا و مناجات میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔کیونکہ یہی وہ وقت ہے جس میں تعلقِ خاطر کی بنیاد پڑتی ہے اور سیرت و کردار کی جہتیں استوار ہونے لگتی ہیں اور مخالفین کی مخالفتوں سے زخمی دلوں کو مرہم ملنے لگتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کا مسافر تازہ دم ہو کر دن کی سرگرمیوں میں اپنا رول ادا کرنے کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

جب بھی کوئی پروردگار کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کے پس منظر، تہ منظر اور پیش منظر کو جانتا ہے،لیکن سحر خیزی کی آہیں اور قیام اللیل کی مناجاتیں خصوصی ہدف اور اثر رکھتی ہیں۔اس لئے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات سمیع اور علیم کا ذکر فرمایا ہے تاکہ یہ معلوم رہے کہ اس وقت کی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

(کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ ۲۲۱) وہ اترتے ہیں ہر جھوٹ گھڑنے والے بدکار پر۔ ۲۲۲) وہ اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ ۲۲۳)

شیاطین کن پر اترتے ہیں

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مخالفین آنحضرت ﷺ پر الزام لگاتے تھے کہ آپؐ ایک کاہن ہیں، پیغمبر نہیں۔جس طرح کاہنوں پر شیاطین غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں، اسی طرح آپ پر بھی شیاطین یہ کلام القا کرتے ہیں جن کو آپ ہمارے سامنے وحیِ الٰہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔چنانچہ پروردگار نے گزشتہ آیات میں واضح فرمایا کہ قرآنِ کریم کا منبع و مصدر کیا ہے اور اس کے واسطۂ نزول کے محفوظ ہونے کا عالم کیا ہے۔اور جس پر یہ کلام نازل ہوا ہے اس کا پاکیزگی اور طہارت میں کیا مقام و مرتبہ ہے۔جو شخص ان باتوں کو نگاہ میں رکھے گا وہ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ کاہن ہیں اور آپؐ پر یہ کلام شیطانی القاء ہے۔اب خلاصۂ بحث کے طور پر مخالفین کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم واقعی جاننا چاہتے ہو کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں تو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شیاطین کیسے لوگوں پر اترا کرتے ہیں۔یہ درحقیقت کاہنوں کی تصویر ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے پاس شیاطین آتے ہیں۔پیشِ نظر آیات میں ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ان کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ اَفَّاک ہوتے ہیں جس کا معنی ہے جھوٹا، جھوٹ گھڑنے والا، لاغی اور لپاٹیا۔یعنی یہ عام لوگوں کو بے وقوف بنانے کیلئے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔کہ یہ باتیں ان پر غیب سے القا ہوئی ہیں۔ان کی دوسری صفت اَثِيْم بیان کی گئی ہے، اس کا معنی ہے گنہگار۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نیکی سے دور اور گناہ کے رسیا ہوتے ہیں۔

Marfat.com

انہیں اچھائی برائی میں کوئی تمیز نہیں ہوتی، حلال وحرام میں فرق نہیں کرتے، زندگی ان کی غلط کاموں اور گناہ کی باتوں میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔
اور تیسری صفت ان کی یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کا ذریعۂ علم شیاطین سے جھوٹ موٹ باتیں سننا اور پھر اپنی طرف سے بہت سے جھوٹ ملا کر لوگوں کے کانوں میں پھونکنا ہیں۔ اس کی تشریح ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ ''بعض لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا وہ کچھ نہیں۔ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! بعض اوقات تو وہ ٹھیک بات بتا دیتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا وہ ٹھیک بات جو ہوتی ہے، اسے کبھی کبھار جن لے اڑتے ہیں اور جا کر اپنے دوست کے کان میں پھونک دیتے ہیں۔ پھر وہ اس کے ساتھ جھوٹ کی بہت سی آمیزش کر کے ایک داستان بنا لیتے ہیں۔'' ان لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کیلئے ان کے پاس جاتے ہیں تو یہ لوگ کچھ عملیاتِ سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے ہیں اور پھر ایک مقفیٰ کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا ہے) اپنا الہام پیش کرتے ہیں کہ یہ ان پر غیب سے فلاں جن نے القاء کیا ہے۔ ان کے اس مراقبہ کو یہاں القاء سمع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ مراقبہ میں اس طرح بیٹھتے ہیں گویا ہاتفِ غیب سے کوئی بات سننے کیلئے کان لگائے ہوئے ہیں۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿٢٢٧﴾

(اور شعراء، بہکے ہوئے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ ۲۲۴) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ ۲۲۵) وہ کہا کرتے ہیں ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ ۲۲۶) بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے جنہوں نے نیک اعمال کئے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا، اور انہوں نے بدلہ لیا اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کئے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۷)

آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید

مخالفین جس طرح آنحضرت ﷺ کو کاہن قرار دیتے تھے اور جس کی تردید ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں، اسی طرح وہ آپؐ کو شاعر بھی قرار دیتے تھے حالانکہ ان کا وہ بالائی طبقہ جو شعر فہمی میں ایک مقام رکھتا تھا اس نے کبھی آنحضرت ﷺ کو شاعر قرار نہیں دیا اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ کیا قرآنِ کریم شعر کی زبان میں نازل ہوا ہے تو وہ اسے شعر کہنے سے بھی گریز کرتے تھے۔ البتہ جس بات نے انہیں مجبور کیا کہ قرآنِ کریم کو شاعری کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کو ایک شاعر قرار دیں وہ یہ بات تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر قرآنِ کریم کو پیش کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں کیونکہ مجھ پر قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی کتاب نازل ہوئی ہے۔ اور پھر قرآنِ کریم کے اعجاز کو قرآن اور اپنی حقانیت کی دلیل ٹھہرایا اور چیلنج کیا کہ اگر تم قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں سمجھتے تو پھر اس کی مثال لا کر دکھاؤ۔ تو اب ان کیلئے آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ وہ قرآنِ کریم کے اعجاز اور اس کی فصاحت و بلاغت کو شعر کا نتیجہ قرار دیں اور آنحضرت ﷺ کو شاعر ثابت کریں۔ اور لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کریں کہ تم جس کتاب کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اسے آسمانی کلام ماننے پر مجبور ہو رہے ہو اس کی یہ فصاحت و بلاغت کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں شاعروں کے کلام میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com

اس لئے محمد (ﷺ) پیغمبر نہیں بلکہ شاعر ہیں۔ البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ قرآنِ کریم میں جو فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے اس کا جواب کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) سب سے بڑے شاعر ہیں، لیکن یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قرآن کی دلیل کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

آپؐ کو شاعر قرار دے کر وہ ایک اور پہلو سے بھی آپؐ کی نبوت کے بارے میں لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ شاعروں کے بارے میں عام طور پر اہلِ عرب یہ تصور رکھتے تھے کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ تو محمد (ﷺ) چونکہ ایک شاعر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی ایک جن لگا ہوا ہے جو ان پر خوبصورت کلام القاء کرتا ہے۔ محمد (ﷺ) کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ کوئی فرشتہ ہے حالانکہ یہ ویسا ہی جن ہے جیسا ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں تین کسوٹیاں رکھ دی ہیں جس پر پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کسی شاعر کا کلام ہے یا کلامِ ربانی ہے۔ اور اس کا سنانے والا کوئی شاعر ہے یا اللہ تعالیٰ کا رسول۔

فیصلہ کن تین کسوٹیاں

پہلی کسوٹی یہ پیش کی گئی ہے کہ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح کوئی کلام بھی اس بات سے پہچانا جاتا ہے کہ اس نے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو کس طرح کی سیرت و کردار سے آراستہ کیا ہے اور اس کے پڑھنے اور سننے والے اپنے اندر کیسے خصائل رکھتے ہیں۔ شعراء اور ان کا کلام آپ کے سامنے ہے اور ان کے پڑھنے والوں کی زندگیاں بھی آپ کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح محمد (ﷺ) نے جن لوگوں کو اپنی تعلیم و تربیت سے جس رنگ میں رنگا ہے، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ دونوں کا تقابل کر کے دیکھ لو، اگر تو دونوں کی زندگیوں کا رنگ ایک جیسا ہے، ان کے طور اطوار یکساں ہیں، ان کے اہداف ملتے جلتے ہیں، ان کے اعمال ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ واقعی دونوں شاعر ہیں اور دونوں کا کلام یکساں ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خدا ترسی ہے، بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے، برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے، معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے۔ اور دوسری طرف شعراء کے ساتھی گمراہ، اوباش، عیاش اور شر پسند قسم کے لوگ ہیں جن کی زندگیاں فسق و فجور سے عبارت ہیں، جن کا سب سے بڑا ہدف عشق بازی اور شراب نوشی ہے اور جن کی دلچسپیاں حُسن پرستی، شہوانیت اور جنسی مواصلت کے گرد گھومتی ہیں، جنہوں نے کبھی قوم کو اتفاق و اتحاد کی دولت دینے کی بجائے ہمیشہ بکر و تغلب کی لڑائیوں جیسے فسادات میں مبتلا کیا ہے، جو اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہیں گیا کہ دنیا میں انسان کیلئے زندگی کا کوئی بلند تر نصب العین بھی ہے۔ تو ان دونوں کرداروں کو دیکھ کر اور زندگی کے ان دو نمونوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں نمونے یکساں ہیں اور جس کلام کے زیرِ اثر یہ دو الگ الگ نمونے تیار ہوئے ہیں اس کلام کا منبع و مصدر ایک ہی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

دوسری کسوٹی جس پر پرکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کا پیش کرنے والا اللہ تعالیٰ کا رسول ہے یا وہ ایک عظیم شاعر اور قرآنِ کریم شاعری کی کتاب ہے۔ یہ ہے کہ ان شاعروں کا حال یہ ہے کہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ان کے فکر کی کوئی بنیاد نہیں۔ جس طرح ہر درخت اپنی جڑ سے پھوٹتا ہے آہستہ آہستہ

Marfat.com

تنا بنتا ہے، پھر اس سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور باغ و بہار لاتا ہے لیکن وہ اپنی جڑ سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتا اور نہ اس کے پھل اس کی حقیقت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ یہی حال انسان کا بھی ہے کہ اگر اس کے عقائد متعین ہیں، اس کی سوچ کا راستہ مقرر ہے، اس کی منزل طے شدہ ہے، اس کے اہداف واضح ہیں وہ ایک طرح کے طور اطوار اور خصائل و شمائل کو پیدا کرتا ہے۔ اس کے افراد میں کتنی بھی وسعت پیدا ہو جائے، اس کے معاملات کی پختگی، اس کی معاشرت کی شائستگی، اس کے اخلاق کے پیمانوں میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآنِ کریم دل و دماغ کو ایک متعین فکر فراہم کرتا ہے۔ وہ انسان کو صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے، ایمان و عمل اس کی پہچان بن جاتی ہے، خدا ترسی، ہمدردی و غمگساری سے انسانی معاملات میں شائستگی پیدا کرتا ہے۔ گہری نظر سے دیکھنے والا اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ معاشرہ اپنی ایک جڑ رکھتا ہے، یہ قبیلہ اپنا ایک نسب رکھتا ہے، اس کی دنیا متعین آداب سے عبارت ہے جبکہ شعراء کے یہاں کوئی متعین راستہ نہیں، کوئی فکری نظام نہیں، جذبات یا خواہشات واغراض کی ہر نئی روان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے، ان کے جہاز کا لنگر کسی چٹان سے بندھا ہوا نہیں، ان کے خیالات کی کشتیاں طبیعت سے اٹھنے والی لہروں کے ساتھ اپنا راستہ بدلتی رہتی ہیں، ایک لہر اٹھی تو حکمت وموعظت کی باتیں ہونے لگیں، دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہوگیا، جس کو چاہا آسمان پر چڑھا دیا، جسے چاہا قعرِ مذلت میں گرا دیا، خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حُسنِ اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو در پہلو ملے گا۔ آپ کسی شاعر کو پڑھتے ہوئے کبھی یہ محسوس کریں گے کہ میں ایک شیطان کو پڑھ رہا ہوں، اور کبھی یوں محسوس ہوگا کہ میں کسی روحانی رہنما کو پڑھ رہا ہوں۔ انہیں ایسی باتیں کہتے ہوئے کبھی کسی روک کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ہیں جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایسے عظیم دو فرقوں کے حامل کلاموں کو اگر کوئی شخص ایک کہتا ہے یا دونوں کو ایک ہی نام دیتا ہے تو یہ ایک ایسی جسارت ہے جسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تیسری کسوٹی ہے جس پر قرآنِ کریم اور شعراء کے کلام کو پرکھا جاسکتا ہے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ کردار سے انہیں کوئی خاص نسبت نہیں ہوتی۔ ان کے دعوؤں کو دیکھو تو ہر میدان کے لاجواب آدمی معلوم ہوتے ہیں، لیکن عمل کی دنیا میں دیکھو تو بالکل صفر دکھائی دیتے ہیں۔ جن مکارمِ اخلاق کی تعریف میں وہ آسمان وزمین کے قلابے ملاتے ہیں ان پر عمل کرنے کی انہیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس پیغمبر کو دیکھو کہ وہ جو کلام پیش کر رہے ہیں اس کا سب سے بڑا عملی نمونہ وہ خود ہیں۔ آپ کا جاننے والا ہر شخص گواہی دیتا ہے کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپ کے قول وفعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہ کرسکتا تھا۔ آپ نے جس بندگیِ رب، جن مکارمِ اخلاق اور جس ایثار وقربانی کی دعوت مخلوق کو دی اس پر سب سے زیادہ عمل خود کر کے دکھایا۔ تو ایسے قدسی صفات شخص کو ان شاعروں کی صف میں کھڑا کرنا جن کے اقوال و اعمال میں ادنیٰ مطابقت بھی نہیں ہے، بہت بڑی زیادتی ہے۔

Marfat.com

ایک ضروری بات

ان آیات کو پڑھتے ہوئے ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآنِ کریم کی تنقید دورِ جاہلیت کے شعراء پر ہے شعر یا فنِ شعر پر نہیں۔ قرآنِ کریم اور آپ نے اس دور کے شعراء پر تنقید اس لئے کی ہے کہ ان کی شاعری جن مضامین سے لبریز تھی اسلام انہیں برائیوں، گمراہیوں اور بداخلاقیوں سے روکنے کیلئے آیا تھا۔ شعر دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب میں ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ایک موثر شاعر اپنی شاعری سے بعض دفعہ قوم میں آگ لگا دیتا تھا اور اس کے اشعار کے اثر سے لوگوں کے تنِ مردہ میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا تھا۔ چنانچہ ایسا موثر ذریعۂ ابلاغ اگر برائی کی ترویج کیلئے وقف ہو کر رہ جائے تو اس سے بڑی نقصان دہ چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اور اس دور کے شعراء نے اتنی موثر صلاحیت کو جن باتوں کیلئے وقف کر رکھا تھا ان کی حیثیت انسانیت کیلئے سمِ قاتل سے کم نہ تھی۔ ان کی شاعری کے بیشتر مضامین شہوانیت، عشق بازی، شراب نوشی یا قبائلی منافرت، جنگ وجدل یا نسلی فخر و غرور پر مشتمل تھے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں کہیں خال خال پائی جاتی تھیں۔ چونکہ وہ لوگ فضائلِ اخلاق سے بہت حد تک تہی دامن ہو چکے تھے اس لئے ان کی شاعری جھوٹ، بہتان، ہجو، بیجا تعریف، طعن وتشنیع، مشرکانہ خیالات اور قبائلی تفاخر میں منحصر ہو کر رہ گئے تھے۔ اور شاعری کی تاثیر کی وجہ سے یہ عیوب ان کی سیرت و کردار کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری اور ایسے شاعروں کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کبھی تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کو یکسر بدل ڈالنا یا ختم کر دینا ان کے مشن کا بنیادی جز تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایسی ہی شاعری کے بارے میں فرمایا لَاَنْ یَّمْتَلِیَٔ جَوْفُ اَحَدِکُمْ قَیْحًا خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّمْتَلِیَٔ شِعْرًا ''تم میں سے کسی شخص کا پیٹ پیپ سے بھر جائے، اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔''

ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ یہ بات کسی حد تک مسلمہ ہے کہ مبالغہ شعر کا ایک لازمی وصف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعر میں اگر مبالغہ نہ ہو تو اس میں شعریت یا شعری حُسن پیدا نہیں ہوتا۔ اور ادھر حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی دنیا میں اظہارِ حقیقت اور راست گوئی کا نمونہ بن کر آتا ہے۔ وہ اگر تعریف کرتا ہے تو حقیقت سے آگے نہیں بڑھتا اور اگر کسی پر تنقید کرتا ہے تو صداقت سے نیچے نہیں گرتا۔ اس کی ذات، اس کی ہر بات اور اس کا ہر عمل انسانوں کیلئے میزان کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کوئی پلڑا نہ اٹھتا ہے اور نہ جھکتا ہے۔ اسی لئے اس کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تقابل کو دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شعر سے مناسبت کیوں نہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو شعر گوئی کی صلاحیت کیوں نہ عطا فرمائی۔ سورۂ یٰسین میں پروردگار نے اس کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ''ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ آپ کے کرنے کا کام ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شعر سے دلچسپی نہ تھی۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دورانِ تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا:

کفی بالاسلام والشیب للمرء ناهیا

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! اصل مصرع یوں ہے:

کفی الشیب والاسلام للمرء ناهیا

Marfat.com

اور بھی اس طرح کی کئی مثالیں روایات میں موجود ہیں۔ ایسے موقعوں پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ عام طور پر عرض کرتے، یارسول اللہ! شعر اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے۔ تو آپ ؐ فرماتے کہ بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ؐ نے اچھے اشعار کو ہمیشہ پسند فرمایا، اور اچھے شعراء کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور آپ ؐ نے یہ اصولی بات فرمائی حسن الشعر کحسن الکلام قبیحه کقبیح الکلام "اچھا شعر اچھے کلام کی طرح ہے اور برا شعر برے کلام کی طرح ہے۔"
دوسری حدیث میں آپ ؐ نے ارشاد فرمایا ان من الشعر لحکمة "بعض اشعار میں بڑی دانائی کی باتیں ہوتی ہیں۔"

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝ "بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے جنہوں نے نیک اعمال کئے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا، اور انہوں نے بدلہ لیا اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کئے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔"

شانِ نزول

شعراء پر تنقیدی آیات کے نزول کے بعد حضرت حسان ابن ثابت ؓ، عبداللہ بن رواحہ ؓ، کعب بن مالک ؓ اور کعب بن زہیر ؓ روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی، یارسول اللہ! شاعروں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل کی ہیں، ہم بھی تو شاعر ہیں، ہم تو ہلاک ہوگئے، ہماری نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔ اس میں ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہیں۔

چار خصوصیات کے حامل شعراء کا استثناء

جن میں پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مومن ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی شاعری کا ایک ہدف متعین ہو جائے گا۔ خیالات کی ہر لہر کے ساتھ شعر گوئی کی قوت حرکت میں نہیں آئے گی بلکہ ان کا ہر شعر کلمۂ حق کی حمایت اور ذکرِ الٰہی کی سربلندی میں کام آئے گا۔ وہ دل و دماغ اور اپنی زبان کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور امانت سمجھیں گے۔ انہیں اس بات کا یقین ہوگا کہ میری زبان سے جو شعر نکلے گا وہ قیامت کے دن میزان کا تول بنے گا اور مجھے اس کا جواب دینا ہوگا۔ اور پھر میرے شعر کی تاثیر سے جو اثرات مرتب ہوں گے مجھے اس کی ذمہ داری کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ ایمان کے ساتھ ساتھ عملِ صالح کی دولت سے بھی مالا مال ہوں گے۔ وہ ایمان لا کر چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی غیر مشروط اطاعت کا عہد کر چکے ہیں، اس لئے ان کی پوری زندگی تقویٰ اور عملِ صالح سے عبارت ہوگی۔ وہ فسق و فجور کا نہ ارتکاب کریں گے اور نہ ان کے اشعار فسق کی تبلیغ سے آلودہ ہوں گے۔ وہ ان تمام اخلاقی بندشوں کو اپنے اخلاق کی زنجیر بنا دیں گے جنہیں شریعت نے ان پر لازم کیا ہے۔ اور انہیں مکارمِ اخلاق کو وہ اپنے شعر کی قوت سے لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کریں گے۔

تیسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے۔ اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی اور اپنے کلام میں بھی۔ ان کی زندگی ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی اور ایک ہی طرزِ عمل سے عبارت ہوگی۔ ان کی شاعری میں انہیں چیزوں کا اظہار ہوگا جو

Marfat.com

اسلامی تعلیمات نے ان کے حوالے کی ہیں اور ان کی زندگی میں وہی چیزیں چلتی پھرتی دکھائی دیں گی جن کا وہ اپنی شاعری میں اظہار کریں گے۔ ان کی زندگی میں ثنویت نہیں ہوگی کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہو لیکن کلام سراسر رندو ہوسناکی سے لبریز ہو۔ جیسے ہمارے یہاں بعض ایسے محترم شاعر گزرے ہیں جنہوں نے شراب خانہ خراب کو کبھی منہ نہیں لگایا، لیکن ان کی شاعری میں شراب کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑا بادہ خوار کوئی نہیں ہوگا۔ اور ان کی زندگی کا یہ رنگ بھی نہیں ہوگا کہ وہ شعر میں بڑی حکمت و معرفت کی باتیں کریں اور ایسا لگے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا ان سے بڑھ کر مبلغ کوئی نہیں، مگر ان کی ذاتی زندگی کو دیکھئے تو اس میں یادِ خدا کے آثار تک نظر نہ آئیں۔ اسلام جس طرح اپنے ماننے والوں کو متعین اہداف دیتا ہے، اسی طرح انہیں اسی منزل کا مسافر بھی بناتا ہے، ان کی تمام زندگی کا سفر اسلام ہی کی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ نہ کبھی منزل بدلتی ہے اور نہ کبھی سفر کی جہت تبدیل ہوتی ہے۔ یہ یکسانی اور یکرنگی ان شاعروں کی خصوصیت ہے، جن کا یہاں ذکر فرمایا جارہا ہے۔

چوتھی خصوصیت ان شعراء کی یہ ہے کہ چونکہ ان کے جذبات و احساسات بھی اسلام کا رنگ اختیار کر چکے ہیں، ان کو اسی بات پر غصہ آتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں بری ہے اور اسی بات پر خوشی ہوتی ہے جو اسلام کی نگاہ میں اچھی ہے۔ ان کا داد و دہش اسلام کے حوالے سے ہوتا ہے اور ان کا انتقام اور انتصار بھی اسلام ہی کے حوالے سے متشکل ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی کی تعریف کرتے ہیں تو اسلام کی خاطر اور کسی کی ہجو کہتے ہیں تو اسلام کی خاطر۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ جو تمام ذاتی، نسلی اور قومی عصبیتوں سے ہاتھ اٹھا چکے تھے، اب ان کا بالکل یہ حال ہوگیا تھا جس کی تصویر حالی نے کھینچی ہے:

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم، گرما گئے وہ

مسلمان شعراء کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ وہ اپنی تمام تر طلاقتِ لسانی اور شعری مہارت کے باوجود اپنی اس صلاحیت کو کبھی شخصی اغراض کیلئے استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب ان پر کوئی ظلم کرتا تھا یا نسلی یا قومی عصبیتوں کی آگ بھڑکاتا یا آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا یا اسلامی تعلیمات کو ہجو و طعن کا نشانہ بناتا تھا۔ تو پھر اسلام کے حق میں اور باطل سے انتقام لینے کیلئے ان کی زبانیں حرکت میں آتی تھیں اور وہ اپنی زبانوں سے وہی کام لیتے تھے جو ایک مجاہد تیر و نشتر سے کام لیتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ شعراءِ کفر جب اسلام اور نبی کریم ﷺ کیخلاف الزامات کے طوفان اٹھاتے اور نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتے تھے تو اس کا جواب دینے کیلئے آنحضرت ﷺ شعراءِ اسلام کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے ایک موقع پر حضرت کعب بن مالکؓ سے فرمایا اھجھم فوالذی نفسی بیدہ لھم اشد علیھم من النبل ''ان کی ہجو کہو کیونکہ اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہارا ہر شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔'' حضرت حسان ابن ثابتؓ کیلئے مسجدِ نبوی میں منبر رکھا جاتا تھا اور وہ کافر شعراء کا جواب دیتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ انہیں دعاؤں سے نوازتے تھے۔ ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے آنحضرت ﷺ کی ہجو کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان کی ہرزہ سرائی کے جواب میں حضرت حسانؓ نے جو اشعار کہے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

Marfat.com

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ — وَعِنْدَاللّٰهِ فِيْ ذَاکَ الْجَزَاءُ
وَاِنَّ اَبِيْ وَوَالِدَتِيْ وَعِرْضِيْ — لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وِقَاءُ
اَتَشْتِمُهُ وَلَسْتَ لَهُ بِكُفْءٍ — فَشَرُّكُمَا لِخَيْرِكُمَا الْفِدَاءُ
لِسَانِيْ صَارِمٌ لَاعَيْبَ فِيْهِ — وَبَحْرِيْ لَاتُكَدِّرُهُ الدِّلَاءُ

''اے ابوسفیان تونے میرے محبوبؐ کی جناب میں نازیبا باتیں کیں اور میں اس ہجو کا تمہیں جواب دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں مجھے اس کی جزاء خیر ملے گی۔''

''سنو! تمہاری بدزبانی سے حضورؐ کی عزت کو بچانے کیلئے میرا باپ، میری ماں اور میری عزت بطور سپر کام دیں گے یعنی میں اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی عزت تک کو حضورؐ کی عزت پر قربان کردوں گا۔''

''تو اس کی جناب میں نازیبا بات کہتا ہے جس کا تو ہم پایہ نہیں ہے۔ تم دونوں میں سے جو برا ہے وہ اس پر فدا ہو جو تم میں سے اچھا ہے۔''

''میری زبان تیز تلوار ہے اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور میرا بحر فصاحت اتنا گہرا ہے کہ ڈول نکالنے سے وہ مکدر نہیں ہوتا۔''

آیت کے آخری حصہ میں ظالموں کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور یہاں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کیلئے سراسر زیادتی سے کام لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر کبھی شاعر ہونے کا الزام لگاتے تھے اور کبھی کاہن ہونے کا۔ تاکہ لوگ آپ کی نبوت کے بارے میں یکسو نہ ہوسکیں۔ اور اسلام کو آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے۔ انہیں وارننگ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانہ کیا ہوتا ہے۔ اور وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

دروسِ قرآن

سُورَةُ النَّمْلِ

(۲۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ النَّمْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام النمل ہے۔اس کا ذکر اس سورۃ کی آیت ۱۸ میں ہے۔اس سورۃ کے رکوع سات ہیں اور اس کی آیات کی تعداد ۹۳ ہے۔یہ ایک ہزار تین سو ستر ہ کلموں اور چار ہزار سات سو ننانوے حروف پر مشتمل ہے۔

زمانہ نزول:۔ اس سورۃ کا تعلق بھی مکی زندگی کے درمیانی عہد سے ہے۔کیونکہ اس سورۃ کا مضمون اور اندازِ بیان مکہ کے دورِ متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت جابر بن زیدؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورۃ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل اور پھر القصص۔یہ زمانہ وہ ہے جب کفار کی عداوت اپنے عروج پر تھی۔غلط الزامات، طعن وتشنیع، بہتان طرازی کے طوفان برپا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔

مضامین:۔ سب سے پہلے تمہید کے طور پر یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو ہدایت وبشارت بنا کر نازل فرمایا ہے۔لیکن اس کی بشارتوں کے مستحق صرف وہی لوگ ہوں گے جو ان حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔جن کی عملی زندگی اطاعت واتباع کی تصویر ہو، اور جن کے دلوں میں آخرت کا خوف پوری طرح موجزن ہو کیونکہ جو لوگ اس دنیا کے عیش وآرام میں مگن ہیں وہ اپنے ان مشاغل سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتے جب تک ان کے اندر آخرت میں جوابدہی کا یقین پیدا نہ ہو۔کیونکہ شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کی دلچسپیاں اور ان کے مشاغل اس طرح کھبا دیئے ہیں کہ اب کوئی تذکیر وتنبیہ بھی ان پر کارگر نہیں ہو سکتی۔اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

پہلا نمونہ فرعون اور سردارانِ قومِ ثمود اور سرکشانِ قومِ لوط کا ہے۔ان کی زندگیوں پر فکرِ آخرت سے بے نیازی اور بندگی نفس کی حکومت تھی۔وہ ہر اس فکر اور اس کام کو ترجیح دیتے تھے جس سے دنیوی عیش وعشرت میں اضافہ ہوتا اور خواہشِ نفس کی پیروی میں آسانی ہوتی تھی۔یہ ہر اس شخص کے دشمن تھے جس نے انہیں خیر وصلاح کی طرف بلایا ہے اور دنیوی زندگی کی ناپائیداری اور اسی کو ہدف بنا کر اپنے مشاغل کو بروئے کار لانے کی روش پر انہیں ٹوکا ہے۔چنانچہ ان کی اس روش نے اس طرح ان کی فکر اور قوتِ فیصلہ کو متاثر کیا کہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحے پہلے تک انہیں ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دولت وحکومت اور شوکت وعظمت سے اس حد تک نوازا تھا کہ کفارِ مکہ ان جیسی سطوت وحکومت کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صالح اور مصلح بندوں کو دولت وحشمت اور حکومت وشوکت اندھا نہیں کر سکتی، بلکہ جتنا ہی ان نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اتنی ہی

Marfat.com

منعمِ حقیقی کے آگے ان کی فروتنی اور سرافگندگی بڑھتی جاتی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نعمت وجاہ اور حکمت وسائنس میں سے جو کچھ بخشا وہ کسی کو بھی نہیں بخشا۔ لیکن انہوں نے ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کا فضل جانا اور یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھی کہ یہ نعمتیں دے کر اللہ تعالیٰ ان کا امتحان کر رہا ہے کہ وہ اس کے شکر گزار بندے بنتے ہیں یا ناشکرے۔

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے۔ تاریخ عالم میں کسی عورت کو حکمران کے طور پر اتنی شہرت نہیں ملی۔ اس کے پاس دولت وحکومت کے وہ تمام وسائل جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ آبائی تقلید وتعصب اور اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کی ہوس کی وجہ سے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اس کیلئے آسان نہ تھا۔ بایں ہمہ جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے روک نہ سکی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آباؤاجداد کی تقلید اور غلط مذہب کی پیروی اس وقت نقصان دیتی ہے جب وہ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی میں تبدیل ہو جائے۔ اور ضمیر ہر طرح کی بھلائی کی باتوں کو سننے سے محروم ہو جائے۔

اس کے بعد کائنات کی گوناگوں نشانیوں اور نعمتوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے مخاطبوں سے پوچھا گیا ہے کہ ان میں سے کس چیز کو تم خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر سکتے ہو۔ جب ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کر سکتے تو آخر اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہو اور ان کے بل پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے کیوں لڑنے اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے اور جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اور یہی چیز درحقیقت ان کی ساری سرکشی کا سبب ہے۔

اصل مرض کی نشاندہی کے بعد مسلسل ایسی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جن سے لوگوں میں آخرت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور اس سے غفلت برتنے کے نتائج پر متنبہ کیا گیا ہے۔ اور آخرت کی آمد کا اس طرح یقین دلایا گیا ہے جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ سورۃ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ نہ تو ان کے حال پر غم کریں اور نہ ان کی چالوں سے پریشان ہوں۔ رہا ان کا عذاب کا مطالبہ تو آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ جو مہلت ملی ہوئی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اپنی شامت نہ بلاؤ۔ اگر اس کے بعد بھی وہ آپ کی بات سن کے نہیں دیتے تو آپ یہ اعلان کر دیجئے کہ مجھے اسی قرآن کے سنانے کی ہدایت کی گئی ہے جو اس پر ایمان لائے گا، اس کا نفع اسی کو پہنچے گا۔ اور جو اس کا انکار کرے گا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کیونکہ میں صرف ایک منذر ہوں، انذار کے بعد میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۹۳	سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ (۲۷)	رُكُوْعَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّبُشْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ
اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ
فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ
حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ﴿۶﴾ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ
مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۷﴾
فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِىَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِى النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ
اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸﴾ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۹﴾
وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ
يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ قف اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ
ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱﴾ وَاَدْخِلْ يَدَكَ
فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ قف فِىْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ

Marfat.com

وَقَوْمِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا

وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع

رکوع: ۱۔ (ط۔س یہ آیات ہیں قرآن اور ایک واضح کتاب کی۔ ۱) یہ ہدایت و بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کیلئے۔ ۲) جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۳) بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال کو ان کیلئے خوشنما بنا دیا ہے، پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ۴) یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے بری سزا ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ ۵) اور بیشک یہ قرآن آپ کو ایک حکیم و علیم کی طرف سے سکھایا جا رہا ہے۔ ۶) یاد کیجئے جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا میں نے ایک آگ دیکھی ہے، میں ابھی وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلگا کر لاتا ہوں تاکہ تم تاپو۔ ۷) تو جب (حضرت موسیٰ علیہ السلام) اس آگ کے پاس آئے تو ندا آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہے، اور پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا رب۔ ۸) اے موسیٰ! یہ میں ہی ہوں، خدائے عزیز و حکیم۔ ۹) اے موسیٰ! آپ اپنی لاٹھی پھینک دیجئے، تو حضرت موسیٰ نے اس لاٹھی کو دیکھا حرکت کرتے ہوئے گویا کہ وہ سانپ ہے تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، (ارشاد ہوا) اے موسیٰ! ڈرو نہیں، میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔ ۱۰) مگر وہ شخص جس نے کوئی زیادتی کی ہو، پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا، تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ ۱۱) آپ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالئے، وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا نکلے گا، (یہ دو معجزات) نو معجزات میں سے ہیں، فرعون اور اس کی قوم کی طرف جایئے، بیشک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں۔ ۱۲) پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں، انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ ۱۳) انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کے سبب سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے، پس دیکھ لیجئے کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ ۱۴)

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾

(ط۔س یہ آیات ہیں قرآن اور ایک واضح کتاب کی۔ ۱)

Marfat.com

ایک اشکال کا جواب

یہاں قرآن کو معرفہ اور کتاب کو نکرہ لایا گیا ہے، لیکن سورۃ الحجر میں قرآن کو نکرہ اور کتاب کو معرفہ ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ اس کی کیا وجہ ہے؟ تفسیر مظہری میں اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ قرآن اور کتاب کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں اس کتابِ الٰہی کے عَلَم (نام) ہیں جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اس کلام کی صفتیں ہیں۔ یعنی قرآن سے مراد مقرو (پڑھا جانے والا) ہے اور کتاب سے مکتوب جو لکھا جاتا ہے۔ جہاں انہیں معرفہ ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ عَلَم کی حیثیت سے مذکور ہیں اور جہاں نکرہ لایا گیا ہے، وہاں بحیثیت صفت۔

کتابِ مبین کا مفہوم

قرآن کتابِ الٰہی کے ذاتی ناموں میں سے ایک نام ہے اور یہ سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس کے ساتھ کتاب مبین کی صفت کئی اہم حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ (۱) کہ یہ کتاب حق اور باطل کا فرق اس طرح کھول کے بیان کرتی ہے اور پھر دونوں کے مصادیق تائید کے طور پر اس طرح پیش کرتی ہے کہ حق اور باطل نمایاں طور پر الگ الگ دکھائی دیتے ہیں اور دونوں میں التباس کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ (۲) کہ اس کی زبان اس قدر واضح اور اس قدر جامع و مانع ہے کہ کسی بات کے سمجھنے میں دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس کتاب کی تعلیمات، اس کی ہدایات اس قدر سہل، سادہ، مربوط اور دل میں اتر جانے والی ہیں کہ کسی شخص نے اگر اپنے دل و دماغ میں تحفظات کے پتھر حائل نہ کر رکھے ہوں تو انہیں قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ (۳) یہ کتاب اپنے ہر دعوے پر خود ایسی حجت ہے کہ اس کی صحت و صداقت کو جانچنے کیلئے کسی خارجی شہادت اور کسی معجزہ و نشانی کی ضرورت نہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کا اس سے بہتر مصداق شاید ہی کوئی اور ہو۔

جس کتاب کی یہ صفات اور خصوصیات ہوں وہ اپنے اندر اتمامِ حجت کی خصوصیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے اس کتاب کے انکار کرنے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ انکار کی صورت میں کتنے بڑے خطرے کو دعوت دے رہے ہیں۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٣﴾

(یہ ہدایت و بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کیلئے۔ ۲) جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۳)

کتاب کی دو خصوصیات ہدایت، بشارت

اس کتاب کی دو خصوصیات کو ذکر کیا گیا۔ ایک یہ کہ وہ ہدایت ہے اور دوسرا یہ کہ وہ بشارت ہے۔ اس میں جو بات سب سے پہلے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کا کام ہدایت دینا اور بشارت دینا ہے۔ اس لحاظ سے اسے مصدر کی بجائے اسمِ فاعل کی صورت میں لانا چاہئے تھا لیکن یہاں دونوں صفات کو مصدر کی صورت میں لایا گیا ہے۔ اس میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرنا

Marfat.com

مقصود ہے کہ یہ کتاب ہدایت اور بشارت کے وصف میں اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کی بجائے مجسم سخاوت اور حسین کہنے کی بجائے از سرتا پا حُسن کہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سخاوت میں اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ گویا خود سخاوت بن گیا ہے اور اپنے حسن اور خوبصورتی میں اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ خود اسے حُسن کہا جانا چاہئے۔

اور دوسری بات جس کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب سب کیلئے ہدایت ہے۔ اپنے اپنے مقام و مرتبہ اور کیفیت کے مطابق ہر شخص اس سے ہدایت حاصل کرسکتا ہے۔ البتہ یہ بشارت صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اسے قبول کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بالفعل ہدایت ہے۔ لیکن نتیجے اور آخرت کے اعتبار سے بشارت اور خوشخبری ہے۔

ہدایت کی شرائط

دوسری آیتِ کریمہ میں ہدایت کیلئے کچھ شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم راہِ راست کی طرف سب کو متوجہ کرتا ہے۔ لیکن اس راستے پر چلنے کیلئے جب تک طبیعت میں آمادگی پیدا نہ ہو اس وقت تک وہ اپنی آغوش اس کیلئے نہیں کھولتا۔ اس آمادگی ہی کو ایمان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا آغاز اقرار سے ہوتا ہے اور جس کا اتمام عمل اور اطاعت سے گزرتے ہوئے قلبی تصدیق پر ہوتا ہے۔ اور اس کی وسعت میں توحید، رسالت اور آخرت بھی شامل ہیں۔ یعنی جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان تینوں باتوں پر یقین رکھتا ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے اساسی تصورات کو مان کر ہی نہ رہ جائے بلکہ اس راستے پر چلنے اور قرآنِ کریم کی ہدایات پر عمل کرنے کیلئے کمر بستہ بھی ہو جائے۔ اسی کو اطاعت اور اتباع کہتے ہیں۔

دائرۂ ایمان میں داخل ہونے کے بعد اطاعت کیلئے سب سے پہلے جو حکم اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ نماز ہے۔ یعنی جو آدمی سورج نکلنے کے بعد ایمان لاتا ہے، دوپہر کے بعد اسے ظہر کی نماز پڑھنا ہوگی۔ اسی طرح دن کے کسی وقت میں بھی ایمان لانے والا وقت کی پابندی کے ساتھ نماز پڑھنے کا پابند ہے۔ اسی طرح جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہے اس کی دولت کے حوالے سے سب سے پہلے زکوٰۃ کا حکم اسے اپنی طرف بلاتا ہے۔ اس لئے ان دو عبادات کا ذکر صرف اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اطاعت کے راستے میں سب سے پہلے پیش آنے والے یہ دو احکام ہیں۔ ان دو پر عمل کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان لانے والا شخص واقعی اپنے ارادے میں مخلص اور اپنے فیصلے میں سنجیدہ ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ آخرت پر یقین لانا ایمان کا لازمی جز ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے قرآنِ کریم نے ایمان بالآخرت کا دوبارہ ذکر فرمایا کیونکہ عملی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا اقرار بھی کسی شخص کو احکام کی اطاعت پر مجبور نہیں کرتا۔ اور نہ اس کے اندر جذبے کی قوت پیدا ہوتی ہے تاوقتیکہ اس کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ نہ ہو جائے کہ مجھے ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ جیسے ہی یہ خیال انسان کی سوچ کا حصہ بنتا ہے تو اب اس کیلئے یہ بات ممکن نہیں رہتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے سرتابی کرنے کی جرأت کرسکے۔ اس لئے یہاں حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ یہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی صرف مان لینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یقین کی قوت انہیں عمل پر اکساتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ زندگی وجود میں آتی ہے جو ایک مومن سے مطلوب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۴

(بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال کو ان کیلئے خوشنما بنا دیا ہے، پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ۴)

Marfat.com

ایمان سے انکار کا سبب

قرآنِ کریم کی تعلیمات حد درجہ واضح ہونے کے باوجود جو لوگ ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہوتے بلکہ مخالفت اور معاندت پر تلے ہوئے ہیں ان کے انکار کا سبب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ وہ لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اسی دنیا کی زندگی کو کل زندگی سمجھے بیٹھے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی وعمل کے نتائج کو صرف اسی دنیا پر محدود سمجھے گا اور ایسی کسی عدالت کا قائل نہیں ہوگا جہاں انسان کے پورے کارنامۂ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حسن وقبیح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جانے والا ہو۔ اور جب وہ موت کو زندگی کے خاتمے کی علامت سمجھتا ہو اور کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہو جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق ٹھیک ٹھیک جزاء وسزا دی جائے تو لازماً اس کے اندر ایک مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے اخلاقی قدریں بے معنی محسوس ہوں گی۔ انسانیت نام کی چیز اس کیلئے اجنبی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت نفع ونقصان کا وہ پیمانہ ہوگا جو اس کو لطف ولذت اور راحت وآرام کا سامان مہیا کر سکے۔ اس کے نزدیک مادی ترقی وخوشحالی اور قوت واقتدار دنیا کی سب سے بڑی حقیقت بن جائے گی۔ اسے ہر وہ عمل اور ہر وہ کوشش کارآمد اور قابلِ عمل دکھائی دے گی جو اس کی ذات کی سربلندی اور اس کے عیش وعشرت میں اضافے کا باعث ہو۔ زندگی کی روحانی اور معنوی قدریں اس کے نزدیک کمزور لوگوں کے سہارے اور توہمات کے نتائج محسوس ہوں گے۔ چنانچہ وہ جیسے جیسے حب دنیا کا اسیر ہوتا جائے گا ویسے ویسے مال ودولت میں اضافے کیلئے کی جانے والی کاوشیں اسے محبوب ہوتی جائیں گی اور وہ انہیں چیزوں کو روشن خیالی اور وقت کی سب سے بڑی آواز قرار دے گا۔ اور ہر وہ شخص جو نیکی اور بھلائی کی بات کرے گا اسے وہ بیوقوف اور احمق سمجھے گا۔ بظاہر وہ نہایت مہذب اور پڑھا لکھا آدمی ہوگا لیکن اسے اپنی ذات اور اپنی عیش وعشرت اس حد تک مرغوب ہوگی کہ اگر اسے دوسروں کے کھنڈرات پر اپنا محل اٹھانا پڑے اور دوسرے کی محرومیوں سے اپنی عیش وعشرت کی شمع جلانی پڑے تو اسے اس میں کوئی تکدر اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اس آیتِ مبارکہ میں تزیینِ اعمال کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق انسان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں سزا کے طور پر انسان اور معاشرے پر مسلط کی جاتی ہے۔ اور انسان کولہو کے بیل کی طرح ساری زندگی اسی مطاف میں طواف کرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ دل کے احساسات مر جانے سے معدے کو ایسی وسعت ملتی ہے کہ انسان کی زندگی کا تمام تر سفر ڈائننگ روم سے واش روم تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا، ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝٥

(یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے بری سزا ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ ۵)

Marfat.com

سُوْٓءُ الْعَذَابِ سے مراد؟

اس آیت میں چونکہ آخرت کے عذاب کا مستقلاً ذکر ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ سُوْٓءُ الْعَذَاب کا تعلق دنیا سے ہے۔ جہاں تک آخرت کے عذاب کا تعلق ہے وہ تو سب جانتے ہیں کہ اس سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ لیکن جہاں تک سُوْٓءُ الْعَذَاب کا سوال ہے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں فرمائی گئی۔ کیونکہ جو لوگ آخرت سے لاتعلق ہو کر صرف دنیا کو بنانے سنوارنے میں لگے رہتے ہیں ان سب کا دنیا کے بارے میں نقطۂ نگاہ یکساں نہیں ہوتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ دنیا کی محبت میں ڈوب کر وہ جو طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں ان میں بھی یکرنگی نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک فرد سے لے کر ایک قوم کی اجتماعی زندگی تک دنیا طلبی، حُبِ دنیا اور دنیوی مفادات کو ہی حاصلِ زندگی سمجھنے کا نتیجہ کسی نہ کسی صورت میں سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کبھی ایک فرد دولت کی محبت میں قرابت کے رشتوں اور احباب کی محبت سے محروم ہو کر تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ عموماً خودکشی کی موت مرتے ہیں۔ اور جس معاشرے میں اس طرزِ عمل کی حکمرانی ہو جاتی ہے اس معاشرے میں سب سے پہلے گھروں کی دنیا اجڑتی ہے، رشتوں کا احترام ختم ہوتا ہے، معاملات میں ابتری کے باعث خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوتے ہیں، اجتماعی زندگی طبقات کا شکار ہو جاتی ہے، اخلاقی قدریں دم توڑ جاتی ہیں، محبت و الفت، ہمدردی و خیر خواہی اور ایثار و قربانی کے الفاظ اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ اس حال میں افراد اور قوم ایسی تباہ کن صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے یہاں سُوْٓءُ الْعَذَاب سے تعبیر کیا ہے۔

وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ ﴿۶﴾

(اور بیشک یہ قرآن آپ کو ایک حکیم و علیم کی طرف سے سکھایا جا رہا ہے۔ ۶)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور قرآن کے ہر قاری اور ہر سامع کو اعتماد کی دولت سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے بلکہ آپؐ کی مخالفت و معاندت پر تلے ہوئے ہیں تو آپ اس کی بالکل پرواہ نہ کریں۔ آپ نہایت اطمینان سے اپنا کام سرانجام دیتے رہیں۔ کیونکہ یہ قرآن جس ذات کی طرف سے آپ پر اتارا جا رہا ہے وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اور قرآنِ کریم سے تعلق جوڑنے والے ہر شخص سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جا رہی ہیں۔ اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس اور رائے پر مبنی ہے بلکہ انہیں ایک حکیم و علیم ذات القاء کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے۔ وہ کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر آپ کی رہنمائی کرے گا اور آپ کو منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔

Marfat.com

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۷

(یاد کیجئے جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گھر والوں سے کہا میں نے ایک آگ دیکھی ہے، میں ابھی وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلگا کر لاتا ہوں تا کہ تم تاپو۔ ۷)

شِهَابٍ، شعلة نار ساطعة ''آگ کا چمکتا ہوا شعلہ'' (صحاح)

انبیائے کرام کے واقعات بیان کرنے کا سبب

والقبس اسم لما یقتبس من جمر وما شبهة (قرطبی) ''یعنی وہ آگ جو کسی انگارہ وغیرہ سے سلگائی جائے۔''

یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کی جا چکی ہے کہ قرآنِ کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جس میں پہلوں کے واقعات بیان کئے جائیں۔ لیکن یہ بات ایک قاری کو بعض دفعہ سوچ میں ڈال دیتی ہے کہ قرآنِ کریم بار بار تاریخ کے بعض ابواب کو کیوں دہراتا ہے اور خصوصاً انبیائے کرام کے واقعات کو مختلف حوالوں سے کیوں ذکر کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نبوت اور رسالت کوئی عام تجربے کی چیز نہیں اور نہ یہ کوئی ایسا منصب ہے جسے محنت اور کوشش سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ منصب سراسر اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کے تحت اچانک کسی کو عطا ہوتا ہے۔ اگر یہ عام تجربے کی چیز ہوتی تو لوگ اپنے تجربوں کے نتائج کے طور پر بہت سے اصول مرتب کرتے اور بہت سی ہدایات مدون ہوتیں۔ یہ چونکہ عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربانی ہے۔ اس لئے اس کا تجربہ صرف انہی سعید نفوس کو ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول جن قوموں کی طرف مبعوث ہوتے ہیں ان کیلئے ان پیغمبروں کی دعوت عموماً ایک انوکھی اور اجنبی چیز سمجھی گئی ہے اور اس کیخلاف طرح طرح کے شبہات واعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ چنانچہ نبوت اور رسالت اور تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں ہر پیغمبر کو جس طرح کے حالات سے سابقہ پڑا اور جن کیفیات سے گزرنا پڑا اور جن مشاہدات اور تجربات سے واسطہ پیش آیا ضروری تھا کہ ہر مناسب موقع پر انبیائے کرام اور رسولانِ عظام کے انہی تجربات اور مشاہدات کو آپؐ پر نازل کیا جاتا تا کہ آپؐ ان حالات کی روشنی میں اپنے لئے طمانیت و سکینت کا سامان پاتے اور مزید یہ کہ ان کے حالات کی روشنی میں آپ اپنے لئے حکمت کے وہ راستے تلاش کر سکتے جس پر سابقہ انبیاء کو چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور شاید یہی وہ چیز ہے جس کی اقتداء کا آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا تھا۔ اور ان کی امتوں کے احوال کی روشنی میں آپ کے مخالفین اگر چاہتے تو اپنے لئے بہت کچھ روشنی کا سامان تلاش کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہی دو اسباب ہیں جن کی وجہ سے قرآنِ کریم بار بار انبیائے کرام کی تبلیغ و دعوت کی حکمتوں اور ان کی امتوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے اور اس سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کے حوالے سے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سب انبیائے کرام سے زیادہ تفصیل کے ساتھ تورات میں موجود تھے۔ اور پھر ان پر ایمان کی مدعی اپنی تمام خصوصیات سمیت ایک قوم بھی موجود تھی۔ اس لئے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و تجربات قرآنِ کریم میں ذکر کئے گئے تا کہ آپ کیلئے تسکین و اطمینان کا باعث ہو سکیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے مختلف ابواب قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر بیان کئے ہیں۔ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ان واقعات کو ذکر کیا جا رہا ہے جب آپؑ مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد غالباً مصر واپسی کیلئے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکلے اور راستے میں آپؑ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ان واقعات کو ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس کے محلِ وقوع کو بیان کر دیا جائے۔

Marfat.com

مدین اور طور کا محل وقوع

مدین کا علاقہ خلیج عقبہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے ساحل پر واقع تھا۔ وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اس مقام پر پہنچے جو اب کوہ سینا اور جبلِ موسیٰ کہلاتا ہے اور نزولِ قرآن کے زمانے میں طور کے نام سے مشہور تھا۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جو یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں رومی سلطنت کے پہلے عیسائی بادشاہ قسطنطین نے ۳۶۵ عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں ٹھیک اس مقام پر ایک کلیسا تعمیر کرادیا تھا۔ اس کے ۲۰۰ برس بعد قیصر جسٹینین نے یہاں ایک دَیر تعمیر کرایا جس کے اندر قسطنطین کے بنائے ہوئے کلیسا کو بھی شامل کرلیا۔ یہ دَیر اور کلیسا دونوں آج تک موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور کے اسی مقام کی طرف بڑھ رہے تھے، جاڑوں کا موسم تھا، رات کا وقت، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات کی سخت سخت خنکی میں راستہ گم کر بیٹھے۔ دور سے ایک روشنی دکھائی دی، اپنے گھر والوں سے کہا تم یہیں ٹھہرو، مجھے آگ نظر آئی ہے، میں وہاں جاتا ہوں، اگر کچھ لوگ وہاں ہوئے تو ان سے راستہ معلوم کرتا ہوں ورنہ آگ ہی کا کوئی انگارہ لاتا ہوں تاکہ تم لوگ اس سردی میں تاپ سکو۔

فَلَمَّا جَآءَ هَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸

(تو جب (حضرت موسیٰ علیہ السلام) اس آگ کے پاس آئے تو ندا آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہے، اور پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا رب۔ ۸)

وادیِ طور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر عنایتِ ربانی

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وہاں پہنچے جہاں آپؑ کو آگ دکھائی دی تھی تو آپؑ نے دیکھا کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ مگر نہ کچھ جل رہا تھا اور نہ کوئی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور سورۃ القصص کی وضاحت کے مطابق اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جو جلنے کی بجائے اپنی سرسبزی اور شادابی میں پہلے سے دوچند ہوتا جارہا تھا۔ یکا یک اس درخت میں سے آواز آنے لگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ اندازہ نہ کرسکے کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آرہی ہے۔ آپؑ کو چاروں طرف سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی کیفیت تھی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلی دفعہ دوچار ہوئے تھے اور انبیائے کرام کے ساتھ ایسے ہی معاملات پیش آتے ہیں جو ان کیلئے حیرانی کا باعث ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء علیہم السلام کے نفوس میں اور خارج کے ماحول میں ایک ایسی غیر معمولی کیفیت پیدا کردی جاتی ہے جس سے یہ یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ ہونے والا واقعہ یا آنے والی آواز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، کسی شیطان کا کرشمہ نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہاتف کی آواز تھی۔ چنانچہ اس کی وضاحت کیلئے اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ آگ نہیں ہے بلکہ اس روشنی کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات اپنے بابرکت کروبیوں کے جلو میں جلوہ گر ہے۔ اس غیر معمولی صورتحال سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانوس کرنے کیلئے یہ فرمایا گیا کہ وہ ذات بڑی بابرکت ہے جو اس آتش نما نور میں ہے اور اس کا سارا ماحول بھی بہت برکت والا ہے۔

Marfat.com

ایک شبہ کا ازالہ

البتہ اس آگ کا ایک مخصوص جگہ میں پایا جانا اور ہاتفِ غیبی کا یہ کہنا کہ بہت بابرکت ہے جو اس کے اندر ہے، یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ تھا۔ اس سے غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی محدود مقام میں سما جاتا ہے اور انسانوں کی طرح مخصوص زبان میں گفتگو فرماتا ہے۔ اس لئے شبہ کے ازالے کا یہی بہترین طریقہ تھا جو اختیار کیا گیا۔ فرمایا: سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ''یعنی اللہ تعالیٰ پاک اور منزہ ہے جہت و مکان سے، اور ان تمام عیوب سے جو حدوث کو مستلزم ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود ہو کہ یہ معاملہ کمال درجہ تنزیہہ کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ اس آواز میں نہ درخت کا دخل ہے، نہ اللہ تعالیٰ کا نور کسی میں اترا ہے، نہ اس کی ذات نے کسی میں حلول کیا ہے۔ وہ ذات جو ہر طرح کی مشابہت سے پاک، ہر طرح کے حدوث سے منزہ اور ہر چون و چرا سے بالا ہے۔ وہ ان تمام صفات سے متصف ہوتے ہوئے بھی بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔ یہ اس کی تجلی ہے جو تمہیں نظر آرہی ہے۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ ﴿۹﴾

(اے موسیٰ! یہ میں ہی ہوں، خدائے عزیز و حکیم۔ ۹)

احتمالات کی وضاحت

گزشتہ آیت میں بیان کردہ غیر معمولی صورتحال سے جو اشتباہات پیدا ہوسکتے تھے اور جس طرح اجمالی انداز میں بات فرمائی گئی تھی اور جس میں کئی احتمالات ممکن تھے ان تمام پردوں کو ہٹاتے ہوئے فرمایا کہ میں ہی خدائے عزیز و حکیم ہوں، میری ہی آواز تم نے سنی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذاتی نام سے اپنا ذکر فرمایا اور اپنی دو صفات سے اپنا تعارف کرایا تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ و دعوت کے کٹھن راستے پر چلتے ہوئے یہ اطمینان رہے کہ ان کی پشت پناہ ایک ایسی ذات ہے جو عزیز اور غالب ہے۔ البتہ وہ بعض دفعہ مخالفین کی گرفت میں تاخیر سے کام لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ انہیں کھل کھیلنے کا موقع دیتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی اس سے بچ کے بھی جاسکتا ہے۔ البتہ گرفت میں تاخیر اور ڈھیل پہ ڈھیل دیتے چلے جانا یہ اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کے سامنے ان دونوں صفات کی موجودگی ایک بہت بڑی ڈھارس کا کام دیتی ہے۔ اور لوگوں کی بے اعتنائیاں بلکہ بار بار حدود سے تجاوز اس کے حوصلے کو شکست دینے سے عاجز رہتا ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ڰ ﴿۱۰﴾

(اے موسیٰ! آپ اپنی لاٹھی پھینک دیجئے، تو حضرت موسیٰ نے اس لاٹھی کو دیکھا حرکت کرتے ہوئے گویا کہ وہ سانپ ہے تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، (ارشاد ہوا) اے موسیٰ! ڈرو نہیں، میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔ ۱۰)

Marfat.com

پہلا معجزہ اور اس کی وضاحت

قرآنِ کریم میں دوسرے مواقع پر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ پروردگار نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ ہمکلامی بخشا اور آپ کو بتایا کہ ہم نے آپ کو نبوت کیلئے چن لیا ہے۔ اس کے بعد آپ کو چند معجزات عطا کئے گئے جن میں سب سے پہلا اور عظیم معجزہ عصائے موسیٰ تھا۔ آپ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ایک لاٹھی رکھا کرتے تھے جس کی مدد سے آپ بکریاں چراتے، بکریوں کیلئے پتے جھاڑتے، تھک جاتے تو اس پر ٹیک لگا لیتے۔ اور بھی لاٹھی سے جو کام لئے جاتے ہیں اس سے لیتے تھے۔ وہی لاٹھی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ بات سراسر غلط ہے جو عوام میں پھیلائی گئی ہے کہ وہ لاٹھی جنت سے حضرت آدم علیہ السلام لے کر آئے تھے، اس سے روشنی پھوٹتی تھی، اس کا قد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھا۔ یہ سب خانہ ساز باتیں ہیں۔ ایک عام لاٹھی تھی جیسے چرواہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ اس لاٹھی کو زمین پر پھینک دیجئے۔ جیسے ہی آپ نے لاٹھی زمین پر پھینکی، اس نے سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے چلنا شروع کر دیا۔ قرآنِ کریم نے کہیں تو اس لاٹھی کو تبدیلی کے بعد جَـآنٌّ کے نام سے یاد کیا ہے جو چھوٹے اور پتلے سانپ پر بولا جاتا ہے اور کہیں اسے حَيَّةٌ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ہر طرح کے سانپ کو کہتے ہیں اور کہیں اسے ثعبان کا نام دیا گیا ہے جو اژدھا کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تعبیر میں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہ عصا جب سانپ کی شکل اختیار کرتا تھا تو ہمیشہ ایک جیسی شکل نہیں ہوتی تھی۔ کبھی عام سانپ کی طرح ہوتا، کبھی باریک سانپ کی طرح اور کبھی اژدھا کی شکل اختیار کر لیتا تھا، جیسے ساحرانِ مصر کے سامنے اژدھا کی شکل میں ان کے سانپوں پر جھپٹا۔ لیکن بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ ہمیشہ ہی اژدھا کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن اس کی پھرتی اور تیزی کی وجہ سے اسے دوسرے ناموں سے یاد کیا گیا ہے، یعنی جسامت میں وہ اژدھا تھا۔ لیکن پھرتی اور تیزی میں عام سانپ کی طرح تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی اپنے عصا کو سانپ کی طرح رینگتے دیکھا تو آپ اس سے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے اور خوف آپ پر ایسا طاری ہوا کہ آپ نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا کہ سانپ پیچھے آ رہا ہے یا وہیں کہیں رہ گیا ہے۔ اس سے دو باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر یہ بننے والا سانپ جسامت میں چھوٹا اور پتلا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جری اور تنومند آدمی کیلئے خوفزدہ ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ آپ بڑی آسانی کے ساتھ اسے کچل سکتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقیناً عصا نے اژدھا کی شکل اختیار کی تھی۔ اور ہو سکتا ہے وہ بل کھاتا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف بڑھا ہو۔ تو ایسی صورت میں انسانی فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ اس سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوتے کیونکہ خالی ہاتھ آدمی اژدھا کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔

نبی کی حقانیت کی دلیل

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبوت کے ابتدائی مرحلہ کے مشاہدات نبی کیلئے بالکل نامانوس، نہایت انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اس کو ان سے مانوس کر دیتا ہے۔ کیونکہ اسے نبوت بغیر کسی کوشش، خواہش یا امید کے محض اللہ تعالیٰ کی عطا کے طور پر ملتی ہے اور ایک فریضے کے طور پر پیغمبر اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اسے ایک لحہ پہلے تک اپنی نبی بن جانے کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور یہ کیفیت نبی کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ نبوت کے جھوٹے دعویدار قدم قدم شہرت کے مراحل طے کرتے اور اپنے دعوے کیلئے زمین ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اس کاروبار میں اپنے ہمراز لوگوں کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ اور لوگوں کے ایمان کی آزمائش

Marfat.com

کیلئے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف دعوے کئے جاتے ہیں۔کبھی مناظر بن بیٹھے،اس طرح سے ہم خیال لوگوں کا اعتماد حاصل کیا،پھر داعی کا روپ دھار لیا،بعض لوگوں سے اپنے آپ کو مجدد لکھوایا،پھر خود کو مہدی کہنے لگے،پھر ایک جست لگائی اور نبوت کے منصب پر فائز ہو گئے۔اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ایسی ہر حرکت اور ہر ارادے سے پاک ہوتے ہیں۔

ایک حقیقت کا اظہار

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر پروردگار نے ارشاد فرمایا: موسیٰ! ڈرو نہیں، میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔نہایت دلنواز انداز میں تسلی دیتے ہوئے ایک بہت بڑی حقیقت کو واشگاف فرمایا کہ نبی اللہ تعالیٰ کا سب سے مقرب اور سب سے زیادہ معتمد ہوتا ہے۔دنیا اسے اذیت دیتی، ڈراتی دھمکاتی اور خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن وہ ہر بات کی شکایت اپنے اللہ سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے بھروسے پر دنیا کی مخالفتوں کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔اے موسیٰ تم میرے رسول ہو، اور میرے حضور میں تم ایسے ہو جیسے بچہ ماں کی آغوش میں ہوتا ہے۔میرے حضور میں تمہارے لئے عافیت اور پناہ ہے، کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں۔یہ تو اندیشوں سے بچنے کیلئے ماویٰ اور ملجا ہے۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًاۢ بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑪

(مگر وہ شخص جس نے کوئی زیادتی کی ہو، پھر اس نے برائی کے بعد اس کو بھلائی سے بدل دیا، تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ ۱۱)

عام اصول اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بشارت

میری بارگاہ پناہ اور عافیت کی جگہ ہے، ڈرنے کی جگہ نہیں۔ہاں اگر کوئی شخص برائی کا ارتکاب کرتا ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے یا کوئی زیادتی کرتا ہے یعنی کسی کا حق چھینتا ہے یا کسی پر زیادتی کرتا ہے تو اس کیلئے یقیناً اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کسی اور سے ڈرنے کا کوئی موقع نہیں۔وہی ایک ذات ہے جو اگر غفور و رحیم ہے تو اس کا عذاب بھی عذاب الیم ہے۔وہ جب پکڑنے پہ آتا ہے تو کوئی اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہو سکتا۔لیکن اگر کوئی شخص جس نے برائی کا ارتکاب کیا ہو وہ برائی سے توبہ کر لیتا اور نیکی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور حقوق العباد تلف کرنے والا لوگوں کے حق ادا کرنے والا بن جاتا اور ان پر مہربان اور شفیق ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر نہ کوئی بخشنے والا ہے اور نہ کوئی مہربان ہے۔

ممکن ہے اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے نادانستگی میں ایک قبطی کا قتل ہو گیا تھا جس میں اگرچہ آپ کے ارادے کو دخل نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک اور سلیم الفطرت بندے اپنے نفس کو الاؤنس دینے کی بجائے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اندیشے میں رہتے ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ قصور اگرچہ بلا ارادہ سرزد ہوا ہے لیکن سرزد تو ہوا ہے اس لئے آپ نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور یہ کہا رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ''اے پروردگار میں اپنے نفس پر ظلم کر گزرا ہوں، مجھے معاف فرما دے۔'' فَغَفَرَلَهٗ ''پس اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انہیں معاف فرما دیا۔'' (القصص: آیت ۱۶) یہاں اسی معافی کی بشارت دی گئی ہے۔

یعنی اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ آپؑ کو اپنے گناہ کے انجام سے اندیشہ ہو جو نادانستگی میں آپ سے سرزد ہو گیا تھا۔لیکن جب ہم اسے معاف کر چکے اور آپ اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے تو اب میرے پاس آپ کیلئے مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

Marfat.com

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾

(آپ اپناہاتھ اپنے گریبان میں ڈالئے، وہ بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا نکلے گا، (یہ دو معجزات) نو معجزات میں سے ہیں، فرعون اور اس کی قوم کی طرف جائیے، بیشک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں۔ ۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا جانے والا دوسرا معجزہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصائے موسیٰ کے ساتھ جو دوسرا معجزہ عطا کیا گیا یہ اس کا بیان ہے۔ آپؑ سے کہا گیا کہ آپ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالئے۔ چنانچہ جب باہر نکالا گیا تو وہ چمکتے ہوئے سورج کی مانند تھا۔ لیکن ساتھ ہی ہر طرح کا تردد ختم کرنے کیلئے فرمایا کہ اس ہاتھ کی سفیدی اور چمک کسی بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ معجزے کی وجہ سے ہوگی۔ ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تردد ختم کرنے کیلئے یہ بات کہی گئی ہو۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے اپنے عصا کو سانپ کی طرح رینگتا ہوا دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ ہاتھ کو چمکتا ہوا دیکھ کر بھی ممکن تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی اور خیال پیدا ہوتا، اس لئے پہلے سے اس کی وضاحت کر دی گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ مخالفین کی جانب سے کی جانے والی تاویلوں کا راستہ بند کرنا بھی مقصود ہو۔ کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے معجزات کا انکار کیا انہوں نے ہر معجزے کی کوئی نہ کوئی تاویل کی۔ ید بیضا کے بارے میں کہا گیا کہ یہ کوئی معجزہ نہ تھا بلکہ برص کی بیماری تھی جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ سفید ہو گیا تھا۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ تورات میں تحریف کرنے والوں نے یہ لکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں برص کے مانند سفیدی تھی۔ یعنی انہوں نے بھی اسے برص کی بیماری قرار دیا اور معجزے کو تسلیم کرنے سے پہلو تہی کی۔

اس آیتِ کریمہ سے ایک اور بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا کئے گئے تھے جن کی تفصیل سورۃ الاعراف میں جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے۔ (۱) عصائے موسیٰ (۲) ید بیضا (۳) جادوگروں کی شکست (۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط (۵) طوفان (۶) ٹڈی دل (۷) تمام غلے کے ذخیروں میں سرسریاں اور انسان وحیوان سب کے بالوں میں جوئیں (۸) مینڈکوں کا ہجوم (۹) خون۔ چنانچہ ابتداء میں صرف دو معجزات دے کر فرعون اور اس کی قوم کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو انذار کیلئے بھیجا گیا اور باقی معجزات کا ظہور آئندہ سالوں میں مختلف وقتوں میں ہوا۔ قرآنِ کریم میں دوسرے مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا تھا کہ آپؑ اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو دور کرا دیجئے تو پھر جو کچھ آپؑ کہیں گے ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی ہٹ دھرمی پر اڑ جاتا تھا۔

Marfat.com

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ باقی انبیائے کرام کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں اپنی قوم کے پاس انذار کیلئے بھیجا گیا لیکن معجزات کا ظہور اس وقت شروع ہوا جب تبلیغ ودعوت کو ایک مدت گزر گئی اور لوگوں نے ایمان لانے کی بجائے نشانیوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی تائید ونصرت کیلئے مختلف مواقع پر مختلف نشانیاں دکھائیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فریضۂ نبوت کی ادائیگی کیلئے بھیجنے سے پہلے دو بڑے معجزات سے مسلح کیا، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرعون بہت بڑی طاقت کا مالک، مطلق العنان فرمانروا، خدائی کا دعویدار، انتہائی متکبر اور منتقم المزاج آدمی تھا۔ اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلے سے قبطی کے قتل کا ایک دعویٰ قائم تھا۔ اس کے قصاص کیلئے آپؑ کو گرفتار کیا جانے والا تھا کہ آپؑ مصر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب آپؑ کی واپسی کی صورت میں اس کا غالب گمان تھا کہ وہ آپؑ کو دیکھتے ہی قصاص لینے کا حکم جاری نہ کر دے۔ اس لئے ضروری تھا کہ آپؑ کو ایسے اسلحہ سے مسلح کر کے بھیجا جاتا کہ فرعون آپؑ پر دست درازی سے پہلے سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک طرح کا دفاعی اسلحہ بھی تھا اور سندِ ماموریت بھی۔ ان کو دیکھ لینے کے بعد کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ آپؑ محض اپنی طرف سے نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف آپؑ کے دعوے کا انتساب بالکل غلط ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٣﴾

(پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں، انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ ۱۳)

مُبْصِرَةً کے معنی ہیں آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں۔

پیغمبروں کے معجزات آنکھیں کھول دینے والے ہوتے ہیں

دیگر انبیائے کرام کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب معجزات لے کر فرعون اور اپنی قوم کے پاس آئے تو ان کا معجزہ ہونا قوم سے مخفی نہیں رہا۔ اندھوں نے بھی جان لیا کہ ایسی نشانیاں دکھانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ان کی قاہری اور ان کے عدیم المثال ہونے نے سب کو اپنی حیثیت ماننے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جن لوگوں کو ایمان نہیں لانا تھا ان کی زبانیں تو گنگ ہو گئیں لیکن ایمان لانے کی بجائے انہوں نے ان نشانیوں کو کھلا ہوا جادو قرار دیا۔ حتیٰ کہ ملک بھر کے جادوگروں نے بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر آپ کی صداقت کا اعتراف کر لیا تب بھی انکار کرنے والے آپ کے معجزات کو جادوگری ہی قرار دیتے رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعصبات کے اسیر لوگ اور مفادات کی زنجیروں میں گرفتار عقل سے محروم تو ہوتے ہی ہیں، اپنے دل کی آواز سننے سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ مرض ہے جس میں قریش اور دیگر اہلِ مکہ مبتلا تھے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤﴾

(انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کے سبب سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے، پس دیکھ لیجئے کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ ۱۴)

Marfat.com

منکرین کے انکار کا اصل سبب

فرعون، آلِ فرعون اور دیگر اہلِ مصر کے سامنے ملک بھر کے جادوگروں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اور سب دیکھنے والوں کے سامنے ساحرانِ مصر نے اعلان کیا کہ یہ جادو نہیں، معجزے کی قاہری اور صداقت کی بالادستی ہے اور ہم اس سچائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اسی طرح پورے ملک پر قحط اور طوفان اور ٹڈی دَل کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سرسریوں کے کے بے شمار لشکروں کا امنڈ آنا کسی جادو کا کرشمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسے کھلے ہوئے معجزے تھے جن کے سامنے دل جھک گئے۔ لیکن مفادات کی دنیا نہ اجڑ سکی، غرور اور تکبر کا سر نہ جھک سکا۔ ان کے سرداروں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہمارے سر کٹ تو سکتے ہیں لیکن اس صداقت کے سامنے جھک نہیں سکتے جس صداقت کا اعلان ان زبانوں سے ہورہا ہے جو ہمارے غلاموں کی زبانیں ہیں اور جنہیں کسی طرح بھی ہم اپنی ہمسری کے لائق نہیں سمجھتے۔ قرآنِ کریم نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ''کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کے انکار کا اصل سبب حقیقت کا مخفی ہونا نہیں بلکہ لوگوں کا ظلم و استکبار ہے جو ان کی بصارت اور بصیرت دونوں کو چھین لیتا ہے۔

وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى
كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ
هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٧﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ
قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ
وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ
رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ

Marfat.com

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ
الصَّالِحِينَ ﴿١٩﴾ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ
مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿٢٠﴾ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي
بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ
بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ﴿٢٢﴾ إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ
وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا
يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ
فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٢٤﴾ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ
الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَ
مَا تُعْلِنُونَ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۩ ﴿٢٦﴾ قَالَ سَنَنْظُرُ
أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾ اذْهَبْ بِكِتَابِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ
ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾ قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ إِنِّي أُلْقِيَ
إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ ﴿٢٩﴾ إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ﴿٣٠﴾
أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ﴿٣١﴾

رکوع: ۲۔ (اور ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس اللہ کیلئے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۵) اور (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے اور فرمایا، اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی کا علم دیا گیا ہے اور ہمیں ہر قسم کی چیزیں

Marfat.com

عطا کی گئی ہیں، بیشک یہ نہایت ہی کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶) اور (حضرت) سلیمان کے جائزے کیلئے جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے ان کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور ان کی درجہ بندی کی جا رہی تھی۔ ۱۷) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ ۱۸) پس سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور دعا کی اے میرے رب! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس فضل کا شکر گزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما۔ ۱۹) (ایک اور روز) آپؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا، تو فرمانے لگے کہ کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں، یا وہ غیر حاضروں میں ہے۔ ۲۰) (اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ کوئی واضح عذر میرے سامنے پیش کرے۔ ۲۱) پس کچھ زیادہ دیر نہیں گزری (کہ وہ آ گیا) تو اس نے کہا کہ میرے علم میں وہ چیز ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے اور میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ ۲۲) میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم پر حکومت کرتی ہے اور اسے ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ ۲۳) میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کیلئے خوشنما بنا دیئے ہیں، پس اس نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے، اور وہ ہدایت قبول نہیں کرتے۔ ۲۴) (شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ ۲۵) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ ۲۶) حضرت سلیمان نے کہا ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تم نے سچ کہا یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ۲۷) میرا یہ خط لے کر جاؤ اور ان کے پاس ڈال دو اور ہٹ کر دیکھو کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۸) ملکۂ سبا نے کہا، اے اہلِ دربار! ایک گرامی نامہ میرے پاس ڈالا گیا ہے۔ ۲۹) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ۳۰) تم لوگ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔ ۳۱)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

(اور ہم نے داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس اللہ کیلئے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ ۱۵)

Marfat.com

انسانی زندگی میں شکر کے اثرات

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک مکلف مخلوق کی حیثیت سے زمین پر بھیجا۔ اسے شعور وخرد اور قوتِ امتیاز کی دولت سے بہرہ ور فرمایا، لیکن اس کی آزمائش کیلئے ابلیس اور اس کی ذرّیت کو بھی فریب ودجل کی صلاحیتوں سے مسلح فرما کر انسان کے ساتھ ہی زمین پر اتارا۔ البتہ انسانوں پر احسان یہ کیا کہ انہیں شعور وخرد کے ساتھ ساتھ وحیِ الٰہی کی رہنمائی سے بھی نوازا۔ بار بار پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں جن کی تعلیمات نے انسانوں کو ابلیسی قوتوں کی فریب کاریوں سے آگاہی بخشی اور ان کے مقابلہ کرنے کی تدبیر بتائی۔ اور جذبات وخواہشات میں ایک توازن پیدا کرنے اور مفادات کی ہوس کو قابو رکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ اور ان کے خیالات وعواطف اور ان کے افکار وعوامل کو صحیح نہج پر رکھنے کیلئے آخرت کا عقیدہ عطا فرمایا اور اس کی فکر پیدا فرمائی۔ اور بار بار یہ بات واضح کی کہ یہی وہ فکر ہے جو تمہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اور اسی کو نظر انداز کرنے کی صورت میں تم اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بننے کی بجائے ظلم اور کبر وغرور کا پیکر بن سکتے ہو۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات میں فرعون اور قومِ فرعون کی شکل میں ان لوگوں کی مثال بیان فرمائی جنہیں اللہ تعالیٰ نے دولت وحکومت سے نوازا۔ لیکن انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ترغیب وترہیب کے باوجود اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور اس کی بندگی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ظلم واستکبار کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ اپنے اقتدار اور وسائل سمیت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو گئے اور آج دنیا انہیں عبرت کے طور پر یاد رکھتی ہے۔ اب دوسری مثال حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی دی جا رہی ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرعون سے بڑھ کر عظمت وشوکت عطا فرمائی اور ایسی قوت و اقتدار سے نوازا جس کی ان کے ہمعصر حکمرانوں میں مثال نہیں ملتی۔ لیکن وہ بجائے ظلم اور استکبار کا شکار ہونے کے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتے چلے گئے۔ ان کو ایک لمحہ کیلئے یہ گھمنڈ پیدا نہیں ہوا کہ ان کی حکومت و دولت اور قوت وعظمت ان کے اپنے ذاتی کارنامے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عطا سمجھا اور ہمیشہ اسی پر اپنے رب کی حمد وثناء کرتے رہے۔ چنانچہ دونوں عظیم باپ بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے انہیں علم کی دولت سے بہرہ ور فرمایا۔ یعنی انہیں سائنس کا علم بھی عطا فرمایا جس سے کام لے کر انہوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی۔ زمین میں چھپے ہوئے قوت کے سرچشموں کو بے نقاب کیا، نئے نئے ایجادات وصنائع سے ملک کو مالا مال کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ حکمت ومعرفت عطا فرمائی جس نے انہیں کبھی بندگی کے راستے سے ہٹنے نہ دیا۔ ان پر یہ راز منکشف کیا گیا کہ حقیقت میں انسان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اور اس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی ان کو بخشے گئے ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی ہی مرضی کے مطابق استعمال کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ اسی علم کا ثمرہ ہے کہ وہ ایک عظیم مملکت کے سربراہ ہو کر بھی اللہ تعالیٰ ہی کا شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس کی دین ہے، ہماری کوئی ذاتی خصوصیت نہیں۔ اور بھی مومن بندے یہاں ایسے موجود تھے جنہیں خلافت عطا کی جا سکتی تھی لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت سے نوازا، تو یہ اس کا فضل واحسان ہے جس کی بجا آوری ہم پر لازم ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ
وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ⑯

(اور (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کے وارث ہوئے اور فرمایا، اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی کا علم دیا گیا ہے اور ہمیں ہر قسم کی چیزیں عطا کی گئی ہیں، بیشک یہ نہایت ہی کھلا ہوا فضل ہے۔ ۱۶)

Marfat.com

آیت میں وراثت کا مفہوم

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤ علیہ السلام کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو سلیم کا ہم معنی ہے۔۹۶۵ قبل مسیح میں حضرت داؤدعلیہ السلام کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ قبل مسیح تک تقریباً چالیس سال تک فرمانروار ہے۔ حضرت داؤدعلیہ السلام کی متعدد بیویاں تھی اور ہرایک ۔سے ان کی اولاد تھی ۔اس آیتِ کریمہ میں جس وراثت کا ذکر ہورہا ہے اگر اسے مال وجائیداد کی میراث سمجھا جائے اور کہا جائے کہ آپ کے سارے مال وجائیداد کے وارث حضرت سلیمان علیہ السلام بنے اور باقی تمام بیٹے اور بیٹیاں محروم کردی جائیں تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے نبی دنیا سے ظلم کوختم کرنے کیلئے آتے ہیں، رواج دینے کیلئے تو نہیں آتے ۔جن لوگوں نے اس آیتِ کریمہ سے مال ودولت کی وراثت پر استدلال کیا ہے وہ شاید حضرت داؤدعلیہ السلام کو ظالم ثابت کرنے کی فکر میں ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے اپنے پناہ میں رکھے۔اس لئے بے غبار بات یہ ہے کہ اس وراثت سے مراد مال و جائیداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدعلیہ السلام کی جانشینی ہے۔حضرت داؤدعلیہ السلام کی عظمت یہ ہے کہ آپ نے جناب طالوت کی جانشینی کو نئی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔متضاد اور منتشر قبیلوں کوایک منظم قوم کی شکل دی، ان کے اندر نظم وضبط پیدا کیا اور عسکری قوت کے ساتھ ساتھ دینی اور روحانی قوت کو ایسا فروغ دیا کہ ایک طرف حکومت مستحکم ہوتی گئی اور دوسری طرف نہایت قابلِ فخر انسانی معاشرہ وجود میں آیا۔یہ مختصری سلطنت ایک بہت بڑی سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔لوہے کی قوت کو دفاعی قوت میں تبدیل کیا اور بحرِ قلزم کے ساحل کے آس پاس لوہے کو ڈھالنے کی بڑی بڑی بھٹیاں قائم کیں جن میں دفاعی آلات بھی تیار ہوتے اور ملکی ضرورتوں کا دیگر سامان بھی تیار کیا جاتا۔آپ نے ملک کو دین کا قلعہ اور قوت کا ایسا سرچشمہ بنادیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسے آگے بڑھانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔آپؑ نے ایک طرف اگر بری فوج میں اضافہ کیا تو دوسری طرف بحری بیڑے کو اتنی ترقی دی کہ وہ دنیا کا سب سے طاقتور بحری بیڑہ شمار ہونے لگا۔اور اللہ تعالیٰ نے مزید ان پر کرم یہ فرمایا کہ انہیں پرندوں کی بولی کا خاص علم عطا کیا۔چنانچہ آپؑ نے ان کی تربیت کرکے انہیں فوج کا ایک حصہ بنادیا جن سے نامہ بری، خبررسانی اور سراغ رسانی کا کام نہایت اعلیٰ پیمانے پر لیا جاتا تھا۔اس طرح سے انہوں نے گویا اپنی ایک فضائی فوج بھی مرتب کرلی تھی۔بائیبل میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کا کوئی ذکر نہیں۔البتہ بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ کے صفحہ ۱۴۳۹ پر اس کی شہادت موجود ہے۔اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس وقت کی دنیا کا سب سے مضبوط حکمران بنایا اور آپؑ پر بَرّ و بحر کے خزانے کھول دیئے گئے، لیکن ان تمام احسانات، کروفر اور طاقت واقتدار کے باوجود ایک لمحے کیلئے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئے کہ یہ سب کچھ میرے دست وبازو اور میرے حُسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے، بلکہ آپؑ اپنی قوم کو یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم بھی عطا فرمایا ہے اور دیگر بے شمار اسباب ووسائل سے ہمیں ہمکنار کیا ہے۔تو یہ سب کچھ اس کا کھلا ہوا فضل وکرم ہے۔ہم تو اس در کے سائل ہیں۔دو عالم سے غنی صرف وہی ذات ہے، ہماری عظمت اس در کی فقیری میں ہے۔اور ہماری محرومی اس سے بے نیازی ہے۔

Marfat.com

مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ کا علم

مَنۡطِقَ الطَّيۡرِ سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کے اندر بھی نطق وادراک موجود ہے۔ ہم چونکہ اسے سمجھتے نہیں، اس لئے عام طور پر اس کا انکار کردیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات عام انسانوں کے تجربے میں آتی ہے کہ حیوانوں اور جانوروں میں بھی نفرت، محبت، عتاب، التفات، خوشی، غم، فکرمندی، طمانیت، استمالت، ملاعبت جیسے جذبات پائے جاتے ہیں اور وہ الگ الگ بولیوں سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اور اس اظہار کو جانور تو آپس میں سمجھتے ہی ہیں وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں جو جانوروں کی تربیت کرتے اور ان کی آوازوں اور اشارات سے آگاہی پیدا کرلیتے ہیں۔ اور جنہوں نے سائینٹفک طریقے سے ان حیوانات کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے ان کی معلومات تو نہایت حیران کن اور دنگ کردینے والی ہیں۔ چیونٹی اور شہد کی مکھی کے بارے میں کتابیں لکھی گئی ہیں، انہیں پڑھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی دانش وبینش اور فہم وفراست ودیعت فرمائی ہے۔ آج کتوں سے سراغ رسانی اور جاسوسی کے سلسلے میں جو کام لئے جارہے ہیں ان سے تو ایک دنیا واقف ہے اور کیسی حیرت کی بات ہے کہ کتے ان اسرار تک پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان نہیں پہنچ پاتے۔ ایک وقت تھا جب کبوتروں سے نامہ بری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس حال میں ہوتا تھا کہ کام لینے والے ان کی بولی نہیں سمجھتے تھے اور نہ اپنی بات انہیں سمجھا سکتے تھے۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اور اگر انسان ان کی بولیوں سے واقف ہوجاتا تو یقیناً ان کی صلاحیتوں سے ہزار چند کام لیا جاسکتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی بند خزانے کی کلید عطا فرمائی تھی۔ یقیناً آپؑ نے اس سے حیرت انگیز کام لئے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيۡمٰنَ جُنُوۡدُهٗ مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ وَالطَّيۡرِ فَهُمۡ يُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾

(اور (حضرت) سلیمان کے جائزے کیلئے جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے ان کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور ان کی درجہ بندی کی جارہی تھی۔ ۱۷)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوج

اس آیتِ کریمہ میں یہ دکھایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جن خصوصی عنایات سے نوازا تھا اور آپؑ پر ایسی نوازشات کی گئی تھیں جن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف انسانوں پر ہی حکومت عطا نہیں کی بلکہ آپؑ کو جنوں اور پرندوں پر بھی اقتدار عطا فرمایا۔ بائیبل میں اگرچہ اس کا کوئی ذکر نہیں لیکن تلمود اور ربیوں کی روایات میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جن بھی آپؑ کے لشکروں میں شامل تھے۔ اور آپؑ جنوں کے ساتھ ساتھ پرندوں سے بھی خدمت لیتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جن کیلئے پیغمبروں کے معجزوں کا ہضم کرنا مشکل ہے اور ان کے نزدیک سب سے بڑا پیمانہ عقل کا پیمانہ ہے اور جو چیز اس پیمانے میں نہیں سماتی وہ اس کا صاف انکار کردیتے ہیں۔ انہوں نے جن اور طیر کی عجیب وغریب تاویلیں کی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''جن'' سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسخر کرلیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت سے کام کرتے تھے۔ اور ''طیر'' سے مراد گھوڑ سواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل وحرکت کرتے تھے۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ کو جو شخص بھی غور سے پڑھے گا اگر اسے عربی زبان اور اس کی گرامر سے کچھ بھی مس ہو تو وہ کبھی اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔

Marfat.com

قرآنِ کریم نے جن، انس اور طیر تینوں پر الف لام جنس کا استعمال کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے مختلف الگ الگ اجناس کے لشکر ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن اور طیر انسانوں کی جنس میں سے نہیں، ورنہ جن اور طیر کے درمیان انس کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے اَلْجِنُّ وَالطَّیْرُ مِنَ الْاِنْسِ کہا جاتا۔ یعنی جن اور طیر انسانوں ہی میں سے ہیں یا انسان کی جنس میں سے۔ لیکن ان تینوں کو مستقل طور پر الف لام تعریف کے ساتھ ذکر کرنا اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ جن اور طیر انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہیں۔ اور اگر جن سے مراد پہاڑی قبائل لئے جائیں اور طیر سے مراد گھوڑ سوار دستے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ الگ الگ لشکر نہیں بلکہ انسانوں کی جنس میں سے دو لشکر ہیں جو اپنی بعض خصوصیات میں منفرد واقع ہوئے ہیں۔

یہ درست ہے کہ محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادت کام کی وجہ سے جن اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دیا جاتا ہے، لیکن اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ جن کا معنی طاقتور آدمی اور پرندے کا معنی تیز رفتار انسان ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ علامہ شبلی کو جب اطلاع ملی کہ حسرت موہانی نے اب کوئی سٹور کھول لیا ہے، تو انہوں نے انہیں خط لکھا کہ تم کبھی شاعری کرتے ہو، کبھی سیاسی مشاغل میں کھو جاتے ہو، کبھی جیل کاٹتے ہو اور کبھی جلوس نکالتے ہو اور اب تم نے ایک سٹور کھول لیا ہے، تم ایک آدمی ہو یا جن ہو۔ تو کیا اس کا ایک مطلب یہ سمجھ لیا جائے کہ حسرت موہانی انسان نہیں رہے، جن ہو گئے۔ ہم جب کسی حسین عورت کو دیکھتے ہیں تو اسے پری سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ حسین عورتیں پریاں ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محاورات میں عام طور پر بعض دفعہ الفاظ کو حقیقی کی بجائے مجازی معنی میں لیا جاتا ہے۔ اور اہلِ لغت و فصاحت کے یہاں یہ بات مُسَلَّم ہے کہ کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی میں صرف اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ ورنہ حقیقی معنی کو چھوڑنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں آخر ایسا کون سا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

(یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا، اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ ۱۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجیں جس میں انسانوں، جنوں اور پرندوں کے لشکر شامل تھے جب مارچ کرتی ہوئی چیونٹیوں کی وادیوں میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے اپنے ہم جنسوں کیلئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا، اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کی فوجیں تمہیں روند ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو کہ ہم نے کیا کر ڈالا۔

Marfat.com

وادیِ نمل کی وضاحت

اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسرین نے تاویل کے خراد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملة کے معنی ایک چیونٹی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت سلیمان علیہ السلام وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اسے قبیلۂ نمل کے لوگو......" لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض وادی النمل کو اس وادی کا نام مان لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔ اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کلب، اسد وغیرہ، لیکن کوئی عرب قبیلۂ کلب کے کسی فرد کے متعلق قَالَ كَلْبٌ (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلۂ اسد کے کسی شخص کے متعلق قَالَ اَسَدٌ (ایک شیر نے کہا) ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لئے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قَالَتْ نَمْلَةٌ قطعاً عربی محاورہ واستعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ "اے نملیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو" بالکل بے معنی ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کچلا کرتا۔ اگر وہ ان پر حملے کی نیت سے آیا ہو تو ان کا اپنے گھروں میں گھس جانا لاحاصل ہے۔ حملہ آور ان کے گھروں میں گھس کر انہیں اور زیادہ اچھی طرح کچلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہوا گزر رہا ہو تو اس کیلئے بس راستہ صاف چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں آ کر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کچل ڈالیں۔ لہٰذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو، بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو تاکہ سلیمان کے لشکر تمہیں تباہ نہ کردیں۔" اور حملے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو، راستہ سے ہٹ جاؤ تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمان علیہ السلام کے لشکروں کی جھپیٹ میں نہ آجائے۔"

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمونِ عبارت کے اعتبار سے ہے۔ رہی یہ بات کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کیلئے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے انہوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں کہ واد بارض الشام کثیر النمل "وہ ایک وادی ہے سرزمینِ شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں۔" لیکن تاریخ وجغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اس وادی میں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ بھی رہتا تھا۔ یہ صرف ایک من گھڑت ہے جو اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کیلئے وضع کرلی گئی ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے، مگر اس کا آخری حصہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب ایک وادی سے گزر

Marfat.com

رہے تھے جس میں چیونٹیاں بہت تھیں تو انہوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسرے چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ ''اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ ورنہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں گے۔'' اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبر کا اظہار کیا اور جواب میں اس چیونٹی نے ان سے کہا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے، ایک حقیر بوند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام شرمندہ ہو گئے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۴۰)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کس طرح بنی اسرائیل کی غلط روایات کی تصحیح کرتا ہے اور ان گندگیوں کو صاف کرتا ہے جو انہوں نے خود اپنے پیغمبروں کی سیرتوں پر ڈال دی تھیں۔ ان روایات کے متعلق مغربی مستشرقین بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے سب کچھ ان سے سرقہ کر لیا ہے۔

عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گھس جانے کیلئے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی بات کیسے سن لی تو جس شخص کے حواس کلام وحی جیسی لطیف چیز کا ادراک کر سکتے ہوں، اس کیلئے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (Crude) چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

(پس سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور دعا کی اے میرے رب! مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس فضل کا شکر گزار رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور میں ایسے نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما۔ ۱۹)

تَبَسَّمَ کا مفہوم

تَبَسَّمَ کا لفظ بعض دفعہ استخفاف اور تحقیر کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ضَاحِكًا کے اضافے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں تبسم خوشی اور سرور کی نوعیت کا ہے، کیونکہ ضحک عموماً خوشی اور سرور کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ وزع کے اصل معنی روکنے، تھامنے اور سنبھالنے کے ہیں۔

واقعہ کی اصل روح اور مرکزی مضمون

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ایک چیونٹی کی آواز سنی جو چیونٹیوں کی وادی میں رہنے والی دوسری چیونٹیوں کو اطلاع دے رہی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر آ رہا ہے، تم جلدی سے اپنے بلوں میں گھس جاؤ تاکہ وہ بے خیالی میں تمہیں پامال نہ کر دیں۔ تو آپ نے اس کی آواز سن کر اور سمجھ کر تبسم فرمایا۔ کیونکہ انسانوں کیلئے دور، تو کیا قریب سے بھی کسی چیونٹی کی آواز سننا بعید از عادت ہے۔ اور پھر اس آواز کو سمجھ لینا، انسانی فہم سے ماوراء ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو چونکہ منطق الطیر کا علم عطا فرمایا تھا اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کی عطا کردہ اس غیر معمولی صفت کی بنا پر اس چیونٹی کی آواز سنی اور سمجھی۔ تو بجائے اس کے کہ آپ اپنی ان غیر معمولی صلاحیتوں پر اتراتے اور فخر کرتے آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کیلئے ہاتھ پھیلا دیئے اور یہ عرض کی کہ پروردگار، تو نے جس طرح مجھ پر غیر معمولی انعامات کئے اور حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا ہے اس سے اندیشہ ہوسکتا ہے کہ میں کبرِ نفس میں مبتلا نہ ہوجاؤں۔ اس لئے میں آپ ہی سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے فضل وکرم سے مجھے اپنے قابو میں رکھیں کہ میں اپنے اقتدار اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث غرورِ نفس میں مبتلا نہ ہوجاؤں۔ اور مجھے اس بات پر بھی اطمینان نہیں کہ میں غرورِ نفس سے بچنے کیلئے اپنے آپ پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ اس لئے کہ نفسِ امارہ ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے۔ اس سے وہی بچ سکتا ہے جس پر آپ رحم فرمائیں۔ اس لئے مجھے توفیق دیں کہ میں ہمیشہ آپ کی عطا کردہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہوں جن سے آپ نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے۔ اور شکر کی احسن صورت یہ ہے کہ آپ مجھے توفیق عطا فرمایئے کہ میں زندگی میں ایسے نیک اعمال کروں جن سے آپ راضی ہوں اور جو آپ کو پسند آئیں۔ اور پھر اپنی رضا سے نوازتے ہوئے مجھے زمرۂ صالحین میں داخل فرمائیں۔ یعنی میرا انجام اور میرا حشر ان صالح بندوں کے ساتھ ہو جنہیں جنت کی عزت ملنے والی ہے اور اس انعام کیلئے میرے اعمال کافی نہیں، آپ کی رضا اور جنت صرف اسے ملتی ہے جس پر آپ کی رحمت کا سایہ ہو۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے لن یدخل احدکم الجنة عمله ''تم میں سے کسی کو بھی محض اس کا عمل جنت میں نہیں پہنچادے گا۔'' عرض کیا گیا ولاانت یارسول الله ''کیا حضور کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔'' آپ نے فرمایا ولاانا الاان یتغمد نی الله تعالی برحمته ''ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہیں ہوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نہ ڈھانک دیں۔''

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْلَا اذْبَحَنَّهٗٓ اَوْلَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾

(ایک اور روز) آپ نے پرندوں کا جائزہ لیا، تو فرمانے لگے کہ کیا بات ہے، میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں، یا وہ غیر حاضروں میں ہے۔ ۲۰) (اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ کوئی واضح عذر میرے سامنے پیش کرے۔ ۲۱)

جانوروں سے پیغام رسانی کی خدمت

ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات اور پرندے بھی تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہوش مندی اور خبر گیری کا عالم یہ تھا کہ آپ ہر طرح کے لشکر اور اس کے سپاہیوں پر کڑی نظر رکھتے اور نگرانی کرتے تھے۔ اور نظم وضبط اتنا سخت تھا کہ کسی کو غیر حاضر ہونے کی مجال نہ تھی۔ آپ نے درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے جب پرندوں کے دستے کا جائزہ لیا تو آپ کو ہدہد نظر نہیں آیا۔ تو آپ نے اس دستے کے ذمہ داروں سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا، کیا وہ غیر حاضر تو نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، وہ غیر حاضر تھا، لیکن کسی کو اطلاع نہ تھی۔ آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ اگر وہ اپنی بلا اجازت غیر حاضری پر کوئی معقول عذر پیش نہ کرسکا تو میں اسے سخت ترین سزا دوں گا۔ اور ہوسکتا ہے کہ میں اسے ذبح کر ڈالوں، کیونکہ اس نے فوج میں

Marfat.com

ایک غلط رسم کی طرح ڈالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد ان جانوروں میں سے تھا جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے باقاعدہ پیغام رسانی، سراغ رسانی اور دریافتِ احوال کی تربیت دے رکھی تھی۔ اور نہایت اعلیٰ پیمانے پر ان سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ اور آپ چونکہ پرندوں کی بولی سمجھتے تھے اس لئے آپ سائنسدانوں سے بھی بڑھ کر ان سے کام لینے پر قادر تھے۔

جس طرح قدیم زمانے سے کبوتر ہمیشہ نامہ بری اور سراغ رسانی کیلئے استعمال ہوتے رہے ہیں، اسی طرح فلسطین کے علاقے میں ہدہد کی کثرت تھی اور یہ پرندہ بھی اس مقصد کیلئے کبوتر ہی کی طرح استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور کبوتر ہی کی طرح یہ اپنے اندر ایسے کاموں کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

موجودہ زمانے کے بعض لوگ جنہیں معمول سے ہٹی ہوئی ہر بات میں شک کرنے کی عادت ہے اور ایسی بات کا بیان چاہے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کیوں نہ ہو، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی کوئی ایسی تاویل کی جائے جو آج کے دور کے مطابق اور ان کے اپنے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ چنانچہ جس طرح ان لوگوں نے سابقہ آیت کی تفسیر میں وادی النمل اور نملۃ کے بارے میں تحقیق کے نام سے عجیب وغریب انکشافات کئے، اسی طرح ہدہد کے حوالے سے جو کچھ قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے وہ ان کی عقلِ رسا کیلئے قبول کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ انہیں اصرار ہے کہ یہاں ہدہد سے مراد کوئی پرندہ نہیں بلکہ کوئی انسان ہے جسے ملکۂ سبا کے پاس بھیجا گیا اور اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اور دلیل یہ ہے کہ ہدہد کے حوالے سے جو باتیں قرآنِ کریم نے بیان کی ہیں انہیں ایک انسان ہی بیان کرسکتا ہے، کسی پرندے کے بس کی بات نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ہم لوگ پرندوں کی بولی اور ان کے احساسات اور صلاحیتوں سے بالکل ناواقف ہیں اس لئے ایسی کوئی بات حتمی انداز میں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہ کام کرسکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہاں تو صرف دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہدہد کوئی پرندہ نہیں بلکہ کوئی انسان ہے جس کی حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوج میں ایک نمایاں حیثیت تھی تو آخر قرآنِ کریم کو ایسی کیا مشکل پیش آئی ہے کہ وہ صاف سیدھی زبان میں اس طرح اس واقعہ کو بیان کرتا کہ جس سے یہ شبہ بھی پیدا نہ ہوتا کہ یہ کسی پرندے کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن جس طرح قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، کوئی ایسا شخص جو معجزات کے بارے میں تحفظات نہیں رکھتا اور اس کی آنکھوں پر مخصوص رنگوں کی عینک نہیں، وہ ان آیات کو پڑھے تو اسے دور دور تک بھی اس کا امکان دکھائی نہیں دے گا، جو کچھ ہمارے یہ نام نہاد مفسرین تاویل کے انداز میں کہتے ہیں۔ اس لئے ہم ان کی تحقیقِ لطیف پر کچھ کہنے کی بجائے قرآن کے ہر قاری کی ذہانت پر اس بات کا فیصلہ چھوڑتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے کیا مفہوم ہوتا ہے۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۢ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾
اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا
وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ
عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾

Marfat.com

(پس کچھ زیادہ دیر نہیں گزری (کہ وہ آ گیا) تو اس نے کہا کہ میرے علم میں وہ چیز ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے اور میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ ۲۲) میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم پر حکومت کرتی ہے اور اسے ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے۔ ۲۳) میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو پوجتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کیلئے خوشنما بنا دیئے ہیں، پس اس نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے، اور وہ ہدایت قبول نہیں کرتے۔ ۲۴)

ہدہد کی رپورٹ

پس زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہدہد آ گیا۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔ اور یہ کہا کہ ملک سبا سے ایک ایسی اطلاع لے کر آیا ہوں جس کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور میں نے ایسی معلومات جمع کی ہیں جن کی تفصیل سے آپ بھی واقف نہیں۔ آپ ایک ہوش منداور باخبر حکمران ہیں، یقیناً اس ملک اور اس کی حکومت سے آپ ناواقف نہیں ہوں گے لیکن اس کی تفصیلی اطلاعات کبھی آپ تک نہیں پہنچیں۔ چنانچہ میں نے یہی خدمت انجام دی ہے اور میں اس کی تفصیلات سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سبا ایک شہر کا نام بھی ہے اور اس میں بسنے والی قوم بھی اسی نام سے معروف تھی۔ یہ قوم جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مارب موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعا سے ۵۵ میل بجانب شمال واقع تھا۔ ایک ہزار سال تک یہ قوم عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ عرب میں یمن اور حضرموت اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ یونانی مورخین اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظامِ آبپاشی قائم کر رکھا تھا۔

علامہ قزوینی نے آثار البلاد میں سبا کو ایک شہر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شہر سبا ابن یشجب بن قحطان نے آباد کیا تھا۔ یہ شہر دفاعی لحاظ سے بہت مستحکم اور گنجان آباد تھا۔ اس کی ہوا بڑی پاکیزہ اور پانی بہت میٹھا تھا۔ اردگرد پہاڑوں کا سلسلہ تھا، بارش ہوتی تو پانی بہہ کر ریگستان میں ضائع ہو جاتا۔ ملکہ بلقیس کے عہدِ حکومت میں دو پہاڑوں کے درمیان ایک زبردست بند تعمیر کیا گیا اور پانی کے اس طرح کے ذخائر اس ملک کی زرعی ترقی کا بہت بڑا سبب تھے۔

ہدہد نے اپنی تازہ معلومات اور چشم دید حالات پر مشتمل جو رپورٹ پیش کی اس کے اہم نکات یہ تھے کہ:

۱۔ میں نے وہاں ایک عورت کو حکمرانی کرتے ہوئے دیکھا اور اندازِ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی حکمرانی اس کی نظر میں ایک تعجب انگیز امر تھی۔

۲۔ اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کا عالم یہ ہے کہ قدرت نے ان کو ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ ملک کی رفاہیت کیلئے جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب ان کو میسر ہیں۔

۳۔ ان کی حکمران عورت ملکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ اس کا ایک بہت عالی شان تخت ہے جس پر وہ دربار میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس تخت کا طول ۸۰ ہاتھ، عرض ۴۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ تھی۔ اس زمانے میں بادشاہوں کی عظمت چونکہ تختوں کی وسعت سے پہچانی جاتی تھی اس لئے ہدہد نے اس کے تخت کو عرشِ عظیم قرار دیا۔

Marfat.com

۴۔ ملک کی مذہبی اور اخلاقی حالت کا حال یہ ہے کہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ سب آفتاب پرست ہیں۔ توحید اور خدا پرستی سے ناواقف، قیامت کے تصور سے نابلد، طلبِ دنیا میں منہمک اور مادہ پرستی سے جنم لینے والے اعمال و اخلاق انہیں ایسے عزیز ہیں کہ شیطان نے ان کی نگاہوں میں انہیں مزین کر کے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہمہ تن ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان کی اسی روش نے ان کو صراطِ مستقیم سے دور کر رکھا ہے اور توحید اور خدا پرستی کی راہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو کے رہ گئی ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَاتُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۶﴾ السجدة

(شیطان نے ان کو صحیح راہ سے روک دیا ہے) کہ وہ اللہ کو سجدہ نہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ ۲۵) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ ۲۶)

یہ تضمین ہے

علامہ قرطبی اور بعض دیگر کبار مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ہدہد کا کلام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو بطور تضمین اس کے ساتھ شامل ہے۔ اس میں خطاب مشرکینِ مکہ سے ہے کیونکہ یہ قصہ سنانے کا حقیقی مقصد یہی حقیقت ان کے سامنے واضح کرنا ہے۔

ہدہد کا کلام گزشتہ آیت پر ختم ہو گیا۔ اس نے جب یہ کہا کہ میں نے قومِ سبا کو دیکھا ہے، وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں، یعنی ان کے تمام اعمال کی بنیاد شرک کا عقیدہ ہے، اور باقی ان کی تمام خرابیاں اسی سے پھوٹی ہیں۔ اور ان کے انتہائی لغو اور غلط اعمال کو شیطان نے ان کے سامنے اس طرح مزین کر دیا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے روک دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد پروردگار نے کلام کو حسبِ حال بنانے اور بات کو مکمل کرنے کیلئے فرمایا کہ یہ بصیرت سے محرومی اس حد تک راسخ ہو گئی ہے کہ وہ اس خدا کی بندگی کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں جو ہر آن ان چیزوں کو ظہور میں لا رہا ہے جو پیدائش سے پہلے نہ معلوم کہاں کہاں پوشیدہ تھیں۔ اور وہ زمین و آسمان کے تمام مخفی اسرار کو بے نقاب کر رہا ہے اور تمہاری ان تمام باتوں سے واقف ہے جنہیں تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر اپنی بے بصیرتی سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے اندازہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ بننے کے لائق نہیں۔ وہی ان تمام چیزوں کا خالق و مالک اور اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ دنیا شہنشاہوں کے تخت دیکھ کر ان کی عظمتوں کے فریب میں مبتلا ہو جاتی ہے جبکہ حقیقت میں عرشِ عظیم کا مالک وہی اللہ ہے جو ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔

فقہائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس مقام پر سجدہ واجب ہے۔ اسے سجدۂ تلاوت کہا جاتا ہے۔ یہاں سجدہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایک مومن اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر ثابت کر دے کہ میں ان آفتاب پرستوں سے بیزار ہوں جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں کیا گیا ہے۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور آستانے پر جھکنے اور کسی اور عظمت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔

Marfat.com

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِىْ هٰذَا
فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

(حضرت سلیمان نے کہا ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تم نے سچ کہا یا تم جھوٹوں میں سے ہو۔ ۲۷) میرا یہ خط لے کر جاؤ اور ان کے پاس ڈال دو اور ہٹ کر دیکھو کہ وہ کیا ردِّعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۸)

ہدہد کی عذر خواہی کا جواب

ہدہد کی باتیں سننے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جو اپنی غیر حاضری کا عذر پیش کر رہے ہو، ہم ابھی اس کی سچائی معلوم کئے لیتے ہیں، اندازہ ہو جائے گا کہ تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ کہہ رہے ہو۔ آپؑ نے ملکۂ سبا کے نام ایک نامۂ گرامی لکھوایا اور ہدہد کو حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور جن راہوں سے تم وہاں حالات معلوم کر کے آئے ہو، انہیں راہوں پر پرواز کرتے ہوئے وہاں پہنچو، اور جا کے یہ میرا خط ان کے سامنے ڈال دو۔ ڈال دینے کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کسی انسان کو نہیں، پرندے کو نامہ بر بنا کے بھیج رہے ہیں۔ کسی انسان کو یہ حکم نہیں دیا جا سکتا کہ تم وقت کے سب سے بڑے حکمران کا گرامی نامہ ایک معزز ملکہ کے سامنے ڈال دینا، بلکہ اس کیلئے بہت سے سفارتی آداب ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے حکمران کا مکتوب گرامی دوسری کسی حکومت کے سربراہ کے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حکم بھی فرمایا کہ میرا خط ان کے سامنے ڈالنے کے بعد پرے ہٹ کر بیٹھ جانا اور دیکھتے رہنا کہ وہ اس خط کو دیکھ کر کیا ردِّعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکے گا کہ تم نے جو کہانی بیان کی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہدہد کو اپنا مکتوب دے کے ملکہ بلقیس کے پاس بھیجنا دلالت کرتا ہے کہ آپؑ پہلے سے ملک سبا اور اس کی ملکہ کے حوالے سے نہ صرف معلومات رکھتے تھے بلکہ ان کا معاملہ آپؑ کے زیرِ غور بھی تھا۔ کیونکہ تمام مؤرخین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فلسطین اور شام کے اڑوس پڑوس کی حکومتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کی باج گزار بن چکی تھیں۔ بعض علاقے آپؑ نے اپنی حکومت میں شامل کر لئے تھے اور بعض علاقوں کی حاکمیت ان کے حکمرانوں کے پاس اس لئے باقی چھوڑی گئی تھی کہ وہ آپ کی حکومت کے اطاعت گزار اور خراج دینے والے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ یمن کے ایک علاقے کی نہایت ترقی یافتہ اور دولت مند سلطنت کے بارے میں آپ بالکل بے خبر ہوں اور اگر باخبر بھی ہوں تو اس کے بارے میں کبھی آپ نے غور و فکر نہ کیا ہو۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

(ملکۂ سبا نے کہا، اے اہلِ دربار! ایک گرامی نامہ میرے پاس ڈالا گیا ہے۔ ۲۹) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ۳۰) تم لوگ میرے مقابل میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔ ۳۱)

Marfat.com

مکتوبِ گرامی سے متعلق چند اہم امور

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوبِ گرامی کو کس طرح ملکۂ سبا کے دربار تک پہنچایا، کہا جاتا ہے کہ ملکہ عمائدینِ سلطنت کے ساتھ دربار میں تشریف فرما تھی کہ ہدہد نے ان کے سر پر پہنچ کر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ ملکہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو ہدہد نے وہ مکتوب ملکہ کے سامنے ڈال دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملکہ محوِ استراحت تھی کہ ہدہد نے نہایت خاموشی سے خط اس کے اوپر رکھ دیا۔ خط کے پہنچنے کی کیفیت کچھ بھی ہو، قرآنِ کریم کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ کے اہلِ دربار میں سے کسی نے بھی اچانک اس طرح خط کے ڈالے جانے پر تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ ملکہ نے بھی اسے معمول کی بات سمجھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جانوروں کے ذریعے نامہ بری اور خطوط کا آنا ایک معمول کی بات تھی۔ اس دور کے بادشاہوں کے پاس تیز رفتار پیغام رسانی کا یہی ایک محفوظ ذریعہ تھا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملکہ نے اس خط کا ذکر کرتے ہوئے اسے کتابِ کریم، یعنی معزز خط کے نام کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ ملکہ اور اس کے درباریوں کے دلوں میں پہلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عزت وعظمت موجود تھی۔ وہ اجمالی حد تک سہی، لیکن فی الجملہ آپؑ کے نام اور آپؑ کے کارناموں سے باخبر تھی۔

تیسری بات اس خط کے سلسلے میں جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں سلاطین وامراء کے خطوط وفرامین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ خط کے آغاز میں مرسل اور مرسل الیہ کا نام لکھا جاتا تھا۔ اور آج بھی ہمارے علماء اور بزرگانِ دین کا یہی طریقہ ہے، لیکن اس خط میں مرسل یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام تو موجود ہے، مرسل الیہ کا نام موجود نہیں۔ اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید یہ پورا خط نہ ہو بلکہ ملکہ نے اس کا خلاصہ اپنے اہلِ دربار کے سامنے پیش کیا ہو۔ لیکن اسے حتمی بات نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک ملکہ کے نام خط لکھ رہے تھے آپؑ کی شرم وحیاء کا تقاضا یہی تھا کہ آپؑ بجائے اس کا نام لکھنے اور انفرادی طور پر اسے خطاب کرنے کے پوری قوم کو خطاب کریں، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ آپؑ صرف ایک بادشاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خط میں مختصر ہونے کے باوجود دعوتی رنگ پوری طرح جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لئے آپؑ نے اپنے نام کے فوراً بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت سے میری جو بھی اہمیت ہے وہ اپنی جگہ ہے، لیکن اصل میری شناخت یہ ہے کہ میں اس اللہ کا پیغمبر اور بندہ ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اور اس اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ میں تمہیں اس کے عذاب سے بچانے کیلئے اسلام کی دعوت دوں۔

یہ خط بے حد مختصر ہے، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں قدیم زمانے کے حکمران مختصر خط لکھنا ہی پسند کرتے تھے، لمبی بات کہنا اور بات کو پھیلانا آدابِ حکومت کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود آنحضرت ﷺ کے مکتوباتِ گرامی اعجاز اور ایجاز کے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط میں خیر الکلام ماقل ودل کا حُسن پایا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مکتوبِ گرامی سے بھی یہی حُسن مترشح ہوتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کر کے ایک تو یہ تاثر دیا ہے کہ اس کائنات کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، اسی کو حکمرانی زیب دیتی ہے، دوسرے حکمرانوں کو وہ اپنی حکمرانی کا ذریعہ بنا کر ان کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ کہاں تک اس امانت کا حق ادا کرتے ہیں، چونکہ وہ رحمٰن ورحیم ہے اس لئے گرفت اور سزا میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اپنے ایک جملے کے خط میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ زمین پر فساد کا صرف ایک سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کو غیر اللہ کی حکومت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس فساد کو صلاح سے بدلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ زمین پر بسنے والے سب انسانوں کو آزادیِ رائے کا حق ملے، وہ ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ اور اپنے تعلق اور اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کی زمین پر اس کی حاکمیت کے بارے میں غور وفکر کریں اور جن نام نہاد حکمرانوں نے انہیں اپنی بندگی کی گرفت میں لے رکھا ہے اس طلسم کو توڑ دیا جائے تاکہ وہ آزادی اور آسانی سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قبول کر کے اس کے سایۂ عدل میں داخل ہو جائیں۔ تمہارے لئے بھی یہی راستہ ہے تمہیں اسلام لانے پر مجبور تو نہیں کیا جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی زمین پر خدا کے قانون کے نفاذ کی بجائے تم نے اپنا قانون نافذ کر رکھا ہے، اسی قانون کی بالادستی خدا سے بغاوت اور فساد فی الارض ہے۔ اس لئے تم اپنی حاکمیت کو چھوڑ کر اس زمین کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کیلئے واگزار کردو، اور میرے پاس مطیع وفرمانبردار بن کر حاضر ہو جاؤ۔ یعنی اپنی سیاسی خود مختاری سے دستبردار ہو کر اسلامی نظام کی ماتحتی قبول کرلو۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ فِىْ
اَمْرِىْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ
اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾ قَالَتْ اِنَّ
الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ
يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ ۢ بِمَ يَرْجِعُ
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ
خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ
فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ
صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِىْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِىْ
مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ
مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّىْ عَلَيْهِ لَقَوِىٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِىْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ
اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۗ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ

Marfat.com

قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۖ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ
فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ﴿۴۰﴾ قَالَ نَكِّرُوْا
لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾
فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِیْنَا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَ صَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ﴿۴۳﴾ قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ
لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ ؕ قَالَتْ
رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾

رکوع: ۳۔ (ملکہ نے کہا اے سردارانِ قوم میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو، میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو۔ ۳۲) اہلِ دربار نے جواب دیا کہ ہم طاقتور اور لڑنے والے لوگ ہیں، اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ غور کرلیں کہ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۳) ملکہ نے کہا اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کردیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل کردیتے ہیں، اور یہی کچھ یہ لوگ بھی کریں گے۔ ۳۴) میں ان کے پاس اپنے سفیر ہدیئے کے ساتھ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے سفیر کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔ ۳۵) جب قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا، کیا تم لوگ میری مال سے مدد کرنا چاہتے ہو، مجھے اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے بلکہ تم ہی ہو کہ اپنے ہدیوں پر خوش ہوتے ہو۔ ۳۶) واپس جاؤ اپنے بھیجنے والوں کی طرف، ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان میں تاب نہیں، اور ہم انہیں وہاں سے ذلیل کر کے نکالیں گے اور وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ ۳۷) حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے، قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں۔ ۳۸) جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے کہا کہ میں اس کو آپ کے پاس آپ کی اس مجلس سے اٹھنے

Marfat.com

سے پہلے پہلے حاضر کردوں گا اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا اور ایک امانتدار ہوں۔ ۳۹) جس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں، پس جب اس نے وہ تحت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں، اور جو شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نفع کیلئے شکر کرتا ہے، اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔ ۴۰) حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کے تخت کی شکل بدل دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔ ۴۱) ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے سوال کیا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا یہ تو گویا وہی ہے، ہم کو اس سے پہلے ہی علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔ ۴۲) اور اسے روک رکھا تھا ایمان لانے سے ان چیزوں نے جن کو اللہ کے ماسوا وہ پوجتی رہی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔ ۴۳) ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ، پس جب اس نے اسے دیکھا اس کو گہرا پانی گمان کیا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں، حضرت سلیمان نے کہا یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے، ملکہ پکار اٹھی، اے میرے رب! میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی ہوں، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالہ کیا۔ ۴۴)

قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

(ملکہ نے کہا اے سردارانِ قوم میرے اس معاملے میں مجھے رائے دو، میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو۔ ۳۲)

حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ شھود سے بھی ہوسکتا ہے اور شہادت سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا جب تک تم موجود نہ ہو۔ اور دوسری صورت میں جب تک تم گواہی نہ دو۔

ملکہ کی اہلِ دربار سے مشاورت

ملکہ نے اپنے درباریوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط سنایا۔ اور ہوسکتا ہے اس کے مضمرات سے بھی آگاہ کیا ہو۔ اس کے بعد ان سے مشورہ طلب کیا۔ اور اہلِ دربار کی اہمیت یا معاملے کی نزاکت کو واضح کرنے اور یا اہلِ دربار کی دلجوئی و استمالت کیلئے کہا کہ میں کوئی بھی اہم فیصلہ تمہاری موجودگی یا تمہاری شہادت کے بغیر کبھی نہیں کرتی۔ یہ معاملہ چونکہ بہت اہم ہے اس لئے تم غور و فکر سے اس بارے میں مجھے رائے دو۔ ملکہ کا اپنے اہلِ دربار سے مشاورت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو ملکہ کی طبیعت میں اپنی مطلق العنان فرمانروائی کا وہ غرور و پندار نہ تھا جو عام طور پر خودسر حکمرانوں میں ہوتا ہے اور ہمیشہ ان کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اور یا شاید حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ملکہ کی معلومات نے اسے باور کرا دیا تھا کہ ان سے لڑنا تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ یہ ممکن نہیں کہ محض ان کے خط لکھ دینے سے ہم اپنی آزادی اور حکمرانی سے دستبردار ہو جائیں اور ملک کا نظام ان کے حوالے کر دیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ غور و فکر کے بعد کوئی راستہ نکالا جائے۔ لیکن کسی بھی طاقتور حکومت کیلئے لڑائی سے پہلو تہی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ چاہے اس لڑائی کیخلاف کیسے ہی معقول دلائل کیوں نہ ہوں۔ اس لئے ملکہ یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے ملک کو لڑائی کی تباہ کاریوں سے بچاؤں، لیکن بچنے کا ایسا راستہ تلاش کروں جو آبرومندانہ ہو۔ اور پھر اس کی ذمہ داری صرف مجھ پر نہ ہو بلکہ تمام عمائدینِ سلطنت اس ذمہ داری میں شریک ہوں۔

Marfat.com

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

(اہلِ دربار نے جواب دیا کہ ہم طاقتور اور لڑنے والے لوگ ہیں، اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ غور کرلیں کہ کیا حکم دیتی ہیں۔ ۳۳)

اہلِ دربار کا جواب

اہلِ دربار نے جواب میں کہا کہ جنگ کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک وسائلِ جنگ اور افرادی قوت کی اور دوسری جنگی مہارت اور جرأت و بسالت کی۔ یہ دونوں ضرورتیں ہمارے پاس پوری طرح موجود ہیں۔ لوگ ہماری جنگی مہارت اور شجاعت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور ہمارے وسائل کی فراوانی بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم جان پر کھیل کر لڑیں گے۔ لیکن جہاں تک فیصلے کا تعلق ہے اس کا اختیار آپ کو ہے۔ آپ غور وفکر کرلیجئے اور اس کے بعد ہمیں حکم دیجئے، ہم اطاعت میں کمزوری نہیں دکھائیں گے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾

(ملکہ نے کہا اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسے برباد کردیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل کردیتے ہیں، اور یہی کچھ یہ لوگ بھی کریں گے۔ ۳۴)

ملکہ کی رائے

ملکہ نے محسوس کیا کہ اس کے اہلِ دربار کا رجحان جنگ کی طرف ہے اور ملکہ جنگ سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوت وصولت اور ان کی دانش وحکمت سے متعلق بہت کچھ سن چکی تھی۔ چنانچہ اس نے جنگ کے عواقب ونتائج سے اہلِ دربار کو آگاہ کرتے ہوئے کہا جنگ کسی ملک کی آبادی وترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ بادشاہ جب کسی ملک میں گھس جاتے ہیں تو اس کے وسائل پر قابض ہوجاتے ہیں اور اپنے مفتوحین کے بارے میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اس حد تک تہی دامن کردیا جائے کہ وہ ضروریاتِ زندگی کے سوا کچھ اور سوچنے کے قابل نہ رہیں۔ اور ان کے معززین کو اس حد تک پامال کردیا جائے کہ وہ سر اٹھا کے چلنے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ چنانچہ جس سر میں بھی سوچنے کی امنگ اور جس زبان میں بولنے کا حوصلہ اور جس دل میں آزادی کی تڑپ دیکھتے ہیں وہ اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کردیتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ کمزور لوگوں میں خوشامدیوں اور ٹوڈیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کردیتے ہیں جو غلامی میں عزت، جاسوسی میں شاہی قرب اور فاتحوں کی تہذیب کی نقل میں اپنا اعزاز سمجھتا ہے۔ اس طرح سے اس ملک کے حقیقی مالک ملک سے بیگانہ اور تیسرے درجے کے شہری بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ حرکت کوئی ایک بادشاہ نہیں کرتا بلکہ جو بادشاہ بھی کسی دوسرے ملک کو اپنی مملکت کا حصہ بنانا چاہتا ہے تو وہ یہی کچھ کرتا ہے۔ سلیمان بھی ایک بادشاہ ہیں۔ وہ جب قوت وجبر سے ہمارے ملک میں داخل ہوں گے تو وہ بھی اس ملک کے رہنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ اور آج جن کو معزز سمجھا جاتا ہے انہیں اپنے ملک میں کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی۔

Marfat.com

وَاِنِّیْ مُرْسِلَۃٌ اِلَیْھِمْ بِھَدِیَّۃٍ فَنٰظِرَۃٌ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

(میں ان کے پاس اپنے سفیر ہدیئے کے ساتھ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے سفیر کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔ ۳۵)

حقیقت کا تجسس

البتہ یہ بات کہ کوئی آبرومندانہ حل نکالنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ سلیمان کس طرح کے آدمی ہیں۔ وہ محض ایک بادشاہ ہیں یا اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، جیسا کہ ان کے خط سے گمان ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت کا تعین ہوجانے کے بعد پھر ان سے معاملہ کرنا آسان ہوجائے گا۔ چنانچہ اس کا اندازہ کرنے کیلئے میں اپنے سفیروں کو تحائف دے کے بھیجتی ہوں۔ اگر وہ بادشاہ ہوئے تو مال و دولت کے حریص ہوں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ دولت کا لالچ دے کر ان سے کوئی مناسب معاملہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہوئے تو پھر ان کی قناعت و بے نیازی سے واضح ہوجائے گا کہ معاملہ محض ملک و دولت کا نہیں بلکہ اصول کا ہے۔ تو پھر ان سے معاملہ اصولی بنیادوں پر کیا جائے گا۔ تو اب میں اپنے قاصدوں کو تحائف دے کے روانہ کر رہی ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰنِۦَ اللّٰہُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

(جب قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا، کیا تم لوگ میری مال سے مدد کرنا چاہتے ہو، مجھے اللہ نے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تم کو دیا ہے بلکہ تم ہی ہو کہ اپنے ہدیوں پر خوش ہوتے ہو۔ ۳۶)

الفاظ میں دونوں باتوں کا احتمال ہے کہ ہدیہ لے کر جانے والا صرف ایک سفیر یا ایلچی ہو یا ایک پورا وفد ہو جو مختلف قسم کے ہدایا لے کر پہنچا ہو۔ دو حکومتوں کے درمیان ایسے معاملات میں عموماً سفارت صرف ایک آدمی کے توسط سے نہیں ہوتی بلکہ وفود کا آنا جانا ہوتا ہے۔ اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک وفد ہدایا لے کر گیا ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے وفد کو جواب

ملکہ کی طرف سے ہدایا دے کر بھیجا جانے والا وفد جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچا اور اس نے مناسب آداب کے ساتھ آپؑ کی خدمت میں ہدایا پیش کئے تو آپؑ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ آپ یہ قیمتی تحائف دے کر مالی طور پر شاید میری مدد کرنا چاہتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ میرا ملک شاید کسی مالی بحران میں مبتلا ہے، اس لئے میں نے یہ جنگ کا ڈول ڈالا ہے تاکہ آپ لوگوں کے ملک پر قبضہ کر کے اپنے ملک کیلئے مالی وسائل فراہم کروں، یہ سوچ صحیح نہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور بہتر عطا فرمایا ہے جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یعنی وسائلِ زندگی اور دولت وحشمت کے معاملے میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔ آپ کے اس مال و

Marfat.com

دولت کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ میرے ملک کو۔ میں نے آپ کی ملکہ کو ایک اصولی دعوت بھیجی ہے کہ آپ مطیع و فرمانبردار ہو کر میرے پاس حاضر ہو جائیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے نظام عدل و انصاف کو نافذ ہونے کا موقع دیں۔ آپ لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نظریاتی لوگ ہیں اور ایک مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ اور وہی مقصد ہماری زندگی کی اصل منزل ہے۔ مال و دولت اگرچہ ہماری ضرورت ہے لیکن وہ ہمارا ہدف نہیں۔ یہ چیزیں آپ کو خوشیاں دے سکتی ہیں، ہمیں نہیں۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٣٧﴾

(واپس جاؤ اپنے بھیجنے والوں کی طرف، ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کے مقابلے کی ان میں تاب نہیں، اور ہم انہیں وہاں سے ذلیل کر کے نکالیں گے اور وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ ٣٧)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے رئیس وفد سے کہا کہ تم اپنی ملکہ اور اپنے اعیانِ مملکت کے پاس واپس جاؤ اور جا کر انہیں بتاؤ کہ ہم تحائف کے طلبگار نہیں ہیں، ہم تمہارے ملک کا نظام بدلنے کی فکر میں ہیں تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کے عدل و احسان کے جھنڈے کے نیچے کھڑا کیا جائے۔ لیکن تمہارے اعیانِ سلطنت چونکہ اپنے اسباب و وسائل اور اپنی شجاعت و بسالت پر بڑا ناز کرتے ہیں، تو ہم بھی اپنی افواجِ قاہرہ لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ اور تم انہیں یقین دلاؤ کہ وہ ہمارے لشکروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہم ان کے ملک کو فتح کرنے کے بعد خودسروں کو وہاں سے اس طرح ذلیل کر کے نکالیں گے کہ وہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قومیں جنگ میں شکست کھا جاتی ہیں لیکن ان کے حوصلے شکست نہیں کھاتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہاری فوجوں کا اس طرح کس بل نکالیں گے کہ تم کبھی بھول کر بھی جنگ کا نام نہیں لو گے۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣٨﴾

(حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا، اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے، قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں۔ ٣٨)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوتی تدبیر

معلوم ہوتا ہے کہ سفیروں نے واپس جا کر ملکۂ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار اور ان کی مملکت کے حالات کے بارے میں جو خبر دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی متقیانہ زندگی کے بارے میں جو تفصیلات بہم پہنچائیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے ملکہ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ سلیمان محض ایک حکمران نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ میں ان کے پاس حاضر ہو کر بالمشافہ ان سے گفتگو کروں۔ چنانچہ وہ نہایت خدم و حشم اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ فلسطین کی طرف روانہ ہوئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اطلاع بھجوا دی کہ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے بالمشافہ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا تخت منگوا لیا جائے تاکہ تخت کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو سکے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس طرح شاہانہ جلال رکھتے ہیں اس سے بڑھ کر انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی قدرتیں عطا کر رکھی ہیں کہ وہ چاہیں تو پندرہ سو میل کے فاصلے پر چشمِ زدن میں ایک ملکہ کا تخت منگوا سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی سوچ کے تحت آپ نے اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ تم میں ایسا کون شخص ہے جو ملکۂ سبا کے آنے سے پہلے اس کا تخت یہاں لے آئے۔

Marfat.com

قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ ۚ وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ﴿۳۹﴾

(جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے کہا کہ میں اس کو آپؑ کے پاس آپؑ کی اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کردوں گا اور میں اس کام پر قدرت رکھنے والا اور ایک امانتدار ہوں۔ ۳۹)

عِفْرِیْتٌ تگڑے، زورآور اور قوی ہیکل کو کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر کا علم دیا تھا، اسی طرح جنات کو ان کیلئے مسخر کردیا تھا۔ اور آپؑ کو ایسا علم عطا فرمایا گیا تھا جس کے ذریعے سے وہ جنوں سے کام لیتے اور جن ان کی اطاعت سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے جس طرح انسان آپؑ کے دربار میں حاضر رہتے تھے اسی طرح آپؑ کے اہلِ دربار میں جنات بھی شامل تھے جو مختلف فرائض انجام دیتے تھے۔ انہیں جنات میں سے ایک بڑے قوی ہیکل اور ہوشیار جن نے آپ کے سوال کے جواب میں کہا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کیلئے میں حاضر ہوں۔ میں اس مجلس کے برخاست ہونے سے پہلے پہلے ملکہ کے تخت کو حاضر کرسکتا ہوں۔ اور آپ کی مجلس کا وقت ظاہر ہے کہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوگا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پندرہ سو میل کے فاصلے پر ملکۂ سبا کا عظیم الشان تخت جو نہ جانے کتنے پہریداروں کی حفاظت میں محفوظ ہوگا، میں تین چار گھنٹوں میں اسے آپ کے سامنے لاسکتا ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتے ہیں، میں اس تخت میں لگے ہوئے ہیروں اور جواہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں جس طرح تخت کو اتنی دور سے اٹھا لانے کی طاقت رکھتا ہوں، اسی طرح میں امانتدار بھی ہوں۔ اس کی ایک ایک چیز کو بغیر کمی بیشی کے آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ؕ فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۟ۖ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَ اَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ﴿۴۰﴾

(جس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں، پس جب اس نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں، اور جو شکر کرتا ہے تو وہ اپنے ہی نفع کیلئے شکر کرتا ہے، اور جس نے ناشکری کی تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔ ۴۰)

اَلَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ کا مفہوم

جب جنوں میں سے ایک قوی ہیکل جن نے یہ کہا کہ آپؑ کی مجلس ختم ہونے سے پہلے میں وہ تخت آپ کی خدمت میں پیش کردوں گا، تو ایک بزرگ جو کتاب کے عالم تھے، انہوں نے اسے لمبا وقت سمجھا اور کہا کہ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں پلک جھپکنے میں ملکہ کا تخت آپ کی خدمت میں حاضر کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ اسی ایک لمحے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ تخت ان کے سامنے موجود ہے۔

Marfat.com

اس واقعہ میں بعض باتیں تشریح طلب ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ علمِ کتاب سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے لوحِ محفوظ مراد ہے۔ بعض اسے کتابِ شریعت قرار دیتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ علمِ کتاب سے مراد کتاب وشریعت یعنی تورات کا علم مرادنہیں، بلکہ اس سے مراد ایک ایسا علم ہے جو عملیاتِ سفلیہ کی طرح ناپاک اور ناجائز علم نہیں بلکہ ایسا علم ہے جسے کتاب وشریعت کے علم کے ساتھ ساتھ سیکھا بھی جاسکتا ہے اور اس کو زیرِ عمل لانے میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ وہ علم کون سا ہے، تو اس سے مراد، خواصِ کلمات اور اسمائے الٰہی کا علم ہے جو سحر وشعبدے وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کے مقابلہ کیلئے دو فرشتوں کے ذریعے بنی اسرائیل کو بابل کی اسیری کے زمانے میں عطا ہوا تھا۔ یہ علم بجائے خود پاکیزہ ہے لیکن اس کی نوعیت ایک شمشیرِ دودم کی ہے جس کو فاسد اغراض میں استعمال کر کے انسان فتنہ میں پڑسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صاحبِ علمِ کتاب کون ہے؟ اس میں بھی مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ کوئی اس سے حضرت خضر علیہ السلام کو مراد لیتا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے آصف بن برخیاہ مراد ہیں جو یہودی ربیوں کی روایات کے مطابق رئیس الرجال ہیں۔ امامِ رازی کو اصرار ہے کہ اس سے خود حضرت سلیمان علیہ السلام مراد ہیں۔ لیکن یہ بات قرآنِ کریم کے سیاقِ کلام سے مناسبت نہیں رکھتی۔ ابنِ عربی کا خیال یہ ہے کہ یہ آصف بن برخیاہ کا تصرف ہے۔ تصرف اصطلاح میں خیال ونظر کی طاقت استعمال کر کے حیرت انگیز کام کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے جس کیلئے نبی یا ولی بلکہ مسلمان ہونا بھی شرط نہیں۔ وہ مسمریزم جیسا ایک عمل ہے۔ ابن عربی کا کہنا یہ ہے کہ انبیائے علیہم السلام چونکہ تصرف کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کام آصف بن برخیاہ سے لیا۔ یہ تمام اقوال اپنی جگہ لیکن قرآنِ کریم نے اس تصرف کو علم من الکتاب کا نتیجہ بتلایا ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کسی دعا یا اسمِ اعظم کا اثر تھا جس کا تصرف سے کوئی واسطہ نہیں، وہ کرامت ہی کے مفہوم میں داخل ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس عمل کو ایک ایسے شخص سے نسبت دی ہے جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اس لئے زیادہ احوط بات یہ ہے کہ ہم صرف اتنی بات کو مانیں اور تسلیم کریں جتنی بات قرآنِ کریم میں فرمائی گئی ہے یا جو کچھ اس کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ کہنا یقیناً بے احتیاطی ہے۔ علمِ کتاب رکھنے والے وہ صاحب کوئی بھی ہوں، اتنی بات تو واضح ہے کہ وہ یقیناً کوئی اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں اور یہ ان کی کرامت ہے جس سے یہ حیرت انگیز واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی شکر گزاری

یہ واقعہ چونکہ ایک ایسے شخص کی کرامت سے ظہور میں آیا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتی، آپؑ کا تربیت یافتہ اور آپؑ کا شاگرد تھا۔ تو بجائے اس کے کہ آپ یہ سوچ کر مغرور ہو جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے شاگردوں کو کیسے کمالات عطا فرمائے ہیں، وہ فوراً پکار اٹھے کہ یہ سب میرے رب کا فضل ہے۔ اور وہ یہ فضل کر کے میرا امتحان کر رہا ہے کہ میں اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا۔ جو شخص نعمت پا کر خدا کا شکر گزار رہتا ہے، وہ خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچاتا بلکہ اپنے لئے نفع کا سامان کرتا ہے۔ میرا رب تو ہر طرح کے نفع سے بے نیاز ہے، لیکن اپنی بے نیازی کے ساتھ ساتھ وہ کریم بھی ہے۔ اس وجہ سے وہ ان لوگوں کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کی نہ صرف ناشکری کرتے ہیں بلکہ اس کے خلاف بغاوت کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

Marfat.com

بعض لوگ اس اشتباہ کا اظہار کرتے ہیں کہ ڈیڑھ ہزار میل سے ایک تختِ شاہی پلک جھپکنے میں کس طرح منگوایا جاسکتا ہے۔ یہ اشتباہ قلتِ فکر کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ زمان ومکان اور مادہ وحرکت کے جو تصورات ہم نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بناپر قائم کئے ہیں ان کے جملہ حدود صرف ہم پر منطبق ہوتے ہیں۔ خدا کیلئے نہ یہ تصورات صحیح ہیں اور نہ وہ ان حدود سے محدود ہیں۔ اس کی قدرت ایک معمولی تخت تو درکنار، سورج اور اس سے بھی زیادہ بڑے سیاروں کو آن کی آن میں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرا سکتی ہے۔ جس پروردگار کے صرف ایک حکم سے یہ عظیم کائنات وجود میں آگئی ہے تو اس کا ایک ادنیٰ اشارہ ہی ملکہ سبا کے تخت کو روشنی کی رفتار سے چلا دینے کیلئے کافی تھا۔ ہم قرآنِ کریم میں معراج کا واقعہ پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو ایک ہی رات میں بیت المقدس لے جایا گیا اور سنت کی وضاحت کے مطابق آپؐ کو تمام آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔ کوئی شخص ان وسعتوں کو دیکھ کر ایک رات میں اس سفر کا یقین نہیں کرسکتا، بجز اس کے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اذعان حاصل ہو۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

(حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کے تخت کی شکل بدل دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے۔ ۴۱)

تخت ذریعۂ ہدایت

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو ہدایت کا ذریعہ بنایا، اس لئے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس تخت کی شکل اس طرح بدل ڈالو کہ وہ ملکہ کیلئے اجنبی سا ہو کر رہ جائے۔ جب تک غور سے نہ دیکھا جائے پہچاننا مشکل ہو کہ یہ ملکہ ہی کا تخت ہے۔ مقصود اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیا وہ صرف اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتی ہے یا حقیقت کو جاننے کے بھی درپے ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ ہم دیکھیں گے کہ کیا وہ اس تخت کو دیکھ کر حقیقت کو پالینے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اور کیا وہ اس بات پر غور وفکر کرتی ہے کہ ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر موجود تخت جس اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے نے میری آمد سے پہلے یہاں منگوا رکھا ہے جبکہ اتنے وقت میں وہاں سے کسی آدمی کا آنا بھی ممکن نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف ایک حکمران نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، تخت کی یہ منتقلی اس کا معجزہ ہے جس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طاقت کام کررہی ہے۔ دیکھنے والے صرف اس کے جاہ وجلال کو دیکھتے ہیں، اس کے خوبصورت محلات کو دیکھتے ہیں اور اس کے کروفر سے اندازہ کرتے ہیں کہ وہ شاید عام حکمرانوں کی طرف ایک حکمران ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں، وہ حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ اور اس کا رسول بھی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۭ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

(ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے سوال کیا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا یہ تو گویا وہی ہے، ہم کو اس سے پہلے ہی علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔ ۴۲)

Marfat.com

ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں

ملکہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں پہنچ گئی تو اس سے پوچھا گیا کہ یہ تخت جو تمہارے سامنے پڑا ہے، کیا یہ تمہارا ہی ہے؟ تو اس نے دیکھ کر کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی معلوم ہوتا ہے اور پھر وہ جان گئی کہ یہ واقعی میرا تخت ہے۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ میں اب تک اپنے قاصدوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دانش و حکمت، آپؑ کے جاہ و جلال اور آپؑ کے کمالات کے بارے میں جو کچھ سن چکی ہوں، آپؑ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ یقیناً یہ سب کچھ ایک حکمران میں جمع نہیں ہوسکتا، یہ صرف نبوت و رسالت کے کمالات اور لوازم ہیں۔ اور اسی بات کی تائید کیلئے اس نے یہ لمبا سفر اختیار کیا تاکہ وہ براہِ راست حضرت سلیمان علیہ السلام سے گفتگو کرکے صحیح رائے تک پہنچ سکے۔ اب جبکہ اس نے اپنی آنکھوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت و شوکت دیکھی جس کی وہ قلبی طور پر پہلے سے معترف ہوچکی تھی تو اس نے فرمانبردار اور مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔ چونکہ ملکہ کے ہمراہ اس کے اعیانِ سلطنت اور امراء بہت بڑی تعداد میں آئے تھے اور وہ بھی پہلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے کمالات اور نیک نامیوں کے تذکرے سن چکے تھے۔ تو ملکہ نے تنہا مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا بلکہ اپنے تمام عمائدینِ سلطنت کو بھی اس اقرار میں شامل کیا۔ اس لئے کُنَّا مُسْلِمِیْنَ کہا گیا۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٤٣﴾

(اور اسے روک رکھا تھا ایمان لانے سے ان چیزوں نے جن کو اللہ کے ماسوا وہ پوجتی رہی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم میں سے تھی۔ ۴۳)

ایک سوال کا جواب

گزشتہ آیت کی وضاحت سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر ملکہ اور اس کے عمائدین حضرت سلیمان علیہ السلام کے علم و حکمت سے اس قدر متاثر اور قلبی طور پر ان کے مطیع اور منقاد تھے تو پھر وہ مسلمان کیوں نہ ہوئے اور اب تک ایک غلط دین پر قائم کیوں رہے؟ اس آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ دو چیزیں اس کیلئے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں جو ہر صالح تبدیلی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے آفتاب کی پرستش اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ اور دوسری یہ بات کہ اس کا تعلق ایک کافر قوم سے تھا۔ یعنی ایک طرف آباؤ اجداد کی تقلید اور دوسری طرف قومی روابط کی زنجیر، جبکہ وہ اس قوم کی ملکہ بھی تھی، اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ یوں تو ایک عام آدمی بھی اپنے تعصبات کے پتھروں کو ہٹانے میں جلدی کامیاب نہیں ہوتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسے توفیق دے دے۔ لیکن جہاں تک حکمرانوں کا تعلق ہے انہیں اپنی سیادت و قیادت کے باعث ان بندھنوں کا توڑنا دوسرے لوگوں سے ہزار گنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ ملکہ کی سلامتِ طبع اور قوتِ فیصلہ کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے ماحول کی بالکل غلام بن کر نہیں رہی بلکہ وقت آنے پر اس نے ان تمام رکاوٹوں کو توڑ ڈالا۔

Marfat.com

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

(ملکۂ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ، پس جب اس نے اسے دیکھا تو اس کو گہرا پانی گمان کیا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں، حضرت سلیمان نے کہا یہ تو شیشوں سے بنا ہوا محل ہے، ملکہ پکار اٹھی، اے میرے رب! میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی ہوں، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالہ کیا۔ ۴۴)

محل میں ملکہ کی حیرانی

ملکہ کی استقبالی مصروفیت سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے خدام نے ملکہ سے درخواست کی کہ وہ محل کے اندر تشریف لے چلیں۔ ملکہ جیسے ہی محل میں پہنچی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے فرش پر نگاہ ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ یہ پانی کا گہرا حوض ہے جس سے گزر کر شاید آگے جانا پڑے گا۔ مہمانی کے آداب کی وجہ سے اس نے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ مجھے بہرحال اس پانی میں اتر جانا چاہئے۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد اس نے بے ساختہ پائینچے چڑھا لئے جس سے پنڈلیاں کھل گئیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو آپؑ نے توجہ دلائی کہ یہ پانی کا حوض نہیں بلکہ یہ محل اور اس کا فرش شیشہ سے بنایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محل کا فرش شیشہ کی دبیز تختیوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر داخل ہونے والا کسی حوض میں اتر رہا ہے۔ ملکہ باوجود اس کے کہ عیش و تنعم میں پلی بڑھی اور دولت و رفاہیت اس کے گھر کی لونڈی رہی۔ بایں ہمہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شان و شکوہ نے اسے مبہوت کر دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا طرزِ زندگی ذریعۂ ہدایت بنا

ملکہ ایک ذہین و فطین اور صاحب بصیرت خاتون تھی۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہر معاملے کو بہت غور سے جانچا اور پرکھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس کی سب سے پہلی آگاہی اس مکتوبِ گرامی سے ہوئی جو آپؑ نے ملکہ کو لکھا۔ اس مکتوب میں جب ملکہ نے دیکھا کہ اسے عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹ کر اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے تو اس کو خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ پھر جب اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بیش قیمت تحائف بھیج کر آزمانا چاہا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی بے نیازی اسے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ تحائف لانے والے وفد نے واپس جا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے کروفر، شاہانہ رعب و جلال، حکمت و دانش اور آپؑ کی متقیانہ زندگی کے بارے میں جو رپورٹ دی اس نے اس تاثر میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ انہیں تاثرات میں ڈوبتے ہوئے ملکہ نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود حاضر ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام سے گفتگو کرنی چاہئے اور ان کے معمولات کو دیکھنا چاہئے تاکہ ان کی دعوت کی سچائی کا اندازہ ہو سکے۔ اسی حوالے سے جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچی اور آخر میں محل میں جانے کا اتفاق ہوا تو اب اس کے تاثرات فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گئے۔ اور اس نے محسوس کیا کہ حکومتیں اور ریاستیں اور شاہانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ اور غیر معمولی علم و دانش، انسان میں کبر و غرور پیدا

Marfat.com

کرتا ہے، لیکن سلیمان ایک عجیب انسان ہیں کہ انہیں دوسرے حکمرانوں سے بڑھ کر شاہانہ وقار حاصل ہے۔ اس کے باوجود ان میں نہ کبر و غرور ہے، نہ رعونت و خودسری۔ وہ ہر بات پر رب العالمین کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی حکومت دراصل اللہ رب العالمین کی حکومت ہے جس کی خلافت کا فرض وہ باحسن طریق انجام دے رہے ہیں۔ وہ محلات میں رہتے ہیں لیکن دل میں غریبوں کا درد بسا ہوا ہے۔ اور ان کے ہر کام میں عاجزی اور فروتنی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ عبدیت و انابت اور شکر گزاری اور وفاداری یہ دنیادار حکمرانوں میں کبھی نہیں ہوتی، یہ صرف اسی کو نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ حکومت و ولایت کے ساتھ نبوت بھی عطا کرتا ہے اور یا اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے راستے پر چلتا ہے۔ چنانچہ ان تاثرات نے اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول بھی ہیں۔ اور میں ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر ایمان لاتی ہوں اور اپنے آپ کو رب العالمین کے سپرد کرتی ہوں۔

ملکۂ سبا کی یہ سرگزشت بائیبل کے عہدِ عتیق و جدید اور روایاتِ یہود سب میں مختلف طریقوں سے آئی ہے، مگر قرآن کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ البتہ دونوں میں ایک قدرِ مشترک موجود ہے۔ اور ہمارے اکثر مفسرین نے اسے خلاصے کے طور پر ذکر کیا ہے، ہم اسے تفہیم القرآن سے مولانا مرحوم کے تبصرے کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔

ملکۂ سبا کا ذکر تورات میں اور اس پر تبصرہ

''اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے۔ اور وہ بہت بڑے جلو کے ساتھ یروشلم آئی...... جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارہ میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے ان سب کا جواب دیا...... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمان کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور اس کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر کو جاتا تھا دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی۔ تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا...... اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہر دیئے اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیئے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے...... اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔'' (سلاطین ۱۰:۱۔۱۳۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون ۲۔ تواریخ ۹:۱۔۱۲ میں بھی ہے)۔

عہدِ جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک تقریر کا صرف یہ فقرہ ملکۂ سبا کے متعلق منقول ہوا ہے:

''دکھن کی ملکہ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھ کر ان کو مجرم ٹھہرائے گی، کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے۔'' (متی ۱۲:۴۲۔ لوقا ۱۱:۳۱)۔

Marfat.com

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہدہد کا غائب ہونا، پھر آ کر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس کے ذریعہ سے خط بھیجنا، ہدہد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جبکہ وہ آفتاب کی پرستش کو جارہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کران سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اترنے کیلئے پائینچے چڑھالینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔ مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں بلکہ خداپرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے ملکۂ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۱۱۔ صفحہ ۴۴۳)۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر توراۃ کے احکام کی خلاف ورزی، غرورِ حکومت، غرورِ عقل ودانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۳۹۔۴۴۱)۔ اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائیبل انہیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہوگیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہوگیا (سلاطین ۱۱:۱۔۱۱)۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا، اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ
فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ
الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ
بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ
كَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

Marfat.com

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا
مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ
لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ
قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾

رکوع: ۴۔ (اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، تو وہ دو فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ ۴۵) حضرت صالح نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم بھلائی سے پہلے برائی کیلئے کیوں جلدی مچاتے ہو، تم اللہ سے مغفرت طلب کیوں نہیں کرتے، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۶) انہوں نے کہا ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے، حضرت صالح نے جواب دیا تمہارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ تم آزمائے جارہے ہو۔ ۴۷) اور شہر میں نو خاندان تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ ۴۸) انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔ ۴۹) اور انہوں نے بھی چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، جسے وہ نہ جان پائے۔ ۵۰) پس دیکھو کیسا ہوا ان کی چال کا انجام، ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۵۱) پس یہ ہیں ان کے گھر جو اجڑے پڑے ہیں بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، بیشک اس کے اندر عبرت ہے ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں۔ ۵۲) اور ہم نے بچا لیا ان

Marfat.com

لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور جو ڈرتے تھے۔ ۵۳) اور لوط کو ہم نے بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم
بدکاری کرتے ہو حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ۵۴) کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کیلئے
جاتے ہو بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو۔ ۵۵) پس نہیں تھا ان کی قوم کا جواب، مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ آلِ لوط کو اپنی بستی سے
نکال دو، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ ۵۶) سو ہم نے اسے اور اس کے لوگوں کو نجات دے دی، بجز اس کی بیوی کے، ہم
نے فیصلہ کر دیا اس کے متعلق کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ ۵۷) اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا،
پس کیا ہی بری بارش تھی ان لوگوں پر جنہیں ڈرایا گیا تھا۔ ۵۸)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو، تو وہ
دو فریق بن کر آپس میں جھگڑنے لگے۔ ۴۵)

انسان کے بناؤ اور بگاڑ کے دو سبب

انسان کے بناؤ اور بگاڑ کی دو بنیادیں ہیں۔ شکر گزاری وفروتنی اور تمرد واستکبار۔ گزشتہ آیات میں شکر گزاری وفروتنی کے مصداق کے طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی سرگزشت سنائی گئی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت وریاست، دولت ورفاہیت اور جاہ وجلال جنہیں بگاڑ کے اسباب سمجھا جاتا ہے یہ بھی انسان کا کچھ نہیں بگاڑتے، اگر فروتنی وشکر گزاری کا جذبہ انسان میں پیدا ہو جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جیسا جاہ وجلال عطا فرمایا اور جس طرح دنیا کے خزانے ان کے سامنے کھول دیئے گئے اس سے بجائے ان کے اندر علو واستکبار کے پیدا ہونے کے جذبۂ شکر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور انہوں نے ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اس کا حق ادا کرنے کی فکر کی۔ نتیجہ اس کا سامنے ہے کہ آج ان کی شخصیت حکمرانوں اور دولت مندوں کیلئے نصیحت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ دوسری طرف ہم فرعون اور آلِ فرعون کو دیکھتے ہیں جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام سے کم درجہ حکومت اور دولت سے بہرہ ور کیا گیا۔ لیکن ان دونوں نعمتوں سے ان لوگوں نے نصیحت حاصل کرنے کی بجائے انہیں علو واستکبار کا ذریعہ بنایا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اپنے اس رویئے کے باعث وہ اپنے اور اہلِ ملک کیلئے ایک مصیبت اور آفت بنے رہے۔ اور ان کا یہی رویہ قبولیتِ حق کے راستے میں دیوار بن گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے اور بحرِ قلزم کی موجوں نے انہیں نگل لیا۔ اور فرعون کا جسم آج بھی عبرت کا سامان بن کر ایک میوزیم میں موجود ہے۔ چنانچہ اسی سلسلۂ نصیحت وعبرت کو آگے بڑھاتے ہوئے قرآنِ کریم اب خاص عرب کی اقوامِ بائدہ میں سے دو قوموں یعنی قومِ ثمود وقومِ لوط کے حالات وانجام کو قریش کے سامنے پیش کر رہا ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں ان ملکوں کی داستانیں سنائی جارہی ہیں جو ہم سے دور ہیں اور جن سے ہم براہِ راست رابطہ نہیں رکھتے۔ یعنی مصر، فلسطین اور یمن۔ اب ان قوموں کے حالات ان کے سامنے بطور عبرت پیش کیے جارہے ہیں جن کی ترقی وسربلندی کے کھنڈرات اور یادگاریں آج بھی ان راستوں میں موجود ہیں جہاں سے وہ تجارتی قافلوں کے ساتھ گزر کے جاتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت اور اس کا ردِ عمل

سب سے پہلے قومِ ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا قومِ ثمود وہ قوم ہے قریش جن کے کھنڈرات سے اچھی طرح واقف تھے، اور جن کی تاریخ سینہ بہ سینہ عربوں تک پہنچ چکی تھی اور ان کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ اور یہ بھی دکھایا جارہا ہے کہ قومِ ثمود کی تباہی جس دعوت کو قبول نہ کرنے کے نتیجے میں ہوئی ہے وہ وہی دعوت تھی جسے آج محمد ﷺ قریش کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جیسے ہی اپنی دعوت اپنی قوم کے سامنے پیش کی تو قوم میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جنہوں نے صداقت کی اس آواز کو سنا، اس پر لبیک کہا اور ایمان لے آئے۔ اور دوسرا وہ گروہ تھا جنہوں نے نہ صرف اس دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ مخالفت و معاندت اور اذیت رسانی پر تل گئے اور کوشش کی کہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس حد تک ہراساں کردیا جائے کہ وہ خود ہی اس دعوت سے دست کش ہو جائیں۔ قرآنِ کریم نے ان کے درمیان کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "اس کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے تھے انہوں نے ان لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے جو ان میں سے ایمان لائے تھے کہا، کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے رسول ہیں، انہوں نے جواب دیا، ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو دے کر وہ بھیجے گئے ہیں، ان متکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کے ہم کافر ہیں۔" (الاعراف: آیت ۷۵-۷۶)

جس قوم میں بھی اللہ تعالیٰ کے رسول مبعوث ہوئے ہیں انہوں نے جیسے ہی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت اپنی قوم کو دی ہے تو اسی طرح ہر جگہ اہلِ ایمان اور انکار کرنے والوں کے دو گروہ وجود میں آئے اور ایک کشمکش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایمان لانے والے ابتداء میں ہمیشہ وہ لوگ رہے ہیں جنہوں نے آج تک بڑے لوگوں کے ظلم کو برداشت کیا اور وہ ہر لحاظ سے ظلم و تعدی کا نشانہ بنتے رہے۔ جیسے ہی ان کو احساس ہوتا ہے کہ یہ نئی اٹھنے والی آواز ایک نئی زندگی کا پیغام لے کر آئی ہے تو آگے بڑھ کر اسے قبول کرلیتے ہیں۔ لیکن قوم کا وہ بالائی طبقہ جنہوں نے آج تک ان کا استحصال کیا ہے وہ اس دعوت کو بھی خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایمان لانے والوں کو بھی سزا دینے پر تل جاتے ہیں۔ اور یہی کچھ نبی کریم ﷺ اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ قریش کی طرف سے ہورہا تھا۔

قَالَ یٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

(حضرت صالح نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم بھلائی سے پہلے برائی کیلئے کیوں جلدی مچاتے ہو، تم اللہ سے مغفرت طلب کیوں نہیں کرتے، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۶)

آیتِ کریمہ میں السَّیِّئَة سے مراد اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ اور الْحَسَنَة سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

Marfat.com

مخالفین کا عام حربہ

قرآنِ کریم نے جابجا اس مضمون کو بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی دعوت اور معاندین کی مخالفت میں جب تیزی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا رسول محسوس کرنے لگتا ہے کہ مخالفین حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتا ہے اور انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ جن قوموں نے بھی یہ رویہ اختیار کیا وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ میں تمہارے بارے میں بھی اسی بات کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تو مخالفین بجائے اس اندیشہ سے ڈرنے کے وہ محض اسے ڈراوا سمجھ کر استہزاء کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور بات بات پر پیغمبر سے مطالبہ کرنے لگتے ہیں کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈرا رہے ہیں وہ عذاب ہم پر لے کیوں نہیں آتے۔ یا اس کی کوئی نشانی ہم پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے تاکہ ہم اس سے ڈر کر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی ان کی دردمندی اور خیر خواہی کے جواب میں بار بار عذاب کا مطالبہ شروع کر دیا۔ چنانچہ اس پر تنبیہ کرتے ہوئے حضرت صالح علیہ السلام نہایت ہمدردی کے ساتھ انہیں سمجھاتے ہیں کہ تم کیسے لوگ ہو کہ بجائے اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب کرنے اور اس سے استغفار کرنے کے تم اس کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔ وہ تمہیں اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے اور تم عذاب کے پتھروں کو دعوت دے رہے ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی احساس کی رمق باقی ہے اس سے استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت مانگو۔

آنحضرت ﷺ کی قوم نے بھی آپ کی دعوت کے جواب میں یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ بار بار آپ سے یہ کہتے تھے کہ اگر آپ کی دعوت کی تکذیب کا انجام ان کی ہلاکت ہے تو اس ہلاکت کی نشانی ہمیں دکھا کیوں نہیں جاتی تاکہ ہمیں واقعی یقین آ جائے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور آپ اس کے رسول ہیں۔ انہیں حضرت صالح علیہ السلام کی سرگزشت سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ان میں سے کوئی بات بھی نئی نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ان کی قوم نے بھی یہی رویہ اختیار کیا اور آخر تباہ ہو گئی۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

(انہوں نے کہا ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے، حضرت صالح نے جواب دیا تمہارا نصیبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ تم آزمائے جا رہے ہو۔ ۴۷)

اِطَّيَّرْنَا کی تحقیق

اِطَّيَّرْنَا ...... طیر سے ہے، طیر چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ توہم پرستوں میں چڑیوں اور پرندوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج رہا ہے۔ اس وجہ سے تطیر کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ پھر اس کا غالب استعمال فالِ بد کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے طائر کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے۔ اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے قسمت اور نصیب کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

Marfat.com

قوم کا بیہودہ ردِ عمل

عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول دنیا میں سایۂ حق بن کر آتے ہیں۔ ان کا وجود جسدِ قوم میں روح کی مانند ہوتا ہے۔ ان کی دعوت کو قبول کر لینے کے نتیجے میں انسانیت کو شباب کی دولت ملتی ہے۔ اور انسان کے گھر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اترنے لگتی ہے۔ لیکن اس کے دعوت کے قبول اور عدمِ قبول کے نتیجے میں چونکہ دو گروہ بن جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ خلیج گہری ہوتی جاتی ہے۔ نتیجتاً ہر گھر میں حق و باطل کی کشمکش چھڑ جاتی ہے اور قبیلے کی شیرازہ بندی جن تعصبات کے بل بوتے پر ہوتی ہے ان تعصبات کی موت سے قبیلے ٹوٹنے لگتے اور امتِ مسلمہ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس ڈھلتے ہوئے سائے کے پجاری یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس شخص کی دعوت نے ہمارے قومی شیرازہ کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ہر گھر میں ایک لڑائی برپا ہے، اپنے، اپنوں سے الجھ رہے ہیں اور ہم بیگانوں میں ایک تماشا بن کے رہ گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب اور اس کی دعوت کے انکار کے نتیجے میں بعض دفعہ اس قوم پر ہلکے پھلکے حوادث بھی آتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو اور وہ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے میں آمادہ ہوں۔ کبھی بارش روک کر قحط سالی پیدا کر دی جاتی ہے، کبھی سیلاب آنے لگتے ہیں، کبھی زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگتے ہیں، کبھی وبائیں پھیل جاتی ہیں، یہ سب جھنجھوڑنے کے اسباب ہیں جس کا مقصد قوم میں انکار کے جذبات کو کم اور آمادگی کے جذبات کو انگیخت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن پروپیگنڈا کرنے والے ایسی ہی باتوں کا حوالہ دے دے کر لوگوں کو یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم پر یہ ساری مصیبتیں اس پیغمبر کی وجہ سے آئی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک یہ شخص تمہارے لئے نحوست کا باعث بن کے آیا ہے۔ اور اگر انہیں یہ کہا جائے کہ یہ سب کچھ تمہارے کفر، شرک اور ناشکری کا نتیجہ ہے تو ان کے دانشور ہمیشہ ان کو اس مغالطے میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اس طرح کے نرم و سخت دن تو قوموں پر آیا ہی کرتے ہیں ان کو کسی کی تصدیق و تکذیب سے کیا تعلق۔ لیکن عام لوگ ان مصائب کو رسول اور اس کے ساتھیوں کی بت پرستی سے برگشتگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبودوں اور ہمارے باپ دادا کے دین کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے معبودوں اور بزرگوں کی مار ان پر پڑی ہے۔ اور ان کی لائی ہوئی آفت میں ہم بھی حصہ پا رہے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جو آزمائشیں اور آفتیں پیش آ رہی ہیں یہ کسی کی نحوست کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کا سر رشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تم میں انابت الی اللہ کے جذبات پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کی طرف مائل کرنے کیلئے تمہیں ان آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ اس طرح سے تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم میں قبولِ حق کی اگر کچھ بھی صلاحیت ہے وہ ان آزمائشوں سے ابھر کر سامنے آ جائے۔ اور یا بصورت دیگر یہ ثابت ہو جائے کہ تم قبولِ حق کے جذبات سے بالکل محروم ہو چکے ہو اور اس قابل ہو گئے ہو کہ دھرتی تمہارا بوجھ مزید برداشت نہیں کر سکتی۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٤٨﴾

(اور شہر میں نو خاندان تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ ۴۸)

Marfat.com

رَهْطٍ کا مفہوم

رَهْطٍ ...... تین سے لے کردس تک یا سات سے لے کردس تک کے گروہ کو کہتے ہیں۔اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شہر میں حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی اس میں نو جتھے یا نو گینگ تھے جو منظم شکل میں شہر میں فساد پھیلاتے تھے اور کسی بھی اصلاحی کوشش کو بارآور نہیں ہونے دیتے تھے۔لیکن قرآنِ کریم نے سورۃ ہود میں اس لفظ کو خاندان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔قومِ شعیب نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا تھا وَلَوْلاَ رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ "اور اگر تیرا خاندان نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کردیتے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں بھی رھط کا معنی خاندان ہے۔جس طرح مکہ معظمہ میں مختلف قبائل آباد تھے اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کے شہر میں نو قبائل بستے تھے۔یقیناً ان میں سے ہر قبیلے کا ایک سردار تھا جو قبیلے کے تمام معاملات کا کرتا دھرتا اور اس کے مجموعی مفادات کا نگران تھا۔جدھر یہ سردار چاہتا، ادھر قبیلہ رخ کرلیتا۔چنانچہ ایسی ہی صورتحال حضرت صالح علیہ السلام کے شہر میں بھی تھی کہ ان نو خاندانوں کے نو سردار تھے جن میں سے ہر ایک برائی کا نمائندہ اور فساد کا خوگر تھا۔حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں جب اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی اور انہیں بتایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری زندگیوں میں آسودگی آئے، تمہارے گھروں میں سکون پیدا ہو اور تمہاری آئے دن کی آپس کی لڑائیاں ختم ہو جائیں اور تمہارے اندر اخلاقِ حسنہ کا دور دورہ ہو اور تمہارے تمام معاملات ٹھیک نہج پر چلیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تم اس دعوت کو قبول کرلو۔

زمین میں فساد کا سبب

جس طرح اہلِ زمین کے علاوہ تمام کائنات میں ہم ایک نظم وضبط، ایک سکون واطمینان اور ایک شائستگی اور آسودگی دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر مخلوق حتیٰ کہ بڑے سے بڑا کُرّہ بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر کمربستہ اور اس کے تکوینی نظام کا تابع ہے۔ ہمیں کہیں تصادم نظر نہیں آتا، کوئی فساد دکھائی نہیں دیتا، ہر کام اپنے وقت پر اور اپنے موقع پر سرانجام پارہا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام میں کسی قسم کی خلل اندازی دکھائی نہیں دیتی۔اہلِ زمین بھی بالکل اسی طرح کی اصلاحی صورتحال سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں اگر وہ اس نقطے کو پالیں کہ باقی کائنات کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کی فرمانبرداری اپنے اوپر لازم کرلیں، اس کے احکام ونواہی کی پابندی کریں، اس کے دیئے ہوئے حقوق وفرائض سے سرمو تجاوز نہ کریں، خواہشات ومفادات کے راستوں پر چلنے کی بجائے صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کردیں۔تو یہ وہ نسخۂ کیمیا ہے جس کے نتیجے میں ہر طرح کا فساد ختم ہوجائے گا اور زمین اور اہلِ زمین صلاح وفلاح سے وابستہ ہوجائے گی۔لیکن جب تک اہلِ زمین اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اس کا راستہ روکنے میں اپنی مساعی بروئے کار لاتے رہیں گے اس وقت تک انفرادی اور اجتماعی زندگی فساد کا شکار رہے گی۔چونکہ اس شہر کے نو کے نو خاندان اور ان کے روساء حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے اور آپؑ کی اطاعت کرنے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے اس کے نتیجے میں فساد برپا ہوتا تھا اور اسی کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

(انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھا کر عہد کرلو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔ ۴۹)

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام کیخلاف مخالفین کا منصوبہ

یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اصلاحی کوششوں کو روکنے کیلئے مخالفین کے باہم اجلاس ہوتے ہوں کیونکہ وہ پریشان تھے کہ ہماری تمام تر اذیت رسانیوں کے باوجود حضرت صالح علیہ السلام کی اصلاحی دعوت کو روکنے میں ہمیں کامیابی نہیں ہو رہی۔ اس کے اثرات آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ ہم جتنی سختی کرتے ہیں اس کے مقابلے میں ان کا صبر اور تحمل لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہم نے ان اثرات کو روکنے کیلئے ناقۂ صالح کو بھی قتل کر ڈالا، لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ البتہ اس کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے ہمیں تین دن کا الٹی میٹم دے دیا ہے فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ، ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ "کہا تم اپنے گھروں میں تین دن مزے کرلو، اس کے بعد خدا کا عذاب آئے گا" اب ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اس زبان کو بھی ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی رازداری سے باہم مل کر حضرت صالح علیہ السلام کے گھر پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا اور قبائلی روایت کے مطابق یہ طے کیا کہ ایک ساتھ آپؑ کے گھر پر حملہ کیا جائے اور تمام قبائل کے نوجوان ایک ساتھ اس حملے میں شریک ہوں تاکہ صالح کا خاندان قصاص کا مطالبہ نہ کر سکے۔ اور اگر انہوں نے کوئی تھوڑا بہت واویلا مچایا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہمارا تو اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تو اس حملے کے وقت سرے سے موجود ہی نہ تھے۔ روایات میں ہے کہ وہ حملہ کرنے کیلئے حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف بڑھے، فرشتوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کو گھیر رکھا تھا، یہ لوگ جب قریب پہنچے تو ان پر سنگباری کی گئی۔ ان پر پتھر برس رہے تھے لیکن پتھر برسانے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ امامِ قرطبی کی روایت کے مطابق تمام حملہ آور اس سنگباری سے ہلاک ہو گئے۔ اور اس کے فوراً بعد قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب برسنے لگا۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾

(اور انہوں نے بھی چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، جسے وہ نہ جان پائے۔ ۵۰) پس دیکھو کیسا ہوا ان کی چال کا انجام، ہم نے ان کو اور ان کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ۵۱)

مخالفین کی چال کے مقابل میں اللہ تعالیٰ کی چال

انہوں نے نہایت خفیہ طریقے سے شب خون مار کر حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے خاندان کو ختم کرنے کی چال چلی اور اس میں تمام خاندانوں کو شامل کر کے انہوں نے اس چال کو اس حد تک مضبوط کیا کہ حضرت صالح علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے ہر طرح کے اندیشے کو بھی ختم کر ڈالا۔ لیکن ان کی چال انہیں پر الٹ گئی اور اس چال کی ناکامی کیلئے اللہ تعالیٰ نے تدبیر کی۔ اس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ہماری ہلاکت اور بربادی ہماری اس چال کے ساتھ باندھ دی گئی ہے۔ چنانچہ دوسری آیتِ کریمہ میں اسی تدبیر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لوگ تو گھر سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے خاندان کو ختم کرنے کیلئے نکلے تھے لیکن ہم نے ان کی اس جرأتِ بیجا پر انہیں ایسا پکڑا کہ انہیں اور ان کی ساری قوم کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

Marfat.com

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

(پس یہ ہیں ان کے گھر جو اجڑے پڑے ہیں بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے، بیشک اس کے اندر عبرت ہے ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں۔ ۵۲) اور ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور جو ڈرتے تھے۔ ۵۳)

قریش کو تنبیہ

یہ سرگزشتیں چونکہ قریش اور اہلِ مکہ کو سنائی جارہی ہیں تاکہ وہ ان سے سبق سیکھیں اور ہدایت قبول کرلیں۔ اس لئے انہیں سنا کر یہ فرمایا گیا ہے کہ قومِ ثمود ان قوموں میں سے ہے جن کے کھنڈرات پر سے تمہارے تجارتی قافلے گزرتے ہیں اور جس کی تباہی کی داستان سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ تم گزرتے ہوئے ان کے کھنڈرات پر نگاہ ڈالو، یہ وہ لوگ ہیں جو تم سے زیادہ پرعیش اور آسودہ زندگی گزارتے تھے اور ان کے گھروں میں ہن برستا تھا۔ آج ان کے گھر ویران اور اجڑے پڑے ہیں اور دور دور تک زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ آنحضرت ﷺ جب تبوک جاتے ہوئے صحابہ کرام ؓ کے ساتھ یہاں سے گزرے تو حضور ؐ نے صحابہ کرام ؓ سے فرمایا، اس عذاب شدہ قوم کے علاقہ میں داخل ہو، تو روتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ ان کا ایک ایک کھنڈر ان کی تباہی کی داستان سنا رہا ہے۔ لیکن انسان کی غفلت کا کیا کہنا کہ ایسے مقامات جہاں سے عبرت حاصل ہونی چاہئے اور جہاں سے گزرتے ہوئے آنکھوں سے آنسو بہنے چاہئیں، انسان نے ان جگہوں کو بھی کلچر کی تلاش میں سیرگاہ بنالیا ہے۔ اور اس کے ایک ایک پتھر سے بجائے عبرت حاصل کرنے کے کلچر تلاش کیا جارہا ہے۔ اور ان کی تباہی کے اسباب کو اللہ تعالیٰ کا عذاب سمجھنے کی بجائے طبعی اسباب قرار دیا جارہا ہے۔ شاعر نے بڑی کام کی بات کہی ہے:

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

اسی لئے آخر میں فرمایا کہ اس سرگزشت میں عبرت کی نشانیاں ہیں لیکن ان لوگوں کیلئے جو اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ کوئی اندھا بہرا خدا اس کائنات پر حکومت نہیں کررہا ہے بلکہ ایک حکیم و دانا ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کررہی ہے۔ اس کے فیصلے طبعی اسباب کے غلام نہیں ہیں بلکہ طبعی اسباب اس کے ارادے کے غلام ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان لوگوں کو نجات دی اور وہ لوگ اس عذاب سے محفوظ رہے جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے اور ان کی دعوت کے نتیجے میں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص سے اپنے عدل کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اور جب سرکشی حد سے گزر جاتی ہے تو پھر وہ انتقام بھی لیتا ہے۔ چنانچہ اسی خوف نے انہیں ہدایت کی طرف آنے پر مجبور کیا اور وہ ہدایت سے بہرہ ور ہوکر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

(اور لوط کو ہم نے بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم بدکاری کرتے ہو حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ۵۴)

یہ اوپر والے واقعہ پر معطوف ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اَرْسَلْنَا محذوف ہے۔ اَلْفَاحِشَةَ کھلی ہوئی بے حیائی اور بے شرمی کو کہتے ہیں جس کے بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

Marfat.com

حضرت لوط علیہ السلام اور آپؑ کی قوم کا بیان

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو جس قوم کی ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا گیا، یوں تو باقی قوموں کی طرح وہ بھی عقیدے کی تمام خرابیوں میں ملوث تھی اور شرک اس کا بھی اوڑھنا بچھونا تھا۔ لیکن جو چیز اس کیلئے وجہِ امتیاز بن گئی تھی وہ ان کا انتہا درجہ بے حیاء ہو جانا تھا۔ قومیں جب اللہ تعالیٰ سے برگشتہ ہوتی ہیں اور آخرت کا عقیدہ ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے تو وہ ہر طرح کی عملی خرابی اور اخلاقی آوارگی کا ارتکاب کرتی ہیں۔ لیکن قومِ لوط اخلاقی آوارگی میں ساری قوموں سے آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ بے حیائی میں نہ صرف زنا کا ارتکاب کرتی تھی بلکہ لواطت یعنی لڑکوں سے بدفعلی اس کا طرۂ امتیاز بن گیا تھا۔ اور یہ مکروہ فعل ان کی گھٹی میں ایسا پڑا تھا کہ عورتوں سے دلچسپی بھی ان کے یہاں برائے نام باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ ان کی اس عادتِ بد پر تنقید کرتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام ان سے یہ فرماتے ہیں کہ تم صرف بے حیاء ہی نہیں ہو بلکہ تمہاری بے حیائی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ تمہارے اندر وہ ذوق بالکل مردہ ہو گیا ہے جو بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ پردہ داری کا خیال رکھتا ہے۔ تم تو ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جس کو نہ جانے کتنی آنکھیں دیکھنے والی ہوتی ہیں جسے قرآنِ کریم نے سورۂ عنکبوت میں فرمایا وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ''اور تم اپنی مجلسوں میں برا کام کرتے ہو۔'' اور جسارت کا عالم یہ ہے کہ تم خود جانتے ہو کہ یہ بہت بری حرکت ہے، لیکن تم پھر بھی وہ حرکتیں کرتے ہو اور تمہیں کبھی اس پر ندامت نہیں ہوئی۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

(کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کیلئے جاتے ہو بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو۔ ۵۵)

خلافِ فطرت کام پر اظہارِ تعجب و حیرت

اظہارِ تعجب و کراہت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ قضائے شہوت کیلئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو پیدا کیا ہے، لیکن تمہاری فطرت شاید اس حد تک مسخ ہو گئی ہے کہ تم ان کے پاس جانے کی بجائے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ پوری کی پوری قوم اس کھلی بے حیائی میں اس طرح شریک ہے کہ ہر شخص اس بری حرکت پر فخر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا یہ رویہ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت بڑے جاہل لوگ ہو۔ جاہل صرف ان پڑھ اور بے علم کو نہیں کہتے بلکہ اس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو جذبات اور خواہشاتِ نفس سے اس حد تک مغلوب ہو جائے کہ عقل و حواس کھو بیٹھے۔ اور اس قوم کا یقیناً یہی حال تھا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾

(پس نہیں تھا ان کی قوم کا جواب، مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ ۵۶)

Marfat.com

دلائل سے پسپائی

حضرت لوط علیہ السلام کی تنقید کا جواب تو ان کی قوم کے پاس بالکل نہ تھا۔ البتہ یہ حوصلہ بھی ان کے پاس نہ تھا کہ وہ اپنی برائیوں اور بے حیائیوں پر طعنہ زنی برداشت کرسکیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی تنقید سے بچنے کیلئے لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ لوط اور اس کے ساتھی اور گھر والے عجیب لوگ ہیں کہ اٹھتے بیٹھتے ہماری برائیوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ان کے سوا ساری قوم بدکردار لوگوں پر مشتمل ہے۔ صرف یہی پارسا لوگ ہیں۔ اب پوری قوم تو پارسا ہونے سے رہی، ان میں اور قوم میں جو خلیج حائل ہوگئی ہے اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ان کو اپنی بستیوں سے نکال دو۔ یہ نہ ہمیں دیکھیں گے اور نہ ہم پر تنقید کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی قوم برائی میں اس حد تک اتر جاتی ہے کہ وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے تو پھر اس کیلئے اپنی اصلاح کرنا تو ممکن نہیں رہتا، پھر وہ اصلاح کرنے والوں اور تنقید کرنے والوں کو خاموش کرنے کیلئے زہر آلود طعنوں سے کام چلاتی ہے۔ بے نمازوں میں کوئی نمازی گھس جائے تو اسے صوفی صوفی کہہ کر شرمندہ کیا جاتا ہے۔ اور اذان ہونے پر بجائے اس کے کہ وہ کچھ کہے پہلے ہی اسے نماز کیلئے جانے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ بے پردہ عورتوں میں کسی باپردہ عورت کا چلے جانا اس کے اپنے لئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کی طرف آنکھوں سے اشارے کئے جائیں گے، ہنسی اڑائی جائے گی، قدامت پرستی کے طعنے دیئے جائیں گے۔ چنانچہ باپردہ خاتون کو یہ خیال ہوگا کہ میں نے پردہ کر کے شاید کوئی گناہ کیا ہے۔ اور مقصود ان لوگوں کا یہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے ہمارے یہاں آ کر ہمارے رنگ کو پھیکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اسے یا تو نکو بنا دیا جائے اور یا اسے مجلس سے نکلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ غالب نے ٹھیک کہا:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ؗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۵۷﴾

(سو ہم نے اسے اور اس کے لوگوں کو نجات دے دی، بجز اس کی بیوی کے، ہم نے فیصلہ کر دیا
اس کے متعلق کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ ۵۷)

فیصلہ کن چیز ایمان اور کفر ہے

قوم لوط کا بگاڑ جب یہاں تک پہنچا کہ پیغمبر اور اس کے متعلقین بھی ان کیلئے ناقابلِ برداشت ہوگئے اور اس کو اپنی بستی سے نکالنے کی تدبیریں ہونے لگیں، تب اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی تفصیلات قرآنِ کریم نے بعض دیگر مواقع پر ذکر کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپؑ اپنے اہل کو لے کر رات ہوتے ہی گھر سے نکل جائیں۔ اہل سے مراد یہاں صرف اہلِ خانہ نہیں بلکہ آپؑ کے اہل و عیال اور اتباع و صحابہ سب مراد ہیں۔ اور پیچھے پلٹ کر نہ دیکھیں۔ البتہ آپؑ کی بیوی آپؑ کے ساتھ نہیں جائے گی ہم نے اسے کے بارے میں طے کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ یعنی آپؑ کی قوم پتھروں کے جس عذاب کا شکار ہونے والی ہے آپ کی بیوی بھی ان میں شامل ہے۔ کیونکہ یہ وہ بدنصیب خاتون ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کے نبی کی مصاحبت نصیب ہوئی لیکن اس کی ہمدردیاں اپنی نابکار قوم کے ساتھ رہیں۔ ایسی عورت تو دوسرے لوگوں سے زیادہ عذاب کی مستحق ہے۔

Marfat.com

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾

(اور ہم نے ان پر برسایا ایک ہولناک برسانا، پس کیا ہی بری بارش تھی ان لوگوں پر جنہیں ڈرایا گیا تھا۔ ۵۸)

قومِ لوط کا انجام

اس سے پہلے اس عذاب کی تفصیل گزر چکی ہے جس عذاب سے قومِ لوط کو تباہ کیا گیا۔ اور پھر جس طرح ان پر پتھر برسائے گئے اور ان کی بستیاں بھی تباہ کردی گئیں ان کو ایک ایسا عبرت کا نشان بنا دیا گیا جو بعد کی دنیا کیلئے دہلا دینے والا انجام تھا۔ اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول نے انہیں بار بار انذار کیا، لیکن انہوں نے اس پر کان دھرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾
اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ
قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ
الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾
اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾
اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ
بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا

Marfat.com

يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ
عِلْمُهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ قف بَلْ هُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْهَا قف بَلْ هُمْ
مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع

رکوع: ۵۔ (اے پیغمبر) کہہ دیجئے ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کیلئے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے برگزیدہ کیا، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک بنا رہے ہیں۔ ۵۹) بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغات اگائے، تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہِ راست سے انحراف اختیار کرنے والے ہیں۔ ٦٠) بھلا کس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے درمیان دریا رواں کر دیئے اور اس زمین کیلئے اس نے پہاڑوں کے لنگر بنا دیئے اور دو سمندروں کے درمیان اس نے پردہ ڈال دیا، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ٦١) بھلا کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے پکارے، اور اس کے دکھ کو دور کرتا ہے اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے، تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ ٦٢) بھلا وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور وہ کون ہے جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، بہت بالا اور برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ٦٣) بھلا کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا، اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، کہہ دیجئے کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ٦٤) کہہ دیجئے، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ جب اٹھائے جائیں گے۔ ٦٥) بلکہ گم ہو گیا ہے ان کا علم آخرت کے بارے میں، بلکہ وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ٦٦)

Marfat.com

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کیلئے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے برگزیدہ کیا، کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک بنا رہے ہیں۔ ۵۹)

خطبے کا آغاز اور آغازِ گفتگو کی تعلیم

یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے اور یہ آیتِ کریمہ آنے والے خطبے کی تمہید ہے۔ اس میں یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تقریر اور اپنی گفتگو کا آغاز کس طرح کرنا چاہئے۔ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی گئی ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے ان بندوں پر سلام بھیجا گیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا ہے۔ ان برگزیدہ بندوں میں چونکہ سب سے بالا قامت اور علوِ مرتبت کے حامل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس لئے مسلمانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ اپنی گفتگو اور تقریر کا آغاز حمد و ثناء اور نبی کریم ﷺ پر خصوصاً دیگر انبیائے کرام، صحابہ کرام اور آپ کے تمام متبعین پر عموماً درود و سلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ سے لے کر استعمار سے پہلے تک مسلمانوں کا یہی طریقہ رہا ہے اور اسلامی ذہنیت رکھنے والے لوگ آج بھی اسی پر عامل ہیں، لیکن جن لوگوں کے دماغوں پر بدیشی تہذیب اور زبان کا غلبہ ہے وہ اب اس طریقے کو ملائیت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کی تعلیم قرآنِ کریم نے دی اور نبی کریم ﷺ نے اسے معمول بنا کر اسلامی ثقافت کا حصہ بنا دیا۔

یہاں سے وہ آیات شروع ہو رہی ہیں جو خاتمۂ سورۃ کی آیات ہیں۔ اس لحاظ سے اس خطبے میں اوپر بیان کئے گئے واقعات کے نتائج بھی سامنے رکھ دیئے گئے ہیں اور قرآنِ کریم کی دعوتِ توحید آفاقی و انفسی دلائل کی قوت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اور سورۃ کے آغاز میں جس طرح مخالفین کے اصل سببِ انکار سے پردہ اٹھایا گیا تھا اس کو مزید دلائل سے مرصع فرما کر ذکر کیا گیا ہے۔

دو کردار اور ان کا انجام

اس آیتِ کریمہ میں بظاہر تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہے لیکن حقیقت میں یہ کہنا مقصود ہے کہ اوپر ہم نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان سے دو کردار سامنے آتے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے شکر گزار اور فرمانبردار رہے۔ حکومت و ریاست اور دولت و رفاہیت ان میں کسی قسم کا پندار یا تکبر پیدا کرنے کی بجائے عاجزی اور فروتنی کا ذریعہ بنی رہی۔ ان کی زندگیاں کامیابی و کامرانی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس کے سامنے عاجز بن کر رہتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں سربلند فرماتا ہے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے ترانے گونجتے ہیں اور اس کی حاکمیت کے غلغلے بلند ہوتے ہیں اور دلوں پر یہ بات نقش ہو جاتی ہے کہ ہر طرح کی حمد و ثناء اور ہر طرح کے شکر و سپاس کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور سلامتی و بقاء اور نیک نامی صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بن کر رہتے ہیں۔

دوسرا کردار ان لوگوں کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بیش بہا نعمتوں سے نوازا۔ حکومت و ریاست جیسی نعمت عطا کی۔ مال و دولت ان کے گھر کی لونڈی بنی رہی، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس حد تک ناشکری کی کہ خود خدا بن بیٹھے۔ ہر نعمت کو اپنی ملکیت سمجھا، خیر کی ہر قوت کو پامال کر کے رکھ دیا، علو و استکبار کی علامت بن کر لوگوں پر مظالم توڑے، اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی دعوت کو ہر ممکن طریقے

Marfat.com

سے روکنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہ جانے کتنے قوت کے مرکز تلاش کیے، اوتاروں اور دیوتاؤں کی پوجا کی، پتھر کے بت تراشے اور انہیں خدائی کے منصب پر فائز کر دیا۔ لیکن جب ان پر ان کی انہی حرکتوں اور تکذیبِ رسالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو نہ ان کے خدا اور دیوتا کام آئے اور نہ ان کی حکومت اور دولت انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکی۔

ان دونوں کرداروں کو سامنے رکھ کر خطبے کی تمہید کے طور پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا تمہارے معبودانِ باطل بہتر ہیں۔ پھر اس کے بعد مسلسل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کے ایک ایک کرشمے کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھا گیا ہے کہ بتاؤ یہ کام کس نے کیے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو پھر تم نے انہیں خدا کیوں بنا رکھا ہے۔ اس طرح سے یہ آیات ردِ شرک کیلئے بھی ہیں اور دہریوں کی دہریت کے ابطال کیلئے بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ اس آیت کی تلاوت فرماتے تو فوراً اس کے جواب میں فرماتے بَلِ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى وَ اَجَلُّ وَ اَكْرَمُ "نہیں بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا اور بزرگ و برتر ہے۔"

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

(بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغات اگائے، تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہِ راست سے انحراف اختیار کرنے والے ہیں۔ ۶۰)

استفہام کا مفہوم

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے زور کو سمجھنے کیلئے یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ سوالیہ جملوں میں مقصود ہمیشہ استفہام اور سوال و جواب نہیں ہوتا، بلکہ اتمامِ حجت اور زجر و تنبیہ بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہی دوسرا مقصود پیشِ نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متکلم پورے زورِ بیان کے ساتھ سوالیہ انداز میں حقائق کو پیش کرتا جاتا ہے اور مخاطب کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گویا اس کی تردید میں کچھ کہنے کیلئے کوئی گنجائش کسی کیلئے سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس اسلوب میں بعض دفعہ بعض اجزائے کلام حذف کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن متکلم کا زورِ کلام اس خلاء کو بھر دیتا ہے اور مخاطب خود سمجھ لیتا ہے کہ یہاں کیا کہا جا رہا ہے۔

الوہیت پر دلائل کے ضمن میں صفتِ تخلیق کی وضاحت

سب سے پہلا سوال یہ کیا گیا ہے کہ بتاؤ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ تم پر بارش کون برساتا ہے؟ مشرکینِ مکہ اور دیگر مشرکین اس کے جواب میں کبھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کام میں کوئی اور بھی شریک ہے۔ ان کی خاموشی پر پروردگار نے فرمایا کہ زمین و آسمان کی تخلیق اور آسمانوں سے پانی کا اتارا جانا یہ سب ہمارے فیضان کا نتیجہ ہے۔ ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بارش کے نزول کے بعد ہم نے زمین پر خوش منظر باغ بھی اگائے۔ تم اور تمہارے معبودانِ باطل مل کر بھی ایک درخت نہیں اگا سکتے۔

Marfat.com

بلکہ درخت کی ٹہنی اگر ٹوٹ جائے تو تم دوبارہ لگا نہیں سکتے جبکہ تمہاری زندگی کی بقاء ان مخلوقات کے سوا ممکن نہیں، تم آسمان کی چھت کے نیچے رہتے ہو، اس کی زمین پر تمہارا بسیرا ہے، اسی کے پیدا کردہ پانی سے تمہارا وجود بھی ہے اور تمہاری بقاء بھی، اسی کے باغات سے تمہیں سایہ بھی ملتا ہے اور پھل بھی کھاتے ہو، جبکہ ان کی تخلیق میں تمہارے کسی معبود کا دخل نہیں، تو پھر تم بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے۔ اگر ہے تو تمہارے کس کام کا۔ جو نہ تمہیں زندگی دے، نہ زندگی کے اسباب فراہم کرے، نہ تمہاری بقاء کا سامان کرے۔ تو پھر تم نے ایسی بیکار چیزوں کو معبود کیوں بنا رکھا ہے۔ پھر ان سے منہ پھیر کر اور جواب سے مایوس ہو کر اظہارِ بیزاری کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں سے کیا توقع رکھی جائے، ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ ہمیشہ راہِ راست سے عدول کرتے ہیں یعنی حق کے اتباع کی بجائے اس سے انحراف ان کا رویہ بن چکا ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

(بھلا کس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے درمیان دریا رواں کر دیئے اور اس زمین کیلئے اس نے پہاڑوں کے لنگر بنا دیئے اور دو سمندروں کے درمیان اس نے پردہ ڈال دیا، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ٦١)

زمین کے جائے قرار ہونے کی وضاحت اور اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمتیں

قرار کا معنی ہے مستقر یعنی ٹھہرنے کی جگہ۔ یعنی ایسی جگہ جہاں آدمی خوشی اور آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انسان اس زمین پر نہ جانے کب سے آباد ہے اور اس کے علاوہ بھی بے شمار مخلوقات اس زمین کے اوپر اور اس کی آغوش میں پل رہی ہیں۔ اور یہ زمین سب کیلئے سکون وقرار کی جگہ، گہوارہ اور بستر بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے جو لفظ استعمال کئے ہیں ان کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زمین کی ماہیت اور ہیئت پر غور کرے اور اس کی خصوصیات کو جانے، اور پھر انسانی ضروریات کا ادراک کرے تو وہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ پروردگار نے زمین کو کس طرح قرار کی جگہ بنایا ہے۔

سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ آغازِ تخلیق میں جب زمین آفتاب سے الگ ہوئی تھی تو اس کا درجۂ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے یعنی 12000 فارن ہائیٹ۔ جب یہ حرارت کم ہوتے ہوتے 4000 فارن ہائیٹ ہوگئی تو آکسیجن کی ایک خاص مقدار ہائیڈروجن کی طرف بھاگی اور پانی تیار ہوگیا۔ ان گیسوں کی مختلف مقادیر سے کروڑوں مرکبات تیار ہو سکتے ہیں۔ لیکن پانی ان کی صرف ایک ترکیب تقریباً دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے بنتا ہے اور باقی تمام مرکبات زہر ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اوزان ومقادیر کا یہ تعین خود بخود ہوگیا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کیمیسٹ کی دکان میں مفرد ادویہ از خود ایک دوسرے سے مل کر مرکب بن جائیں یا لکڑی کے تختے کشتی کی صورت اختیار کر لیں۔

زمین کے سلسلہ میں اس پر غور فرمائیں کہ یہ زمین کہاں سے آئی؟ ماہرینِ ارض نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ آج سے ہزارہا صدیاں پہلے ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زورِ کشش سے سورج کے چند ٹکڑے کٹ کر خلا میں گھومنے لگے ان میں سے ایک زمین تھی۔ ان ٹکڑوں کو قریب کے ستاروں نے کھینچ کر متوازن کر دیا۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے گرد جو 24 گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری آفتاب کے گرد جو 365 دن لیتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زمین کو آفتاب سے جدا ہوئے آج

Marfat.com

دوا رب صدیاں گزر چکی ہیں۔لیکن ان گردشوں میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آیا۔ورنہ علمائے ہیئت کے تمام حساب غلط ہو جاتے۔اپنے گرد زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے اور آفتاب کے گرد 68000 میل فی گھنٹہ کے حساب سے۔اگر اس کی پہلی رفتار کو دس گنا کم کر دیا جائے تو شب و روز دس گنا لمبے ہو جائیں گے۔جون میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گا اور جنوری کی اتنی ہی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی اور اگر اسے بڑھا دیا جائے تو ہر شے کا وزن کم ہوتا جائے گا۔اور جب یہ رفتار 16200 میل فی گھنٹہ تک پہنچے گی تو کسی چیز میں کوئی وزن نہیں رہے گا۔ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا درختوں اور مکانوں کو گرا دے گا اور ہاکی کا بال ہٹ ہونے کے بعد ہوا میں اڑ جائے گا اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔

زمین کا وزن پانچ ارب بلین ٹن ہے اگر آدھا ہوتا تو کششِ ثقل نصف رہ جاتی اور اشیاء کا وزن آدھا ہو جاتا اگر یہ وزن دوگنا ہوتا تو ہر چیز کا وزن ڈبل ہو جاتا۔

زمین سورج سے تقریباً 9 کروڑ 29 لاکھ میل دور ہے۔اگر یہ فاصلہ کم ہوتا تو ہم گرمی سے مرجاتے اور زیادہ ہوتا تو سردی سے مرجاتے۔کرہ زمین کا رخ آفتاب کی طرف بالکل سیدھا نہیں بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف جھکا ہوا ہے۔یہی جھکاؤ موسموں کا سبب ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر دن پچھلے دن جیسا ہوتا اور ہم سردی، گرمی، بہار اور برسات کے مناظر، غذاؤں اور پھلوں سے محروم رہ جاتے۔

آغازِ آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو دو گیسیں یعنی نائٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہوگئیں۔نائٹروجن کی مقدار 78.3 تھی اور آکسیجن کی 20.99۔آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے۔اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی تو آسمانی بجلی کے ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار سے نصف ہوتی تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔کرہ ہوا میں ذراتِ گرد آبی بخارات اور گیسوں کی وجہ سے کچھ کثافت ہو جاتی ہے۔اگر یہ نہ ہوتا تو لاتعداد شہاب جو کثیف ہوا کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں ہم پر اتنے شرر اور پتھر برساتے کہ زندگی ختم ہو جاتی۔

انسان کی دوسری فوری اور ناگزیر ضرورت پانی ہے۔زمین کو انسان کے قرارگاہ بنانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر طرف پانی کی بہم رسانی کیلئے ندیاں رواں کر دی ہیں۔آدمی پانی کی حقیقت پر غور کرے اور پھر اس کے فوائد کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں نظر آتی ہے۔جس کے آئینے میں انسان اپنے پروردگار کو دیکھ سکتا ہے۔یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر فراخی اور وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پانی کے خزانے پیدا فرمائے اور زمین کی تخلیق کے ساتھ جب پانی کو پیدا فرمایا گیا تو کس طرح قیامت تک کی مخلوقات کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا' نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے لیکن آج تک پانی کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور پھر چونکہ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے انسان کبھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا اس لئے ہوا کے بعد اس کے ناپیدا کنار سمندر پیدا فرمائے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پانی کا پہنچنا آسان نہیں کیا گیا۔کہیں سمندروں کو پیدا کیا گیا، کہیں چشمے جاری کر دیئے گئے اور پھر ساتھ ساتھ یہ انتظام فرمایا کہ سردیوں میں پہاڑوں پر برف جما کر گرمیوں میں اسے پگھلا کر زمین کی آبیاری کا سامان کیا گیا اور پھر ایک ایسا حیرت انگیز انتظام دیکھنے میں آتا ہے کہ سمندر سے بھاپ اٹھا کر بادلوں کی چادریں بچھائی جاتی ہیں اور انہیں اس طرح برسایا جاتا ہے کہ زمین کا ایک ایک گوشہ اس سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ سارا پانی زمین میں جذب ہو جائے اور زمین دلدل بن جائے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ سارا پانی بہہ جائے اور ندی نالوں میں پہنچ جائے اور زمین مناسب آبیاری سے محروم رہ جائے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ ضرورت کے مطابق ہم پانی زمین میں جذب کرتے ہیں جہاں مزید ضرورت ہوتی ہے اس کو روک دیتے ہیں اور باقی پانی ہم ندی نالوں اور جدولوں کی شکل میں واپس دریاؤں سمندروں میں لے جاتے ہیں اور پھر پانی کے اوصاف کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ اپنے رب کی یاد آنے لگتی ہے۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

Marfat.com

1۔ پانی کو سیال پیدا کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس سے پیاس بجھتی نہ کپڑے صاف ہوتے اور نہ کھیتیاں سیراب ہوتیں۔

2۔ جب پانی جمنے لگتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں حرارت خارج کرتا ہے جس سے نیچے کا پانی متاثر ہوتا اور غیر منجمد رہتا ہے۔ اگر سردیوں میں سارا پانی جم جاتا تو تمام مچھلیاں اور پانی کے دیگر جانور مر جاتے۔

3۔ برف پانی سے ہلکی ہوتی ہے یہ پانی کی سطح پر رہ کر نیچے کے پانی کو انجماد سے بچاتی ہے۔

4۔ اگر سمندر منجمد ہوتے تو دنیا سردی سے ہلاک ہو جاتی۔ اگر ابل رہے ہوتے تو گرمی سے مرجاتی۔ اس کا اعتدال ہی بقائے حیات کا باعث ہے۔

یہ کُرّہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ایک حالت پر رکھنے کیلئے پروردگار نے پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں۔ اگر پروردگار پہاڑوں کے لنگروں سے زمین کو ایک حالت پر رکھنے کا انتظام نہ فرماتا تو یہاں آبادی کا امکان تک نہ ہوتا۔ ہر وقت اسی قسم کے جھٹکے آتے رہتے جس کا مشاہدہ ہم گاہے گاہے زلزلہ کی صورت میں کرتے ہیں جن کی وجہ سے آنِ واحد میں فلک بوس عمارتیں اور گنجان آبادیاں پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت سے پہاڑوں کے کیل گاڑ کر اس کا توازن ایسا برقرار رکھا ہے کہ وہ اپنی طبعی حرکت سے متحرک ہونے کے باوجود کسی اضطراب کا باعث نہیں بنتی۔

عجیب بات یہ ہے کہ زمین پر میٹھے اور کھاری پانی کے ذخیرے موجود ہیں مگر آپس میں خلط ملط نہیں ہوتے۔ زیرِ زمین پانی کی سوتیں بسا اوقات ایک ہی علاقے میں کھاری پانی الگ اور میٹھا پانی الگ لے کر چلتی ہیں۔ کھاری پانی کے سمندر تک میں بعض مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے موجود ہیں اور ان کا بہاؤ سمندر کے پانی سے اس طرح الگ ہوتا ہے کہ اس کی اچھلتی ہوئی موجوں سے بحری مسافر پینے کیلئے پانی حاصل کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائب وغرائب کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ چند مناسبتیں ہیں جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کیلئے جائے قرار بنی ہوئی ہے۔ ان سب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار سوال فرماتے ہیں کہ کیا یہ سب کچھ محض ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود وجود میں آ گیا ہے اور یہ مناسبتیں خود بخود قائم ہو گئی ہیں یا کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کا نتیجہ ہے۔ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سے بھی عقل دے رکھی ہے وہ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا ہے یا اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور روبہ عمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا یا جن یا نبی وولی یا کسی فرشتے کا دخل ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان کے اکثر لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ ﴿۶۲﴾

(بھلا کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے پکارے، اور اس کے دکھ کو دور کرتا ہے اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے، تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ ۶۲)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی صفت اجابتِ مضطر، کشفُ السوءاور زمین میں جانشینی کی وضاحت

اللہ تعالیٰ اپنی توحید پر دلائل قائم کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اسے معبود مانتا ہے جو بے قراری اور اضطراب کی حالت میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہے۔ جب ہر سہارا جواب دے جاتا ہے تو وہ اس کا سہارا بنتا ہے۔ اور اسباب سے ماورا اس طرح اس کے کام آتا ہے کہ اس کا اسے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے تم بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہاری دعائیں کون سنتا اور تمہاری پریشانیوں کو کون دور کرتا ہے۔ جس طرح انسان فطری طور پر اضطراری حالت میں اس ذات کو پکارتا ہے جسے وہ اپنا معبود سمجھتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی عالمگیر حقیقت ہے کہ انسان نے اپنے تمام تر مشرکانہ رویئے کے باوجود اپنی انتہائی اضطراری اور بے قراری کی حالت میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو پکارا۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت کی آواز ہے، کہ جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے آواز آتی ہے کہ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی کام آنے والا نہیں۔ مشرکینِ عرب کا بھی یہی رویہ تھا۔ وہ عام حالات میں کبھی اپنے بتوں کو پکارتے اور کبھی جنوں کو۔ لیکن جب ان کی کشتیاں بھنور میں ڈولنے لگتیں اور بچنے سے ناامیدی ہو جاتی تو پھر وہ صرف اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعہ سے عکرمہ بن ابوجہل کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر مایوسی میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا تو پھر یہی تو وہ بات ہے جو سالہا سال سے ہمیں محمد (ﷺ) سمجھا رہے ہیں اور ہم نے آج تک پوری قوت سے ان کی اس بات کو رد کیا ہے۔ لیکن ہمارا اپنا رویہ بتاتا ہے کہ حقیقت وہی ہے جس کی طرف وہ دعوت دے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ مکے کی طرف پلٹے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات صرف مشرکینِ عرب ہی تک محدود نہیں ہے، دنیا بھر کے منکرین و مشرکین کا بالعموم یہی حال ہے۔ حتیٰ کہ روس کے منکرینِ خدا جنھوں نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ کائنات کا خدا کوئی نہیں، اپنی تمام ابلاغی اور نشریاتی قوتوں کو صرف کر ڈالا۔ لیکن ان پر بھی جب گزشتہ جنگِ عظیم میں جرمن فوجوں کا دباؤ بڑھا تو انہیں خدا کو پکارنے کی ضرورت محسوس ہو گئی۔

آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جو کسی پریشان حال اور بے قرار کی پریشانی میں دعاؤں کو سنتا اور اس کے دکھوں کو دور کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ دعاؤں کو سن کر اپنی مشیت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ کبھی تو درخواست کرنے والے کا دکھ درد اسی وقت دور کر دیا جاتا ہے، لیکن کبھی یہ فریادرسی اس وقت کی جاتی ہے جب اس کا موزوں تر وقت آتا ہے۔ اور کبھی دعا کی قبولیت مانگنے والے کی چاہت کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف اور بہتر شکل میں کی جاتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں دعائیں روک لی جاتی ہیں اور آخرت میں ان کا ایسا اجر دیا جائے گا کہ دعا مانگنے والا یہ چاہے گا کہ کاش میری ساری دعاؤں کا صلہ آج ہی دیا جاتا۔

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ ہی ہے جو تمہیں زمین میں خلافت اور جانشینی سے نوازتا ہے۔ یعنی تم خود دیکھتے ہو کہ ایک قوم مٹتی اور دوسری قوم اس کی جگہ لیتی ہے۔ یہ قوموں کی تبدیلی نہ اتفاقی واقعات ہیں نہ اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا قادر ہے۔ قریش کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ آج تم کو اس سرزمین پر جو اقتدار حاصل ہے تو یہ تمہارا اپنا حاصل کردہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس نے تمہیں اس سرزمین میں اگلوں کے بعد نہ صرف بسایا بلکہ تمہیں اس سرزمین پر اقتدار بھی بخشا، تاکہ تم اپنی مرضی سے جو چاہو تصرف کرو۔ لیکن یہ مت بھولو کہ جس نے تمہیں اس سرزمین کی رہائش اور یہاں کے اختیارات عطا کئے ہیں وہ تم سے ایک دن باز پرس بھی کرے گا۔

Marfat.com

بے قرار لوگوں کی فریاد سننا، دکھی لوگوں کے دکھ دور کرنا اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اٹھا کھڑا کرنا اور انہیں زمین پر تصرف کا موقع دینا، کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی یہ کام کرسکتا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو تم کس قدر سنگدل اور کم عقل واقع ہوئے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾

(بھلا وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور وہ کون ہے جو ہواؤں کو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، بہت بالا اور برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ ۶۳)

اس میں دو سوالات کئے گئے ہیں، پہلا سوال خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں ہدایت دینے یعنی راستہ دکھانے کا ہے۔ اور دوسرا سوال موسمی ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی بشارت بنا کر بھیجنے سے متعلق ہے۔ دونوں سوالوں کا مفہوم بہت سادہ بھی ہے اور گہرا بھی۔ پہلے سوال کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں راستہ دکھانے کیلئے نشانات گاڑ رکھے ہیں۔ زمین کی مختلف علامتیں اور آفتاب کے طلوع وغروب کی سمتیں راستہ معلوم کرنے میں مدد کرتی ہیں اور آسمان میں ستاروں کے قمقمے لگا دیئے ہیں جو خشکی اور تری دونوں کی تاریکیوں میں مسافروں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا گہرا مفہوم تفصیل کا طالب ہے۔

ہدایت کا وسیع مفہوم اور اس کے مدارج

حقیقت یہ ہے کہ تکوین وجود اور تکمیل وجود کے چار مراحل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا پھر اس کا تسویہ کیا، پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کردی اور پھر اسے اس کی تقدیر کے مطابق زندگی اور معیشت کی راہ پر چلنے کا طریقہ سکھایا۔ یعنی ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چار طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ نباتات میں یہ ہدایت فطری رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جس کے نتیجے میں بیلیں زمین پر پھیلتی، پودے سر اٹھاتے اور درخت تن کر کھڑے ہوتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ہدایت کے مطابق برگ وبار لاتا اور پھل اور پھول دیتا ہے۔ لیکن حیوانات میں ہم اس فطری ہدایت کو اندرونی الہام کی شکل میں دیکھتے ہیں کہ ہر حیوان کا بچہ ادھر پیدا ہوتا ہے ادھر کوئی الہام کرنے والا اسے یہ الہام کرتا ہے کہ تیری غذا ماں کے سینے میں یا تیرے قریب ہی رکھ دی گئی ہے وہاں سے تجھے اس طرح حاصل کرنی ہے۔ چنانچہ ہم بلی کے بچے کو دیکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آنکھیں کھولی نہیں اور خارج کے مؤثرات نے اسے چھوا تک نہیں مگر وہ اپنی ماں کی چھاتی کو ٹٹولتا ہے اس پر منہ مارتا ہے اور پستان کو منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے اور بلی فرطِ محبت سے اسے چاٹ رہی ہے۔ آپ نے بلی کو دیکھا ہوگا جسے اس سے پہلے بچے کو جننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر جیسے ہی اس کے وضع حمل کے دن قریب آتے ہیں وہ الگ تھلگ کونے کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے اور پھر کسی الگ کونے کو عافیت کی جگہ سمجھتے ہوئے بیٹھ جاتی اور بچے جن دیتی ہے اور پھر وہ جس طرح اپنے بچوں کی نگہداشت کرتی اور ایک موہوم خطرہ محسوس کرتے ہوئے مختلف جگہیں بدلتی ہے یہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوئی اندرونی الہام ہے جو اسے ہر معاملہ کی ہدایت دے رہا ہے۔ خود انسان کا بچہ جو جانوروں کے بچوں سے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ:

Marfat.com

هُوَالَّذِیْ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِکُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَیْئًا

(وہ ذات ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے)۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں کی مامتا بے تاب ہو کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور وہ ماں کی چھاتی کے ساتھ منہ مارتا اور پستان منہ میں لے کر چوسنے لگتا ہے تا کہ اپنی غذا حاصل کرے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس بچے کو یہ کون سکھاتا ہے کہ تیری غذا ماں کی چھاتی میں ہے اور تجھے اس طرح اسے چوسنا ہے یہ وہ اندرونی الہام ہے جس کے ذریعے انسان کو سب سے پہلی ہدایت دی جاتی ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے عقل و فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں ادراک واحساس کی کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں جن کی زندگی و معیشت کیلئے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالدو تناسل اور ہدایت و نگرانی کے تمام فرائض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کیلئے ایک ہی طرح کی نہیں بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جیسی استعداد اس کے احوال کیلئے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوت شامہ نہایت دوررس ہوتی ہے اس لئے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کرتی ہے، چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں یہی وہ ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد کیا گیا ہے فرعون نے جب پوچھا:

فَمَنْ رَّبُّکُمَا یَامُوسٰی

(اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے؟)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّنَاالَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی

(ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اسے ہدایت دی، یعنی اس پر زندگی اور معیشت کی راہ کھول دی)۔

پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ راہِ عمل آسان کر دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ

(اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کیلئے ایک اندازہ ٹھہرادیا پھر اس پر زندگی اور عمل کی راہ آسان کر دی۔)

Marfat.com

ہدایت کے یہ دو مرتبے ہوئے جنہیں ہم ہدایتِ الہام اور ہدایتِ حواس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب کیلئے ہیں۔ الہام کی ہدایت انسان اور حیوان میں سعی وطلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ حواس کی ہدایت کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی قوتیں بخشتے ہیں اور انہی کے ذریعے ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ ہدایت ہمارے لئے معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ حیوان کیلئے تو ہدایت کے یہ دونوں مرتبے کافی ہیں۔ کیونکہ اسے زندگی کا جو طریقہ اور جو نصب العین سکھایا گیا ہے اس کیلئے کسی تیسرے مرتبۂ ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہدایت کا تیسرا مرتبہ

انسان کیلئے ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے لئے مجرد احساس کافی نہیں اور نہ صرف محسوسات کا علم اس کیلئے کفایت کرتا ہے۔ انسان کو تو استنباط اور استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ احکام کی بھی ضرورت ہے اور کلیات کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ کام صرف حواس کی ہدایت سے ممکن نہیں۔ اس لئے انسان کو ایک تیسرے مرتبۂ ہدایت سے نوازا گیا۔ یہ وہ ہے جسے جوہرِ عقل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جوہرِ عقل دراصل اسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں الہام و وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہرِ ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا انسان کے مرتبہ میں پہنچ کر درجہء کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے پکارا گیا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے ان تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور اگر اس مرتبہ سے ایک بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔ الہام کی ہدایت ہم میں طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ مطلوبات زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ کام حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے۔ اور اس طرح ہم اپنے وجود کے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں اور اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو یا فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دے لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط و استنتاج کی بھی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم کلیات وضع کرتے ہیں اور کلیات سے احکام نکالتے ہیں۔ اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

اسے مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ حواس تعمیر کے کام میں مزدوروں کی طرح ہیں۔ جن کا کام خام مواد مہیا کرنا، بکھری ہوئی چیزیں فراہم کرنا اور مسالہ بہم پہنچانا ہے اور عقل کی حیثیت ایک معمار کی ہے جس کا کام بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر ایک عمارت کی تشکیل دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حواس کے بعد عقل کا جوہر عطا نہ کیا جاتا تو ہماری بکھری ہوئی معلومات، ہمارے منتشر محسوسات، ہماری زندگی کے کسی شعبہ کیلئے معاون ثابت نہ ہوتے کیونکہ ان سے کام لینا، انہیں ترتیب دینا اور ان سے کلیات وضع کرنا اور پھر انؐ سے احکام استنباط کرنا عقل کا کام ہے اور عقل کی عدم موجودگی میں ظاہر ہے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا اور ہم زندگی کے میدان مین ناکام ہو جاتے۔ پھر ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ

Marfat.com

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وجدان اور فطری الہام کی نگرانی کیلئے حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے کیونکہ وجدان اور الہام غلطیوں سے مبرا نہیں۔ان کی تصحیح ونگرانی کیلئے ہمیں حواس کی راہنمائی کی ضرورت ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حواس کی راہنمائی بھی نارسائی کا شکار ہوتی ہے اور غلطیوں سے محفوظ بھی نہیں۔مثلاً ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتی ہے۔ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں لیکن ہماری قوت ذائقہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اس کا مزا کڑوا ہے۔ہم تالاب میں لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں لکڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے۔لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں اور ہمیں ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اب اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبۂ ہدایت کا وجود نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ ہم حواس کی درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پا سکتے لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔اگرچہ ہماری آنکھ اسے ایک سنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی ہے۔وہ ہمیں بتاتی ہے کہ شہد کا مزا ہر حال میں میٹھا ہے اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے منہ کا مزا بگڑ گیا ہے۔وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں۔اور ایسی حالت میں جو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔وہ خارج کی صدائیں نہیں خود ہمارے دماغ کی گونج ہوتی ہے۔گذشتہ معروضات میں آپ نے دیکھا کہ وجدان اور الہام کی ہدایت کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی۔کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے نہیں بڑھ سکتی تھی۔اور پھر حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی۔کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔اور اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ وہ غلطیوں اور نارسائیوں سے محفوظ بھی نہیں تھی۔ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دونوں کمزوریاں عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہیں۔کیونکہ عقل زندگی کے ہر شعبہ میں نہ تو مکمل رہنما ہے اور نہ بالکل صحیح راہنما ہے۔اس کا بھی ایک محدود دائرۂ عمل ہے۔جس سے یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔اور اس کی کارفرمائی بھی غلطیوں سے مبرا نہیں۔کیونکہ اس کا دائرۂ عمل جیسا کچھ بھی ہے وہ محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتا ہے۔جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی۔یہاں پہنچ کر عقل ایک قلم درماندہ ہو جاتی ہے اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔بقول اقبال:

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

یوں کہنا چاہئے کہ عقل ایک صحیح راہنما ہے۔لیکن مکمل نہیں۔غلطی ہماری ہے کہ ہم اسے ایک مکمل راہنما سمجھ کر زندگی کے ہر دائرۂ عمل میں اس سے راہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی آدمی نے کسی صراف سے یہ پوچھا کہ صراف میاں تمہارا ترازو کیسا ہے؟اس نے کہا بالکل صحیح ہے۔بالکل صحیح تولتا ہے۔ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔اس نے کہا اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر اس میں اپنی دکان تول کر دکھاؤ۔اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی یہ دکانیں تولنے کیلئے تھوڑی بنایا گیا ہے۔اس میں تو سونا چاندی تولتے ہیں۔اس نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا ترازو صحیح ہے۔اس نے کہا میں نے صحیح کہا تھا۔یہ غلطی میزان کی نہیں تمہاری ہے کہ تم اس میں وہ چیز تلوانا چاہتے ہو جو اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ہم بھی عقل سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔اس کا دائرۂ

Marfat.com

کار محسوسات تک محدود ہے۔طبیعات تک محدود ہے رہی یہ بات کہ محسوسات کے دائرہ کے پیچھے کیا ہے اور مابعد الطبعیات کیا ہے عالم لاہوت اور عالم الٰہیات کیا ہے، عالم ملکوت کا کیا حال ہے؟ عالم برزخ میں کیا ہو رہا ہے؟ عالمِ آخرت میں کیا ہوگا؟ موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ روح کس چیز کا نام ہے کائنات کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اخلاقی مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج وزوال کے اصل اسباب کیا ہیں؟ وہ اخلاقی نقطہ کیا ہے جس سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے اور پھر انسانیت پروان چڑھتی ہے؟ انسانیت کے مسلّمہ مسائل کا اجتماعی حل کیا ہے؟ انسان کے اندر بیٹھا ہوا انسان کس چیز سے مرتا اور کس چیز سے جیتا ہے؟ یہ وہ زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں جس سے پردہ اٹھانا عقل کی بساط سے باہر ہے۔لیکن جب ہم انہی چیزوں کا جواب عقل سے مانگتے ہیں تو ہم اس پر ایک ایسا بوجھ لاد دیتے ہیں جس کا تحمل اس میں نہیں ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے بالکل پیش پاافتادہ حقائق بھی انسانی عقل کی گرفت سے باہر معلوم ہوتے ہیں۔مثلاً آپ غور فرمائیے کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح گھرا ہوا، بلکہ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب بھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

جذبات تو پھر بھی ایک زوردار شے ہے۔وہم تو انسانی احساسات میں سے ایک کمزور حس کا درجہ رکھتا ہے۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات وہم جیسا کمزور جذبہ بھی عقل انسانی پر غالب آجاتا ہے۔عقل جانتی ہے کہ ایک انسان کو گذرنے کیلئے ایک فٹ یا زیادہ سے زیادہ دو تین فٹ چوڑی گزرگاہ کافی ہے۔اگر کسی عقل کے پرستار سے یہ پوچھا جائے کہ دریا کے اوپر گزرگاہ بنانے کیلئے کتنا چوڑا پل ہونا چاہیے تو وہ عقل کے مطابق اتنی ہی چوڑائی تجویز کرے گا۔لیکن اگر کسی عقل کے پرستار سے کسی ایسے پل پر سے گزرنے کو کہا جائے جو تین فٹ چوڑا ہو لیکن اس کے نیچے سے گزرنے والا دریا طغیانی پر آیا ہوا ہو جس کی موجیں اچھل کر دریا کے پل کو چھو رہی ہوں تو یہی عقل کا پرستار کبھی اس پل پر سے گزرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گذرنے سے صاف انکار کر دے گا۔غور فرمائیے کہ جس عقل کو جذبات اپنا اسیر بنالیں اور وہم اسے شکست دے دے وہ زندگی کے معاملات حل کرنے میں کہاں تک مؤثر ہو سکتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ عقل کے میزان ہونے اور مؤثر رہنما ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب اس کے دائرۂ کار سے باہر اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسے ایک مکمل رہنما سمجھ لیا جاتا ہے۔حالانکہ اس کی کمزوری کا عالم بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جذبات اور وہم کی زنجیروں سے آزاد کرنے سے بھی عاجز ہے۔یہاں تک تو معاملہ پھر بھی عقل کے مؤثر نہ ہونے کا ہے لیکن اس وقت تو معاملہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے جب عقل نہ صرف یہ کہ مؤثر نہیں رہتی بلکہ بعض دفعہ اپنی رہنمائی میں وہ غلط نتائج پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔یہ موقع وہ ہے جب عقل کو خواہشات کا غلام بنا دیا جاتا ہے انسان عجیب واقع ہوا ہے کہ وہ اصلاً ان خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بروئے کار لاتے ہوئے نام عقل کا رکھتا ہے۔حالانکہ اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو وہاں عمل دخل عقل کا نہیں بلکہ سراسر خواہشات کا ہوتا ہے۔یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمائی:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ

(کہ اگر حق ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہے وہ تباہ ہو جائے۔)

Marfat.com

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ فلسفۂ قانون میں فلاسفہ کا ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کا نمایاں نمائندہ مشہور ماہرِ قانون ڈاکٹر فرائیڈ مین ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کیلئے "دی لیگل تھیوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"عقل صرف انسانی جذبات وخواہشات کی غلام ہے اور اس کو انہی کا غلام ہونا بھی چاہئے۔ عقل کا اس کے سوا اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان جذبات کی بندگی اور ان کی اطاعت کرے۔"

پھر اس نظریے سے جو نتیجہ نکلنا چاہئے وہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"اس کے سوا ہر چیز یہاں تک کہ اچھے برے کے تصورات اور یہ الفاظ کہ فلاں کام ہونا چاہئے اور فلاں کام ہونے کے لائق ہے کلی طور پر جذباتی باتیں ہیں اور دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔"

ممکن ہے کہ آپ اسے محض ایک فلسفی کی بڑ سمجھیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں عقل کی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ عقل کی غلامی کی جا رہی ہے وہاں عملی زندگی میں یہی فلسفہ ہمیں حاکم دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاق کی ہر قدر رفتہ رفتہ شکست وریخت کا شکار ہے۔ رحم اتنی بڑی اخلاقی قدر ہے کہ شائد کوئی اس کا انکار نہ کرسکے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے بموں سے انسانیت پر جو ظلم ہوا انسانیت کی پیشانی آج بھی اس سے عرق آلود ہے۔ لیکن اندازہ فرمایئے کہ جب اس واقعہ کو خالصتاً عقل کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اسے ظلم کی بجائے رحم بنا دیا گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی علمی اور عالمی کتاب میں ان تباہ کاریوں کا ذکر بعد میں کیا گیا جو ایٹم بم کی بدولت ہیروشیما اور ناگاساکی میں برپا ہوئیں لیکن ایٹم بم کے تعارف میں یہ جملہ سب سے پہلے لکھا گیا ہے:

"سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ایٹم بم نے جنگ کو مختصر کرکے دس لاکھ امریکی سپاہیوں اور اڑھائی لاکھ برطانوی سپاہیوں کی جانیں بچائیں۔"

انداہ فرمایئے کہ اس قسم کی منطق میں کون سے ظلم وستم اور کون سی سفاکی ایسی ہے جسے عقل کے خلاف کہا جاسکے۔ اسی طرح شرم وحیاء انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے لیکن خالص عقل کے پیروکاروں نے جس طرح اس کی مٹی پلید کی ہے اور اس بنیادی قدر کو جس طرح انسانی زندگی سے خارج کردیا ہے اس کو سمجھنے کیلئے میں شرم وحیاء سے معذرت کے ساتھ آٹھ سو سالہ پرانی ایک مثال پیش کررہا ہوں۔

"تاریخ اسلام میں ایک فرقہ "باطنیہ" کے نام سے گزرا ہے۔ اس کا ایک مشہور لیڈر عبید اللہ القیر وانی اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

وما العجب من شئی کالعجب من رجل یدعی العقل ثم یکون له اخت او بنت حسناء ولیست له زوجة فی حسنها فیحرمها علی نفس وینکحها من اجنبی ولو عقل الجاهل لعلم انه احق باخته وبنته من الاجنبی وماوجه ذلک الاان صاحبهم حرم علیهما الطیبات. (الفرق بین الفرق لعبدالقاهر البغدادی)

"اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خود اس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے اوپر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے۔ حالانکہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حق دار ہیں۔ اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کو حرام کردیا ہے۔"

Marfat.com

آپ ممکن ہے کہ اسے آٹھ سو سالہ پرانی غیر ترقی یافتہ حالت کی عکاس سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں جس طرح عقلِ خالص کی پیروی میں اضافہ ہوا ہے اسی طرح اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار کی پامالی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج کے دور میں بہن سے نکاح باقاعدہ ایک نعرہ بن چکا ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں باقاعدہ اس کے حق میں جلوس نکالے گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اس بداخلاقی کو روکنے کے لئے میڈیکل سائنس کے حوالے سے یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ استلذاذ بالاقارب سے طبی نقصانات ہوتے ہیں۔ لیکن آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آ رہی ہیں انہوں نے نہ صرف ان طبی نقصانات کی توجیہ کو غلط ثابت کر دیا ہے بلکہ استلذاذ بالاقارب کو انہوں نے انسان کی فطری خواہش یعنی ہیومن ارج قرار دے کر انسان کا بنیادی حق تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اور اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر چکی ہے اور یہ اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابلِ نفرت خصلت جس کی وجہ سے قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ نہ صرف کوئی برائی نہیں رہی بلکہ اسے باقاعدہ ایک علم بنا دیا گیا ہے۔ آپ امریکہ کی لائبریریوں میں جائیں تو وہاں آپ کو اس برائی کے حق میں لکھی ہوئی کتابوں پر مشتمل علیحدہ سیکشن ملے گا جس کا عنوان ہوگا ''گے اسٹائل آف لائف''

چند سال پیشتر امریکی رسالے ٹائم نے لکھا کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اسلئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف امریکہ میں شور مچ رہا ہے۔ مظاہرے ہو رہے ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آپ نے جن لوگوں کو ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے فوج کے عہدوں سے برخاست کیا ہے یہ آپ نے ایک خلافِ عقل حرکت کی ہے۔ اس لئے ان کو دوبارہ بحال ہونا چاہئے اور اس کے حق میں دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ یہ ایک ہیومن ارج ہے اور ہیومن ارج کو دبایا نہیں جا سکتا اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے اور اب تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ بات صرف جنسِ انسانی کی نہیں رہی بلکہ اب تو جانوروں کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

حاصلِ بحث

اس تمام بحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اور حیوان کی زندگی کے تحفظ اور اس کو معیشت کی راہ پر لگانے کیلئے سب سے پہلے فطری رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایک خاص حد تک اپنا کام کرتی ہے۔ اس کے بعد باہر کی زندگی کی راہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے حواسِ خمسہ کی راہنمائی مہیا فرمائی۔ حواسِ خمسہ نے محسوسات کے دائرے میں رہ کر انسانی زندگی کو آگے بڑھایا۔ پھر جب انسان کے قدم محسوسات سے آگے بڑھے تو اسے عقل کی راہنمائی عطا فرمائی گئی۔ اب ہم نے تفصیل سے دیکھا کہ عقل انسان کی راہنمائی کیلئے بہت مؤثر رہنما ہونے کے باوجود اعمال کی درستگی اور انضباط کیلئے کافی نہیں۔ وہ قدم قدم پر جذبات کی اسیر ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ قوت واہمہ سے شکست کھا جاتی ہے اور اگر یہ جذبات ہوائے نفس کی لپیٹ میں آ جائیں تو پھر عقل نہ صرف اس کے سامنے بے دست و پا ہو جاتی ہے۔ بلکہ عموماً وہ ہوائے نفس کی وکالت کرنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ عقلی مسلمات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اب جس پروردگار نے قدم قدم پر حیوان اور انسان کی راہنمائی فرمائی کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان کو غلطان و پیچان چھوڑ دے کہ وہ ہوائے نفس کا شکار ہو کر اپنی زندگی اور آخرت تباہ کر لے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس پروردگار کی رحمت سے یہ بات یقیناً بعید ہے کہ وہ عقل کے بعد انسان کو کسی اور راہنمائی سے محروم فرما دے۔ بلکہ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جس طرح وجدان کے بعد حواس کی رہنمائی پروردگار نے عطا فرمائی اور حواس کے بعد عقل کی، اسی طرح اس نے اپنے ذمہ یہ بات لے رکھی ہے کہ عقل کے بعد زندگی کو رہنما سے محروم نہیں رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے جا بجا ان مراتب ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا
اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا

(ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا جسے ایک کے بعد ایک، مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں۔ پھر اسے ایسا بنادیا کہ سننے والا، دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اس پر راہِ عمل کھول دی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو یا ناشکرا۔ یعنی یا تو اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح وسعادت کی راہ اختیار کرے یا ان سے کام نہ لے اور گمراہ ہو جائے۔)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ

(کیا ہم نے اسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں) اور کیا اس کو ہم نے (سعادت وشقاوت کی) دونوں راہیں نہیں دکھادیں؟

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ

(اور اللہ نے تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیئے اور سوچنے کیلئے دل (عقل) تاکہ تم شکر گذار رہو (یعنی اللہ کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)

ان آیات اور ان کے ہم معنی آیات میں حواس اور مشاعر اور عقل وفکر کی ہدایت کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت وشقاوت کا ذکر کیا گیا ہے وحی ونبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

(بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔ یعنی دنیا وآخرت کی ضرورتوں کیلئے رہنمائی ہماری ذمہ داری ہے)

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى

(اور باقی رہی قوم ثمود، تو اسے بھی ہم نے راہ حق دکھلا دی تھی۔ لیکن اس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ اختیار کیا۔)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

(اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی تو ضروری ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں۔)

Marfat.com

انسانی زندگی کی ضرورتیں جہاں کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، لوگوں سے میل جول رکھنا، عناصر قدرت اور عناصر فطرت سے مستفید ہونا ہیں وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ باہمی میل جول کے آداب کیا ہیں، خود میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کے کیا فرائض اور کیا حقوق ہیں؟ شائستگی اور دل بستگی کیا ہے؟ ان کے آداب کیا ہیں؟ دوسروں کے مجھ پر حقوق کیا ہیں؟ ہمسائیگی کیا ہے؟ اخوت و محبت کسے کہتے ہیں؟ ماں باپ کا احترام کیا ہے؟ علم کس چیز کا نام ہے اور اس کی حدود کیا ہیں؟ عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے اور اس کی نزاکتیں کیا ہیں؟ محرم کسے کہتے ہیں اور نامحرم کون ہے؟ عبادات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ رہے گی یا ختم ہوجائیگی؟ اس کا انجام فنا ہے یا بقاء ہے؟ کیا کوئی دوسری دنیا بھی ہے؟ تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہوجاؤں گا؟ یہ عالم برزخ کیا ہے؟ اور عالم آخرت کیا ہے؟ اللہ کی صفات کیسی ہیں؟ وہ اگر ہمارا مالک ہے تو وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ قربانیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آدمی ایک دوسرے کے لئے ایثار کرتا ہے تو اس کا صلہ کیا ہوگا؟ اخلاقی مسلمات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کن کاموں سے زندہ ہوتی ہے اور کن کاموں سے مرجاتی ہے؟ اور اسی طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب انسان کو ملنا چاہئے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جواب نہ حواس کے پاس ہے اور نہ عقل کے پاس۔ اب اگر ہمیں اپنے محسوسات کی دنیا میں جوابات دینے کیلئے حواس و عقل کی راہنمائی دی گئی ہے تو کیا عالم ناسوت اور عالم ملکوت کی حقیقتوں کیلئے اور اپنی دنیا میں سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی کے لیے اور اس آنکھ کے پردے کے پیچھے کے حقائق کو جاننے کیلئے ہمیں کوئی راہنمائی نہیں دی جائے گی؟ اور ہم بے خبری میں غلط سلط فیصلے کرتے رہیں گے۔

یقیناً وہ ذات جس نے چیونٹی تک کی ضرورتیں پوری کی ہیں وہ انسان کو اس سے بے خبر نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ اس نے حواس و عقل کے ذریعے کے بعد ہمیں ایک اور ذریعۂ علم بھی بخشا جس کا نام وحی اور رسالت ہے اور اس وحی کے حاملین کو پیغمبر نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اس ذریعہ سے انسانوں کو وہ سب کچھ بتایا گیا جو اس کی دنیوی، اخروی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت تھی بلکہ اس ذریعہ علم کے ذریعے انسانوں کی دنیا بھی اور آخرت بھی تباہ ہونے سے بچالی گئی۔ تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں کتنی قومیں اس صفحہ ہستی پر قوت کا نشان بن کر اٹھیں لیکن اپنی اخلاقی بے راہ روی اور غلط فیصلوں کے نتیجے میں اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں۔ آسمانی کتابوں نے جابجا اس تاریخ کو بیان کیا ہے تاکہ انسان اس بات کو سمجھے کہ انسانی بقاء کا دارومدار اس کی اخلاقی زندگی اور توانائی پر ہے کیونکہ اخلاقی زندگی میں گراوٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ انسانیت سے تہی دامن کردیتی ہے۔ وہ شرم و حیاء سے عاری ہوکر کتوں، بلیوں کی سطح پر آجاتا ہے۔ رحم و مروت سے بے بہرہ ہوکر درندوں کی صف میں شامل ہوجاتا ہے۔ حرام و حلال سے بے گانہ ہوکر حشرات الارض کی جگہ نشے کی حالت میں گلی کوچوں مں پڑا دکھائی دیتا ہے۔ آخرت کی محبت سے محروم ہوکر اور حب دنیا کا اسیر بن کر بندۂ درہم و دینار بن جاتا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس ذریعۂ علم کو پہچانیں جسے وحی الٰہی کہا جاتا ہے اور ان کے حاملین کا راستہ اختیار کریں جنہیں پیغمبر اور رسول کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا میں بہت کچھ بدل گیا ہے اور بگڑ گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو جہاں تہاں بھی کوئی روشنی دکھائی دیتی ہے اور انسانیت کی نمود ملتی ہے وہ سراسر ان انبیاء کا ورثہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہم اس رہنمائی سے یکسر محروم رہ جاتے۔ (ماخوذ از خطباتِ مؤلف)

آیت میں دوسرے سوال کا جواب

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق اپنی مخلوقات پر اس قدر مہربان اور قریب ہے کہ جس طرح وہ خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں اپنی مخلوقات کو راستہ دکھاتا ہے۔ اسی طرح جب زمین سورج کی تپش اور دھوپ کی شدت سے جلنے لگتی ہے اور کہیں دور دور تک بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دیتا تو وہ زمین کے خشک ہوجانے کے بعد موسمی ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی

Marfat.com

بشارت بنا کر بھیجتا ہے اور پھر اس کا ابرِ کرم اس کی رحمت کو اس طرح چھم چھم برساتا ہے کہ جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ تم صرف ابرِ رحمت سے برسنے والی رحمت کے مزے لوٹتے ہو لیکن یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ بشارت بن کر آنے والی ہوائیں کس طرح بادلوں کے ٹکڑوں کو جمع کرتی ہیں، پھر ان کو کس طرح تہ بہ تہ گہرا کر دیتی ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو ان دبیز بادلوں کو جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے اور برسا دیتا ہے۔ اندازہ کیجئے آسمان، زمین، ابر، ہوا باہمی تخالف کی نسبت رکھتے ہیں، لیکن ان ہی عناصرِ مختلفہ کو توافق اور ہم آہنگی کی زنجیر میں کون باندھتا ہے۔ کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آسمانوں کا خدا الگ ہے اور زمین کا الگ۔ ابر کے دیوتا اور ہیں اور ہواؤں کے اور۔ اگر ایسا ہوتا تو ان اجزائے مختلفہ کو رحمت کا ذریعہ بننے پر کون مجبور کر سکتا۔ دیوتا آپس میں لڑتے، خداؤں کے ارادے باہم متصادم ہوتے تو بجائے ابرِ رحمت برسنے کے اہلِ زمین پر آگ برستی۔ جو شخص بھی اس صورتحال پر غور کرے گا وہ یقیناً اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کائنات کا ایک ہی معبود ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز اس کے تصرف میں ہے۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ مشرکین نہ جانے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو کیسے اِلٰہ مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار نے ٹھیک فرمایا کہ تم لوگ بہت کم نصیحت قبول کرتے اور بہت کم غور و فکر کرتے ہو۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

(بھلا کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا، اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، کہہ دیجئے کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ۶۴)

اللہ تعالیٰ کی صفت ابتداء خلق اور اعادۂ خلق کی وضاحت

یہ سادہ سی بات جس کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اپنے اندر ایسی تفصیلات رکھتی ہے کہ آدمی ان کی گہرائی میں جتنی دور تک اترتا جاتا ہے اتنے ہی وجودِ اِلٰہ اور وحدتِ اِلٰہ کے شواہد اسے ملتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو بجائے خود تخلیق ہی کو دیکھئے۔ انسان کا علم آج تک یہ راز نہیں پا سکا ہے کہ زندگی کیسے اور کہاں سے آتی ہے۔ اس وقت تک مسلّم سائنٹفک حقیقت یہی ہے کہ بے جان مادے کی محض ترکیب سے خود بخود جان پیدا نہیں ہو سکتی۔ حیات کی پیدائش کیلئے جتنے عوامل درکار ہیں ان سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (Law of Chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔ اب تک تجربی طریقے پر سائنس کے معملوں (Laboratories) میں بے جان مادے سے جاندار مادہ پیدا کرنے کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں، تمام ممکن تدابیر استعمال کرنے کے باوجود وہ سب قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز پیدا کی جا سکی ہے وہ صرف وہ مادہ ہے جسے اصطلاح میں (D.N.A) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مادہ ہے جو زندہ خلیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جوہر حیات تو ضرور ہے مگر خود جاندار نہیں ہے۔ زندگی اب بھی بجائے خود ایک معجزہ ہی ہے۔ جس کی کوئی علمی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکی کہ یہ ایک خالق کے امر و ارادہ اور منصوبے کا نتیجہ ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد آگے دیکھئے۔ زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً 10 لاکھ اور نباتات کی 2 لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں، اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج تک کہیں بھی دو نوعوں کے درمیان کی کوئی ایک کڑی بھی نہیں مل سکی ہے جو ایک نوع کی ساخت اور خصوصیات کا ڈھانچہ توڑ کر نکل آئی ہو اور ابھی دوسری نوع کی ساخت اور خصوصیات تک پہنچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ متحجرات (Fossils) کا پورا ریکارڈ اس کی نظیر سے خالی ہے اور موجودہ حیوانات میں بھی یہ خنثیٰ مشکل کہیں نہیں ملا ہے۔ آج تک کسی نوع کا جو فرد بھی ملا ہے، اپنی پوری صورتِ نوعیہ کے ساتھ ہی ملا ہے، اور ہر وہ افسانہ جو کسی مفقود کڑی کے بہم پہنچ جانے کا وقتاً فوقتاً سنا دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد حقائق اس کی ساری پھونک نکال دیتے ہیں۔ اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ ایک صانع حکیم، ایک خالق الباریٔ المصور ہی نے زندگی کو یہ لاکھوں متنوع صورتیں عطا کی ہیں۔

یہ تو ہے ابتدائے خلق کا معاملہ۔ اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجئے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظام العمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے اور کبھی جھوٹوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانہ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علم تناسل (Genetics) کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورت نوعیہ میں ممیز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (Cell) کے ایک حصہ میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقتور خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو حتماً اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی اپنی صورتِ نوعیہ کا راستہ ہے۔ اسی کی بدولت گیہوں کے ایک دانہ سے آج تک جتنے پودے بھی دنیا میں کہیں پیدا ہوئے ہیں انہوں نے گیہوں ہی پیدا کیا ہے، کسی آب و ہوا اور کسی ماحول میں یہ حادثہ کبھی رونما نہیں ہوا کہ دانۂ گندم کی نسل سے کوئی ایک ہی دانہ جو پیدا ہو جاتا۔ ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصور وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ خلق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوعی امتیازات اور موروثی خصوصیات کو اپنے ذرا سے وجود کے بھی محض ایک حصے میں لئے ہوئے ہوتا ہے، اور پھر اس انتہائی نازک اور پیچیدہ عضوی نظام اور بے انتہا لطیف و پر پیچ عملیات (Progresses) کو دیکھئے جن کی مدد سے ہر نوع کے ہر فرد کا تخم تناسل اسی نوع کا فرد وجود میں لاتا ہے، تو وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تصور نہیں

Marfat.com

کر سکتا کہ ایسا نازک اور پیچیدہ نظام العمل کبھی خود بخود بن سکتا ہے اور پھر مختلف انواع کے اربوں ملین افراد میں آپ سے آپ ٹھیک چلتا بھی رہ سکتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف اپنی ابتداء کیلئے ایک صانع حکیم چاہتی ہے بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کیلئے بھی ایک ناظم و مدبر اور ایک حیی وقیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کیلئے بھی ان کارخانوں کی نگرانی ورہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریئے کے انکارِ خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ کون احمق یہ گمان کر سکتا ہے کہ خدائی کے اس کام میں کوئی فرشتہ یا جن یا نبی یا ولی ذرہ برابر بھی کوئی حصہ رکھتا ہے۔ اور کون صاحب عقل آدمی تعصب سے پاک ہو کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ خلق واعادۂ خلق اس کمال حکمت ونظم کے ساتھ اتفاقاً شروع ہوا اور آپ سے آپ چلے جا رہا ہے۔ (تفہیم القرآن)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ رزاقی کی وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا سوال یہ کیا گیا ہے کہ تمہیں آسمان اور زمین میں رزق کون دیتا ہے؟ یہ سوال بظاہر بہت سادہ سا ہے لیکن حقیقت میں اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا دسترخوانِ ربوبیت صرف زمین پر ہی بچھا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت سمندروں اور آسمانوں تک دراز ہے۔ اور پھر اس دسترخوان سے فیض یاب ہونے والی مخلوقات میں صرف انسان نہیں بلکہ حیوانات کی لاکھوں انواع اور نباتات کی لاکھوں اجناس شامل ہیں۔ ان غذاؤں سے بہرہ ور ہونے والے حیوانات اور دیگر مخلوقات کے افراد اربوں سے بھی فزوں تر ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایک کی غذائی ضروریات الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ تمام کی غذائی ضروریات کا اندازہ کر سکے اور ان میں باہمی جو فرق پایا جاتا ہے اس کا تعین ہو سکے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کو اس کی ضرورت اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہ صرف غذا ملتی ہے بلکہ اس کی حفاظت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی مزید حیران کن بات یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے غذائی انتظام میں زمین اور آسمان کی اتنی مختلف قوتیں مل کر کام کرتی ہیں کہ جن کا شمار مشکل ہے۔ اور ان قوتوں میں بظاہر تخالف کی نسبت پائی جاتی ہے لیکن یہ اپنا فرض انجام دینے میں کامل ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ اگر کہیں ان کے توافق میں کمی آ جائے یا کہیں تناسب کمزور پڑ جائے تو غذا کا ایک ذرہ بھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسرائیلی روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر جب نبوت کی ذمہ داریاں تفویض کی جا رہی تھیں اور فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا جا رہا تھا تو آپؑ نے عرض کیا کہ پروردگار! میں پیچھے درے میں اپنے اہلِ خانہ کو چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں ان کی غذا اور سکونت کا کوئی انتظام کر لوں تو پھر عازمِ مصر ہوں گا۔ پروردگار نے فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم تمہارے اہلِ خانہ کی ضرورتوں سے غافل ہیں۔ حکم دیا کہ جس چٹان پر کھڑے ہو اس پر اپنا عصاء مارو۔ چٹان ٹوٹی تو اس کے نیچے ایک چھوٹی چٹان نظر آئی۔ فرمایا کہ اس پر بھی ضرب لگاؤ۔ اس کے نیچے ایک بڑا پتھر دکھائی دیا۔ فرمایا اسے بھی توڑو۔ جب وہ پتھر ٹوٹا تو اس کے اندر ایک جانور نظر آیا جس کے منہ میں تازہ گھاس کی پتی تھی اور وہ کھا رہا تھا۔ پروردگار نے فرمایا، موسیٰ یہ بھی ہماری مخلوق ہے، ہم تین پتھروں کے نیچے اسے دیکھتے اور اسے غذا مہیا کرتے ہیں۔ تو کیا تیرے اہلِ خانہ کی ضروریات کی ہم کفالت نہیں کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ رزق کا ایسا وسیع انتظام پروردگارِ عالم کی قدرت وحکمت کے سوا کسی اور کے بس میں کہاں۔ تم کس برتے پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو معبود بناتے ہو۔

Marfat.com

آخر میں فرمایا کہ یہ چند سوالات ہیں جن کا ہر اس شخص کو جواب دینا چاہئے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی جواب دینا چاہئے جو ان صفات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ ٦٥

(کہہ دیجئے، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ٦٥)

علمِ غیب کی حقیقت

گزشتہ آیات میں قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور الوہیت پر دلائل دیتے ہوئے اس کی چند صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ وہی ذات ہے جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے، جس نے آسمان سے پانی اتارا، جس نے زمین کو قوتِ روئیدگی بخشی اور جس نے خوش منظر اور خوش ذائقہ باغات پیدا کئے۔ جس نے اپنی بے شمار مخلوقات کیلئے زمین کو رہنے کے قابل بنایا، جس نے ان کے درمیان نہریں جاری کیں اور زمین کو ڈولنے سے بچانے کیلئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں۔ اور دو سمندروں کے درمیان میٹھے اور کھاری پانی کی دو روشیں جاری کیں اور دونوں کے درمیان غیر مرئی پردہ حائل کر دیا۔ پھر وہی ہے جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے، ہر پریشان حال کا دکھ دور کرتا ہے، زمین پر قوموں میں اکھاڑ بچھاڑ کرتا ہے اور ایک کو دوسرے کا جانشین بناتا ہے اور وہی ذات ہے جس نے بر و بحر کی تاریکیوں میں مخلوقات کی رہنمائی فرمائی۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق، تدبیر، رزاقی اور ربوبیت اور اس کی صفتِ ہدایت کو بیان کرنے کے بعد اب اس کے علمِ محیط کو بیان کر رہا ہے، کیونکہ ہر عقلمند آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو ذات ان صفات کے ساتھ موصوف ہے اور دنیا کا کارخانہ جس کی وجہ سے وجود میں آیا اور جس کی تدبیر سے رواں دواں ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ غیر معمولی علم سے آراستہ نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ رزاق ہے تو جب تک اسے لاکھوں انواع میں بٹے ہوئے حیوانوں اور لاکھوں انواع میں پھیلی ہوئی بیلوں کے بارے میں علم نہیں ہوگا تو اس کی صفتِ ربوبیت کس طرح ان کیلئے مفید ہو سکتی ہے۔ وہ اگر پریشان حالوں کو سہارا دیتا اور ان کی مشکلات کو دور کرتا ہے تو اگر اسے انسانوں کے احساسات اور ان کی فعلی اور انفعالی صلاحیتوں اور ان کی قوتِ ادراک اور اس کی تاثیر و تاثر کی کیفیتوں اور اس کے دل و دماغ کی مناسبتوں کا کامل علم نہیں ہوگا تو وہ دل دہی اور دل جوئی کا سامان کیسے کر سکتا ہے، اور انسان کے دکھوں کا تدارک کیسے کر سکتا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس اس کی ایک ایک صفت کو سامنے لائیے اور اس سے متعلق مخلوقات کا مراقبہ کیجئے اور پھر اس کی بے شمار انطباق کی شکلوں کا تصور کیجئے تو تب تھوڑا سا اندازہ ہوگا کہ جو ذات بھی اس طرح کی صفات کی مالک ہے وہ جب تک اس غیر معمولی علم سے آراستہ نہ ہو جس سے تمام مخلوقات تہی دامن ہے اور پھر جس کے علم کی وسعتیں بے کراں نہ ہوں وہ ظاہر ہے کہ اپنی مخلوقات کی نہ ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے اور نہ ان کیلئے رحمت ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرک قوموں نے جب بھی کسی کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کیا اور استمداد کیلئے ان کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو انہوں نے ہمیشہ شریک کی جانے والی قوتوں کے بارے میں یہ یقین کیا کہ وہ علم کی ان تمام وسعتوں سے آراستہ ہیں جو باقی مخلوقات کی رسائی سے باہر ہیں۔ اس لئے پروردگار نے اپنی صفات کو ذکر کرنے کے بعد ضروری سمجھا کہ یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب کے علم کو نہیں جانتا۔ عالم الغیب اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ لیکن مشرک قومیں ہمیشہ اس میں ٹھوکر کھاتی رہی ہیں۔ اور امتِ مسلمہ جس پر توحید کا ایک ایک گوشہ واضح کر دیا گیا ہے اس کے بعض افراد بھی

Marfat.com

افراط وتفریط میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہے۔اس لئے یہ بات جان لینی چاہئے کہ غیب اس علم کو کہتے ہیں جو حواس کی رسائی سے بالاتر ہو اور جسے قوتِ عقل سے حاصل نہ کیا جاسکے۔اور علامہ آلوسی کی وضاحت کے مطابق جو کسی کے بتانے سے حاصل نہ ہو۔جو علم کسی کے بتانے سے حاصل ہوگا چاہے بتانے والا پروردگار ہی کیوں نہ ہو اسے علمِ غیب نہیں کہا جاسکتا۔ورنہ تو آج ہر حافظِ قرآن اور ہر عالمِ دین کو جزواً یا کلاً عالم الغیب ماننا پڑے گا۔اسی طرح اہلِ علم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تمام صفات کی طرح اس کی یہ صفت بھی قدیم ہے،ذاتی ہے اور غیر متناہی ہے۔یعنی ایسا نہیں کہ وہ پہلے کسی چیز کو نہیں جانتا تھا اور اب جاننے لگا ہے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہر چیز کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی اس کی حینِ حیات میں بھی اور اس کے مرنے کے بعد بھی اپنے علمِ تفصیلی سے جانتا ہے۔اور یہ علم اس کو کسی نے سکھایا نہیں بلکہ یہ علم اس کا ذاتی علم ہے۔نیز اس کے علم کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایت۔اس لئے اہلسنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اولین وآخرین کا علم رکھنے کے باوجود آپ ؐ کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح قدیم نہیں بلکہ حادث ہے۔آپ ؐ کا علم ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے حاصل ہوا۔آپ ؐ کا علم غیر متناہی وغیر محدود نہیں۔آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق آپ ؐ کے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کے ساتھ اتنی بھی نہیں جتنی پانی کے ایک قطرہ کو دنیا بھر کے سمندروں سے ہے۔اسی بنیاد پر اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ٹھہرا کہ عالم الغیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اور جس قدر چاہے اپنی معلومات کا کوئی گوشہ کھول دے۔اور کسی غیب یا بعض غیوب کو اس پر روشن کردے۔لیکن علمِ غیب بحیثیتِ مجموعی کسی کو نصیب نہیں۔اور عالم الغیب ہونے کی صفت صرف اللہ رب العالمین کیلئے مخصوص ہے۔اس لئے فرمایا وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ ”اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں،انہیں کوئی نہیں جانتا اس کے سوا۔“ اور سورۃ لقمان آیت ۳۴ میں ارشاد فرمایا ”کہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے،اور وہی بارش نازل کرنے والا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا پرورش پارہا ہے اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ وہ کیا کمائی کرے گا اور کسی متنفس کو خبر نہیں ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئے گی۔“ قرآنِ کریم کی یہ تصریحات اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں رہنے دیتیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ کوئی دوسرا بھی جَمِيْعُ مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ کا علم رکھتا ہے،قطعاً ایک غیر اسلامی عقیدہ ہے۔بخاری اور مسلم اور تمام بڑی بڑی کتابوں نے صحیح سندوں کے ساتھ حضرت عائشہ ؓ کا یہ قول نقل کیا ہے،جس کا ترجمہ یہ ہے ”جس شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جانتے ہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے،اس نے اللہ پر سخت جھوٹ کا الزام لگایا،کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی!تم کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہے۔“ ابن المنذر حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے مشہور شاگرد حضرت عکرمہ ؒ سے ذکر کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا،یارسول اللہ!قیامت کب آئے گی؟اور ہمارے علاقے میں قحط برپا ہے،بارش کب ہوگی؟اور میری بیوی حاملہ ہے،وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی؟اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں نے آج کیا کمایا ہے لیکن یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کل میں کیا کماؤں گا۔اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں،یہ فرمایئے میں کہاں مروں گا؟ان سوالات کے جواب میں آپ ؐ نے سورۃ لقمان کی وہ آیت پڑھی جو اوپر گزر گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ باتوں کا علم کسی کو نہیں دیا۔اسی طرح حدیث جبرائیل میں جب آپ ؐ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟تو آپ ؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں پوچھنے والے سے زیادہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا۔یعنی نہ حضرت جبرائیل کو معلوم ہے کہ قیامت کب آئے گی اور نہ حضور ؐ جانتے ہیں۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا علم جس کی کوئی انتہا نہیں وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اس لئے اسے علم کہا جاتا ہے،علمِ غیب نہیں کہا جاتا۔اسی طرح آپ ؐ کا علم عطائی ہے،ذاتی

Marfat.com

نہیں۔ جزوی ہے کلی نہیں۔ حادث ہے قدیم نہیں۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ علم دیا گیا ہے اور قیامت میں مزید دیا جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں آپؐ کا علم اتنا بھی نہیں جتنا سوئی کے ناکے کو سمندر میں ڈبونے کے بعد پانی ناکے میں لگا رہ جاتا ہے۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ کے علم کو عام لوگوں کے علم کی حدود میں محدود کرتے ہیں وہ گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور جو آپؐ کے علم کو لامحدود بتاتے ہیں، وہ شرک کی وادی میں داخل ہوجاتے ہیں کیونکہ لامحدود علم صرف اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ واللہ اعلم۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلۡمُھُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ ۚ بَلۡ ھُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡھَا ۫ بَلۡ ھُمۡ مِّنۡھَا عَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾

(بلکہ گم ہوگیا ہے ان کا علم آخرت کے بارے میں، بلکہ وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں، بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ۶۶)

اِدّٰرَکَ کی تحقیق

اِدّٰرَکَ ...... اصل تَدٰرَکَ ہے۔ تا کو دال میں ادغام کیا اور ہمزہ کو بڑھا دیا تاکہ ساکن سے ابتداء نہ ہو۔ جس طرح تَثَاقَلَ سے اِثَّاقَلَ بن گیا۔ امام فخر الدین رازی اس کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا معنی انتہا کو پہنچنا، فنا ہوجانا ہے۔ جب پھل پک جاتا ہے اور توڑنے کے قابل ہوجاتا ہے تو عرب کہتے ہیں ادرکت الثمرة "پھل نے اپنی پختگی کی نہایت کو پالیا" ایسی صورت میں دو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ درخت پر پھل جب اپنی پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو گھنا ہو کر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ اس سے اہلِ لغت نے یہ سمجھا کہ اس سے اختلاط اور گڈ مڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا ہے اور دوسری کیفیت یہ پیدا ہوتی ہے کہ پھل پک جانے کے بعد توڑ دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنی شاخ پر لٹکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تو اس سے بعض اہلِ لغت کے نزدیک گم ہوجانے کا معنی پیدا ہوگیا۔ اس طرح سے آیت کے پہلے جملے کا ترجمہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ آخرت کے باب میں ان کا علم الجھا ہوا ہے۔ اور اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان کا علم آخرت کے متعلق گم ہوگیا ہے۔ اس لئے حضرت حسنؓ سے اس لفظ کا یہ مفہوم منقول ہے اضمحل علمھم یعنی قیامت کے متعلق ان کا علم مضمحل ہوگیا۔ یعنی وقوعِ قیامت پر انہیں یقین ہی نہ رہا۔ علامہ قرطبی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا بل ضل وغاب علمھم فی الاخرة فلیس لھم فیھا علم یعنی قیامت پر انہیں پختہ یقین ہے۔ دل ہی دل میں اس کے وقوع کو مانتے ہیں لیکن ہٹ دھرمی اور تعصب کے باعث اقرار کی جرأت نہیں کرسکتے۔

مشرکین کی اصل بیماری

الوہیت پر نہایت واضح دلائل قائم کرنے کے بعد مشرکین کے یکسو نہ ہونے کی وجہ بیان کی جارہی ہے، کہ اتنے مضبوط دلائل سے بھی ان کا شرک سے تائب نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں یکسو نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ وہ آخرت کے بارے میں شدید خلجان میں مبتلا ہیں۔ بنیادی طور پر یہ لوگ خواہشات کے پرستار ہیں۔ ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا چکے ہیں۔ دنیا کی محبت نے انہیں کسی بڑے فیصلے کے قابل نہیں چھوڑا۔ خواہشات کا اتباع چونکہ ان کی زندگی کا معمول بن گیا ہے اور آخرت پر یقین کرلینے سے ان کا یہ معمول باقی نہیں رہ سکتا۔ پھر انہیں ماننا پڑے گا کہ وہ خودرو پودوں کی طرح پیدا نہیں ہوئے کہ مل دل کے ختم ہوجائیں بلکہ ان کی زندگی کا ایک مقصد ہے۔ اور اسی مقصدیت کے حوالے سے ان سے ان کی زندگی کا حساب مانگا جائے گا۔ انہیں اپنے ایک ایک پل اور ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ یہ بات چونکہ ان

Marfat.com

طرزِ زندگی سے میل نہیں کھاتی، اس لئے وقوعِ قیامت کے بارے میں غیر سنجیدگی بلکہ خلجان کا شکار ہو گئے ہیں۔ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں انہوں نے کبھی سنجیدگی سے سوچنے کی زحمت نہیں کی۔ انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ان کے فلسفۂ حیات اور زندگی کے حقائق کے درمیان کوئی مطابقت ہے یا نہیں۔ چونکہ دلائل کا سامنا نہیں کر سکتے اس لئے کھل کر قیامت کا انکار نہیں کرتے۔ خواہشاتِ نفس سے آزادی کا حوصلہ نہیں اس لئے قیامت کا یقین نہیں کر سکتے۔ اس طرح سے وہ قیامت کے علم کے بارے میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اسی الجھاؤ کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مستقبل سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اندھوں کی طرح چلنا اپنا معمول بنا لیا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب کبھی انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے قیامت برپا ہو ہی جائے تو پھر شفاعت کا غلط عقیدہ ان کا سہارا بن جاتا ہے کہ اگر واقعی قیامت آ گئی تو یہ ہمارے دیوی دیوتا اور یا جن قوتوں کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ ہماری سفارش کر سکتی ہیں وہ ہماری سفارش کر کے ہمیں اللہ تعالیٰ سے چھڑا لیں گی، اس لئے ہمیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا
لَمُخْرَجُوْنَ ﴿٦٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ
هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ
فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ
صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِى السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى
بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ

Marfat.com

لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ
بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٨﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى
الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٧٩﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ
اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٨٠﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ وَاِذَا وَقَعَ
الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ
النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٨٢﴾

رکوع: ۶۔ (اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے؟ ۶۷) اس کی دھمکی ہمیں بھی دی گئی اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا کو بھی، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔ ۶۸) اے پیغمبر! ان سے کہئے، ذرا زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ ۶۹) اور اے پیغمبر! ان کے حال پر غم نہ کیجئے، اور نہ تنگی میں پڑیئے ان کی چالوں سے جو وہ چل رہے ہیں۔ ۷۰) وہ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی، اگر آپ سچے ہیں۔ ۷۱) کہہ دیجئے، ممکن ہے کہ جس چیز کیلئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمہارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ ۷۲) اور بیشک آپ کا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے، مگر ان میں کے اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۷۳) اور بلاشبہ آپ کا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴) اور آسمان و زمین میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح رجسٹر میں لکھی ہوئی نہ ہو۔ ۷۵) بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر ان بہت سی چیزوں کو بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ ۷۶) اور یہ (قرآن) ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کیلئے۔ ۷۷) بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے درمیان بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۷۸) اے نبی! آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں، بیشک آپ صریح حق پر ہیں۔ ۷۹) اے پیغمبر! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ آپ اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہیں۔ ۸۰) اور نہ آپ اندھوں کو ہدایت دینے والے ہیں ان کی گمراہی سے بچا کر، آپ تو اپنی بات انہیں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائیں پھر وہ فرمانبردار بن جائیں۔ ۸۱) اور جب ہماری بات ان پر پوری ہونے کا وقت آن پہنچے گا تو ہم ان کیلئے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے گفتگو کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ۸۲)

Marfat.com

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّ اٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا
هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

(اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ نکالے جائیں گے؟ ۶۷) اس کی دھمکی ہمیں بھی دی گئی اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا کو بھی، یہ محض اگلوں کے افسانے ہیں۔ ۶۸)

آخرت سے متعلق کفار کا رویہ

اس سے پہلے کی آیت میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ کفار کے غیر سنجیدہ رویئے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت سے گریز وفرار اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے نیازی اور لاپرواہی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ آخرت کے بارے میں یکسو نہ تھے۔ کبھی یکسر اس کا انکار کر دیتے، کبھی اقرار کرتے تو محض ایک وہمی آدمی کی طرح جو کسی بات کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس کی زندگی کے اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور ان کی اس غیر سنجیدہ روش نے انہیں دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس سے بالکل اندھا بنا کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے اسی غیر سنجیدہ رویئے کی وضاحت کرتے ہوئے پروردگار فرما رہے ہیں کہ یہ کافر لوگ وقوعِ قیامت میں شک کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہمیں مٹی میں دفن کر دیا جائے گا اور ایک مدت کے بعد زمین کی مٹی اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہمارے جسموں کو کھا جائے گی۔ ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر مٹی میں شامل ہو جائیں گی۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکے گا کہ یہاں کسی شخص کو دفن کیا گیا تھا۔ تو کیا اس وقت ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو مٹی سے نکالا جائے گا۔ یعنی کس قدر یہ بات بعید از عقل ہے کہ ہمارا جسم فنا ہو گیا، ہماری ہڈیاں تک گل سڑ گئیں، ہمارا وجود مٹ گیا اور ہمارے باپ دادا ہم سے پہلے اس انجام کو پہنچ چکے۔ یہ معروضی حالات کی شہادت ہے جو ہمیں آپ کی اس بات کو قبول کرنے سے مانع ہے۔

قیامت کا چرچا نیا نہیں

دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے بارے میں جو کچھ آپ ہم سے کہہ رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں، ہم قیامت کی آمد کا چرچا بہت دنوں سے سن رہے ہیں۔ جس طرح آج ہمیں اس سے ڈرایا جا رہا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو بھی اسی طرح اس سے ڈرایا گیا، لیکن قیامت کو نہ آنا تھا، نہ آئی۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے دعوے محض افسانے ہیں جو ہر زمانے میں دہرائے گئے ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ غالب نے جنت کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے اسے دل بہلاوا قرار دیا تھا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

عرب کے منکرین قیامت بھی اسے ڈراوے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ پروردگار نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

Marfat.com

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٦٩﴾

(اے پیغمبر! ان سے کہئے، ذرا زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ ۶۹)

عذاب کا ثبوت تاریخ کی روشنی میں

قریش نے وقوعِ قیامت کو بعید از عقل قرار دیا اور قیامت کی خبر کو ڈراوا ٹھہرایا۔ چنانچہ ان کی دونوں باتوں کا جواب دیتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ جہاں تک اس کے بعید از عقل ہونے کا تعلق ہے اس کا جواب تو تمہاری نظروں اور عقلوں کے سامنے ہے۔ تم عاد و ثمود اور قومِ لوط کی بستیوں سے گزرتے ہو۔ ان کا ایک ایک کھنڈر اور ایک ایک منظر اپنی زبان سے بول رہا ہے کہ وہ کتنے بڑے عذاب کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور یہ عذاب ان پر صرف اس لئے آیا کہ وہ انکار و تمرد، فسق و فجور اور ظلم و ستم کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ جو شخص ان کی بستیوں کی رونق اور وہاں کے رہنے والوں کی مستیوں کو دیکھتا تو وہ کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہاں چند دنوں کے بعد موت کا بسیرا ہو گا۔ انہیں بار بار اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا، لیکن انہوں نے محض اسے ایک مذاق اور ڈراوا سمجھا اور اس کے وقوع کو بعید از عقل قرار دیا۔ اور آج ان کے کھنڈرات ان کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

معذب قوموں کے عذاب سے استدلال

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ معذب قوموں کا انجام کیا اس بات پر دلالت نہیں کر رہا کہ یہ کائنات بے شعور طاقتوں کی اندھی بہری فرمانروائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانونِ مکافات کام کر رہا ہے۔ چونکہ اصل دار الجزاء قیامت کے دن کو ٹھہرایا گیا ہے اس لئے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات نہ جلدی حرکت میں آتا ہے اور نہ مکمل طور پر نافذ کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ بار بار سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ جو شخص یا جو قوم بدکرداری کے راستے پر چل نکلتی ہے اسے ایک خاص حد تک برداشت کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے بالکل کھلی چھٹی نہیں دے دی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اپنا پیمانہ ہے جب وہ چھلک جاتا ہے تو بدکردار اور ظالم قومیں یہاں بھی پکڑی جاتی ہیں۔ لیکن اس گرفت سے پہلے ان کے پیدا کردہ فساد نے جن لوگوں کو نشانہ بنایا ہوتا ہے اور وہ اسی طرح دنیا سے چلے جاتے ہیں، ان پر ہونے والے مظالم تقاضا کرتے ہیں کہ فسق و فجور اور ظلم کا پیمانہ بھرنے سے پہلے پہلے جو لوگ دنیا سے جا چکے ہیں انہیں بھی قانونِ مکافات کے تحت گرفت میں آنا چاہئے۔ چنانچہ اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ قیامت وقوع پذیر ہو، اور وہ پوری طرح قانونِ مکافات کو عملی جامہ پہنائے۔ تاکہ ہر مظلوم کو اس پر کئے جانے والے ظلم کا بدلہ ملے۔ اور ہر ظالم اپنے ظلم کی پاداش میں پکڑا جائے۔

فسق و فجور کا سبب آخرت سے انکار ہے

اس آیتِ کریمہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں حقائق سے جس طرح گریز و فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے اور فسق و فجور اور ظلم و ستم میں بڑھتا چلا جاتا ہے اس کا بنیادی سبب آخرت کا انکار ہے۔ کیونکہ اس آیتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے جن معذب قوموں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے انجام پر غور کرو اور ان پر آنے والے عذاب کی علت تلاش کرو۔ تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان قوموں پر عذاب لائے جانے کی علت ان کی گمراہیاں اور بدکرداریاں تھیں اور ان کی بدکرداریوں کے پیدا ہونے اور پھر بیش از بیش

Marfat.com

بڑھتے چلے جانے کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ کسی آنے والے دن کو جسے دارالجزاء قرار دیا جائے اور جس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کرنا پڑے اور جس میں آدمی کے اعمال کا حساب کتاب ہو، ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ اسی انکارِ آخرت نے انہیں غلط راستے پر ڈالا اور اسی پر بڑھتے چلے جانے کا حوصلہ دیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر انسانوں کو اپنے رویئے کی اصلاح کرنا ہے اور اپنے حالات کو درست کرنے کی فکر ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ قیامت کی حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور اس کے آنے کا یقین پیدا کیا جائے۔ کیونکہ اسی یقین کی وجہ سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے اور اس سے انکار یا اس میں شک وشبہ انسانی زندگی کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیتا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

(اور اے پیغمبر! ان کے حال پر غم نہ کیجئے، اور نہ تنگی میں پڑیئے ان کی چالوں سے جو وہ چل رہے ہیں۔ ۷۰)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

آنحضرت ﷺ کو دو حوالوں سے تسلی دی جارہی ہے۔ پہلا حوالہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کافر اور مشرک لوگ آپؐ کی دعوت کے انکار بلکہ عناد میں بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ آپؐ کی شب وروز کی کوششوں سے بجائے اس کے کہ ان میں کوئی صالح تبدیلی آتی، ان کی ضد اور مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ آپؐ کی تمام تر ہمدردیاں اور غمگساریاں ان سنگدلوں میں نرمی کا باعث ثابت نہیں ہورہیں۔ یہ صورتحال آپؐ کیلئے انتہائی تشویش اور اذیت کا باعث بن رہی ہے۔ آپؐ جانتے ہیں کہ ان کی یہ روش دنیا میں کسی ابتلاء اور آخرت میں جہنم کے عذاب کا باعث بن کے رہے گی۔ چنانچہ ان کے انجام کی فکر آپؐ کی تشویش اور پریشانی میں اضافہ کرتی چلی جارہی ہے۔ تباہی کی طرف وہ بڑھ رہے ہیں لیکن اس کا غم آپؐ کو کھائے جارہا ہے۔ اس پر آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آپ ان کی روش پر غم نہ کھائیں۔ وہ اگر محرومی اور بدبختی کو اختیار کرچکے ہیں تو اس کی آپ پر کیا ذمہ داری ہے۔ آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ آپ اپنا فرض انجام دے چکے۔ ہٹ دھرمی کا علاج آج تک کسی کے پاس نہیں رہا۔

تسلی کا دوسرا حوالہ یہ ہے کہ مخالفین آپؐ کے بارے میں جو منصوبے باندھتے رہتے ہیں اور جس طرح آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے درپے آزار رہتے ہیں اور ہر آنے والا دن ان کی مخالفت اور معاندت میں اضافہ کرتا چلا جارہا ہے، آپ ان کی شرارتوں اور چالوں سے ہرگز پریشان نہ ہوں۔ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں ان میں سے کوئی بات بھی اللہ تعالیٰ کے اختیارات سے باہر نہیں۔ ان کی ہر چال اللہ تعالیٰ کی مٹھی میں ہے۔ اس کی پشت پناہی آپ کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ وہ یقیناً اس بات پر قادر ہے کہ آپ کو ان کے ہر شر سے محفوظ رکھے۔ ایسے مضبوط سہارے کی موجودگی میں آپ کو رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ان کی منصوبہ بندیاں اور چال بازیاں بجائے اس کے کہ ان کے سیاہ نامۂ عمل میں اضافے کا سبب بنیں، آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾

(وہ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی، اگر آپ سچے ہیں۔ ۷۱) کہہ دیجئے، ممکن ہے کہ جس چیز کیلئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو اس کا کوئی حصہ تمہارے پیچھے ہی لگا ہوا ہو۔ ۷۲)

Marfat.com

یَکُوْنَ اور رَدِفَ دونوں فعل ہیں اور ان کا فاعل "بعض" ہے۔ تنازع فعلین کی وجہ سے ایک کا فاعل اسمِ ظاہر ہوگا اور دوسرے کا اسمِ ضمیر، جس کا مرجع وہ اسمِ ظاہر ہوگا۔ رَدِفَ بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور لام کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ کلامِ عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ایک شے کے دوسری شے کے پیچھے لگے ہوئے ہونے کے۔

مکذبین کے مطالبے کا جواب

اللہ تعالیٰ کا جو رسول بھی کسی قوم کی طرف مبعوث ہوا ہے وہ اپنی قوم کی اصلاح کیلئے اپنی لسانی، عملی اور ترغیبی قوتوں کو ہر ممکن طریقے سے بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا رسول جب مسلسل اپنی دعوت و تبلیغ کو خاطر خواہ نتائج پیدا کرتا نہیں دیکھتا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دنیا میں اچانک عذاب کی آمد اور قیامت میں آخرت کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ کبھی معذب قوموں کی تاریخ سے عذاب کی تباہ نا کیوں کو متشکل کر کے ان کے اندر اضطراب پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور کبھی دلائل آفاق و انفس سے قیامت کا یقین پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی کرنے پر آمادہ ہو جائے، لیکن قوموں کا رویہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ بجائے اس سے اثر قبول کرنے کے عذاب اور قیامت کو ایک سوالیہ نشان بنالیتے ہیں۔ بجائے اس سے ڈرنے اور فکر مند ہونے کے اسی کی آمد کو رسول کی رسالت کی دلیل قرار دے دیتے ہیں۔ اور بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ تم یہ کہتے ہو رسولوں کی تکذیب پر پہلی قوموں پر عذاب آتا رہا ہے، تو ہم تکذیب تو کر چکے، اب عذاب آنے میں کیا دیر ہے۔ تم جو بار بار ہمیں کبھی عذاب اور کبھی قیامت کی دھمکی دیتے ہو، تو اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو یہ دھمکی پوری کر کے کیوں نہیں دکھاتے۔ پروردگار نے دوسری آیت میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم جس چیز کی جلدی مچارہے ہو، یعنی بار بار کبھی قیامت کا اور کبھی عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہو۔ اسی قیامت کی ایک ہلکی سی شکل اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، اسی کو "بعض" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ممکن ہے وہ عذاب تمہارے قریب آلگا ہو، یعنی سر پر پہنچ گیا ہو۔

عَسٰی کے معنی کی وضاحت

عَسٰی کا لفظ تمنی، ترجی اور امید دلانے کیلئے آتا ہے۔ عموماً اس کا ترجمہ کیا عجب، ممکن ہے یا شاید کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ اور یہ تمام الفاظ شک پر دلالت کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے میں شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ جب قرآنِ کریم میں عَسٰی کا لفظ آتا ہے تو شک کیلئے نہیں بلکہ یقین اور جزم کا فائدہ دیتا ہے۔ یہ دراصل شاہانہ اندازِ کلام ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ بادشاہ رمز و کنایہ سے ہی اپنے ارادہ کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ تصریح کی انہیں چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی آدمی کہہ سکتا ہے کہ پھر اس طرح کے الفاظ کا استعمال جو شک پر دلالت کرتے ہیں پروردگار کے کلام میں آخر کیا ہی کیوں جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایسے الفاظ کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس کی قدرت ایسی غالب ہے کہ اس کا کسی چیز کو چاہنا اور پھر اس چیز کا ہو جانا گویا ایک ہی بات ہے۔ کیونکہ اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اور دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جہاں تک عذاب کے نزول کا تعلق ہے اس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے بندھا ہوا ہے، اور جس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن دوسرا سرا قوم کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ ایمان لے آئے تو وہ عذاب سے محفوظ ہو سکتی ہے۔ اور اگر تکذیبِ رسل میں بڑھتی چلی جائے حتیٰ کہ پیغمبر اور اصحابِ ایمان کے قتل کے درپے ہو جائے تو پھر عذاب کا ظہور ہو کے رہتا ہے۔ عَسٰی کا استعمال درحقیقت

Marfat.com

قوم کے رویئے کے حوالے سے ہے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے حوالے سے نہیں۔ گزشتہ معذب قوموں نے اپنی روش نہ بدلی تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا ظہور ہو کے رہا۔ اور آنحضرت ﷺ کی قوم کی اکثریت ایمان لے آئی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پیغمبر کی ہجرت جو درحقیقت عذاب کا اعلان ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد بھی اہلِ مکہ میں دھیرے دھیرے قبولیتِ اسلام کی اندر ہی اندر تحریک چلتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ معاہدۂ حدیبیہ کے بعد چند ہی مہینے میں تقریباً ۷۰ افراد ساحلِ سمندر پر جمع ہوگئے، کیونکہ معاہدے کی رو سے وہ مدینہ منورہ میں آ نہیں سکتے تھے۔ اور یہ سب وہ لوگ تھے جو آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد درپردہ مکے میں مسلمان ہوئے تھے۔ اب جبکہ انہیں ساحلِ سمندر پر ایک پناہ گاہ میسر آئی تو وہ خاموشی سے چھپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے

وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْفَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

(اور بیشک آپ کا رب لوگوں پر بڑے فضل والا ہے، مگر ان میں کے اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۷۳)

مخالفین کی بدنصیبی

اللہ تعالیٰ کی وسعت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ اس کا فضل وکرم صرف اپنے فرمانبردار اور شکرگزار بندوں پر ہی نہیں بلکہ کافروں، منکروں اور نافرمانوں پر بھی اس کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنی نافرمانی، تمرد اور سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی سرکشی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ عذاب کیلئے جلدی مچانے لگتے ہیں۔ اور عذاب میں تاخیر کو اپنے برسرِ حق ہونے پر اور پیغمبر کے برسرِ غلط ہونے پر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ عذاب میں تاخیر صرف اس لئے ہوتی ہے کہ لوگ اگر سنبھلنا چاہیں اور اپنا رویہ درست کرنا چاہیں تو انہیں اس کا موقع ملنا چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ ہمیں تو کسی نے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لیکن لوگوں کی ناشکری کا حال یہ ہے کہ وہ اس مہلت اور اس فضل کو اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے جھوٹے ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جس دروازے سے انہیں رحمت لے کر پلٹنا تھا وہاں سے وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۵﴾

(اور بلاشبہ آپ کا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴)
اور آسمان وزمین میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح رجسٹر میں لکھی ہوئی نہ ہو۔ ۷۵)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو انذار

مخالفین کی بڑھتی ہوئی مخاصمت چونکہ روز بروز منہ زور ہوتی جارہی تھی اس لئے آنحضرت ﷺ کا ان کی مخالفت کے حوالے سے پریشان ہونا فطری بات تھی۔ اور اس مخالفت کا جس طرح آپؐ کے وفاشعار ساتھیوں کو نشانہ بنایا جارہا تھا اس سے بھی آپؐ کی تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پروردگار نے ایسی ناگفتہ بہ صورتحال میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپؐ کے دشمن جو کچھ کر رہے ہیں جس میں ان کی دریدہ دہنی بھی شامل ہے اور ان کی جسمانی اذیت رسانی بھی۔ آپؐ جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں یا آپؐ کے علم میں آتی ہیں تو

Marfat.com

آپؐ ان چیزوں میں شدت دیکھتے ہوئے شدید کرب محسوس کرتے ہیں، لیکن ہم آپؐ کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ آپ نے تو ان کی صرف نظر آنے والے مخالفت کو دیکھا ہے اور ان کے منہ سے نفرت کے پھوٹتے ہوئے شعلے دیکھے ہیں اور اس نے آپ کو نہایت تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ لیکن ہم ان کے اس بغض واضطراب کو بھی جانتے ہیں جن کے طوفان وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اس کے اظہار کیلئے مناسب وقت کے انتظار میں ہیں، آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ جبکہ کوئی چیز ان کی ہم سے مخفی نہیں اور ان کا کوئی منصوبہ ہم سے پوشیدہ نہیں وہ آپ کو جس سے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں ہم ان کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور ہمارا یہ بتانا کہ ہم دشمن کی ہر بات سے آگاہ ہیں اس کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی معلومات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ان باتوں سے واقف ہیں تو ہم ان کا تدارک بھی کریں گے۔ آپ ہمارے رسول ہیں، ہم نے رسالت کی ذمہ داری آپ پر ڈالی ہے۔ تو آپ کی حفاظت اور دشمنوں کی اذیت رسانی سے آپ کو بچانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے آپ کو ہر طرح سے اطمینان رکھنا چاہئے کہ دشمن آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں مخالفین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ آسمان وزمین کی ہر مخفی بات ہمارے یہاں ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ اور یہ نوشتہ اس لئے تیار کیا جارہا ہے کہ کل کو قیامت کے دن جب تمہیں ہماری بارگاہ میں لایا جائے اور تم سے پوچھ گچھ کے بعد تمہاری سزا کا اعلان کیا جائے تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں ایسے کرتوتوں کی سزادی جارہی ہے جن کا ہم نے ارتکاب نہیں کیا۔ یہ کتابِ مبین تمہارے ایک ایک عمل پر گواہی دے گی۔ بلکہ یہ نامۂ عمل جس کے ہاتھ میں بھی دیا جائے گا وہ اسے دیکھتے ہی چیخ اٹھے گا۔ مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا "یہ کیسا نامۂ عمل ہے جس میں نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑی گئی ہے، نہ بڑی۔ اس نے ہر بات کو شمار کردیا ہے۔" وہ قیامت کے روز ہر چیز کا نوٹس لے گا اور کوئی بات اس سے چھپائے بھی نہ چھپ سکے گی۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾

(بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر ان بہت سی چیزوں کو بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ ۷۶) اور یہ (قرآن) ہدایت ورحمت ہے ایمان لانے والوں کیلئے۔ ۷۷) بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے درمیان بھی اپنے حکم سے فیصلہ کردے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۷۸)

ترہیب کے بعد ترغیب

قریش اور دیگر مخالفین کو گزشتہ آیتِ کریمہ میں مخالفت سے روکنے اور پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے کیلئے تنبیہ اور تہدید کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ آنحضرت ﷺ کے خلاف کررہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اپنے علم کے مطابق ان سے معاملہ فرمائے گا اور ان کی مخالفتوں کی سزادے گا۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں تخویف وتہدید کے بعد ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ تم جس قرآنِ کریم کی دعوت کی مخالفت کررہے ہو، تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ اس کی علوِ مرتبت اور بلندیِ منزلت کا عالم یہ ہے کہ وہ جس طرح بنی اسماعیل پر اتمامِ حجت اور ہدایت ورہنمائی کیلئے نازل کیا گیا ہے اسی طرح وہ بنی اسرائیل پر بھی

Marfat.com

حجت تمام کر رہا ہے حالانکہ اس کتاب کو ایک ایسے اُمی پر نازل کیا گیا ہے جس کی ذات بابرکات، جس کا ماحول اور جس کی قوم متداول علوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بااین ہمہ اس نے بنی اسرائیل کی اس طرح رہنمائی کی ہے کہ انہوں نے عقائد واحکام، تاریخی محاکمات اور آدابِ زندگی میں جہاں جہاں ٹھوکریں کھائیں اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف وترمیم سے کام لیا قرآن ان کی اصلاح کرتا ہے۔ ان کی بہت ساری خیانتوں پر گرفت کرتا اور بہت سی باتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

تورات کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس میں صرف تحریف ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ متناقض روایات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلانا ناممکن ہے کہ اس میں کتنا حصہ حق ہے اور کتنا باطل ومحرف۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں جس طرح تورات کو حافظے کی مدد اور سنی سنائی باتوں سے ازسرنو مدون کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تورات کی حقیقت ہی گم نہیں ہوئی بلکہ اسے ایک طرح سے مسخ کر دیا گیا۔ قرآنِ کریم نے جابجا ان کی اس طرح رہنمائی کی کہ ان کے سامنے حق وباطل کو واضح کر کے پیش کر دیا گیا۔

دفع دخلِ مقدر

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہ سورت مکی ہے اس میں خطاب قریش سے ہے، انہیں کی باتوں کا جواب ہے اور انہیں کے اعمال پر تنقید بھی ہے۔ ایسی صورتحال میں یہود کا ذکر عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے جس طرح اس آیت کی وضاحت کی ہے اگر اس میں غور کر لیا جائے تو یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور میں یہود صرف دور کے تماشائی تھے۔ لیکن جیسے جیسے اس دعوت کے قدم جمتے گئے یہود بھی آہستہ آہستہ مخالفت میں شریک ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ وہ آنحضرت ﷺ کو پریشان کرنے کیلئے قریش کو سوالات سکھاتے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ جب ان سوالات کا جواب نہیں دے پائیں گے تو قریش خود ہی بدگمان ہو جائیں گے۔ اس طرح سے وہ طریقے طریقے سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کی مخالفت میں آگے بڑھتے گئے۔ تو پھر قرآنِ کریم نے بھی ان سے تعرض کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر حالات کے تقاضے کے مطابق رفتہ رفتہ ان کے ان اختلافات کا عقدہ بھی کھولا جو ان کی دینی زندگی کیلئے لاینحل عقدہ بن کر رہ گئے تھے۔ اور ان پر یہ بات واضح کر دی کہ تمہارے معاملات میں روز بروز جو الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں قرآنِ کریم ان کیلئے ہدایت اور رہنمائی کا سامان بن کر آیا ہے۔ جو لوگ اس ہدایت کو قبول کریں گے اور ایمان لائیں گے ان کیلئے یہ رحمت ثابت ہوگا۔ ان کو اختلافات کی بھول بھلیوں سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لائے گا۔ لیکن اگر انہوں نے اس قرآن کی قدر نہ پہچانی اور قرآنِ کریم کو زندگی کا رہنما نہ بنایا تو یاد رکھیں کہ آج تو اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات اس کتاب کے ذریعے سے رفع کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے بعد وہ دن بھی آئے گا جب وہ اپنے حکم کے ذریعے سے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ اس حکم سے مراد وہ حتمی اور آخری فیصلہ بھی ہو سکتا ہے جو قیامت کے روز ہوگا اور جس کے بعد کسی کیلئے زبان کھولنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اور اس سے مراد دنیا میں بھی فیصلہ ہو سکتا ہے یعنی اس قرآن کی بدولت قریش اور دیگر اہلِ عرب ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں گے، وہ کفر اور شرک کی تاریکیوں سے نکل کر نہ صرف ایمان کی روشنی میں آ جائیں گے بلکہ وہ اسلام کے مشعل بردار بن کر گھروں سے نکلیں گے اور وہاں وہاں روشنی کا سامان کریں گے جہاں جہاں آج سخت تاریکی ہے۔ اور وہ لوگ جو ریگزارِ عرب کے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے دنیا کے پیشوا، قوموں کے امام، تہذیب انسانی کے استاد اور روئے زمین کے ایک بڑے حصے کے فرمانروا بن کر چھا جائیں گے۔

Marfat.com

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾

(اے نبی! آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں، بیشک آپ صریح حق پر ہیں۔ ۷۹)

اللہ تعالیٰ پر توکل آپؐ کی طاقت ہے

گزشتہ مضمون کو مستحکم کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ مخالفین کی مخالفتوں کی ہرگز پرواہ نہ کریں، وہ جو چالیں چلنا چاہتے ہیں انہیں چلنے دیں۔ آپؐ اپنے رب کی نصرت پر بھروسہ رکھیں۔ زندگی میں سب سے مؤثر قوت حق ہے، اور وہ آپؐ کے پاس ہے۔ اس حق کی روشنی کو کوئی نہیں بجھا سکتا، حق ہی کا بول بالا ہوگا اور مخالفین خائب وخاسر ہوں گے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَمَآ اَنْتَ
بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

(اے پیغمبر! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ آپ اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہیں۔ ۸۰)
اور نہ آپ اندھوں کو ہدایت دینے والے ہیں ان کی گمراہی سے بچا کر، آپ تو اپنی بات انہیں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائیں پھر وہ فرمانبردار بن جائیں۔ ۸۱)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

گزشتہ آیت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا تھا کہ آپؐ ان کی مخالفتوں کی پرواہ نہ کریں اور نہ یہ خیال دل میں لائیں کہ ان کی مخالفتیں آپؐ کیلئے ناکامی کا باعث بنیں گی۔ اصل طاقت اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے اور وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جو حق کی علمبرداری اور اس کی پاسداری کیلئے اٹھتا ہے۔ اس وقت حق کے نشان آپؐ ہیں۔ آپ حق کے علمبردار بھی ہیں اور حق کے سراج منیر بھی ہیں۔ اس لئے آج اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت صرف آپ کے ساتھ ہے۔ اب اسی سلسلۂ مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ کو اس بات پر بھی دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ لوگ آپ کی بات سن کے نہیں دیتے۔ اور آپ کی تمام تر ہمدردانہ اور غمگسارانہ مساعی جمیلہ کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر طلب ہدایت کا ایک داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو شخص اس داعیہ سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ہدایت کی مزید راہیں کھول دیتا ہے۔ اور جو شخص اس داعیہ کو غلط جگہ استعمال کرتا یا عدم استعمال کے سبب اسے بیکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کیلئے محرومی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے اس داعیہ سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں بصارت تو ہے لیکن دل کی بصیرت ان سے چھن گئی ہے۔ اور ہدایت کیلئے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

Marfat.com

یہ لوگ فطری صلاحیت سے محروم ہونے کے باعث اس قابل نہیں رہے کہ آپ کی تبلیغی کاوشوں سے ہدایت پا سکیں۔ جس طرح ایک مردہ حواس اور عقل سے محروم ہو جانے کے باعث ہر طرح کی چیز کو محسوس کرنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح جو شخص دل کی بصیرت سے محروم ہو گیا وہ مردوں سے بڑھ کر مردہ ہے۔ تو آپ ایسے مردوں کو کیسے سنا سکتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص بہرہ ہے آپ چیختے رہیں وہ آپ کی بات سن نہیں پائے گا۔ ان کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے، یہ صرف بہرے نہیں بلکہ ان کا حال تو یہ ہے کہ جب آپ انہیں ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو یہ پشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، ایسے دل کے اندھوں اور ہدایت سے بھاگنے والے وحشت زدہ لوگوں کو آپ اپنی بات کیسے سنا سکتے ہیں۔ اور جب وہ آپ کی بات کو سننے سے ہی محروم ہیں تو وہ آپ کی بات کو قبول کیسے کر سکتے ہیں۔ اس لئے آپ کو ان کے ایمان نہ لانے پر دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان کا ایمان نہ لانا آپ کی کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی محرومی کا نتیجہ ہے جس کا سبب وہ خود بنے ہیں۔ ایمان لانے کیلئے تو دل میں ایمان کا ارادہ ضروری ہے اور جب کوئی شخص ایمان لانے کے ارادے سے طلبِ صادق لے کر آپ کے پاس آتا ہے تو وہ ایمان سے محروم نہیں رہتا، بلکہ اس کے ارادے میں اللہ تعالیٰ ایسی برکت دیتا ہے کہ وہ ایمان سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے اور اطاعت و فرمانبرداری بھی اس کے عمل کا حصہ بن جاتی ہے۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

(اور جب ہماری بات ان پر پوری ہونے کا وقت آن پہنچے گا تو ہم ان کیلئے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے گفتگو کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ۸۲)

اتمامِ حجت کے بعد کا مرحلہ

جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان پر آ پہنچے گا، کا مطلب یہ ہے کہ لوگ جب قبولیتِ حق سے بہت حد تک محروم ہو جائیں گے اور اہلِ حق کی تبلیغی کاوشیں بے اثر ہونے لگیں گی تو تب اللہ تعالیٰ اتمامِ حجت کیلئے ایسی نشانیاں ظاہر کرے گا جس کے بعد وقوعِ قیامت کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ آثارِ قیامت میں جو نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں ان میں سے ایک نشانی دَآبَّةُ الْاَرْضِ کا خروج ہے جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے قول کے مطابق دَآبَّةُ الْاَرْضِ کا ظہور اس وقت ہوگا جب نیکی کا حکم کرنے والا اور بدی سے روکنے والا زمین میں کوئی شخص باقی نہیں رہے گا۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ یہی بات انہوں نے خود حضورؐ سے سنی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں گے تو قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک جانور کے ذریعے سے آخری مرتبہ حجت قائم فرمائے گا۔ وہ لوگوں سے آ کر کلام کرے گا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان آیات پر یقین نہیں کرتے تھے جن میں قیامت کے آنے اور آخرت کے برپا ہونے کی خبریں دی گئی تھیں۔ تو اب مجھ سے سن لو کہ آخرت کا وقت قریب آن لگا ہے۔ اور جو کچھ قرآن اور آنحضرت ﷺ نے بتایا تھا وہ سب سچا تھا۔

Marfat.com

خروجِ دابہ کا وقت

رہی یہ بات کہ اس جانور کے خروج کا وقت کون سا ہوگا؟ اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا اور ایک روز دن دیہاڑے یہ جانور نکل آئے گا۔ ان میں سے جونشانی بھی پہلے ہو وہ بہر حال دوسری کے قریب ہی ظاہر ہوگی۔ حدیث کی تمام بڑی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے بتایا ہے کہ قیامت کے قریب زمانے میں دجال کا خروج، دَآبَّۃُ الْاَرْضِ کا ظہور، دخان اور آفتاب کا مغرب سے طلوع، وہ نشانیاں ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کی اولین علامتوں میں سے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور چاشت کے وقت دَآبَّۃُ الْاَرْضِ کا نکلنا ہے۔ ان دو میں سے جو بھی پہلے واقعہ ہوا دوسرا اس کے فوراً بعد ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے قدوقامت، مقامِ خروج وغیرہ کے متعلق بڑی تفصیل سے روایات مذکور ہیں۔ لیکن امام رازی فرماتے ہیں **واعلم انہ لا دلالۃ فی الکتاب علی شیء من ھذہ الامور فان صَحَّ الخبر فیہ من الرسول ﷺ قبل والا لم یلتفت الیہ** (کبیر) ''خوب جان لو کہ کتاب اللہ میں ان امور پر کوئی دلالت نہیں، جو چیز صحیح احادیث سے ثابت ہے وہ مان لی جائے گی، ورنہ اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔''

ایک اشتباہ کا جواب

ممکن ہے کہ ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایک جانور انسانوں سے کلام کیسے کرے گا؟ تو یہ بات اس لئے بعید از عقل نہیں کیونکہ پروردگار اپنی ایک قدرت کے کرشمے کے طور پر اس جانور کو ظاہر فرمائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جانور کا خروج اور اس کی غیر معمولی صفات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ظہور کے طور پر ہوں گی۔ اور اس کی قدرت سے کوئی بات مستبعد نہیں۔ ویسے بھی جس شخص نے قیامت کے حالات کو غور سے پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ قیامت سے پہلے تو صرف یہ جانور لوگوں سے باتیں کرے گا لیکن وقوعِ قیامت کے بعد انسان جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا تو اس کے تمام اعضاء باتیں کریں گے۔ اور جب ان اعضاء سے کہا جائے گا کہ تمہیں یہ بولنے کی طاقت کس نے دی؟ تو وہ جواب میں کہیں گے **اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ** ''ہمیں اس نے بولنے کی طاقت دی ہے جس نے ہر چیز کو بولنا سکھایا۔''

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ
فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ
قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾
اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ

Marfat.com

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٨٦﴾ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي
الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ
شَاءَ اللَّهُ ۚ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً
وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ
إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿٨٨﴾ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا
وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ﴿٨٩﴾ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ
وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾
إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ
كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾ وَأَنْ أَتْلُوَ
الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ
فَقُلْ إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ
فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

رکوع: ۷۔ (اور ذرا تصور کیجئے اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کیا کرتے تھے، پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ ۸۳) یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو (پروردگار) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا، یا وہ کیا تھا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۴) اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر عذاب کا وعدہ پورا ہو جائے گا تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ ۸۵) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو بنایا تا کہ اس میں سکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا بیشک اس میں

Marfat.com

نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۸۶) اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں ہَول کھا جائیں گے بجز ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہَول سے بچانا چاہے اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہوکر حاضر ہو جائیں گے۔ ۸۷) تو اس دن پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ خوب جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے، بادلوں کے چلنے کی طرح، یہ اس اللہ کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا، بیشک وہ ہر چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۸۸) جو نیک عمل لے کر آئیں گے تو ان کیلئے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ ۸۹) اور جو لوگ برائی لے کے آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے، تمہیں بدلہ میں وہی دیا جائے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۹۰) مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس گھر کو عزت وحرمت والا بنایا ہے اور ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداری کرنے والوں میں سے بنوں۔ ۹۱) نیز یہ بھی کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں، تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کیلئے اختیار کرے گا، اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ ۹۲) اور اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں، وہ ابھی تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان جاؤ گے، اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے تمہارا رب بے خبر نہیں ہے۔ ۹۳)

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

(اور ذرا تصور کیجئے اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کی ایک فوج اکٹھا کریں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کیا کرتے تھے، پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ ۸۳)

قیامت کی یاددہانی اور محشر میں مکذبین کی حالت

علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت کے ذکر سے جب قیامت کی طرف توجہ مبذول ہوئی تو روزِ حشر کی یاددہانی فرمائی گئی کہ اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے اپنی آیات کا انکار کرنے والوں کی ایک پوری فوج جمع کرے گا اور پھر ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ اس سے بتانا شاید یہ مقصود ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والے بعض دفعہ ان لوگوں کی کثرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عقیدہ وعمل کے فساد کے باعث یقیناً جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ تو یہ کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں لوگ آخر کس طرح جہنم میں سما جائیں گے۔ پروردگار نے فوج کا لفظ لا کر اشارہ فرمایا ہے کہ جہنم کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔ ہم جہنم میں جانے والوں کو فوج در فوج جمع کریں گے۔ وہاں افراد کا سوال نہیں ہوگا۔ ان فوجوں کے جہنم میں ڈالے جانے کے بعد بھی جہنم کی وسعتوں میں کمی نہیں آئے گی۔ وہ تو برابر ہل من مزید پکارتی رہے گی۔ اور یہ بھی اشارہ فرمایا کہ فوجوں کا ہجوم بھی بغیر کسی شناخت کے نہیں ہوگا بلکہ عقیدہ وعمل میں فساد کے تنوع کے اعتبار سے ان میں درجہ بندی کی جائے گی۔ بہت بڑی تعداد کے باوجود ہر شخص جہنم کی اس وادی میں پھینکا جائے گا جو اس جیسے مجرمین کیلئے بنائی گئی ہوگی۔ کوئی شخص اگر اپنے کفر وشرک کے باوجود خدمتِ خلق میں لگا رہا ہوگا تو اسے یقیناً ان لوگوں کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا جو کافر اور مشرک ہونے کے ساتھ ساتھ ظالم وجابر بھی ہوں گے۔ ہر شخص کی فائل محفوظ ہوگی، ہر شخص کا نامۂ عمل بول رہا ہوگا۔ یہ لوگ اپنے عقیدہ وعمل کے اعتبار سے اگرچہ کسی رحم کے مستحق نہیں ہوں گے لیکن سزا میں بے انصافی ان کے ساتھ بھی نہیں ہوگی۔

Marfat.com

حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡ قَالَ اَكَذَّبۡتُمۡ بِاٰیٰتِیۡ وَلَمۡ تُحِیۡطُوۡا بِهَا عِلۡمًا اَمَّاذَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۴﴾

(یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو (پروردگار) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا، یا وہ کیا تھا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۸۴)

مکذبین سے ایک سوال

جب سب مجرمین میدانِ حشر میں اکٹھے ہوجائیں گے جن میں عقیدہ وعمل کی ہر طرح کی خرابیوں کے حامل لوگ موجود ہوں گے تو پروردگار ان سے پوچھے گا کہ میں نے تمہیں عقل جیسی دولت عطا فرمائی اور پھر سلامتِ فکر کیلئے بار بار اپنے پیغمبر بھیجے اور فکری غذا کیلئے ان پر اپنی کتابیں نازل کیں اور ہر طرح کے دلائل سے اپنی وحدانیت، وحیِ الٰہی اور تمہاری اس کیلئے احتیاج، زندگی گزارنے کیلئے ایک ضابطۂ حیات اور جزاء وسزا کیلئے روزِ حشر کے قیام کو واضح فرمایا۔ لیکن تم نے ان تمام دلائل کو رد کرتے ہوئے میری آیات کا انکار کیا۔ بتاؤ اس کی وجہ کیا تھی۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جن بنیادی اعتقادات پر تمہیں ایمان لانے کی دعوت دی گئی تھی بالخصوص اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور قیامت کا وجود، تم اپنے محدود علم کے ذریعے ان حقائق کا احاطہ نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ تمہارے پاس تمام اسرارِ کائنات کا علم نہیں جس کی بنیاد پر تم کوئی ایسا دعویٰ کرسکو۔ لیکن ان تمام کوتاہیوں اور نا تمامیوں کے باوجود تم نے میری آیات اور تنبیہات کی تکذیب کی۔ تو بتاؤ تمہارے پاس اس کیلئے کیا عذر ہے؟ اور اگر تم نے میری آیتوں کی تکذیب نہیں کی تو بتاؤ تم نے کیا کیا؟ اس الزام کو غلط ثابت کرنے کیلئے کوئی دلیل پیش کرو۔

وَوَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡهِمۡ بِمَا ظَلَمُوۡا فَهُمۡ لَا یَنۡطِقُوۡنَ ﴿۸۵﴾

(اور ان کے ظلم کی وجہ سے ان پر عذاب کا وعدہ پورا ہوجائے گا تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ ۸۵)

مکذبین کی بے بسی

اس سے پہلے بھی وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَیۡهِمۡ کا جملہ گزر چکا ہے۔ وہاں اس کا مطلب یہ تھا کہ جب کفار اپنے ایمان کو کسی بڑی نشانی دکھانے کے ساتھ مشروط کردیں گے اور بار بار اس نشانی کا مطالبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ ان پر مسلط ہوجائے گا جو منہ مانگی نشانی دکھانے پر عام طور پر مسلط کیا جاتا رہا ہے۔ وہی لفظ اس آیت میں دوبارہ لایا گیا ہے۔ لیکن یہاں ماجرا روزِ حشر کا ہے۔ اس لئے اس سے مراد دنیا کا فیصلہ نہیں بلکہ وہ فیصلہ مراد ہے جو تمام کفار ومشرکین اور مجرمین کو جہنم میں جھونک دینے کیلئے ہوگا۔ جب ان کا کفر وشرک اور نافرمانی جیسے جرائم کا ثبوت پوری طرح شہادتیں قائم ہوجانے کے بعد ان کے سامنے فراہم کردیا جائے گا تو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ آج کا دن چونکہ جزاء کا دن ہے آج ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے کتنے بڑے بڑے جرائم کئے ہیں۔ ان کے جرائم کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے۔ اس سے پہلے کافر بہت کچھ سخن سازی سے کام لیں گے، اپنے جرائم سے انکار بھی کریں گے اور اپنے جرائم کی مختلف توجیہات بھی کریں گے۔ لیکن عذاب کا فیصلہ ہوجانے کے بعد ان کی زبانیں بالکل گنگ ہوکر رہ جائیں گی اور وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سورۃ یٰسین میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ”آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے اعمال سے متعلق ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔“

Marfat.com

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو بنایا تا کہ اس میں سکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۸۶)

اس طرح کی آیات کے ترجمے میں دو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ایک طریقہ وہ ہے جس طرح ہم نے ترجمہ کیا کہ آیت کے الفاظ کے مطابق محذوفات کو فرض کئے بغیر ترجمہ کر دیا گیا ہے۔اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے جملے میں مُبْصِرًا کے قرینے سے مَظْلِمًا کو محذوف مانا جائے اور دوسرے جملے میں تَعْمَلُوْا یا اس کے ہم معنی کوئی اور فعل محذوف سمجھا جائے۔اسی طرح آیت کا آخری لفظ يُؤْمِنُوْنَ فعل کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے اور ارادۂ فعل کے مفہوم میں بھی۔

نشانیاں مانگنے والوں کو ملامت

جو لوگ نشانیِ عذاب کا نہ صرف مطالبہ کرتے تھے بلکہ اپنے ایمان کو اس کے ساتھ مشروط ٹھہراتے تھے انہیں ملامت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی اس کائنات میں ہر طرف بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔آنکھیں بینا ہوں تو دیکھی جا سکتی ہیں۔لیکن زیادہ نہیں تو دو نشانیاں تو ایسی ہیں جن کا ہر وقت مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور پھر اس مشاہدے کیلئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ہر انسان ہر وقت ان کے فوائد سے متمتع ہو رہا ہے۔اور پھر یہ نشانیاں ایسی نہیں جس کے دیکھنے کیلئے آنکھوں کی ضرورت ہو۔اندھے بہرے اور گونگے سب ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ان نشانیوں سے مراد رات اور دن کی دو نشانیاں ہیں۔رات کی تاریکی سے کون ہے جو ناواقف ہے۔ہر شخص اس میں آرام ڈھونڈتا اور سکون پاتا ہے۔ اسی طرح دن کا اجالا ہر شخص کیلئے لطف و لذت اور سرگرمیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔رات کا آرام انسان کو تازہ دم کرتا ہے تا کہ وہ دن کی روشنی میں روزی کے حصول کیلئے دوڑ بھاگ کر سکے۔اور دن کی دوڑ بھاگ اسے تھکا دیتی ہے تو رات کی تاریکی اسے ماں کی آغوش بن کر تھپکیاں دیتی ہوئی اس طرح اپنے پہلو میں سلاتی ہے کہ اس کی قوتِ کارکردگی بحال ہو جاتی ہے۔اور اگر آیات سے مراد صرف دو نہیں متعدد نشانیاں مراد لی جائیں تو رات اور دن کی دو نشانیوں میں متعدد نشانیوں کا وجود مضمر ہے۔شب و روز کا یکے بعد دیگرے آنا اور کبھی اس میں تخلف کا نہ ہونا، تضاد کے باوجود ان میں توافق کی کارفرمائی، مخلوق کیلئے ان دونوں کی فیض رسانی اور پھر ان نشانیوں میں اس کی پنہاں قدرت، حکمت، ربوبیت اور حشر و نشر پر ان کا انطباق ایک جہانِ معنی ہے جس کا شمار کرنا آسان نہیں۔نشانی کا مطالبہ کرنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری طلب اگر صادق ہوتی تو کیا ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی تمہیں اپیل نہ کرتی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں میں ایمان کا ارادہ نہ ہو ان کیلئے روشن سے روشن نشانی بھی تاریکی بن جاتی ہے۔ اور جو اپنے اندر آمادگی کی تڑپ رکھتے ہیں ان کیلئے درختوں کا ایک ایک پتا معرفتِ کردگار کا دفتر بن جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾

(اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں ہول کھا جائیں گے بجز ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہو کر حاضر ہو جائیں گے۔ ۸۷)

Marfat.com

ہولِ قیامت سے تذکیر

مختلف طریقوں سے آخرت یاد دلائی جارہی ہے کیونکہ وہی ان آیات کا اصل موضوع ہے اور وہی انسانی زندگی میں صالح تبدیلی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دل ودماغ کو آخرت کے تصور کے قریب لانے کے بعد اب اس کے وقوع کی منظرکشی کی جارہی ہے۔ اور یہ شاید اس لئے بھی ضروری ہے کہ مشرکینِ عرب بالخصوص قریش قیامت اور آخرت کے تصور کو استہزاء بنا چکے تھے اور اگر ان میں سے کوئی شخص سنجیدگی سے بھی ذکر کرتا تو بہت ہلکے انداز میں ذکر کرتا تھا۔ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے ہول اور واقعہ کو معمولی نہ سمجھیں۔ جس دن اس کے وقوع پذیر ہونے کیلئے نفخ صور ہوگا، یعنی خدائی بگل بجایا جائے گا تو زمین وآسمان میں کوئی مخلوق ایسی نہیں ہوگی جس پر ہول اور گھبراہٹ طاری نہ ہو۔ البتہ اس گھبراہٹ سے صرف وہ لوگ محفوظ رہیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھنا چاہے گا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خوش نصیب لوگوں میں انبیائے کرام، شہداءِ عظام اور اس کے مقبول بندے شامل ہوں گے۔ ان کے گھبراہٹ سے مامون رہنے کی وجہ ایک تو یہ ہوگی کہ انہیں پروردگار کی جانب سے تحفظ حاصل ہوگا، کوئی ناگوار بات ان پر اثر انداز نہ ہوسکے گی۔ اور دوسری وجہ جو انسانی ذہنوں کے قریب تر ہے وہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں قیامت اور آخرت کی ایک ایک بات پر یقین رکھتے تھے۔ اور وہاں کی حاضری کی انہوں نے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب انہیں آخرت سے واسطہ پڑا تو انہیں کسی بات پر تعجب نہیں ہوا۔ یقین کا نور ہر جگہ ان کیلئے روشنی کا سامان بنا رہا۔ انہوں نے ہر تبدیلی کو جانی پہچانی چیز سمجھا۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اس دن کی ہولناکی اور ہیبت کا عالم یہ ہوگا کہ بڑے چھوٹے لیڈر اور پیرو سب اس دن خدا کے حضور میں نہایت عاجزی اور ذلت کے ساتھ حاضر ہو جائیں گے۔ اس ذلت سے بھی وہ لوگ محفوظ رہیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھنا چاہے گا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

(تو اس دن پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ خوب جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے، بادلوں کے چلنے کی طرح، یہ اس اللہ کی کاریگری ہوگی جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا، بیشک وہ ہر چیز سے باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۸۸)

قیامت کا ایک اور منظر

قیامت کے ہولناک مناظر میں سے ایک اور دل کو لرزا دینے والا منظر بیان کیا گیا ہے کہ اس روز پہاڑ اپنے حجم اور جسامت کے باوجود دیکھنے والوں کو حسبِ سابق کھڑے ہوئے نظر آئیں گے لیکن حقیقت میں وہ بادلوں کی طرح تیزی سے حرکت کر رہے ہوں گے۔ یاد رہے کہ پہاڑوں کا بطورِ خاص ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ عرب کے حکماء کا حال یہ تھا کہ وہ پہاڑوں کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہر چیز فنا ہوسکتی ہے لیکن پہاڑ کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ تو قیامت اور آخرت چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام فنا اور ہلاکت کا دن ہوگا اس لئے پہاڑ بھی اس عمومی تباہی سے بچ نہیں سکیں گے۔ بادلوں کی طرح چلتے چلتے اچانک ایک جھٹکا لگے گا کہ سب کچھ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ جہاں تک ان کی پائیداری اور ثبات وقرار کا تعلق ہے اس میں کوئی کلام نہیں۔ اس میں استحکام اور پائیداری اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوگی۔ لیکن جب تباہی

Marfat.com

اور بربادی کا اعلان ہوگا تو پہاڑ بھی اس سے کیسے محفوظ رہ سکیں گے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسے ہولناک دن سے واسطہ پڑنے والا ہے لیکن تمہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمہارے ایک ایک عمل سے باخبر ہے۔ وہ اپنے علم اور تمہاری شہادتوں کے مطابق تمہارے اعمال سے متعلق تمہاری جواب طلبی کرے گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

(جو نیک عمل لے کر آئیں گے تو ان کیلئے اس سے بہتر صلہ ہے اور وہ اس دن گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ ۸۹) اور جو لوگ برائی لے کے آئیں گے تو وہ اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے، تمہیں بدلہ میں وہی دیا جائے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۹۰)

عدل وجزاء کا دن

قیامت کے ہولناک مناظر اور روح فرسا واقعات کا ذکر کر کے فرمایا کہ قیامت کا دن بدلے اور انصاف کا دن ہے۔ اس دن نہ کسی کو محرومی کا شکار ہونا پڑے گا اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے ہوائے نفس کی مخالفت کی، مفادات کو نظر انداز کیا، خواہشات کو لگام ڈالی اور رضائے الٰہی کو اپنی منزل بنایا اور ہر ممکن طریقے سے ایثار اور قربانی کو اپنا شعار بنایا۔ اس دن ان کے اعمال کا صلہ ان کے اعمال سے بہتر نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ عمل کرنے والا اپنی ذات میں نہایت کمزور اور کوتاہ ہمت واقع ہوا ہے، لیکن بدلہ دینے والا نہایت کریم اور غنی ہے۔ اس کا بہتر سے بہتر عمل یقیناً اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری رکھتا ہے، لیکن غنی اور کریم کی جزاء اس کی اپنی شان کے لائق ہے۔ یوں تو اس کے اندر بے شمار درجات ہیں لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جزاء عمل سے بہتر ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس قیامت کے دن کی ہولناکی سے بالکل مامون اور محفوظ ہوں گے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس کی شریعت کی حدود کو پامال کرتے ہیں وہ بھی قیامت کے دن اپنے اعمال سمیت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ تو قیامت کا دن چونکہ عدل وانصاف کا دن ہے اس لئے وہ اپنی بداعمالیوں کے صلے میں اوندھے منہ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے اور ایک پکارنے والا پکار رہا ہوگا کہ تم جس انجام سے دوچار کئے جارہے ہو، یہ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں، یہ تمہارے ہی اعمال کا صلہ اور نتیجہ ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی ہے بلکہ آج تم وہی کاٹ رہے ہو جو تم دنیا میں کاشت کرتے رہے ہو۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِىْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

Marfat.com

(مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس گھر کو عزت و حرمت والا بنایا ہے اور ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداری کرنے والوں میں سے بنوں۔ ۹۱) نیز یہ بھی کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں، تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کیلئے اختیار کرے گا، اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ ۹۲)

آنحضرت ﷺ کے مشن کی وضاحت

سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ فیصلہ کن انداز میں اپنے مشن کی وضاحت کر دیں۔ اور قریش پر یہ بات اچھی طرح کھول دیں کہ میں شب و روز جس مقصد کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں وہ یہ مقصد ہے۔ دوسری آیت کے آخر میں " قُلْ " کا لفظ آیا ہے۔ یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ آیت کے شروع میں بھی " قُلْ " کا لفظ محذوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی تبلیغ و دعوت کا مقصد اپنے طور پر متعین نہیں کیا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے عین مطابق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ گھر اہلِ عرب جس کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا وہ گھر ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اور اس گھر کو توحید کا مرکز بنایا گیا تھا۔ اور اسی گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے دو عظیم بندوں نے ایک پیغمبر کی بعثت کیلئے دعائیں مانگی تھیں اور یہیں سے ایک امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے کی التجا کی تھی۔ وہ پیغمبر جس کیلئے حضرت خلیل اللہ نے دعا مانگی، وہ میں ہوں۔ اور جس امت کے اٹھائے جانے کیلئے التجا کی تھی وہ امت وہ ہے جو میری دعوت کے قبول کرنے سے وجود میں آئے گی۔ اور پھر حضرت خلیل نے آنے والے آخری نبی کے جن فرائض کا ذکر کیا تھا میں انہیں فرائض کی ادائیگی کیلئے بھیجا گیا ہوں۔ چنانچہ انہیں فرائض کی ادائیگی کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم سے ہوتا ہے۔ تو میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآنِ کریم کی تلاوت کروں یعنی اسے پڑھ کر تمہیں سناؤں۔ اور یہ پڑھنا ایسا نہیں جیسے ایک قاری پڑھتا ہے، بلکہ یہ پڑھنا ایسا ہے جیسے شہنشاہِ عالم کا حکم وائسرائے پڑھ کے سناتا ہے۔ اور پھر یہ حکم نامہ ایسا نہیں کہ صرف سننے والوں پر لاگو ہوتا ہو، میرے لئے بھی ضروری ہے کہ میں اس کا فرمانبردار بن کے رہوں کیونکہ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میری فرمانبرداری کا طریقہ میری امت کیلئے حجت اور سنت ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ میرے مشن کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص نے اس کو سنا اور اس پر عمل کیا تو اس کا فائدہ اسی کو حاصل ہوگا، یعنی اس کی دنیا سنور جائے گی اور آخرت میں وہ فائز المرام ہوگا۔ اور جو شخص اس کے بعد بھی گمراہی پر جما رہا تو اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔ اس کا جو نقصان ہوگا وہ اس کی ذات کو ہوگا۔ اس کی دنیا بھی دکھوں سے معمور ہوگی اور اس کی آخرت ابدی ناکامیوں کی آماجگاہ ہوگی۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۹۳

(اور اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں، وہ ابھی تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان جاؤ گے، اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس سے تمہارا رب بے خبر نہیں ہے۔ ۹۳)

Marfat.com

اے پیغمبران لوگوں کے سامنے اس بات کو بھی واشگاف کردیجئے کہ ہم نے آپ پر جو بے پایاں عنایات کی ہیں اور رحمۃ للعالمینی کی جوخلعتِ فاخرہ آپ کوارزانی فرمائی ہے اور سیرت وکردار کی جوگوناگوں صفات عطا کی ہیں اور ختم المرسلینی کا جو درخشاں تاج آپ کے سرِ نیاز پر رکھا ہے اور قرآنِ کریم جیسی بے مثل کتاب کا جو معجزہ عطا فرمایا ہے میں ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہوں۔ لیکن تم ان نعمتوں کی قدر کرنے کی بجائے نئی نئی نشانیاں مجھ سے مانگتے ہو۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا، اس وقت تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم نے کس طرح اپنی بدبختی کا سودا کیا۔ تب تم اس بات کو جان لوگے کہ میں نے تمہیں تمہارے انجام سے آگاہ کیا، لیکن تم نے اس کو جھٹلایا اور خود اپنی محرومی کو دعوت دی، مگر اس وقت اس جاننے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ تم جو کچھ آج میرے اور میری دعوت کیخلاف شرارتیں کرتے اور سازشیں تیار کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔ لیکن اس کے فیصلوں کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک تمہیں مہلت ملے گی۔ اور جب یہ مہلت کا وقت گزر جائے گا تو پھر تمہاری گرفت میں تاخیر نہیں ہوگی۔ بہتر ہے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو بدل لو۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

دروسِ قرآن

سُورَةُ الْقَصَصِ

(۲۸)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْقَصَص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام القصص ہے۔ یہ اس سورۃ کی آیت نمبر ۲۵ کے اس جملے سے ماخوذ ہے وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ۔
اس سورۃ کی آیات کی تعداد ۸۸ ہے، رکوع ۹، کلمات ۱۴۴۱ اور حروف ۵۸۰۰ ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ ہم سورۃ النمل کے دیباچے میں حضرت ابن عباسؓ اور جابر بن زیدؓ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ سورۃ الشعراء، سورۃ النمل اور سورۃ القصص یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ مرکزی مضمون کے اعتبار سے یہ سورۃ النمل کا ثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اجمال و تفصیل اور اسلوب بیان و نہج استدلال کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے۔ مضامین کے اشتراک اور اندازِ بیان کے اعتبار سے تینوں سورتوں کا زمانۂ نزول قریب قریب معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ الشعراء اور سورۃ النمل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی کے اجزاء بیان ہوئے ہیں لیکن پیشِ نظر سورۃ میں وہ مختلف اجزاء باہم مل کر ایک پورا قصہ بن گئے ہیں۔ سابق سورۃ میں بنی اسرائیل کی طرف صرف ایک مخفی اشارہ تھا۔ اس سورۃ میں ان کے صالحین اور مفسدین دونوں کا رویہ نسبتاً وضاحت سے زیرِ بحث آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہود کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

موضوع اور مباحث

پہلی تقریباً ۴۳ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت، ان کی ولادت باسعادت کے وقت سے لے کر تورات کے عطا کئے جانے تک بیان کی گئی ہے۔ اس مبارک سرگزشت کا ایک ایک پہلو اپنے اندر نہ جانے کیسی روشنی کا سامان رکھتا ہے۔ انسانی ذہن اس کے ادراک اور اس کے احاطہ سے یقیناً عاجز ہے۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو جابجا جھلکتی دکھائی دیتی ہیں اور عرصۂ حیات ان سے جگمگا رہا ہے۔ ان میں سے چند باتوں کا تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ یہ مبارک سرگزشت آنحضرت ﷺ کو اسی مقصد کیلئے سنائی جا رہی ہے جس مقصد سے سورۃ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت سنائی گئی ہے کہ اس آئینہ میں نبی کریم ﷺ بھی اچھی طرح دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت و صیانت اور اپنی اسکیموں کو بروئے کار لانے کیلئے اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے۔ اور آپؐ کے مخالفین بھی دیکھ لیں کہ اس دعوت کی مخالفت میں بالآخران کو کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔

۲۔ نبوت کسی شخص کو کسی بڑے جشن اور زمین و آسمان سے کسی بھاری اعلان کے ساتھ نہیں دی جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راہ چلتے نبوت نہ مل جاتی۔ طورِ سینا کی سنسان وادی میں کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ تاریخ کتنا بڑا موڑ مڑ گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خود ایک لمحے پہلے تک معلوم نہ تھا کہ آپؑ کتنی بڑی ذمہ داری سے گراں بار ہونے والے ہیں۔ تو پھر اس حوالے سے آنحضرت ﷺ پر اعتراض کیا معنیٰ؟

Marfat.com

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون نے جو کچھ کیا اس کے بیان کے ضمن میں استعماری طاقتوں اور نورِ ایمان سے محروم جابر حکمرانوں کے طور اطوار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کی ڈپلومیسی کی حقیقت واشگاف کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی بھلائی کی بجائے ان میں منافرت اور مختلف طبقات کو پیدا کر کے اپنی حکومت کی طوالت کا سامان کرتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر فقط اپنے ایوانِ اقتدار کو مستحکم بنانا ہوتا ہے۔ اس کیلئے انہیں جو کچھ بھی کرنا پڑے اس سے انہیں عار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی رعایا کے اتحاد و اتفاق کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

۴۔ بنی اسرائیل اور قریش پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول نہ ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ان گوشوں سے بھی واقف ہوتے جن سے تم بھی صحیح صحیح اور اس تفصیل سے واقف نہیں ہو۔

۵۔ مخالفین سے فرمایا گیا ہے کہ تم جو بار بار یہ کہتے ہو کہ محمد (ﷺ) کو وہ کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ یعنی جیسے کچھ معجزات انہیں عطا کئے گئے تھے بلکہ فرعون کے پاس جانے سے پہلے دو بڑے معجزات سے آپؑ کو مسلح کیا گیا تھا، اس طرح آنحضرت ﷺ کو ایسے کھلے کھلے معجزات کیوں نہ دیئے گئے؟ تو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جن لوگوں کو معجزات دکھائے گئے تھے انہوں نے کیا کیا تھا۔ بجائے ایمان لانے کے انہوں نے اسے جادو قرار دیا۔ کیونکہ وہ حق کیخلاف ہٹ دھرمی اور عناد میں مبتلا تھے۔ اس لئے ایسے کھلے معجزات بھی ان کی ہدایت کا باعث نہ بن سکے۔ اسی مرض میں آج تم مبتلا ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ایسے کھلے معجزات تمہیں دکھائے جائیں اور پھر ان کے انکار کے نتیجے میں تمہارا بھی وہی انجام ہو جو فرعون اور قومِ فرعون کا ہوا تھا۔ تم جب تک اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے، اس وقت تک ایسے معجزات مانگ کر اپنی شامت کیوں بلانا چاہتے ہو؟

۶۔ آنحضرت ﷺ کو یہ تسلی بھی دی گئی ہے کہ اس قرآن کو آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے مانگ کر نہیں لیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ پر اس کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ تو جس نے آپؐ پر یہ بار ڈالا ہے وہ خود اس کی کامیابی کا سروسامان بھی کرے گا۔ آپؐ مخالفوں کی مخالفت اور راہ کی مشکلات سے بے پرواہ ہو کر اپنا فرض انجام دیتے جایئے۔ نتیجہ اس کے حوالے کیجئے جس نے آپؐ پر یہ فرض عائد کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد جو بڑی بڑی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں وہ اجمالاً حسب ذیل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کو آنحضرت ﷺ کی نبوت کا ثبوت قرار دیا ہے کہ آپؐ اُمی ہونے کے باوجود دو ہزار سال پہلے گزرے ہوئے ان تاریخی حقائق کو کیسے بے نقاب کر رہے ہیں جبکہ آپؐ کے پاس ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ آپؐ کے شہر اور آپؐ کا ماحول علم اور معلومات کی ہر بات سے کوسوں دور ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ دنیا کیلئے نعمت اور رحمت قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ ایک عرصۂ دراز سے آپؐ کی قوم میں کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی۔ اب آپؐ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت و شریعت کو دنیا میں پھر زندہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا فضل و کرم ہے جس کے ذریعے سے آپؐ کی قوم پر حجت بھی تمام کی جا رہی ہے اور قبول کرنے والوں کو اپنی رحمتوں سے نہال کیا جا رہا ہے۔

باہر سے آنے والے ایک عیسائی وفد کے حوالے سے جو اسلام کی دعوت سن کر اسلام کو قبول کر چکا تھا، شرم دلائی گئی کہ باہر سے آنے والے جس ہدایت سے فیضیاب ہو رہے ہیں مکے کے لوگ نہ صرف اپنے آپ کو اس سے محروم کر رہے ہیں بلکہ اس کے راستے میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔

Marfat.com

قارون کا ذکر فرما کر ایک سرمایہ دار ذہن کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ وہ بے پایاں دولت رکھتے ہوئے بھی دولت سے کبھی سیر ہونے میں نہیں آتا۔ دولت کی ریل پیل کے باوجود اس کا دل اتنا سخت اور سینہ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ اپنے وقت کے عظیم پیغمبر تک کی نصیحت پر کان دھر کے نہیں دیتا۔ اور اپنی دولت ورفاہیت کو اپنی ذہانت، معاملہ فہمی اور کاروباری مہارت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ یہی وہ بدبخت گروہ ہے جو انسانیت کیلئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان شرکاء وشفعاء کی بے حقیقتی کی وضاحت فرمائی گئی ہے جن کو مشرکین اپنی تمام کامیابیوں کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر ان کو انہوں نے چھوڑ دیا تو ان پر تباہی آجائے گی۔

آخر میں کفارِ مکہ کے اس عذر کو ذکر فرمایا ہے جو آنحضرت ﷺ کی دعوت کے مقابلے میں وہ پیش کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اہلِ عرب کے دینِ شرک کو چھوڑ کر اس نئے دینِ توحید کو قبول کرلیں تو اس ملک سے ہماری مذہبی، سیاسی اور معاشی برتری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ہم عرب کے سب سے زیادہ بااثر قبیلے کی حیثیت کھو کر بے خانماں اور بے نوا ہوجائیں گے۔ یہی ان کی حق دشمنی کا اصل محرک تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر آخر سورۃ تک مفصل کلام فرمایا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۸۸	سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ (۲۸)	رُكُوْعَاتُهَا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰسٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ
نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۳ اِنَّ
فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ
طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ
كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۴ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا
فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۵ وَ
نُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا
مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۶ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ
اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ
وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷
فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۭ اِنَّ
فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸ وَقَالَتِ امْرَاَتُ
فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ

Marfat.com

اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ
مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى
قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠﴾ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ
فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١١﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ
الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ
يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿١٢﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ
تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ ع

رکوع: ۱۔ (طا۔ سین۔ میم۔ ۱) یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ۲) ہم آپ کو حضرت موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کی ہدایت کیلئے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۳) بیشک فرعون سرزمینِ مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا، ان کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا، بیشک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ ۴) اور ہم چاہتے تھے ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک (مصر) میں کمزور بنا دیا گیا تھا اور ان کو پیشوا بنائیں اور انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث بنائیں۔ ۵) اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو ان کی جانب سے وہ دکھائیں جن کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ ۶) اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاؤ، جب تمہیں اس کے بارے میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور کچھ خوف اور غم نہ کرو، ہم اسے تمہارے پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو رسولوں میں شامل کریں گے۔ ۷) تو فرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھا لیا تا کہ وہ ان کا دشمن اور ان کیلئے سبب رنج بنے، بیشک فرعون وہامان اور ان کے لشکر بڑے غلط کار تھے۔ ۸) اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ

Marfat.com

میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے۔ ۹) اور موسیٰ کی ماں کا دل اڑا جارہا تھا، قریب تھا کہ وہ اس کے راز کو ظاہر کر دیتی، اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ بنی رہے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی۔ ۱۰) اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جا، چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۱۱) اور ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں، تو اس لڑکی نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو آپ لوگوں کی خاطر اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ دیکھ بھال کریں۔ ۱۲) پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو، اور تا کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق اور سچ ہوتا ہے مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ ۱۳)

طٰسٓمّٓ ① تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ②

(طا۔ سین۔ میم۔ ۱) یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔ ۲)

کتابِ مبین کا مفہوم

حروف مقطعات کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں یعنی یہ کتاب خود بھی روشن ہے اور ان احکام وقصص کو بھی نہایت تفصیل سے بیان کرتی ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ کتابِ مبین کے اندر ایک پہلو تو احسان و امتنان کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانی ہدایت کیلئے جو آخری کتاب اتاری ہے وہ نہایت روشن اور واضح کتاب ہے، اس کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کی الجھن ہے اور نہ دشواری ہے۔ اس کا ہر بیان نہایت سلجھا ہوا اور ہر دور میں فہم اور عمل کیلئے آسان ہے۔ اور زمانے کا کوئی علمی تغیر اس کی کسی بات پر کہنگی یا از کار رفتہ ہونے کی تہمت نہیں لگا سکتا۔ اور دوسرا پہلو اتمامِ حجت کا ہے۔ یعنی اس کتاب کے نازل ہو جانے کے بعد انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر کرنے کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا۔ چونکہ اس میں ہر دور کی ضروریات اور ذہنی اپروچ کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے کسی دور کا انسان بھی بہانہ تلاش نہیں کر سکتا۔

نَتْلُوْا عَلَیْکَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ③

(ہم آپ کو حضرت موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ ان لوگوں کی ہدایت کیلئے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۳)

سرگزشت کے سنانے کا اصل مقصد

اس آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن آیت کے آخری الفاظ خود بول رہے ہیں کہ اس واقعہ کو سنانے کا مقصد داستان سرائی نہیں بلکہ وہ لوگ جو ایمان لانا چاہتے ہیں لیکن حق و باطل کی کشمکش اور اس میں پیش آنے والا زیرو بم ان کے ارادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ وہ جب مشرکین کے مظالم کو دیکھتے ہیں تو ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں اور مسلمانوں کی مظلومیت ان کے حوصلوں میں اضمحلال پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے سامنے یہ واقعہ سنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مکے کے فراعنہ فرعون

Marfat.com

مصر سے زیادہ طاقتور نہیں اور نہ مکے کے مسلمان بنی اسرائیل سے زیادہ کمزور ہیں۔ باایں ہمہ حق و باطل کی کشمکش کا نتیجہ حق کی سربلندی اور باطل کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق شروع میں بظاہر کمزور دکھائی دیتا ہے اور مخالفین کا ظلم ایسا لگتا ہے کہ حق کو نگل جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ حق سورج کی طرح سربلند ہوتا اور اندھیرے سمٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور آخرکار وہ وقت آ جاتا ہے جب تاریکی کے مسافروں کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔ وہ اسلام کی آغوش میں آ جاتے ہیں یا حالات کی نذر ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات تورات میں بھی بیان ہوئے ہیں لیکن ان واقعات میں وہ عبرت و موعظت نظر نہیں آتی جو سرگزشتِ موسیٰ سے مقصود ہے۔ قرآنِ کریم نے "بالحق" کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ تورات اور تلمود میں اس سرگزشت کے بیان کرنے میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے جبکہ قرآنِ کریم اس سرگزشت کو اس طرح بیان کرتا ہے جس میں روایت میں دیانت کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور سرگزشت کی اصل روح کو نمایاں کیا گیا ہے جو واقعہ کا حاصل ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④

(بیشک فرعون سرزمینِ مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا اور اس نے اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، ان میں سے ایک گروہ کو اس نے دبا رکھا تھا، ان کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا، بیشک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ ۴)

سرگزشت کے مقصد کے اہم اجزاء

اصل سرگزشت شروع کرنے سے پہلے یہ اور اس کے بعد کی دو آیتوں میں اس غایت و مقصد کو سامنے رکھ دیا گیا ہے جو اس سرگزشت سنانے کا اصل مقصود ہے۔ پیشِ نظر شاید یہ ہے کہ سرگزشت پڑھتے ہوئے یہ مقصد نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کو چند نکات کی صورت میں ایک ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ اندازِ بیان چونکہ ایجاز کا حُسن لئے ہوئے ہے جس کی نزاکتوں کو کماحقہ ملحوظ رکھنا ہمارے بس میں نہیں، تاہم قرآنِ کریم کی بیان کردہ ترتیب کے مطابق ہم کسی حد تک اسے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ فرعون سرزمینِ مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا۔ عَلَا کا مصدر علو ہے جس کا معنی ہے سرکشی۔ زمین میں سرکشی یہ ہے کہ زمین کے اصل خالق و مالک کی مرضی اور اس کے احکام کو نظرانداز کر کے کوئی اس میں اپنی من مانی کرنے لگ جائے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی اور اطاعت میں داخل کرنے کی بجائے ان سے اپنی بندگی اور غلامی کرانے لگے۔ فرعون نے سرزمینِ مصر میں یہی روش اختیار کی تھی۔ وہ اس بات کو بھول گیا تھا کہ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور مجھے بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ زمین کی طرح میں بھی اس کی مخلوق ہوں، زمین جس کے حکم سے گردش کرتی ہے میں بھی اسی کے حکم سے زندگی گزارنے کا پابند ہوں۔ لیکن اس نے زمین میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کی بجائے باغیانہ روش اختیار کی اور اپنی بندگی کے مقام سے اٹھ کر خودمختاری اور خداوندی کا لبادہ پہن لیا۔ اور زمین کے خزانوں کا مالک ہو کر خدائی کا صور پھونکنے لگا اور جبار اور متکبر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

Marfat.com

دوسری بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرعون کی حکومت انسان دوست اور عادلانہ حکومت نہ تھی بلکہ اس نے ملک کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں نہ تھے۔ ملک کا طبقۂ اشرافیہ جس سے وہ خود بھی تعلق رکھتا تھا ملک کا مقتدر طبقہ تھا۔ غیر معمولی مراعات نے اس طبقے کو خودسر بنانے کے ساتھ ساتھ حکومت کا آلۂ کار بھی بنا دیا تھا۔ وہ حکومت کے ہر فیصلے کو اپنا فیصلہ سمجھتے تھے اور ان کی ظالمانہ روش کو حکومت کی روش پر محمول کیا جاتا تھا۔ یہ بالائی طبقہ چونکہ حکومت کیلئے ناگزیر ہو گیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ نچلے طبقوں کو مزید کمزور کر دیا جائے تاکہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ یوں تو تمام نچلے طبقات فرعون اور آلِ فرعون کے مظالم کا شکار تھے لیکن تاریخ ہمارے سامنے ظلم کا ایک اور گوشہ بھی بے نقاب کرتی ہے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل خاص طور پر حکومت اور قبطیوں کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب برپا ہوا تھا غالباً حضرت یوسف علیہ السلام سے ایک صدی کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ چونکہ اس انقلاب کے نتیجے میں بنی اسرائیل اقتدار سے محروم ہوئے اور قبطیوں کے ہاتھ میں دوبارہ اقتدار آیا۔ ان کی نئی بننے والی حکومت نے قوم پرستی کو اپنا شعار بنایا اور ان کی قوم کے علاوہ جو قومیں مصر میں آباد تھیں ان کا زور توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کیلئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو عام طور پر قوم پرستانہ حکومتیں اختیار کیا کرتی ہیں۔ یعنی مختلف قوموں میں قومیت کی بنیاد پر اختلافات کو تعصبات کی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے اور پھر ہر اختلاف کو ان تعصبات میں اضافہ کرنے کیلئے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرعون نے بھی ایسا ہی کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقاتی منافرت ملک میں فزوں تر ہوتی چلی گئی۔ طبقۂ اشرافیہ نے قوم پرستانہ جذبات سے کام لیتے ہوئے دوسرے گروہوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا اور فرعون اور اس کی حکومت نے ہر ممکن طریقے سے ان کو تحفظ دیا۔

تیسری بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون نے یہ محسوس کیا کہ بنی اسرائیل توالد و تناسل کے ذریعہ سے اپنی افرادی قوت میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں اور بعض دوسرے قبائل جو حکومت کے مظالم کا شکار ہیں وہ بھی درپردہ ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ اگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کو نہ روکا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ اپنی افرادی قوت کے بل بوتے پر کوئی انقلاب برپا نہ کر دیں چنانچہ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے گھروں میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا جائے۔ جب بھی یہ معلوم ہو کہ کسی گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے تو دیکھو اگر بیٹی پیدا ہو تو اسے چھوڑ دو اور اگر بیٹا پیدا ہو تو اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور پولیس کا کام یہ ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ اس طرح سے ان کی تعداد میں اضافہ رک جائے گا اور ان کی عورتیں ہمارے گھروں میں کام کاج کی ذمہ داریاں بھی ادا کریں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ذریعہ سے قبطی نسل میں اضافے کا سامان کیا جا سکے۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائیدادوں سے محروم کیا، پھر انہیں حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقتور ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لینے لگے۔ اور یہ ظلم بڑھتے بڑھتے بچوں کے قتلِ عام تک پہنچا۔ مقصود یہ تھا کہ کسی طرح بنی اسرائیل کو دبا کر رکھا جائے اور ان کی تعداد میں اضافے کی بجائے کمی کی جائے۔ مگر یہ بات جو ہمارے یہاں مشہور ہو گئی ہے کہ فرعون سے کسی نجومی نے یہ کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جس کے ہاتھوں فرعونی اقتدار کا تختہ الٹ جائے گا یا فرعون نے خود کوئی ایسا خواب دیکھا تھا اور اس خطرے کو روکنے کیلئے فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس کا ذکر نہ تو تورات میں ہے اور نہ قرآنِ کریم میں۔ یہ افسانہ تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے ہمارے یہاں نقل ہوا اور مشہور ہوا۔

Marfat.com

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ فرعون خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بجائے اپنی حاکمیت کا صور پھونکا اور اپنی رعایا میں طبقات پیدا کیے اور عدل و مساوات کی بجائے ظالمانہ حکومت قائم کی اور خدا کی زمین کو ظلم اور فساد سے بھر دیا۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾

(اور ہم چاہتے تھے ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک (مصر) میں کمزور بنا دیا گیا تھا اور ان کو پیشوا بنائیں اور انہیں (فرعون کے تاج و تخت کا) وارث بنائیں۔ ۵) اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو ان کی جانب سے وہ دکھائیں جن کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔ ۶)

فرعون کے مظالم کے برعکس خدائی فیصلہ

گزشتہ آیت میں فرعون کے ظالمانہ عزائم کا ذکر فرما کر یہ دکھایا گیا ہے کہ فرعون تو بنی اسرائیل کو مختلف طریقوں سے بے بس اور کمزور کر کے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ابھرنے کا موقع نہ دیں۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ ان کی قومی انفرادیت کو تباہ کر دیا جائے اور وہ رفتہ رفتہ قبطی قوم کا ایک حصہ بن جائیں، لیکن پروردگار فرماتا ہے کہ فرعون اور آل فرعون کے مقابلے میں ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ ہم مظلوموں پر احسان کریں۔ ان کو ظلم و ستم کی چکی سے نکال کر پیشوائی کا منصب بخشیں اور ظالموں کو مٹا کر مظلوموں کو وراثت و خلافت عطا کریں۔ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی دینی پیشوائی جو مصر میں قومی انقلاب کے برپا ہو جانے کے بعد عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہے اور اب فرعون اپنے آپ کو سورج دیوتا کا اوتار قرار دے کر پیشوا بنا بیٹھا ہے۔ اس دینی منصب پر دوبارہ بنی اسرائیل کو بحال کیا جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو یہ پیشوائی حاصل ہوئی اور نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ سے مراد خلافت و ملوکیت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ حکومت بھی عطا کی۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد عرصہ دراز تک بنی اسرائیل کو اقتدار حاصل رہا۔ اب جبکہ وہ ایک طویل عرصہ سے اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور بری طرح سے اذیتوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ انہیں خلافت و حکومت دینے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے اس کا آغاز ہوا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس کی حدود یہاں تک وسیع ہو گئیں کہ فلسطین اس حکومت کا مرکز قرار پایا اور مصر جیسی سلطنتیں اس کی باج گزار بن گئیں۔ اور اسی وراثت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اب جبکہ فرعون اور ہامان کا اقتدار اپنے عروج پر ہے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہیں اچانک نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ان لوگوں کو اقتدار اور صولت و دبدبہ بخشا جائے۔ جو غلاموں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں اور مصر میں ایسا انقلاب برپا کر دیں جس کے اندیشے میں فرعون اور ہامان گھلتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی شوکت و حشمت کے باوجود اس بات سے خوفزدہ تھے کہ بنی اسرائیل کی تعداد روز بروز غیر معمولی طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ قوت حاصل کر لیں اور ملک پر قبضہ جما لیں یا باہر کے دشمنوں سے مل کر قبطیوں کو بے دخل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ ان کے اندیشوں کو حقیقت بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد کی آیتوں میں ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بھی سامنے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادے کی عملی صورت بھی پوری شان کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔

Marfat.com

ہامان کے بارے میں وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں پہلی دفعہ فرعون کے ساتھ ہامان کا ذکر آیا ہے۔ اور اس طرح آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت فرعون کے وزیر کی تھی۔ لیکن تورات میں اس کا نام مرقوم نہیں۔ اس بنیاد پر مغربی مستشرقین نے اس پر بہت قیل وقال سے کام لیا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ قرآنِ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت میں ایک ایسا اضافہ کر رہا ہے جس کے بارے میں آسمانی کتابیں اور تاریخ کا تمام ذخیرہ بالکل خاموش ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علمی دنیا اس پر شکر گزار ہوتی، لیکن مستشرقین جو اپنے آپ کو علم اور تحقیق سے منسوب کرتے ہیں اس پر شکرگزار ہونے کی بجائے تنقید کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور تنقید میں جو باتیں کہتے ہیں اگر یہی باتیں ان کی کسی علمی کتاب کے بارے میں کسی اور جانب سے کہی جاتیں تو یہ اس کو اضحوکہ روزگار بنا لیتے۔ لیکن انہیں کچھ اندازہ نہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی علمی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔ اندازہ فرمائیے ان کا کہنا یہ ہے کہ ہامان تو ایران کے بادشاہ اخسویرس کے دربار کا ایک امیر تھا اور اس کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے مصر لے جا کر فرعون کا وزیر بنا دیا۔ جس آدمی کے دماغ میں تھوڑی سی بھی عقل ہے بشرطیکہ وہ تعصب سے بیکار نہ ہو چکی ہو وہ کبھی اس بات کو باور نہیں کر سکتا کہ دنیا میں ہامان نام کا صرف ایک ہی شخص ہوا ہے حالانکہ ہر نام کے لوگ ہر دور میں بے شمار رہے ہیں۔ اگر فرعون کے ہم نشینوں میں بھی کوئی شخص ہامان نام کا رہا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا یہ حضرات یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کو فرعون اور اس کے تمام وزراء واعیان اور اس عہد کے تمام اکابرِ مصر کے ناموں کی فہرست مل گئی ہے، یا وہ کم از کم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فرعون کی کابینہ میں جتنے وزراء تھے ہم تمام سے نام بنام واقف ہیں اور ہمارے پاس ان کا نہایت مصدقہ ریکارڈ موجود ہے۔ ظاہر ہے ایسا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو اس فرعون کے بارے میں بھی متفق اللفظ نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہمعصر تھا۔ بس قرآنِ کریم کی مخالفت کا جنون اور اسلام سے حد سے بڑھا ہوا تعصب انہیں بالکل سامنے کی بات کو سمجھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کا علم کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ
وَلَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝

(اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلاؤ، جب تمہیں اس کے بارے میں اندیشہ ہو تو اس کو دریا میں ڈال دیجیو اور کچھ خوف اور غم نہ کرو، ہم اسے تمہارے پاس واپس لے آئیں گے اور اس کو رسولوں میں شامل کریں گے۔ ۷)

اصل سرگزشت کا آغاز

یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصل سرگزشت شروع ہوتی ہے۔ البتہ اس میں آپؑ کی ولادت کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ کسی بچے کو دودھ پلانے کا حکم اس کی ولادت کے بعد ہی دیا جاتا ہے۔ اس لئے جب دودھ پلانے کا ذکر آئے گا تو ولادت کا ذکر خود بخود ہو جائے گا۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ جب فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دے چکا تھا اور ہر اسرائیلی گھر میں ایک ہراس طاری تھا انہی دنوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ بائیبل اور تلمود کے بیان کے مطابق آپؑ کا خاندان حضرت یعقوب علیہ السلام

Marfat.com

کے بیٹے لاوی کی اولاد میں سے تھا۔ تورات اور تلمود میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ماجد کا نام عمرام بتایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے عمران سے تعبیر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ محض زبانوں میں اختلاف کا نتیجہ ہو۔ آپؑ کے ایک بھائی اور بہن تھی۔ بھائی کا نام ہارون ہے اور بہن کا نام مریم۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی اولاد میں بیٹوں کے قتل کیے جانے کا حکم ان دونوں کی پیدائش کے بعد کا ہے۔ اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت چونکہ یہ قانون نافذ ہوچکا تھا اس لئے جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ان کے والدین کیلئے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ انہیں ہروقت اندیشہ رہنے لگا کہ اگر گھر میں بچے کی موجودگی کا شبہ بھی ہوگیا تو موسیٰ سلامت نہیں رہیں گے۔ یہ اندیشہ اس خیال سے اور بھی زیادہ تشویشناک ہوگیا تھا کہ تلمود کے بیان کے مطابق فرعون کی حکومت نے گھروں میں جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ چھوٹے بچے لے کر گھروں میں جاتیں اور کسی نہ کسی بہانے بچوں کو رُلانے کی کوشش کرتیں تاکہ بچے کے رونے کی آواز سن کر گھر میں اگر کوئی بچہ چھپایا ہوا ہے تو وہ بھی رونے لگے۔ اس نئے طرزِ جاسوسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی پریشانی میں بہت اضافہ کردیا تھا۔ بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے بعد تین مہینے تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ان کو چھپائے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے انہیں وحی کی کہ جیسے ہی آپ بچے کیلئے کوئی فوری خطرہ محسوس کریں تو آپ اسے دریا کی نذر کردیں اور سورۃ طٰہٰ میں اس کا طریقہ بھی وحی کیا گیا ہے۔ اِقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ ''بچے کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دو۔'' بائبل اور تلمود سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرہ بنایا اور اسے چکنی مٹی اور رال سے لیپ کر محفوظ کردیا۔ پھر اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ البتہ ان کتابوں میں یہ نہیں بتایا گیا کہ دریا میں اس طریقے سے ڈالنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا تھا۔ قرآنِ کریم نے اسے واضح فرمایا ہے کہ دریائے نیل میں اس طریقے سے ڈالنے کا حکم پروردگار نے وحی کیا تھا۔ اور اس وحی میں صرف یہ تسلی نہیں دی گئی تھی کہ ہم موسیٰ کی حفاظت کریں گے بلکہ یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ ہم اسے واپس تمہارے پاس لائیں گے اور انہیں رسالت عطا کریں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہاں وحی سے مراد وہ اصطلاحی وحی نہیں ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ اس سے مراد الہام والقاء یا رؤیا کے ذریعے سے اس طرح دل میں کوئی بات ڈال دینا ہے جس سے دل کو اس بارے میں فی الجملہ اطمینان ہوجائے۔ چنانچہ یہی وحی ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو سہارا دیا۔ آپ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والی ایک خاتون تھیں۔ جب ہاتفِ غیبی نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی تو وہ ہر طرح کے خطرے کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہوگئیں۔ چنانچہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب خطرہ سر پر پہنچا چاہتا ہے تو انہوں نے سرکنڈوں کا ایک صندوق سا بنا کر اپنے بیٹے کو اس میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اسے دریائے نیل کی موجوں کے حوالے کردیا۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ﴿۸﴾ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾

(توفرعون کے گھر والوں نے اس کو اٹھالیا تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کیلئے سببِ رنج بنے، بیشک فرعون وہامان اور ان کے لشکر بڑے غلط کار تھے۔ ۸) اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہم کو نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے۔ ۹)

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پانی میں ڈال دیئے جانے کے بعد کی صورتحال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو پانی میں ڈال دیئے جانے کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ دریائے نیل اسرائیلیوں کی بستیوں سے گزرتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے یقیناً گھر کے قریب سے تابوت کو پانی میں ڈالا۔ وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ فرعون کے محل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں دریا کی موجوں نے صندوق کو کنارے پر ڈال دیا اور دریا چونکہ فرعون کے محلات سے چھو کے گزرتا تھا تو جیسے ہی فرعون کے خدام کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے اسے نکال لیا۔ ممکن ہے بادشاہ اور ملکہ اس وقت دریا کے کنارے پر سیر کر رہے ہوں۔ نوکروں نے انہیں خبر دی اور صندوق ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ صندوق کو کھولا گیا تو یہ دیکھ کر انہیں کوئی حیرت نہ ہوئی کہ صندوق میں ایک موہنا بچہ لیٹا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گئے کہ کسی اسرائیلی نے اپنے بچے کو قتل سے بچانے کیلئے یہ حرکت کی ہے۔ اس موقع پر فرعون نے خود یا کسی نوکر کے توجہ دلانے پر ارادہ کیا کہ اس بچے کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن فرعون کی بیوی جیسا کہ سورۃ تحریم سے معلوم ہوتا ہے نہایت نیک دل خاتون تھی۔ اس نے اپنی طبعی شرافت اور ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا کہ ذرا اس بچے کو دیکھئے، ایسا لگتا ہے جیسے چاند نکل آیا۔ کیا یہ بچہ اس قابل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ پیغمبر تو ویسے بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ کبھی کسی بدصورت کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا نہیں کی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو خاص طور پر سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ”میں نے اپنی طرف سے تیرے اوپر محبت ڈال دی تھی۔“ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسی موہنی صورت دی تھی کہ دیکھنے والا بے اختیار پیار کرنے لگتا تھا۔ اس لئے ملکہ نے اپنے شوہر سے سفارش کرتے ہوئے کہا آپ قتل کرنے کی بات کرتے ہیں، یہ تو میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ میری آنکھیں تو اسے دیکھ کر ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ اسے قتل کرنے کا ارادہ مت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک فرعون کے یہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملکہ نے کہا کہ جب یہ بچہ ہمارے یہاں پلے گا، اسے کیا خبر یہ کس کا بیٹا ہے۔ اگر یہ بنی اسرائیل میں سے بھی ہے تو محل میں رہ کر شہزادوں جیسے طور اطوار سیکھ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ صاحبِ صلاحیت نکلے تو ہم اس کی ذات سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر ہمیں واقعی نرینہ اولاد سے محرومی رہی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب وہ امیدوں کے جھولے میں بہل رہے تھے تو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ فرعون اپنے آپ کو رب کہتا تھا، لیکن رب صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ میرے گھر میں آنے والا بچہ ایک نئی صبح کا پیغام بن کر آیا ہے۔ اور گزشتہ آیت میں اس پوری صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا کہ فرعون، ہامان اور اس کے لشکر اپنی حماقت سے یہ سمجھتے تھے کہ سرزمینِ مصر پر کوئی پتہ ان کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ اور تمام اختیار و اقتدار کے بلاشرکتِ غیرے وہ مالک ہیں۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ بچہ جو بظاہر لاوارث معلوم ہوتا ہے انہی کے ہاتھوں اور انہی کے محل میں پروان چڑھ کر انہی کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠﴾

(اور موسیٰ کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا، قریب تھا کہ وہ اس کے راز کو ظاہر کر دیتی، اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے کہ وہ بنی رہے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی۔ ۱۰)

Marfat.com

ماں کی بے قراری اور اللہ تعالیٰ کی دستگیری

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے خطرات کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بیٹے کو دریائے نیل کی موجوں کے حوالے تو کر دیا اور ایک غیبی وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے غیر معمولی اقدام کر ڈالا۔ لیکن اس کے بعد ماں کی ممتا بے قابو ہونے لگی، دل کا قرار رخصت ہو گیا، سوائے بیٹے کے تصور کے ہر چیز دل سے نکل گئی۔ کوشش کے باوجود اعصابی نظام ٹوٹنے لگا۔ بعض اسرائیلی روایات کے مطابق جب اسے یہ خبر ہوئی کہ دریائے نیل سے بچے کو فرعون کے ملازموں نے اٹھایا ہے اور اسے فرعون کے پاس پہنچا دیا گیا ہے تو یہ خبر اس کے صبر و قرار کیلئے بہت بڑا امتحان بن گئی۔ قریب تھا کہ اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جائے جس سے سارا راز فاش ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت نے دستگیری فرمائی۔ وہی اپنے بندوں کو بڑے سے بڑے امتحان میں ڈالتا ہے۔ اور جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ امتحان ان کیلئے ہمت شکن ثابت ہو رہا ہے تو پھر وہی ہمت عطا کرتا اور حوصلہ دیتا ہے۔ یہی تو موقع ہوتا ہے جب ایک مومن ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے جس طرح بچہ نڈھال ہو کر ماں کی آغوش میں گرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ:

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی پروردگار نے اپنی سنت کے مطابق سنبھالا دیا، اس کے ایمان و توکل کو مضبوط کیا تاکہ اس سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو اس کی شان کے منافی ہو۔

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١١﴾

(اور اس نے اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جا، چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۱۱)

تسلی کی ایک تدبیر

ایک خطرناک اقدام کے نتائج سے بچنے کیلئے ہر انسان آخر حد تک تدبیر کرتا ہے اور بعض دفعہ وہ خود بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ میرے بس میں نہیں۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے میں اس پر بھی اختیار نہیں رکھتا۔ لیکن یہ وقتی دلاسے انسان کی فطرت ہیں جس سے وہ رک نہیں سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپؑ کو دریا میں ڈال دیا۔ آپ جانتی ہیں کہ دریا کا پانی جہاں چاہے گا لے جائے گا، میں اسے روکنے سے عاجز ہوں۔ اس کے باوجود محض دل کو تسلی دینے کیلئے بیٹی سے کہا کہ تم اپنے بھائی کے صندوق کے پیچھے پیچھے کنارے کنارے چلو۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ صندوق بالآخر نظروں سے اوجھل ہو جائے گا، لیکن اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا تھا۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن وہ اس قدر ذہین لڑکی تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو اس طرح کنارے کنارے دیکھتی چلی گئی کہ صندوق اس کی نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہوا اور کسی کو اس واقعہ کی طرف توجہ بھی نہ ہو سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی بستیوں سے فرعون کا محل زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ بہن یہ اندازہ کرنے میں کامیاب رہی کہ چھوٹے بھائی کا تابوت محل کے کنارے پانی سے نکال لیا گیا ہے اور نہایت احتیاط سے اسے محل کے اندر لے جایا گیا ہے اور پھر ادھر ادھر گھومتے ہوئے نہ جانے کس طرح اس نے یہ راز معلوم کر لیا کہ ملکہ صاحبہ کو دودھ پلانے کیلئے کسی ایسی انّا کی تلاش ہے جس کے دودھ کو بچہ قبول کر لے، کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بچہ کسی کا دودھ قبول نہیں کر رہا اور ملکہ اس کی وجہ سے پریشان ہے۔

Marfat.com

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

(اور ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں، تو اس لڑکی نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو آپ لوگوں کی خاطر اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ دیکھ بھال کریں۔ ۱۲)

اللہ تعالیٰ کی کارسازی

بچہ جب شاہی محل میں پہنچ گیا تو محل والوں کو سب سے پہلے اس بات کی فکر ہوئی کہ بچے کو دودھ پلانے کا انتظام کیا جائے اور اس کیلئے کسی دایا یا انّا کو ڈھونڈا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے بالائی طبقے میں بھی عرب کے بڑے خاندانوں کی طرح یہ رواج تھا کہ بیگمات بچوں کو دودھ پلانے کی بجائے عموماً انّاؤں کے دودھ پلانے کیلئے سپرد کرتی تھیں۔ اور یہ دودھ پلانے والیاں عام طور سے شہر کے باہر یا مضافاتی بستیوں میں رہتی تھیں اور وہیں کھلے ماحول میں بچوں کی تربیت کرتی تھیں اور اس خدمت کیلئے دودھ پلانے والیوں کو تلاش نہیں کرنا پڑتا تھا بلکہ وہ اس خدمت کے حصول کیلئے وقتاً فوقتاً بڑے گھرانوں کا چکر لگاتی رہتی تھیں اور جہاں سے انہیں اچھے معاوضے کی امید ہوتی وہاں خود پہنچ جاتیں اور بچوں کو تربیت کیلئے ساتھ لے جاتیں۔ اسی طریقہ سے فرعون کی ملکہ نے ملازموں کو ادھر ادھر بھجوایا کہ کسی اچھی انّا کو تلاش کر کے لایا جائے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ انّاؤں کو لایا گیا لیکن حضرت موسیٰ نے کسی بھی دودھ پلانے والی کی چھاتی کو منہ نہیں لگایا۔ اس سے محل میں عام پریشانی کی فضا پیدا ہو گئی۔ ملکہ چونکہ بچے کی موہنی صورت سے غائت درجہ پیار کرنے لگی تھیں اس لئے وہ اس صورتحال سے سخت آزردہ تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن یہ معلوم کر کے کہ میرا ننھا بھائی محل کے اندر پہنچ گیا ہے، واپس اپنے گھر پلٹ نہیں گئیں بلکہ ادھر ادھر حالات کی دریافت کیلئے چکر لگاتی رہیں۔ نوکروں کے ہجوم کے باعث محل کی باتیں عام طور پر چھپی نہیں رہتیں۔ یہ ذہین لڑکی معلوم ہوتا ہے کہ محل کی خادماؤں سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی اور ان سے جب اس بات کی خبر ہوئی کہ بچہ کسی کا دودھ قبول نہیں کر رہا تو وہ جرأت سے کام لیتے ہوئے خود ملکہ کے پاس پہنچ گئی اور کہا کہ میں ایک ایسے گھر کو جانتی ہوں جس کی فضا انتہائی صاف ستھری اور جس کے مکین انتہائی خیر خواہ اور محبت کرنے والے ہیں۔ اور اس گھر کی خاتون مجھے امید ہے کہ شوق سے اس خدمت کو قبول کر لے گی۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس گھر کا پتہ آپ کو بتا سکتی ہوں۔ چنانچہ اس ترکیب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے گھر اور اپنی والدہ کی آغوش میں جانے کا راستہ کھل گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلایا گیا۔ انہوں نے جیسے ہی بچے کو اپنی گود میں ڈالا، بچے نے نہایت شوق سے دودھ پینا شروع کر دیا۔ ملکہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور مقصود چونکہ دودھ پلانا نہ تھا بلکہ تربیت کیلئے کسی اچھے گھر کے حوالے کرنا بھی تھا۔ اس طرح یہ بچہ اپنی ماں کی آغوش اور اپنے گھر میں پہنچ گیا۔

بظاہر یہ بات ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی دودھ پلانے والی کا دودھ قبول کیوں نہیں کیا۔ اگر قرآنِ کریم نے اس عقدہ کو نہ کھولا ہوتا تو یہ عقدہ لاینحل رہ جاتا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس عقدہ کو کھولتے ہوئے فرمایا کہ "ہم نے موسیٰ پر مراضع کو حرام کر دیا تھا۔" یہ مرضع کی جمع ہے۔ مصدر میمی میں بھی ہو سکتا ہے اور اسمِ ظرف بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی تھی کہ جہاں سے دودھ پھوٹتا ہے یعنی سینے سے، آپ اپنی ماں کے سوا کسی کے سینے کو منہ نہیں لگائیں گے۔ اور یہی وہ ترکیب تھی جس سے آپ کو ماں کی آغوش میں پہنچایا گیا۔

Marfat.com

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

(پس ہم نے اس کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو، اور تا کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق اور سچ ہوتا ہے مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ ۱۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی آغوش میں واپسی اور اس کی حکمتیں

اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ موسیٰ کو دریا میں ڈال دیں اور حوصلہ رکھیں، ہم اسے آپ کی آغوش میں لوٹا کے لائیں گے اور اسے رسالت کے منصب پر فائز کریں گے۔ چنانچہ اس وعدے کو پورا کرتے ہوئے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس وعدے کے مطابق لوٹا دیا تا کہ ان کی والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ان کا غم دور ہو جائے۔" اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا وعدہ فرما لیتا ہے تو اسے ہر صورت پورا کرتا ہے، چاہے بظاہر اس کا ایفاء کتنا ہی مستبعد کیوں نہ نظر آئے۔ دنیا کی کوئی رکاوٹ اس کے فیصلے کو روک نہیں سکتی۔ اس بات کا یقین نامساعد حالات میں بھی جس طرح پیغمبر کو حوصلہ مند رکھتا ہے، اسی طرح ایمان لانے والوں کیلئے بھی اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔ حالات چاہیں کتنے ہی برگشتہ کیوں نہ ہوں ایک مومن کو یقین ہوتا ہے کہ انہیں تاریکیوں سے کامیابی کا سورج طلوع ہوگا اور اس کے طلوع ہونے کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر لوگ اس یقین و ایمان سے تہی دامن ہوتے ہیں اس لئے حق و باطل کی کشمکش میں وہ ہمیشہ حالات کے تیور پہچانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو نہیں پہچانتے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح کمالِ حکمت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی آغوش میں پہنچایا اسی طرح اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماں کا دودھ، آغوش کی گرمی، ہاتھوں کے لمس اور محبت کی ہمہ گیری نے محل کے ماحول سے اثر قبول کرنے کی بجائے آپ کو ایک ایسا نوجوان بنایا جس کی شریانوں میں نہ صرف اسرائیلی خون دوڑتا تھا بلکہ اس کے ذہن میں وہ تمام تصورات اور خیالات راسخ ہوگئے جو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی وراثت تھے۔ خاندانی روایات، اپنی قوم اور اپنے مذہب سے محبت ان کے دل و دماغ میں اتر گئی۔ اور آپؑ جب تک مصر میں رہے طریقے طریقے سے بنی اسرائیل کی پاسبانی بھی کرتے رہے اور بنی اسرائیل کے نوجوانوں کے شعور کی آبیاری بھی کرتے رہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۴﴾ وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ

Marfat.com

الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى
فَقَضٰى عَلَیْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ
مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ
اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۷﴾ فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا
یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ
لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ
بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ
كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا
فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾ وَ
جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰى ؗ قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنَّ
الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ
النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۰﴾ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۱﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنے شباب کو پہنچ گئے اور ان کی نشوونما مکمل ہوگئی تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم خوبکاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ ۱۴) اور (ایک روز) وہ شہر میں داخل ہوئے جبکہ اہلِ شہر غفلت میں تھے تو آپ نے اس میں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا، ایک ان کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا آپ کے دشمنوں کے گروہ میں سے، تو جو آپ کے گروہ میں سے تھا اس نے آپ سے اس شخص کے مقابل میں مدد کی درخواست کی جو آپ کے مخالفوں میں سے تھا، تو موسیٰ نے اس کے ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا، آپ نے کہا یہ کام شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے، بیشک وہ ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ ۱۵) حضرت موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے بخش دے، تو خدا نے آپ کو بخش دیا، بیشک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۶) حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے رب اس احسان کے بعد جو تو نے مجھ پر کیا ہے میں کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔ ۱۷) پس دوسرے روز حضرت موسیٰ شہر میں داخل ہوئے ڈرتے ہوئے اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتے ہوئے تو اچانک آپ نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل آپ کو مدد کیلئے پکارا تھا، آج پھر آپ کو پکار رہا ہے، حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ تو، تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے۔ ۱۸) پھر جب حضرت موسیٰ نے ارادہ کیا کہ پکڑیں اس شخص کو جو ان دونوں کا دشمن تھا۔ تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ! کیا تم آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا، تم اس ملک میں ایک جبار بننے کا ارادہ کر رہے ہو، تم اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں بننا چاہتے۔ ۱۹) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا، اے موسیٰ! عیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیرخواہوں میں سے ہوں۔ ۲۰) (یہ خبر سنتے ہی) حضرت موسیٰ وہاں سے ڈرتے اور ٹوہ لیتے نکل کھڑے ہوئے اور آپ نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے بچا۔ ۲۱)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

(جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنے شباب کو پہنچ گئے اور ان کی نشوونما مکمل ہوگئی تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا اور ہم خوبکاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ ۱۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوانی

دودھ پینے کی عمر اور ابتدائی تربیت کا زمانہ اپنی والدہ کے پاس گزارنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں منتقل کر دیئے گئے۔ وہیں لڑکپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ گزرا۔ دینی احساسات ماں کے دودھ کے ساتھ آپ کے اندر منتقل ہوئے اور ابتدائی تربیت میں یہی احساسات اعتقاداتِ صالحہ کی صورت اختیار کر گئے۔ اس طرح سے اپنی آباؤ اجداد کی وہ وراثت جو بنی اسرائیل میں خطرے کی حالت میں تھی اس سے وابستگی پیدا ہوگئی۔ فرعون کے محل میں آنے کے بعد جلد ہی آپؑ کی تعلیم کا زمانہ شروع ہوگیا کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ محل میں رہنے والا کوئی بچہ بھی جو شہزادوں کی طرح تربیت پا رہا ہو وہ اس دور کی مروج اور متداول تعلیم سے بیگانہ رہے۔ اس لئے بائیبل کی کتاب الاعمال میں بیان کردہ تفصیل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ’’موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی اور وہ کام اور کلام میں قوت والا تھا۔‘‘

Marfat.com

(۷:۳۳) تلمود کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر میں ایک خوبصورت جوان بن کر اٹھے، شہزادوں کا سا لباس پہنتے، شہزادوں کی طرح رہتے اور لوگ ان کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ وہ اکثر جشن کے علاقے میں جاتے جہاں اسرائیلیوں کی بستیاں تھیں اور ان تمام سختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو ان کی قوم کے ساتھ قبطی حکومت کے ملازمین کرتے تھے۔ انہی کی کوشش سے فرعون نے اسرائیلیوں کیلئے ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انہوں نے فرعون سے کہا کہ دائما مسلسل کام کرنے کی وجہ سے یہ لوگ کمزور ہو جائیں گے اور حکومت ہی کے کام کو نقصان ہوگا، ان کی قوت بحال ہونے کیلئے ضروری ہے کہ انہیں ہفتے میں ایک دن آرام کا دیا جائے۔ اسی طرح اپنی دانائی سے انہوں نے اور بہت سے ایسے کام کئے جن کی وجہ سے تمام ملکِ مصر میں ان کی شہرت ہوگئی تھی۔ (اقتباساتِ تلمود۔ ص ۱۲۹)

علم اور حکم کا مفہوم

مندرجہ بالا اقتباسات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیتِ کریمہ میں جس علم کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مراد دینی اور دنیوی علوم دونوں ہیں۔ اور حکم سے مراد حکمت، دانائی، فہم و فراست اور قوتِ فیصلہ ہے۔ اس حکم اور علم کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے جا بجا یہی الفاظ انبیائے کرام کیلئے استعمال کئے ہیں۔ لیکن یہاں ظاہر ہے کہ وہ علم و حکمت مراد نہیں، کیونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی کے احوال بیان ہو رہے ہیں۔ نبوت تو آپ کو مدین سے واپسی پر کوہِ طور پر عطا کی گئی ہے جبکہ آپ بھرپور جوانی کو پہنچ چکے اور آپ کی عقل اور مزاج میں اعتدال و توازن پیدا ہو گیا تھا۔ اسی اعتدال و توازن اور والدین کی تربیت کا شاید نتیجہ تھا کہ آپ کے اندر ایسے کردار نے جنم لیا جو جسمانی قوتوں، ذہنی صلاحیتوں اور طبیعت کے اعتدال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو قرآنِ کریم میں محسنین کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جو سیرت و کردار کے کمال کا آخری مرتبہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو یقیناً بڑی ذمہ داریوں سے نوازتا ہے۔

عمر کا تعین

قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صرف جسمانی اور ذہنی نشوونما کی تکمیل کی بات کی ہے اور اس تکمیل کے بعد علم اور حکم کے عطا کرنے کا مژدہ سنایا ہے، لیکن عمر کا تعین نہیں فرمایا۔ یہودی روایات میں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مختلف عمریں بتائی گئی ہیں۔ کسی نے ۱۸ سال لکھی ہے، کسی نے ۲۰ سال اور کسی نے ۴۰ سال۔ بائبل کے نئے عہد نامے میں ۴۰ سال عمر بتائی گئی ہے۔ (اعمال ۷:۲۳) لیکن جس ترتیب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے احوال بیان کئے جا رہے ہیں اس میں اس بات کا امکان تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ یا ۲۰ سال ہو۔ ۴۰ سال کی عمر کسی طرح بھی قرینِ قیاس نہیں۔ اس لئے کہ ۴۰ سال کی عمر نشوونما کی عمر نہیں بلکہ یہ وہ عمر ہے جس میں صحت ڈھلنے لگتی ہے اور جذبات کی گرمی مدھم ہونے لگتی ہے۔ اس عمر میں نبوت کا ملنا یقیناً سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ کیونکہ نبوت جس قسم کی پاکیزگی فکر، سیرت و کردار کی بلندی اور قوتِ فیصلہ میں بلوغت کا تقاضا کرتی ہے اس کیلئے ۴۰ سال کی عمر ہی صحیح عمر ہے۔ لیکن نشوونما کی تکمیل کے فوراً بعد اپنے لئے خطرات کو انگیخت کرنا اور بنی اسرائیل کی گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا دینے کی کوشش کرنا اور چھپتے چھپاتے ان مصیبت زدہ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی جستجو کرنا اور پھر ہاتھ کی ایک ضرب سے ایک شخص کا ڈھیر ہو جانا اور جس گھر میں پرورش پائی ہے ان کے کفر و شرک کو دیکھ کر بغاوت کے راستے پر چل پڑنا اور پھر مدین کی طرف ہجرت یہ سب باتیں بھرپور جوانی کا تقاضا کرتی ہیں، جس کیلئے ۱۸، ۲۰ سال کی عمر ہی موزوں نظر آتی ہے۔ (واللہ اعلم)

Marfat.com

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ
وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى
فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ
ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾

(اور (ایک روز) وہ شہر میں داخل ہوئے جبکہ اہلِ شہر غفلت میں تھے تو آپ نے اس میں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا، ایک ان کے اپنے گروہ میں سے تھا اور دوسرا آپ کے دشمنوں کے گروہ میں سے، تو جو آپ کے گروہ میں سے تھا اس نے آپ سے اس شخص کے مقابل میں مدد کی درخواست کی جو آپ کے مخالفوں میں سے تھا، تو موسیٰ نے اس کے ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا، آپ نے کہا یہ کام شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے، بیشک وہ ایک کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ ۱۵) حضرت موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے بخش دے، تو خدا نے آپ کو بخش دیا، بیشک وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۶)

مدینہ سے مراد

آیتِ کریمہ میں مدینہ سے مراد وہ اصل شہر ہے جو شرفاء و اعیان کا مرکز اور حکومت کا مستقر تھا۔ یہ شہر اگرچہ دار السلطنت تھا لیکن شاہی محلات معلوم ہوتا ہے عام آبادی سے باہر واقع تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قیام بچپن ہی سے شاہی محلات میں تھا۔

بنی اسرائیل چونکہ ایک عرصے سے غلاموں اور خدمتگاروں کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کی بستی اصل شہر سے الگ بسائی گئی ہوگی۔ لیکن ان کا زیادہ تر وقت چونکہ قبطیوں کے گھروں، ان کے باغوں، ان کے کارخانوں اور ان کے بازاروں میں خدمت کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس لئے ان کی زندگی کی تلخیاں اور محرومیاں اور ان پر ہونے والی زیادتیوں شہر ہی میں دیکھی جاسکتی تھیں۔ اور ان کی مدد کیلئے بھی شہر ہی میں جانے کی ضرورت تھی۔

شہر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد اور احتیاط کا سبب

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جوان ہوئے اور ان کے اندر وہ فتوت و مروت اور حمیت و غیرت پیدا ہوئی جو صالح جوانی اور علم و معرفت کا خاصہ ہے اور وہ بچپن میں اپنی والدہ سے یقیناً یہ بات جان چکے تھے کہ میرا تعلق بنی اسرائیل سے ہے، قبطیوں یا شاہی خاندان سے نہیں، لیکن یہ ان کیلئے مناسب نہ تھا کہ وہ اس کا اظہار کرتے۔ لیکن فطری طور پر وہ بنی اسرائیل سے خونی تعلق کی بنا پر وقتاً فوقتاً شہر میں جاتے اور وہاں جا کر ان کے حالات معلوم کرتے اور نہایت حکمت و دانش سے جہاں تک ممکن ہوتا ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حاسدوں کو پہلے سے اس بات کا شبہ تھا کہ یہ نوجوان لڑکا جو شاہی محل میں شہزادوں کی طرح پل رہا ہے کسی اسرائیلی کا بیٹا ہے اور اب آپؑ کا بنی اسرائیل کی طرف رجحان دیکھ کر انہیں اس بات کا پختہ یقین ہوتا جا رہا تھا۔ اور آپؑ کی مظلوموں کیلئے مدد اور ان کے حقوق کی بازیابی کیلئے کوششیں انہیں کھٹکنے لگی تھیں۔ وہ شاہی خاندان سے تعلق کی وجہ سے ان کیخلاف کوئی اقدام کرنے سے تو قاصر تھے لیکن اندر ہی اندر ایک لاوا سا

Marfat.com

ضرور پک رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسے محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب آپؑ نے یہ احتیاط شروع کی کہ آزادانہ شہر میں گھومنے پھرنے کی بجائے وہ شہر میں اس وقت جاتے جب شہر کے ہنگاموں میں کمی آچکی ہوتی۔ چنانچہ ایسے ہی ایک خاموش وقت میں جب شہر میں ہر طرف سناٹا تھا آپؑ شہر میں داخل ہوئے۔ بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے جن میں بعض متقدمین بھی شامل ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی کافرانہ زندگی دیکھ کر اس کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ اس لئے آپ محل چھوڑ کر اسرائیلی بستیوں میں روپوش تھے۔ کبھی کبھی وہاں سے نکل کر حالات معلوم کرنے کیلئے نہایت مخفی انداز میں شہر میں تشریف لاتے تھے۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی، اس لئے کہ کسی اللہ کے رسول کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے نبوت سے پہلے کبھی وقت کی قوتوں سے تصادم مول لیا ہو۔ نبوت تک وہ ایک پاکیزہ لیکن خاموش زندگی گزارتے ہیں۔ بنابریں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ تصور کہ وہ وقت کی جابر قوتوں کے سامنے نبوت سے پہلے ہی اعلائے کلمۃ الحق کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں ایک اجنبی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ اگر آپ واقعی فرعون اور آلِ فرعون کیخلاف بغاوت کی روش اختیار کر چکے ہوتے تو ان کا دیر تک روپوش رہنا اور پھر شہر میں آتے جاتے رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل سے ہمدردی رکھنے اور وقتاً فوقتاً ان کے کام آنے کے سلسلے میں آپؑ کے بارے میں ایک بدگمانی پیدا ہو رہی تھی اور مقتدر قوتیں آپؑ کی روش کو دیکھ کر خوف محسوس کرنے لگی تھیں اس لئے آپؑ نے یہی بہتر سمجھا کہ میں شہر میں ایسے وقت میں جاؤں جب حکومتی اور احتسابی عملہ عام طور پر گھروں کو جا چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی وقت میں آپ شہر میں داخل ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ قبطی اسرائیلی پر تشدد کر رہا تھا۔ اسرائیلی نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا اور وہ جانتا تھا کہ آپ اسرائیلیوں سے گہری ہمدردی رکھتے ہیں تو اس نے آپ کو مدد کیلئے پکارا۔ آپ نے اس کو مظلوم دیکھ کر حمایتِ حق کے ارادے سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی اور قبطی کو زیادتی کرنے سے روکا۔ لیکن وہ چونکہ اپنے آپ کو حکمران قوم کا ایک فرد سمجھتا تھا اور اسرائیلی اس کی نگاہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس کے مقابلے میں کوئی اس کی مدد کرے۔ چنانچہ وہ اپنی اس رعونت کے سبب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے الجھ پڑا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے آپ پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ آپ نے اپنی مدافعت میں اسے گھونسا مارا۔ ظاہر ہے کہ گھونسا کوئی ہتھیار نہیں جو قتل کیلئے استعمال ہوتا ہو۔ یہ تو محض مدافعت کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن وہ گھونسا ایسا بے ڈھب پڑا کہ قبطی وہیں ڈھیر ہو گیا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ اس کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ آپ کو اس کا گمان تھا۔ آپ کے ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ یہ جو کچھ ہوا یقیناً اس میں شیطان کے اثرات کا دخل ہے۔ اولاً تو یہ بات کہ میں ایک قبطی کی رعونت سے اس قدر مشتعل ہو گیا کہ پوری قوت سے گھونسا دے مارا جبکہ مجھے ٹھنڈے دل سے اس معاملے کو نمٹانا چاہئے تھا۔ اور ثانیاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کے ذریعہ سے شیطان کسی بڑے تصادم کی بنیاد رکھنا چاہتا ہو، تاکہ وہ خطرہ پیش آنے سے پہلے جس سے فرعون اور آلِ فرعون خوفزدہ تھے اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن آپ نے محض اسے عملِ شیطان قرار دے کر اپنے آپ کو غیر متعلق قرار نہیں دے دیا بلکہ اپنی کوتاہیِ فکر اور طبیعت کی بے صبری پر محمول کرتے ہوئے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ آپ نے اپنی غیر ارادی غلطی کو بھی اپنا جرم سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے کہ اے میرے رب مجھ سے بہت بڑی کوتاہی ہوئی ہے، میں اس اشتعال میں توازن باقی نہ رکھ سکا اور غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ سے ایک بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ آپ میری اس غیر ارادی غلطی کو معاف فرما دیں۔ اور اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے آپ اس پر پردہ ڈال دیں۔ کیونکہ مغفرت کا معنی جس طرح معافی ہے اسی طرح اس میں ڈھانپنے کا معنی بھی مضمر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا دروازہ کھلا اور آپ کو معافی اور بخشش سے نواز دیا گیا۔ اور یہ بشارت بھی سنا دی گئی کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔

قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ قتل آپ سے بلا ارادہ سرزد ہوا۔ لیکن آپ کے امتیوں نے جس طرح بائیبل میں اس واقعہ کو بیان کیا وہ بھی سن لیجئے۔

Marfat.com

"اتنے میں موسیٰ جب بڑا ہوا تو باہر اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور ان کی مشقتوں پر اس کی نظر پڑی اور اس نے دیکھا کہ ایک مصری اس کے عبرانی بھائی کو مار رہا ہے، پھر اس نے ادھر ادھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا" (خروج ۲:۱۱،۱۲)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

(حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے رب اس احسان کے بعد جو تو نے مجھ پر کیا ہے میں کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔ ۱۷)

آئندہ کیلئے احتیاط کا عہد

سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے اس کا جو سادہ سا مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ایک قبطی کے مارے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر مجھ سے جو فعل سرزد ہوا ہے اس میں اگرچہ میری نیت شامل نہ تھی لیکن ہوسکتا ہے کہ ایسے واقعہ پر جیسا ردعمل میری طرف سے ہوا اس میں توازن نہ رہا ہو۔ اس لئے آپؑ نے اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے فوری طور پر معافی مانگی اور یہ بھی استدعا کی کہ اس عمل پر پردہ ڈال دیا جائے تاکہ کسی فوری اشتعال کا سبب نہ بنے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس درخواست کو قبول فرمایا، آپ کی مغفرت فرمادی اور اس واقعہ پر پردہ ڈال دیا، کیونکہ کوئی دیکھنے والا شخص ادھر سے نہیں گزرا اور آپ کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ ایک غیر ارادی فعل سے پروردگار کا مجھے بری الذمہ نہ ٹھہرانا، لیکن معافی کا قبول کر لینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مجھ سے اس معاملے میں غلطی ہوئی ہے۔ اور وہ غلطی یہ ہے کہ میں نے اس معاملے میں قبطی کو ذمہ دار سمجھا اور اسرائیلی کو بے گناہ جانا۔ اور اسی وجہ سے میں نے قبطی سے اسرائیلی کو بچانا چاہا جبکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس طرح سے غیر شعوری طور پر میں بے گناہ کو ظالم سمجھ کر اور قصوروار کو بے گناہ قرار دے کر غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں ٹھنڈے دل سے دونوں کے معاملے پر غور کرتا اور غور و فکر کے بعد مناسب ردِعمل پر اقدام کرتا۔ لیکن پروردگار نے میری غلطی کی طرف اشارہ تو فرمایا لیکن ساتھ ہی اپنے غفور الرحیم ہونے کا حوالہ دے کر میرے ساتھ مغفرت کا معاملہ فرمایا۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور آئندہ عہد کرتا ہوں کہ میں تحقیق کئے بغیر کسی کی مدد کرنے کا فیصلہ نہیں کروں گا۔

بعض اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قبطی کا مارا جانا بہرحال ایک قصور تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر سرزد ہوگیا تھا۔ پروردگار نے اس پر نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام معاف کر دیا بلکہ اس پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ قبطی قوم کے کسی فرد اور قبطی حکومت کے کسی آدمی کا اس وقت اس کے آس پاس کہیں گزر نہ ہوا کہ وہ قتل کے اس واقعہ کو دیکھ لیتا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاموشی کے ساتھ موقعِ واردات سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ اس احسان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ایسا عہد کیا جو بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں آئندہ زندگی میں کبھی ان لوگوں کا ساتھی نہیں بنوں گا جن کا شعار ظلم و ستم کرنا ہے۔ میری امداد و اعانت ہمیشہ حق اور اہلِ حق کیلئے ہوگی۔ ابنِ جریر اور متعدد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطع تعلق کر لینے کا عہد کر لیا، کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ اسی سے علماء نے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعانت سے کامل اجتناب کرنا

Marfat.com

چاہیے۔ خواہ وہ ظالم فرد ہو یا گروہ، یا حکومت وسلطنت۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے مَنْ مَشٰی مَعَ الظَّالِمِ وَھُوَیَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ ''جو شخص ظالم کا ساتھ دیتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا'' اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ ظالم حکومت کی ملازمت کو ناپسند کیا بلکہ بعض نے تو اپنی جان پر کھیل کر ظالم کا ساتھ دینے سے اجتناب کیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے واقعات اس سلسلے میں تمام مستند سوانح نگاروں نے سپردِ قلم کیے ہیں۔

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

(پس دوسرے روز حضرت موسیٰ شہر میں داخل ہوئے ڈرتے ہوئے اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتے ہوئے تو اچانک آپ نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل آپ کو مدد کیلئے پکارا تھا، آج پھر آپ کو پکار رہا ہے، حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ تو، تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے۔ ۱۸) پھر جب حضرت موسیٰ نے ارادہ کیا کہ پکڑیں اس شخص کو جو ان دونوں کا دشمن تھا۔ تو وہ بول اٹھا کہ اے موسیٰ! کیا تم آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، جس طرح تم نے کل ایک شخص کو قتل کیا، تم اس ملک میں ایک جبار بننے کا ارادہ کر رہے ہو، تم اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں بننا چاہتے۔ ۱۹)

عہد کے پاس کیلئے مزید احتیاط

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے معمول کے مطابق دوسرے روز اس حال میں شہر میں داخل ہوئے کہ آپؑ خوفزدہ بھی تھے اور حالات کو سونگھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یوں تو احتیاط آپ پہلے بھی کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جس طرح میں طریقے طریقے سے اسرائیلیوں کی حمایت کر رہا ہوں اور ان کے معاملات کی درستگی کیلئے کوشاں ہوں اس سے قوم کے بعض بڑے لوگ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر اسرائیلیوں سے آپؑ کی ہمدردی کا سبب کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا نسبی تعلق بنی اسرائیل سے ہو اور بنی اسرائیل نے بڑی ہوشیاری سے آپ کو فرعون کے محل میں پہنچا دیا ہو۔ لیکن ابھی تک ان باتوں کی حیثیت صرف واہموں کی تھی کیونکہ فرعون اور اس کے اہلِ خانہ کی طرف سے ابھی تک کوئی ایسی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی جس سے محل چھوڑنے کی نوبت آتی اور ریاست کا قانون آپ کیخلاف حرکت میں آتا۔ لیکن آپ کے ہاتھوں ایک قبطی کے مارے جانے کی وجہ سے آپ زیادہ محتاط ہو گئے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس موت کا راز کھل جائے تو قبطی میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اس لئے آپ حالات کی ٹوہ لیتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے، لیکن آپ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جو کل ایک قبطی سے لڑ رہا تھا وہی آج بھی ایک قبطی سے الجھا ہوا ہے اور آپ کو مدد کیلئے پکار رہا ہے۔ آپ اس کی یہ حالت دیکھ کر فوراً سمجھ گئے کہ میں نے کل اس کو مظلوم سمجھ کر اس کی مدد کی اور اس کے نتیجے میں ایک انسانی جان ضائع ہو گئی۔ لیکن یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بہکا ہوا، بگڑا ہوا اور شریر آدمی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس کو ڈانٹا کہ تم تو ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ پھر آپ

Marfat.com

اس خیال سے آگے بڑھے کہ بجائے اس شخص کی مدد کرنے کے میں دونوں کو سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیتا ہوں، لیکن قبطی اپنے نسبی غرور اور حکومت سے تعلق کے زعم میں آپ کی مصالحانہ کوششوں کی قدر کرنے کی بجائے آپ سے الجھنے لگا۔ چنانچہ اب آپ کیلئے ضروری ہو گیا کہ اس کو طاقت سے اسرائیلی سے الگ کر دیں۔ چنانچہ جیسے ہی آپ اس کی طرف بڑھے تو اسرائیلی نے یہ سمجھا کہ چونکہ مجھے اس سے پہلے ڈانٹ پلا چکے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھونسا جو کل جو قبطی پر پڑا تھا، آج مجھ پر پڑے گا۔ اس لئے اس نے شور مچا دیا کہ اے موسیٰ! تم نے جس طرح کل ایک آدمی کو مار ڈالا تھا، معلوم ہوتا ہے آج مجھے مار ڈالو گے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم ایک مصلح بن کر اٹھے ہو، لیکن تمہارے رویے سے محسوس ہوتا ہے کہ تم ایک مطلق العنان اور بے قابو آدمی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں جو شاہی مراعات کا تحفظ حاصل ہے اس سے اصلاح کا کام لینے کی بجائے اپنی طاقت میں اضافے اور اپنی ہیبت بٹھانے کیلئے کام لینا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے اس نے نہایت کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے قبطی کے قتل کا راز فاش کر دیا۔ اور اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے مہیب خطرات پیدا کر دیئے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

(اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا، اے موسیٰ! اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ ۲۰)

ایک صالح آدمی کی خیر خواہی

معلوم ہوتا ہے کہ قبطی کے قتل کی خبر شہر میں تیزی سے پھیل گئی اور قوم کے وہ اشراف جو پہلے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بدگمان تھے اور آپؑ کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے انہیں دیگر عمائدینِ حکومت کو آپ کیخلاف اکٹھا کرنے کا موقع مل گیا۔ ممکن ہے اس وقت آپ اسرائیلیوں کی بستی میں ہوں اور یہ بستی چونکہ شہر سے فاصلے پر تھی اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ ''شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص آپ کے پاس بھاگتا ہوا پہنچا'' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس وقت فرعون کے محل میں ہوں اور ابھی تک محل میں اس بری خبر نے اثرات پیدا نہ کئے ہوں۔ تو شہر کے ایک کنارے سے محل میں اطلاع دینے کیلئے ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ شاہی محلات شہر سے باہر واقع ہوں گے، کیونکہ حکمران عام طور پر شہر میں رہا نہیں کرتے۔ آیتِ کریمہ میں یَسْعٰی کا لفظ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اطلاع دینے والا یقیناً کوئی مخلص شخص تھا اور وہ آپ کی سلامتی کے بارے میں نہایت متفکر تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تھی کہ آپ کے قتل کی منصوبہ بندی تیزی سے تکمیل کو پہنچ رہی تھی اور وہ شخص اس سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے آکر کہا کہ اے موسیٰ! تمہارے قتل کی سازش ہو رہی ہے اور عمائدینِ سلطنت اس سازش میں شریک ہیں۔ اس لئے اب بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔

سوال یہ ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ تاریخ ہمیں کوئی مصدقہ اطلاع فراہم نہیں کرتی۔ البتہ قرآنِ کریم نے سورۃ مومن میں آلِ فرعون کے ایک مومن کا ذکر کیا ہے جو آپ کی نبوت کے اعلان کے بعد آپ پر ایمان لایا لیکن اس نے اپنے ایمان کو مخفی رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص شروع ہی سے آپ کے خیر خواہوں میں سے تھا۔ اور چونکہ اس کا تعلق شاہی خاندان میں سے تھا اس لئے وہ بروقت سازشوں سے باخبر بھی ہو جاتا اور موقع پا کر موثر طریقے سے آپ کا دفاع بھی کرتا۔

Marfat.com

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢١﴾

(یہ خبر سنتے ہی) حضرت موسیٰ وہاں سے ڈرتے اور ٹوہ لیتے نکل کھڑے ہوئے اور آپ نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے بچا۔ ۲۱)

خطرے سے نکلتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ خطرہ سر پر آ پہنچا ہے اور اس ریاست کے ظالمانہ نظام میں انصاف حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ عافیت کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس سرزمین سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ آپ اس طرح مصر سے نکلے کہ دل اندیشوں سے معمور تھا اور نہایت پھونک پھونک کے قدم رکھ رہے تھے۔ کیونکہ یہ سرزمین اور اس کے رہنے والے اقتدار کے مقابلے میں کسی مظلوم کی دادرسی کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اور پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ فرعونیوں کی طرف سے آپ کا تعاقب کیا جائے گا۔ اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ان ظالموں سے نجات عطا فرما، ان کی دست برد سے بچا اور میرے لئے محض اپنی رحمت سے کوئی پناہ کی جگہ مہیا فرما۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى
رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿٢٢﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ
وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ
امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى
يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿٢٣﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى
الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿٢٤﴾
فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۡ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ
لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ
الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥﴾

Marfat.com

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ ۖ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ
الْأَمِينُ ﴿٢٦﴾ قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ
عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ ۖ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ ۖ
وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ
الصَّالِحِينَ ﴿٢٧﴾ قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ
فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٢٨﴾

رکوع: ۳۔ (اور جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو آپ نے دعا کی امید ہے کہ میرا رب سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۲۲) اور جب حضرت موسیٰ مدین کے کنویں پر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریوں کو روکے کھڑی تھیں تو موسیٰ نے ان سے پوچھا، تمہارا کیا ماجرا ہے، انہوں نے کہا ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں، اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں۔ ۲۳) پس (یہ سن کر) موسیٰ نے ان دونوں کی خاطر جانوروں کو پانی پلایا، پھر سائے کی طرف ہٹ گئے اور دعا کی اے میرے رب! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے، میں اس کا محتاج ہوں۔ ۲۴) (کچھ دیر نہ گزری تھی) کہ ان دونوں میں سے ایک شرماتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی اور کہنے لگی، میرے باپ آپ کو بلاتے ہیں تا کہ آپ نے ہمارے لئے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔ تو جب موسیٰ ان کے پاس پہنچے اور انہیں اپنا سارا قصہ سنایا تو انہوں نے کہا کچھ خوف نہ کرو، تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۵) ان میں سے ایک نے کہا ابا جان اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امانتدار ہو۔ ۲۶) (میزبان نے) کہا، میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کردوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو، اور اگر تم نے دس سال پورے کردیئے تو تمہاری مرضی ہے، میں تم پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا، تم ان شاء اللہ مجھے بھلا آدمی پاؤ گے۔ ۲۷) موسیٰ نے جواب دیا، یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی، دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کروں تو اس معاملے میں مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور اللہ ہمارے قول و قرار پر جو ہم کر رہے ہیں گواہ ہے۔ ۲۸)

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿٢٢﴾

(اور جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو آپ نے دعا کی امید ہے کہ میرا رب سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۲۲)

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدین کو قصد

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کے اعیانِ حکومت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ آپ کے قتل کی سازش تیار کر رہے ہیں اور اب مصر کی سرزمین آپ کیلئے تنگ ہوتی جارہی ہے تو آپ نے فوری طور پر مصر چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ بائبل بھی قرآنِ کریم کے اس بیان سے متفق ہے کہ آپؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا تھا۔ لیکن تلمود کا بیان اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ ایک بے سروپا قصے کی شکل میں آپؑ کا پہلے افریقہ جانے، وہاں کئی سال تک حکومت کرنے اور پھر مدین پہنچنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ قصہ قابلِ توجہ نہیں۔ نہ تو تاریخ اس کی تائید کرتی ہے اور نہ افریقہ، شمالی عراق، مصر اور فلسطین و شام کا جغرافیہ اس کی تائید کرسکتا ہے۔ البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے اور قرائن بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ مدین جانے کا آپؑ کا ارادہ اچانک وجود میں آیا، اس سے پہلے آپؑ کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اور یہ بات بھی آپ کے علم میں نہ تھی کہ مدین پہنچ کر میرا مستقر کیا ہوگا۔ مدین چونکہ آپ کے قریب پڑتا تھا اس لئے آپ نے جلدی میں ادھر کا رخ کیا۔ اور چونکہ اس کیلئے تیاری نہ تھی اس لئے پروردگار سے بطورِ خاص التجا کی کہ وہ مجھے سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرمائے اور کوئی اچھا مستقر نصیب فرمائے۔

مدین اس زمانے میں سلطنتِ مصر کا حصہ نہ تھا۔ کیونکہ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر محیط نہ تھی بلکہ صرف اس کے مغربی اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔ خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی سواحل جن پر بنی مدیان آباد تھے مصری اثر و اقتدار سے بالکل آزاد تھے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلتے ہی مدین کا رخ کیا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہاں جانے کیلئے انہیں مصر کے مقبوضہ علاقوں ہی سے گزر کر جانا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ مصر کی پولیس اور فوجی چوکیاں آپ کیلئے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ایسے راستے پر ڈال دے جس سے میں صحیح سلامت مدین پہنچ جاؤں۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۬ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٜ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾

(اور جب حضرت موسیٰ مدین کے کنویں پر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے ورے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریوں کو روکے کھڑی تھیں تو موسیٰ نے ان سے پوچھا، تمہارا کیا ماجرا ہے، انہوں نے کہا ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے اپنی بکریاں ہٹا نہ لیں، اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں۔ ۲۳)

مَـــآءَ سے مراد چشمہ بھی ہوسکتا ہے اور کنواں بھی۔ تورات میں کنویں ہی کا ذکر آیا ہے۔ ویسے پہاڑی چشمے بھی کنوؤں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔

آیت کی تشریح سے پہلے اس مقام کی وضاحت ضروری ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منزل

عربی روایات کے مطابق خلیج عقبہ کے غربی ساحل پر مقنا سے چند میل بجانب شمال وہ مقام واقع تھا۔ آج کل اسے البدع کہتے ہیں اور وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ میں نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں تبوک سے عقبہ جاتے ہوئے اس جگہ کو دیکھا ہے۔ مقامی باشندوں نے مجھے بتایا کہ ہم باپ دادا سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ مدین اسی جگہ واقع تھا۔

Marfat.com

یوسیفوس سے لے کر برٹن تک قدیم وجدید سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی بالعموم مدین کی جائے وقوع یہی بتائی ہے۔اس کے قریب تھوڑے فاصلے پروہ جگہ ہے جسے اب مغائر شعیب یا مغارات شعیب کہا جاتا ہے۔اسی جگہ ثمودی طرز کی کچھ عمارات موجود ہیں۔اوراس سے تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کچھ قدیم کھنڈر ہیں جن میں دو اندھے کنویں ہم نے دیکھے۔مقامی باشندوں نے ہمیں بتایا کہ یقین کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے لیکن ہمارے ہاں روایات یہی ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک کنواں وہ تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بکریوں کو پانی پلایا ہے۔یہی بات ابوالفداء (متوفی ۷۳۲ھ) نے تقویم البلدان میں اور یاقوت نے معجم البلدان میں ابوزید انصاری (متوفی ۲۱۶ھ) کے حوالے سے لکھی ہے کہ اس علاقے کے باشندے اسی مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس کنویں کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صدیوں سے وہاں کے لوگوں میں متوارث چلی آرہی ہے اور اس بنا پر اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں جس مقام کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہے۔ (تفہیم القرآن)

مدین میں پہلا پڑاؤ اور سبق آموز واقعات

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین پہنچے تو آپؑ مدین کے کنویں یا چشمہ کے پاس جا بیٹھے۔معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی میں یہ کنواں یا چشمہ ایک نمایاں اور معروف جگہ ہوگی جہاں قریب قریب سایہ دار درخت ہوں گے وہاں آپؑ نے دیکھا کہ چرواہوں کی ایک بھیڑ اپنے اپنے گلوں کو پانی پلا رہی تھی اور دو عورتیں اپنے گلوں کو روکے ہوئے ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔اور آیت میں تَذُوْدٰنِ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ گلے کے جانور گھاٹ پر پہنچ کر پانی پینے کیلئے بیتاب ہو رہے تھے اور وہ دونوں لڑکیاں کوشش سے ان کو روکے کھڑی تھیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا تو آپؑ نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ آپ دونوں کا کیا ماجرا ہے؟ یعنی آپ آگے بڑھ کر ان بھیڑ بکریوں کو پانی کیوں نہیں پینے دیتیں۔اس سوال کے انداز اور اس کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شریف لوگوں کے یہاں عام طور پر نوجوان لڑکیاں گلہ بانی کا فرض انجام نہیں دیتیں، یہ کام تو مردوں کے ہیں۔تو آپ اس کیلئے کیوں کھڑی ہیں؟ تو لڑکیوں نے جواب میں کہا کہ ہمارے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ہم اس بھیڑ کے اندر گھس کر اپنے گلے کو پانی پلا سکیں۔کیونکہ ہم شریف زادیاں ہیں، ہمیں اندازہ ہے کہ مردوں کے اندر گھس کر اور طاقت استعمال کرتے ہوئے انہیں کی طرح کام کرنا ہمارے شایانِ شان نہیں۔رہی یہ بات کہ پھر ہم اس کام کیلئے کیوں نکلی ہیں تو یہ ہماری مجبوری ہے کیونکہ ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں، وہ یہ کام کر نہیں سکتے، اور ہمارا کوئی بھائی نہیں، جان وتن کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے ہم یہ کام کرنے پر مجبور ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار الگ الگ سمجھے جاتے تھے۔اور اگر عورتوں کو کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی اس طرح کی خدمت انجام دینی ہی پڑتی تھی جو مردوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھنے والی ہو تو وہ نہایت احتیاط، وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ حتی الامکان مردوں سے الگ رہتے ہوئے انجام دی جاتی تھی۔مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا کوئی تصور نہ تھا۔

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾

(پس (یہ سن کر) موسیٰ نے ان دونوں کی خاطر جانوروں کو پانی پلایا، پھر سائے کی طرف ہٹ گئے اور دعا کی اے میرے رب! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کردے، میں اس کا محتاج ہوں۔ ۲۴)

Marfat.com

ایک واقعہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اثر

ان شریف زادیوں کی یہ بات سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جذبۂ حمایتِ ضعیف میں تحریک پیدا ہوئی۔ وہ اٹھے اور تنہا کنویں سے پوری قوت سے ڈول کھینچ کر جانوروں کو پانی پلایا اور پھر پہلے جس درخت کے سائے میں بیٹھے تھے، وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ نہ ان شریف زادیوں کی طرف دیکھنے کی زحمت کی اور نہ ان سے مزید کوئی بات کرنا مناسب سمجھا۔ کیونکہ ان کی طرف متوجہ ہونا کمزوروں کی مدد کا تقاضا تھا۔ اس سے زائد توجہ کرنا، پھر بات کرنے کی کوشش کرنا یہ ایسی دلچسپی کا اظہار تھا جو شرفاء کیلئے کبھی مناسب نہیں ہوتا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کیلئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ دعا کے الفاظ اس قدر مختصر اور اس قدر حُسنِ ایجاز سے مرصع ہیں کہ قلم اس کی تعریف کرنے سے عاجز ہے۔ آپؑ چونکہ نہایت بے سروسامان ہر طرح کی ضرورت سے تہی دامن اور گزشتہ 8 دنوں سے مسلسل فاقوں کی زد میں تھے۔ بے ساختہ التجا کی کہ یا اللہ جو بھی خیر کی کوئی بات اس وقت تو نازل فرمائے، میں سب سے زیادہ اس کا محتاج ہوں۔ خیر کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح یہ لفظ بڑی سے بڑی سچائی اور حقیقت پر بولا جاتا ہے اسی طرح مال و دولت اور انسانی ضرورتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپؑ چونکہ برسرِ راہ ایک ایسے مسافر کی حیثیت سے ایک درخت کے سائے میں بیٹھے تھے جس کے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ کوئی سر چھپانے کی جگہ تھی۔ اور آئندہ کیا صورت پیش آنے والی ہے اس کا کوئی سروسامان نہ تھا۔ اس لئے آپ نے صرف ایک لفظ میں ان تمام ضرورتوں کو سمیٹ لیا۔

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو دعا ٹھیک وقت میں ٹھیک طریقے سے اخلاص کی قوت کے ساتھ مانگی جائے وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

ادھر دعا کے الفاظ منہ سے نکلے، ادھر درِ اجابت کھل گیا۔ اور مظلوموں کیلئے تو اللہ تعالیٰ کا قانون اور بھی نازک واقع ہوا ہے۔ سچ کہا کسی نے:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

ان صاحبزادیوں کے والد کون تھے؟

ان خواتین کے والد کے متعلق ہمارے ہاں کی روایات میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اشارۃً و کنایۃً بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام ہی تھے۔ حالانکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی شخصیت قرآن میں ایک معروف شخصیت ہے۔ اگر ان خواتین کے والد وہی ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یہاں اس کی تصریح نہ کر دی جاتی۔ بلاشبہ بعض احادیث میں ان کے نام کی تصریح ملتی ہے لیکن علامہ ابن جریر اور ابن کثیر دونوں اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی لئے ابنِ عباس، حسن بصری، ابوعبیدہ اور سعید بن جبیر جیسے اکابر مفسرین نے بنی اسرائیل کی روایات پر اعتماد کر کے ان بزرگ کے وہی نام بتائے ہیں جو تلمود وغیرہ میں آئے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ سے اسمِ شعیب کی تصریح منقول ہوتی تو یہ حضرات کوئی دوسرا نام نہ لے سکتے تھے۔

بائیبل میں ایک جگہ ان بزرگ کا نام رعوایل کا گیا ہے اور دوسری جگہ یترو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مدین کے کاہن تھے۔ (خروج باب ۲:۱۶-۱۸۔ باب ۳:۱۔ باب ۱۸:۵)۔ تلمودی لٹریچر میں رعوایل، یتھرو اور حوباب تین مختلف نام بتائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علمائے یہود کا خیال ہے کہ یتھرو ہز اکسی لنسی کا ہم معنی لقب تھا اور اصل نام رعوایل یا حوباب

Marfat.com

تھا۔اسی طرح لفظ کاہن (Kohen Midian) کی تشریح میں بھی علماء یہود کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو پروہت (Priest) کا ہم معنی بتاتے ہیں اور بعض رئیس یا امیر (Price) کا۔

تلمود میں ان کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرعون کے ہاں ان کی آمدورفت تھی اور وہ ان کے علم اور اصابت رائے پر اعتماد رکھتا تھا۔ مگر جب بنی اسرائیل کا ستیصال کرنے کیلئے مصر کی شاہی کونسل میں مشورے ہونے لگے اور ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کردینے کا فیصلہ کیا گیا تو انہوں نے فرعون کو اس غلط کام سے روکنے کی کوشش کی، اسے اس ظلم کے برے نتائج سے ڈرایا اور رائے دی کہ اگر ان لوگوں کا وجود آپ کیلئے ناقابلِ برداشت ہے تو انہیں ان کے باپ دادا کے ملک کنعان کی طرف نکال دیجئے۔ اس پر فرعون ان سے ناراض ہوگیا اور اس نے انہیں ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوادیا۔ اس وقت سے وہ اپنے ملک مدین ہی میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔

ان کے مذہب کے متعلق قیاس یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ بھی دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔ کیونکہ جس طرح حضرت موسیٰ اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد تھے اسی طرح وہ مدیان بن ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ یہی تعلق غالباً اس کا موجب ہوا ہوگا کہ انہوں نے فرعون کو بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے روکا اور اس کی ناراضی مول لی۔ مفسر نیساپوری نے حضرت حسن بصری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہ کان رجلا مسلما قبل الدین من شعیب (وہ ایک مسلمان آدمی تھے۔ حضرت شعیبؑ کا دین انہوں نے قبول کرلیا تھا)۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ مدیانیوں کی بت پرستی کو علانیہ حماقت قرار دیتے تھے، اس وجہ سے اہلِ مدین ان کے مخالف ہوگئے تھے۔ (تفہیم القرآن)

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ۘ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٚ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾

(کچھ دیر نہ گزری تھی) کہ ان دونوں میں سے ایک شرماتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی اور کہنے لگی، میرے باپ آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لئے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔ تو جب موسیٰ ان کے پاس پہنچے اور انہیں اپنا سارا قصہ سنایا تو انہوں نے کہا کچھ خوف نہ کرو، تم نے ظالموں سے نجات پائی۔ ۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی قبولیت اور آپؑ کیلئے خیر کی راہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی سائے ہی میں بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک صاحبزادی لجاتی، شرماتی ہوئی آئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس فقرے کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا جاء ت تمشی علی استحیاء قائلة بثوبها علی وجهها لیست بسلفع من النساء دلاجة و لاجة خراجة ''وہ شرم وحیاء کے ساتھ چلتی ہوئی اپنا منہ گھونگھٹ سے چھپائے ہوئے آئیں، ان بے باک عورتوں کی طرح دھڑلے سے ہوئے آئیں، ان بے باک عورتوں کی طرح درانہ وار نہیں چلی آئیں جو ہر طرف نکل جاتیں اور ہر جگہ جا گھستی ہیں۔'' حضرت عمر فاروقؓ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے عہد میں حیاء داری کا اسلامی تصور کیا تھا۔ اور وہ کسی عورت کے باہر نکلنے کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے اور اگر نکلنا پڑے تو کن احتیاطوں کو ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ صاحبزادی بھی معلوم ہوتا ہے اسی تربیت میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ اس لئے پوری

Marfat.com

احتیاط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے سمیٹتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ کر کہنے لگیں کہ ہمارے والد ماجد نے آپ کو بلایا ہے تاکہ آپ کو اس نیکی کا صلہ دیں جو آپ نے بکریوں کو پانی پلا کر ہمارے ساتھ کی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز صاحبزادیاں چونکہ معمول کیخلاف وقت سے پہلے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئیں تو ان کے والد نے ان سے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے چلی آئیں؟ اس پر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احسان کا ذکر کیا۔ والد کہنے لگے کہ تم اپنے محسن کو پیچھے کیوں چھوڑ آئیں، ابھی جا کر ان کو بلاؤ تاکہ وہ ہمارے یہاں کھانا کھائیں۔ باپ کے حکم کی تعمیل میں ایک صاحبزادی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو اس خیال سے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ہمارے والد آپ کو آپ کی نیکی صلہ دینا چاہتے ہیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو نہایت عالی ظرف انسان تھے اس معمولی نیکی کا صلہ حاصل کرنے کیلئے کبھی اس لڑکی کے ساتھ نہ جاتے اگر وہ اس وقت انتہائی اضطرار کی حالت میں نہ ہوتے۔ وہ مصر سے بے سروسامانی کی حالت میں نکلے تھے اور مسلسل آٹھ دن سفر میں رہنے کی وجہ سے بھوک پیاس اور سفر کی تکان انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کوئی سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ اس لئے جیسے ہی آپ کو اس کی طرف بلایا گیا تو آپ نے اسے اپنی دعا کی قبولیت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت جان کر صاحبزادی کے ساتھ چلے گئے۔

جب اپنے میزبان کے گھر پہنچے تو انہیں اپنی ساری داستان سنائی۔ میزبان نے ان کا ماجرا سن کر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا آپ دل میں کوئی اندیشہ نہ رکھیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظالموں سے نجات دے دی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کیلئے کوئی خطرے کی بات نہیں۔

قَالَتْ اِحْدٰهُمَا یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾

(ان میں سے ایک نے کہا ابا جان اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے، کیونکہ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امانتدار ہو۔ ۲۶)

بیٹی کی تجویز

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس گھر میں چند دن بطور مہمان رہے۔ اہلِ خانہ کو یوں تو پہلی ہی ملاقات میں اندازہ ہو گیا تھا، لیکن اب چند دنوں کے قیام سے ان کی نیکی، شرافت اور صلاحیتوں کا مزید یقین پیدا ہوا۔ گھر میں باپ کے سوا اور کوئی مرد نہ تھا جو گھر کی ذمہ داریاں ادا کر سکے۔ اور باپ اپنی کبرسنی کے باعث مجبوراً باہر کے کاموں کیلئے اپنی بیٹیوں کو بھیجتا تھا جو کسی طرح بھی اسے پسند نہ تھا۔ اور عفت مآب صاحبزادیاں بھی مجبوری کے تحت باہر کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اب جبکہ ایک شریف اور نیک آدمی گھر میں آ گیا تو سب اہلِ خانہ جانتے تھے کہ وہ دیر تک مہمان بن کر نہیں رہے گا تو ایک دن ایک صاحبزادی نے باپ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ گھر میں کوئی کام کرنے کے قابل ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے خود ہمارے گھر میں ایک شریف آدمی کو بھیج دیا ہے جو نہایت مضبوط اور تنومند بھی ہے اور نہایت امانتدار بھی۔ یعنی جو جسمانی وجاہت بھی رکھتا ہے اور جس کی آنکھوں میں حیاء بھی ہے۔ آپ اسے ملازم رکھ لیں۔ اور ملازمت کیلئے اس سے بہتر آدمی اور کہاں مل سکے گا جو ایسی بنیادی صفات کا حامل ہو۔

Marfat.com

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَی ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍۚ فَاِنْ
اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَۚ وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَؕ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ
عَلَیَّؕ وَاللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۲۸﴾

(میزبان نے) کہا، میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو، اور اگر تم نے دس سال پورے کر دیئے تو تمہاری مرضی ہے، میں تم پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا، تم ان شاء اللہ مجھے بھلا آدمی پاؤ گے۔ ۲۷) موسیٰ نے جواب دیا، یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی، دونوں میں سے جو مدت بھی پوری کروں تو اس معاملے میں مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور اللہ ہمارے قول وقرار پر جو ہم کر رہے ہیں گواہ ہے۔ ۲۸)

بیٹی کی انگیخت اور باپ کا فیصلہ اور اس کی شرعی حیثیت

معلوم ہوتا ہے صاحبزادیوں کے والد پہلے ہی اس بارے میں متفکر تھے کہ گھر کے کام کاج کیلئے کوئی مناسب آدمی ہونا چاہئے، جوان بچیوں کا ریوڑ چرانا اور بغیر کسی مرد کے باہر جانا مناسب نہیں۔ اب جبکہ ایک مناسب آدمی ہاتھ آ گیا اور اس کی سیرت و کردار پر بھی طبیعت جمنے لگی اور بیٹی نے بھی اسے ملازم رکھنے کی تجویز دی تو باپ جو پہلے ہی سوچوں میں گم تھا ایک نئے پہلو پر غور کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ بیٹی کی یہ بات کہ بہتر ملازم وہ ہوتا ہے جو قوی اور امین ہو۔ اور یہ دونوں باتیں موسیٰ میں پائی جاتی ہیں، یقیناً اپنی جگہ بالکل سچ ہے۔ لیکن انسانی نفس کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی۔ موسیٰ خاندانی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ وہ پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے نفس کے بارے میں یکسو نہیں تھے، کیونکہ نفس ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے تو کسی اور کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ موسیٰ کو نہ صرف میں اپنے یہاں ملازمت کی دعوت دوں بلکہ اسے اپنا داماد بنالوں۔ وہ چونکہ خوددار آدمی ہے اس لئے مہمان بن کر زیادہ دیر تک اس گھر میں رہنا مناسب نہیں سمجھے گا۔ لیکن جب وہ ملازم کی حیثیت سے گھر میں کھائے پیئے گا تو اسے اطمینان ہوگا کہ میں خدمت کے صلے میں اپنی ضروریات حاصل کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ اس طرح اس کی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ اور رہا عفت مآبی اور پاکدامنی کا سوال، داماد بن جانے کے بعد اس پہلو سے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے کب تک اس پہلو سے غور کیا اور جب وہ مطمئن ہو گئے تو تب انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس طرح بات کی جس کی حیثیت مشورے سے زیادہ نہ تھی۔ مشورے میں ظاہر ہے شرائط کا تعین نہیں ہوتا، اس کی نوبت اس وقت آتی ہے جب باقاعدہ اس عمل کے وجود پذیر ہونے کا وقت آتا ہے۔ اس لئے بچیوں کے باپ کا یہ کہنا کہ میں چاہتا ہوں کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کر دوں، بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے۔ اگر اس کی حیثیت معاملے کی ہوتی تو وہ یقیناً دو بیٹیوں میں سے ایک کا تعین کر کے بات کرتے۔ اس مشاورت میں یہ بھی کہا گیا کہ میں یہ نکاح اس شرط پر کروں گا کہ تم آٹھ یا دس سال میرے پاس ملازمت کرو۔ اس کا میں تمہیں معاوضہ دوں گا اور اس سے تم اپنے گھر کا خرچ بھی چلا سکو گے۔ بعض لوگوں نے نہ جانے اس گفتگو کو نکاح کے وقت کی گفتگو کیوں سمجھ لیا ہے اور پھر یہ سوال اٹھایا ہے

Marfat.com

کہ آیا باپ کی خدمت بیٹی کے نکاح کا مہر قرار پا سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس گفتگو کو غور سے پڑھنے کے بعد کوئی شخص اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ یہ نکاح کی تقریب کی گفتگو ہے۔ رہی یہ بات کہ نکاح کب اور کیسے ہوا؟ اس میں کیا حق مہر طے ہوا؟ اس کا ذکر قرآنِ کریم نے نہیں کیا۔ بچیوں کے والد جیسا کہ اس سے پہلے میں واضح کر چکا ہوں حضرت شعیب علیہ السلام کے دین پر تھے اور انہیں کی شریعت کے پیروکار تھے۔ یقیناً نکاح کی تمام تفصیلات اسی شریعت کے مطابق عمل میں آئی ہوں گی۔ جہاں تک ملازمت کی شرط کا تعلق ہے اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس رشتے سے اصل غرض یہی تھی کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، کوئی بیٹا میرے پاس نہیں ہے جو میری جائیداد کا انتظام سنبھالے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم داماد بن کر میرے دست و بازو بنو۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ، تو پھر یہ شادی ہمارے مسائل میں اور اضافہ کر دے گی۔ کیونکہ پہلے تو دونوں بہنیں گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، جب ایک بچی رہ جائے گی تو اسے باہر بھیجنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مسافر اور اجنبی کی حیثیت سے جائے پناہ کی تلاش میں تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ یا اللہ، میری مدد فرما۔ کوئی تعجب نہیں کہ بچیوں کے باپ نے یہ پیشکش کسی اشارۂ غیبی سے کی ہو۔ اور پھر ان کا یہ کہنا کہ میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ کو معاملہ میں غور کرنے کیلئے مہلت دی جا رہی تھی تاکہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے خوشی سے اس شرط کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے پردیس میں ایک صالح آدمی کا داماد بننے کی انہیں عزت عطا کی۔ اور دونوں نے اپنے درمیان طے کردہ معاملے پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا، تاکہ دونوں کو اطمینان بھی حاصل ہو اور ضمانت بھی ملے۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى

الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ
لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ
جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ
شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ
يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا
رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ
وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ
تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ

Marfat.com

الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا
فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا
فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۖ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾
قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا
يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚۛ بِاٰيٰتِنَآ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالَ
مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ
تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَقَالَ
فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ
يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى
اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ
وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا
لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى

Marfat.com

النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿٤١﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ
الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿٤٢﴾

رکوع: ۴۔ (پس جب حضرت موسیٰ نے مدت پوری کرلی اور وہ اپنے اہل وعیال کو لے کر چلے تو طور کی جانب سے
انہیں ایک آگ نظر آئی، انہوں نے اپنے اہل سے کہا، تم لوگ ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے میں وہاں سے کوئی
خبر یا آگ کا انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ تاپو۔ ۲۹) جب موسیٰ اس کے پاس آئے تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک
خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا مالک۔ ۳۰) یہ کہ تم اپنا عصا
ڈال دو، جونہی (حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا) تو آپ نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو، تو
حضرت موسیٰ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا، (ارشاد ہوا) اے موسیٰ! آگے آؤ، اور خوف نہ کرو، تم بالکل
مامون ہو۔ ۳۱) اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا نکلے گا اور خوف سے بچنے کیلئے اپنا بازو بھینچ لو، پس
یہ آپ کے رب کی جانب سے دو نشانیاں ہیں، فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کیلئے، بیشک وہ بڑے ہی
نافرمان لوگ ہیں۔ ۳۲) حضرت موسیٰ نے کہا، اے میرے رب! میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ
وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۳۳) اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، انہیں میرے ساتھ مدد کے طور پر
بھیج دیجئے تاکہ وہ میری تائید کریں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ ۳۴) پروردگار نے فرمایا، ہم
تمہارے بھائی کے ذریعہ سے تمہارے ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو خاص دبدبہ عطا کریں گے تو وہ تم پر دست
درازی نہ کر سکیں گے، ہماری نشانیوں کے باعث تم دونوں اور جو تمہارے پیروکار ہوں گے غالب رہیں گے۔ ۳۵)
پس جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے کہا یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اس
طرح کی باتیں اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں۔ ۳۶) اور موسیٰ نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے اس کو
جو اس کی طرف سے ہدایت لے کے آیا اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے، بیشک ظالم ہرگز فلاح
پانے والے نہیں۔ ۳۷) (اور فرعون نے کہا، اے اہل دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ تو اے
ہامان میرے لئے گارے کو آگ دے (یعنی پختہ اینٹیں تیار کروا) پھر میرے لئے ایک اونچی عمارت بنا تاکہ میں موسیٰ
کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔ ۳۸) اور اس نے اور اس کی فوجوں نے ناحق تکبر
کیا اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ہماری طرف نہیں لوٹیں گے۔ ۳۹) تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا، پس ان کو
سمندر میں پھینک دیا، تو غور کرو ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔ ۴۰) ہم نے ان کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے
پیشوا بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۴۱) اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگادی
اور قیامت کے دن ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا۔ ۴۲)

Marfat.com

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

(پس جب حضرت موسیٰ نے مدت پوری کر لی اور وہ اپنے اہل وعیال کو لے کر چلے تو طور کی جانب سے انہیں ایک آگ نظر آئی، انہوں نے اپنے اہل سے کہا، تم لوگ ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے میں وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا انگارہ لاؤں تاکہ تم لوگ تاپو۔ ۲۹)

مصر کو واپسی اور جلوۂ طور کا مشاہدہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام موعودہ مدت پوری کرنے کے بعد بیوی بچوں کو ساتھ لے کر مصر کیلئے روانہ ہوئے۔ قرآنِ کریم اور تورات میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ آپؑ نے آٹھ سال مدت گزاری تھی یا دس سال۔ البتہ حضرت حسن ابنِ علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ کی بجائے دس سال کی مدت پوری کی تھی۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے خود یہ بات مروی ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا قضیٰ موسی اتم الاجلین واطیبھما عشر سنین ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے وہ مدت پوری کی جو زیادہ کامل اور ان کے خسر کیلئے زیادہ خوشگوار تھی، یعنی دس سال۔'' آپ کے خسر نے جس طرح آپؑ پر احسان کیا، گھر کی چھت مہیا کی اور بیٹی نکاح میں دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے احسان شناس آدمی سے یہ کیسے توقع ہوسکتی تھی کہ وہ دس سال کی بجائے آٹھ سال کی مدت پوری کر کے عازمِ سفر ہو جاتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس گھر کو چلانے والا کوئی دوسرا سہارا نہیں ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ اس وقت تک دوسری بیٹی کا نکاح ہو چکا ہو اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے کوئی دوسرا سبب پیدا کر دیا ہو۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بیوی کے سوا آپؑ کے دو بچے بھی تھے۔ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بچوں کو لے کر اس راستے پر جا رہے تھے جس راستے پر جبلِ طور پڑتا ہے۔ اور یہ راستہ مصر کو جانے کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کا ارادہ مصر جانے کا تھا۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بائیبل اور تلمود دونوں کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ قیامِ مدین میں وہ فرعون مر چکا تھا جس کے ہاں انہوں نے پرورش پائی تھی اور اب ایک دوسرا فرعون مصر کا فرمانروا تھا۔ اثنائے سفر میں جب آپؑ جبلِ طور کے قریب پہنچے تو رات اندھیری تھی اور سردی شدید تھی۔ اندھیرے میں راستے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ آپؑ موسم کی شدت اور تاریکی کے گہرا ہونے کے باعث پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم راستہ غلط کر جائیں، کہ آپؑ نے طور کی جانب سے آگ کی ایک چمک سی دیکھی۔ آپؑ نے بیوی اور بچوں سے فرمایا، تم لوگ یہیں ٹھہرو، مجھے آگ کی چمک نظر آئی ہے، میں وہاں جاتا ہوں اگر وہاں کوئی راہ بتانے والا مل گیا تو راستہ پوچھ لوں گا ورنہ آگ کا ایک انگارہ لے آؤں گا تاکہ یہاں آگ جلا کر آپ کی سردی دور کرنے کا سامان کرسکوں۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾

(جب موسیٰ اس کے پاس آئے تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ! میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا مالک۔ ۳۰)

Marfat.com

جلوۂ طور کا تعارف

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ پہنچے جہاں ان کو آگ نظر آئی تھی، تو وہاں انہیں حیران کن صورتحال سے واسطہ پیش آیا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ وہ تو یہ سمجھ کر گئے تھے کہ وہاں پر آگ جل رہی ہوگی اور میں اس سے کوئی انگارہ اٹھالاؤں گا۔ لیکن وہاں انہیں ایک آواز سنائی دی جو فضائے بسیط کی گونج کی طرح نہ تھی بلکہ وہ ایک وادیٔ مبارک کی سمت سے آرہی تھی اور یہ وادی مبارک خطہ میں تھی اور اس مبارک خطے میں ایک درخت تھا جس سے یہ آواز آرہی تھی۔ یہ گویا کہ اس آواز کے تین ظرف تھے، اور ان میں ہر ظرف اس لحاظ سے نہایت مبارک تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے نور ظہور کیلئے انتخاب فرمایا تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی تھا کہ وہ اس کے قدوسیوں کی جلوہ گاہ اور ہر قسم کی شیطانی دراندازی سے پاک اور محفوظ تھی۔ آواز کے محل ومقام کی پاکیزگی کے اظہار کے بعد آواز نے اپنی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ تم آگ لینے آئے ہو، لیکن یہاں آگ نہیں بلکہ میں ہوں، اللہ، سارے جہانوں کا رب۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ والاصفات کا تعارف کرایا۔ رب العالمین کے چونکہ مضمرات بہت وسیع ہیں اس وجہ سے بعض دیگر مقامات میں اسی مضمون کو دوسرے الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاکَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓي اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿٣١﴾

(یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو، جونہی (حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا) تو آپ نے اس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھا گویا سانپ ہو، تو حضرت موسیٰ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا، (ارشاد ہوا) اے موسیٰ! آگے آؤ، اور خوف نہ کرو، تم بالکل مامون ہو۔ ۳۱)

پہلا معجزہ اور اس کا اثر

پروردگار نے اپنے تعارف کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنا عصا زمین پر ڈال دو، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی، لیکن آپؑ یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے کہ آپؑ کے ہاتھ کا عصا سانپ کی طرح حرکت کرنے لگا ہے۔ ایک تو ماحول کی ہیبت، پھر رب العالمین کی عظمت اور ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اپنے عصا کو سانپ بنتے ہوئے دیکھ کر خوف کی لپیٹ میں آگئے۔ ڈر کر اس طرح بھاگے کہ مڑ کے دیکھنے کی بھی جرأت نہ کی۔

معجزے سے پیغمبر کی کیفیت صداقت کی دلیل ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ کیفیت بجائے خود آپؑ کی نبوت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبوت ایک اعزاز بھی ہے اور ایک گرانقدر ذمہ داری بھی۔ جسے یہ منصب دیا جاتا ہے اس کے سان گمان بھی نہیں ہوتا کہ میں اس ذمہ داری سے گراں بار کیا جارہا ہوں۔ لیکن پروردگار یہ ذمہ داری جس کے سر پر ڈالتا ہے اس کو اس کی ہمت، حوصلہ اور ادائیگی کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص کسی ہنر کو محنت سے سیکھتا ہے یا کسی منصب کو اپنی کوشش سے حاصل کرتا ہے تو وہ اس

Marfat.com

کی ذمہ داریوں اوراس راستے میں پیش آنے والے خطرات اور حیران کن چیزوں سے پہلے سے آگاہ ہوتا ہے۔ساحروں، کاہنوں، متنبیوں اور مفتریوں کے ذہن میں پہلے سے ایک اسکیم ہوتی ہے اور وہ اس کیلئے بہت سے پاپڑ بیلتے ہیں، اس لئے ان کیلئے اس راستے کا کوئی تغیر نہ حیرانی کا باعث بنتا ہے اور نہ انہیں دہشت زدہ کرتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے ساتھ یہ سب کچھ ان کی مرضی اور علم کے بغیر سراسر اللہ تعالیٰ کے اختیار سے ہوتا ہے۔اس لئے انہیں ابتدائی مشاہدات حیران بھی کرتے ہیں اور بعض دفعہ دہشت زدہ بھی کر جاتے ہیں۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوفزدہ دیکھ کر پروردگار نے تسلی دی کہ گھبرایئے مت اس میں آپ کیلئے کوئی خطرہ نہیں۔البتہ یہ آپ کے دشمنوں کیلئے خطرہ ہے۔آپ کو نبوت کا دیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اب آپ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں۔یہ معجزات آپ کیلئے اسلحہ کی مانند ہیں اس سے آپ کے دشمنوں کیلئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے، آپ کیلئے نہیں۔

اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِہٖ ؕ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

(اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، بغیر کسی مرض کے چمکتا ہوا نکلے گا اور خوف سے بچنے کیلئے اپنا بازو بھینچ لو، پس یہ آپ کے رب کی جانب سے دو نشانیاں ہیں، فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جانے کیلئے، بیشک وہ بڑے ہی نافرمان لوگ ہیں۔ ۳۲)

دوسرا معجزہ

یہ دوسرا معجزہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا جو ید بیضا کے نام سے مشہور ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو، جب اس کو نکالو گے تو وہ کسی مرض کے بغیر چٹا سفید سورج کی طرح چمکتا ہوا نکلے گا۔جب بھی کبھی فرعون یا آلِ فرعون کی جانب سے خطرہ محسوس کرو جس کا ہر وقت امکان موجود ہے، کیونکہ فرعون ایک بگڑا ہوا خودسر حکمران ہے اور اس کے درباری طاقت کے نشہ میں چور ہیں اور تم دونوں بھائی بظاہر بے سروسامان اور ہر طرح کی قوت سے تہی دامن ہیں۔تمہیں قدم قدم پر فرعون اور اس کے درباریوں سے واسطہ پڑے گا۔جب بھی ان کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرو تو اپنے داہنے ہاتھ کو بغل میں دباؤ، تمہارے دل سے ہر طرح کا خطرہ نکل جائے گا۔یہ شوکت وحشمت کے دعویدار تمہاری نگاہوں میں کٹ پتلیاں بن کے رہ جائیں گے۔

یہ دو معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے عطا فرمائے گئے کہ اول تو انہیں پوری طرح یقین ہو جائے کہ اس وقت جو ہستی ان سے مخاطب ہے وہی کائنات کے پورے نظام کی خالق و مالک اور فرمانروا ہے۔اور دوسرے اس لئے کہ چونکہ انہیں ایک فاسق قوم سے واسطہ ہے جن سے تصادم کا ہر وقت خطرہ ہے۔ان دو معجزات کی موجودگی میں نہ تو آپ کسی خوف کا شکار ہوں گے اور نہ دشمن آپ پر آسانی سے وار کر سکیں گے۔اور پھر یہ معجزات آپ کیلئے سندِ ماموریت کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔فرعون کو یقین آجائے گا کہ یہ دونوں یقیناً کسی ایسی قوت کے نمائندے ہیں جو لاٹھی کو اژدھا میں تبدیل کر سکتا ہے اور ہاتھ کو چمکتے ہوئے سورج میں بدل سکتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْھُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾

(حضرت موسیٰ نے کہا، اے میرے رب! میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ۳۳)

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک اندیشہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کیلئے جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عرض کیا، میرے آقا تعمیلِ حکم میں سرتابی کی مجال نہیں، میں دل و جان سے اس کیلئے آمادہ ہوں۔ البتہ دل میں ایک کھٹکا سا لگا ہوا ہے کہ میرے ہاتھوں سے ان کا ایک آدمی مارا گیا تھا۔ اگرچہ میں اس کے قتل کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، لیکن وہ لوگ تو بہر صورت مجھے اس کا قاتل سمجھتے ہیں، اس واقعہ کو یوں تو دس سال کی مدت گزر چکی ہے لیکن جب میں ایک رسول کی حیثیت سے ان کی ہدایت کیلئے جاؤں گا تو یقیناً انہیں بھولی ہوئی باتیں بھی یاد آ جائیں گی اور وہ میرے خلاف تنکے کو پہاڑ بنانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک آدمی کے قتل کو بھول جائیں۔ امکان اس بات کا ہے کہ ادائے رسالت کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ الزامِ قتل میں مجھے گرفتار کر لیں گے۔ اس طرح سے میں اپنے منصبی فریضہ کو ادا کرنے سے قاصر رہوں گا۔ آقا! کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ میرے لئے ایسی کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ
اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾

(اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللّسان ہیں، انہیں میرے ساتھ مدد کے طور پر بھیج دیجئے تا کہ وہ میری تائید کریں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ ۳۴)

اپنی تائید و نصرت کیلئے حضرت ہارون علیہ السلام کے تعاون کی درخواست

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تائید و نصرت کیلئے ایک اور درخواست پیش کی۔ سورۃ طٰہٰ میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت نہ تھی لیکن وہ اپنی عظیم ذمہ داری کے اعتبار سے اپنی قوتِ بیان میں کمی محسوس فرماتے تھے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ انہیں کبھی اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی اور نہ اس کا تجربہ ہوا تھا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم تھی کہ وہ ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو قدرتِ کلام اور فصاحتِ بیان میں ان پر تفوق دے چکا تھا۔ چنانچہ آپؑ نے اسی حوالے سے التجا کی کہ انہیں اس کام میں میرا مددگار بنا دیا جائے تا کہ وہ ہر موقع پر میری تائید اور مدد کریں۔ اگرچہ قرآنِ کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے تو ہر موقع پر آپؑ کی مدد کی لیکن رفتہ رفتہ آپؑ کی فصاحت و بلاغت اور زبان آوری میں اس حد تک ترقی ہوئی کہ آپؑ کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚ
بِاٰیٰتِنَاۤ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

(پروردگار نے فرمایا، ہم تمہارے بھائی کے ذریعہ سے تمہارے ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو خاص دبدبہ عطا کریں گے تو وہ تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے، ہماری نشانیوں کے باعث تم دونوں اور جو تمہارے پیروکار ہوں گے غالب رہیں گے۔ ۳۵)

Marfat.com

دونوں درخواستوں کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دونوں درخواستیں قبول کرلیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو رسالت دے کر آپؑ کا معاون و مددگار بنادیا۔ اور دوسری دعا کے سلسلے میں آپؑ کو اطمینان دلایا کہ ہم فرعونیوں پر تمہارا ایسا رعب و دبدبہ قائم کردیں گے کہ وہ تم پر کبھی دست درازی کی جرأت نہ کرسکیں گے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان پہلے ہی مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر مرعوب ہوگئے کہ وہ کبھی دھمکیوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اپنے درباریوں میں اظہارِ غیظ وغضب کرتے ہوئے بعض دفعہ قتل تک کی باتیں بھی ہوئیں، لیکن کبھی کوئی ایسا اقدام نہ کرسکے جس سے آپؑ کو نقصان پہنچتا۔ بلکہ تورات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی مصر پر کوئی آفت آئی تو فرعون اور اس کے اعیان حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہی درخواست کرتے کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ آفت ٹل جائے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٦﴾

(پس جب موسیٰ ان کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے کہا یہ تو محض گھڑا ہوا جادو ہے اور ہم نے اس طرح کی باتیں اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی ہی نہیں۔ ٣٦)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور ان کی دعوت کی مخالفت

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان بڑی بڑی نشانیوں کو لے کر جو دو معجزات کی صورت میں آپؑ کو دی گئی تھیں فرعون اور اس کی قوم کے پاس پہنچے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلایا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں اور آپؑ کے معجزات کو دیکھ کر دو باتیں کہیں۔ ایک بات تو یہ کہی کہ یہ دو حیرت انگیز چیزیں یعنی عصائے موسیٰ اور یدِ بیضا جنہیں موسیٰ اپنے معجزات قرار دے رہے ہیں حقیقت میں کوئی معجزہ نہیں بلکہ یہ جادو کے کرشمے ہیں۔ اور ہم پر رعب جمانے کیلئے انہیں معجزہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمائندگی کا دعویٰ کیا جارہا ہے یا ان کا ان نشانیوں کو سِحْرٌ مُّفْتَرًى قرار دینے سے مطلب یہ ہے تھا کہ یہ نفسِ شے میں حقیقی تغیر نہیں بلکہ محض ایک نمائشی شعبدہ ہے جسے یہ شخص معجزہ قرار دے کر ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔ اور یا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص کسی کرتب سے ایک ایسی چیز بنالایا ہے جو دیکھنے میں لاٹھی معلوم ہوتی ہے مگر جب اسے ہوا میں پھینکا جاتا ہے تو سانپ نظر آنے لگتی ہے۔ اور اس نے اپنے ہاتھ پر بھی کوئی ایسی چیز مل لی ہے کہ اس کی بغل سے نکلنے کے بعد وہ ہاتھ یکا یک چمکنے لگتا ہے۔ یہ ایک مصنوعی طلسم ہے جو اس نے تیار کر رکھا ہے اور اسے معجزہ قرار دے رہا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہی کہ موسیٰ جس طرح کی باتیں کررہے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ رب العالمین کے رسول ہیں، بالکل انوکھا اور نرالا دعویٰ ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں کسی رب العالمین کا ذکر کبھی نہیں سنا گیا۔ فرعون دراصل اپنی قوم کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی ایسی بات نہیں سنی جس سے یہ معلوم ہو کہ فرعونِ مصر سے اوپر بھی کوئی ایسی مقتدر ہستی ہے جو فرعون کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کیلئے کسی آدمی کو اس کے دربار میں اس حیثیت سے بھیج سکتی ہو کہ وہ رب العالمین کا نمائندہ اور رسول ہے۔ اور فرعونِ مصر بھی درحقیقت اسی کی ہدایات کا تابع ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایسی نرالی باتیں تھیں جو آج تک کسی کی زبان سے نہیں سنی گئیں۔

Marfat.com

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ
عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

(اور موسیٰ نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کی طرف سے ہدایت لے کے آیا اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے، بیشک ظالم ہرگز فلاح پانے والے نہیں۔ ۳۷)

فرعون کی یاوہ گوئی کا جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی الزام تراشی اور دریدہ دہنی کے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے مفتری قرار دے رہے ہو اور مجھے عطا کئے جانے والے معجزات کو جادو کا کرشمہ اور شعبدہ بازی قرار دیتے ہو۔ میرا رب خوب جانتا ہے کہ میں کس حیثیت کا مالک ہوں۔ کیونکہ کسی انسان کی داخلی اور خارجی زندگی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ وہ نیتوں کے فتور اور ارادوں کے فساد سے بھی واقف ہے۔ اس سے یہ بات مخفی نہیں کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کون لوگ اس کو جانتے بوجھتے جھٹلا رہے ہیں اور ہر ایک کا انجام بھی اس کے سامنے واضح ہے۔ میں اگر جھوٹا ہوں تو میں جھوٹ کے انجام سے بچ نہیں سکوں گا۔ اور اگر میں سچا ہوں تو تم سچے رسول کی تکذیب کی پاداش میں پکڑے جاؤ گے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں گہری نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نہایت مخفی انداز میں مستقبل کی خبر دے رہے ہیں البتہ اس کیلئے اسلوب نہایت بلیغ اور شائستہ منتخب کیا گیا ہے۔ یعنی کہنا یہ ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میں اور میرے ساتھی ان شاء اللہ تعالیٰ غالب اور فتح مند ہوں گے اور تم لوگ ذلیل و خوار ہو کے رہو گے کیونکہ وہ ظالم لوگ جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں وہ کبھی بھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى
الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾

(اور فرعون نے کہا، اے اہلِ دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ تو اے ہامان میرے لئے گارے کو آگ دے (یعنی پختہ اینٹیں تیار کروا) پھر میرے لئے ایک اونچی عمارت بنا تا کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔ ۳۸)

فرعون کا استہزاء اور اس کے دعویٰ کا مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اس کے بھرے دربار میں رب العالمین کا ذکر کیا تو اسے بہت ناگوار گزرا۔ اس نے محسوس کیا گویا اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک رہی ہے۔ کیونکہ رب العالمین کا تسلیم کیا جانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا نمائندہ مان لینا اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ فرعون کو اس ملک میں حکومت کا کوئی اختیار نہیں، اصل حکومت رب العالمین کی ہے، اس کی انابت میں اس شخص کو محدود اختیارات استعمال کرنے کی اجازت ہوگی

Marfat.com

جسے وہ اپنا نمائندہ بنائے اور اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرے۔ چنانچہ فرعون نے خیال کیا کہ اگر اس خطرناک بات کو میرے اہلِ دربار نے وزن دینا شروع کر دیا تو میرے اقتدار کیلئے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ انہیں خدشات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے رؤسائے مملکت کی طرف دیکھا، پھر بڑے غرور سے کہا کہ موسیٰ کی بات کی طرف التفات نہ کرنا، میں خوب جانتا ہوں، میرے سوا تمہارا اور کوئی اِلٰہ نہیں۔ اور جہاں تک میری الوہیت اور خدائی کا تعلق ہے وہ تو ایک ایسی معروضی اور زمینی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فرعون نے اپنے دعوے میں اِلٰہ کا لفظ استعمال کیا ہے کہ میں ہی تمہارا اِلٰہ ہوں اور میرے سوا تمہارا اور کوئی اِلٰہ نہیں۔ اِلٰہ کا لفظ چونکہ خالق کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ فرعون نے شاید یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہو۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے سے بڑے کافر اور مشرک نے بھی کبھی اپنے آپ کو خالقِ کائنات قرار نہیں دیا۔ کیونکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ جو خود مخلوق ہو وہ خالق کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا دعویٰ تو صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو عقل سے بالکل تہی دامن ہو۔ فرعون ہزار گمراہ سہی لیکن وہ بے وقوف نہ تھا۔ وہ نہایت کامیابی سے ایک ملک کا نظام چلا رہا تھا۔ اور اس نے اپنی مملکت کو روئے زمین پر ایک بڑی حیثیت دے رکھی تھی۔ اس لئے اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے کسی پاگل پن کا اظہار کر سکتا تھا۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیونکہ اِلٰہ اگرچہ معبود کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن فرعون نے معبود ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو مصر میں کسی اور معبود کی کبھی پرستش نہ کی جاتی۔ جبکہ قرآنِ کریم کی شہادت موجود ہے کہ اہلِ مصر نہ صرف مختلف معبودوں کی پوجا کرتے تھے بلکہ فرعون بھی بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۲۷ میں قرآنِ کریم کا بیان ہے وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ''اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا، کیا تو، موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد برپا کرے اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔'' خود فرعون کو جس بناء پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا، وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اِلٰہ کا مفہوم خالقِ کائنات یا معبودِ کائنات نہیں تو پھر آخر کیا تھا۔ قرآنِ کریم کی وضاحت سے اور تاریخ کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے یہ لفظ مطاع اور حاکمِ مطلق کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک میں ہوں، یہاں حکم میرا چلے گا، یہاں قانون میرا ہی قانون مانا جائے گا، میری ذات ہی یہاں امر و نہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی قوم سے کہا يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ''اے قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے، اور یہ نہرے میرے تحت جاری نہیں۔'' اسی بناء پر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار کہتا تھا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ''کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اصل بنائے نزاع پیغمبروں اور فراعنہ و نمارده اور حق و باطل میں صرف یہ نہیں کہ عبادت کس کی، کی جائے، قربانیاں کس کے نام پر کی جائیں، دلوں کی آبادی کس کے ذکر سے ہو، بلکہ یہ بھی ہے کہ پرستش کے ساتھ ساتھ اطاعت کس کی ہو، حق کے داعی اور اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول، اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی نہ پرستش کی اجازت دیتے ہیں اور نہ اطاعتِ مطلقہ کی اجازت دیتے ہیں۔ وہ صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ جو مخلوقات کا خالق ہے وہی ان کا حاکم، مطاع، قانون دینے والا اور رہنمائے مطلق ہے۔ وہ دنیا میں کشور کشائی اور غیر مشروط حکمرانی کیلئے نہیں آتے، بلکہ وہ انسانوں کے سروں اور دلوں پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنے کیلئے

Marfat.com

آتے ہیں۔ وہ جس طرح ان کے سروں کو اس کے سامنے جھکاتے ہیں، اسی طرح ان کے قانون، ان کی تہذیب، ان کی ثقافت اور ان کے نظامِ زندگی کو اللہ تعالیٰ کے دین کے تابع کرنے کیلئے آتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی سروری کو قبول نہیں کرتے۔ بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہی۔ اور ظاہر ہے جو اس کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اور یہی بات نبی کریم ﷺ نے قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے لازمی ٹھہرائی ہے۔

اسی بات کو ہلکا اور بے اثر کرنے کیلئے فرعون نے ایک دوسری بات استہزاء کے انداز میں کہی، کہ موسیٰ جس رب العالمین کا نام لیتا ہے اور وہ اسے حاکمِ حقیقی کے طور پر ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے، میں نے خوب سوچ بچار اور تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دعویٰ سراسر باطل ہے۔ اس ملک میں میرے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ اس زمین کا پتا پتا میرے حکم سے حرکت کرتا ہے، یہاں کوئی کام میری اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے زمین میں میرے سوا کسی دوسرے اِلٰہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے موسیٰ یہ کہنا چاہتے ہوں کہ آسمانوں پر ایک اِلٰہ ہے۔ تو اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اے ہامان! تم پختہ اینٹوں کی ایک بلند عمارت بناؤ، کیونکہ کچی اینٹیں زیادہ بلند عمارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی، تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے، آخر وہ زمین پر کیوں نہیں اترتا۔ میرا گمان تو یہ ہے کہ موسیٰ ایک جھوٹے آدمی ہیں جنہوں نے محض اپنی طرف سے ایک بات بنا دی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اہلِ مصر فرعون کو سورج جیسے بڑے دیوتا کا اوتار سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ فرعون ایسی قدرت رکھتا ہے جس سے وہ آسمانوں کے اطراف میں پہنچ سکتا اور جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے اگر وہ یہ بات کہتا ہے تو یقیناً اس کا ایک وزن ہے۔ ویسے بھی شخصی حکومتوں میں رعایا کی غور و فکر کرنے کی قوتیں عموماً سلب ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ اپنے بادشاہوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے دماغ سے سوچتے اور انہیں کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کامیاب حکمران وہی ہوتا ہے جو اپنی رعایا کو کبھی جاگنے نہیں دیتا اور ان کے ذہنوں کو خوف یا لالچ کے پردوں میں اس حد تک لپیٹ دیتا ہے کہ وہ اسی میں اپنی راحت و عافیت سمجھتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

نیند سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اس لئے قرآنِ کریم نے یہ نہیں کہا کہ فرعون نے واقعی ایک محل تعمیر کرایا اور پھر اس پر چڑھ کر دیکھا بلکہ یہ تعمیر کے حکم کا ذکر ہے۔ اس لئے امام رازی فرماتے ہیں کہ فرعون نے یہ بات از راہِ مذاق کہی تھی یا اپنی رعایا کو دھوکہ دینے کیلئے ایسا کہا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ اصل معاملے سے ہٹا دی جائے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ رہا وہ قول جو کئی کتابوں میں نقل ہوتا چلا آیا ہے کہ اس نے ایک اونچا مینار تعمیر کیا، پھر وہ اس کے اوپر چڑھا اور ایک تیز انداز کو آسمان کی طرف تیر چلانے کا حکم دیا۔ جب وہ تیر لوٹا تو وہ خون سے آلودہ تھا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ دیکھو میں نے موسیٰ کے خدا کا (نعوذ باللہ) کام تمام کر دیا۔ امام صاحب نے اس قول پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض تاریخی روایات میں کہا گیا ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کیلئے پچاس ہزار معمار جمع کئے، مزدور اور لکڑی لوہے کا کام کرنے والے ان کے علاوہ تھے۔ اور محل کو اتنا اونچا بنایا کہ اس زمانے میں اس سے زیادہ بلند کوئی تعمیر نہیں تھی۔ پھر جب یہ تیاری مکمل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا، انہوں نے ایک ضرب میں اس محل کے تین ٹکڑے کر کے گرا دیا جس میں فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ قرطبی نے اس روایت کو ذکر کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت تاریخی خرافات سے زیادہ نہیں۔

Marfat.com

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾

(اوراس نے اوراس کی فوجوں نے ناحق تکبر کیا اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ہماری طرف نہیں لوٹیں گے۔ ۳۹)

فرعون اوراس کے عیانِ سلطنت اعتقاد کی جس خرابی اور عمل کی جس ناہمواری کا شکار تھے اس کا سبب اپنے وسائل پر بیجا اعتماد اور اپنی ذات پر جھوٹا پندار تھا جس نے انہیں ایک ایسے ناحق گھمنڈ میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ زمین پر اپنے آپ کو سب سے بڑی قوت سمجھنے لگے تھے۔ ملک کی مطلق العنان حکومت کے باعث ایک ایسے اقتدار کے نشے میں مخمور تھے جس نے انہیں اپنے انجام سے بالکل بے فکر کر دیا تھا اور انہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ کبھی لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں جائیں گے۔ نہ جانے انہیں یہ بات کیوں سمجھ نہ آتی تھی کہ جس ذات نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور جو کائنات کے تدبیر وانتظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی ایسا شخص جس نے نہ کسی مخلوق کو پیدا کیا اور نہ مخلوق کے انتظام وانصرام کو چلانے میں اس کا کوئی حصہ ہے وہ اگر حاکمِ حقیقی کے سامنے خودسری دکھائے تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شامت اسے بلا رہی ہے۔ یہی وہ استکبارِ ناحق ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے برگشتہ کرتا اور اس کو اپنے انجام سے لاپرواہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ فرعون نے بھی اسی سرکشی کے باعث اپنے آپ کو شترِ بے مہار بنا کے چھوڑا۔ اور اس کے نتیجہ آخر یہ ہوا۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

(تو ہم نے اس کو اور اس کی فوجوں کو پکڑا، پس ان کو سمندر میں پھینک دیا، تو غور کرو ظالموں کا انجام کیسا ہوا۔ ۴۰)

اس استکبار کے نتیجے میں فرعون اور اس کے حواریوں نے جو سرکشی اختیار کی اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا یہ دی کہ انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ اس کی تفصیلات گزشتہ سورتوں بالخصوص سورۃ طٰہٰ کی تفصیل میں گزر چکی ہیں۔ اس واقعہ اور اس کی تفصیلات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ پھر غور کرو کیسا ہوا ظالموں کا انجام۔ اور یہی وہ حقیقی سبق ہے جس کیلئے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی ہے اور ان کفارِ مکہ کیلئے تنبیہ بھی جو آنحضرت ﷺ کی دعوت کے معاملے میں بالکل فرعون کی روش پر چل رہے تھے۔ اگر فرعون کی طرح انہوں نے بھی اپنی سرکشی کو روکنے کی کوشش نہ کی تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سمندر ہی کی شکل میں نہیں آتا اس کی بے شمار شکلیں ہیں، وہ کسی شکل میں بھی آئے اس کی گرفت میں آنے والے کبھی بچ نہیں سکتے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

(ہم نے ان کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۴۱)

فرعون اور اس کے حواری اپنی ذات میں ایک مثال بنا دیئے گئے۔ بڑے سے بڑا گمراہ آدمی بھی بعض دفعہ دوسروں کی گمراہیوں کی تقلید کرتا ہے اور کبھی اپنی روش میں تبدیلی لانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ ایسے بدنصیب واقع ہوئے تھے کہ قدرت نے انہیں مہلت دی تھی کہ وہ لوگوں کو بگاڑنے اور راہِ حق سے دور کرنے کیلئے جو مساعی بھی انجام دینا چاہیں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس کے نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی سزا بھی ایسی بے روک ہوگی کہ قیامت کے دن کہیں سے بھی ان کو مدد نہیں پہنچے گی۔

Marfat.com

آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ بڑے سے بڑے مفسد لوگ دنیا میں گزرے ہیں لیکن فرعون اور اس کے دائیں بائیں رہنے والے لوگ اپنی ذات میں اس لحاظ سے ایک نمونہ ہیں کہ انہوں نے سرکشی، گمراہی اور بدچلنی کے ایسے راستے کھولے ہیں کہ جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ آئندہ نسلوں کو گمراہ کرنے میں جو انہوں نے مثالیں چھوڑی ہیں اس کا کہیں جواب نہیں۔ انہوں نے جس برائی کی طرف بھی توجہ کی اس کو پوری طرح سیراب کیا۔ اور جس صداقت کے مقابلے میں بھی ہتھیار اٹھایا ظلم کی انتہا کردی۔ اس لحاظ سے وہ واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں گمراہ دنیا کا امام کہا جائے۔ ان کی زندگی فی الواقع جہنم کی آگ کی طرف دعوت دیتے گزری ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آگ کی طرف دعوت دینے کو استعارةً استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں ہے۔ لیکن سید انور شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ آخرت کی جزاء عینِ عمل ہے۔ انسان کے اعمال جو وہ دنیا میں کرتا ہے برزخ اور پھر حشر میں اپنی شکلیں بدلیں گے اور جوہری صورتوں میں نیک اعمال گل وگلزار بن کر جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور اعمالِ کفر وظلم آگ اور سانپ، بچھوؤں اور طرح طرح کے عذابوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ اس لئے جو شخص اس دنیا میں کسی کو کفر وظلم کی طرف بلا رہا ہے وہ حقیقتاً اس کو آگ ہی کی طرف بلا رہا ہے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ﴿۴۲﴾

(اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگادی اور قیامت کے دن ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا۔ ۴۲)

یعنی جس دنیا میں وہ لیڈری اور پیشوائی کرتے رہے اسی دنیا میں ہم نے ان کے پیچھے ہمیشہ کیلئے لعنت لگادی اور آخرت میں وہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ مَقْبُوْحِیْنَ کے کئی معنی ہوسکتے ہیں۔ وہ مردود ومطرود ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بالکل محروم کردیے جائیں گے، ان کی بری گت بنا جائی گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیے جائیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اس کا معنی کیا ہے کہ مَقْبُوْحِیْنَ وہ ہیں جن کے چہرے بگڑ گئے ہوں، رنگ سیاہ ہوا اور آنکھیں نیلی۔ اور جس کو ہر بھلائی سے دور ہانک دیا گیا ہو۔ (مظہری)

یہی مضمون سورة ہود میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ○ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ

یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ○

وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○

(ھود: ۹۷. ۹۹)

"تو انہوں نے فرعون کی رائے کی پیروی کی اور فرعون کی رائے صائب نہ تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ کے گھاٹ پر اتارے گا اور کیا ہی برا ہوگا یہ گھاٹ! اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی، اور کیا ہی برا ہوگا یہ صلہ جو ان کو ملے گا!"

Marfat.com

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ
الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾
وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ
وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ
عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ
الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَلَوْلَاۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا
رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَاۤ
اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ
كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ
اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ
اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ

Marfat.com

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۰ ع

رکوع: ۵۔ (پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی، لوگوں کیلئے بصیرتوں کا سامان بنا کر اور ہدایت و رحمت بنا کر تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۴۳) اور اے پیغمبر! آپ اس وقت پہاڑ کے مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ آپ ان لوگوں میں تھے جو وہاں موجود تھے۔ ۴۴) لیکن اس کے بعد ہم نے اٹھائی ہیں بہت سی نسلیں، پس ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے، آپ اہلِ مدین کے درمیان بھی مقیم نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، لیکن اس وقت کی (یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ ۴۵) آپ طور کے دامن میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ کو پکارا، مگر آپ اپنے رب کی رحمت سے (مبعوث کیے گئے) تا کہ آپ ان لوگوں کو متنبہ کریں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۴۶) (اور ہم رسول نہ بھیجتے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی مصیبت آئے تو وہ کہیں اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔ ۴۷) پس جب ہماری طرف سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا، کیا اس طرح کے لوگوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی، انہوں نے کہا دونوں ماہر جادوگر ہیں جنہوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور کہا کہ ہم اس سب کے منکر ہیں۔ ۴۸) اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے، اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہے، میں اسی کی پیروی کروں گا، اگر تم سچے ہو۔ ۴۹) پس اگر وہ آپ کا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو یقین کر لیجئے کہ یہ دراصل اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے، اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۵۰)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى
بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴۳

(پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی، لوگوں کیلئے بصیرتوں کا سامان بنا کر اور ہدایت و رحمت بنا کر تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ (۴۳)

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کی تین صفات

گزشتہ آیات میں پروردگار نے ظالموں کا انجام واضح فرمایا ہے اور اب اپنے اسلوب کے مطابق اس فضل و انعام کا ذکر کیا جا رہا ہے جس نے مظلوموں کی کایا پلٹ دی۔ اور اس سرگزشت کی تمہید میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

لوگ اپنی کوتاہی فکر کے باعث اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام سے عام طور پر اس کی وہ نعمتیں مراد لیتے ہیں جس کا تعلق مادی زندگی سے ہے۔ یعنی غذائی ضرورتوں کی فراوانی، زمین کی سرسبزی اور شادابی، کاروباری ترقی یا دوسری قوموں پر مسلط ہونے کے امکانات، ان میں سے بیشتر چیزیں یقیناً اللہ تعالیٰ کے انعامات میں شمار کی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی حیثیت ضمنی ہے، اصلی نہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور حقیقی نعمت وہ ہے جو کسی قوم کی بقاء کا سامان بنتی ہے۔ جس سے انسانیت پھلتی پھولتی اور انسانی رشتے مستحکم ہوتے ہیں۔ اور انسان کا اپنے مالک سے ٹوٹا ہوا رشتہ از سر نو جڑ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سب سے بڑی نعمت وحیِ الٰہی اور اس کے ذریعے سے عطا ہونے والی تعلیمات ہیں۔ جب قومیں ان سے روگردانی کرتی ہیں اور جو اس کی طرف دعوت دینے والے ہیں ان انبیائے کرام کی تکذیب کرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کو عبرت بنا دیتا ہے اور وہ اپنے پیچھے تباہی کی داستانیں چھوڑ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کتنی قومیں اس روگردانی کے باعث اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی تو اس نے بہت سی قوموں کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جسے اللہ تعالیٰ نے تین صفات سے متصف فرمایا۔ اس کی پہلی صفت پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جو بیان فرمائی گئی ہے وہ بصیرت ہے۔ یعنی دل و دماغ کی صلاحیتیں اور تعقل اور تفکر کی قوتیں بیدار کرنے والی۔ بعض اہلِ علم نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ھی نور فی القلب یبصر به قلوبهم حقائق الاشیاء۔ بقدر الطاقة البشرية ''یعنی دل کی وہ روشنی جس سے انسانی طاقت کے مطابق حقیقتِ اشیاء پر آگاہی ہوتی ہے۔'' اس کو بصورتِ جمع لانے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ کتاب ایسی آیات اور ایسے دلائل پر مشتمل تھی جو آنکھیں کھول دینے والی تھی۔ اس کتاب کی دوسری صفت ہے ہدایت۔ یعنی وہ کتاب جو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ جو کتابِ قانون بھی ہے۔ جس سے دلوں میں سکون و اطمینان بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو صراطِ مستقیم کو بھی متشکل کر دیتی ہے۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ رحمت ہے۔ یعنی جو شخص یا جو معاشرہ اس کتاب کی رہنمائی کو قبول کر لیتا اور اسے ضابطۂ حیات بنا لیتا ہے اس کیلئے یہ کتاب رحمت کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ اور جب یہ دونوں لفظ یعنی ہدایت اور رحمت ایک ساتھ اس کتاب کی صفت کے طور پر آتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب دنیا کی زندگی میں ہدایت ہے اور آخرت کی زندگی میں رحمت ہے۔

صدیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے کتاب و شریعت کی یہ نعمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو عطا کی۔ اور اس طرح سے انہیں دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز کیا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اس کتاب کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی تفصیل سورۃ البقرہ کے تقریباً دس رکوعوں میں گزر چکی ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾

(اور اے پیغمبر! آپ اس وقت پہاڑ کے مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ آپ ان لوگوں میں تھے جو وہاں موجود تھے۔ ۴۴)

Marfat.com

یہاں سے خاتمہ سورۃ کی آیات شروع ہو رہی ہیں۔ یہ پہلی تین آیتیں آنحضرت ﷺ کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں جن میں آپ ؐ کی نبوت کے ایسے دلائل دیئے گئے ہیں جو نہایت سادہ لیکن فطرت کے دروازے پر دستک دینے والے ہیں۔ یہ چونکہ مکی سورۃ ہے اس لئے اس میں براہِ راست کلام کا رخ قریش کی طرف ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہود کو بھی سنایا جا رہا ہے کیونکہ وہ بھی بہت حد تک حق و باطل کی کشمکش میں شریک ہو چکے اور قریش کو اعتراضات کا مواد فراہم کرنے میں شامل ہو چکے تھے۔ دونوں کو توجہ دلانے اور انکار کی صورت میں اتمامِ حجت کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اے پیغمبر! کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ شریعت دینے کیلئے جبلِ طور پر بلایا گیا تھا اور جبلِ طور چونکہ علاقہ حجاز کے مغربی جانب واقع ہے اس لئے اسے مغربی گوشہ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آپ ؐ تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل کے ان ستر نمائندوں کو جن کو شریعت کی پابندی کا عہد لینے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بلایا گیا تھا، آپ ؐ تو ان میں بھی موجود نہیں تھے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ آپ ؐ کو حضرت موسیٰ اور ان پر نازل کی جانے والی کتاب، اور کتاب کے اترنے کی جگہ اور بنی اسرائیل کے تذبذب کے نتیجے میں ان کے نمائندوں کی جبلِ طور پر حاضری اور پھر وہاں پر پیش آنے والے واقعات، نیز تورات کی تفصیلات جن کا جابجا آپ نے قرآنِ کریم میں ذکر کیا ہے، کس ذریعے سے آپ تک پہنچیں جبکہ عرب کا گوشہ گوشہ ہمیشہ ان تفصیلات سے بے خبر رہا۔ آپ کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے آپ کی رسائی ان معلومات تک ہو سکتی ہے۔ آپ اُمی ہونے کی وجہ سے اہلِ کتاب کے علمی ذخیرہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جو شخص بھی غیر جانبداری سے اس بات پر غور کرے گا، اسے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ صدیوں پہلے پیش آنے والے واقعات کی حتمی اور قطعی خبر وحیِ الٰہی کے سوا اور کسی ذریعے سے نہیں مل سکتی۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿٤٥﴾

(لیکن اس کے بعد ہم نے اٹھائی ہیں بہت سی نسلیں، پس ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے، آپ اہلِ مدین کے درمیان بھی مقیم نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، لیکن اس وقت کی (یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ ۴۵)

آنحضرت ﷺ کی رسالت کی دلیل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دنیا سے رحلت کے بعد کئی قومیں صفحہ ہستی پر نمودار ہوئیں اور تورات کی فراہم کردہ روشنی سے ان قوموں نے استفادہ کیا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پسِ پشت ڈالتے گئے۔ جس کتاب کو ہدایت و رحمت بنایا گیا تھا اس کی ہدایت سے منہ موڑنے کے باعث اللہ تعالیٰ کی رحمت ان سے منہ موڑ گئی۔ اب پروردگار نے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرما کر اس ہدایت و رحمت کے سرچشمے کو از سرِ نو زندہ کیا۔ اور انہوں نے اس کتاب میں ترمیم و تحریف کا جو ظالمانہ کردار جاری کر رکھا تھا اللہ تعالیٰ کے آخری رسول نے ضرورت کے تحت کہیں کہیں اس سے پردہ اٹھایا تاکہ اصل چہرے بے نقاب ہو سکیں اور لوگوں پر یہ حجت بھی قائم ہو سکے کہ بنی اسرائیل کی جن ظالمانہ خیانتوں سے دنیا ناواقف تھی اور تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی اسرائیل نے اس کتاب سے برگشتگی کے باعث جو زخم اٹھائے تھے آج نبی آخر الزماں ؐ جس طرح انہیں منصہ شہود پر لا رہے ہیں آخر ان مردہ معلومات کی عقدہ کشائی کس ذریعے کے بل بوتے پر کی جا رہی ہے۔

Marfat.com

مزید فرمایا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دیئے جانے کے وقت آپؐ جبلِ طور میں موجود نہیں تھے اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے ترمیم وتحریف کا کاروبار جاری رکھا آپؐ اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین پہنچے اور جو کچھ وہاں ان کے ساتھ پیش آیا اور دس سال گزار کر جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے اس وقت بھی آپؐ وہاں موجود نہ تھے۔ اور نہ آپؐ اس وقت مدین کی بستیوں میں وہ کام کررہے تھے جو آج مکہ کی گلیوں میں کررہے ہیں۔ ان تمام واقعات سے باخبر ہونا اور پھر اس کو نہایت صحت کے ساتھ دنیا پر آشکارا کرنا آپؐ کا عینی مشاہدہ تو نہیں بلکہ یہ علم آپؐ کو ہماری وحی کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوا ہے۔ اور ہم نے ان باتوں سے آپؐ کو اس لئے آگاہ کیا ہے کہ جس طرح ہم نے پہلے رسول بھیجے، اسی طرح آپؐ کو بھی اپنا رسول بنایا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

(آپ طور کے دامن میں موجود نہ تھے جبکہ ہم نے موسیٰ کو پکارا، مگر آپ اپنے رب کی رحمت سے (مبعوث کئے گئے) تاکہ آپ ان لوگوں کو متنبہ کریں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔ ۴۶)

آنحضرت ﷺ کی رسالت کے اثبات میں مزید دلیل

جس طرح آپؐ ان مواقع پر موجود نہ تھے جن کا حوالہ سابقہ آیات میں دیا گیا ہے، اسی طرح آپؐ طور کے پہلو میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو آواز دی۔ اس سے مراد وہ واقعہ ہے جو نبوت دیئے جانے سے پہلے پیش آیا کہ آپؐ آگ کی تلاش میں وادیٔ ایمن کے کنارے پر پہنچ گئے، تب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو پکارا، اپنا تعارف کرایا اور آپؐ کو نبوت سے مشرف فرمایا، اور پھر آپؐ کو معجزات دیئے گئے۔ اور فرعون کی ہدایت کیلئے جانے کا حکم دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپؐ ان تمام باتوں سے بالکل بے خبر تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی کہ وہ آپؐ کو رسول بنائے۔ اس وجہ سے اس نے آپؐ کو ان باتوں سے آگاہ کیا جو آپؐ کی رسالت کی نہایت روشن دلیلیں ہیں، کیونکہ ان میں سے ایک ایک بات ایسی ہے جن سے پوری دنیائے علم بے خبر تھی۔ عرب کے کسی گوشے میں اس سے متعلق کوئی علم موجود نہ تھا۔ اہلِ کتاب خود اپنی کتابوں کو ترمیم وتحریف سے غیر محفوظ بنا چکے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ ان میں سے ایک ایک بات کو ایسی صفائی، سادگی، قطعیت اور علمی دیانت کے ساتھ پیش کررہے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے پاس کوئی بتانے کا ذریعہ نہیں۔ آپؐ کے بدترین مخالف بھی کبھی کھل کے یہ بات نہ کہہ سکے کہ آپؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا سرچشمہ فلاں یہودی عالم یا فلاں عیسائی راہب ہے۔ اور اس طرح کی فضول بات کبھی کسی شخص کی زبان پہ نہ آسکی کہ آپؐ کے پاس گزشتہ تاریخ اور علوم وآداب کی ایک لائبریری موجود ہے، جس کی مدد سے وہ یہ ساری تقریریں کررہے ہیں۔ اور کبھی کسی نے یہ الزام نہ لگایا کہ آپؐ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کررکھی ہیں جو عبرانی، سریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کرکرکے آپؐ کو دیتے ہیں۔ اور نہ کبھی کسی نے یہ بے پر کی بات کہنے کی جرأت کی کہ شام وفلسطین کے تجارتی سفروں میں آپؐ یہ معلومات حاصل کرکے آئے تھے۔ کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے۔ مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپؐ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپؐ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا، جبکہ مکے میں آپؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے بیسیوں لوگ ایسے موجود تھے جو ہر وقت آپؐ کے حالات کی ٹوہ میں لگے رہتے۔ اگر ان کے یہاں ایسی کسی

Marfat.com

بات کے سراغ ملنے کا امکان بھی ہوتا تو وہ اس کے حصول کیلئے سب کچھ کر گزرتے۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ وہ انتہائی بگڑے ہوئے لوگ اس طرح کی گری ہوئی حرکت نہ کر سکے، لیکن آج کے مستشرقین جو اپنے آپ کو علم اور تحقیق کا وارث سمجھتے ہیں انہیں ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہوئے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں شاید کبھی اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو۔ لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو قرآنِ کریم اور آپؐ کے زمانے کی تاریخ سے بالکل بے بہرہ ہو اور اسے یہ خبر بھی نہ ہو کہ قرآنِ کریم نے اپنے مخالفوں کو بار بار چیلنج کے انداز میں یہ بات کہی کہ ہمارا پیغمبر جو کچھ بیان کر رہا ہے یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم اس کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اگر ہم انہیں یہ باتیں نہ بتاتے تو وہ کبھی ان باتوں کو نہ جان سکتے، جس طرح ان کی قوم اور اہلِ زمانہ ان باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ آنحضرت ﷺ کی نبوت پر دلائل قائم کرنے کے بعد آپؐ کے مقصدِ بعثت کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا اہتمام اس لئے فرمایا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو ان کے انجام سے خبردار کریں۔ یاد رہے کہ یوں تو رسالت و نبوت کا کام سب سے کٹھن کام ہے لیکن آنحضرت ﷺ کیلئے یہ مشکل اس لحاظ سے فزوں تر ہو جاتی ہے کہ آپؐ کو ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث فرمایا گیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا۔ یہ قوم جو اس وقت عرب میں آباد ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق بنی اسماعیل سے ہے۔ عرب میں حضرت اسماعیل اور حضرت شعیب علیہما السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ تقریباً دو ہزار برس کی اس طویل مدت میں باہر کے انبیاء کی دعوتیں تو ضرور وہاں پہنچیں مثلاً حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی دعوتیں۔ مگر کسی نبی کی بعثتِ خاص اس سرزمین میں نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب تک دنیا میں ایک رسول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود رہتا ہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود رہتے ہیں، کسی نئے رسول کی بعثت نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی یا کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت لاحق ہو۔ ویسے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے عظیم القدر فرزند کو ساتھ لے کر مکے میں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا تو مکے میں ایک امتِ مسلمہ اٹھائے جانے کی دعا کی اور ساتھ ہی یہ التجا بھی کی کہ ان میں ایک ایسا رسول بھیجا جائے جو یہیں کے رہنے والوں کی اولاد میں سے ہو۔ یعنی قبیلۂ قریش کا ایک فرد ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور نبی کریم ﷺ دعائے خلیل کی اجابت بن کر تشریف لائے۔ آپؐ کی نبوت اگرچہ پوری نوعِ انسانی کیلئے ہے لیکن قریش اور عرب میں بسنے والے دیگر لوگ آپؐ کے اولین مخاطب اور اس امت کا ہراول دستہ ہیں۔ ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی بعثت اس کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ اگر ان لوگوں نے اس کی قدر کی تو اس کے نتیجے میں دنیا کی امامت کے منصب پر فائز ہوں گے۔ اور اگر انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو یہ ان کیلئے بہت بڑی نقمت کا باعث بن سکتی ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی قوم خدا کے بھیجے ہوئے منذر کے انذار سے یاد دہانی نہیں حاصل کرتی تو وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اور ہم رسول نہ بھیجتے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے اعمال کے سبب سے کوئی مصیبت آئے تو وہ کہیں اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔ ۴۷)

Marfat.com

تین باتوں کی طرف اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں تین باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرت، حواس اور عقل کی جو روشنی عطا فرمائی ہے وہ بھی انسان کو گمراہی اور بد عملی کی زندگی سے بچانے کیلئے کافی ہے۔ اس روشنی کے عطا کر دینے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ وحیِ الٰہی کا نور بھی نازل فرمائے۔ کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ تفصیلی احکام وحیِ الٰہی کے بغیر جاننا ممکن نہیں۔ لیکن ضروریاتِ دین کی پہچان اور اللہ تعالیٰ کے عرفان کیلئے عقل اور فطرت کی رہنمائی کفایت کرتی ہے۔ اس رہنمائی کے بعد اگر پروردگار کی جانب سے لوگوں کی بد عملیوں کی سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو وہ عدل کیخلاف ہرگز نہ ہوتا۔

دوسری بات جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو زمین پر فساد پسند نہیں۔ وہ انسانوں کی کج روی اور بد عملی کو ایک حد تک ہی برداشت کرتا ہے۔ جب اخلاقی پیمانے بھر جاتے ہیں تو پھر اس کی طرف سے سزا نازل ہو جاتی ہے۔ اور اس کیلئے ضروری نہیں کہ اس سے پہلے کسی نبی کی بعثت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

تیسری بات جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا وہ یہ ہے کہ وحیِ الٰہی کا نزول اور رسول کی بعثت اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص ہے۔ یہ ہدایت کی بنیادی ضرورت نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کمالِ عدل سے یہ پسند فرمایا کہ وہ ہر طرح کے عذر کو ختم کر دے اور لوگوں پر حجت تمام کر دے۔ اس کیلئے اس نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ قریش اور دیگر اہلِ عرب کو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص اور اس کی خصوصی رحمت ہے کہ اس نے آخری رسول کو ہمارے اندر مبعوث فرمایا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تنبیہ بھی ہے کہ اگر اتنی بڑی عنایت کے بعد بھی تم لوگوں نے اس کی قدر نہ کی تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے اب قیامت کے دن ان کا کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی ؕ اَوَلَمْ یَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۗ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

(پس جب ہماری طرف سے حق ان کے پاس آ گیا تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا، کیا اس طرح کے لوگوں نے اس چیز کا انکار نہیں کیا جو اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی، انہوں نے کہا دونوں ماہر جادوگر ہیں جنہوں نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور کہا کہ ہم اس سب کے منکر ہیں۔ ۴۸)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق قطعِ عذر اور اتمامِ حجت کیلئے جب مکہ معظمہ میں نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپؐ پر قرآنِ کریم کو نازل فرمایا اور قرآنِ کریم اور رسولِ کریم دونوں چونکہ ایک ہی پیغام کے پیش کرنے والے اور ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں اس لئے قرآنِ کریم نے دونوں کو حق کے نام سے تعبیر کیا کیونکہ یہ دونوں چیزیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ اور دونوں کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ جس طرح سچائی کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا رسول اور قرآنِ کریم اس

Marfat.com

سچائی کے مبلغ اور مناد ہیں۔ نہ اس سرچشمے تک باطل کی گرداڑ کر پہنچ سکتی ہے اور نہ ان دونوں کی صداقت کو مخالفین کی ژاژ خائی مکدر کر سکتی ہے۔ چنانچہ اب جبکہ یہ حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گیا ہے اور اسی پر آئندہ انسانوں کی قسمت بننے یا بگڑنے کا انحصار ہے۔ تو شیطانی قوتوں نے اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے احسان سے انسانوں کو تہی دامن رکھنے کیلئے اپنے تمام حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اور اپنے ترکش کا ایک ایک تیر آزمانا شروع کر دیا۔ اور پھر اس میں قریش، جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے رسول کے مخاطب تھے نے ہی اس مخالفت میں اپنا رول ادا نہیں کیا بلکہ یہود بھی پوری طرح سے ان کی پشت پناہی کرنے لگے۔ چنانچہ یہود ہی کے بتلانے اور اکسانے پر آنحضرت ﷺ کی نبوت کیخلاف وہ اعتراض کیا گیا جو اس آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ قریش اگرچہ یہودیت اور مسیحیت سے بالکل ناواقف نہیں تھے لیکن دونوں کی تفصیلات سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سنتے رہتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کو کس طرح نبوت ملی اور انہیں کیسے کیسے معجزات سے سرفراز کیا گیا۔ لیکن یہ یہود تھے جو انہیں ان باتوں سے آگاہ کرتے تھے اور پھر ان کو تیار کر کے آنحضرت ﷺ پر اعتراض کرنے کیلئے بھیجتے تھے۔ چنانچہ انہیں کے اکسانے پر قریش نے یہ سوال کیا کہ جس طرح آپ نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، اسی طرح یہود میں موسیٰ نام کے ایک عظیم پیغمبر گزر چکے ہیں۔ انہیں جب نبوت دی گئی تھی تو ساتھ ہی معجزات بھی دیئے گئے تھے۔ ان کا عصاء سانپ بن جاتا تھا، ان کا ہاتھ سورج کی طرح چمکتا تھا، ان کی دعا سے طوفان اٹھتے، ہوائیں بے قابو ہوتیں اور زمین و آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا تھا۔ آپؐ تو اس طرح کی کوئی نشانی لے کر نہیں آئے، تو آپؐ کو نبی کیسے باور کر لیا جائے۔ اگر آپؐ بھی نبی ہوتے، تو آپؐ کو بھی ویسے ہی معجزات دیئے جاتے جیسے موسیٰ کو دیئے گئے تھے۔ قرآنِ کریم نے کسی لمبی بحث میں پڑے بغیر دوٹوک اور براہِ راست جواب دیا کہ جن لوگوں نے تمہیں یہ سکھایا پڑھایا ہے ذرا ان سے یہ تو پوچھو کہ اگر ایسے معجزات دیکھنے کے بعد کسی نبی کے دعویٰ نبوت کو ماننا ضروری ہو جاتا ہے تو پھر ان کے بھائی بند یعنی حضرت موسیٰ کے ہمعصر لوگوں نے حضرت موسیٰ کو نبی ماننے سے کیوں انکار کیا تھا۔ انہوں نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کو معجزات ماننے کی بجائے جادو قرار دیا۔ اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں بدتمیزی کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کو ساحر کہنے کی بجائے آیت میں سحر کہا گیا ہے۔ سحر کا تثنیہ سحران ہے۔ اور یہ ساحر کے مفہوم میں ہے۔ عربی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب اسمِ فاعل کو اسمِ مصدر کی صورت میں صفت یا خبر کے طور پر لایا جاتا ہے تو اس کے اندر مبالغہ کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ اور "تظاہر" کے معنی تعاون اور گٹھ جوڑ کرنے کے ہیں، یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جو شاندار معجزے دکھائے تو ان پر ایمان لانے کی بجائے فرعون اور اس کے امراء نے کہا دونوں بڑے ماہر جادوگر ہیں۔ اور انہوں نے ہمارے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ یہ دونوں اس گٹھ جوڑ کے ذریعے کیسے ہی کرتب دکھائیں اور کتنا زور لگائیں ہم ہرگز ان پر ایمان لانے والے نہیں۔ ہم انہیں بھی ماننے سے انکار کرتے ہیں اور ان کے معجزات کے بھی منکر ہیں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٩﴾

(اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے، اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہے، میں اسی کی پیروی کروں گا، اگر تم سچے ہو۔ ۴۹)

Marfat.com

قریش سے ایک مطالبہ

گزشتہ آیات سے یہ بات تو ثابت ہوجاتی ہے کہ عقل اور فطرت کی روشنی کے باوجود انسان عموماً ہوائے نفس کی یورش، مفادات کی ہوس اور بعض طبعی عوارض سے اس حدتک مقہور واقع ہوا ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی قبول کئے بغیر اس کیلئے کوئی چارہ نہیں۔ اسی وجہ سے پروردگار نے ہمیشہ انبیائے کرام مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں تاکہ انسان نارسائیِ فکر کا شکار نہ ہو اور ان کا اتباع کر کے منزلِ مقصود تک پہنچے۔ اب جبکہ اسی مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تشریف لے آئے اور آخری کتاب نازل ہوگئی تو بجائے اس کا اتباع کرنے کے قریش نے معجزات کے حوالے سے سوالات کھڑے کردیئے۔ قرآنِ کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر معجزات ہی ہدایت کی اساس اور ضمانت ہیں تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کیوں کیا گیا۔ اور صاف صاف ان کے معجزات کو جادو قرار دیا گیا۔ جبکہ یہ بات طے ہوگئی ہے کہ ہدایت کیلئے بہرصورت کسی نہ کسی نبی اور کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر اس نامعقول بات کو مان بھی لیا جائے کہ تورات اور قرآنِ کریم کی ہدایت کافی نہیں تو پھر تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں سے بہتر ہدایت دے سکتی ہو۔ کیونکہ ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کے نبی اور کتاب کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اور میں چونکہ ہدایت ہی کا پیروکار ہوں، اس لئے اگر تم کوئی اور کتاب پیش کردو جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو اور قرآنِ اور تورات سے زیادہ ہدایت دیتی ہو تو مجھے اس کے اتباع سے بھی انکار نہیں ہوگا۔ لیکن اگر تم ایسی کوئی کتاب نہیں رکھتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پیروی میں سچے نہیں ہو۔ تمہیں محض اعتراض کرنے سے دلچسپی ہے، ہدایت سے دلچسپی نہیں۔

اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ نبی کریم ﷺ قرآنِ کریم کی ہدایت سے یکسو نہیں تھے، اس لئے آپ کسی اور کتاب کی پیروی کیلئے بھی تیار تھے۔ بلکہ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ جو کتاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے وہ ہدایت اور نور کا سرچشمہ تھی، اور اسے واجب الاتباع ٹھہرایا گیا تھا۔ قرآنِ کریم اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ وہ پہلی کتابوں کا انکار نہیں کرتا بلکہ ان کا مصدق اور ان میں کی جانے والی ترمیمات وتحریفات کا اصلاح کرنے والا ہے۔ اس میں پیش کی جانے والی ہدایت تمام ہدایتوں کی جامع ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی پیروی درحقیقت تمام کتابوں کی پیروی ہے جس طرح آنحضرت ﷺ کا اتباع تمام رسولوں کا اتباع ہے۔ اب نہ اللہ تعالیٰ کے اس آخری رسول کے بعد کوئی اور رسول آئے گا اور نہ اس کتاب کے بعد کوئی اور کتاب آئے گی۔

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۰﴾

(پس اگر وہ آپ کا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو یقین کرلیجئے کہ یہ دراصل اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے، اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۵۰)

Marfat.com

ہدایت کی پیروی سے گریز کرنے والا خواہشات کا پیرو ہے

اگر یہ لوگ آپؐ کے اس چیلنج کے جواب میں تورات اور قرآنِ کریم سے زیادہ کوئی ہدایت بخش کتاب پیش نہیں کرتے اور نہ ان میں سے کسی کی پیروی کیلئے تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دراصل ہدایت کے پیروکار نہیں بلکہ اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشات کا پیرو ہے اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوگا۔ نفس انسان کو گناہ کا حکم دیتا اور خواہشات کے راستے پر چلاتا ہے۔ اس کے اندر حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت نہیں، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نفس کے پھیلائے ہوئے جال میں عقل ایسا الجھتی ہے کہ اس کیلئے باہر نکلنا ممکن نہیں رہتا۔ اور بعض دفعہ تو عقل نفس کا ایجنٹ بن کر رہ جاتی ہے اور بجائے حق کا ساتھ دینے کے اس کے خلاف دلائل فراہم کرنے لگتی ہے۔ اقبال نے ایسے ہی موقع پر نہایت تاسف سے کہا تھا:

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

جو لوگ خواہشوں کی پیروی کرتے اور عقل سے رہنمائی لینے کی بجائے اسے خواہشات کا غلام بنا دیتے ہیں وہی دراصل ظالم ہیں۔ کیونکہ انہوں نے عقل کو مغلوب کر کے اور خواہش کو غالب بنا کر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ یاب نہیں کرتا۔

وَلَقَدْ

وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥١﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾
اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا
عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ
لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿٥٥﴾ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ

Marfat.com

اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَقَالُوْٓا
اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ
لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ
مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا
قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى
حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا
مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ
شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ
وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

رکوع: ۶۔ (اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۵۱) اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ۵۲) اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے، بیشک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس سے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۔ ۵۳) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو دہرا اجر ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے، وہ برائی کو بھلائی سے دفعہ کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۵۴) جب یہ کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ ۵۵) اے پیغمبر! آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۶) اور وہ کہتے ہیں اگر ہم آپ کے ساتھ اس کتاب کی پیروی اختیار کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے، کیا ہم نے انہیں متمکن نہیں کیا ایک پر امن حرم

Marfat.com

میں جس کی طرف ہمارے فضل سے ہر چیز کی پیداواریں کھنچی چلی آ رہی ہیں مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔
۵۷) کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی خوشحالی پر فخر کرنے لگے تھے، پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ، آخر کار ہم ہی ان کے وارث بنے۔ ۵۸) اور آپ کا رب بستیوں کا ہلاک کرنے والا نہ تھا جبکہ تک ان کی مرکزی بستی میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے مگر اس وقت جب ان کے رہنے والے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن گئے۔ ۵۹) تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور پائیدار ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۰)

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥١﴾

(اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ ۵۱)

ہدایت کی تعلیم وتذکیر کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا

سابقہ آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے راہِ راست پر چلنے اور صحیح رویہ کے مقابلے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوائے نفس کی پیروی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو راستے سے بھٹکاتی، حق کا دشمن بناتی اور عقل کو اپنا صحیح رول ادا کرنے سے روکنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے جو ہدایت کا راستہ روشن کیا ہے اس کا اتباع کیا جائے اور ہر حال میں حق اور اہلِ حق کو رہنما بنایا جائے۔ اسی کے نتیجے میں انسانیت کی بقاء اور انسانی اقدار کی جلا کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآنِ کریم ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔ تو انسان کے بہتر مستقبل کی ضمانت بلکہ انسان کی فلاح و کامرانی کا دارومدار چونکہ اسی ہدایت کو قبول کرنے پر ہے اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ ہم نے ہدایت کی تعلیم وتذکیر کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے تسلسل کو برابر قائم رکھا۔ ہر رسول کی تعلیمات کے گم ہو جانے یا بے اثر ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا رسول، نئی کتاب اور نئی شریعت لے کے آ جاتا۔ اس طرح اس سلسلے میں کبھی انقطاع ہونے میں نہیں آیا۔ چنانچہ اسی تسلسل کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ کتاب کو اس کے حاملوں نے پسِ پشت ڈال دیا اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتِ شریعت کو نظر انداز کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے محمدِ کریم ﷺ کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اور جو ہدایت پہلی کتابوں میں انسانوں کو عطا کی گئی تھی اسی کو قرآنِ کریم کی شکل میں نئے اسلوب سے جامعیت اور کاملیت کے ساتھ نازل فرمایا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں، وہی جانے پہچانے حقائق ہیں۔ البتہ انسانوں کے ذہنی افق میں ارتقاء کے باعث جو تبدیلی آ رہی ہے قرآنِ کریم ان تمام تبدیلیوں کا جواب اور تمام امراض کا شافی علاج بن کر نازل ہوا ہے۔ اہلِ کتاب چونکہ دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ پیش قدمی کریں اور اس نعمت کو دوسروں سے آگے بڑھ کر قبول کریں جو انہیں پہلے ناتمام شکل میں مل چکی ہے، اور اب وہ کامل شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اور بنی اسماعیل کو اس لئے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ براہِ راست ان کو اپنی اس عظیم نعمت کا مورد بنایا ہے جبکہ وہ آج تک براہِ راست اس نعمت سے کبھی مشرف نہیں ہوئے۔

Marfat.com

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ
اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾

(اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی اس سے پہلے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ۵۲) اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے، بیشک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم اس سے پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۔ ۵۳)

اہلِ کتاب کے صالحین کے ایمان لانے پر اظہارِ تحسین

آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی دعوت کے راستے میں یوں تو مشرکینِ عرب نے بھی رکاوٹیں کھڑی کرنے اور اس کا راستہ روکنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، لیکن پورے عرب یا عرب کے کسی قبیلے نے اجتماعی طور پر اس دعوت کو مسترد نہیں کیا۔ قریش نے سب سے زیادہ ہیکڑی دکھائی، لیکن اس دعوت کی برومندی اور فلاح و کامرانی کیلئے سب سے زیادہ قربانیاں بھی قریش ہی نے دیں اور ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود دعوت کی قبولیت کا سلسلہ کبھی نہیں رکا بلکہ اندر ہی اندر اس دعوت کے اثرات پھیلتے رہے۔ لیکن وہ طبقہ جنہوں نے اجتماعی طور پر اس دعوت کو رد کر دیا، وہ اہلِ کتاب کا طبقہ ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے بعض لوگ اس وقت بھی سند کے طور پر پیش کرتے تھے اور آج بھی اس سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اور تاریخِ مذہب کا طالب علم اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود ان کے صالحین کا ایک قابلِ ذکر طبقہ ایسا ضرور ہوا ہے جنہوں نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے حرزِ جان بھی بنایا۔ یہود میں عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں شمعون کے پیروکاروں نے ہر طرح کے ناموافق حالات کا سامنا کرتے ہوئے اس دعوت کو قبول کرنے کا حوصلہ دکھایا۔ قرآنِ کریم انہیں لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشرکینِ مکہ کو شرم دلا رہا ہے کہ تم اپنے گھر آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو حالانکہ دور دور کے لوگ اس کی خبر سن کر آ رہے ہیں اور اس کی قدر پہچان کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی مفسرین نے بیان کیا ہے جسے ابنِ ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے اس طرح روایت کیا ہے:

> ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی کریم ﷺ کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کیلئے مکہ معظمہ آیا اور نبی کریم ﷺ سے مسجدِ حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہوئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآنِ مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور انہیں سخت ملامت کی کہ ”بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔“ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔“ (سیرت ابن ہشام ج ۲، البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۸۲)

Marfat.com

ان کا ایمان صرف زبان کے اقرار تک محدود نہ تھا بلکہ جب ان پر قرآنِ کریم کی آیات پڑھی جاتیں تو وہ نہ صرف اس پر ایمان لانے کا اعلان کرتے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے کہ ہم اگرچہ پہلی آسمانی کتابوں کے ماننے والے ہیں، لیکن ہمارے آباؤ اجداد نے جس طرح ان میں تحریفات کی اور آج قرآنِ کریم ان سے پردہ اٹھارہا ہے تو ہم قرآنِ کریم کے بیان اور انکشاف کو حق سمجھتے ہیں جو ہمارے رب کی طرف سے ہمیں پہنچایا جارہا ہے۔ اور ہمارے علماء نے خیانت سے کام لیتے ہوئے اگرچہ آج نبی آخرالزماںؐ اور قرآنِ کریم کے بارے میں بہت سی پیشگوئیوں کو خلط ملط کردیا ہے، لیکن ہم چونکہ اصل حقیقت سے واقف ہیں اس لئے ہم پہلے سے اس انتظار میں تھے کہ کاش وہ وقت ہماری زندگی میں آئے جب نبی آخرالزماںؐ کی بعثت ہو، اور ہم اپنی آنکھوں سے وہ زمانہ دیکھیں جس کا تذکرہ ہم اپنی کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے آج قرآنِ کریم کی شکل میں جو کچھ ہمارے سامنے ہے ان میں سے کوئی چیز بھی نئی نہیں۔ ایمان کی وہی دعوت ہے جو اس سے پہلے تورات اور انجیل میں دی جاچکی ہے۔ وہی عبادات ہیں جن سے ہم پہلے سے آگاہ ہیں، اگرچہ اہلِ کتاب نے ان میں بہت کچھ بدل ڈالا۔ لیکن آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم ان تمام پیشگوئیوں کے مصدق اور مصداق بن کر آئے ہیں۔ اس لئے جیسے ہی اس دولت کو اپنے سامنے پایا جس کے ہم منتظر تھے تو ہم ان کی اطاعت میں داخل ہوگئے اور ہم جو پہلے ہی سرِ تسلیم خم کرچکے تھے اب زبان سے بھی اس کا اظہار کرنے لگے۔ اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوکر اپنی قسمت سنوارنے لگے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾

(یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو دہرا اجر ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے، وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۵۴)

اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات

اہلِ کتاب میں سے جن سعید روحوں کے ایمان لانے کی خبر گزشتہ آیات میں دی گئی ہے اب ان کے ایمان کی قبولیت اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی انعامات کا ذکر فرمایا جارہا ہے، لیکن ان انعامات کی تفصیل بیان کرنے کی بجائے لپیٹ کر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نہ بیان کرنے کے باوجود بھی بیان کا حق ادا ہوگیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو اپنی استقامت کے صلہ میں دہرا اجر پائیں گے۔ یعنی ایک مومن جو ایمان کے تقاضوں کو پورا کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے بے پایاں انعامات کا مستحق ٹھہرے گا کہ جن کا اس دنیا میں تصور کرنا بھی محال ہے۔ کیونکہ آج کون ہے جو اس کا تصور کرسکے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کیلئے ایسی جنتیں تیار کررکھی ہیں جن کا عرض زمین و آسمان ہیں۔ انسان آج تک آسمان کی حدود کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا، تو وہ ایسی وسیع جنت کا کیا تصور کرے گا۔ لیکن یہ ایسے خوش نصیب لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس امت کے مومن سے دہرا اجر عطا فرمائے گا۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ انہیں اس امت کے اہلِ ایمان پر فضیلت دی جارہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ بھی اسی امت کا حصہ ہیں اور اسی رسول کے امتی ہیں جس رسول کی نام لیوا یہ امت ہے۔ لیکن ان خوش نصیب لوگوں کو ایمان کیلئے دہری مشقت اٹھانی پڑی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے ہوتے ہوئے پہلے وہ اپنے نبی اور اپنی کتاب پر ایمان رکھتے تھے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اہلِ کتاب میں ایمان و عمل کے حوالے سے جو بے شمار خرابیاں پیدا ہوئیں اور بدعات و خرافات نے جس

Marfat.com

طرح عام زندگی پر تسلط حاصل کیا انہوں نے ہر طرف سے دامن بچا کر اپنے نبی اور کتاب کی خالص شریعت پر عمل کرنے کی کوشش کی اور اس راستے میں جو بھی مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔اور ساتھ ہی ساتھ نبی خاتم اور دینِ کامل کی پیشگوئی جو پہلی کتابوں میں کی گئی اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیائے علیہم السلام نے ان کا اعلان کیا، یہ برابر اس کیلئے چشم براہ رہے۔ چنانچہ جب نبی آخرالزماں تشریف لے آئے تو انہوں نے اسے یوسفِ گم گشتہ سمجھ کر آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جبکہ اہلِ کتاب نے اجتماعی طور پر اس دینِ کامل کی دعوت کو رد کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ عبداللہ بن سلام کے ساتھی اور نصاریٰ میں سے شمعون کے پیروؤں نے اپنی قوم کے مبتدعین اور محرفین کے ہاتھوں انتہائی مصائب جھیلے، لیکن ان کی پامردی واستقامت میں کبھی فرق نہ آیا۔ یہی اہلِ حق تھے جن کو قرآن کی دعوت قبول کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اور قرآن نے متعدد سورتوں میں ان کی ثابت قدمی کو تسلیم کیا اور ان کیلئے دہرے اجر کا اعلان کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رُجُلٍ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ ”تین شخص ہیں جن کو دہرا اجر ملے گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا، پھر محمد (ﷺ) پر ایمان لایا۔“

اہلِ کتاب میں ایمان لانے والوں کی صفات

اب ان خوش نصیب لوگوں کے کچھ اخلاقِ حسنہ بیان کئے جارہے ہیں جن میں پہلی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے صبر وعزیمت کا حال یہ ہے کہ اپنے بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہبوں کے ہاتھوں انہیں اس آخری دین کے قبول کرنے کے نتیجے میں جن زہرہ گداز مصائب سے واسطہ پڑا ہے انہوں نے کبھی اس سے حوصلہ نہیں ہارا۔ اور کبھی مشتعل نہیں ہوئے۔ لوگوں نے ایذائیں پہنچائیں، بدزبانی سے کام لیا، تمسخر اڑایا اور ہر طرح کی توہین کی، لیکن انہوں نے ایسی ہر برائی کا جواب نیکی اور خیر خواہی سے دیا۔ وہ دکھوں کے جواب میں ہمیشہ دعائیں دیتے رہے، گالیاں سن کر ہمیشہ نصیحت سے کام لیا۔ بڑی سے بڑی تکلیف پر بھی کبھی مایوس نہ ہوئے، شرافت سے گری ہوئی حرکتیں کی گئیں لیکن ان کی مومنانہ شرافت اور کریمانہ عفو ودرگزر کو کبھی شکست نہ دی جاسکی۔

مزید ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ایمان لانے کے نتیجے میں صرف ان کے رویئے ہی میں تبدیلی نہیں آئی بلکہ ان کی زندگی کے اہداف بھی بدل گئے۔ بنی اسرائیل بالخصوص یہود کی شناخت آج تک زر پرستی رہی ہے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ مخالفین کی عداوت اور مخالفت نے اگرچہ ان کے مالی معاملات تلپٹ کر کے رکھ دیئے، ان کیلئے آسودگی سے گھر چلانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ بایں ہمہ جو کچھ بھی ان کے پاس آتا ہے وہ اس میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر نظریہ جو زندگی کا نظام پیش کرتا ہو، اجتماعی زندگی کی تعلیم دیتا ہو، ایک نئی سوسائٹی بنانے کی فکر میں ہو، ریاست کی تنظیم جس کے اہداف میں شامل ہو، جس کی منزل اجتماعی انقلاب ہو، اس کے افراد کی سب سے بڑی قوت اگرچہ ایمان اور حُسنِ عمل ہوتی ہے لیکن اسے بروئے کار لانے کیلئے قدم قدم پر مالی معاونت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس دعوت کی منزل صرف درویشی اور دنیا سے لاتعلقی کو فروغ دینا ہو وہ بھی بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ چہ جائیکہ وہ دعوت جو اپنے سامنے دھرتی کو ایک نیا روپ دینے کیلئے اٹھی ہو اس لئے یہ لوگ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ انہیں عطا کرتا ہے اسے اپنی حد تک محدود نہیں رکھتے بلکہ انفاق فی سبیل اللہ سے کام لیتے ہیں۔

Marfat.com

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

(جب یہ کوئی لغوبات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔ ۵۵)

گزشتہ مضمون کا تسلسل

گزشتہ آیت میں عفوودرگزران کا خاص وصف بیان کیا گیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کی مزید وضاحت محسوس ہوتی ہے اور یہ شاید اس لئے بار دگر بیان کی جارہی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو ایسی ہی صورتحال سے واسطہ تھا۔ اور آپ کے دشمن آپ کے ساتھ بدترین رویہ اختیار کر چکے تھے۔ ایسے حالات میں اہلِ حق کا سب سے مضبوط حربہ عفوودرگزر اور صبر واستقامت ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اہلِ کتاب جو اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہوئے ہیں انہیں بھی جب ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو ہمیشہ سے اہلِ ایمان کا شیوہ رہا۔ ممکن ہے اس میں اشارہ ابوجہل کے بے ہودہ رویئے کی طرف ہو۔ جو اس نے حبشہ سے آئے ہوئے ان مسافروں کے ساتھ اختیار کیا تھا جو حق کی تلاش میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے تھے اور جیسے ہی انہوں نے قرآنِ کریم کو سنا اور حضورؐ نے ان کے سامنے دعوتِ حق پیش کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انہوں نے اس دعوت کو اس طرح بے تابانہ قبول کیا گویا وہ برسوں سے اس کی تلاش میں تھے۔ اور جب ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے انہیں لعنت ملامت کی تو انہوں نے جواب میں یہی کہا کہ تمہارے لئے تمہارے اعمال مبارک ہوں، اور ہمیں اپنے اعمال کی فکر کرنے دو۔ پھر انہوں نے سلام کہا، اس سلام سے سلام مفارقت مراد ہے۔ جیسا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو سلام کیا تھا۔ یہ کسی سے پیچھا چھڑانے کا ایک نہایت شائستہ طریقہ ہے۔ اور مزید یہ کہا کہ تمہارا رویہ کچھ مناسب نہیں، ہم ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کا نتیجہ الجھاؤ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم اگر اصل بات کی طرف توجہ دینا نہیں چاہتے تو ہمارے پاس بلاوجہ الجھنے کا وقت نہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

(اے پیغمبر! آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۶)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

گزشتہ آیات کی تشریح میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہود ونصاریٰ میں سے جن مخلص لوگوں نے ناموافق حالات کے باوجود اسلام قبول کیا اور اس کی صداقت کی بلند بانگ شہادت دی۔ قرآنِ کریم نے ان کی تعریف وتحسین فرمائی ہے۔ اور مفسرین نے اس حوالے سے حبشہ سے آئے ہوئے وفد کی قبولیتِ اسلام کی جو تفصیل بیان کی ہے ہم نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کی قبولیتِ اسلام سے نصیحت حاصل کرنے کی بجائے جس طرح اشرافِ قریش نے نامناسب ردِعمل کا اظہار کیا، یقیناً آنحضرت ﷺ کو اس سے دکھ ہوا ہوگا اور آپؐ کے دل میں بار بار

Marfat.com

یہ خیال آیا ہوگا کہ دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ جس صداقت کو نہایت بے تابی اور اشتیاق سے قبول کر رہے ہیں وہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ پڑھے لکھے لوگ قرآنِ کریم کی حقیقت کو پا چکے ہیں اور ان کی کتابوں نے نبی آخر الزمان کے بارے میں جو پیشگوئیاں کی تھیں ان پر یقین رکھتے ہیں۔ کاش! اشرافِ قریش بھی اس حقیقت کو سمجھتے اور دولتِ ایمان سے مالا مال ہو جاتے۔ لیکن یہ ایسے بدنصیب لوگ ہیں کہ اس حقیقت کو قبول کرنے کی بجائے شب و روز اس کا راستہ روکنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کے اسی تاثر کے پیشِ نظر آپؐ کو تسلی دی گئی ہے اور قریش کے ایمان نہ لانے سے آپؐ کو جو صدمہ ہوا اس کی شدت کو کم کرنے کی سعی فرمائی گئی ہے۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں ہدایت کا لفظ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے اور ہم مختلف مواقع پر اس کا تذکرہ بھی کر چکے ہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر اتنا جان لینا ضروری ہے کہ ہدایت کا ایک معنی اراء الطریق یعنی راستہ دکھانا ہے۔ اور دوسرا معنی ایصال الی المطلوب یعنی منزل پر پہنچا دینا ہے۔ پہلے معنی کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ یقیناً ہادی ہیں۔ اور دوسرے معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں جس ہدایت کا انکار کیا جا رہا ہے وہ دوسرے معنی یعنی ہدایت یافتہ بنا دینے کے مفہوم میں ہے۔ اور یہ بات بلاشک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر شخص کی ہدایت کیلئے جتنا شدید جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپؐ کے ہم عصروں میں سے کوئی شخص ہدایت سے محروم نہ رہتا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تمام تبلیغی کاوشیں ان بدنصیبوں کا نصیب نہ بدل سکیں۔ اور جہاں تک راستہ دکھانے کا تعلق ہے آنحضرت ﷺ نے اس میں کبھی بال برابر بھی کوتاہی نہیں کی۔ آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ہدایت قبول نہیں کرنا چاہتے، آپؐ ان لوگوں کے پیچھے زیادہ ہلکان نہ ہوں۔ آپؐ کا کام پیغامِ حق پہنچا دینا ہے، لیکن جسے آپؐ چاہیں اسے ہدایت یافتہ بنا دینا نہ یہ آپؐ کے فرائض میں شامل ہے اور نہ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت پانے کا اہل ہے اور کون نہیں۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا جب آخری وقت آیا تو آنحضرت ﷺ نے بڑی دل سوزی سے کوشش کی کہ وہ کلمہ لا الہ الا اللہ پر ایمان لے آئیں مگر انہوں نے ملتِ عبد المطلب پر جان دینے کا اظہار کیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس پر شدید صدمہ ہوا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یاد رہے کہ محدثین اور مفسرین جب کسی آیت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں نازل ہوئی تو عموماً اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت فلاں واقعہ پر چسپاں ہوتی ہے اور اس آیت کے مضمون کی صداقت اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات ضروری نہیں کہ یہ آیت حضرت ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی صداقت حضرت ابو طالب کے ایمان نہ لانے سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ یوں تو کسی شخص کے بھی ایمان نہ لانے سے حضورؐ کو دکھ ہوتا تھا لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر خاتمہ آنحضرت ﷺ پر شاق گزرا ہے تو وہ جنابِ ابو طالب تھے۔ کیونکہ ذاتی محبت اور تعلق کی بناء پر آپؐ ان کی ہدایت کے شدید آرزو مند تھے۔

سلف صالحین کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ وہ حضرت ابو طالب کے ایمان نہ لانے کے واقعہ کو بغیر کسی وجہ کے بیان کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اور جب کبھی اس کا تذکرہ ہوتا تو اس پر نہایت تاسف اور رنج کا اظہار کرتے۔ امت کو ہمیشہ یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کا ایمان نہ لانا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو اس پر جو دکھ ہوا ہمارے لئے اس کا احترام لازم ہے۔

Marfat.com

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى
اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

(اور وہ کہتے ہیں اگر ہم آپ کے ساتھ اس کتاب کی پیروی اختیار کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے، کیا ہم نے انہیں متمکن نہیں کیا ایک پرامن حرم میں جس کی طرف ہمارے فضل سے ہر چیز کی پیداوار یں کھنچی چلی آ رہی ہیں مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۵۷)

قریش کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب

اس آیتِ کریمہ میں کفارِ قریش کے اسلام نہ لانے کے حقیقی سبب کو بیان کیا گیا ہے جسے خود قریش عذر کے طور پر پیش کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قریش کو پیکرِ محسوس کی پوجا کی لذت، اَن دیکھے حقائق کو تسلیم کرنے سے فکری معذوری، حُبِ دنیا اور مادی زندگی کی اخروی زندگی پر ترجیح ان کے وہ امراض تھے جسے قرآنِ کریم نے بار بار بیان کیا ہے لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جس حقیقی سبب کو بیان کیا جا رہا ہے یہ تمام امراض اسباب کی حیثیت سے اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں اس وقت مکہ معظمہ اور ملکِ عرب کے دوسرے گوشوں میں امامت و سیادت کا جو منصب حاصل ہے ہماری عیش و عشرت، دولت و رفاہیت اور تمام عرب پر ہمارے اثرات ہماری اس امامت و سیادت کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہماری بنیادی حیثیت کو نقصان پہنچا تو ہماری عظمت وقوت کے تمام سوتے خشک ہو جائیں گے۔ اس بات کو جاننے کیلئے ضروری ہے کہ اس زمانے میں قریش کو جو پوزیشن حاصل تھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس پر صاحبِ تفہیم القرآن نے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے، وہ اس کی وضاحت کیلئے کافی معلوم ہوتا ہے:

> قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیت دی وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا انسابِ عرب کی رو سے بالکل ثابت تھا اور اس بناء پر ان کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصی بن کِلاب کے حسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبہ کے متولی ہو گئے اور مکہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ اس لئے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ کے مجاور تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل تھا، اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو ان سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے روم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ اس زمانہ میں روم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تھی، اس کے سارے ناکے ایران نے روک دیئے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا، سو یمن پر ایران کے قبضہ نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اس تجارت کو جاری رکھنے کیلئے اس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیج فارس کی بندرگاہوں پر پہنچائیں، اور دوسری طرف انہی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اس صورتحال نے مکہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اس وقت قریش ہی تھے جنہیں اس کاروبار کا قریب قریب اجارہ حاصل تھا۔ لیکن عرب کی

Marfat.com

طوائف الملوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل وحرکت اس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں ان کے ساتھ قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سرداران قریش اس غرض کیلئے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کرسکتے تھے۔ اس کیلئے انہوں نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ ان کو حصہ دیتے تھے۔ شیوخ قبائل اور بااثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انہوں نے پھیلا رکھا تھا جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تجار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

ان حالات میں جب نبی کریم ﷺ کی دعوت حق اٹھی تو دین آبائی کے تعصب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کیلئے اس کے خلاف وجہ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اس دعوت کی بدولت انہیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجتوں سے شرک و بت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اس کو چھوڑنا اور اسے قبول کر لینا ہمارے لئے تباہ کن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصوں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رسوخ واثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائل عرب ہمیں سرے سے مکہ ہی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بار بار انہیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔ مگر انہیں اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رسوخ ہمیں آج حاصل ہے یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوے ہماری بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ ان کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد ﷺ کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابع فرمان ہونے والا تھا، پھر اسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیر نگیں ہو جانے والے تھے، اور اس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفاء سندھ سے لے کر سپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر حکمرانی کرنے والے تھے۔ (تفہیم القرآن)

قریش کے خدشے کا علاج

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ ...... قریش کو قبول اسلام کے نتیجے میں اپنا سب کچھ چھن جانے کا جو دھڑکا لگا ہوا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان نادانوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذرّیت کو اس سرزمین پر لا کر بسایا اس وقت یہاں کیا تھا۔ نہ آبادی تھی، نہ معاشی وسائل کا کوئی وجود۔ ایک صحرا اور ریگستان کے سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا گھر آباد ہوا اور اسی کی برکت سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں یہاں آبادی ہوئی، پانی کا ایک چشمہ پھوٹا، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد پھلی پھولی اور قریش کا عظیم خاندان وجود میں آیا۔ آج حال یہ ہے کہ ہر علاقے سے ہر قسم کی پیداوار یہاں کھنچی چلی آ رہی ہے۔ آج یہ بدنصیب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اس دین کو اختیار کر لیا جس کی قرآن پاک دعوت دے رہا ہے، جو اصلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے تو

Marfat.com

یہ تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین نے ان کو یہاں بسایا، انہیں کے بنائے ہوئے گھر کی وجہ سے انہیں عظمتیں ملیں، امن نصیب ہوا اور عرب بھر میں امامت و سیادت ملی، احترام قائم ہوا اور اسی حوالے سے دوسرے ممالک کے درباروں میں بھی عزت کی حیثیت نصیب ہوئی۔ لیکن آج اسی دین اور اسی ملتِ ابراہیمی میں انہیں اپنی تباہی نظر آ رہی ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

(کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی خوشحالی پر فخر کرنے لگے تھے، پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ، آخر کار ہم ہی ان کے وارث بنے۔ ۵۸)

قریش کو جن فکری اور اخلاقی گمراہیوں نے ہدایت سے دور رکھا ہے ان میں سے ایک خرابی کا حوالہ دے کر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم جس چیز پر فخر کرتے اور اتراتے ہو، یہی تو وہ چیز ہے جس کی وجہ سے گزشتہ کئی امتیں تباہ ہو چکی ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بھڑک چکا ہے۔ تم اپنی دولت و ثروت اور امارت و رفاہیت پر فخر کرتے اور اسی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہو اور اسی میں زیادہ سے زیادہ ترقی کو تم اپنی منزل بنا چکے ہو اور تمہیں اس شخص کی بات نہایت فضول معلوم ہوتی ہے جو تمہارے اس استغراق پر تنقید کرتا ہے تم اسے دیوانہ سمجھتے ہو۔ گویا کہ تمہارے نزدیک مادی زندگی کا حصول اور اس میں بیش از بیش ترقی زندگی کا اصل ہدف ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان کے اس رویئے پر تنقید کرتے ہوئے پروردگار ارشاد فرما رہا ہے کہ تم سے پہلے تم سے زیادہ ترقی یافتہ قومیں گزری ہیں۔ ان کے مساکن یعنی ان کی آبادیاں اور ان کے مکانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تم ان قوموں کے کھنڈرات سے گزرتے ہوئے پہاڑوں میں کھدے ہوئے ان کے مکانات بارہا دیکھ چکے ہو۔ آج ان مکانات کی بے آبادی اور اس علاقے کی ویرانی اور وہاں جا بجا پھیلی ہوئی نحوست خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہاں بسنے والی قوموں نے جن چیزوں کو اپنے لئے عمرِ دوام کا سامان سمجھا تھا وہی چیزیں ان کیلئے ہلاکت کا باعث بنیں۔ آج تاریخ انہیں صرف عبرت کے حوالے سے یاد کرتی ہے۔ کوئی ان کا نام لیوا زندہ نہیں۔ وہ جس چیز کو ترقی کا معیار سمجھتے تھے وہی چیز ان کیلئے ہلاکت کا سبب ثابت ہوئی۔ اہلِ حق نے دنیوی نعمتوں کو کبھی اپنے لئے حرام نہیں سمجھا اور نہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی۔ لیکن اگر یہی نعمتیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خوشحالی شکر کا ذریعہ بننے کی بجائے حق و باطل سے بے نیاز کر دے اور دنیا طلبی ہی مقصدِ زندگی بن کر رہ جائے اور جس مقصد کی دعوت اس تصور میں کمی کرتی ہو تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ تو یہ وہ چیز ہے جس نے پہلی قوموں کو تباہ کیا اور قریش کو بھی اس تباہی کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کی سرکشی نے زمین کو فساد سے بھر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو اس زمین کا مالک سمجھتے تھے وہ سب فنا ہو گئے۔ آخر ان کی ایک ایک چیز ان کی وراثت بن کر اللہ تعالیٰ کی ہی طرف لوٹ آئی۔ کیونکہ وہی زمین و آسمان اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر چیز کا وارث بھی ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

Marfat.com

(اور آپ کا رب بستیوں کا ہلاک کرنے والا نہ تھا جبکہ تک ان کی مرکزی بستی میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے مگر اس وقت جب ان کے رہنے والے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بن گئے۔ ۵۹)

سنت اللہ کا بیان

قریش کو انذار کرتے ہوئے ایک نہایت اہم حقیقت کو واشگاف فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم جن چیزوں اور جن ترقیات کو زندگی کی ضمانت سمجھتے ہو گزشتہ آیت کے آئینہ میں تم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ اگر دنیوی مال و دولت اور شوکت و رفاہیت زندگی اور اس کے دوام کی ضامن ہوتیں تو معذب قوموں کے کھنڈرات آج تمہیں اپنی داستانِ عبرت نہ سنا رہے ہوتے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی قوموں کو طویل زندگی ملتی ہے۔ اسی کی طرف سے وہ کامیابی اور کامرانی نصیب ہوتی ہے جس کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ اس کی ضمانت تمہارے طور اطوار اور تمہاری زندگی کے مصنوعی اصولوں میں نہیں بلکہ اس کیلئے مستقل اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کی ہدایت کیلئے اپنے رسول بھیجتا ہے۔ ان پر اپنی کتابیں نازل کرتا ہے۔ وہ کسی بھی مرکزی مقام پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی تبلیغ و دعوت کا مرکز قائم کرتے ہیں۔ جو قوم اس دعوت کو قبول کر لیتی اور اس کے مطابق زندگی استوار کر لیتی ہے اسے دنیا و عقبیٰ کی کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ لیکن جو قوم اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور پیغمبر کی تکذیب کرتی ہے وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ قریش بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں ہیں۔ اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا رسول آچکا، اس پر کتاب نازل ہو رہی ہے اور وہ پوری تندہی اور اخلاص کے ساتھ مکہ جیسی مرکزی بستی کو اپنا مرکز بنا کر قریش اور دیگر لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ذریعے انذار کر رہا ہے۔ قریش بحیثیت قوم اس وقت حالتِ امتحان میں ہیں۔ اگر اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو دنیا اور آخرت کی کامرانیاں ان کیلئے ہیں۔ اور اگر اس سے انکار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا کسی وقت بھی برس سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قانون کے دوسرے مرحلے کو آیت کے دوسرے حصے میں ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اگر وہ قوم جس کی طرف رسول مبعوث ہو چکا اور کتاب نازل ہو چکی ہے، اگر وہ رسول کی دعوت کو قبول نہیں کرتی بلکہ وہ کفر و شرک کے ارتکاب کے ذریعے مسلسل اپنی جانوں پر ظلم جاری رکھتی ہے اور رسول کی تکذیب سے رکنے کا نام نہیں لیتی، تو اللہ تعالیٰ ایک خاص وقت تک مہلت دیتا ہے۔ آخر کار وہ قوم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیکن اب اس کی تباہی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے لیکن اس کا سبب اس کا اپنا رویہ ہوتا ہے یعنی وہ کفر و شرک کے ذریعے اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہتے ہیں اور بالآخر ہلاکت کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۰

(تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور پائیدار ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۰)

Marfat.com

قریش کو براہِ راست تنبیہ

اس سے پہلے کی آیات میں جو تنبیہات کی گئی ہیں ان میں روئے سخن اگرچہ قریش کی طرف تھا لیکن خطاب براہِ راست ان سے نہ تھا۔ اب براہِ راست قریش کے لیڈروں سے مخاطب ہو کر تنبیہ کی جا رہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں جو دنیوی خوشحالی اور امارت و رفاہیت حاصل ہے یہ محض حیاتِ چندروزہ کا سامان اور عارضی رونق ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی پائیدار اور ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ ان میں بیشتر چیزیں وہم و گمان کے بتوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اسی متاعِ غرور کو حاصلِ زندگی سمجھ کر زندگی کی تمام صلاحیتیں اس پر نچھاور کر دیتا ہے اور اس وقتی چمک دمک پر ریجھ کر آخرت کیلئے جدوجہد کو نظرانداز کر دیتا ہے اور حیاتِ ابدی کے خزانوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی فریبِ نظر کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ یقین دلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے وہی بہتر بھی ہیں اور وہی باقی رہنے والی بھی ہیں۔ اس لئے عقل سے کام لو اور ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

أَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ
لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ
الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا
هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ
مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ
فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾
وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ
عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ
وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

Marfat.com

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ
اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ
وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى
وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ
جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ
اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ
اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٧٢﴾
وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ
فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ
لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٧٥﴾ ع

رکوع: ۷۔ (بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ اسے پانے والا بھی ہے کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے رکھا ہے، پھر وہ قیامت کے دن (کٹہرے میں) حاضر کیے جانے والوں میں سے ہے۔ ۶۱) اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا پھر پوچھے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جنہیں تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو۔ ۶۲) تو کہیں گے وہ لوگ جن پر

Marfat.com

عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا، اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنہیں ہم نے گمراہ کیا، ہم نے ان کو اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم گمراہ ہوئے، ہم تیرے حضور ان سے اعلانِ براءت کرتے ہیں، وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ ۶۳) اور انہیں کہا جائے گا، اب پکارو اپنے شریکوں کو، تو وہ انہیں پکاریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ ۶۴) اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ انہیں پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے ہمارے رسولوں کو کیا جواب دیا۔ ۶۵) تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی، وہ (مارے دہشت کے) آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ۶۶) ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کئے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں سے ہوگا۔ ۶۷) اور آپ کا رب ہی پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جو چاہتا ہے)، انہیں کچھ اختیار نہیں، اللہ پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۶۸) اور آپ کا رب جانتا ہے جو کچھ کہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۶۹) اور وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کیلئے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۰) اے پیغمبر ان سے کہئے کہ بتاؤ کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک رات ہی کو مسلط کر دے تو کون معبود ہے اللہ کے سوا جو تمہارے پاس روشنی لے آئے، تو کیا تم سنتے نہیں ہو۔ ۷۱) اے پیغمبر ان سے پوچھئے کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر تم پر دن ہی کو ہمیشہ کیلئے تا قیامت اللہ تعالیٰ مسلط رکھے تو کون معبود ہے اللہ کے سوا جو تمہارے لئے رات کو لائے جس میں تم سکون پاؤ، تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں ہو۔ ۷۲) اور اپنی رحمت سے اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تا کہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو، اور تا کہ تم (دن میں) اس کے فضل کے طالب بنو، اور تا کہ تم شکر ادا کرو۔ ۷۳) اس دن کا خیال کرو جس دن وہ انہیں پکارے گا پھر پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔ ۷۴) اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکالیں گے اور لوگوں سے کہیں گے لاؤ اب اپنی دلیل، اس وقت تم پر واضح ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔ ۷۵)

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٦١﴾

(بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کر رکھا ہے اور وہ اسے پانے والا بھی ہے کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے رکھا ہے، پھر وہ قیامت کے دن (کٹہرے میں) حاضر کئے جانے والوں میں سے ہے۔ ۶۱)

اَلْمُحْضَرِیْنَ …… احضار سے ہے۔ اس کا مفہوم ہے مجرموں کی طرح پکڑ کر حاضر کرنا۔ اس لحاظ سے اس میں ذلت کا معنی پایا جاتا ہے۔ تو مراد اس سے وہ لوگ ہوں گے جو اپنے شرک کے باعث ذلت کے ساتھ میدانِ حشر میں حاضر کئے جائیں گے۔

Marfat.com

کافر اور مومن کی ذہنیت کا مقابلہ

قریش کیلئے ہدایت قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی خوشحالی اور دنیوی جاہ و منزلت ہے، جس کے بارے میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے قبول کرنے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ان کے ان باطل تصورات پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے، اب اسی کے ازالے میں ان کے غور و فکر کیلئے مزید کچھ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اسلام تمہیں آخرت کی طرف بلاتا ہے اور ایک ایسے نظامِ زندگی پر کاربند ہونے کی دعوت دیتا ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں تم آسودہ زندگی گزارو گے، باہمی رشتوں کے احترام کے باعث گھر سے لے کر ریاست کے ایوانوں تک ہر معاملے کی چول سیدھی ہو جائے گی۔ اور ایک ایسی پرسکون زندگی وجود میں آئے گی جس میں محبت، مروت، مؤدت، ہمدردی و غمگساری کی اقدار جنم لیں گی اور انسان صحیح انسانی زندگی سے آشنا ہو جائے گا۔ اور مرنے کے بعد آخرت میں وہ خوبصورت زندگی نصیب ہوگی جس کی نعمتوں پر کبھی زوال نہیں آئے گا، کہیں کوئی خدشہ جنم نہیں لے گا، ہر طرف خوشیاں اور مسرتیں ہوں گی اور انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے سائے میں ابدی زندگی اور سکون سے ہمکنار ہو جائے گا۔ تم اس کی بجائے اس زندگی پر اصرار کر رہے ہو جو چند روزہ ہے، جس میں چند انسان خوش عیشی کی زندگی گزار رہے ہیں اور بیشتر انسان دکھوں کے سائے میں رہتے ہیں جہاں طاقتور طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں کی محرومیوں پر اپنی کامیابیوں کی عمارت استوار کرتا ہے۔ جہاں امیروں کے کتے مخمل کا لباس پہنتے اور غریبوں کے بچے موسموں کی شدت کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، جہاں ہر راحت اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف کا پہلو لئے ہوئے ہے اور ہر آسودگی کے اندر ابتری اور ناہمواری مضمر ہے اور جہاں کی بڑی سے بڑی دولت متاعِ غرور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی مختصر، ناپائیدار اور موہوم زندگی پر اصرار کے نتیجے میں اس زندگی سے منہ موڑ رہے ہو جو ہمیشہ رہنے والی اور مسرتوں و شادمانیوں سے عبارت ہے۔ اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہو کہ تم جن لوگوں کا مذاق اڑاتے ہو وہ اس ابدی زندگی کے وارث بننے والے ہیں۔ اور تمہاری یہ چند روزہ زندگی ہمیشہ کی ذلتوں و رسوائیوں اور مصیبتوں میں تبدیل ہونے والی ہے۔ اگر تم اس تقابل کو سمجھ سکتے اور تمہارے اندر صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہوتی تو تم کبھی روزِ حشر کی رسوائیاں اور ذلتیں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ آج بھی تمہارے لئے یہ موقع ہے کہ تم ان دونوں زندگیوں میں تقابل کر کے آخرت کی زندگی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرو، ورنہ وہ دن ٹلنے والا نہیں جب سب غلط لوگوں کو بروزِ حشر جزاء و سزا کے کٹہرے میں زبردستی لا کھڑا کیا جائے گا۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَآءِىَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾

(اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا پھر پوچھے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جنہیں تم میرا شریک گمان کرتے رہے ہو۔ ۶۲)

Marfat.com

شرک اور اہلِ شرک کا انجام

گزشتہ آیتِ کریمہ میں متاعِ دنیا کے فریب میں پھنسے ہوئے لوگوں کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم جب مسلمانوں کی غربت، کم مائیگی اور فلاکت کو دیکھتے ہو اور پھر اپنی خوش عیشی اور فارغ البالی پر نظر ڈالتے ہو تو تمہیں اپنے برسرِ حق ہونے اور اپنی کامیابی و کامرانی کا وہم ہونے لگتا ہے۔ اور مسلمانوں کی ناکامی اور نامرادی کا یقین آنے لگتا ہے۔ لیکن تم اس بات کو بھول جاتے ہو کہ تمہاری یہ خوش حالیاں چند روزہ ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور نامرادیوں کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن مسلمانوں کی تنگدستی اور بدحالی بھی چند دنوں کی بات ہے لیکن اس کے بعد ان کا درخشاں مستقبل ان کے انتظار میں ہے۔ دنیا کی آسودہ زندگی انہیں مصیبتوں سے طلوع ہونے والی ہے۔ اور پھر آخرت میں اس دنیا میں دی جانے والی قربانیوں کا ثمر جن نعمتوں کی صورت میں ملنے والا ہے ان کا نقشہ تو الفاظ میں کھینچنا ممکن ہی نہیں، تو ذرا غور کرو فانی اور باقی کا کیا مقابلہ۔ اور چند روزہ خوش عیشی کے نتیجے میں آخرت میں ہمیشہ کے عذاب کو لازم کر لینا کیسا خطرناک فیصلہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے جواب میں عرب کے مادہ گزیدہ اور دنیا کی خوش عیشی کے سحر میں ڈوبے ہوئے لوگ آخرت کا مذاق اڑاتے اور مسلمانوں کی کوتاہ نظری پر اظہارِ افسوس کرنے لگتے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی اسی غلط فہمی کا تدارک فرمایا گیا ہے، کیونکہ اہلِ عرب کا گمان یہ تھا کہ اولاً تو قیامت کے آنے کا امکان کوئی نہیں، اور اگر ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو ہی گیا تو پھر وہ غیر مرئی قوتیں اور وہ خیالی معبود اور توہمات کے گھڑے ہوئے خدا اور اجرامِ فلکی میں سے بنائے ہوئے دیوتا اور اوتار اور اہلِ زمین میں بعض مشیخیت کے دعویداروں کے غیر معمولی مراتب اور طاغوتی قوتوں کا بنا ہوا طلسم آخر کب کام آئے گا۔ ہم ان قوتوں سے جب استمداد کریں گے تو ہمارے لئے مشکل آسان ہو جائے گی۔ اسی دن کا حوالہ دے کر پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے تمام مشرکین سے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک بنائے اور ان کے بھروسے پر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی دعوت کا تمسخر اڑایا اور اس کے انذار کی تمام کوششوں کو مذاق بنا کے رکھ دیا۔ قیامت کے دن کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ میرے شریک جن کا تم اپنے تئیں بڑا مضبوط تصور رکھتے تھے اور جو بھی تمہارے اس خیالِ باطل کی تردید کرتا تھا تم اس کے ساتھ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ پروردگار کی طرف سے سوال کا یہ انداز بجائے خود دہلا دینے والا ہے۔ کیونکہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اس کی عظمت اور اس کا جلال ہر دیکھنے والے کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ دنیا میں شرک کے اس کاروبار نے اللہ تعالیٰ کی جس کبریائی پر پردہ ڈال رکھا تھا قیامت کے دن پورے آب و تاب سے نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوگی۔ جب ان مشرکین کو ان شرکاء کو پیش کرنے کا حکم دیا جائے گا تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے انجام کو پہنچے تو مشرکین کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوگی۔

قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰـهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿۶۳﴾

(تو کہیں گے وہ لوگ جن پر عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا، اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ لوگ جنہیں ہم نے گمراہ کیا، ہم نے ان کو اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم گمراہ ہوئے، ہم تیرے حضور ان سے اعلانِ براءت کرتے ہیں، وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ ۶۳)

Marfat.com

گمراہ لیڈروں اور ان کے پیروؤں میں تکرار

قیامت کے دن ہر طرح کے مشرکین عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، ان میں وہ بھی ہوں گے جنہوں نے دوسروں کو گمراہ کرنے اور حق کا راستہ روکنے میں اساسی رول ادا کیا ہوگا۔ اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو بجائے عقل وفکر سے کام لینے کے بلا سوچے سمجھے ان بڑے بڑے لیڈروں کے پیچھے چلتے رہے جنہیں دنیوی مال ودولت نے بڑائی دے رکھی تھی اور وہ اپنی اس بڑائی کو غلط عقائد کی تشہیر کا ذریعہ بنائے رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ان سب سے یہ کہا جائے گا کہ جن قوتوں کو تم نے اپنے مزعومات کے مطابق اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رکھا تھا آج انہیں بلاؤ تا کہ وہ تمہاری مدد کریں، تو سراسیمگی کی حالت میں ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ جائیں گی، پھر اچانک وہ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جنہیں دنیا میں قائدانہ کردار کی حیثیت حاصل رہی ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ سنایا جارہا ہے، تو بے ساختہ ان کی زبانیں کھلیں گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کریں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جو ہماری گمراہی کا سبب بنے۔ انہوں نے زندگی کے ہر مرحلے پر ہمیں گمراہ کیا۔ چنانچہ ان کے الزام پر وہ لوگ فوراً بولیں گے کہ ہم نے ان کو ہرگز گمراہ نہیں کیا بلکہ ہم نے ان کو زندگی کے اس رویئے اور عقیدے کی اسی نہج کی طرف رہنمائی دی جس طرف ہم خود چل رہے تھے۔ یعنی ہمارا وہ رویہ اور طرزِ عمل جو گمراہی پر مشتمل تھا اسی کی ترغیب ہم نے ان کو بھی دی۔ ہم جیسے بھی تھے ہم نے ویسا ہی ان کو بھی بنایا۔ یہ خود شامت زدہ تھے کہ انہوں نے ہماری پیروی کی۔ ہم آج تیرے حضور ان کے اعمال کی ذمہ داری سے اپنی براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود اپنی خواہشِ نفس کے پرستار تھے۔ اس لئے جو رویہ بھی انہوں نے اختیار کیا ان کی خواہشِ نفس ان کی رہنمائی رہی۔ آج یہ کچھ بھی کہیں دنیا میں انہوں نے ہماری پرستش کبھی نہیں کی۔ تو ہم پر ان کی ذمہ داری کیسے عائد کی جاسکتی ہے۔ یہ خود اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔

تابع اور متبوع کا یہ جھگڑا اور ان کے اندر ہونے والی یہ جوتی پیزار قرآنِ کریم نے کئی جگہ ذکر فرمائی ہے۔ ہم صرف سورۃ اعراف سے ایک مثال پیش کرتے ہیں:

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ۧ (الاعراف: ۳۸.۳۹)

حکم ہوگا، داخل ہو جاؤ دوزخ میں ان گروہوں کے ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے داخل ہوئے۔ جب جب داخل ہوگا کوئی گروہ، وہ اپنے ہم مشربوں پر لعنت کرے گا، یہاں تک کہ جب سب اس میں اکٹھے ہولیں گے، پچھلے اگلوں کے باب میں کہیں گے، اے ہمارے رب! یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تو ان کو دونا عذاب دوزخ دے۔ ارشاد ہوگا، تم میں سے ہر ایک کیلئے دونا عذاب ہے لیکن تم جانتے نہیں اور اگلے پچھلوں سے کہیں گے، تمہیں بھی تو ہم پر کوئی فضیلت نہ حاصل ہوئی تو اپنے عمل کی پاداش میں اب عذاب چکھو۔

Marfat.com

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَ كُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ
لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾

(اور انہیں کہا جائے گا، اب پکارو اپنے شریکوں کو، تو وہ انہیں پکاریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ ۶۴)

مشرکین کی بے بسی

جن لیڈروں کے بارے میں مشرکین کا خیال تھا کہ وہ ان کو گمراہ کرنے والے تھے، جب وہ ان سے اظہارِ براءت کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ مشرکین سے فرمائے گا کہ تمہارے لیڈر تو تم سے اظہارِ براءت کر چکے، اب تمہارے پاس آخری سہارا ایک ہی ہے کہ تم جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ معبود مانتے رہے ہو انہیں اپنی مدد کیلئے پکارو۔ ممکن ہے یہ بات ان سے اس لئے کہی جائے کہ انہیں اچھی طرح اپنی گمراہی کا یقین ہو جائے۔ اور جن سہاروں پر انہوں نے آخرت کا انکار کیا تھا ان سہاروں کی حقیقت بھی ان پر کھل جائے۔ چنانچہ وہ بے بسی کی حالت میں ان نام نہاد معبودوں کو پکاریں گے۔ لیکن توہمات اور خیال آرائی کو نہ پہلے کہیں وجود ملا ہے اور نہ آج ملے گا۔ افسانہ کبھی حقیقت کی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ ان کی بے بسی کی پکار بھی کسی کو جواب دینے پر آمادہ نہ کر سکے گی۔ چنانچہ ادھر سے مکمل طور پر مایوس ہو جانے کے بعد اور ہر سہارے کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچیں گے اور اس عذاب سے دوچار کر دیئے جائیں گے جس سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رسول نے انہیں ڈرایا تھا۔ آیتِ کریمہ کے آخر میں پروردگار ان کے حال پر اظہارِ حسرت و افسوس کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کاش یہ لوگ ہدایت کے راستے پر چلنے والے ہوتے، اللہ تعالیٰ کے نبی کی دعوت کو قبول کرتے اور حق سے وابستگی اختیار کرتے تو آج اس عذاب سے دوچار نہ ہوتے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ
يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

(اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ انہیں پکارے گا اور پوچھے گا کہ تم نے ہمارے رسولوں کو کیا جواب دیا۔ ۶۵) تو اس دن ان کی سٹی بھول جائے گی، وہ (مارے دہشت کے) آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ۶۶)

رسولوں کے حوالے سے لوگوں سے سوال اور ان کی بدحواسی

یہ بھی احوالِ قیامت ہی کا تذکرہ ہے۔ اس سے پہلے کی آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے اپنی توحید کے حوالے سے سوالات کرے گا اور جن لوگوں نے شرک کو زندگی کا طرزِ عمل بنائے رکھا، مختلف پہلوؤں سے ان کے عقیدے کی خرابی، ان کے سہاروں کی ناتوانی اور ان کی بے بسی کو واضح کیا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح توحید اور شرک کے حوالے سے لوگوں سے سوالات ہوں گے، اسی طرح رسولوں سے متعلق ان کے رویوں کے بارے میں بھی سوالات ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے دین کی پیروی کا تمام تر دار و مدار اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی دعوت کے قبول یا رد کرنے پر ہے۔ جس قوم

Marfat.com

نے پیغمبر کی تکذیب کر دی اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اس نے درحقیقت اس مصدر و منبع سے اپنا رشتہ توڑ لیا جہاں سے انسانوں کو ہدایت ملتی ہے۔ اور روشنی کے اس سرچشمے سے آنکھیں بند کر لیں جہاں سے ہدایت کی روشنی نصیب ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایک ایک امت سے یہ پوچھا جائے گا کہ تمہاری طرف ہم نے ہدایت کیلئے رسول بھیجے تاکہ کل کو تم بے خبری کا بہانہ نہ کر سکو۔ اور ان رسولوں نے زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر تمہارے ساتھ خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ لیکن تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا ان کی دعوت کو قبول کیا یا رد کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی دنیا ان کے سامنے اندھیر ہو جائے گی۔ اور ان کے جرم کی سنگینی پوری طرح ان پر کھل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ جواب دینے کی خواہش کے باوجود وہ کوئی بات کہنے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔ ان کی اس حیرت زدگی اور بدحواسی کی کیفیت کو قرآنِ کریم نے فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ کے فقرہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا لفظی معنی تو یہ ہے ''کہ فَصَارَتِ الْاَنْبَاءُ عَلَيْهِمْ كَالْعُمْيَانِ'' یعنی ان کی دلیلیں اندھی ہو کر رہ جائیں گی اور جہاں وہ کھڑے ہوں گے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اسی کا ترجمہ ہم نے سٹی بھول جانے کے محاورے سے کیا ہے۔ اس سراسیمگی کا عالم یہ ہوگا کہ وہ پروردگار کے سوال کے جواب میں ایک دوسرے سے بھی کچھ پوچھ گچھ کرنے کی طاقت نہیں پا سکیں گے۔ نتیجتاً اپنے اس انجام کو پہنچ جائیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾

(ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کئے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں سے ہوگا۔ ٦٧)

اہلِ ایمان کیلئے فلاح کی بشارت

جن لوگوں نے شرک کو زندگی کا دستور العمل بنائے رکھا اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے ان کا ہولناک انجام بیان کرنے کے بعد اب انسانوں کیلئے کامیابی و کامرانی کے ایک راستہ کی نوید سنائی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس طرح گمراہ لوگوں کو جہنم کا ایندھن بنائے گا اسی طرح بہت سے لوگ اس کی بارگاہ سے نوازے بھی جائیں گے۔ ان میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ہر باطل عقیدہ اور ہر غلط عمل سے توبہ کی۔ پیغمبر کی دعوت پر ایمان لائے اور اپنے ہر قول و فعل کیلئے شریعت کو میزان بنایا۔ اگر ان کے ایمان و عمل اور اخلاص و تقویٰ میں کوئی کمی نہ رہی تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیاب و کامران لوگوں میں شمار ہوں گے۔

عَسٰى ...... یوں تو عربی زبان میں امید کے معنی میں آتا ہے، لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو پھر وعدہ اور بشارت کا مفہوم اس کے اندر مضمر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ کبھی اپنا وعدہ نہیں توڑتا اس لئے اسے یقین کے معنی میں لیا جا سکتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾

(اور آپ کا رب ہی پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جو چاہتا ہے)، انہیں کچھ اختیار نہیں، اللہ پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ٦٨)

Marfat.com

شرک کیخلاف صفتِ خلق واختیار سے استدلال

اس آیتِ کریمہ میں ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کائنات میں جتنی مخلوقات ہیں ان سب کا خالق ایک ہے۔ چاہے ان مخلوقات کا تعلق انسانوں سے ہو یا فرشتوں سے یا جنوں سے۔ چاہے ان کا تعلق زمینوں سے یا آسمانوں سے اور چاہے ان کا تعلق مکانوں میں سے کسی مکان سے ہو۔ ان کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ جس طرح ہر مخلوق کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ہر مخلوق کو پسند کرنا، اس کو خاص مقام و مرتبہ دینا، مخصوص صلاحیتیں عطا کرنا اور کسی خاص منصب پر فائز کر دینا یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتا ہے۔ جس طرح اس کی تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں، اسی طرح اس کے اختیار اور مناصب کی تفویض میں بھی کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ شرک کا کاروبار کرنے والوں نے دونوں طرح کے شرک کیے ہیں۔ نہ جانے کس کس کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق میں شریک ٹھہرایا۔ اولاد اللہ تعالیٰ دیتا ہے، مشرکین نے اس کا انتساب مختلف قوتوں کی طرف کیا، زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے لیکن مشرکین نے نہ جانے کس کس کو اس میں دخیل بنایا۔ اسی طرح مخلوقات کے اوصاف، ان کی صلاحیتیں اور طاقتیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا اور دین ہیں۔ اور وہ جس کو چاہتا ہے ان میں سے جو مناسب سمجھتا ہے عطا کرتا ہے۔ لیکن انسانوں نے مختلف مخلوقات کی طرف اپنی مرضی سے ان اوصاف کا انتساب کر رکھا ہے۔ یہاں اس بنیادی خرابی کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے پیدا کرے، اور جیسا چاہے اسے بنائے، جس طرح کے چاہے اوصاف، صلاحیتیں اور طاقتیں بخشے، اور جو کام جس سے لینا چاہے، لے لے۔ جو مقام و مرتبہ کسی کو عطا کرنا چاہے، عطا کر دے۔ ان باتوں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ جانے مشرکین نے یہ اختیارات کہاں سے حاصل کر لیے ہیں کہ مخلوق اس کی ہے اور اختیارات یہ تقسیم کرتے ہیں۔ بندے اس کے ہیں اور صلاحیتیں اور طاقتیں مشرکین ان کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں مشکل کشا بنا دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں بارش کا مختار بنا دیتے ہیں، جسے چاہتے غیر معمولی اختیارات سونپ دیتے ہیں جبکہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں اور جو شخص یا جو گروہ بھی ان اختیارات اور اعزازات کو کسی اور کی طرف منسوب کرتا ہے وہ دراصل شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے ہر شرک سے پاک ہے۔ اس نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا اور معصوم ٹھہرایا، لیکن خدائی میں شریک نہیں کیا۔ اس نے اپنے آخری رسول کو تمام مخلوقات کا سردار بنایا اور سید الاولین والآخرین ٹھہرایا، لیکن انہیں خدائی میں شریک نہیں کیا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا اور اسی کو مدد کیلئے پکارتا ہے۔ قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ اور کوئی ایسا نہیں، جسے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دیا جائے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾

(اور آپ کا رب جانتا ہے جو کچھ کہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ ٦٩)

صفتِ علم سے استدلال

جس سیاقِ کلام میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے فلاں معاملے میں جو رائے اختیار کر رکھی ہے مجھے آج تک اس سے مختلف ایسی کوئی دلیل نہیں مل سکی کہ جس سے میں اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میری رائے کی اصابت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ الفاظ کے طوطے مینا

Marfat.com

اڑانا اور سخن سازی سے اپنی نیت پر پردہ ڈال دینا آج تو ممکن ہے لیکن قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری ہوگی تو وہ صرف زبان سے نکلنے والے الفاظ ہی نہیں دیکھے گا بلکہ اس کی نگاہ نیتوں اور دل کے ارادوں پر بھی ہوگی۔ وہاں نہ نیتیں چھپ سکیں گی نہ ارادوں پر پردہ ڈالا جاسکے گا۔ اس لئے جسے اپنی عاقبت عزیز ہے اسے اسی دنیا میں آخرت کی حاضری کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۷۰

(اور وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کیلئے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اسی کے اختیار میں فیصلہ ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۰)

خلاصۂ بحث

اس سے پہلے کی آیات میں شرک کیخلاف اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق، اس کی صفتِ اختیار اور اس کے علمِ محیط سے استدلال کیا گیا ہے۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس استدلال سے جو بدیہی نتیجہ نکلتا ہے اسے ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جب کائنات کی ہر مخلوق اللہ تعالیٰ ہی کی قوتِ تخلیق سے وجود میں آئی ہے اور پھر ہر ایک مخلوق کے فرائض، اس کا دائرۂ کار اور اس کے مطابق اس کی صلاحیتوں کا تعین اس کی سرشت کے مطابق اس کیلئے ماحول کا انتخاب، اور ماحول کے مطابق اس کی جسمانی اور معنوی ساخت اور ارتقاء اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ اختیار کا نتیجہ ہے۔ پھر ہر ایک مخلوق کو اس کے وجود اور فرائض کے حوالے سے جیسی کچھ ضرورتیں دی گئی ہیں اور ان کی نمود و پرداخت اور حفاظت و صیانت کیلئے جس آگہی کی ضرورت ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کے علمِ محیط سے ساری کائنات کو بہم پہنچ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی تین چیزیں یعنی قوتِ تخلیق، قوتِ اختیار اور قوتِ علمِ محیط تمام کائنات کے وجود و بقاء کی ضمانت ہیں۔ اور یہ تمام قوتیں اور اس کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تو پھر یہ کس قدر بےعقلی کی بات ہوگی کہ ایسی قوتوں کو اس کی ذات، اس کی صفات یا اس کے حقوق میں شریک مان لیا جائے جو ان بنیادی قوتوں سے تہی دامن ہیں۔ اور خود اپنے وجود میں وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ان صفات کی مرہونِ منت ہیں۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ وہی ایک اللہ ہے جو ان تمام صفات کا مالک ہے اور وہی اپنی الوہیت میں وحدہ لاشریک اور یکتا ہے۔ چونکہ ہر مخلوق اپنے وجود اور اپنی بقاء میں اسی کی رہینِ احسان ہے اور اسی کی نعمتوں سے متمتع ہو رہی ہے۔ اس لئے ہر مخلوق پر اس کی ایک ایک نعمت کی حمد اور اس کا شکر واجب ہے۔ دنیا میں ہر مخلوق پر لازم ہے کہ اس کی زبان اس کی تعریف میں زمزمہ سنج رہے۔ اس کے اعضاء و جوارح، اس کی اطاعت اور بندگی میں مصروف رہیں اور اس کا دل اسی کی محبت کے احساسات سے لبریز رہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے جس طرح دنیا میں اس کی ہر مخلوق گراں بار ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آخرت میں اس کی نعمتیں بالخصوص اس کی مکلف مخلوق کو عطا کی جائیں گی۔ اس لحاظ سے اس کے حمد و شکر کا سلسلہ دنیا تک محدود نہیں بلکہ آخرت میں بھی جاری رہے گا۔ جنت میں داخل ہونے والے بھی اپنی ہر مصروفیت اور ہر نشست کے اول و آخر اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر سے ہی اپنے آپ کو شگفتہ و شاداب رکھیں گے۔ اسی طرح دنیا میں ہر مخلوق بالخصوص انسان کی قسمت کا فیصلہ اور آخرت میں نتیجے کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے اور سب کی پیشی بھی اسی کے حضور میں ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اسی طرح اس کے سوا کوئی مرجع و مولیٰ بھی نہیں۔

Marfat.com

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ
يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

(اے پیغمبران سے کہئے کہ بتاؤ کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک رات ہی کو مسلط کردے تو کون معبود ہے اللہ کے سوا جو تمہارے پاس روشنی لے آئے، تو کیا تم سنتے نہیں ہو۔ ۷۱) اے پیغمبران سے پوچھئے کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر تم پر دن ہی کو ہمیشہ کیلئے تا قیامت اللہ تعالیٰ مسلط رکھے تو کون معبود ہے اللہ کے سوا جو تمہارے لئے رات کو لائے جس میں تم سکون پاؤ، تو کیا تم لوگ دیکھتے نہیں ہو۔ ۷۲)

مخاطب کے مسلّمات سے استدلال

مخاطبوں کی خفتہ فطرت کو جگانے اور مردہ ضمیر کو بیدار کرنے کیلئے سوالیہ انداز اختیار فرمایا گیا ہے، اور اس کا آغاز لفظ ''قل'' سے کیا گیا ہے جس میں ایک تحکم بھی ہے اور بے ساختگی بھی۔ اور ایسی باتوں سے متعلق سوال کیا گیا ہے جو بالکل بدیہی نوعیت کی ہیں اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ مشرکین عرب بھی جس طرح اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے تھے، اسی طرح وہ روز وشب کا خالق اور متصرف بھی اللہ تعالیٰ ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ اس لحاظ سے سوال کی کاٹ اور بھی گہری ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے اعتقاد کے خلاف تو جواب نہیں دے سکتے۔ پہلی آیت میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ تمہاری زندگی کی ساری ہماہمی شب وروز کے اختلاف پر مبنی ہے۔ دن کی روشنی انسان کو سرگرمی کا پیغام دیتی ہے اور انسان حصولِ معاش کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اور رات کی تاریکی آرام وراحت اور سکون واطمینان کا پیغام بن کر آتی ہے۔ اور یہی اختلافِ لیل ونہار انسانی ضروریات کا کفیل، اس کی صحت وبقاء کا ضامن اور موسمی تغیرات کا باعث ہے۔ اس لئے ان کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے پوچھا گیا ہے کہ بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ہمیشہ کیلئے رات ہی کو مسلط کردے، اور سردیوں کی طویل رات ہر چیز کو جمادے، چولہے بجھ جائیں اور انسانی ضرورت کی ہر چیز زندگی سے محروم ہو جائے تو تمہارے معبودوں میں سے کوئی ہے جو تمہارے لئے دن کی روشنی نمودار کرسکے۔ اسی طرح اگر وہ تمہارے اوپر قیامت تک کیلئے دن ہی کو مسلط کردے کہ ماہِ جون کا دن اگر چالیس گھنٹے تک طویل ہو جائے تو ہر چیز جل کر بھسم ہو جائے، سمندروں کا پانی بھاپ بن کر اڑ جائے اور زندگی کی بقاء کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ تو کیا تمہارے معبودوں میں سے کسی کے اندر یہ قوت ہے کہ وہ رات کو لاسکے، جس میں دن کے تھکے ماندے سکون پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کائنات کے تصرفات میں جن پر تمام مخلوقات کی بقاء کا انحصار ہے تمہاری ان دیویوں اور دیوتاؤں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم نے ان کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے۔

دونوں آیتوں کے آخر میں سوال میں زور پیدا کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم سنتے نہیں ہو اور کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ اسلوبِ بیان کی بلاغت کا کیا کہنا کہ رات کی مناسبت سے سننے کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ رات کی تاریکی میں دیکھا تو نہیں جاسکتا لیکن سنا تو جاسکتا ہے۔ اور دن کی مناسبت سے دیکھنے کا ذکر فرمایا کیونکہ دن کی روشنی دیکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ اور نصیحت کیلئے سننا بھی کفایت کرتا ہے اور دیکھنا بھی۔ لیکن انسان کی غفلت کا کیا کہنا کہ وہ سننے کے وقت سنتا نہیں اور دیکھنے کے وقت دیکھتا نہیں۔

Marfat.com

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

(اور اپنی رحمت سے اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تا کہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو، اور تا کہ تم (دن میں) اس کے فضل کے طالب بنو، اور تا کہ تم شکر ادا کرو۔ ۷۳)

دونوں دلائل کا نتیجہ

گزشتہ دو آیتوں میں پیش کردہ دلیل نے یہ بات ثابت کردی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ شب و روز کو ایک دوسرے کے بعد لا سکے۔ اور اللہ تعالیٰ پر انسان کا کوئی حق نہیں جس کی ادائیگی کیلئے انسانوں کیلئے شب و روز کا لانا ضروری ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شب و روز کا اختلاف اور دونوں کا ایاب و ذہاب اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کا نتیجہ ہے۔ اور مزید یہ کہ شب و روز کا لانا کسی کا استحقاق نہیں۔ اس سے آپ سے آپ یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور اور اس کے فضل و عنایت کا صدور ہے۔ یہ اس کا کرم ہے کہ وہ رات کو لاکر تمہارے لئے راحت و سکون کا بستر بچھا دیتا ہے، پھر دن کے طلوع سے تمہارے لئے تلاشِ رزق و فضل کا میدان گرم کر دیتا ہے۔ یہ سراسر اس کی رحمت اور اس کا احسان ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے اس نے کیا ہے تا کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ لیکن وہ شخص کس قدر نامراد اور جری واقع ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا اور زندگی کے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے لیکن اس کی زندگی کی تمام کاوشیں اور تمام مشاغل اللہ تعالیٰ کی مرضی کیخلاف اور اس کی نافرمانی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسلحہ کو اس کیخلاف استعمال کرتا ہے اور اس طرح اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ
شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

(اس دن کا خیال کرو جس دن وہ انہیں پکارے گا پھر پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔ ۷۴) اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکالیں گے اور لوگوں سے کہیں گے لاؤ اب اپنی دلیل، اس وقت تم پر واضح ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔ ۷۵)

ایک اور پہلو سے سوال

پہلی آیت بعینہ سلسلۂ بحث کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ اس میں سوال مشرکین کے ان شریکوں کے بارے میں تھا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بنا رکھے تھے۔ پھر سلسلۂ بحث کے درمیان میں دوبارہ یہ آیت گزری ہے ہے لیکن اس میں سوال اس حوالے سے تھا کہ تمام امتوں سے پوچھا جائے گا بتاؤ تم نے رسولوں کی دعوت کا جواب کیا دیا تھا؟ اب تیسری دفعہ یہ آیت ایک اور پہلو سے لائی جا رہی ہے۔ ان میں سوال اگرچہ وہی ہے جو پہلی آیت میں گزرا ہے کیونکہ مدارِ بحث توحید ہے اور شرک وہ چیز ہے جو توحید کی حقیقی ضد ہے۔ اس لئے اس سوال کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ البتہ اب اس میں اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ مشرکین کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہر امت کی طرف مبعوث ہونے

Marfat.com

والے پیغمبر یا وہ برگزیدہ لوگ جو پیغمبروں کی دعوت لے کر امتوں کے پاس گئے انہیں ہر امت پر گواہی کیلئے طلب کر لیا جائے گا۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جب لوگوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تم نے پیغمبروں کی دعوت کا کیا جواب دیا تو قرآنِ کریم نے ان کی بے بسی کا ذکر فرمایا تھا۔ کیونکہ وہ قیامت کا منظر دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کر چکے تھے کہ ہم نے انبیائے کرام اور ان کی دعوت کے ساتھ جو کچھ کیا، آج اس کے نتیجے میں بہت ہولناک صورتحال سے دوچار ہونا ہے۔ اور اب جبکہ پیغمبروں کو گواہی کیلئے بلا لیا جائے گا تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کی گواہی کے بعد مشرکین پر کیا گزرے گی۔ وہ علیٰ رؤوس الاشہاد گواہی دیں گے کہ ہم نے ان کو توحید کا پیغام پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی ایک ایک بات کو واضح کیا، اس کے احکام انہیں پڑھ کر سنائے، اس کی پسند و ناپسند کو کھول کر بیان کیا، لیکن یہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے اور انہوں نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پیغمبروں کی شہادت کے بعد ان کے پاس کوئی دلیل اور کوئی سند باقی نہیں رہے گی کیونکہ تمام مشرک قوموں نے ہمیشہ اسی دلیل کے سہارے شرک کے کاروبار کو پھیلایا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اور جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے یہ سب انبیائے کرام کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اور جب انبیائے کرام کی گواہی سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ سب کچھ ان کا خود تراشیدہ ہے تو سب پر یہ بات کھل جائے گی کہ حق بجانب اللہ ہے اور ان کے تمام خود تراشیدہ معبود بالکل بے حقیقت ہیں۔ رسولوں کی شہادت ان پر آخری حجت تمام کر دے گی جس کے بعد کسی کیلئے لب کشائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اور جو کچھ وہ اب تک شرک کے حق میں دلائل دیتے رہے ہیں سب پادر ہوا ہو جائیں گے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ

Marfat.com

الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا ۚ وَلَا يُسْأَلُ
عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٧٨﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِي زِينَتِهٖ ۖ
قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا
أُوتِيَ قَارُونُ ۙ إِنَّهٗ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾ وَقَالَ الَّذِينَ
أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَا إِلَّا الصّٰبِرُونَ ﴿٨٠﴾ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ
الْأَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُونَهٗ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۗ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ ﴿٨١﴾ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ
مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَا أَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ
وَيْكَأَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُونَ ﴿٨٢﴾ ع

رکوع: ۸۔ (بیشک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا، پھر وہ اپنی قوم کیخلاف سرکش ہوگیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے مشکل سے اٹھتی تھیں اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اتراؤ مت، اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۶) اور جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو، اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو، اور احسان کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو، بیشک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۷) قارون نے کہا! یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بناء پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے، کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ اللہ اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اس سے بڑھ کر اور جمعیت میں اس سے زیادہ تھی اور مجرموں سے ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ۷۸) پس وہ پوری شان وشوکت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا، تو جولوگ حیات دنیا کے

Marfat.com

طالب تھے کہنے لگے، کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بیشک وہ بڑے نصیبے والا ہے۔ ۷۹) اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے افسوس ہے تم پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کیلئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے ، اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔ ۸۰) آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، تو نہ اس کیلئے کوئی جماعت ہی ایسی اٹھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی مدافعت کرنے والا بن سکا۔ ۸۱) اور پکار اٹھے وہ لوگ جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے، اوہو (اب پتہ چلا) کہ اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق کو اپنے بندوں میں سے جس کیلئے چاہتا ہے، اور جس کیلئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، اگر اللہ کا ہم پر احسان نہ ہوا ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا، لاریب، کافر فلاح نہیں پاتے۔ ۸۲)

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾

(بیشک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا، پھر وہ اپنی قوم کیخلاف سرکش ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے مشکل سے اٹھتی تھیں اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ اتراؤ مت، اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۶)

قارون دنیا پرستی کا نمونہ اور اس کے اطوار

قارون کا ذکر تورات کی کتاب گنتی باب ۱۶ میں آیا ہے۔ بائبل کی کتاب خروج باب ۶ آیت ۱۸۔۲۱ میں جو نسب نامہ درج ہے اس کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کے والد سگے بھائی تھے۔ گویا کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سگے چچا کا لڑکا تھا۔ تورات میں اس کا نام قورح مذکور ہوا ہے۔ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جا ملا تھا اور فرعون نے یہ دیکھ کر کہ یہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے گھر کا آدمی ہے اور آج کل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بعد جس طرح بنی اسرائیل کے ساتھ مصریوں کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی ہے اس میں یقیناً اس بات کا بہت دخل ہے کہ موسیٰ کی دعوت بنی اسرائیل میں جس طرح کی زندگی اور بیداری کا باعث بن رہی ہے اگر اسے بروقت روکا نہ گیا تو وہ اپنی کثرتِ تعداد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کے نتیجے میں فرعون اور آلِ فرعون کی حکومت کیلئے بہت بڑا چیلنج بن سکتی ہے۔ اندریں حالات بنی اسرائیل کے ایک مؤثر اور معزز گھرانے کا ایک فرد اگر ہمارے قریب آ رہا ہے تو ہمیں ہر ممکن طریق سے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ چنانچہ قارون کی جاہ پرستی اور ہوسِ زر نے اسے فرعون کی طرف بڑھنے پر مجبور کیا اور فرعون کی سیاسی مصلحتوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو ناکام کرنے کیلئے اس پر اپنی مراعات اور عنایات کے دروازے کھول دیئے۔ وہ پہلے ہی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے حسد کے باعث مسلسل اس آگ میں جل رہا تھا کہ میں ان دونوں کے چچا کا بیٹا ہوں لیکن مجھے بنی اسرائیل میں ان کے مقابلے میں معمولی پذیرائی بھی میسر نہیں۔ اس لئے اس نے حسد سے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ہر ممکن طریقے سے بنی اسرائیل اور موسیٰ اور ہارون کو نقصان پہنچاؤں گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں اٹھتی ہوئی بیداری کے بارے میں وہ فرعون کو باخبر کرتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغی اور دعوتی

Marfat.com

سرگرمیوں کی اطلاع دیتا اور فرعون اس کے جواب میں اسے اپنی ناگزیر ضرورت سمجھ کر اپنی قربت کے دروازے کھولتا جاتا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے یہ حیثیت حاصل کر لی کہ قرآنِ کریم نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مخالفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے ان میں سے ایک اس کو شمار کیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (المومن آیت ۲۳۔۲۴) ''ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، مگر انہوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے، سخت جھوٹا ہے۔'' اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ قارون اپنی قوم سے باغی ہو کر دشمن طاقت کا پٹھو بن گیا تھا اور اب اس کا شمار بڑے بڑے اعیانِ سلطنت سے بھی بڑھ کر ہامان کے برابر کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ یہ بہت ہوشیار آدمی تھا، وقت کی مقتدر قوتوں سے وہ اپنی غداری کی پوری قیمت وصول کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ دولت کے بڑے بڑے خزانوں کا مالک بن گیا تھا۔ اور اس کی مالداری کا یہ عالم تھا کہ اس کے خزانے اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کیلئے بھی بھاری معلوم ہوتی تھیں۔ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوبِ بیان نہیں ہے بلکہ بیانِ واقعہ ہے۔ اس زمانے میں خزانوں کی حفاظت کیلئے وہ وسائل میسر نہیں تھے جو آج ہمارے پاس ہیں۔ اور نہ ابھی تالوں اور کنجیوں نے وہ شکل اختیار کی تھی جیسے آج ہمارے سامنے ہے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے سرمایہ دار بالعموم زمین دوز خزانے بناتے اور ان کو محفوظ کرنے کیلئے ان کے پھاٹکوں اور دروازوں میں بڑے بڑے آہنی کنڈے لگا کر ان میں بھاری بھاری آہنی اڑنگے جو خاص اسی غرض کیلئے تیار کئے جاتے تھے پھنساتے۔ ان اڑنگوں کو پھنسانا اور کھولنا ایک مشکل کام ہوتا اور ان کے تمام لوازم مل ملا کر ایک بھاری بوجھ بن جاتے۔ جب بھی ان کو اٹھانے اور ہٹانے کی ضرورت پیش آتی تو ایک طاقتور جماعت کی ضرورت ہوتی۔ آیتِ کریمہ میں اسی طرح کی کنجیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور کسی شخص کے پاس اس قسم کی کنجیوں کا پایا جانا اس کی سرمایہ داری کی نشانی تھا۔

قارون کے بگاڑ کا آغاز حسد سے ہوا۔ اس کی ہوسِ زر نے اس میں اضافہ کیا اور پھر قوم فروشی، استعمار پسندی اور ضمیر کی موت نے اسے ایسی سرکشی پر آمادہ کیا جس میں ہر قیمت پر قومی مفادات کی قربانی اور دولت کے حصول کیلئے فرعون کی ظالمانہ حکومت کے اقدامات کی ہر صورت میں تائید و نصرت اس کی زندگی کا معمول بن گئی۔ قوم کے دانشمند لوگوں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ تم مال و دولت کے برتے پر اور اقتدار کی قربت کے باعث حد سے آگے نہ بڑھو اور تکبر کا راستہ اختیار نہ کرو۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اکڑنے اور اترانے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ اسے سمجھانے والے یقیناً قوم کے منتخب افراد ہوں گے لیکن قرآنِ کریم نے اس کیلئے قوم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رویے کی ناپسندیدگی اور اس کی بہتری کیلئے نصیحت میں ساری قوم شریک تھی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس شخص کو اپنی قوم سے کٹ کر دوسروں کا آلۂ کار نہیں بننا چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی غالب اکثریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروکار تھی۔ بہت تھوڑے لوگ تھے جو اپنی مفاد پرستی کے باعث قارون کے ساتھ تھے۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾

(اور جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو، اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو، اور احسان کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو، بیشک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۷۷)

Marfat.com

قوم کے اہلِ دانش کی قارون کو نصیحت

سابقہ آیتِ کریمہ میں قارون کی قوم کے اہلِ دانش کی نصیحت کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے قارون کے بگڑے ہوئے طرزِ عمل کو دیکھ کر کی تھی۔ پیشِ نظر آیت میں اسی نصیحت کی مزید تفصیل ذکر فرمائی گئی ہے۔ اس میں چار باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جن میں ہر بات حکمت و معرفت کا خزینہ ہے۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے جو دولت بخشی ہے اور عزت و رسوخ عطا کیا ہے یہ اس لئے نہیں ہے کہ تم اسے اترانے کا ذریعہ بناؤ اور فریب خوردگی کا شکار ہو کر دنیا اور دولتِ دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھ بیٹھو۔ اور اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو دولتِ دنیا سے سروکار نہیں رکھتے یا اس سے تہی دامن ہیں ان کے ساتھ تکبر و غرور کا معاملہ کرنے لگو۔ تم تو اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ تمہیں دولت و رفاہیت سے نوازا گیا ہے۔ اب تم اسے بھلائی کے کاموں میں خرچ کر کے اور اللہ تعالیٰ کے محتاج بندوں کی مدد کر کے آخرت کی فوز و فلاح حاصل کر سکتے ہو، کیونکہ دولت اللہ تعالیٰ کی جانب سے امتحان ہوتی ہے۔ اور دولت مند کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو اس امتحان میں کامیابی حاصل کر کے اسے آخرت میں فیروزمندی کا ذریعہ بنا لے، اور چاہے تو اسے مقصود سمجھ کر اسے گننے اور سینتنے میں لگا رہے۔ اور بجائے اسے فوز و فلاح کا ذریعہ بنانے کے اس کی چاکری اور حفاظت میں زندگی گزار دے۔ اس لئے ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ تمہاری دولت سر تا سر خدا کی بخشش ہے۔ یہ تمہارے اب وجد کی میراث نہیں اور نہ تمہاری قابلیت و استحقاق کا کرشمہ ہے۔ بجائے اس کا پرستار بننے کے اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ بناؤ۔ تو یہ ایسی دولت ہو گی جو دنیا میں بھی کام آئے گی اور آخرت میں بھی کام آئے گی۔

اس نصیحت کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ تم دنیا میں سے اپنا حصہ مت بھولو۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ دنیا اور دولتِ دنیا تو ایک فانی اور آنی جانی چیز ہے۔ یہ آج تمہارے پاس ہے کل کو کسی اور کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ اولاً تو اسے حادثے سے دوچار ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تو تمہارا اور اس کا ساتھ زیادہ سے زیادہ موت تک ہے۔ موت کی پہلی پھونک تمہارا اور اس کا تعلق توڑ دے گی، اس کے بعد تمہارے ساتھ تمہارے اعمال جائیں گے۔ اس لئے تم اگر اس دولت سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو، بندوں کی ضروریات کے کام میں لاؤ، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کو اپنی منزل بنا لو۔ آنحضرت ﷺ نے اسی عقدہ کو کھولتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ انسان کا وہی ہے جو اس نے کھا لیا یا آگے بھیج دیا، یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دیا۔ اور جو اس نے روک کے رکھا وہ تو اس کے وارثوں کا ہے، اور وہ آدمی کس قدر بے وقوف ہے جو وارثوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اس آدمی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو وارثوں کیلئے بھی نہیں چھوڑتا بلکہ اپنی ذات کی سربلندی اور فسق و فجور میں صرف کر دیتا ہے، یعنی اس کی دولت نہ اپنے کام آئی اور نہ وارثوں کے۔ ایسے بدنصیب سے بڑھ کر اور بدنصیب کون ہو گا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اہلِ دولت میں ایسے ہی بدنصیبوں کی کثرت ہے۔

تیسری بات نصیحت کے ضمن میں یہ کہی گئی کہ تم بھی بندوں کے ساتھ ویسا ہی احسان کا معاملہ کرو جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے تمہیں خزانے عطا فرما دیئے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے بندوں کیلئے ان خزانوں کو خرچ کر کے تم اپنی عاقبت بنا لو۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا کم از کم بدلہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ مدد و تعاون کا رویہ اختیار کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے۔ اور جو شخص کسی کے عیال پر خرچ کرتا ہے وہ صاحبِ عیال کا دل جیت لیتا ہے۔ اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کسی پیاسے کو پانی پلاتا ہے، کسی بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے اور کسی ننگے کو کپڑے پہناتا ہے اس کے اس سلوک کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں بندوں کے ساتھ کی ہوئی اس کی نیکی کو اپنے ساتھ نیکی قرار دے گا اور اس پر بیش از بیش اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

اور چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ، اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح چوری، راہزنی، ڈکیتی، بندوں کی حق تلفی اور حق شکنی اور لوگوں میں خوف وہراس پیدا کرنا فساد فی الارض ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر فساد فی الارض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی بجائے غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کی جائے۔ اور کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو اپنے حقوق بنا کر دوسروں سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مکلف مخلوق کے علاوہ اس کی تمام مخلوقات اس کے تکوینی قانون کی بندگی اور اس کی اطاعت میں زندگی گزارتی ہیں۔ کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی اور کی بندگی کرے یا کسی اور کے احکام کی اطاعت کرے۔ تمام مخلوقات کی زندگی کا سفر بندگی اور اطاعت کے راستے نہج اور منزل کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مکلف مخلوق یعنی جن و انس کو بھی زندگی کے سفر کا یہی طریقہ سکھایا ہے، لیکن جب یہ دونوں مخلوقات اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی بجائے دوسروں کی بندگی اور اطاعت کرنے لگتی ہیں اور اپنی ذات اور اپنے مال اور اپنے علاقات میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کو نظر انداز کر کے غیر اللہ کے حقوق کو زندگی کا زادِ راہ بنا لیتی ہیں تو یہیں سے اطاعت کے راستے پر چلتی ہوئی ٹریفک معصیت اور شرک کے راستے پر چلنے والی ٹریفک سے ٹکرانے لگتی ہے اور فساد بپا ہو جاتا ہے۔ کسی بھی متمدن اور مہذب ملک میں ایک آئین وقانون کی اطاعت اور پاسداری ملک میں امن کی ضمانت ہوتی ہے، لیکن اگر ایک ہی ملک میں دو قانون چلنے لگیں اور دونوں کی اطاعت ہونے لگے تو قدم قدم پر تصادم کی نوبت آئے گی اور گلی کوچوں سے لے کر زندگی کے مختلف دوائر میں عدالت اور حکومت کے ایوانوں تک ایک کہرام مچ جائے گا اور پورا ملک انارکی اور بدامنی کا جہنم بن جائے گا۔ نصیحت کرنے والوں نے قارون سے یہی قیمتی بات کہی کہ تم اپنی ذات اور اپنی دولت میں اس کی اطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اپنے مال کو اس کے راستے میں خرچ کرو جس نے تمہیں مال عطا کیا ہے تو کہیں فساد برپا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر تم اپنی حیثیت سے آگے بڑھ کر اور اپنی دولت کی اصل حقیقت کو نظر انداز کر کے تکبر اور استکبار کو اپنا معمول بنا لو گے اور دولت کو اللہ تعالیٰ ملکیت سمجھنے کی بجائے اپنی ملکیت سمجھ کر من مرضی کا رویہ اختیار کرو گے تو فساد کا راستہ کھل جائے گا تم یہ طریقہ اختیار نہ کرو اللہ تعالیٰ ایسا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

(قارون نے کہا! یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بناء پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے، کیا اس نے یہ نہیں جانا کہ اللہ اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اس سے بڑھ کر اور جمعیت میں اس سے زیادہ تھی اور مجرموں سے ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ۷۸)

قارون کا جواب

قارون نے نصیحت کے جواب میں یہ کہا کہ یہ مال ومتاع مجھے جو حاصل ہے یہ سب میرے حُسنِ تدبیر اور کمالِ علم کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود اپنی محنت اور دماغ سوزی سے کمایا ہے، اس کا اللہ تعالیٰ سے کیا تعلق۔ چونکہ اس نے مجھے میری محنت اور حُسنِ تدبیر سے ہٹ کر براہِ راست اسباب سے ماورا کوئی چیز عطا نہیں کی، تو اس کے حقوق مجھ پر کیسے عائد ہو گئے۔ اور جب اس کے مجھ پر کوئی حقوق نہیں تو اس کی مخلوق کے حقوق بھی مجھ پر عائد ہونے کا کوئی معنی نہیں۔ یہ دولت میری ہے اور میری محنت اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے، اس لئے اس میں مجھے بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اس میں مکمل آزادی کے ساتھ اپنی مرضی بجالاؤں اور کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

Marfat.com

اُوْتِيْتُهٗ کے لفظ سے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید اس آیت کا یہ مفہوم ہو کہ یہ دولت مجھے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دی گئی ہے لیکن ان اوصاف اور اس علم کی وجہ سے دی گئی ہے جو مجھے حاصل ہے۔ یقیناً وہ اوصاف اللہ تعالیٰ کو پسند ہوں گے۔ اس لحاظ سے میں اس کا پسندیدہ بندہ ہوں۔ اگر میں اس کی نگاہ میں پسندیدہ نہ ہوتا تو وہ نعمتوں کی بارش اس طرح مجھ پر نہ کرتا۔ بنابریں میں جس طرح اپنی دولت کو خرچ کر رہا ہوں یہی وہ صحیح طریقہ ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

اَوَلَمْ يَعْلَمْ ...... قارون کے قول پر یہ اللہ تعالیٰ کا تبصرہ ہے۔ یہ بدنصیب شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے دولت کا ملنا گویا میرے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے اور میں نے یہ سب کچھ اپنے علم اور اپنی صلاحیت سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو بہت عالم وفاضل اور دانا وبینا سمجھتا ہے۔ لیکن اس بے وقوف نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس سے پہلے کتنے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو قوت و جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ کر تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے چشم زدن میں ان کو تباہ کر دیا۔ اور اگر قارون کی تباہی کا یہ واقعہ فرعون کی تباہی کے بعد پیش آیا ہے تو پھر کس قدر حماقت کی بات ہے کہ فرعون اس سے کہیں بڑھ کر وسائل کا مالک اور اسلحہ وقوت رکھنے والا اور مصر جیسی مضبوط حکومت کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اور افرادی قوت کی بھی اس کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ بااین ہمہ جب قدرت نے اسے پکڑا تو کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ تو قارون خدا جانے کس خواب وخیال میں ہے؟

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے سامنے بڑے سے بڑے مجرموں کی بے بسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب مجرموں کو پکڑنے کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو اسے اسباب کی فراہمی کا انتظار نہیں کرنا پڑتا اور نہ وہ مجرموں کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ اور اس کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی مجرم سے اس کے جرم کے بارے میں سوال کرے۔ وہ خالق و مالک ہے، وہ جرائم کی تحقیق وتفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا علمِ محیط خود اس کی سب سے بڑی سند ہے۔ اور قیامت کے دن ہر مجرم کی پیشانی، اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے اعضاء وجوارح خود اس کیخلاف گواہی دیں گے۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۷۹﴾

(پس وہ پوری شان وشوکت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا، تو جو لوگ حیاتِ دنیا کے طالب تھے کہنے لگے، کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، بیشک وہ بڑے نصیبے والا ہے۔ 79)

قارون کا اظہارِ طاقت اور کمزور لوگوں کا تأثر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں حق وباطل کی کشمکش جاری تھی اور قارون اپنے خزانوں اور اپنے اثر واقتدار سے فرعون کی تائید کر رہا تھا، تو ایک روز اس نے اپنی قوت وجمعیت کی نمائش کیلئے کوئی جلوس نکالا تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر یہ ظاہر کرے کہ وہ کتنی بڑی حیثیت کا مالک ہے اور اس کے بدلے میں فرعون سے مزید مراعات حاصل کر سکے۔ اور فِیْ زِیْنَتِهٖ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

اس موقع پر اس نے اپنی دولت وحشمت کا خاص طور پر مظاہرہ کیا۔ کیونکہ عوام پر ایسی ہی چیزیں اثر کرتی ہیں۔ بنی اسرائیل کے لوگ چونکہ ابھی پوری طرح تربیت حاصل نہ کر سکے تھے اور فرعون کی غلامی اور چاکری نے انہیں محرومیوں کا مرقع بنا رکھا تھا۔ اس لئے ان میں سے وہ لوگ جو ابھی تک دولتِ دنیا ہی کو متاعِ حیات سمجھتے تھے قارون کے ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر کو دیکھ کر کہنے لگے کہ قارون تو واقعی بڑی قسمت والا ہے۔ کاش ہمارے پاس بھی وہ دولت ورفاہیت ہوتی جس سے قارون بہرہ ور ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

(اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے افسوس ہے تم پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کیلئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔ ۸۰)

قوم کے تربیت یافتہ لوگوں کا ردِعمل

جو لوگ علم کی دولت سے بہرہ ور تھے یعنی جن کی نگاہیں دولت کی چمک نے خیرہ نہیں کی تھیں جن پر دولت میں استغراق اور اسے مقصدِ زندگی بنانے کا نتیجہ بھی واضح تھا وہ اس علمِ حقیقی سے آگاہ تھے کہ انسان کی ترقی درحقیقت اقدارِ انسانیت کی پاسداری اور ان میں جلا اور محنت سے عبارت ہے۔ انسانیت اخلاقِ حسنہ اور مکارمِ اخلاق کا نام ہے۔ انسان کا اصل مقصد بندوں کی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ انسانی زندگی کی کشتی کو کھینے کیلئے دولت کے پانی کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ زندگی کیلئے اس وقت تک مفید ہے جب تک یہ اس کشتی کے نیچے رہتا ہے اور کشتی اس کے اوپر تیرتی رہتی ہے۔ لیکن اگر اس کشتی میں کہیں سوراخ ہو جائے اور پانی اس کے اندر داخل ہو جائے یا پانی کی موجیں سرکش ہو کر کشتی کو اپنی گرفت میں لے لیں تو اب یہ پانی کشتی کی ضرورت نہیں بلکہ مہلک ہے اور اس کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ انسانوں کا گھر دولت سے چلتا ہے لیکن ماں باپ کی شفقت اور بچوں کی اطاعت سے باقی رہتا ہے۔ معاشرے میں بسنے والے باہمی حقوق کی پابندی سے بستے ہیں۔ شہریت اور مدنیت بنیادی اخلاق کی پاسداری سے آگے بڑھتی ہیں ورنہ اس میں اور جنگل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جو لوگ اس علمِ حقیقی سے آگاہ تھے انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب یعنی وہ رزقِ کریم جو حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے محنت اور کوشش کرنے کے نتیجے میں دنیا میں انسان کو ملتا ہے وہی انسانیت کی بقاء کا ضامن ہے۔ ان چند بنیادی حقائق کا یقین جن کی تعلیم مذہب دیتا ہے اور ان بنیادی اقدار اور احکام پر عمل جس کا حکم شریعتِ اسلامی دیتی ہے اس ایمان وعمل کے نتیجے میں جو انسانی زندگی وجود میں آتی ہے اس میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے صحیح اہداف کیا ہیں اور خود زندگی کی حقیقت کیا ہے اور اگر یہ دولت حاصل نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے اجر وثواب، رزقِ کریم اور حقیقی زندگی سے کبھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ دولت رکھنے کے باوجود اس کی حیثیت ایک مارِ گنج سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ چالاک، ہوشیار اور شاطر تو بن جاتا ہے لیکن انسان نہیں بنتا۔ آخر میں فرمایا کہ زندگی کی یہ حقیقت اور زندگی کا یہ حقیقی علم صرف اسے نصیب ہوتا ہے جو صبر کے وصف سے متصف ہے۔ اور صبر سے مراد ہے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنا۔ لالچ اور حرص وآز کے مقابلے میں ایمانداری اور راست بازی پر ثابت قدم رہنا، صداقت ودیانت سے جو نقصان بھی ہوتا ہو یا جو فائدہ بھی ہاتھ سے جاتا ہو اسے برداشت کر لینا، ناجائز تدبیروں سے جو منفعت بھی حاصل ہو سکتی ہو اسے ٹھوکر مار دینا، حلال کی روزی خواہ بقدرِ سدِ رمق ہی ہو اس پر قانع ومطمئن رہنا۔ بس یہی وہ قوت ہے جس کے سہارے آدمی اس حکمت وموعظت کو پا سکتا ہے جس کی تلقین اصحابِ علم نے اس آیت میں کی ہے۔

Marfat.com

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

(آخرکار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، تو نہ اس کیلئے کوئی جماعت ہی ایسی اٹھی جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی مدافعت کرنے والا بن سکا۔ 81)

قارون کا عبرتناک انجام

ہم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نہ صرف خاندان سے تعلق رکھتا تھا بلکہ آپؑ کے چچا کا بیٹا تھا۔ بنی اسرائیل میں آپؑ کی عزت اور آپؑ کے کمالات کی وجہ سے حسد کا شکار ہو گیا۔ اس وجہ سے اس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ خاندان کے تمام آدمی یکساں مقدس اور دیندار ہیں۔ تو آخر موسیٰ و ہارون ہی کو کیا ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ قوم کی امامت و پیشوائی کریں۔ دوسرے کو یہ حق کیوں حاصل نہیں۔ چنانچہ وہ خاندان کے کچھ لوگوں کو ملا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کیخلاف بغاوت کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی سالوں تک وہ اپنے مکروہ ارادوں کی کامیابی کیلئے کوشاں رہا حتیٰ کہ مفسرینِ کرام کی وضاحت کے مطابق اس نے ایک فاحشہ عورت کے ساتھ سازش کی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سامنے وعظ کر رہے ہوں تو وہ مجمع عام میں آپؑ پر بدکاری کا الزام لگائے۔ اس طرح وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عزت کو ختم کر کے دینی منصب خود سنبھالنا چاہتا تھا۔ ایک روز آپؑ وعظ فرما رہے تھے تو وہ عورت کو آپؑ پر الزام لگانے کیلئے مجمع عام میں لے آیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ سامنے آ کر الزام لگانے کی بجائے سچ اگلنے پر مجبور ہو گئی اور اس نے سازش کو بے نقاب کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہایت صدمہ ہوا۔ آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ آپؑ کی دعا کے نتیجے میں پروردگار کا غضب بھڑکا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے حواریوں کے ساتھ زمین میں غرق کر دیا۔

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ قارون نے اپنے ساتھ اڑھائی سو آدمی جمع کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیخلاف ایک فتنہ کھڑا کر دیا اور کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ سامری کے فتنہ کے بعد ان کی قوم میں ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے تو انہوں نے قارون اور اس کے ساتھیوں کو خیمۂ اجتماع کے سامنے مباہلہ کی دعوت دی تا کہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں مقبول اور پسندیدہ کون ہے۔ وضاحت کیلئے تورات سے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

> اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں، بیٹوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا، اس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ میں یہ سب کام کروں کیونکہ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی (اشارہ قارون اور ان کے جتھ کی طرف ہے) ویسی ہی موت مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین ان کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور ان کو اور ان کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور ان کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور ان کا سارا گھر بار پاتال میں سما گئے اور زمین ان کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیلی جوان کے آس پاس تھے ان کا چلانا سن کر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نہ نگل لے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۸-۳۴)

Marfat.com

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

(اور پکار اٹھے وہ لوگ جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے، اوہو (اب پتہ چلا) کہ اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق کو اپنے بندوں میں سے جس کیلئے چاہتا ہے، اور جس کیلئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، اگر اللہ کا ہم پر احسان نہ ہوا ہوتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا، لاریب، کافر فلاح نہیں پاتے۔ ۸۲)

اَمس ......گزرے ہوئے کل کے معنی میں اس کا استعمال عام ہے۔ لیکن بعض دفعہ ماضی قریب کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ تو کل کی بات ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل معلوم ہوتا ہے۔

وَيْكَاَنَّ ......اس میں وَیْ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ جب اس کے ساتھ کَاَنَّ یا کَاَنَّهٗ مل جاتا ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے اوہو! یا ارے! یہ تو گویا وہی بات ہوئی۔

عوام کی کوتاہ فکری اور زود پشیمانی

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ حقائق کا جلدی ادراک نہیں کرتا جب تک وہ حقیقت مجسم شکل میں تجربہ بن کر اس کے سامنے نہیں آ جاتی۔ ایسے خوش نصیب لوگ کم ہیں جو اپنی عقل کو خواہشات کی پیروی کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور اپنے دل کے احساسات کو نہ صرف توانا رکھتے ہیں بلکہ کبھی ہوائے نفس سے اسے مکدر ہونے نہیں دیتے۔ لیکن بیشتر لوگ ہوائے نفس کے تابع رہ کر زندگی گزارتے ہیں ان کی عقل خواہشات کی ایجنٹ ہوتی ہے اور ان کے دل میں ہمیشہ خواہشات کی فصل اگتی ہے۔ ایسے لوگ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتے اور ہر اقتدار کو لازوال سمجھتے ہیں۔ انہیں ہزار سمجھایئے کہ جن چیزوں سے تمہاری نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں:

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

لیکن یہ بات ان کے دل میں نہیں اترتی۔ مگر جب کوئی بڑا حادثہ تجربہ بن کر ان کے سامنے آتا ہے تو تب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ قارون کے طمطراق اور اس کی دولت کی چمک دمک نے انہیں بری طرح مسحور کر رکھا تھا۔ اس کا ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر دیکھ کر وہ اسی جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے۔ اب جو اچانک قارون اپنے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا تو ان کے دل و دماغ کو ایک دھچکا سا لگا کہ اوہو، یہ کیا ہوا۔ ہم جس دولت کو لافانی سمجھتے تھے اور اس کی وجہ سے قارون کی عزت و شہرت کو لازوال سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی یہ تباہی اور ہلاکت دیکھی تو اب ان کی آنکھیں کھلیں اور بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ کیسا فریب نظر ہے کہ ہم یہ تک نہ جان سکے کہ رزق کی تنگی اور فراخی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح عزت و ذلت بھی اسی کے آستانے سے وابستہ ہے۔ وہ جس کا چاہتا ہے رزق کھول دیتا ہے لیکن اگر چاہے تو اسی کو آزمائش بنا دیتا ہے۔ اور جس کا چاہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور چاہتا ہے تو اسی کو رفع درجات کا سبب بنا دیتا ہے۔ لیکن ہماری نظریں ہمیشہ اس کے ظاہر تک محدود رہتی ہیں۔ اس کی تہہ میں اتر کر حقائق و عبر کے موتی چننے کی زحمت کبھی نہیں کرتیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا احسان ہوا کہ ہم اس کے گروہ میں شامل نہ ہوئے ورنہ جس طرح اسے اور اس کے ساتھیوں کو زمین میں دھنسایا گیا ہے ہمارا انجام بھی یہی ہوتا۔ اب ہمیں اس بات کو حرزِ جان بنا لینا چاہئے کہ انجام کار کامیابی ان لوگوں کا مقدر ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہیں۔ اس کے ناشکر گزار اور اس کا انکار کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔

Marfat.com

قارون کی سرگزشت کا مقصد

قارون کی یہ داستان محض داستان سرائی کیلئے بیان نہیں کی گئی بلکہ درحقیقت اس میں اس ذہنیت پر چوٹ لگائی گئی ہے جس کا ذکر آیت نمبر ۵۷ میں گزر چکا ہے۔ قارون اسی ذہنیت کا نمائندہ تھا۔ وہ بھی قریش کی طرح یہ سمجھتا تھا کہ زندگی درحقیقت خوشحالی، فارغ البالی، زراندوزی، کثرتِ مال، کثرتِ اولاد، عہدہ ومنصب، افرادی قوت، بالادستی اور ٹھاٹھ باٹھ کا نام ہے۔ جن نظریات کو قبول کرنے اور جس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے سے فقر وفاقہ، درویشی اور صبر واستغنا تک نوبت پہنچے وہ کتابی زندگی تو ہے، حقیقی زندگی نہیں۔ اور روئے زمین پر رہنے والوں میں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ لباس پہننے والے کی قدر لباس سے ہوتی ہے اور مکین کی عزت وعظمت مکان کی خوبصورتی سے۔ کرسی پر بیٹھنے والا کرسی کی قوت سے قوی ہوتا ہے۔ تصادم اور مقابلے کے وقت بنیادی صداقتیں اور ان پر ایمان کام نہیں آتا بلکہ افرادی قوت اور اسلحہ کی برتری کام آتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس طرزِ زندگی کے قبول کرنے کی دعوت دے رہے تھے وہ قارون کی سوچ اور فکر سے متصادم تھی۔ بالکل اسی طرح قریش اور عمائدینِ قریش بالخصوص ابولہب جیسے لوگوں کے تصوراتِ زندگی بھی آنحضرت ﷺ کے پیش کردہ طرزِ زندگی سے نہ صرف مخالف بلکہ متصادم تھے اور وہ انہیں کو کامیابی اور عزت وسربلندی کی ضمانت سمجھتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے کے نتیجے میں اپنی تباہی و بربادی دیکھتے تھے۔ قارون کا واقعہ بیان کرکے اور اس کی سوچ کو نمایاں دکھا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ تم جس طرح سوچتے اور جو کچھ کررہے ہو دنیا میں پہلے بھی تمہاری فکر کے حاملین گزر چکے ہیں لیکن ہم تمہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ انہوں نے پیغمبر کی دعوت کورد کرنے کیلئے ایک سے ایک بڑھ کر بیہودہ طریقہ اختیار کیا۔ شرافتِ انسانی تک کو بھول گئے بالآخر تباہی وبربادی ان کا مقدر ٹھہری۔ وہ جس طرزِ زندگی کو اپنے لئے ہر طرح کی کامیابی کی ضمانت سمجھتے تھے وہی ان کی تباہی کا باعث ہوا۔ اور اس کی مثالیں ایک نہیں بہت ہیں۔ قارون عمائدینِ قریش کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں اس فکر کی بہت بڑی مثال تھا۔ لیکن اس کے طرزِ فکر نے جیسی کچھ بیہودگیاں اس سے کروائیں اور جس طرح کے الزامات اس نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر لگائے اور پھر جس طرح اس کے انجام میں پکڑا گیا کہ نہ صرف وہ اور اس کے رفقاء زمین میں دھنسا دیئے گئے بلکہ جن خزانوں پر اسے بہت مان تھا اور جس دولت کو وہ اپنے لئے کامیابی کی ضمانت سمجھتا تھا وہ خزانے بھی اس کے ساتھ زمین میں دفن کردیئے گئے۔ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں دھنسنے کا یہ عذاب قیامت تک اس کے ساتھ جاری رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوچ جو انسان کو زندہ درگور کردیتی ہے اور زمین میں دفن کرکے چھوڑتی ہے کس قدر بدنصیبی ہے کہ انسان اسی سوچ کو بار بار اختیار کرتا اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ
لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٨٣﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ
بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا

Marfat.com

يَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾ إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ
مَعَادٍ ۚ قُلْ رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي
ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ
إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ﴿٨٦﴾
وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ
إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٨٧﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ
إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ
لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٨﴾

رکوع: ۹۔ (یہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کیلئے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں غرور و فساد چاہنے والے نہیں ہیں اور انجام کی بھلائی خدا سے ڈرنے والوں ہی کیلئے ہے۔ ۸۳) جو کوئی نیکی کما کر لائے گا تو اس کیلئے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو برائی لے کر آئے گا تو برائیاں کمانے والوں کو وہی بدلہ ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔ ۸۴) بیشک جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہ آپ کو ایک بہترین انجام تک پہنچانے والا ہے، اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کون ہے جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۵) آپ اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو بس آپ کے رب کا فضل ہوا ہے، پس آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں۔ ۸۶) اور وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیات سے روکنے نہ پائیں اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف اتاری جا چکی ہیں، اور آپ اپنے رب کی طرف (لوگوں کو) بلائیں اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں میں سے۔ ۸۷) اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، کوئی معبود نہیں بجز اس کے، اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۸)

Marfat.com

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٨٣﴾

(یہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کیلئے مخصوص کردیں گے جو زمین میں غرور و فساد چاہنے والے نہیں ہیں اور انجام کی بھلائی خدا سے ڈرنے والوں ہی کیلئے ہے۔ ۸۳)

دارِ آخرت کیسے لوگوں کیلئے ہے

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دارِ آخرت ان لوگوں کیلئے خاص کردیا گیا ہے جو خدا کی زمین پر اپنی بڑائی قائم کرنے کے خواہاں نہیں۔ جو سرکشی اور تکبر کو زندگی کا عنوان نہیں بناتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی زندگی کا ہدف اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر اس کے قوانین کی اطاعت بھی ہے اور زمین اور اہلِ زمین پر اس کا نفاذ بھی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ زمین پر بسنے والے جب سرکشی اور تکبر کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور بندہ بننے کی بجائے خدا اور طاغوت بن کر اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے کی بجائے خود ساختہ نظام اور اپنی مرضی کو مسلط کرتے ہیں تو فساد برپا ہوجاتا ہے۔ حق کی بجائے باطل کو فروغ ملتا ہے۔ عدل کی بجائے ظلم بروئے کار آتا ہے۔ حقوق سلب ہوتے اور بھلائیاں تلف ہوتی ہیں، نیکیوں کے خوشبودار اور مثمر درخت قدآور ہونے کی بجائے زہریلی جھاڑیاں پھیلتی ہیں۔ اس طرح سے زمین فساد سے بھر جاتی ہے۔ تو اس صورتحال کا نتیجہ یقیناً تباہی و بربادی ہوگا۔ ایسے لوگوں کیلئے دنیا بھی جہنم ہے اور آخرت میں تو جہنم ہی ان کا مقدر ہوگا۔ لیکن جو لوگ زمین میں علو اور فساد نہیں چاہتے اللہ تعالیٰ نے دارِ آخرت کو ان کیلئے مخصوص کردیا ہے۔ دارِ آخرت سے مراد جنت ہے۔ لیکن جنت دنیا میں کئے ہوئے ان اعمال کا نتیجہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارے کئے ہیں۔ اس لئے دونوں میں غائیت درجہ وابستگی ہے۔ جنت اسی کو ملے گی جو زمین میں نظامِ حق و عدل کا قائم کرنے والا ہوگا۔ اس لئے آیت کے آخر میں فرمایا کہ جنت کا یہ انجام متقین کیلئے ہے۔ اور متقین یقیناً وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے، بندگی اختیار کرتے اور حق کی سربلندی کیلئے اپنا سب کچھ قربان کردیتے ہیں۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾

(جو کوئی نیکی کما کر لائے گا تو اس کیلئے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو برائی لے کر آئے گا تو برائیاں کمانے والوں کو وہی بدلہ ملے گا جو وہ کرکے آئیں گے۔ ۸۴)

آخرت میں جزاء وسزا کا طریقہ

اس آیتِ کریمہ میں جزاء اور سزا کا وہ قانون بیان فرمایا گیا ہے جس پر آخرت میں عمل ہوگا۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ نیکوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو معاملہ فرمائیں گے اس کی بنیاد اس کے فضل پر ہوگی۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نیکی کا صلہ نیکی کے تول کے برابر نہیں ہوگا۔

Marfat.com

کیونکہ برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جیسی نیکی کی گئی ہو بالکل ویسا ہی اس کا صلہ دیا جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہوگا کہ وہ اپنے فضل کو بنیاد بنا کر زیادہ سے زیادہ صلہ عطا فرمائے گا۔ قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل کی شرح عمل کی نسبت دس گنا زیادہ ہوگی، یعنی آدمی ایک نیکی کرے گا اور اس کا بدلہ اسے دس نیکیوں کے برابر ملے گا۔ لیکن یہ کم سے کم معاوضہ ہے۔ تقویٰ اور اخلاص میں اضافے کے ساتھ اس معاوضے میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا جس کی کوئی انتہا نہیں۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو شخص دنیا میں برائی ہی کے چلن کو اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ناراض ہو کر ہر طرح کے معاوضے سے محروم نہیں فرمائیں گے بلکہ اس کے ساتھ عدل کے مطابق معاملہ فرمائیں گے۔ یعنی جو کچھ اس نے کیا ہوگا اور جیسا کچھ کیا ہوگا اس کا ثمرہ اس کے آگے رکھ دیا جائے گا۔ اور اسے بتا دیا جائے گا کہ یہ تمہاری ہی کاشت کی ہوئی فصل کا حاصل ہے، تمہاری اپنی ہی پیداوار ہے، اب اس کا مزہ چکھو۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۸۵﴾

(بیشک جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہ آپ کو ایک بہترین انجام تک پہنچانے والا ہے، اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کون ہے جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ ۸۵)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور بشارت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے سلسلے میں جس بات کو نمایاں فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اچانک نبوت و رسالت جیسی عظیم ذمہ داری سے گراں بار کیے گئے۔ وہ حالتِ سفر میں تھے، بکریوں کے ایک ریوڑ کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ہاتھ میں ایک عصا تھا جو مختلف کاموں میں معاون اور ہر وقت کا ساتھی تھا۔ دنیا کے وسائل کے حوالے سے آپؑ بالکل تہی دامن تھے۔ لیکن آپؑ کو اس شخص کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا جو ایک بہت بڑی حکومت کا مالک، بیشمار فوجوں اور اسلحۂ جنگ سے مسلح اور ایک زرخیز ملک کا مطلق العنان حکمران تھا، جس کی خلافِ طبع بات کا نتیجہ موت سے کم نہ تھا۔ لیکن آپؑ نے اس کے سامنے کلمۂ حق کہا۔ سالوں تک حق و باطل کی کشمکش جاری رہی، لیکن نتیجہ کیا ہوا کہ حق بے یار و مددگار ہونے کے باوجود غالب رہا اور باطل اپنی تمام قہرمانی قوتوں سمیت بحرِ قلزم کی موجوں کی نذر ہو گیا۔ اسی طرح قارون جیسا خزانوں کا مالک دولت مند آپؑ کا انتہائی قرابت دار اپنی تمام تر دولت و وجاہت کے باوجود سالوں تک آپؑ کی مخالفت میں سرگرداں رہا۔ بالآخر زمین کا رزق ہو کر رہ گیا۔ آج پھر محمد رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان معرکۂ حق و باطل برپا ہے۔ ایک طرف دنیا بھر کے وسائل ہیں اور دوسری طرف سچائی اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر بھروسہ ہے۔ اس کے سوا ان کے پاس بے کسی اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے مخالفین پر غلبہ دیا، بالکل اسی طرح نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو قریش اور دیگر اہلِ باطل پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں تسلی بھی دی گئی ہے اور غلبۂ حق کی پیشگوئی بھی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے بعد کی آیات میں قریش اور دیگر مخالف قوتوں کو تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

مَعَادٍ کا مفہوم

مَعَادٍ کا معنی لوٹنے کی جگہ مرجع اور غائت ہے۔ البتہ اس کی مراد کے تعین میں اہل تفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے جنت مراد لی ہے۔ لیکن سیاق کلام سے یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جنت تو ہر اس شخص کا صلہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی توفیق دی ہے۔ اور پھر اس صورت میں آنحضرت ﷺ کی تمام مساعی کے نتیجے کو آخرت تک محدود کر دینا جو کسی طرح صحیح نہیں۔ اور مزید یہ کہ اس شکل میں آنحضرت ﷺ کیلئے تسلی کا مضمون بھی مکمل نہیں ہوتا۔

بعض دیگر اہل تفسیر نے اس سے مراد بہترین انجام لیا ہے اور چونکہ اس لفظ کو نکرہ لایا گیا ہے اس لئے انہوں نے اس کی تنکیر کو تفخیم شان پر دلیل ٹھہرایا ہے۔ اس وجہ سے وہ اسے مُعْتَادٌ حَسَنٌ کے معنی میں لیتے ہیں۔ اس میں یقیناً آنحضرت ﷺ کیلئے تسلی ہے کہ قریش تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ کا دین قبول کر لینا درحقیقت تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ قریش کی تمام تر قیادت وسیادت ان کے دینِ شرک سے وابستہ ہے اور اسی نے انہیں پورے عرب کا امام اور بیت اللہ کا متولی بنا رکھا ہے۔ اگر اس کی جگہ توحید کا تصور قبول کر لیا جائے تو تمام جزیرۂ عرب کے قبائل ان کے خلاف یورش کریں گے۔ اس طرح سے ان کی ایسی ہوا خیزی ہوگی کہ ان کیلئے مکے میں رہنا ناممکن ہو جائے گا اور جان بچانا بھی ایک مسئلہ بن جائے گا۔ اس لئے قریش یہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ نے اپنے آپ کو تو تباہی کے حوالے کر دیا ہے ہم ان کے پیچھے لگ کر اپنے آپ کو تباہ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو یقین دلا رہا ہے کہ یہ شپرہ چشم لوگ کیا جانیں کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ ایک بہترین انجام آپؐ کے انتظار میں ہے۔ چند ہی سالوں میں پورا جزیرۂ عرب آپؐ کے زیر اقتدار ہوگا۔ کوئی مزاحمت کرنے والی طاقت میدان میں باقی نہیں رہے گی۔ سارے عرب میں صرف آپؐ کے دین کا ڈنکا بجے گا۔ چنانچہ اس دور کے انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ چند ہی سالوں میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا جس میں نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو ایسی قیادت ووجاہت میسر آئی کہ تاریخ نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھا جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ تھی کہ وہ قوم جس نے کبھی کسی منظم حکومت کے ماتحت رہنا سیکھا ہی نہ تھا آج اس پوری قوم پر اللہ تعالیٰ کے دین کا غلبہ تھا۔ وہ ایک خدا کی پرستار اور ایک نبی کی رہنمائی کو قبول کرنے والی تھی۔ اور پورے جزیرۂ عرب میں کسی دوسرے دین کیلئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک معاد سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے معاد کی یہی تفسیر منقول ہے۔ آئمہ تفسیر میں سے مقاتل کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کے وقت غار ثور سے رات کے وقت نکلے اور مکہ سے مدینہ جانے والے معروف راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں سے سفر کیا۔ کیونکہ دشمن تعاقب میں تھے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ طیبہ کے راستہ کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے اور جہاں سے مکہ سے مدینہ کا معروف راستہ مل جاتا ہے اس وقت مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد آئے۔ اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے جس میں آپؐ کو بشارت دی گئی کہ مکہ مکرمہ سے یہ جدائی چند روزہ ہے اور بالآخر آپؐ کو مکہ مکرمہ پہنچا دیا جائے گا جو فتح مکہ کی بشارت تھی۔ (قرطبی) اگر معاد کا یہ مفہوم بھی مراد لیا جائے اور حدیث میں ذکر ہونے کی وجہ سے بہتر ہے کہ یہی مراد لیا جائے تو سابقہ مفہوم اور اس مفہوم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ معاد کو بہترین انجام اس لئے قرار دیا گیا کہ اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی دعوت اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کا پورے جزیرۂ عرب پر غلبہ تھا اور اس انقلاب کو برپا ہونا تھا جس کیلئے آپؐ کو مبعوث کیا گیا تھا اور فتح مکہ بھی ظاہر ہے کہ اسی انقلاب کی کامیابی سے عبارت اور اسی انقلاب کی تکمیل کا پیش خیمہ ہے اور یہی

Marfat.com

وہ بہترین انجام ہے جس کے بعد پورے جزیرۂ عرب پر اللہ تعالیٰ کا دین غالب آ گیا اور اس کے دو ہی سال بعد نبی کریم ﷺ کو واپس بلا لیا گیا۔ کیونکہ آپ جس مقصد کیلئے تشریف لائے تھے وہ مقصد پورا ہو گیا۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں تسلی کے اس مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے مکمل فرمایا، یعنی آپؐ کا اب تک معمول رہا ہے کہ آپؐ ہدایت کی امید لئے ہوئے ہر دروازے پر دستک دیتے رہے ہیں اور مخالفین کی اذیتوں اور بدزبانیوں کے مقابلے میں بھی آپؐ نے نہایت صبر سے کام لیا ہے اور تبلیغ و دعوت میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ اور مخالفین نے جیسے بھی اعتراضات اٹھائے آپؐ نے اس کا جواب دیا۔ اب ان مخالفین سے بحث کا دروازہ بند کر دیجئے اور صاف صاف ان سے کہہ دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اللہ تعالیٰ کی ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ اب معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر۔ کیونکہ جہاں تک افہام و تفہیم کا تعلق ہے اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ اب تم اپنے رویئے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہو۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

(آپ اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو بس آپ کے رب کا فضل ہوا ہے، پس آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں۔ ۸۶)

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل

اس آیتِ کریمہ میں سابق مضمون کی مزید وضاحت بھی ہے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیل بھی۔ جہاں تک نبوت کی دلیل کا تعلق ہے اس کے بعض پہلو واضح ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے، جس طرح آپؐ کی تربیت ہوئی، جس طرح کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا، پھر جن لوگوں کے ساتھ آپؐ کے خاندانی اور تجارتی روابط رہے، اور پھر جو لوگ تجارتی سفار میں آپؐ کے شریکِ کار رہے، ان کے حالات کو دیکھتے ہوئے دو باتیں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کا کوئی گوشہ نبوت سے پہلے ایسا نہیں جس سے اہلِ مکہ واقف نہ ہوں۔ آپؐ کے بکریاں چرانے کے زمانے سے لے کر غارِ حرا کی تنہائیوں تک ایک ایک تبدیلی اور ایک ایک مصروفیت کے جاننے والے لوگ موجود تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق اور متحد تھے کہ آپؐ کی چالیس سالہ زندگی میں کبھی آپؐ سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی، کبھی آپؐ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلا، کبھی آپؐ نے کسی سے کوئی ایسی بحث نہیں فرمائی اور کبھی کسی ایسی مجلس میں نہیں پہنچے اور کبھی کسی ایسے آدمی سے ملاقات نہیں کی جس سے دور دور تک اس بات کا شبہ کیا جا سکتا ہو کہ آپ نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔ یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی لوگوں کی اصلاح کیلئے اسی طریقے پر کام کروں جس طرح پہلے انبیائے کرام کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ مکے میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ آپ کا بچپن دوسرے بچوں سے مختلف تھا، آپ کا لڑکپن دوسرے لڑکوں سے نمایاں تھا، آپ کی جوانی دوسرے جوانوں سے مختلف تھی۔ جوانی کی خوش فعلیاں جوانوں کے ساتھ صحبتیں، جوانوں جیسا لاابالی پن، جوانوں کی طرح تفریحی مشاغل میں دلچسپیاں، گانے بجانے اور قصہ گوئی کی مجالس میں شرکت، سیر سپاٹے کیلئے جوانوں کے ساتھ مل کر کہیں

Marfat.com

باہر کا سفر، شعروشاعری سے غیر معمولی دلچسپی، ان میں سے کوئی بات بھی آپ کے قریب تک بھی نہ پھٹکی تھی جبکہ لوگوں میں ہر طرح کی برائیوں کا چلن تھا، جھوٹ عام بولا جاتا تھا، ستر پوشی کوئی اہمیت کی چیز نہ تھی، لڑائی جھگڑا لوگوں کا معمول تھا، دوسروں کی دلآزاری معمولی بات سمجھی جاتی تھی، شرافت ونجابت کی چنداں پرواہ نہ کی جاتی تھی، ہمدردی وغمگساری، خیر خواہی وہمدردی، ایفائے عہد، وفاشعاری، صداقت کی پاسداری، ان باتوں کی بہت زیادہ پرواہ نہ کی جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی زندگی میں نہ ان برائیوں میں سے ہمیں کوئی برائی دکھائی دیتی ہے اور نہ ان خوبیوں میں سے کسی خوبی کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود حیرانی کی بات یہ ہے کہ آپ نے ان مکارمِ اخلاق کے حوالے سے کبھی کوئی نصیحت نہیں فرمائی تھی، کبھی کسی کو ملامت نہیں کی تھی، آپ ایک روشن چراغ ضرور تھے لیکن دوسروں کے گھروں میں روشنیاں بکھیرنا آپ کا معمول نہ تھا۔ یعنی آپ انتہائی پاکیزہ زندگی ضرور رکھتے تھے لیکن آپ میں کسی طرح کے ادعا کا کوئی شائبہ تک نہ تھا

آپ شرافت ونجابتِ انسانی کی اعلیٰ مثال ہوتے ہوئے اور ہر طرح کے عیبوں سے پاک زندگی گزارنے کے باوجود علمی طور پر آپ انہیں باتوں کو جانتے پہچانتے تھے اور وہی چیزیں آپ کے تصورات کا حصہ تھیں جن سے اہلِ مکہ واقف تھے۔ آپ چونکہ اُمی تھے اس لئے کسی کتاب سے استفادہ آپ کیلئے ممکن نہ تھا۔ آپ کی معلومات اور آپ کے علمی تصورات عام عربوں سے قطعی طور پر مختلف نہ تھے جس سے کبھی کسی کو شبہ ہوتا کہ آپ کے اندر ایک نئی علمی دنیا وجود پذیر ہو رہی ہے جس کی وجہ سے آپ لوگوں میں کچھ علمی خیالات کا نفوذ چاہتے ہیں اور آپ کسی مناسب موقع کے انتظار میں ہیں جب آپ اس کا اظہار کرسکیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کوئی شخص بھی جو آپ کو اچھی طرح جانتا تھا وہ آپ کی پاکیزہ زندگی کا تو ضرور معترف تھا اور آپ کے خیالات کی پاکیزگی کی بھی شہادت دیتا تھا۔ وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتا تھا کہ آپ دوسروں سے سیرت وکردار میں بہت مختلف ہیں۔ لیکن اس کا گمان کسی کو بھی نہ تھا کہ آپ نبی بننے والے ہیں اور نبوت کے دعوے کیلئے موقع کی تلاش میں ہیں۔

غارِ حرا کی تنہائی میں جب فرشتہ آپ پر وحی لے کر نازل ہوا اور قرآنِ کریم کی چند آیات آپ کو سنائیں تو تمام مستند احادیث اور تمام معتبر مؤرخین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نہایت پریشان اور مضطرب حالت میں اس طرح گھر تشریف لائے کہ سخت سردی محسوس کر رہے تھے اور فرما رہے تھے زملونی زملونی، مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ آپ کو لحاف اڑھا دیا گیا۔ جب آپ کی طبیعت کسی حد تک پرسکون ہوئی تو آپ نے اپنی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہؓ سے فرمایا، یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں تو اپنی جان کیلئے خطرہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ اور پھر سارا واقعہ انہیں سنایا۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے کہا، کہ ہرگز نہیں! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی کسی مشکل میں نہ ڈالیں گے، آپ تو قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں، بے کس کو سہارا دیتے ہیں، بے زر کی دستگیری کرتے ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں، ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ پھر وہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ وہ ایک ذی علم اور راست باز آدمی تھے۔ وہ آپ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بے ساختہ کہنے لگے یہ جو کچھ آپ کے پاس آیا تھا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ کے پاس آیا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو شہر سے نکال دے گی۔ آپ نے حیران ہو کر کہا کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے جواب دیا، ہاں! کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہوگئے ہوں۔

آپ کی زندگی کے حالات اور آپ کی رفیقۂ حیات کی گواہی کیا یہ بات بتانے کیلئے کافی نہیں کہ آپ کے ذہن میں کبھی نبوت کا تصور بھی نہیں گزرا تھا۔ نہ آپ نے کبھی اس کی خواہش کی تھی، نہ کبھی آپ کو اس کی امید رہی۔ بلکہ جب نبوت کا پیغام آپ کے پاس پہنچا تو آپ اس وقت نہایت ششدر رہ گئے اور ہانپتے اور کانپتے ہوئے گھر پہنچے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت اسی طرح عطا

Marfat.com

فرمائی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک ایسی وہبی چیز اور ایسا الٰہی پروانہ ہے کہ جس کسی کو عطا ہوتا ہے اسے دور دور تک اس کی امید نہیں ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ قدرت اس عظیم کام کیلئے اس کی تربیت کرتی ہے۔ لیکن اسے اس کا خواہشمند کبھی نہیں بناتی۔ سورۃ یونس میں اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا قُلْ لَّوْشَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (آیت ۱۶) ''اے نبی ان سے کہو، کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمہیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک تم کو نہ دیتا، آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات نہیں سمجھتے۔)

اور سورۃ شوریٰ میں فرمایا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا (آیت ۵۲) ''اے نبی، تم جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔''

ہماری ان گزارشات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی کریم ﷺ کو جس طرح نبوت عطا ہوئی کہ نہ آپؐ کی ذات میں اس کا کوئی داعیہ موجود تھا، نہ آپؐ کے اندر اس کی طلب پائی جاتی تھی، نہ کبھی آپؐ نے اس کی خواہش فرمائی تھی، نہ آپؐ کا ماحول اس کی غمازی کرتا تھا اور نہ آپؐ کے قول و عمل میں اس بات کا کوئی اشارہ پایا جاتا تھا بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت، اللہ تعالیٰ کا عطیہ، اس کی طرف سے ایک عظیم ذمہ داری کی تفویض اور ایک بہت بڑے کام کی بجا آوری کیلئے انتخاب تھا۔ اور ذمہ داری بھی ایسی کہ جس میں نہ اپنے گھر بار کی فکر کی گنجائش تھی، نہ اس میں کاروبار اور تجارت کا کوئی امکان تھا، نہ اس میں کچھ پانے کی امید تھی بلکہ سراسر سب کچھ کھو دینے اور قربانی و ایثار کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ تھا جسے آدمی اپنی چاہت سے کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔ ان حقائق کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس آپؐ کی نبوت اور رسالت کی صداقت پر شبہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داری کو اپنی چاہت اور خواہش کے بغیر قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اس کی مدد فرماتا ہے۔ اور جب کسی منصب کی آدمی تمنا اور خواہش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس منصب کے حوالے کر دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ عظیم منصب چونکہ ہم نے آپؐ کے سپرد کیا ہے جس میں آپؐ کی خواہش کا کوئی دخل نہیں، اس لئے ہم ہی اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مدد کریں گے، اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو آسان کریں گے اور اس راہ کے بڑے سے بڑے دشمن کو ناکام و نامراد کریں گے۔ نیز یہ بات بھی کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں آپؐ کی کامیابی درحقیقت ہماری کامیابی ہے کیونکہ ہم نے اس کا بار آپؐ کے سر پر ڈالا ہے۔ اس لئے راستے کی مشکلات کتنی بھی عظیم ہوں آپؐ ہرگز اس کی پرواہ نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کے سامنے کوئی مشکل بھی ٹھہر نہیں سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے دین کا مزاج

آیت کے آخر میں فرمایا فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ''آپ ان کافروں کے مددگار اور پشت پناہ نہ بنیں۔'' اس میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن اس میں جو تنبیہ و عتاب مضمر ہے اس کا رخ آپ کی طرف نہیں بلکہ آپ کے مخالفین کی طرف ہے۔ اس میں

Marfat.com

انہیں اس دین اور نبی کریم علیہ السلام کی دعوت کی اہمیت اور مزاج سے آگاہ کرنا ہے۔ یعنی انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نبی کریم علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب اور آپ کے لائے ہوئے دین کا انکار اور مخالفت اپنے اندر اس قدر نزاکت رکھتی ہے کہ پیغمبر جو دین کا منادو مبلغ بن کے آیا ہے اور جس کی زندگی اور زندگی کے تمام وسائل اسی دین کے فروغ اور بالادستی کیلئے وقف ہیں۔ اگر وہ بھی کبھی ان کافروں کی کسی حد تک معاونت کرنے لگیں جو اس دعوت کا راستہ روک رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بھی اس کی اجازت ہرگز نہیں دے گا۔ چہ جائیکہ ان کافروں کو برداشت کیا جائے جو اس دین کی مخالفت کر رہے ہیں اور جن کی کوشش یہ ہے کہ اس دین کو لوگوں میں نفوذ کا موقع نہ ملے۔

وَلَا یَصُدُّنَّکَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْکَ وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۸۷﴾

(اور وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیات سے روکنے نہ پائیں اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف اتاری جا چکی ہیں، اور آپ اپنے رب کی طرف (لوگوں کو) بلائیں اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں میں سے۔ ۸۷)

ردِ شرک میں آخری درجہ تک زور اور تاکید

اللہ تعالیٰ کے دین کی اہمیت اور اس کی تبلیغ و دعوت کی حیثیت کو واضح کرنے کے بعد ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ مشرکین توحید کی دعوت کے ہرگز روادار نہیں اور توحید کی ایک ایک بات انہیں بری طرح کھلتی ہے اور وہ شرک کی مذمت میں کوئی بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔ بنا بریں آپ کیلئے انتہائی مشکل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جن کی بنیاد ہی توحید پر ہے کھل کر بیان کرنے کی کوشش فرمائیں۔ لیکن دین کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی آیات کی تبلیغ و دعوت سے کبھی آپ کو روکنے کی جسارت نہ کریں۔ آپ ہر بات کو ڈنکے کی چوٹ کہیں، کیونکہ جو باتیں آپ پر نازل کی جا چکی ہیں وہ نہ واپس ہو سکتی ہیں اور نہ دبائی جا سکتی ہیں کیونکہ ان آیات کا سرچشمہ آپ کی ذات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ آپ کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے دین کے مبلغ کی ہے، دین کے بانی اور شارع کی نہیں۔ آپ پر جو کلام اترتا ہے آپ تو بہر صورت اسے بندوں تک پہنچانے کے مکلف ہیں۔ اور اگر آپ اسے کسی دوسرے کی خاطر روکنا پسند فرمائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تبلیغ و دعوت پر دوسروں کی پسند و ناپسند کو ترجیح دی ہے تو یہ گویا شرک ہوگا۔ اور آپ تو دنیا میں شرک کو ختم کرنے کیلئے اٹھے ہیں۔ یہاں پر پہنچ کر پتہ پانی ہونے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی گہرائی بھی دل میں اترنے لگتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا مخالفین کو تصور دینا مقصود ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۣ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ؕ لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

(اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، کوئی معبود نہیں بجز اس کے، اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۸)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی دعوتِ توحید کا نچوڑ

سابقہ مضمون کا تسلسل جاری ہے، اس آیت تک پہنچتے پہنچتے اس کی لو اور تیز ہوگئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت شرک نے ایسی وسعت اور متنوع صورت اختیار کرلی تھی کہ جس کا ازالہ آسان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا وہ گھر جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کا مرکز بنایا تھا بت پرستی کا ایک بہت بڑا تیرتھ بن چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت مشرکین کیلئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس طرح اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے کہ جس میں مداہنت کا ہر امکان ختم ہوجاتا ہے اور مخالفین پر اچھی طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تم نبی کریم ﷺ سے اس معاملے میں کسی نرمی کی امید مت رکھو۔ چنانچہ اس طرح کی ہر امید کو ختم کرنے کیلئے آپ سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکاریں۔ حالانکہ آپ سے اس کی کسی طرح امید نہیں ہوسکتی۔ لیکن بتایا صرف یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو ایسی تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا جارہا ہے تو دوسرے لوگوں کو اس کی اہمیت اچھی طرح جان لینی چاہئے۔ اور دوسرا معبود پکارنے سے اس لئے روکا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کائنات کی ہر چیز اس کے سوا فانی ہے۔ ہر چیز اس کے فرمان کے سامنے سرافگندہ ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔ فیصلے کا تمام اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ چندروزہ زندگی گزارنے کے بعد آخرکار اسی کے پاس لوٹ کے جانا ہے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری اس طرح ہو کہ ہر جبین پر اس کی بندگی کا روشن نشان چمک رہا ہو اور دل اس کی محبت سے سرشار ہو، سینہ اس کے نورِ معرفت سے منور ہو، کیونکہ اس کے تعلق کا یہی کم سے کم تقاضا ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com